سلسلہ (۱)
نمبر (۱)

معیار

تعاون
سالانہ — پانچ ر
فی کاپی — آٹھ آ

ترتیب دینے والے
اصغر علی عابدی
عبدالقدیر اصغر

ہیڈ آفس:۔ خندق اسٹریٹ میرٹھ
سب آفس: محلہ کشن گنج دہلی نمبر ۶

"لاتعداد بے بسوں کا خون توہینِ انسانی کو غسل دے رہا ہے
خود غرضی دردِ انسانی پر ہنس رہی ہے۔ بے زبان سماج سرنگوں
کھڑا ہے جس کے اُترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی
داستان کندہ ہے۔ آؤ! اس داستانِ غم کو انسانیت کے چہرے
نوچ کر پھینک دیں۔ آؤ! اِس خون کی پیاسی تہذیب کو بدل ڈالیں
یہ کسی دین و آئین کی قائل نہیں ہے۔ یہ وقت کی موجوں پر آوارگی
اور حباب آسا سرتوں کو نچاتی ہوئی ایک بے منزل کے راستے
پر بھاگی چلی جا رہی ہے —— آؤ! اس بھٹکی ہوئی ہرنی کو راستہ
بتا دیں ——"!

(ماخوذ)

ا

ترتیب

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ حضرات اپنی رقوم شیخ محمد قمر الدین صاحب پبلشر اندرون موچی گیٹ لاہور کے پتے پر روانہ کریں اور ہمارے سب آفس کو اطلاع دیں۔

(ہمدرد پریس دہلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

نقشِ اوّل

"معیار" کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آغازِ کار کے اِس
[illegible]لے میں قدم رکھنے سے پہلے ہمیں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا اور
[illegible]تے کے وہ کونسے موڑ تھے جو ہمارے استقلال کو بار بار آزمائش
ڈالتے رہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جس کی ورق گردانی
کے لئے لاحاصل ہے۔ [illegible] اتنا سمجھ لیجئے کہ خدا کو منظور تھا کہ یہ
[illegible]ہو وہ ہوگیا۔ اب "معیار" آپ کا ہے اور آپ جس طرح چاہیں
[illegible] پروان چڑھانے میں [illegible] ہو سکتے ہیں۔

اس ماہنامہ کے اجراء سے ہمارے مقاصد یہ ہیں کہ ہم موجودہ
[illegible]ب پر چھائے ہوئے الحاد، فحاشی اور عریانی کو ختم کریں اور زندگی
اعلیٰ قدروں پر ایک صالح اور پاکیزہ ادب کی تشکیل کریں۔ ہم
[illegible] کو اُس تباہی کے راستے پر بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں جو
[illegible]دیوں سے انسانی شرافت اور اخلاق کا خون کر رہا ہے۔ ہم انسانی
[illegible]ذیب سے اِس خون خرابے کو ختم کرا دینے کے خواہشمند ہیں۔ ہمارا
[illegible]مطمح العین یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان کالے، گورے
[illegible]و نیچے اور حاکم و محکوم کی تمیز مٹ جائے۔ پوری انسانی برادری
[illegible]یک قانون اور ایک اصول کو اپنے لئے بالاتر تسلیم کرلے۔ اُس کے
بعد اِس قانونِ حیات میں کسی مقتدر گروہ کی اغراض کے تحت کوئی
تبدیلی نہ ہو —— سارے انسان صرف اس برتر ضابطے کے
آگے سرِ تسلیم خم کردیں۔ ہم خیالی نیکیوں اور خوبصورت الفاظ کا جامہ
پہنے ہوئے ناقابلِ عمل نظریات کے قائل نہیں ہیں۔ ہم کسی اونچی سے
اونچی فلسفیانہ بات کو محض کسی اونچے آدمی کی ذات سے تعلق کی بناء
[illegible] قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم ہر بات کو عمل اور نتائج کی کسوٹی
پر پرکھیں گے۔ اصولِ فطرت اور عقلِ سلیم کے معیار پر جانچیں[illegible]
اُس کے بعد اگر وہ زندگی کے لئے کارآمد ثابت ہو تو [illegible]
اپنا ئیں گے۔ ہم نظریات کے جگنوؤں اور توہمات کے [illegible]
کے پیچھے دوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم ایسے ارتقا[illegible]
قائل نہیں ہیں جو انسانیت کو پیچھے کی طرف دھکیلتا ہو۔ ہم [illegible]
اصطلاحات اور بڑی بڑی لغات کے پیچھے چلنا نہیں چا[illegible]
زندگی کے سلبی مقاصد (Negative Aims)
ہمارے لئے منزل کے چراغ نہیں ہیں۔ ہم صرف ایجابی اصو[illegible]
کے قائل ہیں، اور اُسی کی طرف دنیا کو لیجانا چاہتے ہیں [illegible]
کے لئے اپنے وقت کا مہذب ترین طریقہ، مہذب ترین زبا[illegible]
اور مہذب ترین ادب پیش کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اگر آپ
راستہ پسند ہو تو آپ بخوشی اس راہ پر چل سکتے ہیں! و ہمارا ساتھ دیجئے
"معیار" کے اس شمارے اور آئندہ شماروں میں [illegible] ایسے لکھنے
کے نام ملیں گے جن سے دنیائے ادب نا آشنا[illegible]
بالکل نئے ہیں۔ ان کے مقاصد مختلف[illegible]
ہے۔ اس لئے نہ تو "فلمی پریوں" کے [illegible]
بانگ دعوے کرنے والے "پیشہ [illegible]
ہیں کسی نقاد نے ان کے ادب[illegible]
نہیں کرایا۔ اور نہ یہ اس [illegible]
تعارف آپ ہیں، یہ خو[illegible]
ہیں، اور ان کے [illegible]
اپنا زمانہ آپ بنا[illegible]

ان کے سب میں ظاہری چمک دمک نہیں ہے لیکن پائدار
اور زندگی کی صحت مند قدروں کی حلاوت موجود ہے۔
منزل کے راہی مروجہ راستوں کے نقوش مٹاتے ہوئے آگے
بڑھے ہیں۔ اِن کے قدموں کے نشانوں سے تاریخ کے نئے
اُبھریں گے، اور زندگی کے نئے سوتے پھوٹ بہیں گے۔
وقت بھی آئے گا کہ ان کی اصول پسندی اور سچائی زندگی
ن کو سجا دے گی، اور باطنی حقیقت کے ساتھ ساتھ ظاہری
نکھر آئے گی۔ ہم اپنے اِن ساتھیوں سے اور آگے بڑھنے
اپنے ادب و خیال کو اور زیادہ نکھارنے کی درخواست کرینگے
طرح اُن کے تصورات روشن اور مقاصد چکدار ہیں، اسی طرح
ن کے الفاظ اور خارجی لبادہ بھی جگمگاتا ہوا ہونا چاہیئے۔ روشنی
داعیو! تاریکیوں کو مٹاؤ اور اُجالے اُچھالتے ہوئے آگے
ھو۔ پھر فن اور تکنیک اپنے آپ تمہارے قدم چومیں گے۔

ہم اپنے نقادوں اور سخن فہموں کو بھی اس طرف متوجہ
یں گے کہ وہ اِن نو آموز لکھنے والوں کا ہاتھ بٹائیں، اور تنقید
فریضہ انجام دے کر اُن کی صحیح رہنمائی کریں۔ ہمارے نزدیک عام
ادب پسندوں کی طرح لکھنے والے کی اپنی شخصیت [illegible]
نہیں رکھتی۔ ہم شخصیت کو کردار، عمل اور مقصد سے لگاؤ کے آئینے میں
دیکھتے ہیں۔ نقادانِ فن کا فرض ہے کہ وہ اپنے نشتروں کو تیز
کریں اور نجس خون نکال دیں۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ادب کا مفہوم محض
افسانہ، غزل اور نظم تک محدود نہیں ہے۔ ہم ادب کو اُس کے وسیع
معنوں میں لیتے ہیں، اور ایک تحقیقی علمی اور اصلاحی کاوش کو جو
زندگی کے حقائق کی صحیح ترجمانی کرے ادب شمار کرتے ہیں۔ ہمارے
نزدیک ادب آرٹ بھی ہے اور لٹریچر بھی۔ اس لئے ہمارے لکھنے
والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں باتوں کا خیال رکھیں
اپنے موقلم سے جو نقش بنائیں اُس میں فنی نزاکت اور باریک بینی بھی
ہو اور زندگی، ماحول اور عمل کے لئے سازگاری بھی۔ سماج کے ناسور
کو صرف کرید کر چھوڑ دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُن پر پھاہے رکھنے
یا کم از کم پھاہے رکھنے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔
کہ ہمارے فن کار ان امور کا خیال رکھیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

نقشِ اوّل

"معیار" کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آغاز کار کے اِس مرحلے میں قدم رکھنے سے پہلے ہمیں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا اور راستے کے وہ کونسے موڑ تھے جو ہمارے استقلال کو بار بار آزمائش میں ڈالتے رہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جس کی ورق گردانی کے لئے لاحاصل ہے۔ ب اتنا سمجھ لیجئے کہ خدا کو منظور تھا کہ یہ کام ہو وہ ہوگیا۔ اب "معیار" آپ کا ہے اور آپ جس طرح چاہیں اسے پ,وان چڑھانے میں مدد دے سکتے ہیں۔

اس ماہنامہ کے اجرا سے ہمارے مقاصد یہ ہیں کہ ہم موجودہ ادب پر چھائے ہوئے الحاد، فحاشی اور عریانی کو ختم کریں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں پر ایک صالح اور پاکیزہ ادب کی تشکیل کریں، ہم سماج کو اُس تباہی کے راستے پر بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں، جو صدیوں سے انسانی شرافت اور اخلاق کا خون کر رہا ہے۔ ہم انسانی تہذیب سے اِس خون خرابے کو ختم کرا دینے کے خواہشمند ہیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان کالے، گورے اونچے نیچے اور حاکم و محکوم کی تمیز مٹ جائے۔ پوری انسانی برادری ایک قانون اور ایک اصول کو اپنے لئے بالاتر تسلیم کرلے۔ اُس کے بعد اِس قانونِ حیات میں کسی مقتدر گروہ کی اغراض کے تحت کوئی تبدیلی نہ ہو ——— سارے انسان صرف اس برتر ضابطے کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں۔ ہم خیالی نیکیوں اور خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنے ہوئے ناقابلِ عمل نظریات کے قائل نہیں ہیں۔ ہم کسی اونچی سے اونچی فلسفیانہ بات کو محض کسی اونچے آدمی کی ذات سے تعلق کی بناء پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم ہر بات کو عمل اور نتائج کی کسوٹی

پر پرکھیں گے۔ اصولِ فطرت اور عقلِ سلیم کے معیار پر جانچیں
اُس کے بعد اگر وہ زندگی کے لئے کارآمد ثابت ہو تو اُ
اپنائیں گے۔ ہم نظریات کے جگنوؤں اور توہمات کے تتلیٖ
کے پیچھے دوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم ایسے ارتقا
قائل نہیں ہیں جو انسانیت کو پیچھے کی طرف دھکیلتا ہو۔ ہم ط
اصطلاحات اور بڑی بڑی لغات کے پیچھے چلنا نہیں چا
زندگی کے سلبی مقاصد (Negative Aims
ہمارے لئے منزل کے چراغ نہیں ہیں۔ ہم صرف ایجابی اصو
کے قائل ہیں، اور اُسی کی طرف دنیا کو لیجانا چاہتے ہیں۔ ہمار
کے لئے اپنے وقت کا مہذب ترین طریقہ، مہذب ترین زبا
اور مہذب ترین ادب پیش کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اگر آپ
راست پسند ہو تو آپ بخوشی اس راہ پر چل سکتے ہیں! ورہمارا ساتھ دیجئے
"معیار" کے اس شمارے اور آئندہ شماروں میں بیادِ ایسے لکھ
کے نام ملیں گے جن سے دنیائے ادب ناآشنا
بالکل نئے ہیں۔ ان کے مقاصد مختلف
ہے۔ اس لئے نہ تو "فلمی پریوں" کے
بانگ دعوے کرنے والے "پیشہ
ہیں۔ کسی نقاد نے ان کے ادب
نہیں کرایا۔ اور نہ یہ اس با
تعارف آپ ہیں۔ یہ خو
ہیں، اور ان کے
اپنا زمانہ آپ بنا

ان کے ادب میں ظاہری چمک دمک نہیں ہے۔ لیکن پائیدار
اور زندگی کی صحت مند قدروں کی حلاوت موجود ہے۔
منزل کے راہی مروجہ راستوں کے نقوش مٹاتے ہوئے آگے
بڑھ رہے ہیں۔ ان کے قدموں کے نشانوں سے تاریخ کے نئے
ابھریں گے، اور زندگی کے نئے سوتے پھوٹ بہیں گے۔
وقت بھی آئے گا کہ ان کی اصول پسندی اور سچائی زندگی
کو سجا دے گی، اور باطنی حقیقت کے ساتھ ساتھ ظاہری
بھی نکھر آئے گی۔ ہم اپنے ان ساتھیوں سے اور آگے بڑھنے
اپنے ادب و خیال کو اور زیادہ نکھارنے کی درخواست کرینگے،
جس طرح اُن کے تصورات روشن اور مقاصد چمکدار ہیں، اسی طرح
ان کے الفاظ اور خارجی لبادہ بھی جگمگاتا ہوا ہونا چاہیئے۔ روشنی
کے داعیو! تاریکیوں کو مٹاؤ اور اُجالے اُچھالتے ہوئے آگے
بڑھو۔ پھر فن اور تکنیک اپنے آپ تمہارے قدم چومیں گے۔
ہم اپنے نقادوں اور سخن فہموں کو بھی اس طرف متوجہ
کریں گے کہ وہ اِن نو آموز لکھنے والوں کا ہاتھ بٹائیں، اور تنقید
کا فریضہ انجام دے کر اُن کی صحیح رہنمائی کریں۔ ہمارے نزدیک عام
ادب پسندوں کی طرح لکھنے والے کی اپنی شخصیت کوئی اہمیت
نہیں رکھتی۔ ہم شخصیت کو کردار، عمل اور مقصد سے لگاؤ کے تحت ہی
دیکھتے ہیں۔ نقادانِ فن کا فرض ہے کہ وہ اپنے نشتروں کو تیز
کریں اور گندہ خون نکال دیں۔
ایک اور بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ادب کا مفہوم محض
افسانہ، غزل اور نظم تک محدود نہیں ہے۔ ہم ادب کو اس کے وسیع
معنوں میں لیتے ہیں، اور ایک تحقیقی علمی اور اصلاحی کاوش کو جو
زندگی کے حقائق کی صحیح ترجمانی کرے ادب شمار کرتے ہیں۔ ہمارے
نزدیک ادب "آرٹ" بھی ہے اور "لٹریچر" بھی۔ اس لئے ہمارے لکھنے
والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں باتوں کا خیال رکھیں
اپنے موقلم سے جو نقش بنائیں اُس میں فنی نزاکت اور باریک بینی بھی
ہو اور زندگی، ماحول اور عمل کے لئے سازگاری بھی۔ سماج کے زخم
کو صرف کرید کر چھوڑ دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُن پر پھاہے رکھنے
یا کم از کم پھاہے رکھنے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔
کہ ہمارے فن کار ان امور کا خیال رکھیں گے۔

تجربے کے بعد

پاکستان کے خری

اخلاقی انقلاب اور بھارت

ہندوستانی سماج میں اس وقت جو برائیاں پرورش پا رہی ہیں، ان کو مٹانے کے لئے ایک زبردست اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہے اگر ہم نے اس انقلاب کے لئے کوشش نہیں کی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے پستول کی گولی اپنی کنپٹی پر چلا دی ہے، ہماری یہ دانستہ گمراہی ہماری قومی خودکشی کا باعث ہوگی، جو آنے والے دور میں انسانی تاریخ کا ایک گزرا ہوا باب بن جائے گی۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے، کہ سماج کے مختلف شعبوں میں جو طریقے رائج ہیں، وہ پنپنے والے نہیں ہیں، ہماری سیاسی زندگی، ہماری گھریلو زندگی اور ہمارے آپس کے تعلقات اور معاملات میں خودغرضی جاہ طلبی، دھوکے بازی، ناجائز نفع اندوزی، اقربا پروری، تنگ نظری اور مادہ پرستی کے گھناؤنے اصول رائج ہیں، ہمارے خاندانوں کا نظام درہم برہم ہے، ہمارے بازاروں میں لوٹ ہے۔ ہمارے سیاسی بیانات فارموں پر ہنگامے ہیں۔ اور جنگلوں میں چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنے مسکن بنا لئے ہیں، مہلک نظریات کے تیروں نے سماج کے جسم کو جگہ جگہ سے چھلنی کر دیا ہے، اس کے کپڑے پھٹ چکے ہیں، پیٹ اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں، سر گنجا ہے، ناخن بڑھ گئے ہیں سینے سے خون جاری ہے، اور ہونٹوں پر چھالے پڑے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک پتھریلے اور ناہموار راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہے۔ اس نعیلی خیالوں والے راستے پر چلتے چلتے جب اسے کوئی ٹھوکر لگتی ہے، تو وہ زور سے چیخ مارتا ہے، لیکن اس چیخ کے جواب میں موجودہ دور کے تمام غیر اخلاقی ضابطے زوردار قہقہہ لگاتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے (Iron cuts Iron) کبھی کبھی بعض سمجھدار حضرات کے پیٹ میں ہمدردی کا درد اٹھتا ہے، تو وہ جلدی جلدی اسی قسم کے نظریات کی اجوائن خود بھی پھانکتے ہیں اور دوسروں کو بھی پھانکنے کا مشورہ دیتے ہیں، جن پر چل کر دنیا تباہ ہو رہی ہے یہ لوگ علانیہ دیکھتے ہیں، کہ خارجی اصلاح کے موجودہ غیر اخلاقی ضابطے فیل ہو رہے ہیں، مادی طاقت، فوج، پولیس اور ایٹم بم کی موجودگی بھی برائیوں کا قلع قمع نہیں کر سکتی۔ دنیا کے ہر گوشے میں بیرونی اصلاح کے قاعدوں کو زبردست ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی انہیں پر کاربند ہیں، اور دوسروں کو بھی انہی پر چلنے کا مشورہ دے رہے ہیں

ایک عام نقطۂ نظر یہ ہے، کہ قوم پرستانہ اور وطن پرستی کے جذبہ کو ابھار کر ان اخلاقی برائیوں کو دور کیا جا سکتا ہے، جو افرادِ قوم کے اندر پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس طرزِ فکر کی خامی اب پوری طرح آشکارا ہو چکی ہے، قوم پرستانہ جنون سے یہ تو ہوتا ہے، کہ وقتی طور پر لوگوں میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی، ایثار اور قربانی کے جذبات ابھر کر ذہنوں میں بڑی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں، لیکن اس تغیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ برائیوں کی شکل بدل جانے سے انسانی اخلاق بھی بدل جاتا ہے، پہلے اگر آدمی اپنے ہی ہم قوم افراد کو دھوکا اور فریب دیا کرتا تھا اور انہیں کو اپنے ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا کرتا تھا تو اب ان جذبات کا سیلاب دوسری قوم کے افراد کی طرف پلٹ جاتا ہے، ذاتی مفاد اور خودغرضی کے جذبات قومی مفاد اور قومی خودغرضی میں بدل جاتے ہیں اور ایک شخص اپنی قوم کی تعریف کرنے لگتا ہے کہ اس میں اس کی ذات کا بھی فائدہ ہے چنانچہ جب تک کوئی مخالف گروہ دشمن کی حیثیت سے سامنے رہتا ہے ایک قوم کے افراد میں دوستی اور مروت کا دور دورہ رہتا ہے، لیکن جب وقت مشترکہ دشمن سامنے سے ہٹ جاتا ہے۔ اس سیلاب کا رخ دوسری

انہوں کی طرف پھر جاتا ہے، اور آپس کی شیرازہ بندی کو پھر ایک بار بکھیر کر رکھ دیتا ہے، اس لئے قوم پرستی کی بنیاد پر جو اخلاق ابھرتا ہے وہ اول تو افراد قوم میں سے برائی کو نیست و نابود نہیں کر سکتا، بلکہ اس کا رُخ بدل دیتا ہے، دوسرے اس اخلاق کی عمر بہت تھوڑی ہے، یعنے جونہی قومی خطرہ دُور ہوا، عوام کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے، چنانچہ قومی رہنما اندیشے کو بھانپ کر ہر وقت کسی نہ کسی "مشترک دشمن" کی تاک میں لگے رہتے ہیں، اور ہر لمحہ اپنی قوم کو دوسری قوموں اور ملکوں کے خلاف گرم کرتے رہتے ہیں۔

اس خطرناک کھیل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ داخلی خطرے تو ٹل جاتے ہیں، لیکن اُن کی جگہ بیرونی و خارجی خطرے دن بدن بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ کی نوبت آجاتی ہے، اور جو لوٹ کھسوٹ مار دھاڑ اور عزت ریزی ایک قوم کے اندر ہوتی تھی، وہ بین الاقوامی جنگ کے پیمانے پر ہونے لگتی ہے، جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم ثانی انہیں منحوس نظریات کے پیدا کردہ شاخسانے تھے، ان کے ذریعہ انسانی اخلاق اور عزت و آبرو کا اس سے ہزار ہا گنا زیادہ نقصان ہوا جتنا ایک ملک کے داخلی فتنوں میں ہو سکتا تھا۔

کس قدر اچھا ہو اگر ہم اپنی قوم کے افراد کو قوم پرستی کے جذبات میں سرشار کرنے اور انہیں دوسروں کے خلاف اکسا کر متحد کرنے کے بجائے ان میں برائیوں سے لڑنے کا جذبہ پیدا کر دیں اور ان اچھائیوں کے پلیٹ فارم پر جمع کر دیں، اگر ہمارا سماجی اخلاق کسی ایجابی مقصد (Positive Aim) کے ذریعہ درست نہیں ہو سکتا، اور ہم اس کے لئے سلبی طریقہ کار ہی اختیار کرنے پر مجبور ہیں، تو بہتر یہ ہے، کہ اپنی قوم کو کسی دوسرے انسانی گروہ کے خلاف ابھارنے کے بجائے خود اپنے نفس کے خلاف اُبھارا جائے اور اچھائی کے پیکر کو اس کے بغل میں لیٹے ہوئے سینے اور گندہ دماغ کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔

مختصر میں اگر کوئی چاہتے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم اسکو ایک برائی [illegible] برائی میں مبتلا کر دیں، بھلائی چاہنے اور بھلائی [illegible] ڈھنگ یہ ہے کہ اسے ہر قسم کی برائی سے روکا جائے، اور ایک بلند مقصد کے تحت با اخلاق زندگی گذارنے کی دعوت دی جائے۔ اگر ہندوستانی سماج کی اصلاح مقصود ہے تو برائیوں کے لاوے کو عارضی طور پر دبا دینے یا اس کا رُخ پلٹ دینے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اس مادے ہی کو خارج کر دینا چاہئے، اس گندہ اور نجس مادے سے ہمدردی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، جو لوگ دانستہ یا نادانستہ موجودہ اخلاقی خرابیوں کو برداشت کر رہے ہیں، وہ ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں، چاہے وہ اپنی [illegible] میں خود کو کتنا ہی بڑا ہمدرد قوم اور دیش سیوک ہی کیوں نہ [illegible] ہوں۔

اشتراکی دوستوں کی رائے قوم پرستوں کی رائے سے ذرا مختلف ہے، یہ حضرات انسانی کردار کی خامیوں کا واحد سبب بھوکے پیٹ اور ننگے جسم کو سمجھتے ہیں، اس لئے ان کا خیال یہ ہے کہ اگر پیٹ کا خلا پر ہو گیا ہو اور جسم کا ننگا پن دور ہو جائے تو آپ سے آپ کردار بلند ہو جاتا ہے، آدمی با اخلاق اور ہمدرد بن جاتا ہے، مگر جس طرح قوم پرستانہ جنون نے انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا، اسی طرح اشتراکی فلسفہ اخلاق بھی انسانی بداعمالیوں، شرارتوں، اور خرمستیوں کو دور نہیں کر سکتا۔ اگر پیٹ بھر روٹی کھانے والا اور تن پر اچھا کپڑا پہننے والا پاکباز ہو سکتا ہے، تو پھر سرمایہ دار کو سب سے زیادہ با اخلاق اور پاکباز ہونا چاہئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی برائیاں ایک ننگے اور بھوکے میں ہیں اتنی ہی یا اتنی ہی برائیاں ایک پیٹ بھرے اور خوش پوش میں بھی ہیں، اگر وہ ناجائز لوٹ کھسوٹ کا قائل ہے، تو یہ بھی اس کا قائل ہے، اگر وہ عیاشی اور آبرو ریزی پر تلا ہوا ہے، تو یہ بھی مہذب طریقے پر وہی کام کرتا ہے، اگر وہ قتل و غارت سے نہیں چوکتا، تو یہ بھی قتل و غارت کے ساتھ تعاون کرتا ہے، آخر کونسی ایسی خصوصیت ہے جو بے زر میں ہے، اور زردار میں نہیں ہے، یا زردار میں ہے اور بے زر میں نہیں ہے۔ اس لئے جو لوگ معاشی خوشحالی یا معاشی بدحالی کے ساتھ اخلاق کا دامن باندھتے ہیں وہ سخت غلطی

میں مبتلا ہیں، انہوں نے ایک فلسفہ کو جو غلط مشاہدے اور غلط تجربہ کی بنیاد پر نہایت تنگ نظری سے گھڑا گیا تھا آنکھیں بند کرکے قبول کر لیا ہے، اور ہر چیز کو اسی رنگین عینک سے دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ "یہ رنگ" واقعات کے خلاف ہے، حقیقت تو صرف اس قدر ہے کہ کچھ اچھے لوگ سرمایہ داروں میں ہیں تو کچھ اچھے لوگ ناداروں میں بھی، اور بُرے لوگ سرمایہ داروں میں ہیں، تو کچھ بُرے اُدھر بھی ہیں، بہرحال سرمایہ کی کمی اور زیادتی کے ساتھ اخلاق اور اعلیٰ کردار کو وابستہ کرنا انسان کے سماجی مسائل کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اگر اس طرح کے غلط نظریات اور معتقدات (Doctrines) پر چل کر اشتراکی حضرات اس ملک میں کوئی انقلاب لے آئیں، تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، کہ جو کچھ اُن کے ذہن میں تھا، وہ تجربہ کی کسوٹی پر لگنے کے بعد اُس کا کھرا اور کھوٹا آپ سے آپ نمایاں ہو چکا ہے۔

اشتراکی حضرات کا ایک خیال [illegible] ہے کہ جب وسائلِ دولت حکومت کے قبضہ میں آ جائیں گے اور سارا اقتدار اور پیداواری قوتیں ایک جگہ سمٹ جائیں گی، تو پھر جو لوگ حکومت کی مسند پر بیٹھیں گے وہ اپنے ہمہ گیر قانون کے ذریعہ ایک ایک غنڈے اور بدمعاش کا دماغ ٹھیک کر دیں گے، لیکن اگر کچھ دیر کے لئے اس "طریقہ علاج" کو [illegible] کر لیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ جو لوگ خود حکومت کی کرسیوں پر بیٹھیں گے [illegible] کی [illegible] کر چلائیں گے اور [illegible] کر [illegible] آخر ان میں بدکرداریاں اور [illegible] کی [illegible] کیا آج کے رشوت خور [illegible] اور [illegible] اشتراکی نظام میں رشوت لینا چھوڑ دیں گے، چاہے اُنکی [illegible] تنخواہ سے پوری ہی کیوں نہ ہو جاتی ہوں، لیکن رشوت لینے [illegible] کی [illegible] اشتراکی [illegible] ہو گئے۔!!

[illegible] دار انفرادی ملکیت [illegible] رکھتا ہے، اس لئے بلیک مارکیٹنگ [illegible] لیکن اشتراکی ریاست [illegible] ختم ہو جائے گی [illegible] حکومت کے [illegible] موجود ہیں [illegible]

کمل بھی رہیں گے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو لیجئے، جو حکومت کی سب سے اونچی کرسیوں پر بیٹھیں گے، آخر ان کے پاس کونسا ضابطۂ اخلاق ہوگا جس کی وہ پابندی کریں گے، اور کیا گارنٹی ہے کہ انکے اعمال حدِ جائز سے تجاوز نہیں کر سکیں گے، جبکہ وہ بھی انسان ہیں اپنے عزیز و اقارب سے ان کو بھی اسی طرح ہمدردی ہوگی، جس طرح ان کے عہدیداروں کو ہے تو پھر وہ کونسا قانون ہوگا جو ان انسانی خداؤں کی نگرانی کر سکے گا، اور بڑائی کے تمام اختیارات رکھتے ہوئے بھی اکڑ بازی سے بچا سکے گا، یقین جانئے اشتراکی نظام میں جب ان ناخداؤں کی طرف سے کوئی برائی پھیلے گی، تو اس شدت اور زور کے ساتھ پھیلے گی، کہ ملک کے عوام میں سے اس کے خلاف کوئی شخص اونی سی آواز تک بلند نہیں کر سکے گا، اور اگر کسی نے ناک بھوں چڑھانے کی غلطی کی، تو اس کی ناک بھوں ہمیشہ کے لئے منجمد کر کے رکھ دی جائے گی۔!

ایک اور بات یہ ہے کہ موجودہ دور کے ان مادہ پرستانہ اور دنیاداری کے نظریات کو جو اس وقت تمام حکمران انتظامات کی بنیاد ہیں، اشتراکی نظام میں بھی اُسی طرح رکھا جائے گا، اور انہی پر اشتراکی انقلاب پروان چڑھے گا تو پھر یہ کس قدر لغو اور مہمل بات ہے، کہ انسانی عقائد و افکار اور کائنات میں انسانی زندگی کے مقام کے موجودہ تصور کو نہ بدلتے ہوئے صرف سطحی تبدیلی کر کے یہ دعویٰ کیا جائے کہ "ہم ایک ہمہ گیر انقلاب لا رہے ہیں۔ ہم انسانوں کی بداخلاقیوں کو دور کر دیں گے، اور ہم زندگی کی موجودہ قدروں کو مٹا کر نئی قدروں کو جاری کر دیں گے"، یہ ہڑبونگ اور یہ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے سب جھوٹے ہیں، ان تمام دعووں کے باوجود ان لوگوں نے سرمایہ داری اور سامراجی نظام سے گہری ساز باز کر رکھی ہے ان کی ساری جدوجہد ایک طرح کی جماعتی سیاست (Party Politics) ہے جس کا منشا اس [illegible] اور کچھ نہیں معلوم ہوتا، کہ جن شخصیتوں کے ہاتھ میں اس وقت [illegible] ہے، اُن کو ہٹا دیا جائے، اور ان کے بجائے کچھ اور شخصیتوں کو گدی پر بٹھا دیا جائے، حالانکہ محض شخصیتوں [illegible] (Transfer) سے سماجی [illegible] اگر ایک انسان کے بجائے دوسرا انسان عوام کا [illegible]

[illegible] کونسا بنیادی تغیر ہو جاتا ہے ـــــــــ ؟

اگر زندگی کی قدریں وہی رہیں، جو پہلے تھیں، اور نظام کائنات میں انسانی پوزیشن وہی رہے، جو پہلے تھا، تو پھر اس عدم تغیر کے باوجود یہ سمجھ لینا کہ کسی سطحی تبدیلی سے انسانی کردار اور اعمال میں ایک زبردست فرق آجائے گا، نہایت افسوسناک غلطی اور سوچی سمجھی ہوئی حماقت ہے

جو لوگ ملک میں اشتراکی انقلاب لانا چاہتے ہیں، چاہے وہ کمیونزم کے قائل ہوں، یا ارتقائی سوشلزم کے، انہیں اچھی طرح سوچ لینا چاہئے، کہ جس انقلاب کے لئے وہ اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں، اس کے آجانے کے بعد انہیں کونسا قیمتی پھل ملنے والا ہے۔ اگر اس ساری تگ و دو کے بعد حاصل صرف ایک کڑوا اور کسیلا پھل ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس پھل کا درخت لگانے سے پہلے ہی اس کے بیج کو جلا دیا جائے، ورنہ جو جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا ـــــ !

قوم پرستوں اور اشتراکیوں کے علاوہ اس وقت ایک گروہ عظیم ایسا ہے، جو مذہبی انقلاب کا نعرہ لگا رہا ہے، اور اس کا کہنا یہ ہے کہ ان تمام خرابیوں کا علاج ایک مذہبی نظام حکومت ہے، اس کے بغیر کسی برائی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ خیال نہایت معقول نظر آتا ہے، لیکن بدقسمتی سے جو مذہبی تصور اس وقت عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے، وہ سچی اور اصلی مذہبیت سے کوسوں دور ہے۔ اس لئے اس کی کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف "لا مذہبیت" اور "قوم پرستی" کا نام بدل جائے گا، اور کام وہی ہوگا، جو یہ تحریکات کر رہی ہیں ـــ

موجودہ مذہبیت اور خدا پرستی کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان اپنی نجی زندگی (Private Life) میں خدا کو مانے اس کی پوجا کرے۔ اس کے آگے ہاتھ باندھے، جھکے اور سجدہ میں گر لیٹ جائے، وہ مندر اور مسجد میں جتنی بار چاہے، اس کے نام کی مالا جپے۔ لیکن ان عبادت گاہوں کے باہر "خدا پرستی" بالکل بیکار ہے، خدا کا اعتقاد صرف گھر کی چار دیواری تک محدود ہے، وہ سیاست، معیشت اور حکومت کے معاملات کو نہیں سلجھا سکتا، ان تمام امور میں ایک [illegible] مذہبی آدمی کو بھی وہی سب کچھ کرنا چاہئے، جو ایک عام [illegible] لا مذہب، مادہ پرست اور مشرک کا رد عمل ہو سکتا ہے ـــ

تصور مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کو قبول کرنے کے بعد بھی سماجی مسائل کی گاڑی اسی طرح چلتی ہے، جس طرح لا مذہبیت اور مادیت کے تحت چل رہی ہے۔ اس قسم کی جھوٹی مذہبیت کو مان کر اپنے آپ کو اور اپنے خدا کو دھوکا اور فریب دینے سے آخر حاصل کیا ہے؟

ان مذہب پرستوں کے پاس اپنے عقائد اور نظریات کو راستی اور علمی طریقے پر پھیلانے کا بھی کوئی اصول نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اصولوں میں ہم آہنگی اور ربط نہیں ہے، ان کے مذہبی اصولوں پر عملی زندگی میں کوئی سچا نمونہ پیش کرنے والی سوسائٹی بھی نہیں ہے، بلکہ یہ سوسائٹی اس وقت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے وہ ایک شکستہ اور کٹی پھٹی سوسائٹی ہے، جس کے اندرونی اختلافات کا دار و مدار خود انہیں لا یعنی مسلمات پر ہے، جن کا نام لیا جا رہا ہے، چنانچہ مذہبی نظریات پر زور دینے کے معنی سماج میں اور پھوٹ ڈالنے کے ہیں، لہٰذا اپنے گروہ کو کامیاب بنانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک طرف دوسرے مذہبی اصولوں پر خوب تنقید کی جائے، اور دوسری طرف اپنے مذہب کے اندھے پیروؤں کو دیگر مذاہب کے نام لیواؤں کے خلاف بھڑکایا جائے، تاکہ اس مخالفانہ جذبہ کے تحت ان کی سوسائٹی میں داخلی اتحاد (Internal Unity) پیدا ہو، اور اس کے مختلف عناصر بکھرنے سے بچ جائیں

ایک سمجھدار آدمی اس صورت حال سے اندازہ لگا سکتا ہے، کہ اس طرح کا مذہبی انقلاب چاہنے والوں اور قوم پرستوں، مادہ پرستوں اور اکثریتی راج کے ماننے والوں میں آخر کیا فرق ہو سکتا ہے؟ بہت ممکن ہے اصطلاحات اور طریقہ کار میں تھوڑا بہت فرق ہو، لیکن آخر کار جو نتیجہ سامنے آتا ہے، وہ دونوں صورتوں میں قطعاً ایک ہے۔

اس قسم کے مذہبی انقلاب کے بعد یہ تو [illegible] دیکھنا کہ ہندوستانی سماج کی موجودہ اخلاقی بنیادیں بدل جائیں گی، اور نئی بنیادوں پر نئی سوسائٹی بننے لگے گی، ایک محض خام خیالی ہے۔ بہت ممکن ہے، آدمی بہ طرح کی باتیں کر کے اپنا جامہ بدل لے [illegible] رنگوں کو دھوکا دے لیکن وہ اس سے خدا اور اس کے [illegible] کو دھوکا نہیں دے سکتا جس [illegible] سے کچھ [illegible] ــــ

اگر اس دیش کے بسنے والے سچے دل سے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ موجودہ اخلاقی بنیادوں کو بدلا جائے اور ایک زبردست اخلاقی انقلاب پیدا کیا جائے، تو پھر انہیں اُن تمام نظریات اور اصولوں کو خیرباد کہنا پڑے گا، جو اس وقت رائج ہیں، کیونکہ ظاہر ہے، جب یہ نظریات چل رہے ہیں، تو جس قسم کی اخلاقی بیماریاں پھیل رہی ہیں، وہ سب انہیں کا نتیجہ ہیں۔ [illegible] واقعی دشمنی ہے اور اچھائیوں سے پریم ہے، تو کوشش [illegible] برائی کی ان جڑوں پر کلہاڑی چلائیں [illegible] ایک شخص کو اپنے معتقدات [illegible] بڑا دکھ ہوتا ہے، وہ ان کے [illegible] اپنے کھوٹے وقار کی خاطر اپنی بات کو [illegible] ان کے ساتھ چپکا رہتا ہے، لیکن اس طرز فکر کا [illegible] بلکہ تنہا اس کی ذات کو برداشت کرنا [illegible] ذہن میں پالنا ایسا ہی ہے، جیسا [illegible] پرورش کرنا۔ یہ سنپولیا بڑا ہو کر یقیناً [illegible] زندگی دو بھر ہو جائے گی، اس لئے بہتر [illegible] پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔ [illegible] جسم و جان یہ [illegible] بلکہ ان کے ساتھ اندھی عقیدت رکھنا [illegible] کیونکہ دنیا ایک [illegible] کا سیلاب ہے [illegible] ہوتا ہے، اور ان معتقدات [illegible] خیز ہو سکتے ہیں، اس تبدیلی [illegible] اصولوں کو اختیار کر لے سکتے [illegible] ہی سے۔

پھر ہندوستان کے موجودہ حالات میں [illegible] پرستی [illegible] مذہبی اصولوں کے ماننے والوں کو ان کے نقصان سے واقف ہو جانے کے بعد انہیں ترک کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں [illegible] ان کے سامنے ہم [illegible] خدا پرستی، انسان دوستی اور آخرت میں خدا کے سامنے جوابدہی کے سچے اسلامی اور انقلابی اصول پیش کرتے ہیں، ہم اپنے ملک کے سوچنے والوں کو دعوت دیتے ہیں کہ

[illegible]

جن نظریات پر تم اب تک چلتے رہے ہو، ان کا کھرا اور کھوٹا تمہارے سامنے ہے، اس لئے اب ان نئے اصولوں پر انسانی سماج کو بنانے کی فکر کرو!

جس زمانہ اور جس ملک میں بھی خدا کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں کے ذریعہ ان اصولوں کا پرچار ہوا ہے۔ وہاں ان کی بنیاد پر ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی انقلاب برپا ہوا ہے، اس لئے آج بھی اگر ہم خدا کو صرف اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ اُسے اپنے حاکم اور قانون ساز (Sovereign [illegible]) کی حیثیت سے مان لیں، آج بھی ہم ایک عالمگیر برادری کا تخیل لے کر اٹھیں، اور ایک خدا کے پیدا کئے ہوئے تمام انسانوں کو ایک ہو جانے اور ایک ہی ضابطہ حیات کو جو ان کے بنانے والے نے بنا کر بھیجا ہے، تسلیم کر لینے کی دعوت دیں، اور آج بھی ہم اپنے نفع و نقصان کو دنیوی زندگی کی حد تک محدود سمجھنے کے بجائے اس سلسلے کو موت کے بعد آنے والی زندگی تک بڑھا دیں۔ اور اس دائمی زندگی کے فلاح یا نقصان کو [illegible] نظر رکھ کر کام کریں، تو جو اخلاقی خرابیاں اس وقت سماج میں موجود ہیں [illegible] وہ اسی انقلاب انگیز تصور کے تیزاب سے [illegible] موجودہ حکومتوں کے خارجی اصلاح کے ضابطے اور قوانین دور نہیں کر سکتے، ان کو یقیناً انسان کے پیدا کرنے والے خدا کی حکومت کا قانون دور کر سکتا ہے، کیونکہ انسانی قانون جسم پر حکومت کرتا ہے، اور خدا کا قانون جسم اور دل دونوں پر حکومت کرتا ہے، ہم اگر موجودہ سیاسی زندگی سے اقتدار پرستی، معاشی زندگی سے اونچ نیچ، معاشرتی زندگی سے خود غرضی اور کاروبار اور معاملات سے دھوکہ بازی اور ناانصافی کو ختم کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں خدا کو صرف مسجد اور مندر کا خدا ماننے کے بجائے پوری زندگی کا خدا ماننا پڑے گا، اس کے تمام پیغمبروں پر اس کے بھیجے ہوئے قانون کو چلانا ہوگا، اور موت کے بعد اپنے اعمال کے کاغذات اس کے سامنے پیش کرنے میں اخلاص رکھنا ہوگا۔ اس اصول اور بنیاد کو اختیار کئے بغیر کسی قسم کے اصلاحی سفر پر لگانا فضول ہے، محض [illegible] کوئی اخلاقی انقلاب ہو سکتا ہے اور اس انقلاب سے موجودہ خرابیوں کا علاج ممکن ہے، اگر دنیا نے کھوٹے سکوں کی کھوکھلی آواز کے باوجود محض ان کی خوبصورتی کو دیکھ کر انہیں اصل سمجھ لیا ہے تو بہت جلد بازار عالم میں ایسے کھوٹے سکوں کی قیمت کا اندازہ ہو جائے گا!

از: سید خورشید علی

ایٹمی طاقت کا راز!

ایٹم بم کا نام اس زمانہ میں شاید ہی کوئی ہو جس نے نہ سنا ہو، جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپانی شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر صرف ایک ایک ایٹم بم گرا کر دونوں شہروں کو مع مضافات تودۂ خاک بنا دیا۔ لاکھوں انسانوں اور حیوانوں کی جانیں تلف کیں، اور کروڑوں روپیہ کی جائیداد تباہ و برباد کر دی، دنیا اس ہولناک اور تباہ کن جوہری طاقت کے مظاہرے سے انگشت بدنداں ہو گئی، سب سے پہلے امریکہ ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کو اس وقت تک پردۂ راز میں رکھا گیا جب تک اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئی نتیجہ یہ نکلا کہ اس قیامت خیز تباہی سے اپنے چھوٹے سے جزیرہ کو بچانے کے لئے جاپانیوں نے فوراً ہتھیار ڈال دئیے۔ اگر ایسے دس پانچ بم اور گرا دئیے جاتے تو آج جزیرۂ جاپان سمندر کی سطح پر شاید ہی نظر آتا۔ اس خطرناک واقعہ کے بعد دوسری حکومتوں کو بھی فکر پیدا ہوئی، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ایٹم بم کے بغیر اپنے آپ کو کمزور سمجھ رہی تھی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ روس نے بھی ایٹم بم تیار کر لیا ہے، اس خبر سے بڑی بڑی طاقتوں میں کھلبلی مچ گئی ہے، اور امریکہ اور روس کے درمیان تو خاصی رسہ کشی جاری ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ایٹم بم میں وہ زبردست قوت کیسے پیدا ہوئی جس کو حاصل کرنے کے لئے عظیم ترین مسابقت جاری ہے۔ اس کا جواب خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یعنی "ایٹم" سے۔ اسی بات کا ذکر یہاں مقصود ہے کہ ایٹم کیا ہے، اس کی ساخت کیسی ہے؟ اور خدا نے اس میں کیا قوت بھر دی ہے؟۔

اپنے رب کی پہچان کا ذریعہ!

ایٹم بم کی ساخت کا تجزیہ کرنے سے پیشتر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہاں "روح" سے کوئی بحث نہیں ہے، کیونکہ یہ امر ربی مادہ سے ماوراء اور ہمارے دائرہ ادراک سے باہر ہے، اس لئے ہم صرف مادہ ہی کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں، جس کا کسی قدر علم خود خدا نے انسان کو عطا فرمایا ہے، اور جس پر غور و فکر کرنے کی اس نے اپنے کلام پاک میں بار بار ہدایت کی ہے۔ کیونکہ رسالت کے بعد عقل و فہم کے لئے خدا کی پہچان کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ علمی تحقیقات، انکشافات اور ایجادات انسان کو دہریت یا مادیت کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، اور نتیجہ خدا سے بغاوت ہوتا ہے، در اصل "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان" کا مثل مشہور ہی ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے لئے خدائے تعالیٰ نے فرمایا بھی ہے کہ "لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ" - یعنی ان کے دل ایسے ہیں جن سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ بالکل غافل ہیں) مگر یہ مستثنیات میں سے ہیں، اور جزو سے کل پر حکم لگانا قرین انصاف نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوں جوں عجیب و غریب انکشافات اور محیر العقول ایجادات ہوتے جاتے ہیں، دل پر اس کی عظمت اور قدرت کے نقوش زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں، کیونکہ آخر یہ سارے کرشمے قوانین قدرت ہی کے تو ہیں، جن کا مبدا خدا ہے۔ آج کسی بڑے سے بڑے سائنس دان کو اس سے انکار نہیں کہ کائنات جن قوانین میں جکڑی ہوئی ہے، ان کو ایجاد کرنے، جوڑنے اور منضبط کرنے والی کوئی عقل کل رکھنے والی قوت ضرور ہے۔ اور یہی ہمارا اللہ [illegible]

ہم ۹۹ اسماء حسنیٰ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اب ذرا خدا کا فرمان دیکھئے:۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (یعنے یقیناً آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں اور رات دن کے اختلاف میں ان صاحب عقل لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں) ۔ کیا غور کرتے ہیں؟ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (یعنے اے ہمارے خدا۔ یہ سب تو نے بیکار نہیں پیدا کیا)۔ اب ہم ان کو بیکار سمجھ لیں اور ان پر غور و فکر اور علمی تحقیقات نہ کریں۔ تو میرے خیال میں صریح نافرمانی ہے ۔
اس قسم کے صدہا اشارات قرآن کریم میں ملتے ہیں، بلکہ اکثر صاف صاف الفاظ میں غور و فکر کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اگر عالم الغیب والشہادۃ کی ان ہدایات کو ذہن میں رکھ کر تحقیقات کی جائیں تو ہر علمی تحقیق اور ایجاد میں بہت جلد زبردست کامیابی ہوگی ۔ اور تشکر و امتنان کی ایک لہر محقق کے جسم و جان میں دوڑ جائے گی، اس سے لازمی طور پر ان کا ایمان باللہ راسخ اور مستحکم ہوتا چلا جائے گا۔ اسلام کے اولین داعیوں کے دماغ انہی ہدایات سے منور تھے۔ انہوں نے جہالت کی تاریکی کو علم کی مشعل سے دور کیا، نور کے خزانے جمع کئے، اور معلومات کے دریا بہائے، ہماری دنیا سیراب کیا، مغرب والوں نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا، مستفید ہوئے، اور ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے معراجِ کمال پر جا پہنچے، تک اسی بل بوتے پر بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں ۔ ہم بھی اسلام کے نام لیوا ہیں، لیکن ہم نے ان ہدایات پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور ان دل کے کارناموں پر پانی پھیر دیا، نتیجہ یہ ہے، کہ آج ہم اپنے ہی اسلاف کے شاگردوں کے علمی ٹکڑوں کے محتاج، پستی میں پڑے ہیں۔ یا کاسۂ گدائی لئے ان کے سامنے منتظر کھڑے ہیں کہ کوئی ٹکڑا اس میں ڈال دیں۔ وائے بر حالِ ما۔

ترکیبِ مادہ یہ بات سب جانتے ہیں، کہ ساری کائنات کی تعمیر مادہ سے ہوئی ہے ۔ چاند، سورج، ستارے، اور ہماری زمین، ابر و باد و خاک و آب، جاندار اور بے جان، اونچے سے اونچے پہاڑ سے لے کر ریت کے حقیر ترین ذرے تک، اور عظیم الشان سمندر سے لے کر ادنیٰ ترین قطرہ تک، چٹیل میدانوں سے لے کر نظر فریب سبزہ زاروں اور گنجان جنگل و بیابان تک ساری کائنات اور بوقلمونی مادہ کا ہی ظہور ہے ۔ خلاقِ علیم کے مظاہر قدرت سے شبہ ہونے لگتا ہے، کہ مادہ کے اقسام کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے ۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ سائنسدانوں نے تحقیقات اور تجربات سے ثابت کیا ہے، کہ مادہ کی اب تک جو دریافت ہو سکی ہے اس سے صرف ۹۲ قسمیں معلوم ہوئی ہیں ۔ جو عناصر (Elements) کہلاتی ہیں ۔ انہی کی باہمی کیمیائی ترکیب اور طبعی آمیزش سے مختلف النوع مخلوق ظہور پذیر ہوئی ہے ۔ پرانے زمانہ کے حکماء یونان نے ثابت کیا، کہ مادہ کو تقسیم کرتے کرتے آخری حد ایسے جزء تک پہنچتی ہے، کہ جس کی مزید تقسیم محال ہے ۔ یہی "جزء لا یتجزیٰ" مادہ کی پہلی اینٹ یا اکائی ہے ۔ جس کا نام ایٹم یا جوہر پڑ گیا۔ لیکن اس کے آگے تحقیقات نہ بڑھیں ۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جان ڈالٹن (John Dalton) نے پھر اس نظریہ کو تازہ کیا، اور ثابت کیا، کہ مادہ کے سارے ایٹم یا جوہر یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، انیسویں صدی کے آخر تک ۹۰ قسم کے ایٹم دریافت ہو گئے ۔ اور ایک ہی قسم کے ایٹموں سے بنی ہوئی اشیاء کے الگ الگ نام رکھے گئے، جو عموماً عناصر کہلاتے ہیں، مثلاً لوہا، تانبا، سونا، پارہ، آکسیجن، ہائیڈروجن وغیرہ عناصر ہیں، ہر ایک عنصر کے ایٹم جداگانہ ہیں، لیکن ایک ہی عنصر کے سب ایٹم یکساں ہوتے ہیں، ایٹموں کے وزن کی جانچ کرنے پر ایک دوسرے میں اختلاف پایا گیا، سب سے ہلکا ایٹم ہائیڈروجن کا اور سب سے بھاری یورینیم کا ہوتا ہے ۔ چنانچہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے وزن کو اکائی مان کر عناصر کی فہرست ان کے اٹامک ویٹ (Atomic Weight) جوہری وزن کے لحاظ سے تیار کر لی گئی ، اور اس اختلاف کی بنا پر یہ یقین کر لیا گیا کہ ایک عنصر کا دوسرے میں تبدیل کرنا محال ہے ۔ مثلاً تانبا، پارہ وغیرہ سونے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اس نظریہ کی بنا پر ایک گروہ جو لامعلوم زمانہ سے تانبے، سیسے اور پارہ، سونا بنانے کی دھن میں لگا رہتا تھا، اور جس میں بہتوں نے عمریں صرف کر دیں۔ اور بے حد و حساب دولت

عناصر کی، ان کو خبطی قرار دے دیا گیا آج بھی اس دُھن میں لگا ہوا اگر کوئی ملتا ہے، تو اس کا مذاق اڑتا ہے۔

طبعی اختلافات کے متعلق ڈالٹن کے نظریہ کی تائید میں ایسے بدیہی ثبوت ملے، کہ ماہرین سائنس نے طوعاً و کرہاً اس نظریہ کی صداقت کو تسلیم کرلیا، لیکن بعض کے دلوں میں یہ خیال بنا رہا، کہ باوجود اختلافات کے مختلف عناصر کے ایٹموں میں کوئی قدر مشترک ضرور ہونا چاہئے، اور عجب نہیں کہ کیمیا گروں کا ضرب المثل خبط محض خبط نہ ہو، بلکہ حقیقت پر مبنی ہو، اس خیال کو اس سے اور بھی تقویت پہنچی، کہ مختلف عناصر کے جوہری اوزان اور خواص میں ایک خاص قسم کا تسلسل اور تشابہ پایا جاتا تھا۔ اور اس قدر باقاعدگی پائی گئی، کہ سلسلۂ عناصر میں صرف دو جگہ خلاء نظر آیا۔ اس پر علمار سائنس نے فوراً حکم لگا دیا، کہ یہ خلاء ان دونوں عناصر کے مستقر ہیں، جن کا اب تک پتہ نہیں لگا ہے۔ اور اس کی تصدیق بھی بعد کی تحقیقات سے ہوگئی۔ چنانچہ ذہن کے بگڑے سائنس دان کمرہمت باندھ بیچارے ننھے سے ایٹم کی جو لاتجزا ([illegible]) یقین کرلیا گیا تھا، تخریب کے درپے ہوگئے۔ یعنی اس کی ساخت کا جائزہ لینے کے لئے اس کو توڑنے پھوڑنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس میں بڑی دشواریاں نظر آئیں۔ کیونکہ یہ غیر مرئی بظاہر حقیر ترین ذرہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا دانتوں کا مقابلہ لوہے کے چنے سے تھا، اس سلسلہ میں جو کوششیں ہوئیں، ان کا بھی مختصراً ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لیکن پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے، کہ عناصر و ایٹم کی نظام مادہ (Material System) میں حیثیت کیا ہے۔!

عناصر اور ایٹم کی نظام مادہ میں حیثیت

عناصر کا وجود تین طریق پر ہے، خالص شکل میں (گو قدرتی حالت میں عناصر خالص شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں) جیسے لوہا، تانبا، پارہ، سونا، ہائیڈروجن، آکسیجن وغیرہ، یا کیمیا مرکبات (Chemical Compounds) میں مثلاً پانی، نمک، چاک وغیرہ، یا طبعی آمیزوں (Physical - Mixtures) میں مثلاً ہوا میں۔ مرکب (Compound) اور آمیزہ (Mixture) میں فرق یہ ہے کہ جب دو یا زیادہ عناصر کیمیائی عمل کے ساتھ ملتے ہیں، تو ہر ایک اپنی فطری خاصیت کھو دیتا ہے اور باہمی امتزاج سے ایک ایسی نئی چیز بن جاتی ہے، جس میں اصل اجزاء کی کسی بھی صفت کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ مثلاً ہائیڈروجن خود جلنے والی گیس ہے اور آکسیجن گیس دوسری آتش گیر اشیاء کو جلانے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان دونوں کے مرکب "پانی" میں یہ دونوں صفتیں مفقود ہیں، بلکہ پانی جلتی ہوئی چیز کو بجھانے کے کام آتا ہے، آمیزہ میں مختلف عناصر کے ذاتی اوصاف قائم رہتے ہیں، مثلاً ہوا میں آکسیجن بھی ہے، جو آپ کو چولھا جلانے میں مدد دیتی ہے۔ اسی طرح نائٹروجن اور دیگر گیسی عناصر جو ہوا میں شامل ہیں، اپنی انفرادیت قائم کئے ہوئے ہیں۔ مادہ کی، خواہ وہ عناصر کی شکل میں ہو، یا مرکبات اور آمیزوں کی، تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ٹھوس (Solid) مائع (Liquid) اور گیس (Gas)۔ ایٹم دنیا میں چاہے جہاں ہوں، انفرادی حالت میں شاذ ہی رہتے ہیں۔ عموماً ہم جنس یا غیر جنس عناصر کے دو یا زیادہ ایٹم ایک دوسرے سے ملحق ہو کر سالمہ (Molecule) بنا لیتے ہیں اور سالمات ہمیشہ متحرک، رواں، دواں اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ خود ایٹم بھی سالمات میں متحرک رہتے ہیں۔ ٹھوس میں سالمات بلحاظ نقل زیادہ کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی حرکت محدود رہتی ہے۔ مائع میں آسانی کے ساتھ ایک دوسرے پر پھسلتے اور پھرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ٹھوس کی بہ نسبت نقل و حرکت کے لئے زیادہ آزادی ملتی ہے۔ گیس میں اسی قدر آزاد ہوتے ہیں، کہ جہاں تک جگہ ملتی جاتی ہے پھیلتے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کمرہ میں اگربتی جلائی جاتی ہے۔ تو ذرا سا دھواں سارے کمرہ میں پھیل کر آپ کی ناک میں خوشبو پہنچاتا ہے۔ اسی طرح اگر دو ایک قطرے مٹی کے تیل کے یا عطر کے کمرہ میں ڈال دئے جائیں تو گیس بن کر تھوڑا پھیل جائیں گے۔ اور آپ کو مٹی کے تیل کی بو یا عطر کی خوشبو محسوس ہونے لگے گی۔ ایک بات اور قابل لحاظ ہے، کہ سالمات کے اندر ایٹموں کے درمیان کوئی خلاء (Vacuum) ضرور رہتا ہے۔ اسی طرح سالمات کے درمیان اور زیادہ خلاء رہتا ہے۔ جس طرح دو چار گولیاں یا کوئی دوسری چیز ملا کر رکھ دی جائیں تو بیچ

میں چھوٹی ہوئی جگہ نظر آتی ہے۔

منفی برقیوں کی دریافت!

علمائے سائنس نے ایٹم کو توڑنے کی غرض سے ان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ چنانچہ جس حد تک ایٹموں اور سالموں کے درمیان خلا بھی رہا، دباؤ قبول کیا، لیکن خلا ختم ہوتے ہی جب معاملہ صرف ایٹموں سے آ پڑا، تو دباؤ کا اثر زائل ہو گیا۔ سیکڑوں من کا دباؤ سائنس کے آلات کے ذریعہ ڈالا گیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی، ٹوٹنا تو درکنار، ایٹم پچکے تک نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ایٹم دباؤ قبول نہیں کرتے۔ پھر حرارت پہنچا کر توڑنے کی کوشش کی گئی۔ مادہ کی خاصیت یہ ہے کہ حرارت پہنچنے سے اس میں پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس امید پر کہ زیادہ حرارت سے ایٹم پھیلتے پھیلتے ٹوٹ جائے گا۔ تجربہ کرنے والوں نے جس قدر حرارت پہنچانا ان کے امکان میں تھا پہنچا دی۔ نتیجہ صرف یہ ہوا کہ سالمات کی تعمیر تو درہم برہم ہو گئی اور ایٹم جدا جدا ہو گئے، لیکن خود ان کی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ یاد رہے کہ سائنسدان برقی بھٹیوں کے ذریعہ کئی ہزار ڈگری حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اس تجربہ کی ناکامی کے بعد آخر کار سر جے جے ٹامسن (Sir J.J. Thomson) نے ایک نلی کے اندر بذریعہ ناسپ خلا پیدا کر کے برقی رو دوڑائی (مکمل خلا پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ مفروضہ خلا میں مادہ کے کچھ نہ کچھ ذرے تیرتے رہا کرتے ہیں۔) نتیجہ یہ ہوا کہ نلی کے اندر شعاعیں دوڑنے لگیں، اور معلوم ہوا کہ یہ شعاعیں نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہیں، جن میں کا ہر ذرہ منفی برقی قوت (Negative Electricity) کا حامل ہے۔ ٹامسن نے ان ذرات کا نام الیکٹران (Electron) رکھا۔ اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہر قسم کے مادہ سے یہی ذرات حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ مختلف قسم کے عناصر کے ایٹموں میں اختلافات کے باوجود الیکٹران سارے ایٹموں کا مشترک جزو ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر رابرٹ اے میلیکن (Dr. Robert A. Millikan) نے الیکٹران کا ماس (Mass) یعنی مقدار مادہ دریافت کر کے ثابت کیا کہ ایک الیکٹران کی مقدار مادہ ہائیڈروجن کے ایٹم کی مقدار مادہ کا $\frac{1}{1840}$ ہے یعنی ۱۸۴۰ الیکٹران کا مجموعہ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کے برابر ہے۔

مثبت برقیوں کی دریافت!

جب یہ یقینی طور پر ثابت ہو گیا کہ ہر ایک الیکٹران منفی برقی قوت رکھتا ہے، تو ساتھ ساتھ یہ دقت پیش آئی کہ اگر مادہ کے ذرات میں صرف منفی ہی برقی قوت ہوتی، تو ہر شے سے اس کا اظہار ہوتا، کیونکہ برق کا خاصہ ہے کہ اپنی جنس کو دھکیلتی ہے، اور جنس مخالف کو کھینچتی ہے۔ لہٰذا تمام اشیاء بھاگی بھاگی اور اڑی اڑی پھرتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہر شے میں خواہ مفرد ہو یا مرکب یا آمیزہ، خواہ ٹھوس ہو یا مائع یا گیس برقی توازن قائم ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا گیا کہ ایٹم کے اندر الیکٹران کی منفی برقی قوت کا رد عمل کرنے والی کوئی چیز مثبت برقی قوت (Positive Electricity) کی حامل ہونی چاہئے۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی قوت کی تنسیخ ہو کر برقی توازن قائم رہتا ہے۔ لارڈ ردر فورڈ (Lord Ruther-Ford) نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا کہ ایٹم کی ساخت کا معمہ بہت کچھ کھل گیا۔ اس نے ثابت کیا کہ ایٹم کے مرکزی حصہ (Nucleus) میں مثبت برقی قوت مستقر ہے، اور ایٹم بالکل نظام شمسی سے مشابہ ہے۔ جس طرح آفتاب کے گرد سیارے مع اپنے بچوں یعنی چاندوں کے اس کی قوت کشش سے بندھے ہوئے گھوم رہے ہیں، کہ نہ اس سے دور جا سکتے ہیں، نہ اسے چھوڑ بھاگتے ہیں، اور كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ[1] کی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں، ٹھیک اسی طرح ایٹم کے مرکزی حصہ کے گرد الیکٹران گھومتے ہیں اور ہر ایٹم میں جس قدر الیکٹران ہوتے ہیں، ان کی مجموعی تعداد کے مساوی مثبت برقی قوت کے اکائیاں (Protons) مرکز میں بہر حال موجود رہتی ہیں۔ یہ مساوی متضاد قوتیں ایک دوسرے کا رد عمل کر کے توازن قائم رکھتی ہیں۔ لہٰذا اب کون ہے جو ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ[2] سے انکار کر سکتا ہے۔

---

[1] ہر ایک (ستارہ) آسمان میں تیرتا پھرتا ہے۔ [2] یہ عزیز و علیم کا مقرر کردہ (اندازہ لگایا ہوا) ہے۔

ایٹم کی حقیقت! اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد عناصر کے ایٹموں کی جانچ پڑتال اس نئے زاویہ نظر سے شروع ہوئی اور پایا گیا کہ ہر قسم کے عنصر کے ہر ایٹم میں ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے جس کے گرد الگ الگ مقررہ تعداد میں الیکٹران نہایت سرعت سے گردش کرتے رہتے ہیں، مثلاً ہائیڈروجن جو سب میں ہلکا گیس عنصر ہے۔ اس کے مرکز کے گرد صرف ایک الیکٹران گھومتا ہے، ہیلیم گیس (Helium Gas) جو آج کل ہوائی جہازوں میں بھری جاتی ہے، کے دو، لیتھیم (Lithium) میں تین الیکٹران ہیں، علیٰ ہذا القیاس ایک ایک بڑھاتے چلے جائیے۔ بالآخر سب سے وزنی عنصر یورینیم تک پہنچیں گے جس میں بانوے (۹۲) الیکٹران ہیں۔ ایک ہی قسم کے عنصر کے ایٹموں میں ایک ہی مقررہ تعداد الیکٹران کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک عنصر میں دوسرے عنصر سے الیکٹران کی تعداد ہمیشہ مختلف ہوتی ہے، چنانچہ عناصر کی سابق فہرست کے بجائے از سرِ نو فہرست بلحاظ سلسلہ وار تعداد الیکٹران مرتب کی گئی جو بانوے تک پہنچی لیکن درمیان میں دو عدد ابھی تک غائب ہیں، جو دو لاپتہ عناصر کے ہیں۔ بہر حال اس بحث سے یہ تو آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ایٹم کا نظام نظامِ شمسی سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ ہے، کیونکہ نظامِ شمسی میں تو صرف نو سیارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں، اور یہاں تعداد بانوے الیکٹران تک پہنچ گئی ہے۔ جس ایٹم میں ایک سے زیادہ الیکٹران ہیں، وہ سب کے سب ایک ہی فاصلہ پر نہیں ہوتے۔ ان کی سرعت رفتار کا تو وہم و گمان بھی آنا مشکل تھا، لیکن محققین سائنس نے اس مشکل کو بھی حل کر لیا ہے۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا اور ثابت کیا کہ الیکٹران اپنے مرکزی حصہ کے گرد تقریباً دو ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گھومتا ہے۔ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ڈھائی سیکنڈ میں پوری زمین کا چکر لگا دے۔ اس حیرت انگیز سرعت رفتار کی وجہ سے ہر ایٹم کے مرکزی حصہ کے گرد ایک ہی نہیں، بلکہ تعداد الیکٹران کے لحاظ سے کئی کئی ایسے مضبوط حصار قائم ہیں کہ مرکز تک رسائی اور اس پر کسی چیز کا اثر ڈالنا دشوار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایٹم پر نہ دباؤ کا اثر ہوتا ہے، نہ مصنوعی پیدا کردہ محدود حرارت کا۔ مرکزی حصہ کی مقدار مادہ، الیکٹران کی مجموعی مقدار مادہ سے سینکڑوں یا ہزاروں گنا زیادہ ہوتی ہے۔ نیوٹن (Newton) کے مسلم الثبوت نظریہ کے مطابق کائنات میں ہر طرح کا مادہ دوسرے ہر طرح کے مادہ کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور اس کشش کی کمی زیادتی چیزوں کی مقدار مادہ اور ان کے درمیانی فاصلہ پر منحصر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الیکٹران مرکزی کشش سے جکڑے ہوئے رہتے ہیں اور باوجود تیزئ رفتار کے اپنا مدار (Orbit) چھوڑ نہیں سکتے، یہ رفتار ان کو مرکز میں جا گرنے سے روکے رکھتی ہے۔ ان انکشافات کے بعد ماہرین سائنس کو یہ بھی ماننا پڑا کہ ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، اور پرانے کیمیاگروں کی پارہ، تانبا وغیرہ سے سونا بنانے کی کوشش جو خبط سے تعبیر کی جاتی تھی، حق بجانب تسلیم کر لی گئی، اس طرح کہ چونکہ عناصر کا طبعی اختلاف تعداد الیکٹران کے اختلاف پر مبنی ہے، لہٰذا ایک عنصر کے الیکٹران کی تعداد میں کمی زیادتی پیدا کر دینے سے دوسرا عنصر بن جائے گا۔ لیکن ایٹم کی مضبوط حصار بندی اور [illegible] قوت مدافعت پر قابو پانا شرط ہے۔

ایٹم کی شکست یہ سب معلوم ہو جانے کے بعد بھی ایٹم کے مرکزی حصہ کی ساخت کا عقدہ حل نہ ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں مادام کیوری (Madame Curie) نے جو پولینڈ کی رہنے والی تھی، اور پیرس میں پناہ گزینی کی حالت میں تجربات سائنس کیا کرتی تھی ریڈیم کا پتہ لگایا جو نہایت کمیاب دھات ہے۔ اور آج بھی جس کی مقدار دنیا میں بہت کم ہے اگرچہ وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا جاتا ہے یہ آج کل سرطان کے علاج میں بھی کام میں لائی جاتی ہے۔ اس کی عجیب خاصیت یہ ہے کہ اس میں ہر وقت ایک خاص رفتار سے عمل خود شکنی جاری رہتا ہے، جس کو نہ کوئی روک سکتا ہے، اور نہ جس کی رفتار کو کوئی گھٹا بڑھا سکتا ہے۔ اس جگہ قادر مطلق کے قانون کی کنہ تک انسانی عقل کی رسائی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ جو قلیل علم خدا نے انسان کے لئے مخصوص کر رکھا ہے اس میں اگر یہ شامل ہے۔ تو عجب نہیں کہ

کسی وقت کامیابی ہو جائے، اور کسی کسی عناصر میں یہ عمل جاری پایا گیا ہے۔ ریڈیم یا دوسرے ایسے ہی عناصر کے اس فعل خودشکنی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ایٹم خود بخود ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں، اور ایک قسم کی شدت کی گولہ باری چھوٹے پیمانہ پر جاری رہتی ہے۔ ریڈیم کا مرکزی حصہ جب ٹوٹتا ہے، تو تین قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، جن کو الفا، بیٹا اور گاما کہتے ہیں، اس جگہ ہم الف، ب اور ج کہیں گے۔ درحقیقت یہ شعاعیں ذرات ہیں جن کے ٹوٹنے کے قبل مرکزی حصہ کی حرارت بیس کروڑ ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے، اور دس ہزار میل فی سکنڈ کی تیزی سے یہ ذرات نکلتے ہیں، ان ذرات کی تیز رفتاری سے علمائے سائنس نے فائدہ اٹھایا، اور دوسرے عناصر کے مرکزی حصوں پر ان کے ذریعہ گولہ باری کر کے توڑ پھوڑ کرنے میں کامیاب ہو گئے، معلوم ہوا کہ ہر ایٹم کا مرکزی حصہ تین قسم کے ذرات سے بنا ہوا ہے، ایک کا نام پروٹون (Proton) دوسرے کا نیوٹران (Neutron) اور تیسرے کا پازیٹران (Positron) رکھا گیا، پروٹون اور نیوٹران مقدار میں بڑے ہوتے ہیں، اور پازیٹران ہر لحاظ سے الیکٹران کی بالکل ضد ہے۔ بعضوں کا یہ بھی خیال ہے کہ پروٹون، نیوٹران اور پازیٹران کا مجموعہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ایٹم کی تعمیر میں کم سے کم چار قسم کے ذرات ہیں، یعنے الکٹران بیرونی حصہ میں، اور پروٹون، نیوٹران اور پازیٹران مرکزی حصہ میں۔ تین قسم کی شعاعوں میں سے الف کا ہر ذرہ دو عدد پروٹون کا مجموعہ ہے۔ ہیلیم گیس کا مرکزی حصہ بن جاتا ہے۔ اور ریڈیم کے فعل خودشکنی سے ہیلیم گیس خود بخود بنتی رہتی ہے۔ اگر اس قسم کی گولہ باری پارہ پر کر کے اس کے ہر ایٹم میں سے ایک ایک الیکٹران اور مرکزی حصہ میں سے ایک ایک مثبت برقی اکائی خارج کر دی جائے تو سونا بن جائے گا کیونکہ پارہ میں ۸۰ الکٹران ہیں اور سونے میں ۷۹۔ اس طریقہ سے فزیکل ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ (Physical technical institute) برلن میں خفیف سی مقدار سونے کی بنائی گئی، لیکن اب تک تجارتی پیمانہ پر تیار نہ ہو سکا۔ نہ مغربی سائنس والوں کی اس طرف فی الحال کوئی توجہ ہے۔

قوت کا زبردست خزانہ!

ایٹم کی پیمائش بھی خوب کی گئی، مثال کے لئے ہائیڈروجن کو لیجیے، اس کا ایک سالمہ الکٹران سے (۱۷,۰۰۰) سترہ ہزار گنا بڑا ہوتا ہے۔ الیکٹران کا قطر (Diameter) ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۱۴ (اعشاریہ بارہ صفر ایک چار) انچ ہے۔ یعنے اگر الیکٹران ایک قطار میں ایک دوسرے سے ملا کر رکھے جائیں، تو ایک انچ کی لمبائی میں ۷۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ (ستر کھرب) سما جائیں گے۔ مرکزی حصہ سے الیکٹران کا فاصلہ تقریباً ۱۷۰۰۰ (سترہ ہزار) الیکٹران کے مجموعی قطر کے برابر ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ایٹم کے مرکزی حصہ سے الیکٹران تک کے درمیانی فاصلہ میں ۱۷۰۰۰ (سترہ ہزار) اور سما سکتے ہیں۔ یہ خلا ایٹم کے اندر الیکٹران سے فاصلہ تک مرکز کے ہر سمت موجود ہے۔ اس خلا کو اگر جوہری ذرات سے پُر کیا جائے، تو اتنے سما جائیں گے کہ جن کا شمار کرنا محال ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایٹم کا حجم (Volume) تو وہی رہے گا لیکن مقدار مادہ اور ثقل بالفاظ دیگر وزن اتنے گنا زیادہ بڑھ جائے گا کہ وہم و گمان میں آنا مشکل ہے۔ اسی طرح اگر ... کوئی مقدار لیکر اس کے مادہ ایٹموں کا نظام توڑ کر ذرات آپس میں کس دیئے جائیں تو ذرا سا حجم رہ جائے گا۔ اور ثقل بہت بڑھ جائے گا۔ مقدار مادہ وہی رہے گی، لہٰذا وزن میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ اس طرح ایک ٹن مادہ کا حجم تقریباً ایک پینی (Penny) کے برابر ہو سکتا ہے۔ یعنے ایک پینی کا وزن ایک ٹن ہوگا۔ ایٹم بم اسی اصول پر بنا ہے، آپ نے شاید جنگ کے زمانہ میں اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ کہ ایٹم بم گالف (Golf) کے گیند یعنے اوسط نارنگی کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن وزن دو سو پونڈ ہوتا ہے۔ ایٹم قوت کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔

رفتار کی قوت میں تبدیلی!

یہ امر مسلمہ ہے کہ حرکت (Motion) حرارت (Heat) اور قوت (Energy) ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایٹم جب ٹوٹتا ہے تو ۲۰۰۰۰۰۰۰۰ (بیس کروڑ) سینٹی گریڈ حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اور ذرات ۱۰۰۰۰ دس ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے نکلتے ہیں، یہی رفتار قوت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے

اور اس قوت سے کیا کیا کام لئے جاسکتے ہیں، ان کا حساب لگانا مشکل ہے۔ کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک اونس مادہ کے ایٹموں کو توڑنے سے ایک لاکھ گھوڑوں کی طاقت ایک سال تک مسلسل کام لیتے رہنے کے لئے حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی نسبت سے حساب ذرا اور آگے بڑھائیے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہزار ٹن مادہ سے اس طرح اتنی قوت پیدا کی جا سکتی ہے کہ ہمارے سر زمین کے ممالک متوسطہ (C. P.) کو سال بھر تک اس کے ذریعہ سورج کے مقابلہ کی روشنی اور حرارت بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ لیکن ابھی یہ منصوبے عملی صورت اختیار نہیں کر سکے ہیں۔ اس وقت ملکوں قوت کے دلدادگان شیطان الرجیم کی عبودیت میں مصروف ہیں، لہٰذا اس کی ہدایت کے مطابق دنیا کو تباہ و برباد کرنے میں استعمال کرنا چاہتے ہیں شیطان کے پنجے سے چھڑائے۔ اور نیک ہدایت دے۔ کیا قدرت ہے اللہ جل شانہ کی کہ ایک ذرہ بے مقدار میں یہ قوت بھر دی ہے

قوت اور مادے کا تعلق!

دیکھئے کس طرح سائنس بتدریج حقیقت عبودیت (اللہ کی بندگی) اور توحید کی طرف کھنچتی جا رہی ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن پہلے تک یہ عام خیال تھا کہ مادہ غیر فانی ہے۔ صرف شکل تبدیل ہوتی ہے وزن اور مقدار میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔ لیکن حال ہی میں برقی مقناطیسی نظریے کے تجربات نے اس خیال کا قلع قمع کر دیا اور یہ ثابت ہوا کہ مادہ کے ذرات فنا ہو کر قوت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جو غیر مادی ہے۔ الیکٹران ہی کو لیجئے کہ جو کبھی تو ذرہ کی شکل میں ایٹم کا جز بنا رہتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا ہے اور کبھی بالکل فنا ہو کر برقی قوت کی غیر مادی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ مثال سارے مادے پر صادق آتی ہے۔ اس لئے اقرار کرنا ہی پڑے گا کہ کل مادہ فنا ہو سکتا ہے۔ یعنی فانی ہے۔ اور قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یا سلب ہو جاتا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (دنیا کی ہر ایک چیز فنا ہونے والی ہے اور فقط آپ کے پروردگار ہی کی ایک ذات باقی رہ جائے گی جو صاحب جلال و اکرام ہے) جب مادہ قوت میں تبدیل ہو سکتا ہے تو اس کے برعکس قوت کا مادہ میں تبدیل ہونا یقینی ہے، بالفاظ دیگر مادہ کی تخلیق قوت سے ہوئی۔ قوت تک تو ہم پہنچ گئے۔ اب پوچھئے قوت کہاں سے آئی، تو اقرار کرنا پڑے گا، کہ "قَوِيٌّ عَزِيزٌ" (قوت اور عزت والا ہے) کے پاس سے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے، اسی کی قوت؟ تخلیق و تعمیر و تصویر مادہ ہے۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (وہی اللہ ہے جو پیدا کرنے والا ٹھیک ٹھیک بنانے والا اور صورت گری کرنے والا ہے) اور اسی کی قوت سے سارا نظام ٹوٹ جائے گا۔ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔) کائنات کی یہ بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے گی۔ اور انسان کو ایک دن اس کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا۔

★

مرتبہ ادارہ

روسی ادب پر حکومت کی نگرانی

(ان مظالم کا عکس جو آہنی پردے کے پیچھے ادب کے نازک جسم پر توڑے جا رہے ہیں)

کمیونسٹ عقائد کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے، کہ وہ لازوال ہیں۔ دائمی ہیں۔ اور ان میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے، لیکن روس کی کلیت پسندانہ (Totalitarian) حکومت نہ صرف نظام زندگی کے دوسرے شعبوں کو اپنے قوانین کے بندھنوں سے جکڑے ہوئے ہے۔ بلکہ اس نے اپنے لٹریچر، اپنے ادب، اور اپنے عقائد و اصول کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ یہ نئی استبدادیت انسانی جسم کے دوسرے اعضا کی طرح اس کے دل و دماغ، اس کے قلم اور اس کی تحریر پر بھی حملہ آور ہوتی ہے۔ اس وقت سویٹ گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ روسی ادب موجودہ پارٹی کے گن گائے، اور اسی کی آواز کو اپنے ریکارڈوں میں بھر کر جگہ جگہ پہنچائے۔ پھر چاہے ایسا کرنے میں خود کمیونزم کے عقیدے اور مسلک ہی کو کیوں نہ بدلنا پڑے۔

اس اصول کا نتیجہ یہ ہے کہ جب حکومت اپنا پینترا بدلتی ہے، اور داخلی اور خارجی معاملات میں کوئی نئی تبدیلی کرتی ہے، تو روس کے تمام لکھنے والے سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ایسا ہوتا ہے۔ تو لاتعداد کتابیں جو پہلے اصول و نظریات کی بنیادوں پر لکھی گئی تھیں، نہ صرف "پرانی" ([illegible]) ہو جاتی ہیں، بلکہ بسا اوقات مخالف سویٹ (Anti-Soviet) قرار دی جاتی ہیں۔ اس وقت مدیروں اور قلم کاروں کی حالت نہایت قابل رحم ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے دل و دماغ کے کھلے ہوئے دریچے بند کر کے بڑی مشکل سے دوبارہ کمیونسٹ پارٹی کے نئے نظریات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتے ہیں، حالانکہ وہ صاف طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی پارٹی الٹی زقندیں بھر رہی ہے۔

جب ایک ادیب کوئی کتاب لکھتا ہے۔ تو اسے اس کتاب کو مصدقہ بنانے کے لئے سویٹ پروپیگنڈا افسر کے پاس بھیجنا پڑتا ہے۔ وہ افسر اس میں متعدد تبدیلیاں کرتا ہے۔ اس وقت ادیب کی بے چینی انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کو ان تبدیلیوں کے مطابق اپنے مضامین کو مرتب کرنے میں سخت روحانی دکھ ہوتا ہے۔ مگر چار و ناچار یہ اپریشن برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ تغیرات ایک پڑھنے والے کے لئے بھی نہایت عجیب ہوتے ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات وہ ایک کتاب کے مضامین کو محض اس لئے پڑھتا اور اپنے علم کا جزو بناتا ہے کہ اس کے نظر ثانی شدہ اڈیشن کے مطالعہ کے بعد اسے اپنے ذہن سے خارج کرنے کے لئے زور لگائے۔ اس طرح اس کا سارا مطالعہ اور محنت ضائع ہو جاتی ہے، اور وہ علم کی اسی منزل پر رہتا ہے جہاں سے وہ چلا ہوتا۔

ایک انوکھا واقعہ!

[illegible] واقعہ [illegible] سویٹ پبلشنگ ہاؤس کی جانب سے سویٹ اکابرین (Soviet-[illegible]) کے سلسلہ کی ایک کتاب کی تیاری میں پیش آیا۔ یہ کتاب ایک روسی ہوا باز کرنل پی۔ اے۔ پلیوتوف (P. A. Pily[illegible]) کی زندگی اور اس کے کارناموں پر لکھی گئی تھی۔ اس کی اشاعت سے قبل اس کے لکھنے والے [illegible] بوروف (M. Burov) نے اسے پلیوتوف کو تصحیح کے لئے دکھایا، اس نے اپنی سوانح سے متعلق صحیح اطلاعات

اور واقعات کی جانچ کی۔ اور انہیں درست کیا۔ لیکن جب یہ کتاب مکمل شکل میں چھپ کر اُس کے سامنے آئی، تو اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ اس نے دیکھا کہ کتاب میں لاتعداد غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا بچپن اُس کے وطن Belorussia بیلو رشیا میں گزرا، یہاں وہ مستقبل کی زندگی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اور سوچا کرتا تھا کہ کیا اس کا وطن ایک نئی وضع کی بستی بن جائے گا اور وہاں خوبصورت سڑکیں نکالی جائیں گی۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ بلیوتوف بلورو رشیا میں پیدا تو ضرور ہوا تھا۔ مگر اُس کا سارا بچپن یوراال میں گذرا، اور وہیں پلا، بڑھا تھا۔ اسی طرح ایک اور جگہ دوران جنگ میں بلیوتوف کے زخمی ہونے کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے، کہ "وہ آپریشن کے میز پر ہنستا ہوا لیٹا رہا" اس پر بلیوتوف نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، کہ جب اُس کے جسم سے بیس لوہے کے ٹکڑے نکالے گئے تھے، تو وہ ہنس نہیں رہا تھا! بحوالہ (Soviet Literary Gazette oct 6, 1948) ——بات دراصل یہ تھی کہ جب یہ کتاب لکھی جا چکی تو سینٹرل اکادمی کے سلسلۂ کتب کے مرتب اے، وی گوگن (A.V. Gogin) کے پاس بھیجی گئی، اُس نے اُسے اٹھا کر ایک اور ادیب ڈی، اے ویدٹسکی (D.A. Vadetskii) کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اس میں کچھ ادبی نزاکتیں پیدا کر دے۔ چنانچہ قلم کاری کا یہ مرحلہ اصل مصنف یا خود اس کتاب کے "موضوع" سے بغیر کسی مشورے کے تکمیل کو پہنچا، اور اس میں وہ سب کچھ بھر دیا گیا، جو ایک روسی ہیرو کو انتہائی بلندی پر پہنچانے کے لئے ضروری تھا۔ اور جس کے ذریعہ برسر اقتدار شخصیتوں کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی تھی۔

بڑے لوگوں کی حماقتیں

خلاف واقعہ تبدیلیوں اور دروغ بافیوں کا یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ حتیٰ کہ روسی حکومت کے کرتا دھرتا تک اس مرض میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ "انقلاب اکتوبر" کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۶ نومبر ۱۹۱۸ء کو "پراودا" نے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ جس میں اسٹالن نے اکتوبر کے انقلاب پر یوں اظہار رائے کیا تھا۔

"عملی سرگرمیوں کے تمام متعلقہ امور کی تکمیل پٹروگراڈ سوویٹ کے صدر نشین ٹراٹسکی کی رہنمائی میں ہوئی۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قلعہ گیر فوجوں کی سوویٹ صفوں میں اچانک شرکت یا فوج کی انقلابی جماعت کی تائید صرف کامریڈ ٹراٹسکی کی مرہون منت ہے۔ ان کے علاوہ کامریڈ انتو نوف اور پوڈ وئسکی ان کے دست راست تھے"

لیکن ٹراٹسکی سے اختلاف کے بعد پارٹی کی رائے اُس کے حق میں بدل گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی جو مستند تاریخ لکھی گئی۔ اس میں ۱۹۱۷ء کے "انقلاب اکتوبر" کے وقت ٹراٹسکی کے کام کو بالکل الٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور انقلاب کی تکمیل میں اُس کا مرہون منت ہونے کے بجائے اس کو انقلاب کے مخالفوں میں شمار کیا گیا۔ حالانکہ ایک زمانہ وہ تھا، جب کہ خود اسٹالن نے اس کی تعریف میں قلم اٹھایا تھا۔ مگر جب ٹراٹسکی اور اسٹالن میں چل گئی، تو ٹراٹسکی پر چاروں طرف سے تیر برسائے جانے لگے۔ حتیٰ کہ کھلے ہوئے حقائق کو غلط قرار دیا گیا، اور شبہ سے بڑا تاریخی جھوٹ بولنے میں بھی شرم محسوس نہ ہوئی۔

تاریخ میں مضحکہ انگیز تغیر!

سیکنڈری اسکولوں کے لڑکے روسی تاریخ کی ایک کتاب جسے پروفیسر اے ایم پنکراتوا (A.M. Pankratova) نے مرتب کیا ہے، [illegible] کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۶ء میں جو تغیرات ہوئے ہیں، نہایت دلچسپ اور "تکرار" کے ناجائز استعمال کی بہترین مثال ہیں۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۵ء میں روس اور جاپان میں جو لڑائی ہوئی اس کو اس کتاب کے ۱۹۴۰ء کے ایڈیشن میں ایک سامراجی لڑائی بتایا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اس کی تہ میں زار یا اس کے بورژوا اقتدار اور عوام کو لوٹنے کا جذبہ پنہاں تھا۔ لیکن اسی کتاب کے ۱۹۴۶ء کے ایڈیشن میں اس زار شاہی (Tsarist Imperialism) کی لڑائی کو حق بجانب قرار دیا گیا ہے، اور روس کی بری اور بحری فوجوں کی شان میں قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ اسی طرح ۱۹۴۰ء کے ایڈیشن میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس جنگ کے

وقت اسٹالن نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اور ٹراٹسکی اور منشویک پارٹی کے افراد (Mensheviks) نے اسے اپنے آبائی وطن (Father Land) کی مدافعت کی جنگ قرار دے کر اس کی تائید کی تھی۔ لیکن ۱۹۵۱ء کے ایڈیشن میں اس ترتیب کو بھی الٹ دیا گیا۔ اور ٹراٹسکی اور منشویکوں کی حمایت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے، کہ کس طرح کمیونسٹ اپنے انقلابی مسلک اور بین الاقوامی نظریات سے ہٹ گئے ہیں، اور اس ترقی معکوس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کیونکر تاریخ کے چہرہ کا روغن بھی بدل دیا اور اس پر نیا رنگ چڑھا کر نئے قسم کے نقش و نگار بنائے ہیں لیکن اس فن کارانہ بد دیانتی کے باوجود حقیقت بڑی تیزی سے بے نقاب ہوتی جا رہی ہے۔

ایسی ہی ایک ابن الوقتی اور خود غرضی کی مثال جنگ عالمگیر (ثانی) کا وہ واقعہ ہے، جبکہ اتحادیوں نے فرانس کے شمالی ساحل (نارمنڈی) پہ اپنی فوجیں اتار دی تھیں۔ اس وقت اسٹالن نے اس کو ذہانت آمیز اقدام (Brilliant Success) کہہ کر سراہا تھا۔ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مقصد کی وسعت اور بڑے پیمانہ پر غیر معمولی قتل و خون کے اعتبار سے پوری جنگ کی تاریخ میں اس کارنامے کے مماثل کوئی اور واقعہ نہیں ہے"۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں اسٹالن کا یہ تبصرہ بھی "تاریخ" سے خارج کر دیا گیا۔ اور اسے چند معمولی الفاظ کا جامہ پہنا کر یوں پیش کیا گیا، کہ "جون ۱۹۴۴ء کو اتحادی فوجوں نے شمالی فرانس کے ساحل پر چڑھائی کی"۔ حالانکہ اسی کتاب کے ۱۹۴۶ء کے ایڈیشن میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے گئے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے ایڈیشن میں ایک اور جگہ اتحادیوں کو "امن پسند ممالک" اور "یورپ و امریکہ کی جمہوری طاقتیں" کہا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے جدید ایڈیشن میں یہ الفاظ بھی حذف کر دیئے گئے۔

"کمنٹرن" (Komintern) کا تذکرہ کرتے وقت ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے ایڈیشن میں زبردست فرق ہے۔ ۱۹۴۵ء میں "کمنٹرن" کی تحلیل اور برخاستگی کی خاصی تفصیل موجود ہے۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے ایڈیشن میں اس تفصیل کو صفحہ قرطاس سے محو کر دیا گیا۔ اسی طرح "پنکراٹووا" (Pankratova) کی کتاب میں روس اور جاپان کی لڑائی کو شکلیں بدل بدل کر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء کے ایڈیشن میں روس کی شکست خوردگی کو پوری طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن ۱۹۴۵ء کے ایڈیشن میں اس کھلی ہوئی حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ پہلے "فوج" کے لئے "زارشٹ فوج" (Tsarist Army) کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، لیکن بعد میں قوم پرستی کو ابھارنے کے لئے "روسی فوج" (Russian Army) لکھا جانے لگا۔ مگر شکست اور ناکامی کے جتنے واقعات تھے سب کے سب "روسی فوج" کے بجائے "زارشاہی" (Tsarist Government) کی طرف منسوب کئے گئے۔ یہ رد و بدل نہایت ہی مضحکہ خیز اور عجیب ہے۔ اس [illegible] کس کی طرف سے ہوا؟! یہ سوال بھی نہایت ڈرامائی بن گیا ہے، کیونکہ کتاب کے دو مختلف ایڈیشن [illegible] جنگ کی وجہ سے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۵ء کا انقلاب بہت تیز رفتار [illegible] اگست ۱۹۰۵ء کو جاپان سے صلح کی پیش کش کی۔ لیکن [illegible] جنگ کی وجہ سے جاپان اس قدر پریشان ہو گیا تھا، اور اسے اس قدر نقصان پہنچا تھا [illegible] (Tsushima) کی لڑائی کے بعد اس نے مجبور ہو کر صلح کی تجویز رکھی تھی!!

علمی کتابوں میں جذبات نگاری!

سوویت انسائیکلوپیڈیا "کرٹکایا" (Krat Kaya) جو ایک جلدی کتاب ہے براہ راست حکومت کے محکمہ سیاست کی مرتب کردہ ہے۔ اس کے مرتب کرنے والوں میں نائب وزیر خارجہ اینڈریو وائی وشنسکی (Andrei Y. Vyshensky) بھی شریک ہیں، اس کتاب کے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۸ء کے

ایڈیشن میں روسی حکومت کی تغیر پذیر سیاسی حکمت عملی کے مطابق لاتعداد تبدیلیاں ہیں۔

سویٹ انسائیکلوپیڈیا کے [year] والے ایڈیشن کو مغربی ممالک کے خلاف نفرت و حقارت کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا گیا ہے۔ مثلاً [year] کے ایڈیشن میں "ریاستہائے متحدہ امریکہ" کے عنوان کے تحت وہاں کے طرز حکومت کا مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن [year] میں نہ صرف واقعات و اعداد کو بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے نقطۂ نظر سے تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس میں ریاست ہائے متحدہ کے طرز حکومت کو "سرمایہ داروں کی وحدانی جمہوریت" (Capitalist Unitary Republic) "سرمایہ کی اجارہ داری" (Monopoly Capital) اور "ڈالر جمہوریت" (Dollar Democracy) کے طنزیہ کلمات سے نوازا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں امریکہ کی جمہوریت پر تنقید کا ہر ایک کو حق حاصل ہے، اور نہ وہاں پر کوئی سچی جمہوریت قائم ہے، لیکن واقعات و حقائق کی ایسی کتابوں میں جذباتی تنقید پر نہایت پست ذہنیت کا مظاہرہ ہیں۔

اسی کتاب میں ایک اور جگہ مغربی ممالک کے خلاف پرجذبات تنقید کی مثال ستمبر اور اکتوبر [year] کی "ماسکو کانفرنس" کے بیان میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کانفرنس، مسٹر ہری مین (Harriman) لارڈ بیوربروک (Lord Beaver Brook) اور سٹالن، مولوٹوف، لٹوینف اور ووروشیلوف (Voroshilov) کے درمیان ہوئی تھی، اور جس کے نتیجہ میں یہ طے پایا تھا کہ مغربی ممالک یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کی مدد کریں گے۔ [year] کے ایڈیشن میں بتایا گیا کہ "کانفرنس نے نہایت ٹھوس بنیادوں پر کام کیا۔ اور تمام آزادی پسندوں کا ایک مضبوط مخالف ہٹلریت (Anti-Hitlerite) محاذ بنایا، جس کے رہنما یو۔ ایس۔ ایس۔ آر، انگلینڈ اور یو۔ ایس۔ اے ہیں۔" لیکن [year] کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں ان تمام جذبات خیر سگالی کو ختم کر دیا گیا۔ اور بتایا گیا کہ "[year] کی ماسکو کانفرنس میں برطانیہ اور امریکہ نے روس کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کیا"۔

جارحانہ مارکسیت!

مارکسیت کے جنگی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے "کٹ کا پا" کے [year] کے ایڈیشن میں "جنگ" (War) کے عنوان پر یوں لکھا گیا ہے "ایک حق بجانب لڑائی وہ ہے، جس میں لوگ بلند مقاصد کی خاطر کھڑے ہوتے ہیں، اور اپنے ملک کی بیرونی حملہ کے خلاف مدافعت اور غلامی سے نجات کے لئے لڑتے ہیں۔ ایسی لڑائی میں سوال صرف آزادی، عزت نفس اور مقابلہ کا ہوتا ہے۔۔۔۔"

لیکن [year] کے ایڈیشن میں مارکسیت کے جنگی رجحان کو یوں واضح کیا گیا ہے، کہ "ایک حق بجانب لڑائی صرف وہی جا سکتی ہے۔ جس میں لوگ بیرونی حملے اور غلامی کے خلاف مدافعت کریں۔ اور معاشی لوٹ کھسوٹ مچانے والے طبقے کے جوئے سے گردنیں چھڑانے میں کوشاں ہوں"۔

ان تمام مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اور ایک خاص پارٹی کے اقتدار کے تحفظ کے لئے روسی حکومت کس طرح "ادب" (Literature) پر نگرانی کرتی ہے۔ افسانہ نویسوں اور تفریحی ادب کے میدان میں اپنے کارنامے دکھانے والوں کا گروہ بھی ان پابندیوں سے آزاد نہیں ہے، بلکہ جب اونچے ادبی کاموں میں یہ اصول برتا جاتا ہے، تو ان معمولی درجہ کے کاموں میں "آزادی تحریر" (تقریباً) ناپید ہے۔ روس میں صرف وہی ادیب اپنا نام پیدا کر سکتا ہے، جو حکومت کا خوشامدی ہو، اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے رہوار قلم کی باگیں موڑ دے۔ جس ادیب میں ابن الوقتی اور زمانہ پرستی کا یہ جوہر نہیں ہے۔ وہ کسی طرح سویٹ سماج میں اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتا۔ جو شخص ٹھوس حقائق سے تعلق رکھنا چاہتا ہے۔ وہ جلد ہی مخالف سویٹ زمرے میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس کی قبر تراشکی کی قبر کے برابر بنا دی جاتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ روسی حکومت کو آئے دن اپنے نظریات افکار اور اصولوں میں یہ تبدیلیاں کیوں کرنی پڑتی ہیں؟ اس کا صرف یہی جواب ہو سکتا ہے، کہ کمیونزم کے پاس سرے سے کوئی مستقل حقیقت ایسی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنی عمارت لامحدود بلندی تک تعمیر کرتی چلی جائے۔

معیارِ ماہنامہ

نیا سویرا

جمال احمد امین ابجدی



حریمِ دل کے حیات افزا حسین گوشے نکھر رہے ہیں
لطیف جذبے وجودِ ہستی کے رنگ بن کر بکھر رہے ہیں

نفس نفس کی حرارتوں سے حیات بیدار ہو رہی ہے
دلِ فسردہ کی آرزوئے نجات بیدار ہو رہی ہے

عروسِ خورشید کے تبسم سے چادرِ شب سمٹ رہی ہے
نگارِ تاباں کی ضوفشانی سے بزمِ تاریک مٹ رہی ہے

ہوس کے محشر خرام سائے نگاہ سے دُور ہو رہے ہیں
ضمیر کے زرنگار جلوے نظر میں مستور ہو رہے ہیں

خرامِ حق سے سحر کے جلوے شرار بن کر بھڑک رہے ہیں
حقیقتوں کی جمال دوزی سے جہل کے دل دھڑک رہے ہیں

"اذانِ حق" کی لطافتوں سے سحر کا چہرہ دُھلا ہوا ہے
عبادتوں سے معانقے کو دریچۂ حق کھلا ہوا ہے

طلوعِ صبح کی فرحتوں سے اُفق کی سُرخی دمک رہی ہے
عبودیت کی صباحتوں سے جبینِ مومن چمک رہی ہے

ریاض الدین (علیگ)

انقلابِ حق

اب یہاں ظلم کا چھایا ہے اندھیرا ہر سُو
اب یہاں ظلم کا کوئی بھی مداوا نہ رہا
اب یہاں پر ہے جہالت کا بسیرا ہر سُو
اب یہاں علم و بصیرت کا گذارا نہ رہا

اب یہاں دولت و افلاس کے ہنگامے ہیں
اب یہاں پیٹ کی گردش میں ہے ساری دنیا
اب یہاں بھوک کے اور پیاس کے ہنگامے ہیں
مکر و وسواس کی شورش میں ہے ساری دنیا

آ۔ کہ ہم ایسے زمانے کو بدل دیں اے دوست
شورشِ فتنۂ عالم کو کچل دیں اے دوست

ظلمت جورِ زمانہ ہے غرورِ دولت
باعثِ فتنۂ عالم ہے ہماری شدت
ذہنِ مردہ پہ ابھی چھایا ہے نخوت کا طلسم
ہم غریبوں پہ ابھی چھایا ہے شدت کا طلسم

ہم تو افلاس کو پابندِ یقیں کر نہ سکے
ہم نے معمورۂ عالم کو سنوارا ہی نہیں
اپنے معبود کے آگے یہ جبیں دھر نہ سکے
ہم نے اس خالق و رازق کو پکارا ہی نہیں

آ۔ کہ پھر خالق و رازق کو پکاریں اے دوست
آ۔ کہ پھر دولت و طاقت کو سنواریں اے دوست

★

انور اعظمی

غزل

روح سرشار نہیں، قلب و نظر شاد نہیں
ساقیٔ ہند ترا میکدہ آباد نہیں

پیرِ مغرب کے اشارے پہ ہے مینا کا خرام
بادہ و جام تری بزم کے آزاد نہیں

شبِ تاریک کی بے چینی پتہ دیتی ہے
لبِ مغرب سے پرے آہِ سحر زاد نہیں

لاخدائی سے ہوئی غیرتِ آدم برباد
سو خدا یاد ہوئے، ایک خدا یاد نہیں

پھیل جا دہر پہ پیغامِ محبت بن کر[1]
اس کو نکہت نہیں کہتے ہیں جو برباد نہیں

کم یہ کیا ہے؟ ستمِ غیر کا شکوہ نہ رہا
خود مٹاتے ہیں نشیمن کو جو صیاد نہیں

بارے اتنا تو رہا پاسِ مسلمانی کا
شیخ دعوت نہیں لیتے جو حرم زاد نہیں

اے خوشا! انجمن آرائی دردِ غربت
جیسے کچھ آرزوئے عالمِ ایجاد نہیں

★

[1] اس شعر کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید کسی استاد کا ہو مگر صاف یاد نہیں پڑتا سو عرض ہے کہ اگر کسی دوسرے کا ہو تو اسی کا رہے اگر کسی اور کا نہیں ہے تو پھر میرا ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں

★

ارشد کاظمی

واردات!

ابھی کچھ دیر میرا منتظر رہ اے مرے ساقی
نپٹنا چاہتا ہوں میں غمِ امروز و فردا سے

عبث ہے قیس سمجھ کر جستجو دشت و بیاباں کی
جنوں خود پیدا کر لیتا ہے راہ و رسم صحرا سے

مرا ذوقِ جہاں بانی مجھے مجبور کرتا ہے
الجھ جاؤں کسی پروردۂ دیر و کلیسا سے

وہی کچھ عصرِ حاضر کے جوانوں کو دکھا یارب
کہ جو کچھ میں نے دیکھا آج اپنی چشمِ بینا سے

مری آتش بیانی رنگ لائے گی مرے ہمدم
کہ اکثر کھیلتا رہتا ہوں شعلوں کی تمنا سے

میں سرگرمِ فغانِ نیم شب ہوں آج کل ارشد
اسی حالت میں ملتا ہوں کلیمِ طورِ سینا سے

★

ظہیرالدین

اے ساقی!

تیرے ہوتے کوئی میخوار نہیں اے ساقی
بے سبب قحطِ خریدار نہیں اے ساقی

سارے مخانے تو معمور ہیں میخواروں سے
تیری کیوں گرمیٔ بازار نہیں اے ساقی

بے قرینے سے پڑے ہیں جو یہ آلات وظروف
یہ تو کچھ خیر کے آثار نہیں اے ساقی

بادہ خواروں میں اضافہ ہو ترا فرض نہ تھا
اور تو اب بھی گنہگار نہیں اے ساقی

چند دیرینہ ثنا خوانوں کی باتوں پہ نہ جا
جرعہ کش ہیں یہ قدح خوار نہیں اے ساقی

تیز بھی، تند بھی، شفّاف بھی ہے مے تیری
اور پھر کوئی طلب گار نہیں اے ساقی

لوگ کتراتے ہیں کیوں تیری طرف آنے سے
تجھ میں کیا نرمیٔ گفتار نہیں اے ساقی

تیرے اخلاق سے دُنیا تری دیوانی تھی
آج کیا تجھ میں وہ کردار نہیں اے ساقی

کس مپرسی کا یہ عالم، ترے میخانے کا
تیرے منصب کے سزاوار نہیں اے ساقی

عبدالمنان ہلالی

یہ اچھے لچھن نہیں

"سلام چودھری جی، سلام وحید بھیا"

"سلام سلام" چودھری جی اور وحید نے کہا "کہو کیسے نکل آئے" چودھری جی نے رسماً پوچھا۔

"بیٹھو"

"آج کل سب آپ بھیا لوگوں کی کرپا ہے" سمیر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انکسارانہ کہا۔

چودھری جی مرالی گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ان کے بزرگ اپنے دور میں اطراف و اکناف میں بہت مشہور رہتے۔ مگر نئے چودھری تو ان سے بھی بازی لے گئے۔ ان کی شہرت کی وجہ ان کی سیاست اور حکمت عملی تھی، ابھی حال ہی کا واقعہ ہے کہ انھوں نے بہت سے کھیتوں کو عدالتی کارروائی سے اپنے نام کروا لیا حالانکہ وہ کھیت ان کے نہیں تھے۔

ایک طرف تو یہ حالت، دوسری طرف تھانیدار اور پولیس سب ان کے اثر میں گھر کے آدمی تھے جو افسر گاؤں میں آتے انھیں کے یہاں ٹھہرتے کھاتے پیتے۔ آخر افسران بھی احسان مانتے ہیں جس کے یہاں کھائیں پیئیں، انھیں بیٹھیں اگر اسکا کچھ بھلا کریں تو کس کا کریں۔ یہی وجہ تھی جس سے ان کی شرارت بے روک ٹوک چل رہی تھی

بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ ولیعہد بھی گاؤں میں آتے اور چودھری جی کی ایما سے کسی پر غرضی الزام عائد کر کے مار سے پیٹتے اور کچھ نقد وصول کرتے رشوت میں چودھری جی بھی حصہ دار ہوتے۔

یہ سب کچھ تھا، گاؤں کے کافی لوگ اس سے واقف تھے مگر چودھری جی کے خلاف کوئی چوں تک نہ کرتا تھا۔ مخالفت کیسی ——— کچھ لوگ جو ابھی زمانے کی چالوں کو نہ سمجھ سکے تھے چودھری جی کی میٹھی میٹھی باتوں میں گرفتار تھے۔

"ان کے متعلق حسن ظن رکھتے تھے، مگر زیادہ لوگ اس لیے ان کی خوشامد کیا کرتے کہ کہیں چودھری کی نگاہِ غضب ان کو برباد نہ کر دے۔

اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی کوئی مجبور ہو کر مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا مگر اسکا حشر وہی ہوتا جو زیادہ تر چھپکلی کا ہوا یعنی کسی کو گاؤں چھوڑنا پڑا اور کسی کو جیل کی ہوا کھانی پڑی

غرض چاروں طرف سے زمین ہموار تھی اور چودھری جی اپنی چودھراہٹ چلا رہے تھے۔

سمیر ایک متوسط اسیر تھا اس نے شیخ کرامت کے دور دورے کو بھی دیکھا تھا اور نئے چودھری جی کی شہرت کو بھی دیکھ رہا تھا۔ کرامت اسے بہت مانتے تھے — باپ کی طرح چودھری جی نے بھی اس پر اپنا دستِ شفقت رکھا۔ سمیر نے بھی چودھری جی کی وفاداری کا بہت مرتبہ ثبوت دیا۔

آج چودھری جی اور وحید جو ایک ادھیڑ عمر کا سنجیدہ آدمی ہے۔ چودھری جی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ سمیر آ پہنچا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ سمیر نے ان کی گفتگو کے کچھ فقروں کو سن لیا تھا اس لیے اس نے پوچھا۔

"کون مولانا صاحب چودھری جی"

"ارے ایک نئے نئے چلے ہیں مولانا بننے" چودھری جی نے منہ بنا کر کہا "وہی اشرف کا ... بھلا نام ہے"

... نے سر کھجلا کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"ارے بھئی شکور دھنیا کا" — وحید نے یاد دلایا۔

"اچھا دھنیا بھی مولانا بننے کا جتن کرنے لگے۔ بھیا کل جگ ہے کل جگ" سمیر نے مربیت کی طرح اسے تسلی دیتے سمجھتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ہے بڑا سیدھا سادا آدمی" وحید نے اس کی صداقت کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔ چودھری جی وحید کی طرف پرمعنی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"مگر آپ کے طرفدار تو اس کے ساتھ بہت رہتے ہیں۔ چودھری جی یہ اچھے لچھن نہیں۔ چھوٹوں کی سنگت سے آدمی چھوٹے خیال کا ہو جاتا ہے۔ میں نے آپ کو دیکھا اور آپ کے پتا جی کو دیکھا مگر کسی نے چھوٹوں کو اس طرح منہ نہ لگایا۔ کئی بار دیکھا کہ رضیا جولاہے ان کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آخر آپ بھی تو کبھی اس عمر کے تھے مگر کیا کوئی ہنس کر بھی بات چیت کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ آپ اپنے رنگ کے لوگوں کو نہیں تو یہ لونڈا سب لے ڈوبے گا۔ منانے کا کیا سوال" سمیر نے ایسے لہجہ میں یہ سب کچھ کہا گویا سوچ سمجھ کر قدرے نصیحت کرنے چلا تھا۔ چودھری جی ہر سوال کے جواب میں سر ہلا دیتے وہ سمیر کی طرف اس طرح دیکھنے لگے گویا سمیر ان کے دل کی بات کہہ رہا تھا۔

"ارے سمیر تمہارا بیل کھیت کھا رہا ہے اور تم یہاں بیٹھے ہو۔ دوڑو! دوڑو!! جلدی دوڑو ——" [illegible] ایک نو وارد نے کہا اور سمیر دھوتی سنبھالتا ہوا ہانپتا ہوا جانب چل پڑا۔

ہاشم ایک دھنیا کے یہاں پیدا ہوا۔ اگر وہ گاؤں میں رہتا تو وہ بھی جاہل رہ جاتا۔ کیونکہ چودھری جی وہاں اسکول کھلنے میں مانع تھے۔ لیکن اس کے ماموں جان جو ایک انگریزی اسکول میں [illegible] تھے اپنے ساتھ وہیں لے گئے۔ وہاں اس نے [illegible] تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ کچھ دنوں تک [illegible] پھر جب اسے سیاسیات میں دلچسپی ہونے لگی تو اس نے اپنے گاؤں کے متعلق سوچنا شروع کیا اس کے سامنے اس کا جاہل گاؤں اور ساتھ ہی ساتھ چودھری جی کی ریشہ دوانیاں اور بانی پست ذات والوں کی درماندگی ہر وقت رہتی۔ اس نے بار بار سوچا کہ کیا کرے مگر خاطر خواہ نتیجہ پر نہ آ سکا۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ چودھری جی سے نفرت کا جذبہ ترقی کر رہا تھا۔ آج کل زمانہ میں اسے کچھ کمیونسٹ ساتھیوں سے سابقہ پڑا پھر کیا تھا۔ آگ پر پیٹرول چھڑک گیا اس نے چودھریت کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اسی [illegible] وہ اکثر

گاؤں میں جانے لگا اور لوگوں کو چودھری جی کے خلاف بھڑکانے لگا لیکن جاتا تو چودھری جی سے چھپ چھپا کر لوگوں سے باتیں کرتا۔ اور چودھری جی جیسی کہتا۔ چودھری جی بھی اسے اپنا دشمن نہ سمجھتے تھے ہاشم بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بھلا برا ذریعہ اختیار کرنا جائز تھا۔

ایک دن جب وہ اپنے دین کی تبلیغ سے لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ گھر ایک مہمان آئے ہوئے ہیں وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک ملا یا انسان اس کی تبلیغ سے محروم رہ جائے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ مہمان صاحب کے پاس گیا اور اپنے مقصد کی باتیں کرنے لگا۔ ہاشم تدریجاً اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمیونزم کیا ہے؟ —— کمیونزم کیا نہیں ہے؟ کمیونزم کیوں؟ —— کمیونزم کے بنیادی اصول —— کمیونسٹ معاشرہ اخلاق و مذہب کمیونزم کی نظر میں وغیرہ —— آخر میں اخلاقیات پر بحث چھڑ گئی۔ ہاشم نے اخلاق کو ایک لغو اور بے معنی لفظ بتلایا اور کہا کہ "یہ ایام جاہلیت کی پیداوار ہے۔ اب ہمیں اس کے متعلق سوچنے تک کی فرصت نہیں"

مہمان نے کہا "آپ اخلاق سے بھاگ نہیں سکتے۔ غریبوں سے ہمدردی رکھنا ایک اچھے اخلاق کے علاوہ کوئی دوسری شے نہیں ہے" انھوں نے کہا "جب آپ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر بھلا برا ذریعہ اختیار کرنا جائز سمجھتے ہیں تو پھر سرمایہ دار جو کہ زیادہ دولت پیدا کرنے اور اپنے آرام و آسائش کے لیے مزدوروں کے گوشت پوست کی کچھ پرواہ نہیں کرتا بلکہ آپ ہی کی طرح ہر ذریعہ استعمال کرنا جائز سمجھتا ہے کیونکر ظالم کہا جا سکتا ہے۔"

ہاشم آسانی سے شکست ماننے والا نہ تھا۔ اپنی تمام کارگزاریوں کو اتنی جلدی وہ بے معنی کہنے پر تیار نہ تھا۔ گو کہ اس کا دل مہمان کی ہر بات پر مہر تصدیق ثبت کرتا جاتا تھا مگر اس کی خود اعتمادی ہی نہیں بلکہ خود ستائی حق کے اقرار میں مزاحم تھی۔ اس نے گفتگو کو ختم کرنا چاہا۔ بالآخر ایک بہانے سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور [illegible] پلنگ پر لیٹ گیا۔ ہاشم سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ تمام رات سوچتا رہا۔ اخلاق و مذہب۔ [illegible] کی خود ساختہ اصطلاح

مگر یہ وہ انقلاب کیوں؟ اس لیے نہ کہ وہ اپنی ہستی کے واسطے سب چیزوں کو تصرف میں ناجائز سمجھتا ہے۔ آخر کیا ہے آج تک اس اصول کا پرستار نہیں رہا —— کیا جہاں آج تک اسی کی دعوت نہیں دیتا رہا —— اسی اصول کی —— اسی بداخلاقی کی۔

صبح کو ستارے جھلملا رہے تھے شرقی افق سے روشنی کا لشکر بڑھ کر تاریکیوں پر چھا رہا تھا۔ تمام گمسکے تاریک دل کو صبح اپنے نور سے منور کر رہی تھی —— صبح کو اب دوسرا ہاشم تھا۔

صبح کو نعمان جانے والے تھے مگر ہاشم نے معلوم نہیں کیوں ملاقات نہ کی ہونہ ہو اس کا یہ اعتراف شکست تھا۔ نعمان نے خود ہاشم سے ملاقات کی اور اس کو چند کتابیں برائے مطالعہ دیں —— وہ بھی کسی تحریک کے مبلغ تھے۔

دن گزرتے گئے ہاشم جس طرح کمیونزم کے پیچھے دوڑتا تھا۔ اب اسلام کو اپنا مسلک بنائے ہوئے تھا —— اس کے ماموں جان خود ہاشم کی کوششوں سے کمیونسٹ ہو گئے تھے مگر اسلام کی راہ میں انھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ انھوں نے جب ہر طرح آزما کر دیکھ لیا کہ ہاشم اب پھرنے والا نہیں اور غریبوں کا غیر مشروط طور پر حامی نہیں تو انھوں نے اسے گاؤں میں بھیج دیا۔

چھ ماہ سے ہاشم اپنے گاؤں میں رہنے لگا تھا وہ مخلص انسان تھا جس چیز پر وہ عقیدہ رکھتا اسے سب تک پہونچانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مزارعین میں اب اس کے متعلق کانا پھوسیاں ہونے لگی تھیں۔ زمیندار پارٹی تو اکثر اس کی بھویں چڑھ جاتی۔ کیونکہ بہت سے رسوم جو زمینداروں نے ہر جگہ زبردستی ٹھونس دیے تھے اور جنھیں ادا کرنا نیچے طبقے والوں کو ناگزیر تھا۔ ہاشم نے خلاف اسلام قرار دیے تھے۔ البتہ غریب پارٹی اس کی باتوں کو ضرور سنتی مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ ان قیود کو توڑ ڈالتی جب موقع آتا تو چودھری جی ہی کی بات رہتی۔

یہ سب کچھ تھا مگر ہاشم کی شرافت کا ہر ایک قائل تھا۔ دوست دشمن سب سے اس کی برائی نہیں کی جاتی تھی کہ چودھری جی بھی جو کہ اب ہاشم کو اپنی چودھراہٹ کا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کی دیانتداری کو مانتے تھے۔ انکا لڑکا ظفر ہاشم کے انداز سے اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا۔ ہاشم موقعوں سے چوکنا نہیں جانتا تھا۔ اس نے ظفر کو صحیح شعور بخشنے کی سخت کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا۔ اب گاؤں میں دو دو جگہ کام کر رہی تھیں۔ گو مخالفت کم تھی مگر اس بنا پر کہ چودھری جی کا لڑکا بھی اس جرم کا مرتکب تھا۔

ظفر کی یہ حالت دیکھ کر چودھری جی کے ہمدردوں سے نہ رہا گیا انھوں نے ایک کو کیس بنا بنا کر چودھری جی کے سامنے خوب پیش کیا۔ کسی نے کہا کہ "اب وہ ہم لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا بلکہ انھیں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے جو ہاشم کے ساتھ ہیں" کسی نے کہا کہ "اب تو وہ چماروں تک کو اپنے پاس بٹھاتا ہے" غرض جو کچھ جس سے ہو سکا سب کہہ ڈالا چودھری جی بھی اب ظفر کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ کم از کم ہمیر کی بات تو ان کے دل میں بیٹھ گئی۔

مگر کل یہ کھلا کہ پرسوں چودھری جی، مسجد کے مولوی صاحب اور دو چار آدمی اور بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے اور مشتاق چودھری جی کا روپیہ اصل معہ سود چکتا کر رہا تھا۔ اسی دوران میں ظفر بھی کہیں سے وہاں آ پہونچا۔ اس نے دیکھا کہ مشتاق گڑگڑا کر سود کی شرح کم کرنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر چودھری جی کی پیشانی پر بل تک نہ ڈال سکا۔ ظفر سے یہ ظلم اور خلاف اسلام روش نہ دیکھی جا سکی۔ اس نے نہایت مودبانہ اور نرم لہجہ میں پوچھا۔ "ابا جان آپ سود لیتے ہیں؟"

"نہیں تو" چودھری جی نے غیر متوقع سوال کے جواب میں کہا "آخر تھوڑی سی شرح پر ہرج ہی کیا ہے۔"

"ابا جان جس رقم کو آپ حقیر سمجھ رہے ہیں وہی مشتاق کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔ خدا کے فضل سے ہم مسلمان ہیں اس لیے ہم اسے مٹائیں گے، نہ یہ کہ اسے خود اختیار کریں گے۔"

لوگ ظفر کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ظفر کو چودھری جی سے اس طرح ہمکلام ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چودھری جی سامنے نیم کے تنے پر نظر جمائے ہوئے تھے۔ ان کے دماغ میں ہمیر کے الفاظ گردش کر رہے تھے۔ "یہ اچھے لچھن نہیں، ظفر [illegible] میں گھس جانے کا کیا سوال؟"

مولوی صاحب نے چودھری جی کے احساسات کو بھانپ لیا۔ انھوں نے

[illegible] دیتے ہوئے ظفر سے کہا۔ ارے میاں ظفر! تم بھی اس ہاشم کی صحبت سے باز آجاؤ۔ وہ تمہیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ ابھی تھوڑے سے ہی پانی میں پہنچے ہو۔ جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا تو پھر کوئی تدبیر کام نہ کرے گی۔"

"کیا میں نے کچھ غلط کہا مولوی صاحب؟" ظفر نے پوچھا۔
"نہیں غلط نہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چودھری جی خود اپنا نفع و نقصان سمجھتے ہیں۔ انھوں نے سر کے بال دھوپ میں نہیں سفید کیے ہیں۔" مولوی صاحب نے پان کھاتے ہوئے نہایت متانت کے ساتھ نصیحت کی۔

"سود تو ضرور نفع کی چیز ہے مگر کیا اسلام بھی اسے روا رکھتا ہے اور پھر یہ آتا کہاں سے ہے؟
"کیا غریبوں کے خون سے نہیں آتا؟"
"ارے تو کمیونسٹ ہو گیا کیا رے؟ غریبوں غریبوں چلاتا ہے۔ انگریزی اسکول میں کیا پڑھا ہے کہ باپ اور بڑوں کا کچھ احترام ہی نہیں سمجھتا ہوں ——— " مولوی صاحب ـ غیظ میں چلا رہے۔ ظفر نے مزید بات بڑھانا پسند نہ کی اور گھر کے اندر چلا گیا۔

یہ سب باتیں ہو گئیں مگر چودھری جی اپنے خیال میں غرق تھے۔ انھیں اپنے خاندان کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ ایک ہی بیٹا سو وہ بھی اس قسم کا۔ انھیں اپنے والد کا دور یاد آگیا ——— پھر اپنی کارگزاریاں یاد آئیں جن کے خیال سے ان کے چہرے پر چمک آگئی۔ مگر ظفر کے خیال نے پھر تیوری سلوٹ کر دی۔ یہ اچھی الجھن نہیں۔ انھوں نے کیسر کے حقے کو دہرایا۔ "تم اب کیا کروں؟ کیا ظفر کو [illegible] ہٹا دوں؟ مگر ابھی تو وہ آیا ہے تو کیوں نہ ہاشم ہی کو راستے سے دور کر دوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری
مگر کیسے؟ ——— گاؤں میں کافی لوگ افیم بیچتے کہتے ہیں۔ خصوصاً غریب پارٹی ——— تو پھر ——— اچھا ٹھیک۔ چودھری جی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

آج معمول کے خلاف بازار کے ہر فرد کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں جن کو دیکھیے پراگندگی کی حالت میں بھاگا جا رہا ہو۔ کسی نے رپورٹ کر دی ہے کہ اس گاؤں میں بغیر لائسنس کے افیون کی خرید فروخت ہوتی ہے داروغہ جی [illegible] ہوئے ہیں۔ تحریر آتے ہی اس تھانے پر آئے ہیں [illegible] بہت سخت ہیں

لوگوں کے گھروں میں تلاشی ہو رہی ہے۔ دین محمد دوکاندار کے یہاں ہو چکی ہے۔ کچھ نہ نکلا ——— دوسرے نمبر پر جمن کا گھر ہے اور تیسرے پر ہاشم کا۔ لیجیے ہاشم کے گھر میں پولیس کے سپاہی گھس گئے۔
"بیچارے ہاشم کے گھر میں ناحق تلاشی لی جا رہی ہے۔ اسے ہم کیا سمجھ کار ——— وہ تو بہت صاف آدمی ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "یہ شور کیسا" "مل گئی مل گئی۔"
"ارے وہ دیکھو ایک سپاہی رنگی ہوئی ہانڈی میں کچھ لا رہا ہے۔" ایک نے کہا۔
"یہ تو وہی ہانڈی معلوم ہوتی ہے جو کل چودھری جی کی چپراسی لائے تھی" مجو نے کہا۔
داروغہ جی نزدیک ہی تھے۔ انھوں نے سن تو ضرور لیا مگر کچھ توجہ نہ کی۔ انھوں نے جب ہانڈی کو دیکھا تو [illegible] ہاشم کے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا اور بدمعاش! تو ہی ہے۔ دیکھنے تو معلوم ہوتا ہے بڑے پاکباز مولانا! مگر کام دیکھو۔ چلو تھانے میں مزا چکھاتا ہوں
"جمن بھیا میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ ہاشم اور افیون۔ کیا تعلق" مجو نے متعجبانہ انداز میں کہا
"کیا کرو گے آجکل کسی کا اعتبار نہیں۔ بڑے بڑے دکانداروں کا بھی۔" جمن نے روکھے پن سے جواب دیا۔
داروغہ جی نے ہاشم کو حراست میں لینے کا حکم دیا۔ ہاشم "مثال تصویر کھڑا تھا۔" الٰہی یہ کیا عذاب؟ اس نے سوچا۔ داروغہ جی ہاشم کو لیکر چودھری جی کے مکان کی طرف چل دیے، وہاں کھانا کھائیں گے آرام کریں گے۔ لوگ پیچھے پیچھے انگشت بدندان چلے جا رہے تھے تھوڑی دیر میں چودھری جی کی بیٹھک آ گئی۔ داروغہ جی نے پستول نکال کر رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر چودھری جی سے باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے حکم دیا کہ افیون بکس سے نکال کر میرے سامنے تولی جائے۔ دو چار آدمی ترازو لینے دوڑے اور دو چار آدمی باٹ۔ آن کی آن میں ترازو اور باٹ لائے گئے۔ افیون نکالی جانے لگی ——— اس میں سے ایک کاغذ نکل کر سامنے آ گرا۔ داروغہ جی نے دیکھا فوراً منگوا لیا ——— اور دل میں پڑھنا شروع کیا۔

چودھری جی!
آداب عرض
آپ کے حکم کے مطابق تین سیر افیون روانہ کر رہا ہوں۔ فقط

آپ کا خادم

چمن لال ——— [illegible]

پانسے کو پڑھتے ہی داروغہ جی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ انھوں نے چودھری جی کو پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔ چودھری جی بھی داروغہ جی کے آثار چڑھاؤ کو دیکھ کر ہراساں ہوئے

"ہمیں کو سیاست پڑھائی جا رہی ہو چودھری جی؟"

"کیسی سیاست داروغہ صاحب" چودھری جی نے غیر متوقع سوال پر پوچھا۔

"ابھی سب کچھ معلوم ہوا جاتا ہے" داروغہ جی نے لوگوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا

"تم یہاں آؤ۔ نہیں۔ تم نہیں" انھوں نے مجو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"تم نے کس چمارن کو ہانڈی لاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"کسی کو تو نہیں ——— وہ تو پاربتی تھی ——— بھولو چمرن کی بیوی" مجو نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کون پاربتی بلاؤ" داروغہ جی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

مجو۔ پاربتی کو بلانے چلا گیا۔ داروغہ جی نے تولنے والے سے پوچھا "کتنی ہوئی؟"

"تین سیر حضور" ایک نے کہا۔

"ہوں ——" داروغہ جی نے بھوں چڑھا کر کہا۔

گاؤں کے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ ماتھے پر شکنیں ڈال ڈال کر سوچنے لگے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ ——— اتنے میں

ظفر جو کسی دن [illegible] اپنے ماموں کے یہاں گیا تھا۔ اس نے ہاشم کو حراست میں دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ بھاگا بھاگا پھرتا۔ لوگوں سے پوچھتا۔ کچھ لوگوں نے چوری کہیں ——— "ایسے ہی گودنگے چھپے ہیں" مگر ظفر نے کچھ جواب نہ دیا۔

اس عرصے میں مجو پاربتی کو لیکر آ پہنچا۔ اس نے کہا "میں ——— میں نے اسے ہانڈی ——— ہاشم کے گھر کی طرف ——— لاتے دیکھا تھا۔"

"صاف صاف بتا ——— نہیں تو ابھی ڈنڈوں سے بات کروں گا" داروغہ جی نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"چودھری جی نے تمہیں اس ہانڈی کو دیکر ہاشم کے گھر بھیجا تھا نا؟"

بیچاری پاربتی کانپ رہی تھی۔ الفاظ حلق میں آ آ کر اٹک رہے تھے اس نے چودھری جی کی طرف خوف و ہراس کی نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کر رہ گئی۔ داروغہ جی تمام معاملہ سمجھ گئے۔ انھوں نے ہاشم کو چھوڑ دیا اور چودھری جی کو حراست میں لینے کا حکم دیدیا۔ سپاہیوں نے حکم کی اسی دم تعمیل کی۔ ظفر واقعات کو بالکل نہ سمجھ سکا وہ ہاشم کے چھوٹ جانے پر اچھل پڑا

چودھری جی کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا انھوں نے اپنے کو پہلی بار گاؤں والوں کے سامنے اس حالت میں دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ظفر مسکرا رہا ہے۔

"یہ اچھے لچھن نہیں" چودھری جی نے دل میں کہا۔

سپاہی چودھری جی کو تھانے کی طرف لیجا رہے تھے گاؤں والے دانتوں میں انگلیاں رکھے ہوئے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہاشم سر جھکائے کھڑا تھا۔

——— [illegible] ———

The End.

مرزا فراست بیگ

تجربے کے بعد

نجمہ ۔ خورشید کے حلقۂ احباب ہی کی ایک لڑکی تھی ۔ اور خورشید نے اسے بچپن میں دیکھا بھی تھا ۔ وہ ایک بے مثال صورت و سیرت کی مالک تھی، اور اب تو وہ پرائیویٹ بی ۔ اے بھی کر چکی تھی ۔ آج اسے اپنے نکاح میں پا کر خورشید بے حد مسرور تھا ۔

یہ شام کا وقت ۔ دریا کا کنارہ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، خورشید ٹہل رہا تھا، کچھ گنگنا رہا تھا، اور کبھی کچھ سوچ سوچ کر مسکرا دیتا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد شفق کی سرخی بھی روپوش ہونے لگی، اور خورشید نے سمجھا کہ آفتاب اس کے لئے ڈوب گیا ۔ اور پھر صبح اسی کے لئے دعوتِ ولیمہ کا پیغام لے کر واپس آئے گا ۔

لیکن خورشید کے ذہن میں لٹکتے ہوئے سبزہ زار کو نجمہ کی تہذیبی شرم و حیا کے بادِ سموم نے جھلس دیا ۔ اسے ایک بے تکلف اور بے باکانہ ملاقات کی توقع تھی ۔ اس کے حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی ۔ اس نے سوچا یہ دنیا کتنے سو برس پیچھے ہٹ گئی ۔ نہ تو میرے گڈ نائٹ کا کچھ جواب ملا، اور نہ سگریٹ ہی قبول کیا گیا ۔ پتہ نہیں بی ۔ اے تک ہی اس نے کیا پڑھا ہے ۔ اور کیا تہذیب سیکھی ہے ۔ یہی چند باتیں دماغ میں آ رہی تھیں کہ وہ کچھ سنبھلا ۔ اور اس کے دماغ کی الجھن دور ہو گئی، اس نے اپنے دل میں کہا میرے ساتھ کلب جانے لگیں گی، تو خود ہی جھجک دور ہو جائے گی، اور سوسائٹی کے معیار پر آ جائیں گی ۔

نجمہ کو خورشید کے گھر آئے ہوئے اب تین چار یوم گذر چکے تھے خورشید اپنے اندرونی کمرہ میں کچھ متفکر بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک ہم خیال رفیقِ حیات نہیں پا سکا ۔ اتنے میں نجمہ کمرے میں داخل ہوئی، خورشید کی نگاہیں سگریٹ کے دھوئیں سے ہٹ گئیں، اس کے دماغ نے سوچنا بند کر دیا ۔ اس نے اپنے سامنے والی کرسی پر نجمہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور کہنے لگا ۔

خورشید :- یہ تم شلوار اور پورے آستین کی قمیص یا لانگ جمپر روزانہ پہنے رہتی ہو ۔ کیا تمہارے پاس وہ جمپر یا بلاؤز بھی ہے، جو بدن پر بالکل فٹ رہتا ہے، اور بانہوں کی زینت پر کوئی تسلط نہیں رکھتا ۔ کیا تمہارے پاس کوئی انگریزی سوٹ بھی ہے کیا تمہارے پاس کوئی انگلش فراک بھی ہے ۔ جس نے رانوں کے نیچے تمام پیر کے حسن کو آزادی دے رکھی ہے ؟

نجمہ :- مجھے ایسے لباس سے نفرت ہے ۔ جو عورت کے حسن و زینت کو انسان پر مباح کر دیتا ہے ۔

خورشید :- مگر حسن و زینت کو چھپانا اور عام انسانیت کو اس کے حظ سے محروم رکھنا بھی تو ایک اخلاقی جرم ہے ۔۔ خیر اسے ہٹاؤ اور بتاؤ، کہ میرے ساتھ کلب چلنے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ؟ مجھے روزانہ ندامت ہوتی ہے ۔ کلب کے تمام احباب روزانہ تمہارے انتظار میں رہتے ہیں ۔

نجمہ :- وہ میرے انتظار میں رہتے ہیں ! میں یہ سننا گوارا نہیں کر سکتی ۔ مجھے اس تہذیب سے نفرت ہے ۔ اس کی ایک ایک چیز دل پر نشتر کی طرح جا کر لگتی ہے ۔ یہ سمجھ لیجئے کہ یہ تہذیب انسانیت کو تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے ۔

خورشید :- (حیرت سے) تباہی کی طرف ؟ جس تہذیب نے انسان کو اس عروج تک پہنچا دیا ہو ۔ اور جو تہذیب کسی قوم کی ترقی کا راز ہو ۔ وہ زوال کی طرف لئے جا رہی ہے ؟ یہ آنکھ میں دھول جھونکنا ہے ۔

نجمہ :- یہ موجودہ عروج، یہ ترقی خود ۔ حقیقت میں زوال ہے ۔ اور اس تہذیب کی صرف ایک چیز ۔ کسی ایک چیز کو دیکھئے یعنی عورتوں کی بے پردگی، اور ان کا یہ نیم عریاں لباس تمدن و انسانیت کے ایوان گرا سکتا ہے ۔ قوموں کے وجود کو ختم کر سکتا ہے ۔

خورشید :- (طنزیہ انداز میں) جسم کی نیم عریانی اور بے پردگی

سے تمدن کا ایمان کرسکتا ہے۔؟

نجمہ:۔ جی۔ حسن کی نمائش کا ذوق صرف عورت مرد کے باہمی میل ملاپ، بے پردگی، بازاروں اور راتوں کی عریانی اور سینے پر کپڑے کے تناؤ پر اکتفا نہیں کرے گا، بلکہ یہ عورت اور مرد کا آزاد اختلاط انسان کے جنسی تعلق کو جانوروں کے معیار تک لے جائے گا۔ اور یہ بے پردگی تمام جسم کی عریانی پر ختم ہوگی۔ اور پھر یہ عروج اپنا نقاب چاک کر کے تحت الثریٰ کا رخ کرے گا اور ننگی تصویریں اور مجسمے یادگار کے لئے رہ جائیں گے۔

خورشید:۔ "اچھا تو اب بس کرو۔ کان پک گئے سنتے سنتے" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

خورشید کی طبیعت دن بدن نجمہ سے اچاٹ ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس کا مستقبل اس کی نگاہوں میں بہت تاریک تھا۔ یہ سوچ سوچ کر اس کی بہت سی آرزوؤں کا خون ہو رہا ہے۔ اس کے سارے حوصلے سرد پڑ رہے ہیں، وہ اپنے دل میں ایک طرح کی ٹیس محسوس کر رہا تھا، لوگ اس سے اس کی بیوی کے بارے میں پوچھتے اور یہ سوال اس کے جذبات میں ایک زبردست طوفان برپا کر دیتا جس کا اندازہ اس کے چہرے سے کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس بات سے چڑنے لگا تھا کہ لوگ نجمہ کے بارے میں اس سے کچھ پوچھیں۔ وہ اس غم کو ہمیشہ بھلانے کی کوشش کرتا تھا، نعیم اس کا ایک مخلص دوست تھا جس نے حال ہی میں پی۔ سی۔ ایس کیا تھا۔ اور ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے اسی شہر میں موجود تھا۔

خورشید کا زیادہ تر وقت اسی کے ہاں پر گذرتا تھا نعیم کی شادی بھی جلد ہی ہونے والی تھی۔ اس کی ہونے والی بیوی پروین ایک مہذب خاندان کی لڑکی تھی۔

چند روز بعد پروین بھی نعیم کے نکاح میں آ گئی تھی۔ لیکن نعیم کی قسمت خورشید کے برعکس تھی۔ خورشید کی ازدواجی زندگی کا مستقبل دن بدن گھناؤنا ہوتا جا رہا تھا۔ مگر نعیم کا ستارہ چمک گیا تھا، اس کی زندگی بہار ہی بہار تھی، پروین ایک بہت ہی پرکشش عورت تھی۔ تعلیم کی روشنی نے اس کی زندگی کے تمام گوشوں کو منور کر دیا تھا، کالج کی زندگی میں اس نے کئی ڈرامے اسٹیج کئے تھے۔ اور ان میں ہیروئن کا پارٹ بھی ادا کیا تھا۔ وہ ایک افسانہ نگار بھی تھی، قدرت نے اُسے جسمانی حسن کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان بھی دیا تھا۔ وہ نعیم کے احباب سے بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ اور اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے نہ صرف نعیم بلکہ اس کے دوستوں کے لئے بھی دل بستگی کا ایک دلفریب ذریعہ بنتی جا رہی تھی۔

نعیم کے ڈرائنگ روم میں۔ پروین۔ قمر۔ خورشید۔ احسان اور زبیر کی بارہ بارہ بجے رات تک مجلس رہتی۔ کبھی کبھی یہ پوری کمپنی ساتھ ہی سینما اور پارک کی سیر کو جاتی۔ پروین نے کلب کی ممبری بھی حاصل کر لی تھی۔ کھیل کا پروگرام ختم ہونے کے بعد پروین اکثر گانا سناتی۔ اور کلب کے ممبران سن سن کر جھوما کرتے۔

خورشید کو نعیم کی بیوی پر برابر رشک آتا رہا۔ یوں تو اُسے پروین سے ملنے جلنے، ہنسنے بولنے، گھومنے پھرنے کا موقع ملتا ہی تھا لیکن وہ سوچتا کہ وہ کم از کم بیوی تو نعیم کی ہے، نام تو نعیم کا چل رہا ہے۔ اور وہ ہاتھ مل کر رہ جاتا کہ کاش اُسے بھی ایسی ہی بیوی ملی ہوتی۔ جس کے سوشل اور مہذب ہونے کا سوسائٹی میں چرچا رہتا۔ وہ غور کرتا کہ کیا کوئی تدبیر ایسی بھی ہو سکتی ہے جس سے نجمہ کی زندگی بدل جائے۔ ایک روز وہ پروین کے ساتھ باغ میں ٹہل رہا تھا۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا وہاں موجود نہ تھا، خورشید کے دل میں خیال آیا، ایک عورت ایک عورت کو بہتر طور پر سمجھا سکتی ہے، چنانچہ اس روز اس نے پروین کو اپنا سارا دکھڑا سنایا، اور وہ نجمہ سے ملنے اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے فوراً تیار ہو گئی۔

پروین کی موٹر خورشید کے زنان خانہ کی طرف رکی۔ خورشید اُسے نجمہ کے کمرہ میں لے گیا۔ اصل گفتگو کے واسطے زمین ہموار کرنے کے لئے پروین نے پہلے ادھر اُدھر کی بات کی۔ اور پھر کہا "ہاں تو

نجمہ بہن تم سے مل کر خوشی تو بہت ہوئی، لیکن ایک بات دل میں کھٹکتی بھی ہے، کہو تو عرض کروں۔

نجمہ :- ضرور ارشاد فرمائیے۔

پروین :- یہ سن کر مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے، کہ تم عورت کی آزادی کی راہ میں حائل ہو رہی ہو۔ ہزاروں برس کے بعد آج عورت مرد کے چنگل سے چھوٹی ہے۔ اور آج وہ بھی مرد کے دوش بدوش سڑک، بازار، دفتر، پارک، سینما اور کلب گھر میں پہنچ رہی ہے۔ اس آزادی میں تمہارا عدم تعاون صرف انفرادیت کشی نہیں، بلکہ ایک اجتماعی جرم بھی ہے۔

نجمہ :- غالباً یہ صحیح نہیں ہے کہ عورت مرد کے چنگل سے چھوٹ چکی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے، کہ عورت آج ہی پورے طور سے مرد کی غلامی میں آئی ہے، تم نے سوچا نہیں کہ یہ مرد جو تمہیں کل تک غلام بنائے ہوئے تھے آج کیوں تمہاری آزادی کے لئے بے قرار ہیں، اس ہمدردی کا کیا مطلب ہے؟ — دیکھو آج تمہیں گھروں سے نکال کر سڑکوں، بازاروں، دفتروں اور پارکوں میں اس لئے لے جا رہے ہیں کہ وہاں تمہارے حسن و عصمت پر ان کی ہولناک نگاہوں اور کثیف نفس کی حکومت قائم ہو سکے۔

پروین :- (بات کاٹ کر) بہن ذرا ہوش کی باتیں کرو۔

نجمہ :- ہوش تمہیں آنا چاہئے پروین! تم کلب گھروں اور پارکوں میں مرد کے نفس کے اشارے پر ناچتی ہو۔ اور تمہیں خبر نہیں — ان کی کمینی نگاہیں تمہارے زلف و عارض میں الجھتی ہیں اور تمہیں چھین تک نہیں محسوس ہوتی، تمہاری عصمتوں پر مسلسل ڈاکے پڑتے ہیں۔ اور تمہیں استحصال پر رحم بھی نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ پروین بہن! کیا یہی ہے، عورت کی آزادی کا نقشہ؟ — ذرا اسے غور سے دیکھو۔ اس پر نفس کی نہیں ضمیر کی نگاہ ڈالو — اور پھر اس آزادی کا راگ مجھ سے چھیڑ کر میرا دل نہ کڑھاؤ۔

پروین :- اگرچہ تمہارے ہمارے خیال میں کچھ اختلاف ہے لیکن یہ بھی سن لو کہ پردے کے بندھن کو توڑ کر باہر نکلنے میں ہمارا سب سے بڑا مقصد یہ ہے، کہ ہم بھی دفتروں اور سرکاری ملازمتوں میں اپنا حق لیں۔

نجمہ :- عورت مرد کے لئے ایک فطری تقسیم کار ہے۔

پروین :- ہاں معلوم ہے۔ یہی نا کہ مرد باہر کا کام کرے اور عورت گھر میں خانہ داری کی خدمت انجام دے۔

نجمہ :- بالکل یہی — چنانچہ میرے نزدیک یہ سراسر غیر مناسب ہے، کہ عورت گھر کے کام کو ہوٹل اور بازار کے سپرد کر کے دفتروں میں سرکاری غلامی قبول کرے۔ کام کا یہ غیر فطری بوجھ اٹھانے سے تمہارے حسن و زینت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ دفتری کام کے ہجوم سے تمہارے چہرے کی شادابی ختم ہو جاتی ہے۔ تمہارے حسین بال بکھر جاتے ہیں تمہارا دماغ تھک جاتا ہے۔ اور پھر تمہارے اندر وہ تازگی اور فرحت باقی نہیں رہتی۔ کہ بچوں کی صحیح تربیت کر سکو۔ یا تھکے ماندے شوہر کی دلبستگی کا ذریعہ بن سکو۔

پروین :- اچھا خیر تمہارے خیالات تمہیں مبارک۔ میرے پاس وقت کم ہے، میں چلتی ہوں۔ فرسٹ شو کے لئے دیر ہو رہی ہے (کلائی پر بندھی ہوئی سنہری گھڑی دیکھتی ہے) — گڈ بائی —

خورشید خاموش بیٹھا اس گفتگو کو سنتا رہا۔ اور پھر پروین کے ساتھ ہی موٹر میں روانہ ہو گیا۔

نعیم کے احباب سے پروین کے میل ملاپ کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا بیشتر وقت اب دوستوں سے ملنے ملانے میں گذرنے لگا — غرض تو اس کی دوستی کے والہانہ تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ اکثر دو دو بجے رات تک ہوٹلوں کی سیر کرتی رہتی۔ نعیم کے پاس اٹھنے بیٹھنے یا بات چیت کا بھی اسے اب کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ ادھر دس بجے صاحب کی موٹر کچہری کو روانہ ہوتی اور ادھر پروین کی آنکھ کھلتی۔ میک اپ، ڈریسنگ، اور چائے کے بعد کسی دوست کے پاس روانہ ہو جاتی۔ ملنے جلنے اور کلب اور سینما کو جانے کا سلسلہ ڈیڑھ دو بجے رات تک جاری رہتا۔ اس کے بعد آ کر وہ اپنے بستر میں لیٹ رہتی۔ اس وقت تک نعیم جھنجھلاہٹ اور کڑھن کرتے کرتے سو جاتا۔

نعیم میں نئی روشنی کے اس تجاوز کو برداشت کرنے کی تاب

بلکہ اب تو نعیم اور خورشید دونوں ہی تہذیب کی گاڑی کو اس سٹیشن پر نہیں روک سکتے تھے۔ نعیم نے پروین کو کئی ایک بار کہلایا کہ وہ اپنی رفتار پر غور کرے۔ لیکن اس قسم کے اشارے کنائے اور ساری ہدایتیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ الٹا کام کر گئیں وہ اپنی رفتار میں تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ کبھی کبھی پوری پوری رات کسی رفیق کے ساتھ گذر جاتی۔ ایک روز نعیم کے کان میں ایک اور بھی بری قسم کی بھنک آئی۔ ان سب حالات نے اسے بہت اداس بنا دیا اس نے عرصے سے کلب جانا چھوڑ دیا تھا۔ سوائے خورشید کے وہ اب کسی سے نہیں ملتا تھا وہ ہمیشہ فکرمند رہتا۔ خورشید ہی اس کا تنہا غم خوار تھا۔ جو خود بھی غور و فکر کی ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا اس کے دل کی کسک جیسے کسی قسم کی ندامت سے بدلتی جا رہی تھی۔

حالات بدل چکے تھے۔ خورشید کو اپنا مستقبل اب سنہرا نظر آیا۔ لیکن نعیم کی دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ اس کا دماغ ٹھیک نہیں رہتا تھا۔ وہ صرف ایک ہی چیز ہر وقت سوچا کرتا تھا۔ خارجی حالات ہی اس کے زخموں پر نمک پاشی کے لئے کافی تھے۔ محلے اور گھر کے پڑوسیوں اور ملازمین کے حلقے میں اکثر کانا پھوسی ہوا کرتی تھی — نعیم کو وہ کسی راستے سے گذرتا تو لوگ اس کی طرف انگشت نمائی کرتے۔ اس نے نوکری سے چھٹی لے لی تھی۔ اور اب دن بھر اپنے کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ اور سوچا کرتا تھا۔ خورشید اکثر اس کی دل جوئی کے لئے موجود رہتا۔ لیکن اب اس کی باتیں زیادہ تر نجمہ کے خیالات کی ترجمانی ہوا کرتی تھیں۔

نعیم کی طبیعت بھی اب اس تہذیب کی ایک ایک چیز سے اکتا چکی تھی۔ وہ انسانیت کے احساسات اور خیالات پر بغاوت [illegible] انقلابی طور پر فکر سمندر کی طرح [illegible] رہا تھا۔ نئے فکر کے اس انقلاب نے [illegible] دھو دیا تھا۔ اس کے سامنے اب وہ شاہراہ تھی۔ اپنی زندگی کی غلاظتوں کو دھو دھا کر اور آگے پیچھے لگے ہوئے خس و خاشاک کو نوچ نوچ کر وہ اب اچھے ساتھیوں کے ساتھ اس سڑک پر چلنا چاہتا تھا۔

ایک روز پروین کہیں جانے کو تیار تھی، کہ نعیم نے اسے اپنے کمرے میں بلایا، اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر کہا، "لو یہ ہیں تمہارے مہر کے روپئے۔ اسے تو مجھے پہلے ہی دن ادا کر دینا چاہئے تھا۔ اس تاخیر کو معاف کرنا۔"

پروین :- بہت خوب لائیے روپئے کی تو مجھے ضرورت بھی تھی۔

نعیم :- اچھا یہ بھی سنو، کہ آج میں نے تمہیں اپنی زندگی سے الگ کر دیا۔ یعنے طلاق دیدی —!

پروین :- میں خود بھی تو آپ کو چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ دیکھئے یہ خطوط (ہینڈ بیگ سے نکالتے ہوئے) بمبئی کی تین فلم کمپنیوں کے میرے نام دعوت نامے ہیں۔ میں کل ہی بمبئی روانہ ہو رہی ہوں۔ یہ کہہ کر پروین اٹھ کر چلی گئی — نعیم کے سر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

نجمہ سمجھ نہ سکی تھی کہ آخر کس چیز نے خورشید کو اس کی طرف ملتفت کر دیا ہے۔ کیوں اس کی دلچسپیاں اس سے دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں — اصل میں خورشید کو ایک طرح کی جھینپ ہو رہی تھی۔ فکر و نظر بدل جانے کے بعد نجمہ سے اچھے سلوک پر تو وہ فطری طور پر مجبور تھا۔ مگر اعترافِ حق کے اظہار کو اس نے کسی خاص وقت کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔

آج نعیم سے پروین کی علیحدگی کے بعد وہ نجمہ کے کمرہ میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"لو نجمہ! تم فاتح ہو۔ اور میں نے شکست قبول کر لی۔ یعنے تم نے مجھے جیت لیا۔"

نجمہ :- آپ کی بات تشریح طلب ہے۔

خورشید :- یہی کہ تمہارے قول اور دعووں کی صداقت مجھ پر اور ساتھ ساتھ نعیم پر بھی واضح ہو چکی ہے۔ تہذیب حاضر کی چمک دمک میں چھپے ہوئے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو ہم نے سوسائٹی کے شگافوں سے جھانک کر دیکھ لیا ہے۔

کلثوم :- تو پھر اس فہم و شعور کے بعد کیا آپ لوگوں پر کچھ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے ۔؟

خورشید :- وہ ہم اور نعیم طے کر چکے ہیں ۔ یہ دنیا ایک ہمہ گیر انقلاب چاہتی ہے ۔ جس میں بقول تمہارے انسانی زندگی کی ان اصولوں پر تعمیر کی جائے ۔ جو خالق بشر نے انسان کو دئے ہیں ۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اپنی زندگی کو بدلنے اور اپنی صلاحیتوں کو اس راہ میں خرچ کرنے کی ابتداء آج ہی سے کر دی گئی ہے ۔

نجمہ :- آپ لوگوں کا یہ اقدام مبارک ہے ۔ میں آپ کی ہر حال میں معین و مددگار رہوں گی ۔

شرائط ایجنسی

۱۔ دیانتداری اور حسابات کی ادائیگی میں باقاعدگی شرط اول ہے ۔

۲۔ کم سے کم ۵ عدد پرچے منگوانے ہوں گے ۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا ۔

۴۔ سول ایجنسی کی صورت میں ۱۰۰ عدد پرچے منگوانے ہوں گے ۔

۵۔ پرچہ ذریعہ وی ۔ پی یا پیشگی قیمت آنے پر روانہ کیا جائے گا ۔

۶۔ صرف خاص صورتوں میں یہ رعایت کی جائیگی کہ پہلی دفعہ پرچہ ذریعہ بک پوسٹ بھیجا جا سکے گا ۔

۷۔ ڈاک خرچ میں صرف بک پوسٹ کا خرچ دفتر کے ذمہ ہو گا ۔

۸۔ ڈاک کی خرابی کا دفتر ذمہ دار نہ ہو گا ۔

منیجر

مزدور دشمن

"مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"

ایک خوبصورت نیو ماڈل کار ہزاروں چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے
جھوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی، سینکڑوں، غریبوں، مزدوروں اور
سیاہ آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی نہایت تیز رفتاری سے
پروڈکشن کے رفیع الشان گیٹ میں داخل ہوئی۔

دھک سے رک گئی۔ ڈرائیور اور کار میک اپ روم کے سامنے ... ڈائرکٹر ظہیر نہایت بیش قیمت دولن کے سوٹ میں ملبوس ... اس کار سے اترا۔ مسرت اور کامیابی کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں ہو رہے تھے۔

"ڈرائیور! دیکھنا فرنٹ سیٹ پر ایک فائل اور اسٹوری رکھی ہے"
ڈائرکٹر ظہیر نے سیٹ اور ٹائی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"جی بہت اچھا! لیجئے" ڈرائیور نے اسے کاغذات کا پلندہ دیتے ہوئے کہا۔ ڈائرکٹر ظہیر نے کاغذات کو فائل میں رکھا اور نہایت خوشی میں عجلت کے ساتھ میک اپ روم کے برآمدے کے زینہ پر چڑھتا چلا گیا......

"گڈ ایوننگ، ایوری باڈی!" ظہیر نے حد درجہ کامیابی کے لہجہ میں ایک خاص انداز سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا

شاید حاضرین کو ظہیر کا نہایت بے قراری سے انتظار تھا۔ ظہیر کو انتہائی مسرور پا کر وسیع کمرہ کے گوشہ گوشہ میں حرکت و حرارت دوڑ گئی۔

"کیوں! اسٹوری لیٹ ہو گئے؟" کفیل نے کرسی کا سہارا چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہم تو چار دن کچھ نا امید سے ہو گئے تھے۔ مگر سیٹھ جی کو تمہاری کامیابی کا یقین تھا"

"واہ رے میرے کامریڈ شاعر!" ظہیر نے کرسیوں سے گھری ہوئی میز پر کاغذات رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "ظہیر کے ہتھکنڈوں کو دنیا تسلیم کرتی ہے اور ایک تم ہو کہ استاد مانتے ہوئے بھی ناامید ہوئے جا رہے تھے اور سیٹھ جی! بھلا سیٹھ جی کو کامیابی کا یقین نہ ہوتا اور کیسے ہو۔

آخر اس کہانی کے پیچھے نجانے عدالت کے کتنے چکر کاٹنے پڑے" وہ خاص ... سے کہہ رہا تھا "رات دن ہم فکروں میں گھلے جا رہے تھے۔ راتوں کی نیند تک حرام ہو گئی۔ نہ وقت پر کھانا نہ وقت پر سونا ___ تمہارا خیال تھا کفیل، یہ سب دوڑ دھوپ بیکار جائے گی؟"

"بیکار تو نہ جاتی" پروڈیوسر محفوظ نے کاغذات کا پلندہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مگر ہمارے خلاف گوکل جیسا چوٹی کا بیرسٹر مقدمہ لڑ رہا تھا۔ آخری وقت تک ... پھیر کر، ان کا طرفدار بن گیا، چھوٹی موٹی رشوتیں چل گئیں۔ بہرحال بھارت بچہ والوں نے ہمیں نیچا دکھانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی" پروڈیوسر محفوظ نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"بھلا کرشن چندر جیسے بلند پایہ ترقی پسند ادیب کی لکھی ہوئی کہانی تھی، کوئی مذاق تھا؟" رمیش جو کہ پروڈیوسر محفوظ کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔ بولا۔

"اور ہمارے خلاف جتنی بھی سازشیں تھیں، سب اسی اشرف کی کارروائی تھی"

"بالکل ٹھیک ہے" رمیش کی تائید میں مس زرینہ نے کہا "بھارت میں سوائے اشرف کے اور ہے ہی کون؟ جو ہندوستانی

پبلک کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہو۔" وہ کہہ رہی تھی "آپ سے تجربہ ہو
بھارت پکچر کی پہلی دو اسلامی فلمیں بنا کر کے اشرف، مسلمانوں کی جیب سے
جس قدر بھی روپیہ کھینچ سکا ہو تقریباً اس سے آٹھ گنی دولت تو اس نے
کمپنی کی اس تیسری تصویر "سرخ انقلاب" میں مزدور کی جیب سے
بآسانی جھٹک لی ہے۔
"[illegible] کی جیب سے؟" کفیل نے [illegible]
مزدور کی جیب سے۔"
"تم نے ٹھیک ہی کہا سیمی ارجنسیر"۔ ملیش اور زرینہ کے درمیان
والی کرسی سے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے نوجوان "ایرانی"
نے منہ کھولا
"بھارت پکچر کی آج ہمیں جو شان و شوکت نظر آ رہی ہے۔ یہ محض
اسی "سرخ انقلاب" کا طفیل ہے۔ اور اسی دولت کے گھمنڈ میں تو بھارت
والوں نے کرن چندر کو بیوقوف بنا کر ہمارے ہاتھوں سے "مزدور دشمن"
چھیننا چاہا تھا"
"واہ رے بھارت پکچر! اور تیرا "سرخ انقلاب"" ظہیر نے رنگین
گلاس میں سوڈے کی بوتل سے آخری چند قطرے نتھارتے ہوئے کہا۔ "جو
کچھ ہندوستانی مزدور طبقے کی گاڑھی کمائی سمیٹ کر دولت کا انبار جمع کر رکھا تھا
اس کا بیشتر حصہ مقدمہ کے سلسلہ میں گورنمنٹ کے نمک حلال حکام کی نذر
کر بیٹھا۔ اب نہ جانے کب تک کوئی "سرخ" کہانی بھارت والوں کو نصیب ہو۔"
اس نے رنگین گلاس سے سرخ پانی کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے
کہا "سیٹھ جی آپ بجا فرماتے ہیں۔ بہت ہاتھ پیر مارے "مزدور دشمن"
نے مگر "مزدور کا دشمن" حاصل نہ کر سکے۔"
"مزدور دشمن؟" کفیل بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔
"ہاں! مزدور دشمن نہیں تو اور کیا...... وہ اشرف؟" ظہیر نے
کہنا شروع کیا،
"اس غریب نے تو "سرخ انقلاب" کے فرہ میں آ کر موت کو بھی بھلا
رکھا تھا۔ اس "سرخ" کہانی کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا۔
آخرکار کر بکڑ کر بیٹھ ہی جانا پڑا۔"
کفیل آج کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہا تھا وہ نہ جانے کس سوچ

میں تھا؟ شاید وہ سوچ رہا تھا اپنے مزدور بھائیوں کے متعلق۔ اپنے متعلق
اپنے انقلابی گیتوں کے متعلق۔ ظہیر مسلسل کہہ رہا تھا "اشرف! ہمارے
مقابلہ میں کل کا بچہ! بھلا رشوتیں دے کر کام نکالنے کے ڈھنگ کیا جانے یہ
تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا جب پانسہ ہمارے خلاف پڑتا نظر آیا۔ فوراً
ہی سیٹھ جی کو ہم نے اشارہ کر دیا اور پھر سیٹھ جی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔
[illegible]
کا جھگڑا ہی ختم کر دیا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے مشہور و معروف
ترقی پسند فن کار کی قلمی کاوش۔
"مزدور دشمن" ہمارے قبضہ میں ہے" اس نے گلاس سے پھر تھوڑی سی
شراب چڑھائی اور کہنا شروع کیا "سیٹھ جی! ہمیں اب پکچر کا نام
ڈکلیر کرنے میں ہرگز دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اور آج ہی ایڈورٹائزمنٹ کے لیے
مسٹر گپتا کو دس ہزار کا چیک کاٹ دیجیے تاکہ ملک کے تمام اخبار، رسالے
اور دیگر ذرائع سے پکچر کی شہرت ملک کے چپہ چپہ میں پھیلا دی جائے"
پروڈیوسر محفوظ ہر ایک کی بات کو بڑے غور سے سنتا رہا۔
وہ نہ جانے اس بات چیت سے کونسی گتھی سلجھانا چاہتا تھا۔ اس کے
چہرہ کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ آج کامیابی کے باوجود نہ جانے کیوں کچھ
تھکا اور غیر مطمئن سا ہے۔ چیک کا نام سن کر وہ کچھ چونک سا گیا۔
"اسٹوری کی قیمت کے علاوہ اسٹوری حاصل کرنے میں کافی روپیہ
صرف ہو چکا ہے اور پھر شوٹنگ سے پہلے اس نام نہاد کامیابی کے سلسلہ میں
ایک بہی چوڑی ڈزپارٹی کا بندوبست بھی ہمیں مجبوراً کرنا ہی ہوگا" محفوظ نے
گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"خرچ کی آپ بالکل فکر نہ کیجیے سیٹھ جی!" ظہیر نے میز سے گلاس
اٹھاتے ہوئے کہا "دیکھنا صرف یہ ہے کہ زمانہ جس چیز کی طرف اندھا دھند
دوڑا چلا جا رہا ہے ہمارے پلے بالکل وہی چیز پڑی ہے یا نہیں؟"
اور پھر یہ تو میرا بیس سالہ تجربہ ہے" ظہیر نے میز پر کہنیاں ٹیک کر ہنستے ہوئے
کہنا شروع کیا۔
"ایک زمانہ وہ تھا کہ دھارمک ڈراموں سے شہری ہندوؤں کے
باوجود دیہاتیوں اور گنواروں تک کو اس قدر بیوقوف بنایا گیا کہ ایک
دھارمک پکچر سے ایک نئی فلم کمپنی کی بنیاد پڑتی رہی، پھر ایک دور آیا کہ فلمساز

کی نگاہیں مسلمانوں کی جیبوں پر پڑیں اور انھوں نے کھٹا کھٹ اسلامی تاریخی پکچر تیار کرنے شروع کر دیے اور مسلمانوں سے اس زمانہ میں اسقدر روپیہ جھٹکا۔ اسقدر روپیہ جھٹکا کہ دولت کے انبار لگ گئے ایک تاریخی پکچر میں مسلمانوں سے اتنی دولت سمیٹ لی جاتی کہ بآسانی اسی رقم میں تین تین فلمیں تیار ہو جائیں۔

رمیش، رزمینہ اور ایرانی، ظہیر کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو غور دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں انتہائی دلچسپی سے سن رہے تھے، کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کسی بات پر ہنس بھی دیتے مگر—!

پروڈیوسر محفوظ اور کفیل آج کی گفتگو میں نہ جانے کونسا پہلو ٹٹولنے میں محو تھے وہ دونوں ہر بات بڑے ہی انہماک سے سن رہے تھے ظہیر — جی کی رو میں بہا کہے جا رہا تھا!

"وہ فلمساز! جو کسی مقصد کے تحت یہ تجارت کر رہے ہیں آجکل زمانہ کی ہوا کو دیکھتے ہوئے، مزدور کی ہمدردی میں "سرخ کہانیاں" فلما فلما کر اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں۔ اور بے انتہا دولت کما رہے ہیں! مجھے یقین ہے سیٹھ جی! کہ ہماری کہانی فلم پر چڑھ کر بس ریلیز ہو جائے پھر آپ دیکھیں گے۔ یہ ہماری آج کی بہائی ہوئی دولت۔ صرف وصول ہی نہیں ہوگی" اس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بلکہ ڈالروں کے انبار لگ جائیں گے ہمارے سامنے اور جس شہر میں بھی ہماری پکچر پہنچے گی۔ میرا خیال ہے کون ایسا مزدور ہوگا۔ جو ایک وقت کا فاقہ برداشت کر سکے! اپنے دشمن کو داستان بیچتے ہوئے پردہ پر دیکھنے نہ پہنچ جا سکے۔؟"

"مزدور؟ اپنے دشمن کو؟" محفوظ نے ایک عجیب طرح گھگھی باندھتے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! مزدور کا دشمن" ظہیر نے مسکراتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا!

"ہمارے پکچر کا نام ہوگا— میری رائے میں "

"میں جانتا ہوں! یہ ہماری کہانی کا نام ہے" پروڈیوسر محفوظ نے اسی طرح سنجیدگی سے کہا "مگر میں پوچھتا ہوں کہ مزدور کا دشمن ہے کون؟"

"ارے سیٹھ جی! آپ بھی کیا بات پوچھ رہے ہیں" ظہیر نے مگر بڑے

کے دھوئیں سے حلقے اڑاتے ہوئے کہا!

"سرمایہ داروں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے بھلا مزدور کا دشمن اور اسی اندھی تقلید کا کرشن چندر نے بھی اپنی کہانی میں اظہار کیا ہے"

"نہیں مزدور کا دشمن! سرمایہ دار نہیں۔ ہم ہیں! ہم ہی۔۔۔"

محفوظ نے کاغذات کا بلندہ میز پر پٹختے ہوئے کہا "اس لئے ہم ہی ہیں مزدور کے دشمن! اس کے بچوں کے دشمن! اس کے خاندان کے دشمن! اور اس سے بڑھکر اپنے ملک کے دشمن، کہ جہاں بیشتر عوام مزدور پیشہ ہیں"

"سیٹھ جی آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم تو مزدوروں کے۔۔۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا کفیل" محفوظ نے کفیل کی بات کاٹ کر کہا۔

"تم صرف زمانہ کے ساتھ بہکر انقلابی گیت لکھنا جانتے ہو اور کرشن چندر سرخ کہانیاں"

محفوظ کی آواز میں حرارت تھی اور لہجہ میں سختی وہ کہے جا رہا تھا۔

"ہماری کہانی فلمائی گئی— "مزدور دشمن" ریلیز ہوگئی"

سب حیرت زدہ تھے اور سنسنی خیز انداز سے محفوظ کی طرف متوجہ تھے۔ وہ کہہ رہا تھا

"میں نے دیکھا! مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سینما ہال کے اندر اور باہر بھیڑ بکریوں کی طرح مزدوروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے ہیں اور خود فراموش انسان آنے والی کل سے بالکل بے خبر اپنے بیوی بچوں کا حق، اپنی گاڑھی کمائی، فلمی لباس میں کوشش چیز کم رہے ہیں اور اسے اپنی دماغی تفریح اور فلمساز کو اپنا غمخوار سمجھتے ہوئے اس کی تعریفیں کر رہے ہیں"

وہ چپ ہوگیا! نہ معلوم کیوں سب خاموش تھے کچھ دیر بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا! مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ایک مزدور کی معصوم بچی کئی روز سے بیمار ہے شب و روز کی تھک دوڑ میں پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے کسی طرح دوا کا بندوبست کر لیتا۔ اور کسی روز دوا نہ کر پانے پر بچی کی محبت میں تڑپ اٹھتا اور دن بھر مغموم رہتا مگر آج — پیٹ کا حیوانی تقاضا پورا کرنے کے بعد اسکے پاس پیسے تھے۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ "پچھلے" دو روز تک دوا

...ظالم نہ ہونے سے بچی کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔ پھر بھی وہ عقل کا اندھا
حیوانی آنکھوں سے اپنے دشمن کو دیکھنے کی خاطر ہماری فلم دیکھنے کے لیے
سینما پہونچ جاتا ہے ..... " پھر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ سب
بے چینی سے سن رہے تھے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا۔ محفوظ نے ایک
ٹھنڈی سانس کھینچنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے
بے خبر انسان پکچر ختم ہونے کے بعد جب گھر پہنچتا ہے تو بچی اپنے
باپ کو دیکھتی ہو اور آخری بار اس کا نام لیکر دم توڑ دیتی ہو۔ یہ بدنصیب
انسان یہ دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے چلانے لگتا ہو! اور دھاڑیں مار مار کر
رو لینے کے بعد جب سوچتا ہو تو محسوس کرتا ہو ..... اس وسیع ترین
دنیا میں میں بے بس ہوں! تنہا ہوں! مجھے کسی کا سہارا نہیں، کاش
میں بھی امیر ہوتا، میرے پاس بھی دولت ہوتی، اور اس کی نظر
سرمایہ دار کی زندگی پر پڑتی ہو، وہ رشک کرتا ہو، اس کے خلاف اپنے
سینہ میں جلن محسوس کرتا ہو اور سرمایہ دار کو اپنا دشمن سمجھ بیٹھتا ہو؟
مگر نہیں مزدور کا دشمن سرمایہ دار نہیں، مزدور خود اپنا دشمن ہو اور
..... ہم بھی مزدور کے دشمن ہیں، ہم سب ..... یہ سارے فلمساز:
کاش یہ عقل کا اندھا مزدور عقل کی روشنی میں اپنے دشمنوں کو
دیکھنے کی اور اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے ۔۔ !! ۔۔۔

ظاہر ہے ہم نہیں فلما سکینگے یہ کہانی! یہ سراسر مزدور دشمنی ہے۔
سراسر ظلم ہو۔ یہ گناہ ہم سے نہ ہو گا۔ پروڈیوسر محفوظ کی آواز ڈوبتی چلی گئی
اور وہ ایک گہری سوچ میں محو ہو گیا۔

ظاہر ہے کفیل وہ دونوں نوجوان اور زرینہ! سب کے چہروں پر
سنجیدگی دوڑ گئی۔ وہ نہ معلوم کس محویت میں غرق تھے ــــ کمرہ پر
عجیب قسم کی خاموشی طاری تھی۔

مگر اب ـــــــــ کہانی فلمائی نہ جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا
ہے سیٹھ جی؟ "

کفیل نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا " اور پھر کہانی تو ایک
بڑے مزدور دوست کرشن چندر کی لکھی ہوئی ہو۔ اگر یہی مزدور دشمنی ہو
تو ایسی کہانی کیوں لکھتا؟

" زمانہ کے بہاؤ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرخ کہانیاں
اور کتابیں لکھ لکھ کر دولت کا پجاری کرشن چندر دولت سمیٹ رہا ہو اور تم
اُسے مزدور دوست سمجھ رہے ہو؟ محفوظ نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا
" اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تم صرف نظمیں اور گیت ہی لکھ سکتے
ہو کفیل ـــ اور زمانہ کی افراتفری سے واقف ہوتے ہوئے بھی تم
اندھوں کی دنیا بسانا چاہتے ہو! کہانی نہیں فلمائی جائے گی کفیل شاید
تم نہیں سمجھے " وہ مسلسل کہہ رہا تھا

" یہ مزدور دوست شاعر! جذباتی اور انقلابی گیت گا گا کر، مزدور کے دل
میں سرمایہ دار کے خلاف، بغض و حسد کی آگ بھڑکا دیتے ہیں، اور مزدور
اس آگ سے تلملا کر، عقل سلیم کھو بیٹھتا ہو۔ اور اسے اپنے حق میں سوچنے کا
موقع تک نہیں ملتا۔

مزدور دوست، ادیب اور مصنف سرخ کہانیاں اور کتابیں
لکھ لکھ کر، دولت جمع کرتے ہیں۔ اور غریب مزدور کو حیوانی مساوات کے سبز
باغ دکھا دکھا کر اُس کے فکر و نظر پہ چھا جاتے ہیں اور اُس کے پاس
خود کو پہچاننے کے لیے عقل و خرد کے نور کی ایک کرن بھی نہیں چھوڑتے
یہ مزدور دوست لیڈر مزدور راج کے بہانے اپنے ہی چند گنے چنے بااخلاق
لیڈروں کی حکومت جمانے کے خواب دیکھتے ہیں اور بیچارے سادہ لوح مزدور ان
کو بھیڑ بکریوں کی طرح اندھیرے غار کی طرف ہانکے لیے جا رہے ہیں تاکہ
دنیا کا ستایا ہوا غریب مزدور پناہ لینے کی خاطر اس اندھیرے غار میں بغیر
سوچے سمجھے اتر پڑے، اور جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی آزادی بھی
آج کے درندہ صفت انسان کے سپرد کر دینے پر مجبور ہو جائے۔ "
یہ شاید اس کے دل کی آواز تھی وہ حقیقی جذبات میں کہے جا رہا تھا۔
کفیل! جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کا انسان جب اپنے خاندان کا
دوست نہیں، اپنی قوم کا دوست نہیں، اپنے ملک کا دوست نہیں، اپنے پیدا کرنے والے
کا دوست نہیں، یہ مذہب و اخلاق سے آزاد آج کا انسان خود اپنا دوست
نہیں، تو پھر وہ احمقوں کی جنت میں بستے ہیں جو یہ امید رکھتے ہیں کہ اس
درندوں سے بھری ہوئی دنیا میں مزدور ہی کا کوئی دوست ہو گا؟ " پروڈیوسر
محفوظ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، جیسے اس کا دل مزدور
کے درد سے بھر اٹھا ہو، اُس کے چہرے سے غم و غصہ کے آثار نمایاں تھے
وہ کہہ رہا تھا۔

"کفیل! یہ کہانی فلمائی نہیں جائے گی۔ میں اسے پھاڑ ڈالوں گا۔

میں کرن چند جیسے مزدور دشمن کا دماغ نوچ کے رکھ دوں گا"

کفیل، ہم مزدور کو بھیانک غار میں گرنے سے بچائیں گے۔ ہم مزدور دشمنوں کے خواب کبھی پورے نہیں ہونے دیں گے۔

محفوظ کی آواز پھر کسی گہری سوچ نے جذب کرلی۔ اور وہ کسی نامعلوم شے کو گھورنے لگا۔ وہ سب سر جھکائے اپنے اپنے طور پر کسی گتھی کو سلجھانے میں محو تھے جیسے وہ پروڈیوسر کی نا جیبی اتوار سے جوا کر رہے ہوں۔ کمرہ کی ہر شے پر سکوت طاری تھا، اور کفیل کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے . . . .

"آپ بالکل حقیقت بیان کر رہے ہیں سیٹھ جی" کمرہ کی خاموش فضا میں کفیل کی آواز نے ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "آج آپ نے میری آنکھوں سے خود غرضی کے پردے ہٹا کر میرے دل و دماغ پر حقیقت کی روشنی بکھیر دی ہے، مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں زندگی کے ایک تاریک اور گھناؤنے پست ماحول سے اٹھا کر کسی روشن اور بلند مقام پر لا کھڑا کر دیا گیا ہوں اور اب اس روشنی میں انسانی زندگی کا صحیح مقصد میری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔" وہ کہتا گیا "مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے سیٹھ جی کہانی ہرگز فلمائی نہیں جا سکتی۔ یہ مزدور دوست کردار کے بجائے مزدور دشمن ہے۔" کفیل خاموش ہو گیا۔ محفوظ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، وہ سیٹھ رئیس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بے ساختہ کفیل نے کہنا شروع کیا۔

"ہرگز نہیں! کہانی ضرور فلمائی جائے گی۔ ہم یہ فلم ضرور تیار کریں گے"

سب چونک پڑے، جیسے ان کی مرضی کے خلاف کسی نے ان کے سامنے ایسے ہنگامہ خیز بات کر دی ہو جیسے کسی نے ان کی محبت کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہو۔ کفیل کا چہرہ انتہائی خوشی میں تمتما اٹھا۔

اس نے مسرت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا "اب ہم صحیح معنوں میں دنیا کے سامنے "مزدور دشمن" کو ظاہر کر سکیں گے۔ کہانی کرن چندر کی نہیں ہوگی بلکہ کہانی میں خود لکھوں گا ——— میں خود ہی ——— ہماری پکچر صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں جائے گی جس سے آج کا مذہب و اخلاق سے آزاد انسان پردہ پر خود اپنی کہانی دیکھ کر عبرت و سبق حاصل کرے گا ———" محفوظ اور ظہیر بے حد خوش تھے اور کفیل کی گفتگو پورے انہماک سے سن رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"میں اپنی کہانی میں اندھوں کی دنیا اور احمقوں کی جنت پیش کروں گا۔ تاکہ آج کا مزدور اپنے دوست نما دشمن کو دل کی آنکھوں سے دیکھ کر اچھی طرح پہچان سکے"

سب کے چہروں پر مسرت کی لہر پھیل گئی، جیسے کفیل کی آواز ان سب کے اپنے دل کی آواز ہو، کمرہ کی ہر چیز انھیں خوشی میں جھومتی نظر آ رہی تھی۔

"میں تمہارے سچے جذبات کی قدر کرتے ہوئے تمھیں مبارکباد دیتا ہوں مسٹر کفیل،" پروڈیوسر محفوظ نے بے حد مسرت سے کہنا شروع کیا "تمہاری کہانی ضرور فلمائی جائے گی۔ انسانی اخلاقیات کی تعمیر آج سے ہمارا مقصد ہوگا اور یہ کام ہم نفع بازی کے تصور سے بالاتر ہو کر کریں گے"

"ہیرو، ہیرو، ہیرو، ہیرو" ڈائرکٹر ظہیر نے خوشی میں اچھلتے ہوئے کہا،

"سیٹھ جی! اب ہمیں پکچر کا نام ڈکلیئر کرنے میں ہرگز دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ اور آج ہی ایڈورٹائزمنٹ کے لیے مسٹر گپتا کو چیک کاٹ دیجئے تاکہ ملک کے تمام اخبار، رسالے اور دیگر ذرائع سے پکچر کی شہرت ملک کے چپہ چپہ میں پھیلا دی جائے۔"

"مگر جانتے ہو پکچر کا نام کیا ہوگا؟" پروڈیوسر محفوظ نے اٹھتے ہوئے شوخی سے دریافت کیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور یک زبان ہو کر بولے ———

"مزدور دشمن" !!! ———

اختر [illegible]

امتحان

[illegible] بڑے شہر شمر نے کہنا شروع کیا: "تمہارے والد اپنے پیچھے ایک کثیر جائداد چھوڑ گئے ہیں جو ان کی زندگی کی ساری دولت [illegible] کا [illegible] ان کی دلی خواہش تھی [illegible] باپ کی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد [illegible] بھی [illegible] سے بچے دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے بے سہارا نہ رہ جائیں۔ [illegible] ایک [illegible] بھی اور وصیت کی ہے [illegible] کا [illegible] [illegible] اور [illegible] تقسیم کر دیا جائے [illegible] تمہارا [illegible] اس کے سوا کچھ نہیں [illegible] مرحوم باپ کی عزت [illegible] ایک [illegible] کا بار تمہارے کاندھوں پر آ گیا ہے خیال رہے کہ [illegible] اپنے والد کی [illegible] دنیا چھوڑ [illegible] خدا کا شکر ہے کہ آج میں ایک بڑے بوجھ سے بخوبی آزاد ہو گیا۔ اب صرف ایک ہی فکر ہے کہ [illegible] کے ہاتھ [illegible] کر دوں۔ بس [illegible] کا انتظار کر رہا ہوں ...... اچھا اب تم جا سکتے ہو۔" اکرم اور نعیم سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ بگڑ [illegible] عبداللہ کی [illegible] نظروں سے باہر [illegible] اکرم کا [illegible] اور اس کی آنکھوں میں [illegible] چھپی [illegible] ہونٹوں پر ایک [illegible] آ کر رہ گئی۔ پھر اس نے نعیم کو دیکھا جس کی افسردہ آنکھیں اپنے چاروں طرف [illegible] کے [illegible] رہی تھیں۔ سخت [illegible] نازک، جوانوں کے [illegible] بچوں کے [illegible] کے ......

[illegible] رہے ہیں، نعیم نے [illegible] ہے کہ اس زندگی [illegible] کیا ہو رہا ہے؟ سب [illegible] ہے ٹھیک ہے کہ انسان کو بری باتوں سے بچنا اور اچھی باتیں اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان سے [illegible] ہے نام ہوتا ہے اپنے [illegible] سے بیشتر [illegible] سے نفرت کرتے ہیں [illegible] انسان [illegible] تھا کہ عقل کے [illegible] اور دل کی [illegible] ...... [illegible] کیا کہتے ہیں حضرت [illegible] کتاب پھر اٹھائی اور زور سے پڑھنے لگا [illegible] بے شک یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے تاکہ [illegible] زندگی کے [illegible] اس [illegible] زندگی میں اپنے اعمال کے حساب سے [illegible] مستحق قرار دیے جائیں [illegible] ایک شخص نیکی کرتا ہے [illegible] کوئی فائدہ [illegible] ایک شخص بدی کرتا ہے [illegible] کوئی نقصان [illegible] ہم ہزاروں مثالیں [illegible] ہیں کہ ایک شخص [illegible] نقصان [illegible] ایک دوسرے شخص نے بدی کی اور وہ [illegible] کرتا رہا اس قسم کے واقعات کو دیکھ کر عقل مطالبہ کرتی ہے [illegible] نیکی کا اور [illegible] کا پھل ملنا چاہیے۔ سارے معاملات کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہوتا۔ اس لیے انسانوں کی یہ فطری ضرورت ہے کہ [illegible] حالات پر [illegible] کے ساتھ ہر ایک کا فیصلہ [illegible] جائے ...... [illegible] کر [illegible] زبان [illegible] نعیم نے تنقید کی اور کتاب کو [illegible]

خفارت سے میسز کے آخری نوٹ پھینک دیا۔ "نعیم بھائی کہاں جا رہے ہیں؟"
"کون اکرم؟ آؤ۔" "آداب عرض ہے" اکرم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا
"آداب۔ بیٹھو۔ کہاں رہتے ہو آج کل؟" نعیم جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیا عرض
کروں کچھ ایسی کاروباری الجھن میں پھنسا ہوا ہوں کہ سر اٹھانے کی
مہلت نہیں ملتی" "آخر ایسا کون سا کاروبار ہے کہ تم کبھی نظر نہیں آتے" نعیم نے زیر لب
مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ روئی کا بھاؤ چڑھنے والا ہے [illegible]
دس لاکھ روپیہ کی خریداری کر ڈالی۔ روپیہ کچھ میرے پاس تھا باقی ادھر ادھر سے قرض
بنا لیے۔ خیال تھا اکرم سے کہ پانچ لاکھ کا فائدہ ہوگا مگر بدقسمتی سے باہر سے
روئی کے کئی جہاز آ گئے۔ بھاؤ ایک دم گر گیا اپنا روپیہ تو ڈوبا [illegible] حصہ داروں
کو کیا جواب دیا جائے یہی فکر سوہان روح بنی ہے"

"اور یہ روئی کس گودام میں رکھی ہے؟" نعیم نے غور سے اکرم
کی طرف دیکھا "وہ۔۔۔۔۔ وہ اپنے گودام میں تھا۔۔۔" اکرم گھبرا گیا
"ہاں وہ سمجھا اگر دام وہ ہی ملیں باقی آگ لگ جائے اس کا کیا کرتا۔۔۔ تم اپنی حرکتوں
سے باز نہیں آؤ گے" "جی [illegible]" "مجھے بنانے کی کوشش
مت کرو اکرم میں سب جانتا ہوں" اور اکرم جو شاید اداکاری کا پورا کمال صرف
کرنے پر تلا تھا یکدم اٹھ کر نعیم کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگا "مجھے معاف
کر دیجئے نعیم بھائی اب خاندان کی عزت آپ کے ہاتھ ہے میں قرض کے بوجھ
سے دبا جا رہا ہوں مجھے بچا لیجئے اگر کل تک روپیہ ادا نہ کیا تو مجھے جیل
جانا ہوگا۔ اللہ میری مدد کیجئے" اکرم نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "یہ کیا
کر رہے ہو اٹھو کتنا روپیہ چاہئے؟" "دس ہزار" "دس ہزار؟ میرے
پاس اس وقت اتنا روپیہ نہیں ہے" "تو چیک لکھ دیجئے۔ بڑی مہربانی کا احسان
عمر بھر نہ بھولوں گا" [illegible] "احسان کیسا میں آخر تمہارا
بھائی ہوں۔ لو اب [illegible]" نعیم نے [illegible] اچھا [illegible]
[illegible] سنبھل جاؤ [illegible] دس دن کا مگر
[illegible]
[illegible]
[illegible] اکرم نے [illegible] جواب دیا [illegible]
[illegible] "ارے میاں عبید" نعیم نے [illegible]
[illegible] ایک [illegible] آ گیا دیکھو میرے سونے [illegible]

"میز پر میری چیک بک رکھی ہوئی ہے ذرا اٹھا لاؤ"

"اخاہ۔ آئیے آئیے۔ ہوشیار باش نواب اکرم صاحب بہادر
تشریف فرما ہیں" مسعود نے کہا اور یاران طریقت کے بلند قہقہوں سے
کمرہ گونج اٹھا۔ "میں نے کہا کل بھی تمہاری یاد آئی تھی" محبوب
نے اکرم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا "خالی؟ یار روپے کا [illegible] چھا گیا ہو
آج تک۔۔۔۔۔" "یہ دیکھو" اکرم نے پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا
"پورے دس ہزار ہیں دس ہزار" "ارے واہ میرے شیر ببر
حضور نواب کو مبارک باد" شوکت نے اکرم کی پیٹھ ٹھونک ڈالی
"ارے بس کنگال کر لوٹ گئی" "مگر صاحبزادے یہ دس ہزار
کب تک چلیں گے" مسعود نے کہا "ابے گھبراتا کیوں ہے جب ہم [illegible]
[illegible] جب یہ ختم ہو جائیں گے تو وہ [illegible] پارہ پارہ ہو جائیں گے" اکرم نے سینہ
تان کر جواب دیا "اس [illegible] کیا ہے؟" "مارے اشتیاق کے سب
مرے جا رہے تھے" "وہ عبید ہے نا۔ وہ پھوپھی کا بچہ نعیم صاحب کے
مارے ہمدردی کے اپنی [illegible] لے لیا ہے" "ہاں ہاں پھر"
"[illegible] سے توڑ لیا ہے اس جانب نے" اکرم نے مسکرا کر دوبارہ
[illegible] "اس سے کیا ہوا" محبوب بول اٹھا "میرے یار پہلے پوری
بات تو سن [illegible] ہاں تو تم جانتے ہو کہ نعیم صاحب
[illegible] ڈائریکٹر ہیں پورے بینک کی چابیاں انہی کے
پاس رہتی ہیں بس عبید کے ذریعہ ادھر چابیاں آئیں اور ادھر کھل جا سم
سم۔ کیا سمجھے" "واہ واہ" سب چیخ کر اکرم سے لپٹ گئے "ارے [illegible]
[illegible] کوڑی لائے ہو" شوکت نے پھر پیٹھ ٹھونکی "ارے بابا ان
چھوکروں سے تو صاف ہی رکھو مگر یار کہیں بھانڈا پھوٹ گیا تو" مسعود
نے کہا "تم بھی [illegible] اکرم ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا۔ وہ
[illegible] کہ بھائی صاحب [illegible] آئیں گے [illegible]
رنگ صاف الگ" اکرم نے جواب دیا۔ "[illegible] آدمی" محبوب نے پھر
[illegible] اکرم کا [illegible] اب [illegible]
[illegible] آج کا دن [illegible] گزر رہا ہے
"حاضر [illegible]" دوسرے کمرے سے آواز آئی [illegible] تھوڑی دیر

(ر)ملی جان چھم چھم کرتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ آگے آگے استاد جی تھے اور پیچھے پیچھے وہ تین سازندے۔ "اب جیب سے کچھ نکلے گا یا نہیں۔ آمدو رفت ختم ہو چکا ہے" مسعود نے ہنس کر کہا "کیوں نہیں۔ لینا استاد جی واسطے (پ)اس کی تین...... سمجھ گئے نا" اکرم نے سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا اور استاد جی معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"ذرا سنبھل کے اکرم" شوکت نے کہا "کیا ہوا؟" اکرم نے پوچھا "میرا خیال ہو کہ بینک کے ساتھ ساتھ فہیم صاحب کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ کیا نقصان ہے" شوکت نے چپکے سے کہا۔ "ناشتہ میں۔ آخر جینا ہمارا کا گرد۔ اچھی بات ہو تو پہلے انہیں سے نپٹ لیں گے" پہلے بعد میں ہیں دونوں ایک ساتھ "یہ کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں" مسعود نے پوچھا اور اکرم نے آنکھ کے اشارے سے کہا "ایسے خفیہ راز کی باتیں دوسروں کے سامنے" مسعود نے پھر کچھ کہنا چاہا کہ طبلے کی تھاپ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

شہر بھر میں لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ نیشنل بینک کے مینیجنگ ڈائریکٹر اور شہر کے سب سے بڑے تاجر فہیم مرزا نے بینک کا تین لاکھ روپیہ غبن کر لیا۔ خوب خوب مقدمہ چلا آخر ایک سال پورا ہوتے ہی مقدمے کی کارروائی زور شور سے جاری تھی۔ بینک کی طرف سے لازم کا اہم عبد اس کا بھائی اکرم اور بینک کے ملازمین نے زبردست شہادت دی جرم ثابت ہو گیا اور عدالت نے فہیم کو دو سال قید کی سزا کا حکم سنایا۔ اکرم اور اس کے دوستوں کے دلوں میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ ممی کے سوانح جلا دیے گئے۔ شاندار پارٹیاں ہونے لگیں اور...... ایسی کی محفلیں ملاقاتوں کے پیچھے فہیم سوچ رہا تھا

[illegible] دنیا کتنی مشکل [illegible] کہا جاتا ہے "اپنی زندگی کا ایک [illegible] واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے [illegible] عبد و ناتواں سے تنگ آ کر جان دے رہا تھا [illegible] کے کمرے سے نکالا۔ ہم طرح کی راحت دی [illegible] اس پیچھے وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر کچھ بھی ثابت کرے۔ وہ مکار شوکت بھائی [illegible] ان کی پرورش

کا جیل بنا کر مجھ سے سیکڑوں نے چھا ہے۔ میں نے اس کی مدد کی کیا اس لئے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں بیٹھ کر خلاف ایک ہتھیار بن جائے اور وہ کم ظرف محبوب جس نے اپنی مفلسی کا رونا رو کر تعلیم جاری رکھنے کے بہانے ہزاروں روپے ہتھیا لئے۔ میں نے اس کے ساتھ کیا کہ اس دن کے لئے تو وہ ایک بے نیاز شب میں رنجیدہ [illegible] جیل بھجوانے میں معاون بنے ۔۔۔ اور فہیم نے بڑی ضرورت سے کوشش کیا کہ جسے کبھی اپنی بینک کا کھیل نصیب نہ ہوا اسے یاد آیا کہ جو [illegible] پائی اور ترقی ختم کر لی۔ مرنے کا ارادہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تو سب [illegible] زندگی بازی کی قدر ہو جاتی ہے۔ اس نے غریبوں کو [illegible] کے لیے کمبل بانٹے اور اسکے دیکھا دن ہوا کہ ان میں سے اکثر چور بازار میں کپڑے کی دکان پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے یتیم لڑکیوں کی شادی میں روپیہ اور زیور دیئے کہ دنیا اس کی فیاضی [illegible] اور بے کس و بے نوا لڑکیاں سماج کی پیشانی کا کلنک ہونے سے بچ جائیں مگر چند ہفتوں کے بعد زیورات غلام حسن کی بیٹھک میں بک گئے۔ اور پلنگ کے ڈوریوں پہ وہ چھما چھم آوازیں گھنگھروں کی جھنکاریں گونجنے لگیں۔ اچانک فہیم کے تصور نے اس کے سامنے اکرم کی تصویر لا کھڑی کی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے کئی قطرے جیل کی تنگ کوٹھری کے سنگین فرش پر گر پڑے۔ اس نے سوچا۔ جب اپنا سگا بھائی ہی دشمن ثابت ہوا تو غیروں کا کیا گلہ۔ [illegible] اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا [illegible] خواہوں کے تقاضوں سے [illegible] میں نے اپنا بھائی سمجھ کر اس کی مدد کی [illegible] ایسا چھین رہے اس نے [illegible] کی [illegible] اور احسانوں کا بدلہ [illegible]

[illegible]

عزیز و اقارب [illegible] تعلیم کے رشتے اس حقیقت کو جانتے تھے اسی لیے ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں ان کی آرام گاہ قرار پائیں۔ انھوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا [illegible] اور [illegible] جگہ ان کی [illegible] وہ [illegible] سوچتا [illegible] ختم ہو گئے [illegible] فیصلہ کر چکا تھا [illegible] کرنے کا۔

اس نے جیل سے باہر آ کر دیکھا [illegible] پگڈنڈیاں اور [illegible] دنیا [illegible] اس کا دل بھی ڈگمگا گیا مگر فوراً ہی [illegible] کامیابیاں یاد آئیں اس نے [illegible] سے سڑک پر [illegible] دیا اور تیز تیز قدموں سے اپنے [illegible] گھر کی طرف چلا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گھر جہاں اس نے زندگی کی [illegible] بہاریں [illegible] عزت اور [illegible] گزاری [illegible] ویران پڑا ہوگا۔ [illegible] کے ساتھ عزت [illegible] آرام گاہ بنا ہوا [illegible] ہوگا۔ [illegible] جب اس نے گھر کو [illegible] عزت [illegible] سے آراستہ پایا [illegible] نفاست اور [illegible] باہر آ [illegible] تھے [illegible] شادی [illegible] دنیا [illegible] نسیم [illegible] دیکھ کر [illegible] حیران ہو گئے

میں تمھیں بتلاتا ہوں۔ یہ سب تمھاری کامیابی کی خوشی میں ہو رہا ہے [illegible] کی خوشی میں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بڑے [illegible] ہو مجھے معلوم ہے کہ کس طرح تمھارے [illegible] سال کے لیے [illegible] کا ثبوت [illegible] نے تو قیمت ظاہر کر دی ہے۔ میں تم دونوں بھائیوں کا امتحان لینا چاہتا [illegible] آزادی [illegible] کر دیا کہ [illegible] اس امتحان میں کامیاب ہو [illegible] کامیابی کے انعام [illegible] کا ہاتھ تمھارے [illegible] ۔۔۔۔۔ نسیم اس کے آگے [illegible] [illegible] نیک [illegible] اور [illegible] فیصلہ نہیں کرتا [illegible] اس کی نظریں [illegible] اور [illegible] ۔۔۔۔۔

[illegible] امتحان لیتا ہے [illegible] دنیا ایک امتحان گاہ ہے [illegible] زندگی کے بعد [illegible] زندگی میں اپنے اعمال کے حساب سے جزا یا سزا کے مستحق [illegible] ایک شخص نیکی کرتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ اس کو دنیا میں حاصل نہیں ہوتا۔ ایک شخص بدی کرتا ہے اور اس کو کوئی نقصان [illegible] ایسی [illegible] ایک شخص [illegible] نقصان ہوا۔ ایک دوسرے شخص نے [illegible] واقعات کو دیکھ کر عقل مطالبہ کرتی ہے کہ [illegible] شریر آدمی کو شرارت کا پھل ملنا چاہیے [illegible] نہیں ہوتا اسی لیے انسانوں کی یہ فطری ضرورت ہے کہ کوئی [illegible] پورے انصاف کے ساتھ ہر ایک کا فیصلہ کیا جائے۔ نسیم کے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی اس کے چہرے پر [illegible] کی طرح [illegible] آنکھوں میں [illegible] کے آنسو [illegible]

[illegible] کے [illegible]

عبدالقدیر اصغر

سوچتا چلا گیا ــــــــــ!

اک طرف ہے شور و شر، اک طرف سکون ہے
اک طرف فسونِ زر، اک طرف جنون ہے
زندگی کی راہ میں، آدمی کا خون ہے
نابکاریٔ سحر!
افتراق سربسر!
امتزاجِ خیر و شر!
گمرہیِ راہبر! ـــــــــــ دیکھتا چلا گیا
ــــــــــــ سوچتا چلا گیا

اک طرف ہے سرخ فوج اک طرف سفید ہم
اک طرف اذیتیں اک طرف حصارِ غم
دیکھتے ہیں دور سے تک رہے ہیں آپ ہم
زندگی کے موڑ پر!
انتشارِ ہر نظر!
راہزن ہیں راہبر!
آدمی ہے نوحہ گر ـــــــــــ دیکھتا چلا گیا
ــــــــــــ سوچتا چلا گیا

آدمی بھٹک گیا آشتی کی راہ سے
سرکشی میں بڑھ گیا، لذتِ گناہ سے
ذلتوں میں گھر گیا، پستیِ نگاہ سے
دیکھتا ہے کیا ادھر!
چھوڑ ذکرِ خیر و شر!
ذلت اور اس قدر!
مر رہا ہے، ڈوب مرا ـــــــــــ دیکھتا چلا گیا
ــــــــــــ سوچتا چلا گیا

انتقام لے چکے، انہدام ہو چکا
جنگ کا فساد کا اہتمام ہو چکا
تم سے رہبرانِ قوم، انتظام ہو چکا
ظلم اس قدر حسیں!
کانپتی ہے سرزمیں!
ہنس رہے ہیں ہر کہیں!
ننگِ قوم و ملک و دیں! ـــــــــــ دیکھتا چلا گیا
ــــــــــــ سوچتا چلا گیا

انقلاب دہر میں بے شمار آ چکے
بے گناہ سینکڑوں خون میں نہا چکے
فتنہ ہائے عصرِ نو گل نئے کھلا چکے
راہِ امن و آشتی!
کب کسی کو مل سکی!
کائنات جل گئی!
ایک جنگِ زرگری ـــــــــــ دیکھتا چلا گیا
ــــــــــــ سوچتا چلا گیا

تأثرات

راغب

مصلحت کوشی نہیں ہمراہیِ پیغمبری
جرأت بیباک پاتی ہے مقامِ حیدری
ن کے چارہ گروں سے ہو گی کیا چارہ گری

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے ابتری ہی ابتری
دفریبی، خود فروشی، خود نمائی، خود سری
گر نہیں یہ کافری پھر اور کیا ہے کافری

زلے، سیلاب، خشکی، قحط، سم آلود آب
پھر بھی اے انساں بڑھی جاتی ہے تیری خود سری
س سے ہو کر منکشف خود پستیوں میں گر گیا
حق نے تو تجھ کو عطا کی تھی جہاں کی برتری

م نقضِ عہد، خود غرضی، افادیت، [illegible]
آدمی کی حاکمیت کی ہے شکستہ گری
گر نہیں تیشہ کے بت وہم و گماں کے بت تو کیا
آج بھی نازاں ہے راغب کار و بارِ آذری

ظہیر الدین

لیا جب کام کچھ عزمِ جواں سے　　جو چاہا میں نے منوایا جہاں سے
اتر آیا زمیں پر آسماں سے　　طلب اُنکی کہاں لائی کہاں سے
جھکا ہوں جب سے اُسکے آستاں پر　　مجھے فرصت ملی ہر آستاں سے
وہ لے اس دور میں اللہ کا نام　　جو تنہا لڑ سکے سارے جہاں سے
کبھی یوں بھی ملی ہے عزم کی داد　　اُتر آئے فرشتے آسماں سے

راغب

دعوئِ علم و ترقی تو بجا ہے لیکن
اب بھی چھپتا نہیں انسان پہ انسان کا نام
کوئی بکری کسی بکری کی نہیں ہے محکوم
اور انسان ابھی تک ہے خود انسان کا غلام
بلکہ [illegible] اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں
کہیں حیوان سے بھی پست ہے انساں کا مقام

ندرت میرٹھی

رُباعیات

یہ شغلۂ صنم پرستی کیا ہے
یہ شیوۂ میکشی و مستی کیا ہے
غافل دنیا سے، بے خبر عقبیٰ سے
اے رندِ خراب تیری ہستی کیا ہے

• • •

اک کھیل ہے رقصِ جام و مینا تیرا
لاکر ہی رہے گا رنگ پینا تیرا
یہ موجِ شراب موجِ طوفانی ہے
اک روز ڈبو دے گی سفینا تیرا

• • •

ایمان ہے جام، دیں مینا تیرا
آتش کدۂ ہوس ہے سینا تیرا
مفقود حواس و ہوش، معدوم احساس
مرنے سے بھی بدتر ہے یہ جینا تیرا

• • •

بوتل جس وقت روبرو آتی ہے!
مستی پہ درندگی کی خو آتی ہے!
یہ مے نہیں خونِ عصمتِ فطرت ہے!
جا خون کی تیرے منہ سے بو آتی ہے

★ ★ ★

عبدالقدیر اصغر

تازیانے

گزر چکا ہوں میں اے دوست ان منازل سے
مجھے نشاط کے نغمے لبھا نہیں سکتے
فریبِ حُسن و ادا، رقص، رنگ، چنگ و رباب
مرے شباب کی دنیا پہ چھا نہیں سکتے

★ ★ ★

میں نے یہ جام یہ مینا یہ سبو توڑ دیے
میں تو ان عیش کے نغموں میں نہیں کھو سکتا
ابنِ آدم کی تباہی ہو، میں مدہوش رہوں
اے مرے دوست یہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا

★ ★ ★

کون سا جرم کیا، کس لیے معتوب ہوں میں
یعنی الحاد کے دھارے کی طرف بہ نہ سکا
سرخیٔ رنگِ شفق صبح کی تمہید نہ تھی
میں تو آثارِ شبِ غم کو سحر کہہ نہ سکا

★ ★ ★

ایک مطالعہ

اصغر علی عابدی

"جہنم کے دروازوں پر"[1]

اسعد گیلانی کا "یہ تاثراتی ناول" ادب میں ایک نئے مقصد کا علمبردار ہے۔ اور یہ مقصد خدا پرستی کے ہمہ گیر تصور پر عالمگیر انسانی سماج بنانے کا ہے۔ بہت سے لوگ وقت کے دھارے میں تیزی سے بہنے کو انقلاب انگیزی کہتے ہیں۔ یہ تعبیر غلط ہے۔ انقلابیت وقت کے دھارے کو بدلنے، زمانے کی رو کے خلاف چلنے اور تاریخ کی منجدھار کو بیچ میں سے کاٹ دینے کا نام ہے۔

"جہنم کے دروازوں پر" اسی طرح کی ایک کامیاب کوشش ہے، عام ناولوں کی طرح اس "ناول" کے واقعات کسی متعین پلاٹ کے گرد نہیں گھومتے۔ بلکہ اس ناول کا دارومدار تاثرات اور زندگی کے میدان میں گہرے غور و فکر کے بغیر قدم رکھ دینے سے اچانک پیش آجانے والے حادثات پر ہے۔ پھر ان تاثرات اور حادثات کی کڑیاں باہم جڑی ہوئی ہیں۔ اس طرح کہ ان سب کے جڑ جانے سے ایک زنجیر سی بن گئی ہے — اس زنجیر کے ایک سرے کو ہلانے سے دوسرے سرے تک لرزش پیدا ہو جاتی ہے، اور بیچ کی ساری کڑیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس میں ایک "مرکزی خیال" کے گرد تمام واقعات گھومتے ہیں لیکن جو بات اس میں ہے اُسے ایک نئی اصطلاح "مرکزی رو" یا حادثات و واقعات کی "روح" کے ذریعہ تعبیر کیا جا سکتا ہے — اس کا مرکزی کردار اُسی راستے کا مسافر ہے جس پر دنیا چلی جا رہی ہے۔ زندگی کے وہی نظریات اور مقاصد رکھتا ہے جن کے پیچھے آج کا حیوانیت پسند انسان چل رہا ہے۔ اس لئے اس کے راستے میں وہ تمام رکاوٹیں اور موڑ آتے ہیں جو انسانیت کے مجموعی راستے میں حائل ہیں۔ وہ ان جھاڑیوں اور کانٹوں میں اُلجھتا، پھنستا، اور انہیں کاٹتا ہوا اپنا راستہ بناتا ہے۔ وہ ایک مخصوص منزل کی طرف چل کر کامیاب یا ناکام ہونے والا ہیرو نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک تلاشی راہ (Exploratory) ہے۔ وہ سوسائٹی کے اسی طرح سوچنے والے کو اپنے ساتھ لئے چلتا ہے اور بالآخر اسے ایک نقطۂ نظر دے دیتا ہے۔ اسعد گیلانی نے اپنی اس کوشش کو "ناول" کہنے کے بجائے ایک "تاثراتی ناول" کہا ہے، اس لفظ میں بڑی گنجائش ہے۔ یوں بھی ناول لکھنے کے قدیم (Classical) اور بعد کے رومانی (Romantic) اور واقعاتی (Realistic) ادوار میں زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کی درمیانی مدت میں ناول کے فن نے بڑی تیزی سے قلابازیاں کھائی ہیں۔ اس وقت ناول نویس کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی فی الواقع "کہانی" کی طرح گزرتی ہے؟ اس سوال کا جواب قطعیت کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ اس ضمن میں متضاد باتیں سامنے آتی ہیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ مختلف اصناف ادب مثلاً افسانہ اور نظم میں غیر معمولی تبدیلی ہوئی۔ نئی نئی بنیادیں اُبھر کر انسان کی سطح ذہنی سے ٹکرانے لگیں۔ اسی طرح ناول میں بھی تغیر ہوا۔ ناول کو انسانی زندگی سے قریب کرنے کے لئے لکھنے والوں نے فن سے بغاوت کی متعدد صورتوں کو تلاش کیا۔ اور جس طرح "آزاد نظم" کہی جانے لگی، اُسی طرح آزاد ناول بھی لکھے جانے لگے۔ "رپورتاژ" ناول سے بالکل ہی قریب کی چیز ہے لیکن وہ ناول بھی نہیں ہے۔ وہ طویل مختصر افسانہ بھی نہیں ہے — رپورتاژ میں واقعات کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے، جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا جاتا ہے۔ اس کے دونوں سروں کو جوڑ کر

[1] ناشر: مکتبۂ نو۔ یعقوب شاہ روڈ۔ کراچی

"حلقہ" نہیں بنایا جاتا۔ اس میں زیادہ تر "حکایت در حکایت" کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کے کردار ایک طویل سڑک کے مسلسل چلنے والے ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں جن حادثات سے دوچار ہوتے ہیں، اُن سے جس طرح بچ نکلتے ہیں پھر اُن کا جو خاص اثر اُن کے ذہن پر پڑتا ہے، اُسے پیش کرتے ہوئے وہ برابر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسعد گیلانی کا یہ ناول بھی قریب قریب ایک رپورتاژ ہی ہے۔ اسکے واقعات کسی ایک مرکزی واقعہ کے گرد نہیں گھومتے، اور نہ اس کا ہر باب اپنے اندر ناول کے ابواب کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ "طویل مختصر افسانہ" یا مختصر افسانوں کا مجموعہ بھی نہیں ہے۔ یہ کہانی بھی نہیں ہے۔ یہ حقائق کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جس کی کڑیاں احساسات کی آگ سے تپا کر بنائی گئی ہیں۔ پھر اس میں گہری مقصدیت ہے۔ اونچا نصب العین ہے بلند آواز ہے۔ باطل سے بغاوت ہے اور حق کی موافقت کا نعرہ ہے۔ یہ نعرہ بہت تیز ہے۔ اور میرے خیال میں فن کی ارتقا یافتہ قدروں اور اونچے نصب العین کے امتزاج سے اسعد گیلانی ادب کو نئے میدان میں گھسیٹ لایا ہے۔ آج کا دور مقصدیت کا دور ہے۔ "ادب برائے ادب" والوں کو اس مقصدیت سے اس لئے چڑ ہے کہ اس کا نام لیکر فن کار خود فن پر ضرب لگاتا ہے۔ لیکن ان عقلمندوں کو یہ نہیں معلوم کہ ہمیشہ سے اعلیٰ فن اعلیٰ مقصد ہی کا تابع رہا ہے۔ جب ایک ادیب کسی بلند مقصد کو قبول کر لیتا ہے تو اپنی بات کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کے لئے ادب کو اور زیادہ نکھارنے اور اُبھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اُس کی بات لوگوں کے ذہن میں اُتر سکے۔ اُس کی یہی کوشش ادب کی سرزمین میں نئی سوتیں بہا دیتی ہے۔ اور اُس کی دنیا میں نئی بہار آجاتی ہے جس فن کا نام سے لے کر ان "ادب پرستوں" کا حلق خشک ہوا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی مقصدیت ہی کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن آج وہ اس ابتدائی محرک ( ) کو فراموش کر چکے ہیں، اور غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اُن کی ٹرین بغیر انجن ہی کے ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک پہنچ گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گھٹیا اور پوچ مقاصد سے ادب میں بہت سی ناخوش گوار تبدیلیاں ہوئی ہیں، اور اس لحاظ سے اصلی بُرائی مقصدیت میں نہیں بلکہ گھٹیا قسم کی مقصدیت میں ہوئی۔ جو لوگ محض نعرہ بازی اور اوچھی پلڑا بازی

مرعوب ہو کر ادنیٰ درجہ کے مقاصد کو ادب میں جگہ دے رہے ہیں۔ وہ یقیناً ادب کا ناس کر رہے ہیں، اور ایک دن انہیں واقعات اور اسباب و علل کی عدالت کے آگے اپنی کاوشوں کا جواب دینا پڑے گا۔ میرے خیال میں "جہنم کے دروازوں" کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ نہایت پائیدار مقصدیت کا علم اُٹھائے ہوئے ہے۔ یہ پائیداری لکھنے والے کے قلم کو مبارک ہو۔

"جہنم کے دروازوں" میں اسعد گیلانی کا آرٹ پوری قوت سے اُبھرا ہے۔ وہ جتنا اندر تھا غالباً سب کا سب باہر آچکا ہے اور شاید آئندہ اس سے زیادہ باہر نہ آسکے۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ وہ اپنے اس "باہر" کو اور زیادہ نکھارے سنوارے، اور نئی تراشوں کے ذریعے کچھ اور نئے موڑ اور نئی لکیریں پیدا کر دے لیکن جہاں تک اس "بیرون" کی اندرونی روح کا تعلق ہے وہ نہیں بدلی جا سکتی۔ وہ دائمی اور اٹل ہے۔ اسعد گیلانی کے اس کاغذی پیرہن میں داخلیت یا مطالعہ اندرون (Subjectivism) اور خارجیت یا مطالعہ بیرون (Objectivism) کا زبردست امتزاج ہے۔ اُس نے جو لکیریں بنائی اور جو نقوش کھینچے ہیں وہ پتھر کی لکیریں ہیں، اور خونِ جگر سے بنائی گئی ہیں۔ امٹ اور اثر انگیز، دائمی اور دلکش۔ تاہم میں یہ ضرور کہوں گا کہ جن دوامی قدروں کا اسعد علمبردار ہے اس کے طرز (Style) میں اُس اعتبار سے دوام اور ارتقا کی کمی ہے۔ اس کا طرزِ نگارش زیادہ تر کلاسیکت سے متاثر ہے، اور یہ کلاسیکی ادب کو بہت زیادہ پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ لیکن کلاسیکی ادب میں بھی دو درجے ہیں۔ اوّل درجہ کا کلاسیکل ادب تو دراصل انقلابی ادب ہے۔ جو مختلف زمانوں میں ادب و خیال کی نئی طرحیں ڈالتا اور نئی راہیں کھولتا رہا ہے۔ یہ ادب وقت کے جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹا کر ایک نئی شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور اپنے ساتھ ایک مثالی لٹریچر رکھتا ہے۔ اس ادب کا دارومدار قوانینِ فطرت، زندگی اور زندگی کی دائمی قدروں پر ہے۔ اس کا موضوع انسان اور انسانی سماج کے تمام مسائل ہیں۔ وہ ان سب کو ایک بالکل صحیح زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور زندگی کے ٹوٹے ہوئے مکان کو نئے سرے سے تعمیر کرتا ہے۔ اُس کے بعد بہت سے لوگ اس نام سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور غلط مقاصد

کی تشریح شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوسرے دور کے ادب اور آرٹ میں حق اور باطل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے بلکہ دراصل یہ حق نما باطل ہوتا ہے جو انسانیت کو فریب دیکر خود حق کی جگہ لے لیتا ہے، اس طرح ان غلط اوہام اور تخیلات کی تعمیر اس وقت شروع ہوتی ہے جب صحیح متعاملہ کی عمارت ٹوٹنے لگتی ہے اور اس کی اینٹیں بکھر جاتی ہیں۔ یہی دوسرے دور کی کلاسیکت ہے۔ بہت سے لوگ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور نادانستہ اس بعد کی کلاسیکت اور پہلے کے کلاسیکت دونوں کے یکساں مخالف ہو جاتے ہیں۔ عرصہ سے کلاسک ازم (Classicism) کے خلاف یہ جنگ جاری ہے۔ اسی طرح جو لوگ مدافعت پر کمر بستہ ہیں وہ بھی یکساں طور پر دونوں کے موافق ہیں۔ گویا یہ لڑائی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لڑی جا رہی ہے۔ خدا پرستانہ سماجی اور ادبی قدروں کے علمبرداروں کا فرض ہے کہ وہ تاریخ کا تجزیہ کر کے ان لڑنے والوں کے سامنے صحیح واقعات رکھیں اور انھیں سوچنے کا موقع دیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ملحد اس "مذہب" کی مخالفت کر رہا ہے جو سرے سے کوئی مذہب ہی نہیں ہے، اور بیچارہ "مذہب پرست" ایسے مذہب کی مدافعت پر تلا ہوا ہے جو اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے سراسر مادیت ہے۔ یہ لڑائی کیا رنگ لائیگی اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ لوگ خود آپس میں نمٹ لیں گے۔

ہمیں جو کچھ دیکھنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم صحیح انقلابی قدروں اور حقیقی "کلاسیکت" کو پیش کرتے ہوئے کہیں پھسل تو نہیں گئے۔ کیونکہ یہ پھسلن بڑی خطرناک ہے۔ یہ ہم کو کسی وقت بھی اندھے جدیدیت پسندوں اور اندھے قدامت پسندوں میں سے کسی ایک کی طرف گرا سکتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ "جہنم کے دروازوں" میں اسعد گیلانی کا قلم دوسرے دور کے کلاسیکل طرز ([illegible]) کی طرف پھسل گیا ہے۔ لیکن بہرحال وہ کسی طرف گرا نہیں ہے۔ وہ اس پلصراط پر سے کامیابی سے گزر گیا ہے۔

ناول کا آغاز اتنا فطری نہیں ہے جتنا اُسے ہونا چاہیئے تھا۔ پڑھنے والے کو تخیل کے اس محلسرا میں داخل ہونے کے لئے دروازے کھولنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب وہ اندر داخل ہو جاتا ہے تو کسی پرسکون دریا کی سطح پر بہتا چلا جاتا ہے۔ آج "ناول"، "افسانہ" اور "ڈرامہ" میں اچانک آغاز Abrupt Beginning کو ترجیح دی جاتی ہے۔ میں اس چیز کی اس لئے تائید نہیں کرتا کہ آغاز جدّت اور تازگی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ فطری ہے۔ زندگی بالعموم تمہید کے بغیر ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اُس کے ہر واقعے سے انسان متاثر ہو سکتا ہے چاہے بظاہر وہ کتنا ہی سادہ ہو۔ اچانک آغاز سے پڑھنے والے کو کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے اُس کے دوستوں نے بڑی بلندی سے پانی میں دھکا دے دیا ہو۔ پہلے وہ جھنجلاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تیراکوں کے ساتھ خود بھی شریک ہو جاتا ہے۔ اس طرح ناول کے کردار اور قاری کے ذہن کو بہت جلدی ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہم آہنگی مقصد کے لئے بے حد مفید ہے۔ قاری اور کردار دونوں ایک ہی ساز کے دو تار بن جاتے ہیں۔ اور ایک ہی زخمہ سے ساتھ ساتھ لرز اٹھتے ہیں۔ یہ چیز مصنف کے فن کی جان ہے۔ اسعد گیلانی "جہنم کے دروازوں" میں لوگوں کو دروازہ کھولنے کی زحمت دئے بغیر ہی داخل کر لیتا تو بہت اچھا تھا۔ اس طرح انھیں "جہنم" کی تپش اور زیادہ محسوس ہوتی۔ ناول کا وسط یا آغاز کے بعد سے آخر تک کا حصہ اپنے شباب پر ہے۔ اس کو پڑھنے سے ابتدائی تاثر کی کمی کا احساس نہ معلوم کس طرح ختم ہو جاتا ہے۔ زورِ بیان، روانی، سلاست، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت، خیالات کے نئے نئے موثر تاثرات کے نئے نئے زاویئے، اچھوتے افکار کا جگمگاتا ہوا محل، آدمی ہکا بکا رہ جاتا ہے، اور گہرے تاثر میں ڈوب جاتا ہے۔

وہ اپنے آغاز کے بعد دوسرا آغاز اس طرح کرتا ہے۔

"جب میں نے زندگی میں جھجکتے جھجکتے قدم رکھا تو بے بسی میرے استقبال کے لئے کھڑی تھی جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں پہنچا دیا جہاں سے انسان پر اسی دنیا میں جہنم کے دروازے کھلتے ہیں .... میرے دروازے پر طوفان دستک دے رہا تھا، اور مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ پناہ کا کوئی راستہ تلاش کر سکوں .... مختلف دفاتر کے دروازے میرے سامنے کھلے پڑے تھے اور میری پیشانی پر ساٹھ روپے کا لیبل لگا ہوا تھا .... جس نے دورانِ تعلیم میں سب سے اگلی ڈیسکوں پر بیٹھ کر خواب میں اپنی عالی شان زندگی کا محل تعمیر کیا تھا۔ ایک شکستہ مکان کے سامنے بیٹھا تھا .... چالیس پچاس۔ ساٹھ میری قیمت لگائی گئی تھی۔ اس مارکیٹ میں انسان

کھانے بھینس سے کہیں زیادہ سستا بکتا ہے۔ میں نے اپنے خوابوں کو دربانوں اور چپراسیوں کی جھڑکیوں میں تحلیل ہوتے دیکھا اور خاموش رہا۔ میں نے اپنے پندار اور کو بڑے بیڈ کلرکوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں ٹوٹتے پایا اور خاموش رہا .... میں ساکت و خاموش مارکیٹ کی گہما گہمی دیکھتا رہا۔ جہاں میری قیمت ترازو کے پاسنگ سے بھی کم رکھی گئی تھی ———"

پھر وہ اور آگے بڑھتا ہے ۔

"کرائے کا سپاہی اور مزدور جسے سرمایہ دارانہ نظام نے تیار کیا ہے اپنی جفاکشی کے ساتھ نہایت شدید غلامانہ ذہنیت رکھتا ہے ۔ اس کے اجتماعی شعور کو کسی سیدھی راہ پر لگانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے اصلی انسانی قوت کہا جا سکتا ہے۔ یہ جب کسی مقصد کے لئے سوچ بوجھ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہو تو اس گروہ کا بپھرا ہوا سیل کئی نپولین اپنی ٹھوکریں لے کر چلتا ہے۔ کئی ماسکو اس کی چنگاری سے بھڑک اُٹھتے ہیں .... لیکن جب یہ روٹی کے لئے اپنی قیمت بیچ رہا ہوتا ہے تو اس کے خون کی زہریلی جنگیوں میں گرمی پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ......"

پھر وہ سوسائٹی میں گھس کر اندر کا منظر دیکھتا ہے ۔

"جس نظام نے ہمارے انسانی اخلاق خودداری ، اور حمیت کو بداخلاقی، گراوٹ اور بدتہذیبی میں تبدیل کرنے کی کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ ہم بھی اس کی مشینری کے دن رات بھرتی ہو کر آنے والے نئے پرزوں کو زنگ آلود کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ یہ نظام غریبوں سے چھین چھین کر اپنے کرایہ کے سپاہیوں کا پیٹ تو بھرتا ہے لیکن اُنھیں ہر اچھائی سے خالی کر دیتا ہے۔ وہ عوام سے نقدی، کپڑے، غلہ، مکان، زمینیں، بیٹے، شوہر، بھائی، باپ چھینتا ہے اور پھر توقع رکھتا ہے کہ لوگوں کی قلبی، روحانی، لسانی، دماغی، تحریری، تقریری اور شعوری ہمدردیاں بھی اُس کے ساتھ ہوں۔"

وہ اور گہرا اُترتا ہے ۔

"آخر ایسا کیوں تھا ——— ہم نے بار بار سوچا۔ اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ انسان کا ضمیر کسی بالاتر قوت کے سامنے جوابدہی کے احساس سے خالی ہو گیا تھا۔ انسان نے اپنے نفس ہی کو اپنا معبود بنا لیا تھا۔ نفع و نقصان ہی اُس کی زندگی کا معیار حق و باطل تھا اس نفع و نقصان کی عینک سے زندگی کے سارے معاملات پر نظر ڈالی جاتی تھی ، جو چیز نفع کی حد میں آتی اُسے دانتوں سے پکڑ لیا جاتا تھا، چاہے وہ اپنے بھائی کا قتل ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو چیز نقصان کی حد میں نظر آتی اُسے ٹھکرا دیا جاتا۔ چاہے وہ وعدہ وفائی صلۂ رحمی یا احسان کا بدلہ ہی کیوں نہ ہو ......"

اس طرح وہ زندگی کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ اسعد گیلانی کی یہ کاوش انگریزی حکومت کی ایرفورس (Air Force) کا پس منظر لئے ہوئے ہے۔ اگر یہ انگریز کے زمانے میں چھپتی تو اس کے مصنف کی جگہ سلاخوں کے پیچھے ہوتی اور کیا تعجب کہ انگریز کی پیروی کرنے والے اب بھی اس پر نگاہیں رکھتے ہوں۔

پورا ناول "انگریز کے لائے ہوئے نظام میں ایک ہندوستانی سپاہی کی زندگی کو ہر ہر پہلو سے نمایاں کرتا ہے۔ پھر اُس ایک زندگی کے آئینہ میں دوسری زندگیوں کے عکس بھی دکھاتا چلا جاتا ہے۔ اسعد گیلانی اپنے ساتھ پڑھنے والے کو آئینہ خانے میں لے جاتا ہے۔ جہاں ایک انسان کے ہزار چہرے ہیں اور اُن میں کا ہر چہرہ نیا روپ لئے ہوئے ہے۔

اسعد نے باطل نظام کو جیسے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ اُس نے کسی شعبہ کو اپنے قلم کی زد سے بچ کر نکل جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایک ہوشیار اور بہادر سپاہی کی طرح خوب ڈٹ کر لڑا ہے اور کشتوں کے پشتے لگا دئے ہیں ——— "وہ ہوائی سپاہی" ہے۔ وہ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پھینکا جاتا ہے۔ مختلف ٹریننگ سنٹروں میں لڑھکایا جاتا ہے اور انسانوں کی گوناگوں اقسام سے اس کو سابقہ پڑتا ہے۔ نئی نئی فطرتوں اور طبیعتوں سے وہ دوچار ہوتا ہے۔ اور انسانی نفسیات کے سارے پہلو اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور ایک فولادی لشتن استفہامیہ کی شکل میں اُس کے ذہن میں چبھنے لگتے ہیں۔ وہ اس چبھن سے

مجبور ہوکر سوچتا ہے اور اپنے تاثرات قلم بند کرتا چلا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اُس کی سوجھیں اور مشاہدات اُسے کھینچ کر تائی کے گراں بہا ذخیرے کے پاس لا ڈالتے ہیں ، اب وہ فیصلہ کر لیتا ہے ۔ اس کے ذہن کا یہ رول ([illegible]) انتہائی سادہ اور فطری ہونے کے باوجود بھی انقلاب انگیز ہے ۔ پھر لطف یہ کہ وہ اپنے کرداروں کو مکالمے اور مناظرے کے ذریعے اس منزل تک نہیں پہنچاتا ۔ بلکہ اُس کے کردار بالعموم اُسی رُخ پر حرکت کرتے ہیں جس رُخ پر عمل کی دنیا میں زندگی حرکت کرتی ہے ۔ مقصدیت کے بہت سے شیدائی اس بات کو اپنی خوبی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے کرداروں کے مکالمے کے ذریعے ایک نتیجہ نکالیں ۔ جیسے ہی ایک شخص کے ذہن میں کوئی خیال پیدا ہوا فوراً اُس پر مناظرہ شروع ہو جائے گا ۔ یہاں تک کہ "ہیرو" جیت جائے اور "ویلن" ہار دے ۔ یہ تُک بندی بالکل بھونڈی اور لغو ہے ۔ دنیا میں کوئی اصولی انقلاب اس طرح نہیں آتا ۔ زندگی کا اجتماعی عمل ([illegible]) صرف ٹھوس واقعات سے ٹکرا کر ہی اپنا رُخ بدلتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ٹھوس واقعات کی باگ ڈور ہمیشہ افکار کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن جب تک افکار کا واقعات پر قابو نہیں ہو جاتا اور غلط راستہ کی سمت پر ایک فولاد کا بند نہیں باندھا جاتا زندگی کا بہاؤ اپنا رُخ نہیں بدل سکتا ۔ اسعد گیلانی اس بدعت سے صاف بچ کر نکل گیا ہے ۔ لیکن آخر میں جہاں وہ "ویش پانڈے" سے گفتگو کرتا ہے ، اس کا قلم قدرے بہک گیا ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ اسعد نقلی گھونسوں کا قائل نہیں ہے ۔ وہ سامنے سے گلے ([illegible]) کا قائل ہے ۔ اور مجھے اس کی شکایت نہیں ہے ۔ کیونکہ میں بھی بعض حالات میں اس کا قائل ہوں ۔ زندگی کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ادب میں پیش نہ کی جا سکتی ہو لیکن اس کے لئے ماحول ([illegible]) اور پس منظر کی تیاری بھی اسی حد تک ہونی چاہیے جس حد تک خود زندگی میں ہوتی ہے ۔۔۔ ویش پانڈے سے گفتگو کے وقت یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ماحول بالکل نہیں ہے ۔ لیکن ماحول کم از کم اس حد تک نہیں ہے کہ پڑھنے والا بھی اتنا ہی متاثر ہو جتنا ویش پانڈے ۔ یہ کمی اسعد گیلانی کے یہاں اکثر پائی جاتی ہے ۔ اسی طرح مقصد کی دھن میں اسعد کی زبان بھی اس موقع پر رپورتاژ یا "تاثراتی ناول" کی زبان سے ہٹ کر مضمون نگاری کی زبان بن گئی ہے ۔ آج کے انسانی تمدن میں رونما ہونے والی جائز حرکتوں سے ہمیں کچھ بھلائیاں بھی ورثے میں ملی ہیں ۔ اور یہ بھلائیاں ادب کے دائرے میں بہر صنف کے لئے علیحدہ انداز بیان مقرر کرتی ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات ایک ہی صنف کے مختلف موضوعات میں زبان بدلتی ہے ۔ معاشیات کی زبان سیاسیات اور تاریخ سے الگ ہے ۔ ہمارے اکثر فن کار اس تقسیم کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اسعد نے بھی اس موقع پر یہی غلطی کی ہے ۔ اس جگہ اُس کا انداز بیان دوسرے دور کے کلاسیکل ادب سے مل گیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے دور کی کلاسکیت اب ہمارے اندر سے ختم ہونی چاہیئے ۔ اور ہمیں اوّل دور کی کلاسکیت کو جو دراصل انقلابیت ہے اور جس کا منبع "قرآن" ہے ، اس شعور کے ساتھ اپنانا چاہیئے کہ زندگی کے دھارے میں خود جان واقعات ([illegible]) نے وہ کون سے رنگ ملا دئے ہیں ، جو آج کے دور میں گزشتہ انقلاب کی تجدید کے لئے ہمارے لئے ایک قیمتی تحفہ ہیں ۔ اگر اس نعمت سے ہم فائدہ نہ اُٹھائیں گے تو باطل کے پرستار اپنے آپ کو "حق نما" بنا کر پیش کریں گے ، اور دنیا کو دھوکے میں مبتلا رکھنے کو مدت کچھ اور طویل ہو جائے گی ۔

اس ایک آدھ بات کو چھوڑ کر مجموعی طور سے "جہنم کے دروازوں پر" ایک عظیم کوشش ہے ۔ اس میں ایک ادیب کی فنی صلاحیتیں عروج پر ہیں ، اس میں مقصدیت کا پورا رنگ نمایاں ہے ، اور مقصد کی خاطر نئے فن کے نشانات بھی موجود ہیں ۔ جن پر پیچھے آنے والے چل سکتے ہیں نعیم صدیقی نے آج کے دور میں خدا پرستانہ مقصدیت کا آغاز اپنے افسانوں کے مجموعے "ذہنی زلزلے" سے کیا تھا ۔ اسعد گیلانی اپنے "تاثراتی ناول" کے ذریعے اُس میں ایک اور قدم کا اضافہ کرتا ہے ۔ اس اضافہ کے لئے اردو ادب اسعد کا احسان مند ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ مختلف نقاط نظر رکھنے والے ادیب اس کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کریں ، اور پہلے سے طے شدہ اصولوں پر چلنے کے بجائے اس کتاب کی گہرائی میں اُتریں ۔ اس کے لکھنے والے کو سمجھیں ۔ اُس کے مقصد سے آگاہ ہوں ، اور نئے مقصد کی خاطر نئے فن کی تخلیق کا معیار اپنے سامنے رکھ کر اس پر تنقید کریں ۔

سحر ہونے سے پہلے

کوریا کی لڑائی

کوریا کی لڑائی ادارۂ اقوامِ متحدہ کے گلے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ یہ ادارہ نہ اس ہڈی کو نگل سکتا ہے اور نہ اُگل سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو فائدہ اس ادارے سے پہنچا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اُس نے بین الاقوامی جنگ کو کوریا کے میدان میں سمیٹ دیا ہے۔ اس دنگل میں ہر پہلوان کو اپنے جوہر دکھانے کی اجازت ہے۔ لیکن نہ معلوم یہ مہلت بھی کس وقت ختم ہو جائے اور عالمی جنگ کا لاوا ساری دنیا کو جھلس کر رکھ دے۔ ادارۂ اقوامِ متحدہ پر اس وقت اینگلو امریکن بلاک کا قبضہ ہے۔ اس لئے وہ جو تجویز چاہتا ہے منظور کروا لیتا ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک روس کی عدم شرکت سے انہوں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ لیکن روس نے اب اس نقصان کو محسوس کر لیا ہے، اور سلامتی کونسل میں شرکت کر کے اپنا حق استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب ایسی تمام تجویزیں جو روس کے خلاف پڑتی ہوں یا جن سے کمیونزم کے پھیلاؤ میں رکاوٹ پیش آتی ہو، روس اُنہیں اپنا ویٹو استعمال کر کے رد کر دیتا ہے۔ بڑی طاقتوں کا حقِ استرداد اور ادارۂ اقوامِ متحدہ میں اُن کی برتری لیک سکس کو ٹھنڈی جنگ کا اکھاڑا بنائے ہوئے ہے۔ یہاں آنے والے حق کی بنیاد پر فیصلے کروانے نہیں آتے بلکہ اپنی اپنی اغراض کی خاطر اس ادارے کا ناجائز استعمال کرنے آتے ہیں۔ کوریا کے عوام مٹ رہے ہیں۔ اُن کا تمدن تباہ ہو رہا ہے۔ اُن کے وسائلِ حیات معدوم ہو رہے ہیں۔ اُن کی نوخیز نسلیں ختم ہو رہی ہیں، لیکن سرخ اور زرد بلاک کے حامی اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہر ایک دو مخالف جتھوں کی پیٹھ میں سنگین گاڑے اُن کی پشت پناہی کے نام سے آگے بڑھ رہا ہے، اور اُن کو آپس میں ٹکرا رہا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اس بات کے لئے تیار نہیں ہے کہ کوریا والوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر اُن سے الگ ہو جائے۔ پہلے شمالی کوریا والوں نے یلغار کی اور جنوبی کوریا میں گھستے چلے گئے، اس کے بعد امریکن فوجیں انسانی آبادیوں کو روندتی ہوئی ۳۸ درجہ عرض بلد کو پار کر کے شمالی کوریا کے دار السلطنت پر قبضہ کرتی ہوئی منچوریا کی سرحد پر بگل بجانے لگیں۔ اب چینیوں نے لاکھوں کی تعداد میں داخل ہو کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا ہے، اور دوبارہ اقوامِ متحدہ کی فوجوں اور جنوبی کوریا والوں کو شکست ہو رہی ہے۔ اس وقت ۳۸ درجے خطِ متوازی کے شمال میں پورے علاقے پر چینی کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا ہے، اور اس خط کو پار کر کے جنوبی کوریا کے صدر مقام سیول کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تباہی اور بربادی کا ہل ہے جو انسانیت کے سینے پر چلایا جا رہا ہے۔ اُس کا گوشت اُدھڑ چکا ہے اور ہڈیاں چُور چُور ہو گئی ہیں۔ اس کا جسم خون میں لتھڑ رہا ہے۔ خون ایک دن رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسانیت کا مقدس خون تباہی کے شیطانوں سے لڑنے کے لئے ایک دن پھر اکٹھا ہو گا، اور ایٹم بم کی دھمکیوں اور امن امن کی جھوٹی پکاروں کو چیر کر حق کی آواز بلند کرے گا۔ دنیا اس مسلسل تباہی سے تخریبی قوتوں کا پتہ چلا لے گی۔ اس دن اِن اندھیروں کے اندر سے روشنی کی کرن پھوٹے گی، اور ایک نئے نظام کا مطالبہ اُبھرے گا، جو انسانی اغراض کو جائز حدود میں رکھ سکے، اور انسان پر انسان کے استبداد کو ختم کر دے۔ جو لوگ ایسے نظامِ زندگی کے متمنی ہیں اُن کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو کسی ایک بلاک کی طرف جھکا دینے کے بجائے کسی تیسرے حق پسندانہ نظریہ کی تلاش کریں۔ انسانیت کے ایک ایک زخم پر الگ الگ مرہم رکھنے کے بجائے [illegible] خرابی کو دور کریں ——— اگر دنیا کا کوئی ملک کمیونزم اور سرمایہ داری سے بچتا ہوا اپنے لئے نئی راہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا، اور اس نے انسانی مسائل کا ایک نیا حل پیش کر دیا تو وہ حقیقی امن کی طرف ہماری انسانیت کی رہنمائی کرے گا۔ پھر کوریا اور کشمیر جیسے زہر اُگلنے والے پھوڑے ہمیشہ

ختم ہو جائیں گے

سردار پٹیل کا انتقال

گزشتہ مہینے اس ملک میں ایک المناک حادثہ پیش آیا، اور وہ بھارت کے اپ پردھان منتری سردار پٹیل کی موت تھی۔ موت کا ایک دن معین ہے، لیکن سردار کی موت اس ملک کے لئے ایک عظیم واقعہ ہے۔ گاندھی جی نے جہاں اس ملک کے باشندوں کو ایک ایسا نظریہ دیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے مختلف خیالات اور تصورات کو جوڑنے کی کوشش کریں، وہیں سردار پٹیل ایک ایسا انسان تھا جس نے اپنے فولادی ہاتھ سے بھارت کے مختلف عناصر کو جوڑ دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے طریقۂ کار سے بہتوں کو اختلاف رہا اور ہے۔ اور یہ بھی دوسری بات ہے کہ سردار نے جو علاج تجویز کیا تھا وہ وقتی اور سطحی تھا۔ اُس کے طریقہ کار میں مثبت پہلو کی شدید کمی تھی۔ لیکن ان سب چیزوں کی تکمیل اُس نے اپنی شخصیت سے کر لی تھی۔ بھارت کی جدوجہد آزادی میں اُس کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت تھی۔ اس لئے جو کچھ وہ کرتا تھا اُس پر اُس کی شخصیت کا اتنا بوجھ پڑ جاتا تھا کہ دنیا کو اُسے ماننے ہی بنتی تھی۔ لیکن اب یہ وزنی شخصیت اُٹھ چکی ہے، اور ایک زبردست خلا واقع ہو گیا ہے۔ بھارت والوں کو اس صورتِ حال سے انتہائی تشویش ہونی چاہیئے۔ ایک ایسے نظام میں جہاں ہر کام شخصیت کے بل بوتے پر چل رہا ہو بڑی شخصیتوں کا ایک ایک کر کے اُٹھ جانا اُس نظام کی بنیادوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتا ہے۔ اس کی دیواروں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ اور پھر ان دراڑوں میں سے تخریب اور تباہی کا سیلاب اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سردار پٹیل کی آنکھ بند ہو جانے کے بعد بھارت کے سماجی نظام میں انتشار کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ بھارتی سوسائٹی کے جو عناصر اس "فولادی انسان" کی وجہ سے جڑے ہوئے تھے وہ اب ایک دوسرے سے پھٹ جائیں گے اور باہم ٹکرانے کا انہیں پورا موقع مل جائے گا۔ اس خطرے سے نپٹنے کے لئے سوائے چند ایک اور شخصیتوں کے کوئی حل نہیں ہے۔ لیکن یہ شخصیتیں بھی تا قیامت رہنے والی نہیں ہیں۔ اس لئے مسئلہ کا یہ حل بالکل غلط ہے۔ صحیح حل یہ ہے کہ ایسے پائدار اصول تلاش کئے جائیں جن کی بنیاد پر شخصیتوں کے بغیر یہاں کا نظام کھڑا ہو سکے، اور محض ان کی کشش بھارت والوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھے۔ ایسے اصول دنیا میں ناپید نہیں ہیں جس ہستی نے اس دنیا کو بنایا ہے اُس نے اس میں زندگی گزارنے کا ضابطہ بھی بھیجا ہے۔ صرف ذرا عصبیت اور تنگ دلی سے بچ کر تلاش و جستجو کی ضرورت ہے۔ یہ گوہر بے بہا ہر ایک کو مل سکتا ہے۔ سردار پٹیل کی موت ہمارے لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اس گھنٹی کو سن کر بھی سوتے پڑے رہنا پورے سماج کو خطرات کی طرف لے جانے کے مترادف ہے۔ بھارت والوں نے اپنے لئے کوئی مناسب اصول تلاش نہیں کر لیا تو انہیں خدا کی پکڑ سے ڈرنا چاہئے۔

ہندو مہا سبھا کا حل؟

پچھلے دنوں پونا میں اکھل بھارتیہ ہندو مہا سبھا کا اجلاس ہوا۔ اس میں جو اہم ترین مشورہ دیا گیا وہ یہ تھا کہ "بھارت کی حکومت مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اُسے پرشارتھیوں کا مسئلہ حل کرنا چاہیئے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے جو پاکستانی حکومت پاکستان کی اقلیتوں (یعنی ہندوؤں) کے ساتھ کر رہی ہے۔" ——— گویا یہ ہے وہ حل جو بھارت کی معاشی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ ہندو مہاسبھا کے رہنما اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ اس ملک کی ساری پریشانیوں کا سبب مسلمان ہیں۔ بے شک پاکستان والوں کا وہ طریقہ قابلِ مذمت ہے جو انہوں نے وہاں کی اقلیتوں کے خلاف اختیار کر رکھا ہے، اور اس کے لئے تمام جائز ذرائع سے پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیئے کہ وہ اپنے رویّہ کو ٹھیک کرے۔ لیکن پاکستان کے کرتوتوں کا بھارت کی سرزمین میں جواب دینا خود اپنے پیر پر آپ کلہاڑی چلانے کے مترادف ہے۔ معاشی، سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے ساڑھے تین کروڑ انسانوں کی پریشانی کسی طرح ایک ملک کے لئے سودمند نہیں ہو سکتی۔ اگر چند لاکھ اشخاص بھی بے روزگار ہو جائیں تو ملک کے اندر سینکڑوں اخلاقی اور اقتصادی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کجا کہ کروڑوں اشخاص کی بدحالی سے ملک میں خوشحالی کی بہار آجائے۔ ایسا سوچنے والے نہ تو سماجی مسائل

(Social Problems) کے علم سے واقف ہیں، اور نہ وہ معاشیات اور اخلاقیات پر کوئی گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ باتیں بالکل بچکانہ اور کم علم لوگوں کی ہیں۔ مہا سبھائی نیتا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان ترکیبوں سے ایک گروہ کے وسائل معیشت اور دولت پر قابض ہوکر دوسرے گروہ کو دولت مند اور خوش حال بنا سکیں گے۔ بظاہر کچھ ایسا نظر بھی آتا ہے۔ لیکن صرف انہیں لوگوں کو جن کی نظر سطحی ہے، اور جن کی تعلیم صرف دفتر کی کلرک کے لئے ہوئی تھی۔ بصیرت کی آنکھیں رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اتنے بڑے گروہ کی معاشی بدحالی (Economic Set Back) دراصل پورے ملک کے معاشی نظام کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار ملک کے پورے انسانوں پر ایک وسیع جال کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر انسان کی ضرورت دوسرے انسان کی ضرورت سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر ایک شخص بھی اُس ضرورت کو پورا کرنے کے لائق نہ رہے تو دوسرا فوراً پریشان ہوجائے۔ اس طرح ایک آدمی کی بدحالی پوری انسانیت کے دائرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پھر خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ اُس کی بدحالی کے لئے مصنوعی ذرائع اختیار کئے جائیں اور محض جواب الجواب کی اسپرٹ میں یہ سب کچھ کیا جائے تو اس کے اثرات دوگنے ہوجاتے ہیں۔ یہ طریقہ اختیار کرنے والے خود اپنے کیرکٹر کو بھی بگاڑ لیتے ہیں اور اپنے حریف کے خاتمے کے بعد خود اپنے ہی جسم کے اعضاء کے خلاف لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بھارت میں اس طریقۂ کار کے بُرے نتائج ظاہر ہونے لگے ہیں۔ مخالفوں کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد فساد پسند عناصر کا رُخ اپنوں کی طرف پھر چکا ہے اور وہ اپنے ہی جسم کے مختلف حصوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ دراصل ایک اصول کو بداخلاقی کے زور سے توڑا تو جا سکتا ہے مگر دوسرے اصول کو بداخلاقی کے زور سے چلائے جانا بالکل ناممکن ہے۔ بھارت اگر اپنے ملک کی اور اس دیش کے رہنے والوں کی سچی ہمدرد ہے تو اُسے پاکستان کی کارروائیوں کا بھارت کی سرزمین پر جواب دینے کی کوشش کرنے کے بجائے ملک کے مسائل کا کوئی ٹھوس حل تلاش کرنا چاہیئے۔ پاکستان کی حکومت جو غلطیاں کر رہی ہے اُسے وہ بھگتے گی۔ لیکن انہیں غلطیوں کو یہاں آزما کر خود بھگتنے کی کوشش کرنا سخت نادانی ہے۔ ہندوستان میں جو لوگ پریشان ہیں اور پاکستان سے آکر یہاں مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُن کے دُکھوں میں ہر انسان کو شریک ہونا چاہیئے، اور اپنے انسانی بھائیوں کی ہر طرح خدمت کرنی چاہیئے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ بھارت والوں میں اِن جذباتِ اخوت اور ہمدردی کی شدید کمی ہے۔ اور مہا سبھا اس کمی میں اور اضافہ کرنا چاہتی ہے۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ایسے اصول دریافت کئے جائیں جو انسانوں کو باہم جوڑنے اور ملانے والے ہوں۔ اب فرقہ پرستی کے دن لد گئے۔ اب قوم پرستی اور امپیریل ازم کے دن بھی لد رہے ہیں۔ اب مزدور اور کسان کے اقتدار کا نعرہ بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ سوال تو پوری انسانیت کا ہے۔ آج پورا عالم انسانی خطرے میں ہے۔ دنیا دو مخالف بلاکوں میں تقسیم ہو کر عالمگیر جنگ کے الاؤ کے سامنے کھڑی ہے ـــــ آپ کے پاس اس دہکتے ہوئے الاؤ سے اُسے بچانے کا کیا ذریعہ ہے؟ کیا یہ کہ بھارت کے مسلمانوں پر تباہی اور بربادی کے پہاڑ لاد دئے جائیں؟ اگر واقعی آپ ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں تو یہ بہت چھوٹی بات ہے۔ زندگی کے اہم ترین مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرکے صرف ایک گروہ کی مخالفت پر تُل جانا سخت ترین غلطی ہے۔ اگر مہا سبھائی نیتا دل سے اصلاح کے خواہش مند ہیں اور ملک کے دکھوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو منفی پروگرام بنانے اور نفرت کا بیج بوکر کام نکالنے کے بجائے سچائی اور حق کی بنیاد پر انسانیت کی تمام خرابیوں کا ایجابی حل (Positive Solution) پیش کرنا چاہیئے۔ اس طرح وہ اپنے حق میں بھی بھلائی کر سکتے ہیں، اور اپنے ملک والوں کے حق میں بھی بھلائی کر سکتے ہیں، اور دنیا کے حق میں بھی۔ آج ہر چھوٹی سے چھوٹی قوم اور جماعت کے مسائل پوری انسانیت کے مسائل سے وابستہ ہیں۔ اس لئے جو جماعت اور قوم زندہ رہنا اور آگے بڑھنا چاہتی ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پوری انسانیت کی مشکلات کا حل لیکر اُٹھے۔ اور آگے بڑھے اور جس جماعت کی حیثیت اس حل کے اعتبار سے خام ہوگی وہ اتنا ہی اپنے آپ کو اور انسانیت کے وسیع مفاد کو نقصان پہنچائے گی اور اتنی ہی جلدی اپنی عمر کی آخری منزل میں داخل ہوجائے گی۔ مہا سبھائی نیتاؤں کے لئے یہ چیز قابلِ غور ہے۔

ضروری اعلان

ادارۂ ادب اسلامی کے کارکن متوجہ ہوں

مرکز ادارہ ادب اسلامی کی طرف سے ایک دستوری خاکہ مختلف حلقہ ہائے ادب اسلامی کو روانہ کیا گیا تھا، اور اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ اس نئے خاکہ کے مطابق جہاں جہاں حلقہ جات قائم ہوں اُن کی تشکیل جدید کرلی جائے، اور اس کی رپورٹ فوراً مرکز کو روانہ کردی جائے لیکن ابھی تک متعدد مقامات پر ادارۂ ادب کی تشکیل جدید عمل میں نہیں آئی ہے، اور نہ اس کی رپورٹ ہی مرکز کو پہونچی ہے۔ اس لئے ادبی کارکن فوراً اس طرف متوجہ ہوں۔ اور ماہ فروری کی ۲۰ تاریخ تک پوری کارروائی مکمل کرکے اس کی رپورٹ مرکز روانہ کردیں۔

نئے دستوری خاکہ کے مطابق آپ کو حسب ذیل کام کرنے ہیں۔

۱۔ جو لوگ ادارے کے ادبی مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں اور اپنے ادب اور سیرت کو اُن کے مطابق ڈھالنے کے لئے آمادہ ہوں اُن کے ناموں کا بہ حیثیت رکن باقاعدہ اندراج کیا جائے گا۔

۲۔ ادارہ کے صدر اور سکرٹری کا انتخاب کیا جائے گا۔

۳۔ لائبریری کے قیام کے لئے فنڈ کا انتظام کیا جائے گا۔

۴۔ اپنے اجتماعات اور آئندہ کام کا باقاعدہ پروگرام بنایا جائے گا۔

۵۔ اپنے "ادبی سنٹر" (یعنی ایسا ذیلی ادبی مرکز جس کے تحت ایک علاقے کے ادارہ جات ادب اسلامی رہیں گے) کے مقام اور اس کے ناظم کے لئے اپنی طے شدہ تجاویز بھیجی جائیں گی۔

۶۔ دستوری خاکہ کے پورے متن یا کسی شق کے بارے میں جو تجاویز اور مشورے ہوں اُن سے مرکز کو مطلع کیا جائے گا۔

دوبارہ اس امر کی وضاحت کی جاتی ہے کہ ان تمام باتوں پر عمل کرکے اپنی رپورٹیں اور تجاویز ۲۰ فروری ۱۹۵۱ء تک مرکز "ادارۂ ادب اسلامی" نور منزل محلہ کھنڈسار کہنہ رام پور (یو۔پی) کو روانہ کردیجئے۔ اگر اس تاریخ تک تجاویز اور رپورٹیں نہ پہنچیں گی تو مرکز اس کے بعد کام شروع کردے گا۔

محمد شفیع مونس

رام پور (یو۔پی)

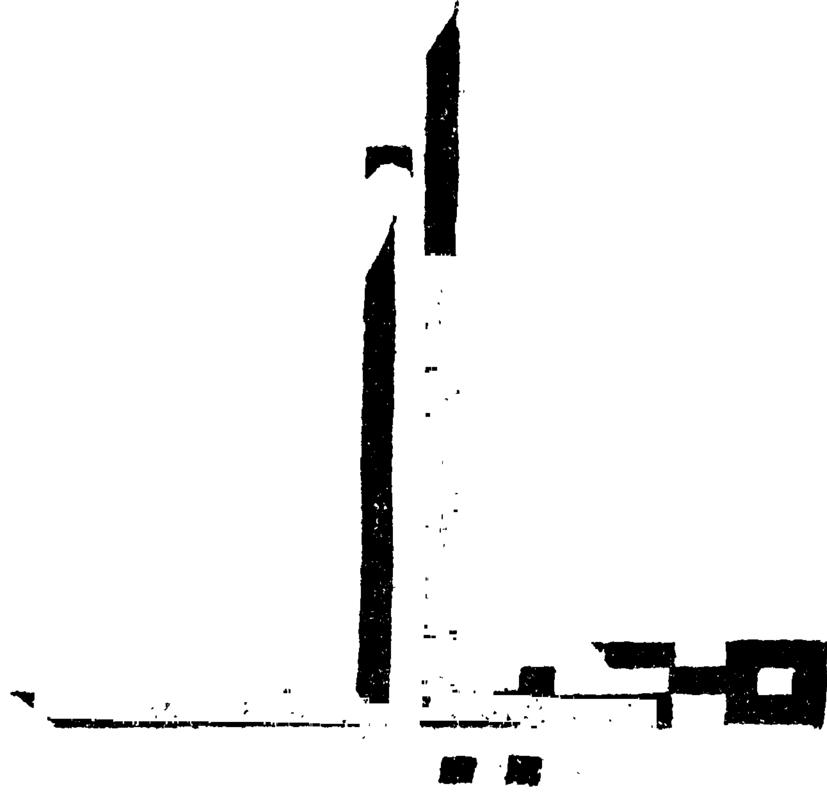
معیار

Maiyar
Monthly



فروری
سنہ ۱۹۶۵ء

جلد (۱)
شمارہ (۲)



ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

عبدالقدیر اصغر

تعاون

سالانہ پانچ روپے

فی کاپی آٹھ آنے

ہیڈ آفس:۔ خندق اسٹریٹ ۔ میرٹھ شہر
سب آفس:۔ محلہ کشن گنج ـــــ دہلی ۶
(خط و کتابت و ترسیلِ زر کے لیے سب آفس)

ترتیب

[illegible] اور ایجنٹ حضرات اپنی رقوم شیخ محمد ظفر الدین صاحب پبلشر اندرون موچی گیٹ لاہور کے پتے پر روانہ کریں اور ہمارے سب آفس کو اطلاع دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

نقشِ اوّل

"معیار" کا پہلا شمارہ جب سامنے آیا تو اُس پر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اصحاب نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ٹائیٹل، کتابت و طباعت اور مضامین کی نوعیت کوئی چیز ایسی نہ تھی جو زیرِ بحث نہ آئی ہو۔ ہم اپنے اُن تمام دوستوں کے مشکور ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کرکے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ دراصل جو کام ہم لے کر اُٹھے ہیں وہ باہمی تعاون کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ الحمدللہ یہاں تک اس تعاون کے پہلے حصے یعنی مشورے اور تنقید کا تعلق تھا وہ پورا ہوا لیکن اس کے دوسرے حصے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی یعنی عملی تعاون بہت کم کیا گیا۔ ہم اپنے ان خیرخواہوں سے عرض کریں گے کہ اب عمل کی طرف قدم بڑھائیے۔ اور جس طرح بھی آپ ہماری مدد کرسکتے ہیں اُس سے دریغ نہ کیجیے۔

ہمارے لکھنے والوں کو "درخواستوں" اور "ریمائنڈروں" کا انتظار کیے بغیر اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔ اور صرف اپنا اپنا لیٹر پر نیا مراسلہ کے ساتھ حاضر ہو جانے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بعض لکھنے والے لکھتے لکھتے تھک سے گئے ہیں۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ ہے کہ اُن کے سامنے لکھنے کے نئے میدان نہیں ہیں۔ نئے عنوان اور نئے موضوع کسی دسند تکیے میں چھپ گئے ہیں۔ جب آدمی ایک ہی راستے پر پہنچ لیتا ہے تو وہ کچھ پٹا ہوا سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کی طبیعت اُکتانے لگتی ہے اور وہ قلم ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنی اس کمزوری کو دُور کرنا ہوگا۔ یہ تعطل کا بہت بُرا دور ہوتا ہے۔ یہ چیز اگر مستقل اختیار کرلے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اُس پورے نظامِ حق سے ہاتھ دھو بیٹھیں جس کو ہم نے حق سمجھ کر قبول کیا ہے۔ بعض دوستوں کو اپنی "کم علمی" اور "بے کرداری" کا بہت زیادہ احساس ہوگیا ہے، اس لیے اب وہ مسلسل "تکمیلِ علم" اور "تکمیلِ سیرت" کی طرف متوجہ ہیں ـ یہ احساس بہت قیمتی شے ہے۔ لیکن اگر یہ اس حد تک ہو کہ انسان کو میدانِ عمل سے ہٹا دے تو پھر یہ ایک فتنہ سے کم نہیں۔ "تکمیلِ علم" اپنی انتہا پسندی کے ساتھ ایک خیالی منزل ہے جس کا راہی کبھی اُسے نہیں پا سکتا۔ اور "تکمیلِ سیرت" میدانِ عمل سے ہٹ کر محض ایک وہم ہے جس کو حاصل کرنا خالی فضا میں عنقا کو تلاش کرنا ہے۔ دوستو اور ساتھیو! حصولِ علم کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ ایک طرف آپ اسے کاغذی کتابوں کے ذریعہ حاصل کریں اور دوسری طرف یہ گوشت پوست کی کتاب ـــــ "کتابِ زندگی" کھول کر بیٹھیں۔ ان دونوں کے گہرے تقابلی مطالعہ اور ان میں باہمی تطابق کے لیے مشقوں (EXERCISES) کے ذریعہ انسان صحیح علم کے زینہ پر چڑھتا ہے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم جو کچھ پڑھیں اُس کو زندہ انسانی سوسائٹی پر آزمائیں۔ اس طرح ہمارے افکار کی صیقل ہوگی، اور ہمارے خیالات کی عملی اور افادی حیثیت نکھر کر سامنے آئے گی۔ حصولِ علم کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں ہو سکتا جبکہ عمل کی طرف سے غفلت برتی جائے ـــــ جو علم بغیر

عملی تجربہ کے حاصل کیا جائے گا وہ علم نہیں تخیل ہے۔ صحیح علم کا مطلب تو یہ ہے کہ اصول اور نظریات انسانی جماعت کے رواں دواں مسائل کا ساتھ دے سکیں۔ وہ اُن کے ساتھ دوڑنا اور پھاندنا جانتے ہوں۔ لیکن اگر وہ اِس اُچک پھاند کے عادی نہ ہوں اور ٹھہر کر بیٹھ رہیں تو کسی وقت ایسا ہوگا کہ زندگی کا قافلہ راستے کے موڑ پر اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جائیگا۔ اور یہ گرانقدر افکار اپنی تمام گرانقدری کے باوجود پیچھے رہ جائیں گے ہمیں حق کو پیش کرنے میں اس کوتاہی سے ڈرنا چاہیئے۔ انسان جس وقت جتنی صلاحیت رکھتا ہے اُسی کے مطابق وہ ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ وہ مستقبل کے توقعات پر اپنی موجودہ صلاحیت کے استعمال سے غفلت نہیں برت سکتا۔ کیا معلوم مستقبل آئے نہ آئے اور وہ اُس کی راہ تکتے ہوئے اس جہان سے کوچ کر جائے۔ جو لوگ حال کے ذرائع کو آئندہ کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں وہ دراصل اُن ذرائع کی افادیت کو کم کرتے ہیں۔ اِس سے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دن اُن کی افادیت بالکل ہی ختم ہو جائے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کی موت سے ڈرنا چاہیئے۔ یہ چیز ایک اچھے خاصے انسان کو زندہ لاش میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اب رہا تکمیلِ سیرت کا سوال تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جس اونچی منزل تک ہم کو پہنچنا ہے اُس تک پہنچنے کے لئے چھوٹے اور بڑے راستوں سے بہرحال گزرنا پڑے گا۔ اگر ہم ان راستوں کو حقیر جان کر اُن پر سے نہیں گزریں گے تو ملت کی وہ منزل کبھی آ ہی نہیں سکتی جس تک ہم اپنے آپ کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی تیاری کے خیال سے سفر ملتوی کر دیا تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ ہم اپنی جگہ پر بیٹھے رہ جائیں گے اور کبھی اوپر پہنچنے کا موقع ہی نہ آئے گا۔ ہر وقت سیرت کی تکمیل میں کوئی نہ کوئی کمی نظر آئے گی صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم جیسے کچھ ہیں اُسی طرح آگے بڑھتے رہیں اور اس دوران میں اپنے آپ کو اور آگے کیلئے تیار کرتے رہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہماری غلطیاں اور کوتاہیاں ہم سے چھوٹ جائیں گی۔ اور ایک منزل کے بعد دوسری منزل تک پہنچنے کی جدوجہد آپ کی منزلوں سے خود بخود بلند تر کر دیگی۔ کردار اور اخلاق کی بلندی ماحول سے لڑنے، مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے اور باطل پرستوں سے پنجہ آزمائی کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور اس کام کے لئے ہم عملی کوششوں کے ذریعہ ہی انسان پختہ ہوتا ہے۔ جس طرح تیراکی کا فن پانی میں چھلانگ لگائے بغیر نہیں آتا اور اس کے باہر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اسی طرح کردار کی پختگی کیلئے ماحول میں چھلانگ لگانا ضروری ہے۔ [illegible] ہمارے رفیقوں کو اپنی ذہنی اور فکری تیاری کے ساتھ ساتھ عمل کے میدان میں نئے نئے طریقوں سے آگے بڑھنے کا تجربہ ہر وقت کرتے رہنا چاہیئے۔ یہ تجربہ ہماری زندگی کی علامت ہے۔ یہی تجربہ ہماری رکاوٹوں کو دور کرے گا۔ اور ہمارے لئے ترقیوں کی شاہراہ کھل جائیگی۔ اگر اس وقت آپ کے راستوں کا میدان محدود ہے تو یہ کل نہیں رہے گا۔ آپ کی کوششیں خدا کی تائید سے مل کر [illegible] پہاڑ کو راستے سے ہٹا دیں گی۔

اس شمارے میں [illegible] مضامین ہیں ان کی افادیت پہلے سے زیادہ ہے۔ مقالات میں "سماج کی بنیادیں" انور اعظمی کی ایک نئی کوشش ہے۔ اس میں اگرچہ مواد کم ہے لیکن موضوع انوکھا ہے اور اسلوب بھی حالات کے نئے رُخ کے مطابق ہے۔ یہ دونوں چیزیں کافی اہم ہیں۔ [illegible] محبوب علی [illegible] نے "روسی انسان کی زندگی" پر ایک ترجمہ بھیجا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس علاقے کا رہنے والا ہے جہاں کمیونسٹ تحریک کسی حد تک اپنی شکل میں جلوہ گر ہے۔ اس ترجمہ میں محبوب علی کے اپنے ماحول کا ردِ عمل جھلکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک طرف کمیونزم کے اصلی خدوخال سامنے لائیں اور دوسری طرف سرمایہ داری کی پول کھولیں۔ تاکہ ان دونوں نظاموں کی برائیوں کے خلاف ہمارا [illegible] اُٹھے۔ نظموں میں [illegible] "بھی بھارتی پس منظر میں نئے مقصد کے ساتھ ایک نئی چیز ہے۔ غزل میں قمر الٰہ آبادی [illegible] اپنی آمد سے اچھی علامتوں کا اظہار کر رہے ہیں، باقی لوگوں میں حفیظ میرٹھی رہنمائی کے مقام پر ہیں۔ حفیظ نے غزل کو غزل رکھتے ہوئے بڑی خوبی سے نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ ن حسنی اور نجم الاسلام آگے آ رہے ہیں۔ عزیز احمد ابھی [illegible] رہے ہیں۔ افسانوں میں راؤ شمشاد علی خاں کا مطالعہ گہرا اور نفسیاتی ہے۔ "فیصلہ کن" میں انور اعظمی دیہاتی زندگی کے اہم ترین مقصد پر چوٹ کرتا ہے۔ [illegible] "تاج العرفان عثمانی کے لئے علامتِ خیر ہے۔ "ارزدہ کرنیں" ——— احمد حسین انصاری کے اب تک کے ڈراموں میں سب سے اونچا ہے۔ یہ ڈرامہ فن اور مقصد دونوں کے اعتبار سے خداپرستانہ مقصدی ادب میں ایک محسوس ہونے والا نشان ہے۔ ابوالخطیب انوار کے "ادبیات نبوی کے پس منظر" میں خداپرست فن کاروں کی بڑی حد تک صحیح رہنمائی کی ہے۔

نقشِ ثانی ———

بھارت کے عوام

بھارت کے عوام صدیوں بعد آزادی کی انگڑائی لے رہے ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے عوام کا ضمیر مردہ ہو چکا تھا۔ نہ ان میں خودداری تھی، نہ آزادی پسندی تھی اور نہ اپنے انفرادی اور سماجی کردار کو بنانے کا جذبہ تھا۔ قدیم مذہب پرستانہ جذبات سے یہ لوگ برسوں سے گریز پیروی کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی مذہبیت پر نا مذہبیت اور ذاتی خواہشات کا رنگ چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ان کی زندگی پر طرح طرح کے غیر فطری نظریات اور اصولوں کے دوسے چڑھ گئے تھے۔ ہندوستانی سماج کو مختلف طبقوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ہر طبقہ اپنے آپ کو اپنے سے نچلے طبقہ کا خدا سمجھتا تھا۔ مذہبی اصولوں میں ترمیم و اضافہ کے بعد خاص خاص گروہوں نے اپنے مفادات حاصلہ ([illegible]) کی حفاظت نے بند و مضبوط کر لیا تھا۔ عام لوگوں کو سوچنے اور بولنے تک کی آزادی نہیں تھی۔ غریبوں کے گروہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کے لوگ پیدا ہوتے اور مر جاتے لیکن وقت کے نظام میں اتنا بل بوتا نہیں تھا کہ وہ انہیں اٹھا کر اوپر کرتا۔ جو ایک دفعہ اوپر آ جاتا۔ اعلیٰ خاندان میں پیدا ہو جاتا اور اونچی ذات میں جنم لے لیتا۔ وہ اپنے کردار اور اخلاق کی انتہائی پستی کے باوجود اسی طبقے میں رہتا تھا۔ اس اصول کی تائید وقت کا سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی نظام سب کرتے تھے۔ آزادی اور خوشحالی صرف چند لوگوں کی میراث تھی اور بھارت کے کثیر تعداد عوام غلام تھے۔ ان کے دماغ ماؤف کر دیئے گئے تھے۔ ان کی عقلیں مفلوج تھیں۔ ان کے احساسات پامال تھے۔ ان کے جسم ننگے اور ان کے پیٹ پچکے ہوئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس کمزور ہندوستان پر ایرانیوں کی طرح باہر والے بھی آ آ کر اپنا سکہ جماتے رہے۔ اور انسان پر انسان کا راج قائم ہوتا رہا۔ لیکن آج یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ ——— جب سے بھارت آزاد ہوا ہے۔ یہ فتنے دب رہے ہیں اور بھارتی عوام نئے جذبات اور نئی امنگوں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

اکثر لوگ کہتے ہیں اور یہ خیال بڑی حد تک ٹھیک بھی ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں کوئی نئی چیز نہیں ہوئی۔ وہی پرانے اصول تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ ابھی تک چل رہے ہیں۔ سیاسی طور پر بے شک ہندوستان آزاد ہو گیا ہے لیکن ذہنی اور تمدنی اعتبار سے ابھی اس ملک کو آزاد ہونا ہے۔ عوام کو زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نیا راستہ اختیار کرنا ہے۔ مگر ایسا خیال کرنے والے یک طرفہ رجحان رکھتے ہیں۔ ان کا نظریہ قنوطیت پسندانہ (Pessimistic) ہے۔ بیشک ہندوستان کی آزادی "کامل آزادی" نہیں ہے اور ذہنی اور فکری اعتبار سے ابھی ہندوستان کو آزاد ہونا ہے لیکن اس معمولی آزادی سے جو اس وقت ملی ہے۔ کامل آزادی کے لئے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ اور بھارت کے عوام اپنی غیر معمولی طاقت سے زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا کر دینے کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس ہمہ گیر انقلاب کی جدوجہد سوسائٹی کی اوپری سطح کے نیچے پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔ مختصر طور پر عوام کے اندر جو خیالات اس وقت پرورش پا رہے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) یہ لوگ انگریز کے سیاسی اصولوں اور مغرب سے آئے ہوئے حکمرانی کے تمام تصورات کو خیرباد کہہ دینا چاہتے ہیں۔ اور ان کے سخت مخالف ہیں۔

(۲) ان کے نزدیک مادہ پرستانہ فلسفیات کی اہمیت دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ سطحی دنیادارانہ ([illegible]) طریقہ زندگی سے گھبرا کر اور اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ ہو کر اس کے شدید دشمن بنتے جا رہے ہیں

ہیں۔

(۳) ان کے پیش نظر اپنی معاشرتی اور سماجی خرابیوں کی اصلاح کا کام بہت زیادہ اہم ہے۔ اور وہ دن رات [illegible] پر غور کر رہے ہیں اس معاملہ میں انھیں دوہرا کام کرنا ہے۔ ایک [illegible] قدیم [illegible] کو خیرباد کہا جائے جو مغربی حکمرانوں نے زبردستی ان پر لاد دیئے تھے۔ دوسرے [illegible] ہندوستانی تہذیب یا پراچین بھارت [illegible] کو دوبارہ اس طرح مرتب کیا جائے کہ وہ زندگی کے موجودہ مسائل کو حل کر [illegible] کام اس وقت سب سے زیادہ [illegible]

(۴) معاشی طریقوں [illegible]

رہے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام [illegible] تھا مگر اب عوام کے اندر [illegible] کا [illegible] ہوگئی ہے۔ اس لئے وہ [illegible] کے مخالف ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس مخالفت کا مطلب یہ نہیں [illegible] ہندوستانی عوام سوشلزم یا کمیونزم کے حامی ہوگئے [illegible] مغربی [illegible] کو اپنے لئے [illegible] سمجھتے ہوئے [illegible] والے رہنما سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان کوئی متوازن راہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔

[illegible] عوام [illegible] جذباتی [illegible] اور [illegible] لیکن [illegible] بھارت کے عوام [illegible] جذباتی نہیں [illegible] خاص مقصد [illegible]) کے قدم اٹھاتے ہیں [illegible] کوئی خاص مقصد [illegible] ہندوستان کی حفاظت اور ذاتی فائدہ یہ سب چیزیں ان کے پیش نظر رہتی ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ شخصیت پرست بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنے مخصوص اصولوں کی خاطر [illegible] سے بڑی شخصیت کو [illegible] کر دیا۔ کیا یہ واقعہ ہندوستانیوں کی شخصیت پرستی کا دور انسان پرستی پر دلالت کرتا ہے؟ جو لوگ ان پر یہ بہتان لگاتے ہیں وہ صریح دھوکے میں مبتلا ہیں۔

ہندوستان کے عوام آزادی [illegible] دشمن بھی نہیں ہیں۔ البتہ انھیں کسی خاص پارٹی کے اقتدار سے نفرت ہو سکتی ہے لیکن وہ اپنی آزادی سے ہرگز نفرت نہیں کرتے [illegible] کا ہر شخص سچی آزادی کا خواہاں ہے اور اسی کے لئے وہ جد و جہد کر رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندستان کے کثیر التعداد باشندے اپنے اوپر اپنے ہی جیسے کسی انسان کے اقتدار کو پسند نہیں کرتے۔ نہ کسی باہر والے کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور نہ اپنے ہی ملک کے کسی انسان یا انسانی جماعت کے اقتدار کو پسند کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ اگر وہ آزادی سے پہلے باہر والوں کے خلاف متحد ہو کر لڑ سکتے تو اب آزادی کے بعد اپنے تحفظ کے لئے اپنے ہی ملک والوں سے دست و گریباں ہیں۔

ہندوستان کی داخلی کشمکش، کیونزم اور بدامنی بظاہر سینکڑوں برائیاں [illegible] لیکن [illegible] انسانیت کا سویا ہوا ضمیر [illegible] اس کے اندر صدیوں کے مردہ انسان کے لاشے میں جان [illegible] اور آدمیت حقیقی آزادی کا سورج اپنے کندھوں پر اٹھائے [illegible] آگے بڑھ رہی ہے۔ اس اقدام کو کوئی انسانی طاقت روک نہیں سکتی ہے

نا پختہ سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون؟
روح آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون؟

بھارتی عوام کے تیور نکلتے ہوئے ضمیر اور مچلتے ہوئے جذبات سے جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ ان کی فطری خامیوں کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی غلط رہنمائی کا نتیجہ ہیں جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت عوام کی باگ [illegible] وہ پوری طرح عوامی جذبات کو سمجھ نہیں سکے ہیں اور اگر سمجھ گئے ہیں تو ان کے پاس عوام کے اجتماعی ضمیر کے مطالبہ کو پورا کرنے کا کوئی صحیح ذریعہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ہے کہ عوام کے کھولتے ہوئے جذبات اور انقلاب انگیز کردار غلط مقاصد کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے ہیں۔ اور ان کی طاقت ضائع ہو رہی ہے۔

اس وقت رہنماؤں کا ایک گروہ عوام سے کہہ رہا ہے کہ ہمارے مسائل کا حل اس نظام میں ہے جو ہم نے مغرب کے لادینی جمہوری اصولوں اور قدیم ہندوستان کے تہذیبی اصولوں کے میل ملاپ سے تمھارے لئے تیار کیا ہے۔ پس اس نظام کو کچھ مدت نہیں چلا لینے دو ہم تمھیں بتائیں گے۔ کہ اس سے کتنا غیر معمولی فائدہ پہونچتا ہے۔ اس میں ہر انسان کو سچی آزادی حاصل ہے۔ کامل مساوات ہے اور امن و سلامتی ہے۔ لیکن عوام دیکھتے ہیں کہ جب سے یہ نظام ان کے ملک میں آیا ہے اس وقت سے ان کو کوئی

فائدہ نہیں پہونچا۔ دن بدن زندگی کے راستے کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس لئے لاکھ یقین دہانی کے باوجود عوام کا اعتماد رہنماؤں کے اس طبقہ پر سے اٹھتا جا رہا ہے اور عوام ان کی حکم عدولی کر رہے ہیں۔

رہنماؤں کا دوسرا طبقہ ایسا ہے جو اپنے پروپیگنڈے، ہڑتالوں اور توڑ پھوڑ کی تحریک ([illegible]) کے ذریعہ عوام کے ذہین افراد اور پچھلے محنت پیشہ طبقوں کو یہ سمجھا رہا ہے کہ ہندوستان جاگیرداری دور سے گزر کر سرمایہ داری کے عہد میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس کے بعد اسے تاریخ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ انقلاب یعنی محنت پیشہ طبقے کے اقتدار سے دوچار ہونا ہے۔ لہذا قدیم مذہبی، معاشی اور معاشرتی اصولوں کو ترک کر کے عوام کو "پیٹ" کی بنیاد پر اپنے ملک کے سرمایہ داروں سے ایک اور جنگ لڑنی چاہیئے۔ ہندوستان کی موجودہ آزادی اصل میں ہندوستان کے سرمایہ داروں کی آزادی ہے۔ بھارت کے کسان، مزدور، اور لاتعداد محنت پیشہ عوام آج بھی اسی طرح غلام ہیں جس طرح وہ انگریزوں کے زمانے میں غلام تھے۔" اس نظریہ سے بعض افراد کافی متاثر ہیں لیکن جو لوگ بھی اس کے ساتھ ہوئے ہیں وہ محض ابن الوقتی کی وجہ سے .... ہوئے ہیں۔ یا ایک نئے تجربے کی خواہش ان کی جدت پسند طبیعت کو اکسا رہی ہے۔ ورنہ ان کے ضمیر اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ تحریک بھی مغرب کی ذہنی اور مادی غلامی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اس میں مساوات کا صرف ڈھونگ رچایا گیا ہے ورنہ اس میں بھی اسی طرح انسان پر انسان کی حکومت قائم ہوتی ہے جس طرح سامراج میں۔ اس میں سرمایہ پرستی ایک نیا روپ دھار کر دوبارہ جنم لیتی ہے اور اگر یہ تحریک کامیاب ہو جائے تو اس سے فائدہ عوام کا نہیں بلکہ ان کے رہنماؤں کا ہوگا۔ عوام آج کی طرح کل بھی محنت کرتے اور ایڑیاں رگڑتے ہی رہیں گے۔ چنانچہ ایک بڑا گروہ کھلم کھلا اس تحریک کا مخالف ہے۔ اور پوری قوت سے اس کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان خیالات کو پیش کرنے والی جماعتیں ایک طرف قوم پرستوں اور مذہبی گروہوں کے جذبات کا ساتھ دے رہی ہیں اور دوسری طرف امن سوز کارروائیوں کا۔ یہ لوگ دو عملی اور نفاق کے ذریعہ اپنا کام چلا رہے ہیں۔ ان میں اتنا بل بوتا نہیں ہے کہ کھل کر سامنے آئیں اور مکر و فریب کے پردے کو چاک کر کے کوئی ایک اصولی راہ اختیار کریں۔

ہمیں یقین ہے کہ اس دو رنگی کو ہندوستانی عوام زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکیں گے اور عوام کی طاقت ایک دن ان تحریکوں کا قلع قمع کر دے گی۔

ایک اور گروہ جو اس وقت عوام کی نفسیات سے نسبتاً قریب ہے یہ کہتا ہے کہ قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ ہمارے کام کا نہیں ہے اس سے ہمارا دھرم خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ہم اس لادینی تصور مملکت کو ختم کر کے ایک خالص مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں حکم الٰہی صرف مقدس قانون کا چلے گی۔" اس بات کو سنکر بھارت کے عوام اس کی طرف لپکتے ہیں، کیونکہ اس میں انہیں اپنی خواہشات کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اس تحریک میں تین زبردست خامیاں ہیں۔ اول یہ کہ وہ قومی جمہوری لادینی ریاست کی نفی کرنے کے باوجود خود جس قسم کا خاکہ پیش کرتی ہے وہ بھی قریب قریب وہی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تحریک سوشلزم اور کمیونزم کی مخالف ہوتے ہوئے بھی معاشی حل کے طور پر اس کی قائل ہے اور تیسری اہم بات یہ کہ اس کا تصور مذہبیت محدود ہے۔ پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے یہ مذہب اور خدا پرستی کا نام تو لیتی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد پر کوئی مکمل نظام زندگی پیش نہیں کرتی۔ اس کا طریقہ انقلاب بھی منفی پروگراموں پر مشتمل ہے۔ یہ تحریک اپنے اصولوں کو دنیا کے سامنے رکھنے اور مخالف تحریکوں سے ایک "اصولی جنگ" لڑنے کے بجائے اپنے مخالف کے خلاف محض نفرت و حقارت کے جذبات ابھار کر عوام کو کامیابی کا یقین دلاتی ہے۔ بھارت کے سادہ لوح عوام اس کے چکر میں آ جاتے ہیں۔ اور بغیر کسی اخلاقی یا اصولی وجہ کے قتل و خون کے سمندر میں کود پڑتے ہیں۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد بھارتی عوام پر اس تحریک کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔ اور وہ دیکھ لیں گے۔ کہ جس جذباتیت کے راستے پر یہ لوگ انھیں لئے جا رہے تھے۔ وہ بین الاقوامی مسائل اور زندگی کی نئی نئی مشکلات کو حل کرنے میں سخت ناکام ہو چکی ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس سے اس وقت بھارت کے عوام دوچار ہیں۔ ہماری رائے میں عوام کو اس حالت سے نکلنے اور ان کو شدید ذہنی کوفت سے بچانے کی واحد شکل صرف یہ ہے کہ ان

کے فطری مطالبات کی جلد سے جلد تکمیل کی جائے اور کوئی ایسا نظام فکر ان کے سامنے رکھا جائے ۔ جو ان کی تمام صحیح ضروریات کو پورا کرسکے ۔ اور ان کی اُبھرتی ہوئی صلاحیتوں کو بہتر راستے پر لگا سکے ہو سکتا ہے کہ عوام اول اول ایک نئی چیز دیکھ کر اس کے خلاف کچھ کشاکش کریں لیکن بعد کو جب انھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ نظام لادینی جمہوریت، کمیونزم، سوشلزم اور محدود مذہبیت سے بالاتر ہے اور ان کے جذبات اور فطری مطالبات کی نہایت بہتر طریق پر تکمیل کرتا ہے تو وہ اس کی طرف اس طرح لپکیں گے ۔ جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے ۔

اس قسم کا نظام فکر وہی ہو سکتا ہے ۔ جو اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے دوسری اشیاء کے ساتھ ساتھ انسان کے فائدہ کے لئے بنایا ہے ۔ اس نظام میں کہیں کوئی خامی نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ خدا کی پیدا کی ہوئی دوسری اشیاء میں بھی کوئی خامی نہیں ہے ۔ یہ عوام کے فطری مطالبات سے پوری طرح میل کھاتا ہے ۔ کیونکہ اس کا بنانے والا عوام کی فطرت سے ان کے "رہنماؤں" کے مقابلہ میں کہیں زیادہ واقف ہے ۔ وہ خالق ہے ۔ اور یہ لیڈر اور عوام سب اس کی مخلوق ہیں ۔ اس لئے اس سے بڑھ کر جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے ۔ اور اس سے بہتر راستہ اور کون دکھا سکتا ہے ۔

اگر ہندوستانی عوام نے سچے خدا پرستانہ اصولوں کو تسلیم کر لیا ۔ تو صرف پندرہ دن کے اندر Within a fortnight اس ملک میں زبردست اخلاقی اور معاشرتی انقلاب آسکتا ہے اور تہذیبی اور تمدنی اصلاح کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے ۔ جسے اکثر لوگ برسوں سے دیکھتے چلے آرہے ہیں ۔ لیکن اس "خواب کی دنیا" تک پہونچنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔ بھارت کے بڑے بڑے قومی لیڈروں اور رہنماؤں نے ملک کو بلندیوں تک پہنچانے کے لئے جو پروگرام بنائے اس میں ان کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق انھوں نے جو کچھ درست سمجھا وہ کیا ۔ مگر اب تجربہ نے بتا دیا ہے کہ انسان نے جو کچھ سوچا تھا ۔ وہ غلط تھا ۔ اگر اس غلطی پر اسی طرح اصرار جاری رہا ۔ اور ہم محض ضد کی وجہ سے غلط اصولوں سے چمٹے رہے ۔ تو انجام تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ اب انسان کو وہ بات مان لینی

چاہیئے جو اس کے بنانے والے نے اس کے لئے بتائی ہے جس طرح ایک موٹر اپنے آپ کو خود نہیں چلا سکتی ۔ اسی طرح زندگی کی موٹر بھی خود بخود نہیں چل سکتی ۔ اگر یہ آپ ہی چل پڑے گی تو کسی چیز سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے گی ۔ انسانی مشین کو چلانے کے لئے انسان نے جتنے طریقے بنائے تھے وہ ٹوٹتے جا رہے ہیں اور مشین خراب ہوتی جا رہی ہے اگر آئندہ بھی یہی صورت حال رہی تو پوری کی پوری مشینری بالکل تباہ ہو جائے گی ۔ بھارت دیش کے لوگ اس وقت ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں ۔ انھوں نے ایک غیر قوم کا جوا اپنی گردن سے اتارا ہے ۔ انھوں نے اپنے راستے کی بڑی سے بڑی رکاوٹ کو دور کیا ہے ۔ ان کے خون میں گرمی اور تڑپ باقی ہے ۔ ان کا انقلابی کردار زندہ ہے ۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ عوام کے رہنما ان کو مادہ پرستی، خود غرضی اور دنیا پرستی کی راہ پر لئے جا رہے ہیں اور ان کے ضمیر کے خلاف ان سے کام لے رہے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ بھارت کے عوام ابھی ہر غلط رہنمائی کے خلاف نبرد آزما ہیں ۔ وہ یکے بعد دیگرے انسان کی غلامی کے ہر ہر بندھن کو کاٹ رہے ہیں ۔ کچھ بندھن کٹ چکے ہیں ۔ کچھ اور کٹنے والے ہیں ۔ ان لوگوں کو ایک نظام کے بعد دوسرا نظام لانے کی عادت ہو گئی ہے ۔ اگر اس دیش کے رہنما عوام کی فطرت کو سمجھیں اور قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے ذریعہ خود بھی ان کے بندھن کاٹنے میں مدد دیں تو ایسا زبردست کام ہو سکتا ہے ۔ جو دنیا بھر کے انسانوں کے لئے سلامتی کا پیغام ثابت ہوگا ۔ اور بھارت کو سارے دیشوں میں اونچا کر دے گا لیکن اگر وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے تو ہم پوری ہمدردی کے ساتھ ان سے عرض کریں گے ۔ کہ

" انسانیت کے بیدار ہوتے ہوئے ضمیر سے ہوشیار رہو ۔ اور بھارتی عوام کے کروٹیں لیتے ہوئے جذبات سے ڈرو ۔ "

اگر بھارت کے لیڈروں اور سوچنے والے طبقے نے اس بات کو سمجھ لیا تو جو انقلاب سینکڑوں خرابیوں کے بعد آتا، وہ تعمیر کے راستے سے آئے گا ۔ ورنہ کون جانے موجودہ جذبات بھارت والوں کو کن کن چٹانوں سے ٹکرائیں ۔ اور پھر "بعد از خرابی بسیار" راہ حق نمودار ہو ۔ ! !

ہلال ماہنامہ
فروری ۱۹۵۱ء

انور اعظمی

سماج کی بنیادیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جہاں کہیں اور جس دور میں بھی ہوگا ضرور کسی نہ کسی اصول پر اپنے تمدن، اپنی معاشرت، روزانہ کے معاملات اور ذہنی و فکری زاویوں کا تعین کرے گا۔ انسان اس پھیلی ہوئی دنیا میں حیوانوں کی طرح خود اپنے ہی ذاتی فائدوں میں محصور رہ کر بیٹھ نہیں سکتا۔ اس نے ماں کی گود کی نعمت حاصل کی ہے باپ کے شفقت آمیز ہاتھ نے اس کی پرورش میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ بھائی کی محبت، بہن کی الفت اس کے لئے وقف رہی ہے۔ پڑوسیوں اور خاندان والوں کے پیار بھرے گہوارے میں اس نے زندگی کا ابتدائی سفر طے کیا ہے۔ آگے بڑھئے تو شہریوں کے حقوق ہیں حکومت کے عام انتظامات ہیں۔ ان سب سے اس نے اپنی زندگی کو پائدار اور محفوظ بنا دیا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دنیا میں قدم رکھے لیکن نہ تو اس کے لئے ماں کی محبت ہو اور نہ باپ کا مشفقانہ ہاتھ۔ نہ تو بھائی بہن کی الفت ہو اور نہ پڑوسیوں اور خاندان والوں کا پیار، حکومت نہ ہو کہ اس کی ننھی سی جان کے لئے حفاظت کا انتظام کرے لیکن خالق کائنات نے انسان کی پیدائش کا مقصد یہ نہیں قرار دیا تھا کہ وہ صرف حیوانوں کی طرح آزادانہ زندگی بسر کرے۔ بلکہ حقیقی مقصد یہ تھا کہ وہ دنیا میں پھیلے، بڑھے۔ اور اپنے معاملات اور تعلقات کے ذریعہ دنیا میں حق کی شہادت دے اور صداقت کا نام بلند کرے۔ اسی لئے اتنا اہتمام کیا گیا کہ ماں کی محبت بھری گود ہو، باپ کا مشفقانہ ہاتھ ہو۔ خاندان کا پیار ہو، حکومت کی نگرانی ہو۔

یہ تمام نفع رسانیاں انسان کو ایک زنجیر میں مقید کر دیتی ہیں۔ اور اگر کوئی انسان ان احسانات اور نوازشوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف ذاتی نفع پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو در حقیقت اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور بے ایمان شخص کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ ماں باپ کا احترام کرے۔ بیوی، بہن، بھائی کے حقوق ادا کرے۔ خاندان اور حکومت کے احکام مانے، کوئی انسان بھی دنیا میں انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنے گرد کی دنیا سے لے کر پورے کرۂ ارضی کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ اور جب کبھی بھی ان میں سے کوئی ایک اپنی ضرورت کے وقت اسے پکارے گا۔ تو اسے لبیک کہنا پڑے گا۔ اس لئے کہ ان تمام سے اس نے فائدہ حاصل کیا ہے۔

یہ تصور کہ انسانی سماج اپنے پیچھے کوئی مستقل بنیاد نہیں رکھتی باطل ہے اور ایک شرمناک فریب ہے جس میں بدقسمتی سے اس وقت دنیا مبتلا ہو گئی ہے۔ یہ خیال صرف انسانی فکر کی کوتاہی ہے۔ جو زندگی کی موجودہ الجھنوں میں پھنس کر بے بس ہو گئی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کچھ لوگ جو ان حد بندیوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ محض قدامت پسندی اور دقیانوسیت کی بنا پر سماج کی حمایت کرتے ہیں۔ اور کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ کہ "انسان جس قسم کی چاہے زندگی بسر کرے۔ اور جس طرح چاہے آزادانہ انسانیت کی راہوں کو روندتا پھرے کسی کے اوپر جبر نہیں، اگر وہ کل تک پرانے رسم و رواج کے طلسم کا اسیر تھا تو یہ اس کی خوشی تھی۔ مگر آج جب کہ وہ آزادیٔ فکر و ضمیر کی فضا میں سانس لینے کے لئے پر تول رہا ہے۔ اس پر اس قسم کی پابندی عائد کرنا فطرت کے ابھار کو زبردستی دبانا ہے۔"

یہ اور اسی قسم کی بے شمار دلیلیں آج بڑے زور و شور کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔ ان تمام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو قدر مشترک یہ نکلے گا کہ وہ انسان جو پھیلی ہوئی انسانی برادری کا ایک رکن تھا اب صرف اپنی خواہشات کی دنیا کو آباد کر کے پورے عالم کو برباد کر دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ موجودہ انسان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ سوسائٹی اور معاشرہ کی خاطر اپنے شاداب تخیلات اور سرسبز امیدوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ بلکہ اسے صرف اپنی دنیا دیکھنی ہے۔ خواہ اس حد میں ماں اور باپ تک کے تعلقات ختم کر دینے کی نوبت کیوں نہ آجائے۔

اس آشفتہ فکری اور اندھا دھند آزادی کے پیچھے متعدد محرکات کی کارفرما ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم محرک خارجی حالات (OBJECTIVE CONDITIONS) کی پرستش کا ہے۔ سماج اگرچہ خارجی موثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ مگر یہ موثر طاقتیں بھی درحقیقت

انہی ذہنی اور فکری کاوشوں سے پیدا ہوتی ہیں جو انسانی جماعت کے بیشتر افراد یا تمام افراد کے ذہنوں اور دماغوں پر اپنا قبضہ جما لیتی ہیں۔ صرف خارجی موثرات تک نگاہوں کا تھما رہنا سماجی تاریخ کے باب میں ایک خوفناک غلطی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ سماج کہاں سے پیدا ہو گیا۔ جو افرادِ انسانی کے لئے مصیبت بنا ہوا ہے اور جس کو برباد کرنے کا مقدس فریضہ آزادی پسند گروہ نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے ؟ ظاہر ہے کہ وہ بعض اسباب کی بنا پر پیدا ہوا۔ اور وہ اسباب خارجی نہیں بلکہ داخلی تھے۔ اس لئے کہ اس معاشرہ کے تحت زندگی بسر کرنے والوں نے اسے پسند کر رکھا تھا۔ اور یہی پسندیدگی ہے جس کے خلاف یہ "مقدس جنگ" جاری ہے۔ اس لئے ہر صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ معاشرہ کوئی ایسی چیز نہیں جو بغیر کسی مستقل بنیاد کے برپا ہو گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو فکر انسانی معاشرہ کی توجیہ ذہنی اور فکری موثرات سے بے پروا ہو کر کرنا چاہتا ہے۔ تاریک گلی میں جا پڑتا ہے اور چند قدم چلنے کے بعد ہی تنگ کا راستہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ خوش فہمیوں اور غیر معقول دلیلوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتا ہے لیکن جو قدم بھی وہ اٹھاتا ہے اس جال کا ایک اور پھندا اس کے پیر میں پڑ جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور الجھ کر ایک عقدۂ لاینحل بن جاتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ معاشرہ کی بنیاد تو ضرور ہوتی ہے لیکن تمام بنیادیں زمانہ کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ اور جب ان کا زمانہ ارتقائی شکنجہ میں آ کر دم توڑ دیتا ہے تو ان کی جگہ پر ایک پائندہ اور نیا اصول ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ایک مسلسل اور مربوط معاشرہ حرکت میں ہے۔ زمانہ جتنا جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے معاشرہ کی قدریں بھی بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں معاشرہ کے اندر جو تغیر واقع ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قائم شدہ اور رائج الوقت نظام۔ انسانی جماعت کی بدلتی ہوئی ضروریات، حالات اور کیفیات کے لئے ناکافی ہو جاتا ہے اسی لئے ایک بہتر نظام وجود میں آتا ہے اور اپنے زمانہ کے مطابق ایک نئے معاشرہ اور نئے سماج کی بنیاد ڈال دیتا ہے یہ اس فکر کو واقعیت کا رنگ دینے کے لئے اس طرز پر لکھی جانے والی تاریخ کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اپنے اس نظریہ کے سفر کا آغاز اس دور سے کرتے ہیں جب انسان زندگی کی ابتدائی منزل میں تھا۔ اور اس کی زندگی اتنی وسیع نہ تھی۔ اس کی ضروریات محدود اور اس کی دنیا کو زیادہ سے زیادہ اس کے خاندان یا اس کے گھرانے تک پھیلا یا جا سکتا تھا۔ اس وقت انسان نے وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے حالات کے موافق ایک نظام معاشرت مرتب کیا۔ جس میں صرف انھیں دفعات کو جگہ دی گئی جس سے انسان کی خاندانی زندگی سدھر سکے۔ اس کے بعد خاندان نے گروہ کی حیثیت اختیار کی جس کے نظم کے لئے ضروری تھا کہ ایک سرگروہ تسلیم کیا جائے۔ جو اس گروہ کے بکھرے ہوئے افراد کو ایک سلسلہ میں لا سکے۔ اور ایک مرکز پر متحد کر سکے۔ ضرورت نے اس دفعہ پھر مجبور کیا کہ قائد یا سرگروہ کی حیثیت متعین ہو۔ اس کے بعد سرخیل کی اطاعت کے دائرے اس کے فرامین اور احکام کی بجا آوری کی نوعیت اور اس کی قیادت کی حدیں مقرر کی جائیں۔ اس مسئلہ نے معاشرت کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا۔ انسانی فکر کو از سرِ نو مرتب کرنا پڑا۔ نئی نئی الجھنوں نے پرانے نظام معاشرت کو بالکل باطل کر دیا۔ البتہ چند حقیقتیں تھیں جن کا اختیار کرنا اس نظام کے لئے بھی ناگزیر تھا۔ اس لئے ان کو اختیار کرنے کے بعد بقیہ ضابطوں کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر انسان نے پس پشت ڈال دیا۔"

اسی طرح وہ ملوکیت کے ظہور، مذہب اور جمہوریت وغیرہ کی ضرورت پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک "معاشرہ کے اندر تغیر اور انقلاب ایک ابدی حقیقت ہے جو ہر نئی مادی پیداوار پر پھوٹ پڑتا ہے اور کوئی طاقت اس ابلتے ہوئے طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتی انسانی فکر اس حقیقت کے محور پر چکر لگاتا رہتا ہے۔ انسان پہلے اتنا وسیع الفکر نہیں تھا۔ اس لئے سرخیل، بادشاہ، پوپ، پروہت۔ جمہور کے پھندہ میں گرفتار رہتا۔ مگر اب جب کہ حیات کی ایک نئی منزل طبیعی پیداوار نے سامنے کر دی ہے اور معیار تفکر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انسان اس حد تک پہونچ چکا ہے۔ کہ ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھے جو "مذہب" اور "جمہوریت کے قائم کئے ہوئے سماج سے زیادہ موزوں اور زیادہ بہتر ہو ——— اس لئے انسان پر لعنت پڑے جو ابھی تک جمہوریت یا "مذہب" اور بادشاہت کے قائم کئے ہوئے سماج کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ مجبوراً الحیات انسان فطرت کی ارتقاء پسندی کے خلاف ایک احتجاجی اور باغیانہ روش اختیار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا انسان موجودہ دنیا کے مزاج کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اور ایک دن آئے گا جب زمین کا سینہ باوجود اپنی وسعت کے اس پر تنگ ہو جائے گا۔ یہ اس لئے کہ اس نے فطرت کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے۔"

اس کے برعکس دوسرا گروہ بالکل متضاد راستے پر چلا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ معاشرت کے اندر تغیر اور انقلاب ناممکن ہے۔ وہ لوگ جو معاشرہ یا سماج کی پابندیوں کو توڑنا چاہتے ہیں سر پھرے ہیں۔ آوارہ اور اوباش ہیں۔ اس لئے ان کی باتوں پر توجہ کرنا خطرناک ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے لئے موت کا سامان فراہم کرنا ہے۔ ان کے نزدیک دنیا میں حرکت نہیں۔ کرۂ ارضی ساکت وصامت ہے۔ صرف سورج کا اتنا قصور ہے کہ گردش کرتا ہوا کبھی روشنی لاتا ہے اور کبھی تاریکی پھیلاتا ہے۔ ورنہ ہونا تو یہ چاہیے کہ سورج بھی گردش نہ کرتا۔ اور جس طرح ایک حالت ابتدائے آفرینش میں تھی، وہی قائم رہتی۔ اور انسان جو ہوش اور حواس کی وجہ سے دن کی روشنی میں ستر پوشی کی زحمت گوارہ کرتا ہے۔ اس سے بچ جاتا! یہ گروہ حقیقتاً دنیا کو گھنگھور گھٹا کے دنیا کو بھانے کی احمقانہ کوشش کرتا ہے۔ اور اس کی حرکتیں اس قدر پوچ ہیں کہ متحرک کرۂ ارض کا انسان مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان دونوں گروہوں کے ہنگاموں پر سنجیدہ غور وفکر ضروری ہے۔ کیونکہ اس افراط وتفریط کے درمیان ہی حقیقت کی راہ موجود ہے۔ آج پہلا گروہ ہی سوسائٹی پر چھایا ہوا ہے۔ اور پورے انسانی سماج پر اسی کے افکار حکمرانی کر رہے ہیں۔ اگرچہ دوسرا گروہ بھی اس سے پیچھے نہیں ہے۔ اور خاص طور پر بھارت میں تو سوچ کو جامد کر دینے کی کوشش بڑے زور سے ہو رہی ہے۔ یہ صورت حال دراصل مادہ پرستی کا رد عمل ہے لیکن تفصیلی غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں گروہ ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ کیونکہ دونوں سماج کو بنانے اور انسانی ضروریات کی بہتر طریق پر تکمیل کرنے کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ ایک نے جمود اور تعطل کے ستون سے اپنے آپ کو باندھ لیا ہے۔ اور دوسرے نے ایک پاگل گھوڑے کی دُم سے اپنے آپ کو لٹکا لیا ہے۔ ایک نے اگر چشمے تک پہنچ کر پانی پینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ تو دوسرا اس چشمے کو پھلانگ کر سرپٹ دوڑا چلا جا رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں ہے کہ چشمہ کہاں ہے۔ اس کے نزدیک صرف آگے بڑھنا ہی ایک اہم حقیقت ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے۔ چشمہ سے کوئی بھی فیض یاب نہیں ہو سکتا۔

ان متضاد تصورات پر نگاہ ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی گروہ کے دماغ نے بھی گھرے ہوئے حالات سے آگے بڑھ کر سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی ہے۔ اور جو لوگ جس طرح سماجی مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے انسانی احساسات اور جذبات کی طرف سے خوفناک غفلت اختیار کر لی ہے۔ اس لئے کہ انسان نہ تو کوئی مشین ہے کہ جس کے پرزے ہی اس کی حرکت کا سبب ہوں۔ اور جو وظیفے ابتدائے حیات سے مقرر کر دیئے گئے ہوں۔ انھیں پر قائم رہے۔

اور نہ انسان صرف زمانہ کی پیداوار ہے کہ جا بجا جھٹکا کے ساتھ اس کے اندر بھی تبدیلی ہوتی رہے۔ بلکہ انسانیت چند اٹل حقیقتوں پر مبنی ہے یہ حقیقتیں ہی انسان سے کام لیتی ہیں۔ اور اس کی ضرورت کی بہتر سے بہتر طریقہ پر تکمیل کے لئے اسے اکساتی ہیں۔ اس لحاظ سے تبدیلی یا تغیر جو کچھ ہوتا ہے وہ انسانی ضروریات کی تکمیل کے ذرائع ہیں۔ نہ کہ بجائے خود ضروریات میں۔ انسانیت اور اس کی ضرورتیں اٹل ہیں۔ معاشرہ کے تغیر میں انسان جو اتنا تلون مزاج نظر آتا ہے۔ حقیقتاً وہ اتنا متلون نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر سلامتی اور بقا کے جذبہ کی بیداری نے ان تمام راہوں پر اسے لگا دیا۔ اور اس جذبہ کا مارا ہوا انسان بے تکلف ان تمام راہوں پر حق کی تلاش کے لئے چل پڑا۔ اس کی ہر دور میں کوشش یہی ہے کہ وہ سلامت رہے۔ محفوظ رہے۔ اس کے حقوق کی پامالی نہ ہو۔ اس کے حدود روندے نہ جائیں۔ اسی جذبۂ سلامت پسندی نے کبھی قبیلہ کی صورت اختیار کی اور کبھی قومیت کی۔ تاکہ دوسری قوم یا دوسرا قبیلہ اس کے حقوق پامال نہ کر ڈالے۔ کبھی بادشاہت میں اس کا ظہور ہوا۔ اس لئے نہیں کہ ارتقائی ادھیڑ بُن کے ذریعہ انسان کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی تھی۔ کہ وہ بادشاہ کی غلامی پسند کرے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اس طرح ملک کی نگہداشت کے معاملات کسی کے سپرد کئے جائیں۔ اور عافیت کی زندگی مل جائے۔ دوسری طرف خود "بادشاہ" کی پہلی بھولی خواہش سلامتی اپنے لئے وسیع میدان کی طلبگار تھی۔ انسان نے مذہب کا دامن تھاما۔ اس لئے نہیں کہ یہ انسانی عقل کے ارتقاء کی کوئی کڑی تھی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اس میں اسے اپنے حقوق کی حفاظت کا سامان نظر آتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں تحریف اور تبدیلی کے بعد اس کا رُخ دوسری طرف پھر گیا۔ اور اس کے جذبۂ سلامتی کا ظہور جمہوریت کو اپنانے کی شکل میں ہوا۔ اور یہ بھی صرف اس لئے کہ جمہوریت نے فطری حقوق اور داعیات کی تکمیل کا دعویٰ کیا تھا۔ آج مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کا تازہ چھڑا ہوا ہے۔ اور یہ بھی سلامتی اور بقا کے جذبات سے سرشار ہو کر انسان صرف اس لئے بیتاب ہے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ سلامتی اور حفاظت کی زندگی بسر کرے۔ پھر یہ کتنی غیر معقول کوشش ہے۔ کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش اصل بنیاد ہی سے نظر انداز کر کے خیالات اور تصورات کی دنیا میں لایعنی فلسفوں کا انبار لگا دیا گیا۔

اسی لئے جہاں یہ بات عقل سے دُور ہے کہ معاشرہ یا سماج میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہیں یہ بات بھی ناقابلِ اعتبار ہے کہ اخلاقی اقدار اور معاشرتی بنیادیں زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اور اس کے ساتھ پیدا ہوتی۔ اور اسی کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں۔ حقیقت وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ میں بیشمار مثالیں ایسی ملیں گی جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اخلاقی اقدار جو پہلے سے متعین ہیں۔ صدیوں بعد بھی ٹھیک انہیں معنوں میں اخلاقی اقدار سمجھی جاتی ہیں اس زبردست تاریخی حقیقت کو جھٹلانا بہت بڑی دیدہ دلیری ہے۔ تبدیلی بالعموم جس وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان ان معروف اخلاقی اقدار کے مطابق ایک صالح نظام بنانا چاہتا ہے۔ اگر اسے وہ ہدایت مل جاتی ہے جس کی بنیاد پر صالح نظام بن سکتا ہے۔ تو وہ ایسا نظام بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ دنیا میں اب تک جتنے صالح نظام بنے۔ ان کی بنیادی قدریں ایک سی رہیں۔ اسی طرح اگر انسان کو راہ ہدایت نہیں ملتی۔ تو وہ ایک غیر صالح نظام سے دوسرے غیر صالح نظام کی طرف بھٹکتا پھرتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں جتنے غیر صالح نظام بنے۔ ان کی بنیادی قدریں بھی تمام زمانوں میں ایک ہی رہیں۔ جاگیرداری، بادشاہت، لادینی جمہوریت، کمیونزم یہ سب غیر صالح نظاموں کی مثالیں ہیں۔ ان سب کی بنیادی قدریں ایک سی ہیں۔ خدا سے بے نیاز ہو کر زندگی گذارنا۔ انسان پر انسان کی حکومت قائم کرنا۔ خود غرضی اور دنیا طلبی کے محرکات سے کام لینا۔ اس بحث سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہمیشہ سے سماج کی تعمیر یا تخریب کی بنیادیں مستقل رہی ہیں۔ تبدیلی جو کچھ ہوتی ہے وہ مختلف ایجادات اور اختراعات پر ان کے انطباق میں ہوتی ہے۔ اور ایسی صورت میں بسا اوقات ان کی ظاہری شکل اور اصطلاحات میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اساسی تبدیلی نہیں ہے۔ اور نہ یہ تبدیلی کوئی تبدیلی ہی نہیں ہے۔ کیونکہ سورج ابھی تک جام نہیں ہوا ہے۔

ان توضیحات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر زمانہ میں معاشرہ یا سماج اپنے پیچھے غلط یا صحیح کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور رکھتا ہے۔ اس کی ایک سمت متعین ہوتی ہے۔ ایک منزل مقصود نظر کے سامنے ہوتی ہے جس کی طرف سماج کا قافلہ سرگرم سفر ہوتا ہے۔ اور جب تک وہ سمت سفر نہ بدلے۔ اس وقت تک معاشرے کے اندر انقلاب مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ آج ہماری سماج جس سمت کی طرف بڑھ رہا ہے وہ غیر اخلاقی اور تخریبی ہے اور اس کی تخریب پسندی پر ایک زمانہ گواہ ہے۔ موجودہ سماجی قدریں انسانی ضروریات کو کسی طرح بہتر طریق پر پورا نہیں کر سکتیں۔ چاہے ان کی بنیاد پر کتنے ہی نئے نظام بنائے جائیں۔ اور کتنی ہی اوپری تبدیلیاں ہوں۔ اصلی سوال تو بنیادی قدروں کا ہے۔ جب تک وہ نہ بدلیں۔ کوئی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ ہمارے انقلاب پسند اگر واقعی کسی صالح نظام کے طلبگار ہوں۔ تو ان کے لئے ضروری ہے۔ کہ موجودہ تخریبی قدروں سے اپنے آپ کو ہٹائیں۔ اور ان قدروں کی طرف بڑھیں۔ جنہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں انسان کے جذبۂ عافیت پسندی کی تکمیل کی ہے۔ اور جب تک انسان نے ان کو اپنی زندگی میں برتا ہے۔ مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں یہ قدریں خالص خدا پرستی، یا خدا کی حاکمیت، انسانیت دوستی، اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لئے دنیوی نعمتوں کے جائز استعمال کی قدریں ہیں اگر ان کی طرف سے۔۔۔ غفلت کی جائے گی تو نہیں کہا جا سکتا کہ گروہ انسانی کا موجودہ غلط نظریات کے ہاتھوں کیا حشر ہو۔ ماضی قریب اور حال کے حالات تو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان راہوں کو اختیار کرنے کے بعد انسان نے درندہ کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی وحشت اور بربریت نے تمام معمورۂ ارضی کو ظلم اور فساد سے معمور کر دیا۔

ظہرا لفسا د فی البر والبحر بما کسبت ایدی لنا س ۔

خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا۔ یہ سب انسانوں کی اپنی کمائی ہے!

●

خط و کتابت و ترسیلِ زر کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے

مترجمہ شیخ محبوب علی (تلنگانہ)

روسی کسان کی زندگی

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں ۲۴۰۰۰۰ اجتماعی کھیتوں (COLECTIVE FARMS) میں سے ایک فارم میں کام کرنے والا ایک ۴۰ سالہ کسان "اِوان" اور اس کی ۳۶ سالہ بیوی "میریا" کا ایک ۱۴ سالہ لڑکا "اسٹیفن" اور دوسرا ۱۲ سالہ لڑکا "مائکل" اور دوران جنگ میں پیدا شدہ ۲ سالہ لڑکی "گالیا" ہے۔ ان پانچ کے علاوہ ایک معذور ضعیفہ میریا کی ماں بھی موجود ہے۔ گویا یہ اِوان کا پورا کنبہ ہے۔

تقریباً ۷۰۰ کی آبادی پر مشتمل ۲۰۰ مکانات والے گاؤں کے ایک مکان میں "اِوان" زندگی بسر کرتا ہے اور یہ مکانات "ریڈ اکٹوبر" (RED OCTOBER) سے موسوم گاؤں کے اجتماعی کھیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ریڈ اکٹوبر میں گذشتہ پچاس سال سے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے یہ گاؤں اب تک بجلی کے چراغوں سے محروم ہے۔ اس پورے گاؤں میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس گاؤں کے آباد ہونے سے پہلے یہاں ایک کلب بنا ہوا تھا۔ جہاں پر اس فارم کے نمائندے (CHAIRMAN) کے دفتر اور گماشتے کے لئے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنایا گیا تھا۔ اس گاؤں کے جملہ مکانات لکڑی سے بنے ہوئے جھونپڑے ہی ہیں۔ سب کافی حد تک خستہ ہو چکے ہیں۔ اور بہت کچھ ترمیم اور رنگ پاشی کی ضرورت ہے۔ بعض کسانوں کی تو بالکل ابتر حالت ہے۔ ان کو اپنے مکانات کی صفائی کرنے تک کا خیال نہیں ہوتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ اشیاء ما یحتاج کی قلت کی وجہ سے زندگی گذارنا ہی دو بھر ہو گیا ہے۔ صرف پچاس قدم چوڑی شاہراہ موجود ہے۔ جس کے اطراف مکانات تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہ شاہراہ چونکہ صد درجہ خستہ ہے۔ اس لئے اس میں متعدد گڑھے پڑ چکے ہیں۔ اور موسم بارش اور موسم سرما میں کیچڑ سے لبریز رہتی ہے۔

اِوان کا مکان

اِوان اپنے باپ کے بنائے ہوئے مکان ہی میں زندگی گذارتا ہے۔ جس وقت اس کی بیوی سن بلوغ کو پہنچی۔ تو شاید اس وقت اس مکان کی تھوڑی بہت ترمیم اور نقش و نگار ہوا تھا۔ مگر قابل ترمیم بڑی بڑی چیزیں تو یونہی رہ گئی ہیں۔ اس جھونپڑی کے صرف دو ہی کمرے ہیں۔ جن کو اِوان کی خوش قسمتی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس گاؤں میں بسنے والے اکثر دیگر روسی کسانوں کو صرف ایک ایک کمرے والی جھونپڑیاں میسر ہیں۔ اِوان اور اس کی بیوی میریا مع شیر خوار بچی کے باہر کے کمرے میں سویا کرتے ہیں۔ اور اسی کمرے میں اس کے بزرگوں اور جنگ میں ہلاک شدہ دیگر ساتھیوں کی ایک عرصہ قبل کھنچوائی ہوئی تصاویر آویزاں ہیں۔ بچے باورچی خانے کے اسٹو (STOVE) کے قریب ایک تختے پر سویا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے گوشے میں میریا کی ماں سویا کرتی ہے۔ بعض اوقات باہر سردی پڑنے کی صورت میں ستوروں کو بھی اسی باورچی خانے میں باندھا جاتا ہے۔ ریڈ اکٹوبر میں بسنے والے ۲۰۰ خاندانوں کو "اجتماعی کاشت" کرنے کے لئے جملہ ۲۷۰۰ ایکڑ دیئے گئے ہیں۔ یعنی فی خاندان ۵ ایکڑ تیرہ کنٹھے دیئے گئے ہیں۔ اور موسم سرما کے رائی (RIPE) گیہوں اور موسم گرما کے اوٹس بارلی، آلو، ترکاریاں اور جانوروں کا چارہ وغیرہ کے لئے رکھی ہوئی جملہ زمین ۱۴۰۰ ایکڑ ہے۔ باقی زمین چراگاہوں، سڑکوں، مکانوں اور مزارعین کی ذاتی ضروریات اور باغ وغیرہ کے لئے رکھی گئی ہے۔

ریڈ اکٹوبر فارم میں کام کرنے والے ۱۶ سال سے زائد عمر والے تمام کسان جنگ سے پہلے جملہ ۳۴۰ آدمی ہوا کرتے تھے۔ اور جنگ کے بعد تعداد گھٹ کر ۲۵۰ رہ گئی تھی۔ مگر اس وقت جملہ ۲۰۰ آدمی ہیں جن میں باقی ماندہ زخمی اور کچھ معذور شدہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو مکانوں کو واپس ہو چکے ہیں۔ اکثر قوی لوگ اور نوجوان آدمی ابھی فوج ہی میں روک لئے گئے ہیں۔ ان ۲۰۰ افراد کے علاوہ ۱۲ تا ۱۶ سال کی درمیانی عمر والے مزید ۱۰۰ آدمیوں کو ملا کر جملہ ۳۰۰ آدمی ۱۴۰۰ ایکڑ زمین پر مشتمل ایک فارم میں کام کر رہے ہیں۔

امریکہ یا مغربی یورپ میں اتنی وسعت پر مشتمل زمین میں کاشت کرنے کے لئے اتنے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس COLECTIVE FARM میں

مکمل نگرانی کے اصول کے مطابق اصلی کارکنوں کے علاوہ ان کے عہدہ داروں، گماشتوں، گوداموں اور رات دن چوروں کے داخلہ کی نگرانی کرنے والے واچ مین (WACTH MEN) اور محکمہ صفائی والوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

ریڈ اکتوبر کے نمائندے (RED OCTOBER CHAIR MAN) کے قانون کے مطابق اجتماعی زراعت (مشترکہ زراعت) کرنے والے کسانوں کے عام جلسے کبھی منعقد ہوا کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر مقامی جماعت (LOCAL PARTY) کے جلسے ہی ہوتے رہتے ہیں۔ نمائندے کے "کھیت کا دفتر" (CHAIR-MAN FARM OFFICE) پر یا فارم پر گماشتوں کو کامل اختیارات حاصل رہتے ہیں۔ فارم اگنارمسٹ (FARM EGNARMEST) علیحدہ ۳۰ آدمیوں پر اور جانوروں اور بھیڑوں پر نگرانی کرتا رہتا ہے۔

کام کی تقسیم: جملہ چھ بریگیڈوں میں سے چار بریگیڈ کاشت ہونے والی زمین کے لئے اور باقی دو بریگیڈ ترکاریاں لگانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہر ایک زرعی بریگیڈ میں ۳۵ تا ۴۰ آدمی کام کرتے ہیں۔ اور ہر ایک ترکاری بریگیڈ کے لئے ۳۵ آدمی ہوتے ہیں۔ ہر زرعی زمین والے بریگیڈ کے تحت ۴۰ ایکڑ موسم سرما کے رائپ (RIPE) ۳۰ ایکڑ موسم سرما کے گیہوں، ۲۰ ایکڑ گرما کے بارلی، ۵۰ ایکڑ اوٹس، ۹۰ ایکڑ آلو، ۱۲ ایکڑ BEET ROOTS بچانا ضروری ہے۔ ہر ترکاری بریگیڈ کو علاوہ ۵۴ ایکڑ زمین کے بعض "اسکوئیڈ" (SQUADE) کے تحت بھی تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہر ایک "اسکوئیڈ" پر ۹ مزدور کام کے لئے دئے جاتے ہیں۔ ہر بریگیڈ کا لیڈر اپنے بریگیڈ پر نگرانی کرتے ہوئے اپنے ممبروں کے کئے ہوئے کام کا ریکارڈ رکھتا ہے۔

اوان ایک اسکوئیڈ لیڈر کے تحت زرعی زمین میں کام کرتا ہے۔ اس کے دونوں لڑکے اسٹیفن اور مائکل کو جبکہ اُن کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ مدرسہ جانے کے باوجود روزانہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ ۱۴ سالہ اسٹیفن ایک ترکاری بریگیڈ میں اور ۱۲ سالہ مائکل ایک چرواہے کے تحت کام کرتا ہے۔

زنانہ مزدور: میریا بھی ایک ترکاری بریگیڈ کے تحت کام کرتی ہے۔ مگر وہ کام پر جانے سے گھر پر رہنا بہتر سمجھتی ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ ایسے وقت جبکہ آمدنی بالکل ناکافی ہو اور گذر اوقات بمشکل ہو رہی ہو۔ اپنے حصے کی کمائی کیوں بیکار جائے۔ اپنی چھوٹی بچی کو دایہ گھر (NURSING HOME) میں چھوڑ کر برابر پابندی سے کام کرنے جایا کرتی ہے۔ اس کی چھوٹی بچی نرسنگ ہوم میں دیگر دو سو (۲۰۰) چھوٹے بچوں سے مل کر کھیلا کرتی ہے۔ لیکن وہ ماں کی مشفق پرورش سے محروم ہے۔

جنگ سے پہلے سوویٹ یونین میں زنانہ مزدوروں کی تعداد صرف ۵۵ فیصد تھی۔ لیکن جنگ کے بعد بوجہ زخمیوں کی زیادتی اور نوجوانوں کے فوج کے لئے روک لئے جانے کے زنانہ مزدوروں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔

ہر روز "اوان" کے کنبے والوں کو جس فارم میں کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ تبلا دیا جاتا ہے اور یہ مفوضہ کام ضرورت کے موافق نہ صرف مشینری بلکہ جانوروں کی کمی کے باوجود ضرور بالضرور اسی دن پورا کرنا پڑتا ہے۔

مشینی سامان کی کمی: ایم، ٹی، ایس یعنی مقامی مشن ٹراکٹر اسٹیشن (LOCAL MACHINE TRACTOR STATION) کچھ سال پہلے ہی "ریڈ اکتوبر" کے علاوہ دیگر چار فارموں کو مشینی ہل، ٹریکٹر اور کمبائن فراہم کرنے کے لئے رکھے گئے تھے۔ اور جنگ سے پہلے ۴۰ فیصد کام اسی ایم، ٹی، ایس، ٹراکٹروں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں گھوڑوں کو سرخ فوج میں بھرتی کرنے کی وجہ سے اب اس کا کام بہت کم ہے۔

مشینی سامان کی اتنی قلت کے باوجود جتنا کام پہلے ہوا کرتا تھا۔ اتنا ہی کام اب پورا کرنا ضروری ہے۔ زراعت کرنے کے لئے جتنے سامان کی ضرورت ہے۔ اس کی کمی کے متعلق "اوان" بخوبی واقف ہے۔ مگر سرکاری منصوبے کے مطابق مطلوبہ پیداوار اگانا ضروری ہے۔ اس کی خوش قسمتی سے اگر موسم کی حالت اچھی رہی۔ تو پیداوار اچھی اگا کر سرکاری منصوبہ کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں جو جانور ہوتے ہیں۔ صرف ان ہی کی کھاد کے ذریعہ اپنے کھیتوں کو تقویت پہنچا لینا پڑتا ہے۔

کھیت مزدور کو ہدایتیں: ہر ایک مجلس عام میں نمائندہ کو اسٹالن اور سرخ فوج کی بڑائی جتلاتے ہوئے اپنے وطن مالوف کے لئے زیادہ سے زیادہ پیداوار اگانے کا اقرار کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔

"ریڈ اکتوبر فارم" سرکاری منصوبے کے مطابق کام کرتا ہے۔ پیداوار اگانا، ذاتی مصارف، غلہ کی بیم اندازی، تخم ریزی، اور اجتماعی زراعت کے عاملین کو فراہمی تخم

حکومت کو انشورنس فنڈ اور قرضے یا بقائے کی ادائی وغیرہ کا تعین حکومت ہی کرتی ہے۔ کچھ پیداوار زمانۂ جنگ میں کسانوں کی اجناس کی کمائی کے لحاظ سے حساب لگا کر ان
میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

نقد کمائی:۔ اجناس اور چیزیں حکومت کو یا بازار میں فروخت کر کے کمائے ہوئے مال میں سے، حکومتی ٹیکس (GOVERNMENT TAX) لیوی، معاوضہ
فارم، جنگ سے متاثرہ علاقوں کے "دھرم فنڈ" کے لئے اور کچھ دیگر اخراجات کے لئے رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔
محنتانہ خواہ نقد کی شکل میں ہو یا اجناس کی شکل میں ناکافی ہوتا ہے۔ کسان کی نقد کمائی کی بہ نسبت غلہ کی شکل کی کمائی، اگر آلو اور خام اشیا کی کاشت
ہو تو زیادہ رہتی ہے۔

سوویٹ یونین میں زرخیز اجتماعی زراعت کے فارم میں بھی گذشتہ سال اور سال حال ایک ہی نوعیت کی کاشت ہونے کے باوجود کسان کو بہ نسبت سال
گذشتہ کے سال حال بڑی سخت مشقت اٹھانی پڑی ہے۔

اجتماعی کھیت سے کسان کی نقد یا غلہ کی شکل کی کمائی اس کے ایام کارگذاری کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے۔ سال گذشتہ "ایوان" کے معہ اپنی اہلیہ (۴۰۰) دن
اور اس کے دونوں بچوں کے ۱۰۰ دن کام کرنے پر، ایوان کے جملہ خاندان کی ایام کارگذاری ۵۰۰ دن ہوئی۔
"ریڈ اکتوبر" کی روزانہ مزدوری حسب ذیل ہے:۔

۳ روبل، ۴½ خام غلہ، ۵ پونڈ ترکاری، ۵ پونڈ گھاس، اکثر فارموں میں تو مزدوری اس سے بھی بہت کم ہوا کرتی ہے۔ اس حساب سے "ایوان" کے کنبے کی
گذشتہ سال کی کل آمدنی ۱۵۰۰ روبلز، ۲۵۰۰ پونڈ ترکاری، ۲۲۰۰ پونڈ خام اجناس، ۲۵۰۰ پونڈ آلو، ۲۵۰۰ پونڈ گھاس ہے۔ اندرون سال بہت تھوڑا مال پیشگی
دیا جاتا ہے۔ بقیہ مال اور یہ جملہ رقم سال کے آخر میں دی جاتی ہے۔
"COLECTIVE FARM" کے دستور العمل کے مطابق آلو یا خام غلہ اگر پیشگی دینا ہو تو کسان کا وہ مال جو حکومت کو ادا کیا جاتا ہے اس کے [illegible] فیصد
سے زیادہ نہیں دیا جاتا۔

ناکافی روٹی:۔ روسی لوگ عام طور پر روٹی استعمال کرتے ہیں۔ ہر ایک روسی کسان ہر سال ۴۵۰ پونڈ خام غلہ کما سکتا ہے۔ ۲ بڑے آدمی اور دو بچوں پر مشتمل
خاندان کے خام اجناس کا استعمال ایک سال کے لئے ۲۳۰۰ پونڈ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ایوان کے کنبے کی کمائی یا آمدنی صرف ۲۲۰۰ پونڈ ہے اسی
لئے میریا اور اس کی ماں تھوڑی سی روٹی کھا کر آلو اور سبزیاں زیادہ کھا لیا کرتے ہیں۔ سال گذشتہ ایوان کا کنبہ اپنی کمائی میں سے ۱۰۰۰ پونڈ آلو اور ترکاریاں بازار میں
فروخت کر کے ہی کچھ گوشت خریدنے کے لئے بچا سکا۔ جنگ کے زمانے میں آلو فی پونڈ ۸ تا ۱۰ روبلز کے حساب سے فروخت کئے گئے۔ لیکن اس وقت آلو کی قیمت ۱ تا ۵
روبلز ہے "ایوان" اپنے ۱۰۰۰ پونڈ آلو اور ترکاریوں سے جملہ ۱۳۰۰ روبلز حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس رقم سے صرف ۹۵ پونڈ گوشت خرید سکتا ہے۔ یہ ۹۵ پونڈ گوشت
اس کے پورے کنبے کو سال بھر کے لئے کافی ہونا ضروری ہے۔

خوش قسمت ایوان کے پاس ایک گائے دو سوّر اور کچھ مرغیاں بھی ہیں۔ اس کے لئے زیادہ جانور پالنا مشکل ہے کیونکہ حکومت کے دستور العمل کی روسے
چارہ بہت کم ملتا ہے۔ یا اگر گھاس خرید کر چرانا چاہے تو رقم کی قلت رہتی ہے۔ بہر صورت ایوان بڑا خوش قسمت ہے۔ کیونکہ اس کے دیگر ساتھی کسانوں کو جانور
تک میسر نہیں ہیں۔

ایوان کے کنبے کے کارگذار چار افراد کی جملہ کمائی میں سے ساری ضروریات زندگی خریدنا پڑتا ہے۔ اور جس سال پیداوار تلف ہو جاتی ہے۔ تو اس سال اس
کی آمدنی بھی کم ہو جاتی ہے۔ مگر حکومت کا قابل ادا قرضہ اسی طرح بحال رہتا ہے۔

ایوان اب تک اپنا سابقہ پرانا فوجی لباس ہی پہنتا ہے۔ اس کو فی الحال جوتوں کی شدید ضرورت ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ اس وقت مردانہ جوتوں کی قیمت ۲۲۸
روبل ہے۔ ایوان کے بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کو بھی ایوان اور میریا کی طرح جوتوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ان تمام کے لئے جوتے خریدے جائیں۔ تو اس
کے پاس جتنے روبلز ہیں۔ ان تمام کا صفایا ہو جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں غذائی اجناس کی قیمت بڑھ جانے کے باعث بعض چیزیں فروخت کر کے میریا کچھ رقم
پس انداز کر سکی۔ لیکن حکومت کی مصارفی اصلاحات کے تحت پرانے روبلز کے بدلے نئے دس روبلز دینے کے وعدے پر حکومت نے پرانے روبلوں کو سختی سے

وصول کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے میترپا کو بھی دیگر عورتوں کی طرح موسم گرما میں ننگے پیر ہی گذارنا پڑا۔ ان حالات میں اِوان کے خاندان کو بڑی کٹھن زندگی گذارنا پڑا۔

سماجی میل ملاپ کی کمی: ان کی چھٹیاں اور کھیل کود کے اوقات بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ کسانوں کے لئے محکمہ زراعت کی جانب سے ہوٹل ہونے کے باوجود یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کے دیگر زرعی مزدوروں کی طرح ان میں، ان کا داخلہ بہت کم ہے۔ اگر ان ہوٹلوں میں جانا بھی چاہیں تو قیمتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

سماج اور سوسائٹی میں مل جل کر رہنے کے مواقع بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ حکومت اجتماعی زراعت سے متعلق تبلیغ یا پرچار زیادہ تر سیاسی مفاد کے تحت ہی کرتی ہے۔ اس گاؤں کے چھوٹے کلبوں میں ایک یا دو زرعی اخبار یا کچھ سیاسی پمفلٹس اور زیادہ تر لینن ازم اور اسٹالن ازم سے متعلق کتابیں ہوتی ہیں۔ جلسے شاذ و نادر ہی ہوا کرتے ہیں۔ تاہم جب ہوتے ہیں۔ تو ان میں بھی چیرمین یا دیگر حکومتی ملازمین اپنی اپنی پارٹیوں، اسٹالن اور سرخ فوج کی تعریف کر کے زیادہ سے زیادہ پیداوار اگانے کی تلقین کرتے ہیں۔ روزانہ کام کرنے والا تھکا ماندہ اِوان جلسوں میں شرکت بھی کرتا ہے۔ تو بالکل خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ انتخاب کے زمانے میں نمائندے منتخب کرنے والا اِوان ہمیشہ رعیت ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اکثر ملازمین سرکار ہی منتخب ہوا کرتے ہیں۔

اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا پُرانا چرچ ہے جو گودام (WAREHOUSE) کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کسان کبھی فرصت کے وقت چرچ جانا چاہیں تو "ریڈا کٹوبر" سے چھ میل دور ایک دوسرے گاؤں کو جانا پڑتا ہے جس گاؤں میں یہ چرچ ہے۔ اس میں COLECTIVE FARM سے متعلق باٹ ہے جس بنا پر میترپا اپنے سامان کو فروخت کر کے گوشت خریدتے وقت اکثر چرچ جایا کرتی ہے۔

کانوں پر پہرے: "ریڈا کٹوبر" میں بجلی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ریڈیو نہیں ہیں۔ حکومت نے دیہات کے لئے جو بیاٹری سیٹس تیار کرنا شروع کئے ہیں۔ وہ بیاٹری سیٹس بھی صرف ملازمین اعلیٰ کے لئے ایک یا دو کی حد تک ہی فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ ان ریڈیو سیٹوں کے ذریعہ سامعین کو ان کی خواہش کے مطابق اسٹیشنوں سے دیگر ممالک کی خبریں سننے کی نہ صرف ممانعت ہے۔ بلکہ ملکی خبریں بھی صرف حکومت کے مقرر کردہ اسٹیشنوں ہی سے سُنی جا سکتی ہیں۔ عام طور پر جو مکبّر الصوت قائم کئے گئے ہیں۔ وہ ہر کلب میں ایک ایک ہیں۔ ان کے ذریعے عوام زرعی اور زیادہ تر سیاسی خبریں سنا کرتے ہیں۔

طبّی امداد: "ریڈا کٹوبر" جیسے چھوٹے گاؤں میں کوئی دواخانہ نہیں ہے۔ اس لئے مریضوں کو وہاں سے ۲ میل کے فاصلے پر ایک دوسرے قصبے کو شکستہ سڑک کے ذریعہ سفر کر کے جانا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس آلات بہت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ لیکن مریض بکثرت موجود رہتے ہیں۔ ان سب کو اگر فوری علاج درکار نہ ہو تو کچھ گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے وہاں آلات کی کمی کے باعث عموماً معمولی علاج ہی کرانا پڑتا ہے۔

اس وقت اِوان کی حالت دیگر غریب کسانوں کی بہ نسبت بہتر ہے لیکن پچھلے دنوں سے جان توڑ محنت کا معاوضہ بھی بہت ہی کم ملا کرتا ہے۔

انقلاب کے بعد آلات زراعت میں تبدیلی ہونے پر بھی گزشتہ ۳ سال سے اِوان کی نظر شہری صنعت پر ہے۔ قابل استعمال سامان کی قیمت بڑھ جانے اور سرکاری دستور العمل کے مطابق اس کی فروخت شدنی زرعی پیداوار کی قیمت میں کمی اور مصارف زندگی میں زیادتی کی وجہ سے اِوان ایک بہت بڑی مصیبت میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی بچوں کی حالت درست کرنے کے لئے کچھ زیادہ جوان بھی نہیں ہے۔ اِوان کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ محنت بہت زیادہ کرنی پڑے گی۔ اور آمدنی بہت ہی کم مل سکے گی۔

●

۱۔ مضمون نگار اصحاب مضامین صاف اور خوش خط لکھا کریں۔

۲۔ مضامین موجودہ حالات کو پیش نظر رکھکر مرتب کئے جائیں۔

۳۔ ہمیشہ مقصد کی خاطر لکھئے۔

عبدالقدیر اصغر

اے چاند تارو ــــــ!

تمہیں معلوم ہے اے چاند تارو؟

وہ ہندوستان کی خاموش وادی!
جہاں کچھ جھاڑیاں سوکھی کھڑی تھیں
وہ بستی اُف وہی بستی کہ جس میں
کئی صدیوں سے اُڑتے تھے شرارے
وہ منظر بھی تمہیں کچھ یاد ہوگا
کہ جب ساقی کی پُر معنی نگاہیں!
اُٹھیں اور اہلِ محفل جھوم اُٹھے!
بھرا ساقی نے پھر اک جام رنگیں!
ہر اک میکش کی للچائی نگاہیں
ادائے خاص سے اس سمت اُٹھیں
تبسم زیرِ لب آنکھوں میں سُرخی!
حسد کی آگ سینے میں فروزاں
ہوئے مسحور سحرِ سامری سے
نئے انداز کی جادوگری سے
ہر اک میکش پہ جھپٹے شیر بن کر
اسی عالم میں گزرے چند لمحے!
وہ حالت آہ! کتنی پُر خطر تھی
زمیں انساں کے خوں میں تر بتر تھی!

تمہیں معلوم ہے اے چاند تارو؟؟

کہ انسانوں نے کیا کیا کر دکھایا!
کہیں زندہ جلایا عورتوں کو!
کہیں بچوں کو سُولی پر چڑھایا!
کہیں چھینا گیا سامان گھر کا
کسی نے عصمتوں کو بڑھ کے لُوٹا!
یہ سب انسان تھے یا بھیڑیئے تھے؟
انھیں کیا دشمنی تھی اس زمیں سے؟
اسی ماحول میں پھُولے پھلے تھے
نشے میں اپنی اپنی قومیت کے!
یہ سب بدمست ہوتے جا رہے تھے!
انھیں تعلیم ایسی دی گئی تھی
کہ انسانوں سے حیواں بن گئے تھے
وہ منظر کس قدر خونیں ادا تھا
کہ انساں اپنے ہاتھوں مِٹ رہا تھا

تمہیں معلوم ہے اے چاند تارو؟؟؟

یہ سب کچھ کیوں ہوا کیسے ہوا تھا؟
بھلا کیوں عصمتیں لُوٹی گئی تھیں؟
زمیں پر خونِ انساں کیوں بہا تھا؟
ہزاروں سال سے اس آسماں پر
اسی انداز سے تم سب ہو روشن!
بتاؤ تو تمہیں معلوم ہوگا!
کہ انساں آج کیا کیا کھو چکا ہے؟
وہ انساں، اُف وہی انساں کہ جس کو
خلیفہ ارض کا سمجھا گیا تھا!
؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟

تمہیں معلوم ہے اے چاند تارو؟؟؟؟

تمھیں کچھ یاد ہوگی وہ صدا بھی!
کہ جو اس عالمِ خاکی کے اوپر
ہزاروں بار ہر خطّے میں گونجی
خدا کی حاکمیت کی وہ آواز
کہ جس نے ہر خدائی کو مٹایا
ہر اک کی بادشاہی کو مٹایا!
مٹا کر سینکڑوں اصنام جس نے
درِ خالق پہ بندوں کو جھکایا
فساد و جنگ جس سے دب گئے تھے
صدائے امن و راحت گونجتی تھی
یہ تحدیدِ محبت کا تخیّل!
کہ جس کے پردۂ رنگیں کے پیچھے
بہے ہیں خونِ انسانی کے نالے
اسی تحدید کو توڑا گیا تھا!
عمومی رشتۂ الفت تھا جس کو
مئے توحید سے جوڑا گیا تھا!
تمھیں معلوم ہے اے چاند تارو؟؟؟؟؟
اگر معلوم ہے خاموش کیوں ہو؟
یہ مانا آج انساں مر چکا ہے!!
زمیں آباد ہے اب بھیڑیوں سے
علَم طاغوت کا یاں گڑ چکا ہے!
یہ مانا آج انسانوں کے ریوڑ
چلے جاتے ہیں شیطانوں کے پیچھے
یہ مانا دولت و شوکت کی خاطر
زمیں پر خونِ انساں بہہ رہا ہے
یہ سب تسلیم، لیکن یہ بتاؤ!
کہ جس پیغامِ حق کے تم امیں ہو
اسے کیوں سامنے لاتے نہیں ہو!
مگر —— ٹھیرو ذرا —— اے چاند تارو

کہ میں نے تم سے کیا کیا کہہ دیا ہے
مجھے کچھ یاد آتا جا رہا ہے!
کہ اس پیغامِ حق کا میں امیں ہوں
تمھیں شاید تعجب ہوگا اس پر
کہ میں خود اس سے کیوں واقف نہیں ہوں
بتا دوں گا کبھی فرصت میں یہ بھی
کہ یہ خود ایک لمبی داستاں ہے



تلخیاں

(۱)

ٹھہر او بے وفا دنیا، اری او بے خبر دنیا
تری ہر مسکراہٹ موت کو بیدار کرتی ہے
تری خود غرضیوں کو یاد کر کے کانپ جاتا ہوں
کہ جس سے پیار کرتی ہے اُسی پر وار کرتی ہے

(۲)

تجھے طوفاں میں رہ کر بھی اُبھر جانا نہیں آتا
اُچھالے موج کتنا ہی مگر دل ڈوب جاتا ہے
تری فطرت بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہے ساحل کا
ابھی تو زندگی کی کشمکش سے ہچکچاتا ہے

(۳)

ابھی موجود ہیں دنیا میں کچھ ایسے بھی فرزانے
کہ ہے کچھ ہوش جن کو جادۂ منزل نہ منزل کا
وہ طوفانوں سے کھیلیں خیر یہ تو غیر ممکن ہے
نشاں ساحل پہ رہ کر بھی نہیں معلوم ساحل کا

ن جٹ

ساتویں دن وہ روزانہ کی طرح مل کے باہر نعرے لگا رہے تھے کہ چپراسی نے دامودر سے آکر کہا۔ سیٹھ جی! آپکو دفتر میں بلاتے ہیں ـــــ وہ اُس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اندر اُس نے دیکھا کہ واسدیو اور کارخانہ دار ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ وہی واسدیو جو کارخانہ دار کو لگاتار گھنٹوں بُرے بُرے الفاظ میں یاد کیا کرتا تھا۔ واسدیو نے اُس وقت جو الفاظ کہے وہ اُنہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ "دامودر ہڑتال ختم کر دو۔ ابھی کسی مل میں بھی یونین نہیں ملا۔ جب اور جگہ ملیگا تو یہاں بھی مل جائے گا"

دامودر نے بھی غصہ اور حیرت کے ملے جلے انداز میں جواب دیا "ہڑتال ہرگز ختم نہیں ہو سکتی۔ جب تک یونین نہ مل جائے" واسدیو نے کہا "مان جاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں" مگر دامودر راضی نہ ہوا اُسے مل سے نکال دیا گیا۔ ہڑتال بغیر مانگیں پوری ہوئے ختم ہو گئی۔

اب دامودر کے پاس کوڑی بھی نہ تھی۔ اُس نے چاہا کہ ہری کرشن سے مدد طلب کرے۔ مگر اُس کے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ "آخر واسدیو اور ہری کرشن ہیں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے" اُسے اُن سے نفرت ہو چکی تھی۔ اُنکی شکلوں سے، اُنکے گھر سے، اُنکی خاندانی تصویروں سے، اُنکی باتوں سے اور اُنکی عادات سے ـــــ اُس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا "اُف! یہ ظالم راکشس"

●

"مدتوں دنیا کے سینے میں اُبلنے والا لاوا اُس وقت پھٹتا ہے، جب ظالم کے فتح کے مینار اپنے خون سے تعمیر کرنے والا مظلوم 'ہاں' کہتے کہتے 'نہیں' کہہ دیتا ہے جب چابک کے سراٹے اس کے منجمد خون میں گرمی پیدا کر کے اُسے یقین دلاتے ہیں کہ تم ابھی زندہ ہو، اور انسان ہو۔ جب زندگی بھر کے دل پر ٹپکے ہوئے آنسو اُبل کر باہر نکل آتے ہیں اور دنیا اس سیل کی تاب نہ لا کر پناہ کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ جب وہ اپنی روح کے مردہ خانے میں سے اپنے ضمیر اور خودداری کو قُم باذن اللہ کہہ کر پھر دعوتِ بیداری دیتا ہے۔ تو پھر اُس کے وہ آلاتِ غلامی جو ظالم کی حشمت کے محلات تعمیر کرتے ہیں، اس کی قبر کھودنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت ظالم کا سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے۔ اُس وقت اُس کے جسم کی رگیں رسیاں بن جاتی ہیں اور اُس کی دولت جہنم کی آگ بن کر اُسے پھونک دیتی ہے"

اسعد گیلانی

انور عظمی

فیصلہ کُن

"ایسا تو کبھو (کبھی) کو نہیں دیکھا"

"ارے تو تمہاری دھمکی سے ہم دب جائیں"

ایک ہنگامہ مچ گیا تھا بات کچھ نہ تھی اگر رحمت اور شکور سوچتے تو خود ان کے نزدیک بھی یہ کوئی جھگڑنے کی بات نہ تھی۔ آپ ہی تو سوچئے پنچایت کے اندر اگر شکور کا نام نہ رکھا جا سکا تو کون سی قیامت آ گئی مگر حقیقت تو یہ تھی کہ شکور کو اس میں اپنی صاف ہتک نظر آتی تھی، اس کی وہ پرانی عداوت جاگ اٹھی تھی جسے زمانے سے اس کے سینے کے اندر ایک زندہ چنگاری کی شکل میں دبا دیا تھا۔ اس کو اس کا تصور ہی بوکھلا دیا کرتا تھا کہ رحمت اس سے کسی میدان میں بازی لے جا رہا ہے اور رحمت بھی ہر موقعہ پر اس کی انتہائی کوشش کرتا کہ شکور کو گاؤں میں ابھرنے اور چمکنے کا موقع نہ ملے۔ اس کے نزدیک بھی شکور اتنا مبغوض تھا کہ اسے ابھرنے کا کوئی حق ہی نہیں حاصل تھا اسی لئے جب گاؤں کے اندر پنچایت کے لئے انتخاب ہونے لگا تو رحمت نے اسکی جان توڑ کوشش کی کہ شکور اس کے اندر نہ آ سکے۔ شکور کے کان میں اگرچہ بھنک پڑتی رہتی تھی مگر اسے وہ کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا اور اپنی جگہ پر پنچایت کی رکنیت کے لئے پوری کوشش کرتا رہا۔

مگر جب نتیجہ ظاہر ہوا تو شکور تلملا کر رہ گیا اور اس کے دل میں جو خطرات اور وسوسے پیدا ہوتے رہتے تھے اب یقین کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ سانپ کے نکل جانے کے بعد جس طرح دیہاتیوں کے نزدیک لکیر کو نہ پیٹنا چاہیے اسی طرح شکور نے اب اس مسئلے میں الجھنا مناسب نہ خیال کیا اور اب یہ کوشش کرنے لگا کوئی نادر موقع ہاتھ آئے تو رحمت سے بدلہ لے۔

چند دنوں کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شکور کی دلی تمنا کو اتھاہ گہرائیوں سے سطح پر ابھرنے کا موقع دے دیا۔ گاؤں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصل کا زبردست نقصان ہو رہا تھا۔ کسان اپنی ہر مجلس میں اسی ہلاکت کا تذکرہ کرتے رہتے۔

"دیو کی مرجی! نہیں تو برکھا تو اب تک ہو جات رہا"

دو چار دن کے انتظار کے بعد ہوشیار اور مستعد قسم کے کسان تو رہٹ، پر، گہرے تالابوں کے ذریعہ سینچ سینچ کر کھیتی کو سیراب کرنے لگے اور بقیہ لوگ بارش کے انتظار میں کھیتوں سے بے نیاز زمانہ گزار رہے تھے ایک صبح کہ سورج نئے واقعات کی تلاش میں ذروں کے دل کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا اور نئے اگے ہوئے پودوں کی پھنگنیاں شبنمی رنگ اختیار کر چکی تھیں کہ گاؤں کے پورب والے کنوئیں پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور اکثر و بیشتر لوگ اس جگہ کھچ کر جمع ہو گئے۔

رحمت اور شکور ایک دوسرے سے بری طرح الجھ پڑے تھے ان کی آوازیں درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو مضطرب کر رہی تھیں بلکہ تعجب انگیز شور نے رہٹ میں جتے ہوئے بیلوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ کھیتوں کے اندر کچھ لوگ کدال کے منہ پر ایک پیر رکھ کر کھڑے ہوئے رہٹ کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ شاید معاملہ ابھی تک پوری نوعیت کے ساتھ ان کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔ شکور بپھرا ہوا دل کا بخار نکال رہا تھا۔

"تمہارا ای مجال نہیں ہے رحمت کہ بیل کی جوڑی رہٹ سے کھل جائے"

"آج ہی شکور! کسی سے بھینٹ (ملاقات) نہیں بھئی۔ (ہوئی) اسی سے اتنا مجاج بڑھ گوا (گیا) ہے" رحمت نے تلملاتے ہوئے جواب دیا۔

شکور نے للکارا "تو تم بھی تو اتنے بلوان نہیں ہو کہ ہمارا مجاج درست کر دو"

"ارے ہم تو کچا چبا جائیں کچا" رحمت نے گھونسے کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا "تم کا سمجھتے ہو"

"ایسا تو کبھو (کبھی) کو نا ہیں دیکھا" شکور نے ایک آدھ قدم بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے تو تمہاری دھمکی سے ہم دب جائیں" رحمت مجنونانہ حالت میں بڑھا۔

وہ تو خیریت ہوئی کہ چار پانچ آدمیوں نے بڑھ کر دونوں کو تھام لیا نہیں تو وہیں زمین حضرت انسان کا خونی قصیدہ سنانے لگتی۔

اس روز کے واقعہ نے شکور کے دل میں جو انتقامی جوالا مکھی بھبک رہا تھا اسے اور مشتعل کر دیا اور دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہنے لگا کہ کسی طرح رحمت کو جو عزت اور اقتدار گاؤں میں حاصل ہے ختم کر دیا جائے۔ رحمت نے جو گرم باتیں سنائی تھیں اس کی سب سے بڑی وجہ شکور کے نزدیک یہی تھی کہ گاؤں والے اب شکور کے مقابلے میں رحمت کی طرفداری کرنے لگے تھے اور رحمت کو اس کا گھمنڈ ہو چلا تھا کہ اب گاؤں میں اسکے مقابل کا کوئی نہیں۔

شکور نے رہٹ والے مسئلے کو پنچایت میں بھی رکھا۔ مگر وہاں بھی اسے منہ کی کھانی پڑی۔ سب پنچوں نے مل کر متفقہ فیصلہ سنایا کہ "شکور کو بنا کہے رہٹ نہیں جوتنا چاہئیے تھا" اگرچہ سب کو معلوم تھا کہ کم از کم اس معاملے میں تو شکور کا کوئی قصور نہیں ہے۔

ان دو واقعات نے گاؤں بھر میں شکور کو نکو بنا دیا اور جو نقشے ذہن میں شکور نے جمائے تھے تمام درہم برہم ہو گئے وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح دن رات بل کھاتا اور ہر وقت اسی خیال میں کھویا سا رہتا۔ گاؤں والوں سے کوئی امید تو تھی نہیں پاس پڑوس میں بھی رحمت کے مقابلے میں اس کی دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔

جب بات ضبط کی حد سے باہر نکل گئی تو شکور اپنی آخری پونجی بھی انتقام کی قربان گاہ پر بھینٹ کرنے کو آمادہ ہو گیا اس کے دل میں بار ہا اس کا خیال گزرا لیکن محض خاندانی وقار کے تصور نے اس کے قدم ہی کو نہیں بلکہ دل و دماغ تک کو جکڑ لیا اور وہ کچھ اور آگے سوچنے سے معذور ہو گیا مگر اب وہ اس آخری اور گراں مایہ دولت کو بھی انتقام کی آگ میں جھلس دینا چاہتا تھا بالکل اس جواری کی طرح جو جھنجھلا کر گھر کی آخری پونجی کو بازی پر لگا دے۔

رات سفید ذروں کے روشن چہرہ پر کاجل کا غازہ مل چکی تھی ہیبتناک سیاہی نے چرند و پرند سے گزر کر درخت کے پتوں تک کو خاموش کر دیا تھا ——— مگر شکور اس وقت مرگ آلود کشمکش میں گرفتار بستر کو شکن سے معمور کر رہا تھا۔ ایک عجیب کشمکش تھی۔

دل اگر آمادہ ہوتا تو دماغ ساتھ دینے سے انکار کر دیتا اور دماغ ساتھ چلنے کو کہتا تو دل پھسل کر الگ ہو جاتا وہ بڑبڑانے لگا۔

"پشتہا پشت کی اجت (عزت) کا سوال ہے اگر یہ لٹ گئی تو پھر متہ میں کالک لگ جائے۔ مدا یہ رحمت کتنا اکڑ اکڑ کر چلتا ہے جان پڑتا ہے کہ دھرتی کی چھاتی پھٹ جائی۔ بچہ دو چار گنڈے نہ ساتھی ہوتے تو ساری اکڑ پھوں بھول جاتی اچھا! ہم بھی اگر شریف کے بچے ہیں تو مجا چکھا کے چھوڑیں"

بیک وقت متضاد خیالات ذہن پر رینگ رہے تھے مگر اب اسے رحمت کی تمام عداوتیں سلسلہ وار یاد آتی جا رہی تھیں۔ وہ زمانہ جب کہ وہ دو چار غنڈوں کا سردار تھا تو رحمت کتنا اس سے دبتا تھا مگر یکایک گھر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے وہ اپنی پوری دولت گنوا بیٹھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غنڈوں نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا اور وہ بالکل تنہا ہو کر رہ گیا۔ یہ موقع تھا رحمت کے ابھرنے کا اور رحمت نے اس موقعہ سے دل کھول کر فائدہ اٹھایا رفتہ رفتہ وہ گاؤں پر حاوی ہو گیا اس لئے کہ شکور کے علاوہ کوئی اور تو تھا نہیں کہ اس کے مقابل آتا۔

پھر جب شکور نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرنی چاہی تو رحمت نے اس میں وہ روڑا اٹکایا کہ نہ صرف شادی رکی بلکہ وہ اردگرد کے گاؤں میں کئی مہینوں تک منہ دکھانے کے قابل نہ ہو سکا

اسی سال جب فصل تیار ہو کر کھلیان میں پہنچ چکی تھی تو محض ضد کی وجہ سے رحمت نے جھگڑا کھڑا کر دیا حالانکہ کئی نسل سے شکور کا کھلیان اسی میدان میں ہوتا تھا مگر رحمت نے محض غنڈوں کے بل بوتے پر اسکو ثابت کر دیا کہ وہ چراگاہ ہے اور کسی کو وہاں کھلیان کرنے کی اجازت نہیں اور جب گاؤں والوں نے قریب کے تھانے کو اطلاع دی تو دارو غہ نے الٹے اطلاع دینے والوں ہی کو فسادی قرار دیا اور سزا پانے والوں میں شکور بھی تھا۔

اور جب وہ سزا بھگت رہا تھا اس وقت اس کے گھر والوں کو رحمت نے کتنی زحمت میں مبتلا کر دیا تھا کتنی بار اس کے چھوٹے سے لڑکے کو چپت لگا چکا تھا۔ کتنی ہی بار جانوروں کو محض دشمنی کی وجہ سے مویشی خانہ بھجوا چکا تھا اور حد کر دی تھی کہ کنوئیں سے کئی بار پانی کا لینا بند کر دیا تھا۔

بس بس" شکور بوکھلا کے بڑبڑانے لگا "اتنا کھٹور اور کون ہوگا مجھ تنگ رحم نہ آیا' ایک بوند پانی کو ترسا دیا"

وہ تلملا کر اٹھ بیٹھا صحن سے کدال اٹھائی اور تاریک گلیوں نے اسے نگل لیا۔

دوسرے روز صبح ہی کو گاؤں بھر میں ہلچل تھی کہ رحمت کے گھر میں جھاڑو تک نہیں بچی، داروغہ آتے مگر نہ جانے کیوں بجھے بجھے سے رہے حالات کا جائزہ لیا اور رخصت ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہیں آج رحمت سے کوئی لگاؤ ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ گھنٹوں اس کے دروازے پر محفل منعقد کئے رہتے تھے، گاؤں والوں کا عام خیال تھا کہ "ماتا ہوا ہے اگر جی چڑھ گئی ہے" یعنی کسی چیز نے رخ بدل دیا ہے۔

رحمت ابھی گھر کے لٹنے کا جی بھر کے ماتم بھی کرنے نہ پایا تھا کہ دوسری رات کو اس کا کھلیان جل کے راکھ ہو گیا اب اس کے پاگل ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہ گئی' مگر اس کے دو تین دوستوں نے اسے سنبھالا اور واقعہ یہ ہے کہ کافی مدد کی مگر جب سرچشمہ غائب ہو تو ہوتے کہاں تک پانی دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال کے اندر جب دوبارہ چناؤ ہوا تو قدرتی طور پر رحمت کے بجائے سرپنچی کا تاج شکور کے سر پہ رکھا گیا۔

پنچایت کا ہنگامہ ختم ہوا تو ایک روز اسی پانی کے معاملہ پر رحمت اور شکور سے جھگڑا ہو گیا۔ رحمت کچھ زیادہ بپھر گیا تھا اور آج وہ دل کی بھڑاس نکال ڈالنا چاہتا تھا چاہے اسے اس کے پیچھے جان ہی کیوں نہ دینی پڑتی اور حقیقت تو یہی تھی جب صبح سویرے سے رہٹ ۔۔ چل رہا تھا تو شکور کا اس سے اس بات پر الجھنا درست نہیں تھا کہ

"باری چھوڑ کے کیوں رہٹ لی؟"

"چور کہیں کا، جیسے خود بے ایمان ہے ویسے سب کو سمجھتا ہے" رحمت نے تلملا کر جواب دیا

"دیکھ جبان سنبھال کر بول. نہیں تو جوتے سے کاٹ لوں گا" شکور نے پیکتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا کوئی دیل نہیں ہے۔ شکور جیا ہوس کی دعاکرو کل تک کا حیثیت رہی اس کا بھی تو کھیال کرو" رحمت نے شکور کے دل پر جیسے نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔

شکور کو آخری جملے کے سننے کی تاب کہاں تھی۔ اس نے فوراً جوتے کو پیر سے کھینچا اور بے تکلف رحمت کے سر پر سلنے لگا۔ رحمت نے مزاحمت تو کی مگر شکور کے نوکروں اور ساتھیوں نے اسکو بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔ گاؤں والے ڈر کے مارے بول نہیں رہے تھے کہ اگر اس وقت کچھ کہا تو کل بندھے بندھے پھریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب رحمت بالکل بے جان ہو کر گر پڑا تو شکور نے جوتے کا چلانا بند کیا اور ٹھوکر لگا کر پوچھنے لگا۔

"بول! آج کس کی باری ہے"

رحمت کراہتے ہوئے بولا "شکور کی"

گاؤں میں جب یہ خبر پھیلی تو ایک بڈھے سے انسان نے منہ لٹکا کر کہا کہ۔

"اب اسی کی حکومت ہے؟"

"طاقت ـــ طاقت: آج ہر طرف طاقت کی پوجا ہو رہی ہے۔ اخلاق کی کمی طاقت سے پوری کی جا رہی ہے۔ محبت کا دُکھ طاقت سے دُور کیا جا رہا ہے۔ اور پیٹ کا علاج بھی طاقت ہی ہے لیکن ایک بد اخلاق اور خدا سے باغی سماج جوں جوں اسکی طرف بڑھتی ہے یہ اندھی طاقت دیوانے کے خلل دماغ کی طرح اس کو اور تباہی کی طرف لے جاتی ہے ـــ طاقت پیدا کرنے سے پہلے اُس کو محفوظ رکھنے اور صحیح استعمال کرنے کے لئے وسیع ظرف پیدا کرنا ضروری ہے"

سنائی دیتا ہے)

مت اتنا گنجار پپیہے ــــ مت اتنا گنجار
پی پی مت کر جاگ نہ جائے میرا سوتا پیار
پپیہے ــــــــــ

برکھا کے دن آئے تو کیا
کالے بادل چھائے تو کیا
جس کے پی پردیس بسے ہوں کیسی اس کی بہار
پپیہے ــــــــــ

چندرا:- کون گا رہا ہے۔؟ کون ہے یہ۔؟ کون مجھے بلا رہا ہے۔؟ (آواز بیر چلتی ہے) ضرور یہ کوئی جادو ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر میرا دل کیوں کھنچ رہا ہے۔؟

(سامنے ایک درخت کی جڑ سے ٹیک لگائے ڈاکٹر مہیش ستار پر گیت گا رہا ہے)

چندرا:- راگی! ــــ یہ تم کیا غضب کر رہے ہو؟ بس کرو۔ تم تو میرے سوئے سپنے جگا رہے ہو راگی ــــ کیوں تم نے اس راکھ کو کریدا؟ کہیں کوئی چنگاری بھڑک کر شعلہ نہ بن جائے۔

ڈاکٹر:- اوہ ــــ (چندرا کی طرف متوجہ ہو کر) راگوں کی دیوی؟ تم اس جنگل میں کیسے۔؟

چندرا:- تم کون ہو؟ ــــ مگر مجھے یہ پوچھنے کا حق ہی کب ہے۔

ڈاکٹر:- میں؟ میں ڈاکٹر مہیش ہوں۔

چندرا:- تم ڈاکٹر مہیش ہو۔؟ تم ہی کہتے ہو زندگی کے ساگر میں ایک بھیانک طوفان آ رہا ہے۔ پرانی اور بوسیدہ جھونپڑیاں اس طوفان کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ اور اُن کی جگہ نئے محل تعمیر ہوں گے

ڈاکٹر:- (دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ کر) اور اس طوفان کے آثار ابھی سے پیدا ہو چلے ہیں

چندرا:- تمہارا مطلب ہے میری زندگی کا طوفان

ڈاکٹر:- ہاں ــــ شاید تم دودھوا ہو؟ یہ سفید ساری جو تمہارے جوان اور سجیلے حسن کو چھپانے کے لئے سماج نے تمہیں دی ہے تمہارے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔ وہ آگ جو عنقریب بھڑک کر شعلہ جوالہ بن جائے گی، کب کسی فانی تہہ کے نیچے کیسے چھپ سکتی ہے؟ تم مجھ پر ظلم کر سکتی ہو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں بلکہ اس ظلم کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ لیکن اپنی جوانی کو یوں تاسہادی کی نیند سلا دینا یہ تمہارا سب سے بڑا ظلم ہے جو میں نہیں برداشت کر سکتا ــــ دیوی! میرے من کے تار کسی امٹ راگ کے لئے تڑپ رہے ہیں ــــ محبت کا غیر فانی نغمہ چھیڑ کر مجھے بھی لافانی بنا دے۔

چندرا:- اوہ بھگوان ــــ

ڈاکٹر:- مگر بھگوان ہے کہاں ــــ مدت ہوئی اس نے دنیا کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ مگر دیوی! تم نے کیوں میرے من کے تاروں پر انگلیاں رکھ دیں۔ وہ قطرہ جو عرصہ سے دریا سے دور پڑا سو رہا تھا تم نے اس کی ساگر سے ملنے کی آشا کیوں جگا دی؟ اور اس سے پہلے کہ تاروں کی یہ جھنجھناہٹ زندگی کے خوش آئند نغمے میں تبدیل ہو تم کہاں چل دیں ــــ؟

(چندرا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور وہ پھر گانے لگتا ہے)

کس نے سوتی آس جگا دی
من میں جیون جوت جلا دی
چھیڑ دئے پھر جانے کس نے من کے ٹوٹے تار!

× × ×

منظر دوم ــــــــ چودھری کی چوپال

یہ ایک صاف ستھرا چوپال ہے جسے دیہاتی طرز کا برآمدہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کافی لمبا ہے کنارے کی سمت دو وزنی پلنگ بچھے ہوئے ہیں جو اتنے زبردست اور بڑے ہیں کہ شاید سال میں ایک آدھ بار ہی اٹھائے جاتے ہوں گے۔ باقی حصہ میں ٹاٹ کا موٹا فرش ہے جو آنے والوں کے پاؤں کی مٹی کھا کھا کر مٹیالا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف گڑھے میں آگ دبی ہوئی ہے۔ پاس ہی ایک حقہ اور کئی ایک چلمیں رکھی ہوئی ہیں۔ اسٹیج سے اندھیرا آہستہ آہستہ ہٹتا ہے۔ ایک شخص کی ہنسی کی آواز اُبھرتی ہے۔ اور پھر یہ ایک آواز کئی آوازوں میں بدل جاتی ہے۔ منظر اور اُجاگر ہوتا ہے۔ اور چودھری

بھولا ناتھ :- بنسی. منڈو اور کئی آدمی بیٹھے نظر آتے ہیں
ایک شخص :- اسے کیا بات کہی ہے رے تو نے بنسی
بنسی :- میں تو جانتا ہوں چودہری کاکا جب تک ہنسا جائے خوب ہنسو! کون جانے سوکھی ندی میں پھر روانی آئے کہ نہ آئے
اُجڑے باغوں میں روز روز بہار نہیں آتی۔
چودہری :- کچھ اور بھی جانتا ہے تو چھوکرے! بڑی قیمت دینی پڑتی ہے اس ہنسی کی۔ ایک ایک مسکراہٹ کے لئے کتنا
رونا پڑتا ہے آ- یہ کوئی میرے دل سے پوچھے۔
بھولا ناتھ :- چودہری تم تو ہمیشہ دکھ کی آنکھ سے دیکھتے ہو زندگی کو۔ کل کی فکر سے آج کی خوشی کیوں برباد کرتے ہو؟ کیوں بنسی
بنسی :- ہاں ہاں تم نے سچ کہا۔
چودہری :- چھوڑ بھی ان باتوں کو بنسی۔ جب میری عمر کو پہنچےگا
تب تجھے معلوم ہوگا زندگی کیا ہے اور اس میں سکھ کتنا ہے
بنسی :- میں جانتا ہوں کاکا جیون کیا ہے۔ مگر جب تک ہمیں پھول میسر ہیں ہم کانٹوں سے اپنا دامن کیوں الجھائیں؟
چودہری :- ارے پاگل پھولوں سے دامن بھرنے کے لئے کانٹوں
سے الجھنا ہی پڑتا ہے۔ زندگی میں سکھ تو بالکل ایسا ہے
جیسے دریا میں موتی۔ اگر موتی کی خواہش ہے تو اندر جانا ہی
پڑے گا۔ کنارے سے تو کوڑا کرکٹ ہی مل سکتا ہے۔
بنسی :- اب تم سے کون جیت سکتا ہے کاکا۔ (وقفہ) — لیکن
کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ پھول بھی ہاتھ آجائے اور
کانٹوں سے دامن بھی نہ الجھے۔
چودہری :- کانٹوں سے ڈرتا ہے پاگل، یہیں پر تو انسان کا کھوٹا
کھرا پرکھا جاتا ہے جو آنسو پی گیا وہ پار ہو گیا، اور جس کے
قدم ڈگمگائے وہ رہ گیا۔ جینا وہ جو دوسروں کے لئے ہو
جو اپنے لئے جیا وہ مردوں سے بدتر ہے۔
بنسی :- مگر کاکا۔ مہیش بھیا تو زندگی کے بارے میں کچھ عجیب طرح
سے سوچتے ہیں۔
چودہری :- کون؟
بنسی :- اپنے مہیش بھیا — ڈاکٹر مہیش
چودہری :- اوہ — ہاں ہاں. کیا کہتے ہیں وہ ؟

بنسی :- وہ کہتے ہیں یہ دنیا خود غرضوں کی دنیا ہے۔ اس میں وہی جی
سکتا ہے جو اپنا نفع نقصان دیکھے۔ دوسروں کے لئے دکھ
اُٹھانا، پرسوارتھ کے لئے جان جوکھوں میں ڈالنا حماقت نہیں
تو اور کیا ہے؟
چودہری :- چھی چھی۔ مہیش تو اس گاؤں میں زہر پھیلا رہا ہے۔
بنسی :- یہ تو کہو کاکا۔ اس نے رادھا نگر کی بڑی سیوا کی ہے۔ روگیوں
اور دکھیوں کی بے غرض سیوا کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ وہ کہتے
ہیں آدمی آدمی برابر ہیں۔ ان میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ روٹی
کپڑا، مکان، ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔
چودہری :- اچھا (تعجب سے) اور کیا۔
بنسی :- اور — اور یہ کہ کسی کو کسی پر حکومت کا کوئی حق نہیں
جنتا خود ہی اپنی حاکم آپ ہے۔
چودہری :- اچھا — تو یہ انسان اس کا مطلب ہے سب آزاد
ہیں جو چاہیں بے روک ٹوک کریں۔
بنسی :- بھلا کاکا یہ بات کیسی ہے کہ اگر بھگوان ہیں تو بڑے
انیائی ہیں کسی کو غریب بنا دیا، کسی کو امیر۔ کوئی فاقہ کرتا ہے
تو کسی کے کتے دودھ اور ڈبل روٹی کھاتے ہیں۔
چودہری :- اوہ — چھوکرے یہ تو نے کیا کہا۔ یہ تو ہمارے
دین دھرم اخلاق سب ہی جڑیں ہلا کر رکھ دے گا۔ یہ کیسی
روشنی ہے کہ ہمارے من تاریک ہوتے جا رہے ہیں —
بھولا ناتھ :- تم نے بھی یہ بال دھوپ میں پکائے ہیں۔ تم نہیں دیکھتے
اندھیرے اجالے کی یہ ٹکر کتنی زبردست ہوگی۔
بھولا ناتھ :- بھگوان جانے چودہری کون جیتے کون ہارے
بنسی :- مگر کاکا۔ یہ ٹکر ہو کیوں؟ — دنیا ہر آن بدلتی رہتی ہے۔
جو کچھ پرانا ہو چکا ہے اسے نئے کے لئے جگہ خالی کر دینا چاہیے
کیا تم نے نہیں دیکھا بڑے بڑے لوگوں نے بھگوان کا
نام لے کر غریبوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں۔
چودہری :- بنسی — (مگر پھر نرم ہو کر) تیرا خیال ہے میں نے
رادھا نگر کے ساتھ انیائے کیا ہے۔ لوگ بھوکے سو گئے اور
میرے گھر میں چولہا جلتا رہا۔ بھگوان قسم بھولا ناتھ رادھا نگر
کا ذرہ ذرہ گواہ ہے میں نے کبھی اکیلے نہیں کیا روٹی ہوئی

آنکھوں میں جب تک مسرت کی لہر نہیں چمک اٹھتی مجھے چین نہیں ملا بھولا۔ مگر تمہیں حاکم کون کہتا ہے۔ تم نے تو ہمیشہ اپنے آپ کو دھرتی کا خادم کہا ہے ۔۔ (نندو سے (بنسی کی طرف متوجہ ہوکر) تجھے تو بات کرنے کا بھی ڈھنگ نہیں۔ کون سی بات کہنے کی ہے کون سی نہیں تو تو یہ بھی نہیں جانتا چل معافی مانگ۔ ارے دیکھتا کیا ہے چودھری سے معافی مانگ۔

بنسی:۔ ہاں چودھری کاکا مجھے معاف کر دو۔

چودھری:۔ نہیں نہیں میں تیری بات کا برا نہیں مانتا۔ تو مایوس نہ ہو بھولا کا [illegible] سنتا ہے چھوکرے آج سے تیرا آنا جانا بند۔ خبردار جو اس ڈاکٹر [illegible] کے یہاں گیا۔

نندو:۔ چودھری میں سوچتا ہوں یہ ڈاکٹر تو ہمارے گاؤں میں بیماریاں پھیلا رہا ہے یہاں کون چھوٹا ہے کون بڑا سب ایک ہی اناج کھاتے ہیں اور ایک ہی پانی پیتے ہیں۔ کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ مگر چودھری۔ تم اسے اپنے گاؤں سے نکال دو۔ احسان فراموش۔

چودھری:۔ خاموش نندو۔ اس نے ہمارے گاؤں میں پناہ لی ہے۔ ہم اسے نکل جانے کے لئے کیسے کہہ دیں۔

نندو:۔ تم کسی کی کب سننے والے ہو چودھری۔ آگ کی ایک چھوٹی سی چنگاری بڑھتے بڑھتے سارے سنسار کو جلا سکتی ہے۔ وہ ہمارے گاؤں میں بڑی خطرناک بیماری [illegible] پھیلا رہا ہے کیا تم چاہتے ہو یہ اندھیرا رفتہ رفتہ سارے گاؤں پر چھا جائے اس گاؤں میں امرت کے دریا بہتے رہے ہیں وہ ان میں زہر گھول رہا ہے۔

چودھری:۔ نندو ۔۔۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے کہنے دو۔ اگر اس کے پاس [illegible] ایسا [illegible] کہ دنیا میں کوئی دکھی نہ رہے تو اس سے کہوالے بھولا [illegible] چودھری! بھگوان سے بغاوت کرکے جو بات کہی جائے بھلا سچائی سے اس کا کیا تعلق ۔۔۔ اچھا چودھری میں تو چلا ۔۔ رام رام چودھری۔

بنسی:۔ کاکا۔ مجھے معاف کر دو۔

چودھری:۔ تو کیوں [illegible] کرتا ہے چھوکرے

نندو:۔ میں بھی چلا چودھری۔ رام رام

بنسی:۔ رام رام کاکا۔

چودھری:۔ رام رام۔ اچھا تم سب چل دیئے (سب چلے جاتے ہیں) بونت۔ یہ فکر بڑی غضب کی ہوتی۔ نئے اور پرانے خیالات کی ٹکر سارا کس بل نکل جائیگا تیری ان بوڑھی ہڈیوں کا۔

(سونی داخل ہوتی ہے)

سونی:۔ کیا ہوا بابا ۔۔۔؟

چودھری:۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ ارے سونی تو۔

سونی:۔ تم کچھ سوچ رہے تھے چودھری بابا ۔۔؟

چودھری:۔ نہیں۔ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

سونی:۔ بابا یہ آم کا پیڑ تو بڑا ہرا بھرا ہو رہا ہے۔ اب کی پت جھڑ میں تو میں نے سمجھ رکھا تھا کہ یہ اب نہ ہرا ہوگا۔

چودھری:۔ اوہ پگلی ۔۔۔ ہر خزاں کے بعد بہار تو لازمی ہے۔

سونی:۔ بھلا بابا ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ گاؤں کا تالاب سوکھ گیا ہو اور پھر بارش بھی اسے نہ بھر سکی ہو؟

چودھری:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر تو آج کیا کہہ رہی ہے!

سونی:۔ میں وہی کہہ رہی ہوں جسے میں نے محسوس کیا ہے بابا۔ پیڑ پت جھڑ کے بعد پھر ہرا ہو جائے۔ گاؤں کا تالاب بار بار سوکھے اور بار بار بارش کا پانی اسے بھر دے۔ ہمارے کھیت سوکھ سوکھ جائیں اور پھر ہرے ہو جائیں۔ تمہیں بتاؤ بابا یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ بیوہ [illegible] لڑکی اگر ایک بار اجڑ جائے تو دوبارہ سرسبز ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ میں چندرا کے لئے کہہ رہی ہوں۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

چودھری:۔ مگر بیٹی۔ بھولا نا تم سنے گا تو کیا کہے گا۔ یہ اس کی بڑی بے عزتی ہے۔ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک کی ہوتی ہے۔

سونی:۔ تو تم نے بھگوان سے کہہ دیا ہوتا۔ انہوں نے اسے کیوں ودھوا کر دیا۔ یہ ظلم ہے۔ بھولا نا تھ بابا اور ان کی سماج چندرا پر ظلم کر رہے ہیں۔ اگر میں چندرا کی جگہ ہوتی تو ظلم کی ان زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔

چودھری:۔ سونی ۔۔۔

سونی:۔ مگر بابا اسے بچاؤ۔

چودھری:۔ لیکن سماج ۔۔؟

سونی:۔ ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔ وہ بیمار ہے بابا۔ بابا، چندرا بیمار ہے۔

اُسے ابھی زندہ رہنا چاہیئے۔ میں چاہتی ہوں وہ زندہ رہے۔

چودھری:۔ وہ بیمار ہے؟ اُسے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ میں آتا ہوں۔ میں کہتا ہوں تم اسے ڈاکٹر کو دکھاؤ ——— (پردہ)

× × ×

منظر سوم ——— بھولا ناتھ کا گھر

(یہ مکان کا اندرونی منظر ہے۔ منظر سادہ اور اُداس ہے۔ گھر کی تمام چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں جیسے کوئی رہتا نہ ہو۔ مکان میں پورب کی طرف جو دالان ہے اس میں چندرا ایک چارپائی پر غافل پڑی ہوئی ہے۔ پاس ہی پیڑھی پر بھولا ناتھ بیٹھا اس کا ماتھا سہلا رہا ہے۔ کھڑکی سے سائیں سائیں کرتی ہوا آ رہی ہے)

چندرا:۔ (غفلت میں) تم تو میرے سوتے پسینے جگا رہے ہو راگی ——— کیوں تم نے اس راکھ کو کریدا۔ کہیں کوئی چنگاری بھڑک کر شعلہ نہ بن جائے۔

بھولا ناتھ:۔ چندرا۔ میری بچی۔ تو کون سے سپنے دیکھ رہی ہے۔؟ کون راکھ کرید۔ ہائے یہ چنگاری اور یہ شعلے؟ یہ سب تو کیا بک رہی ہے۔ میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے۔ بھگوان! میرا یہی ایک سہارا ہے۔

چندرا:۔ (ہذیانی کیفیت) میری زندگی میں طوفان آ رہا ہے۔ میں تو ایک چلتی پھرتی لاش ہوں۔ لوگ مجھے زندہ کیوں کہتے ہیں؟

بھولا ناتھ:۔ ہاں ہاں میری بچی تو زندہ ہے۔ کون تجھے لاش کہتا ہے۔ بھگوان میرے ساتھ دغا نہ کرنا۔ چندرا۔ چندرا میری بچی

چندرا:۔ (آنکھیں کھول کر) بابا۔ میں زندہ ہوں۔

بھولا ناتھ:۔ لیکن تو یہ سب کیا بک رہی ہے۔ بیٹی تو نے مجھے آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔

چندرا:۔ بابا ——— آنسو پونچھ ڈالو بابا۔ تم روتے کیوں ہو۔؟ مجھے دیکھو۔ میں ہنس رہی ہوں۔ میں ہنس رہی ہوں بابا۔ ہی ہی ہی (زہرخند) (ہنسنے کی کوشش کرتی ہے لیکن آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں)

بھولا ناتھ:۔ تم میرے دل پر چھریاں چلا رہی ہو بیٹی۔ میں ضبط نہ کر سکوں گا۔ بیٹی میرا کلیجہ پھٹ جائیگا۔ دبی ہوئی آہیں، رُکے ہوئے آنسو، بھیچے ہوئے جذبات جوالا مکھی ہیں جو آتما میں آگ لگا دیتے ہیں۔

چندرا:۔ مگر بابا ——— آتما تو کب کی جل کر راکھ ہو گئی۔ یہ آگ جلے ہوئے کو اور کیا جلائے گی۔

بھولا ناتھ:۔ چندرا میری بچی ——— (ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہے) بخار کی تیزی سے بھنی جا رہی ہے بھگوان تم نے میری بچی کی خوشیاں کیوں لوٹ لیں؟ اُسے اجاڑ کر تمہیں کیا مل گیا (نیلے آسمان کی گہرائیوں میں نظریں گاڑ کر سوچنے لگتا ہے) میں اس کے ہونٹوں پر ایک بار مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں صرف ایک بار میرے بھگوان۔ میں ایک باپ ہوں۔

(سوتی داخل ہوتی ہے)

سوتی:۔ بابا چندرا کے ہونٹوں پر ایک بار مسکراہٹ دیکھنا چاہتے ہو؟ تم باپ ہو تمہارے دل میں باپ کی محبت ہے؟ بابا دنیا کے جھوٹے بندھن ایک بار زور لگا کر توڑ کیوں نہیں ڈالتے

بھولا ناتھ:۔ سوتی میں کمزور ہوں۔ میں ان بندھنوں کو نہ توڑ سکوں گا میری قوت جواب دے رہی ہے۔ میری قوت جواب دے رہی ہے سوتی۔ میں بوڑھا ہوں باقیوں کا سا کس بل نہیں

سوتی:۔ یہ بندھن ———؟ یہ بندھن ہم نے بنائے ہیں بابا اور ہم ہی ان کو توڑ سکتے ہیں جوانی تو ایک سبک خرام ندی کی طرح ہے بابا۔ سماج نے اس ندی کے سامنے بند باندھ کر اس کی روانی کو روک دیا ہے۔ لیکن بابا میں اس وقت کو یاد کر کے لرز اٹھتی ہوں کہیں یہ رکا ہوا پانی بڑھتے بڑھتے طوفان نہ بن جائے (چندرا کے ماتھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے) یہ زندہ دبی جوانی۔ بابا تمہیں اس پر رحم نہیں آتا۔ آہ بھگوان اس اندھیرے میں کبھی اُجالے کی کرنیں بھی چمکیں گی ———؟

چندرا:۔ (بے ہوشی کی حالت میں) مگر یہ آگ مجھ جلی ہوئی کو کیا جلا رہی ہے؟

سوتی:۔ سنا تم نے بابا۔

چندرا:۔ تم نے مجھے ان اندھیریوں میں بھٹکنے کے لئے کیوں چھوڑا ہے۔ اے دل، اپنی بزم تنہائی خوب آراستہ کر لے وہ آنے والا ہے۔ وہ ضرور آئے گا۔ تم مجھے لے چلو۔ یہاں کیا ہی کیا ہے۔

ابدی مسرتیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ ڈاکٹر

بھولا ناتھ:۔ نہیں نہیں۔ میں تجھے نہ جانے دوں گا۔ میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں (اور وہ تیزی سے نکل جاتا ہے)

(سونی چندرا کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی ہے)

چندرا:۔ (آنکھیں کھول کر) کون ہو تم۔؟

سونی:۔ میں سونی ہوں۔ طبیعت کیسی ہے چندرا۔؟

چندرا:۔ تیل ختم ہو چکا ہے سونی معلوم نہیں کب چراغ بجھ جائے

سونی:۔ (منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) نہیں چندرا ــ میری بہن ایسا نہ کہو۔ میں تمہیں مرنے نہ دوں گی ــ اپنے لئے نہ سہی اس بدنصیب بوڑھے کے لئے جیو جو بنا کسی سہارے کے نہیں جی سکتا۔

چندرا:۔ یہاں کون کس کا سہارا ہے سونی۔

سونی:۔ تم یہ سب کیوں سوچتی ہو؟ تمہارا دماغ تھکا ہوا ہے تمہیں آرام کرنا چاہیئے۔

چندرا:۔ آرام ــ ؟ تم نے سچ کہا مجھے آرام چاہیئے۔ اچھا تم چپ رہو ــ مجھے سو جانے دو۔ میں سو جانا چاہتی ہوں (اور پھر وہ آنکھیں بند کر لیتی ہے تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہتی ہے) زندگی پھر کروٹیں لے رہی ہے۔ وہ لہریں جنہیں کنارے سے سر پھوڑتے دیکھ کر مسرور ہوتے ہو کہیں طوفان نہ بن جائیں ڈاکٹر میں پاگل ہو جاؤں گی۔ جو گیسو کسی کے شانوں پر نہ لہرا سکیں انہیں کاٹ کر پھینک دو۔ مجھ سے زندگی چھین لو مجھے اس دولت کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ کرنیں۔ کیا پھر اجالا ہو گا؟ مجھے پتھر کے ٹکڑے دے کر کیوں بہلاتے ہو؟ میرے موتی مجھے واپس کر دو بابا ــ بابا (چیختی ہے) کھڑکی کھول دو کہ ہوا کے جھونکے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھا دیں۔ بابا کھڑکی کھول دو۔

سونی:۔ چندرا ــ

بھولا ناتھ:۔ میں آ گیا میری بچی۔ ڈاکٹر بھگوان کے لئے میری امید نہ توڑنا۔ (بھولا ناتھ اور ڈاکٹر جہیش داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر:۔ (مریضہ کو دیکھتے ہوئے) آخر طوفان آ ہی گیا۔ موت اور زندگی کا یہ کھیل بھی کتنا انوکھا ہے۔ ہونہہ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) انوکھا اور پیارا بھی ــ بھولا بابا۔ کسی بڑے داخلی

صدمے نے یہ حالت بنا دی ہے۔

سونی:۔ سنا تم نے بابا ــ چندرا من ہی من میں کڑھ رہی ہے

ڈاکٹر:۔ ش ــ ی ــ ی ــ (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کرتا ہے) تکلیف نہ ہو تو ذرا باہر ــ

سونی:۔ (دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

ڈاکٹر:۔ چندرا۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں کون ہوں۔

چندرا:۔ کون ڈاکٹر؟ تم یہاں کیوں آئے؟ مجھے بچاؤ ڈاکٹر بھگوان کے لئے مجھے بچاؤ۔

ڈاکٹر:۔ میں تمہیں بچاؤں گا ــ بھگوان تو دنیا والوں کا دکھ دیکھتے دیکھتے پتھر کے ہو گئے ہیں مگر میں پتھر نہیں ہوں۔ جو کچھ تم پر گذر رہی ہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ جوانی جب ایک بار جاگ اٹھتی ہے تو پھر موت ہی اسے سلا سکتی ہے۔ چندرا ــ

چندرا:۔ ڈاکٹر تم مجھے سو جانے دو۔ یہ چٹانیں ــ یہ مہیب چٹانیں خوفناک دیوؤں کی طرح گرز تانے میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔ ڈاکٹر مجھے سو جانے دو۔ تم نے مجھے کیوں جگا دیا۔ ڈاکٹر ــ (رحم طلب نظروں سے دیکھتی ہے)

ڈاکٹر:۔ چندرا ــ میری رانی۔ میں تجھے یہ جھوٹی نیند نہ سونے دوں گا (اور ڈاکٹر کی انگلیاں چندرا کے بالوں سے کھیلنے لگتی ہیں) آج میں تجھ پر ان کرنوں کے دروازے کھول دوں گا جو دو روزہ زندگی کو امر بنا دیتی ہیں۔

چندرا:۔ ڈاکٹر ــ میرے راگی ــ آخر تم نے ۔ اکبر کرید ہی ڈالی لیکن ان شعلوں میں مجھ بدنصیب کلی کو نہ جلا دینا۔

ڈاکٹر:۔ یہ شعلے ــ ؟ جی چاہتا ہے انہیں شعلوں کی مدھم آنچ میں عمر گزار دوں رانی یہ ہم پر کتنا مہربان ہے۔ (ڈاکٹر چندرا کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے) (اور چندرا کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتا ہے۔ ایک مسرور آواز پس منظر میں آہستہ آہستہ ابھرتی ہے)

وقت کے دھارے ــ وقت کے دھارے
تھم جا تھم جا ــ دم بھر پیارے
ڈوبنے والوں نے پائے ہیں پھر سے کھوئے سہارے

جیون کے آکاش پہ چمکے ڈوبے چاند ستارے

(اور پھر بھولا ناتھ اور سونی کی آواز ابھرتی ہے لیکن پس منظر میں گیت برابر جاری رہتا ہے)

سونی :- یہ دلیپ ہے ماما۔ تم اس کی خوشیوں کا اندازہ کر سکتے ہو۔ اس نے ایک ودھوا سے شادی کی ہے۔ میں خوش ہوں اس کا ضمیر جاگ رہا ہے اس کے جسم میں ایک تعمیر پسند یگ کی روح ہے۔

بھولا ناتھ :- ودھوا سے شادی کی ہے۔

سونی :- ہاں ——— صدیوں کے بعد اس نے اس چٹان کو توڑا ہے جو چندرا جیسی لاکھوں بے زبان لڑکیوں کی راہ میں حائل تھی۔

بھولا ناتھ :- مگر یہ پاپ ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ چندرا کو گھٹ گھٹ کر مر جانے دو۔ یہ میرے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔

سونی :- تو ڈاکٹر کو کیوں بلا رہے ہو؟ جاؤ اس کا گلا گھونٹ دو۔ جاؤ اس کا گلا گھونٹ دو ———

بھولا ناتھ :- مگر سونی — یہ میرے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ میں چندرا کی دوسری شادی نہ ہونے دوں گا۔

سونی :- زندگی کا یہ سفر بھگوان جانے کتنا طویل ہو؟ اور ایک کمزور لڑکی! نہیں یقین ہی ماما وہ اس سفر کو تنہا طے کر لیگی کہیں وہ راہ بھٹک گئی تو کیا ہوگا ماما — جواب دو تم کیسے باپ ہو۔ اپنے ہاتھوں اولاد کا گلا گھونٹ رہے ہو۔

بھولا ناتھ :- میں باپ نہیں ہوں — میں باپ نہیں ہوں میں چندرا کا گلا گھونٹ دوں گا

ڈاکٹر :- کیا ہے ———؟

بھولا ناتھ :- کچھ نہیں — کچھ نہیں — میں ایک باپ ہوں ——— میں ایک باپ ہوں۔ دلیپ کتنا خوش ہے۔ میں اس کی خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس نے ایک ودھوا لڑکی سے بیاہ کیا ہے مگر بھگوان [illegible] کیا تم یہ سب برداشت کر سکو گے؟ بھگوان مجھے ان ہاتھوں سے بچا [illegible] پاگل ہو جاؤں گا ——— مجھے بھاگ جانے دو ——— (وہ باہر نکل جاتا ہے)

x x x

منظر چہارم ——— گاؤں سے باہر کھیتوں کا طویل سلسلہ گاؤں سے باہر کھیتوں کا طویل سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ دوپہر میں سورج اپنا پیلا چہرہ چھپانے کی تیاری کر رہا ہے۔ تیز تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ پورے ماحول پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ درختوں کی پتیاں ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر خوفناک آوازیں پیدا کر رہی ہیں۔ چودھری اور بھولا ناتھ کھیت کی مینڈ پر بیٹھے مصروف گفتگو نظر آتے ہیں ———)

چودھری :- بھولا ناتھ۔ سورج ڈھلتا جا رہا ہے۔ دن کی کمر ٹوٹ رہی ہے

بھولا ناتھ :- دیکھ رہا ہوں چودھری۔ آج کی شام بھگوان جانے کیوں اتنی اداس اور سنسان ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مر گیا ہو! اندھیرا وقت سے پہلے ہی بڑھ رہا ہے۔ معلوم نہیں اجالے کی کوئی کرن کبھی طلوع ہو گی؟

چودھری :- اجالے کی کوئی کرن ——— معلوم نہیں بھولا ناتھ انسان کی فطرت اجالے کی تلاش میں کیوں رہتی ہے۔

بھولا ناتھ :- زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے چودھری کون اس کی گردش سے بچ سکے گا؟ بھگوان ہی جانے . . . . . سنا تم نے چودھری؟ دلیپ نے ایک ودھوا سے بیاہ کیا ہے۔ زمانہ بدل گیا چودھری۔

چودھری :- میں نے سنا ہے بھولا ناتھ ——— اور میں نے اسے آشیرواد بھی دی ہے۔

بھولا ناتھ :- آشیرواد ——— تم نے چودھری ———؟

چودھری :- ہاں میں نے ———

بھولا ناتھ :- یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

چودھری :- بھولا ناتھ ——— میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں غلط بہر حال غلطی ہے چاہے وہ میں کروں یا میرے باپ دادا ——— میں دلیپ کو آشیرواد نہ دیتا تو وہ اس کا من چھوٹا ہو جاتا [illegible] [illegible] ہوا اگر میں اس سے خوش ہوں۔ تم اسے بگاڑ رہے ہو اور میں دیکھ رہا ہوں اس بگاڑ میں بناؤ کا پہلو زیادہ نمودار ہے۔ ذرا سوچو تو! تم ہنسنا چاہو اور تمہارا ہونٹوں سے زبردستی ہنسی چھین لی جائے تمہیں رونے پہ مجبور کیا جائے اور پھر بھگوان کا نام لے کر۔ یقیناً یہ ظلم ہے جسے ہم نے اور تم نے برداشت کر لیا۔ مگر ہماری اگلی نسل میں دیکھتا ہوں وہ نہیں برداشت کر سکتی۔

بھولاناتھ:- تم کچھ بھی کہو چودہری۔ دلیپ میری نظروں سے گر گیا اور اس سے زیادہ وہ لڑکی جس نے اپنے خاندان کی عزت کو مٹی میں ملا دیا۔

چودہری:- عزت ـــــ؟ تم اسے عزت کہتے ہو؟ تمہاری لڑکی بھی تو بیوہ ہے، میری طرف دیکھو! کیا تم اسے کبھی دیکھ کر خوش ہوئے؟ ـــــ تو پھر یہ عزت کس کام کی؟ دل میں دکھوں کی چتا اور ہونٹوں پر جھوٹی مسکراہٹ۔ ممکن ہے تم اسے سچی خوشی سمجھتے ہو مگر میرا دل تو کڑھتا ہے۔ بھولاناتھ اگر چندرا میری بیٹی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی دوسری شادی کر دیتا لیکا ہوا پھوڑا تو بہر حال پھوٹ کر ہی رہتا ہے تمہیں چندرا پر وشواس ہے تم سمجھتے ہو وہ ساری عمر بیٹھ کر گزار دے گی لیکن اگر کوئی دوسری لڑکی اس وشواس کو قائم نہ رکھ سکی اور بھرا ہوا پیالہ چھلک گیا تو؟ ـــــ تو کیا ہوگا بھولاناتھ؟ کیا تم اس وقت بھی سر اونچا کرکے اپنے خاندان کی عزت کے گیت گا سکو گے۔؟

بھولاناتھ:- چودہری ـــــ

چودہری:- میں جانتا ہوں بھولاناتھ تم پریشان ہو! لیکن میں کہتا ہوں تم چندرا کا بیاہ کر دو۔ سچی عزت تو وہی ہے جس پر آدمی کا دل مسرور کیا۔

بھولاناتھ:- چودہری ـــــ! یہ میری عزت کا سوال ہے چودہری ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔ میرا گلا گھونٹ دو۔ چودہری مجھے اس کشمکش سے نجات دلاؤ۔ میں مرجانا چاہتا ہوں۔ میں مرجانا چاہتا ہوں ـــــ مجھے کہیں چین نہیں ـــــ (بے تحاشا بھاگتا ہے)

چودہری:- پاگل (معنی خیز انداز میں) بھرا ہوا پیالہ چھلک گیا تو؟ تو کیا ہوگا؟ اندھیرا بڑھ رہا ہے ـــــ بوڑھے! اندھیرے اُجالے کی اس کشمکش میں ڈگمگا نہ جانا ـــــ (چلا جاتا ہے) (وقفہ)

(تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر مہیش داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر:- وہ ابھی تک نہیں آئی۔ میری ننھی سی آ۔ میں نے تجھے سپنے دیکھنا سکھلایا ـــــ تو سمجھتی ہے۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ ہونہہ! محبت ... بیکار اور لغو تیز ـــــ

میں عمل کا قائل ہوں۔ دنیا کی ہر عورت مرد کے لئے ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس سے لطف اندوز ہو۔ اگر یہی محبت ہے تو اچھا ہے یہ حسین پردہ کبھی نہ اٹھے۔ بھگوان نے دنیا کو پاپ اور پُن کی زنجیروں میں کس کر جہنم بنا دیا ہے ہو تم بھگوان ـــــ میں اس جہنم کو پھر جنت بناؤں گا۔ پاپ اور پُن کی یہ بوسیدہ زنجیریں ٹوٹ کر رہیں گی۔ وہ آ رہی ہے۔ ستار کے خوابیدہ تار، کوئی ایسا راگ چھیڑو کہ وقت کا پُر شور طوفان تھم جائے اور لطف و لذت کی وہ گھڑیاں جو چندرا کے ساتھ بسر ہوں امر ہو جائیں۔ آؤ ـــــ چندرا آؤ۔

چندرا:- مگر ڈاکٹر ـــــ؟

ڈاکٹر:- یہاں کوئی نہیں۔ میں ہوں اور تم ہو۔ دلوں کی کچھ دھڑکنیں ہاتھوں کی لرزشیں یہی ہماری آج کی رفیق ہیں ـــــ اور قریب آؤ چندرا۔ ہوا درختوں سے لپٹ کر سو گئی ہے۔ کیا تم میرے دل کی پکار نہیں سن رہیں؟۔

چندرا:- مجھے ڈر لگ رہا ہے ڈاکٹر

ڈاکٹر:- میں جانتا ہوں تمہیں ایک سہارا چاہیئے۔

چندرا:- ہاں ـــــ ڈاکٹر وہی گیت سناؤ جو اس روز سنا رہے تھے۔ مت اتنا گھبرائیے۔

ڈاکٹر:- نہیں ـــــ آج میرے ستار کے تاروں سے مسرت کے نغمے اُبل رہے ہیں آج میں وہ غمگین گیت نہیں سنا سکتا ـــــ ارے تم اب بھی سو رہی ہو اور تمہاری جوانی؟ نہ جانے کب میں اسے جگا چکا ہوں! چندرا

چندرا:- ڈاکٹر ـــــ میں سوچتی ہوں ـــــ انسان اتنا مجبور کیوں ہے؟ وہ ہنسنا چاہتا ہے۔ مگر نہیں ہنس سکتا من کے ساگر میں دبے سروں میں مسرت کے گیت گاتی ہوئی لہریں اٹھتی ہیں مگر کنارے پہنچتے پہنچتے فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے۔

ڈاکٹر:- کچھ بھی نہیں چندرا ـــــ آدمی خوش رہنا چاہے تو کون ہے جو اُسے رونے پر مجبور کرے ـــــ ہماری پریشانیوں کی جڑ ہماری پابندیاں ہیں۔ ان پابندیوں کو توڑ دو پھر

خوشی ہی خوشی ہے۔ سماج نے تمہاری خوشیاں چھین لی ہیں!
کیوں؟ ــــ کیا دو عورتوں کو ہنسنے کا کوئی حق نہیں ــــ یہ ظلم
نہیں تو اور کیا ہے؟ چندا من ہی من میں گھٹنے سے فائدہ ـــ؟
میں کہتا ہوں ایسی سماج کو توڑ دو ـــ ہنسو! اور خوب ہنسو!
یہی ایک صورت سماج سے انتقام لینے کی ہے۔

چندرا:۔ مگر میں ایک کمزور عورت ہوں۔

ڈاکٹر:۔ کون تمہیں کمزور کہتا ہے۔ یہ تو ایک مفروضہ ہے کہ عورت کمزور ہے جسے مردوں نے عورتوں کے دماغ پر مسلط کر دیا ہے چندا ہم ایک نئی صبح کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی نئی صبح جس میں انسان آزاد ہوگا جیسا کہ وہ آزاد پیدا ہوا ہے صدیوں کے کچلے ہوئے مزدوروں کی حکومت ہوگی۔ مزدوروں کے لئے ــــ مردار خور سرمایہ داروں کا اس دنیا میں کوئی کام نہ ہوگا ــــ مگر چندرا ــــ یہ صبح زندگی کے افق پر جب ہی طلوع ہو سکتی ہے جب ہم پرانے رسم و رواج کے خلاف بغاوت کر دیں وہ ساری رکاوٹیں جو دلوں کے درمیان حائل ہیں انہیں دور کر دیں۔

چندرا:۔ ڈاکٹر ہوا تیز ہوتی جا رہی ہے کیا طوفان آ کر ہی رہیگا۔

ڈاکٹر:۔ ضرورت ــــ ہر بناؤ کے لئے بگاڑ ضروری ہے۔ اور سپلوچ کی رات یہ رات ہماری زندگی میں یادگار رات ہے۔ آج کے بعد ہم دونوں کی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع ہوگا اسی قسم کے طوفانوں کے بعد تو امن شانت ہوتا ہے۔

چندرا:۔ مگر یہ طوفان ــــ یہ میری زندگی کی جڑیں ہلا دے گا۔ ڈاکٹر اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے گھر جانا چاہئے۔ میں ایک کمزور عورت ہوں۔

ڈاکٹر:۔ نہیں ــــ آج تمہیں سہارا مل گیا چندرا۔ (ہوا اور تیز ہو جاتی ہے) (آسمان پر سیاہ بادل چھا جاتے ہیں۔

چندرا:۔ طوفان آ رہا ہے ــــ طوفان آ رہا ہے۔ بادل کی خوفناک گرج کے ساتھ بجلی چمکتی ہے) ــــ اُف۔ ڈاکٹر ــــ (چندرا چیخ مار کر ڈاکٹر کی آغوش میں گر جاتی ہے) پردہ

× × ×

منظر پنجم:۔ ڈاکٹر مہیش کے کمرہ کے سامنے کی پھلواری۔

یہ ایک با سلیقہ پھلواری ہے جو ڈاکٹر مہیش نے اپنے کمرے کے سامنے لگائی ہے۔ مختلف رنگوں کے پھول ڈالیوں پر جھوم رہے ہیں۔ سوفی داخل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نظر نہیں آتا اس لئے پھولوں سے دل بہلانے کی کوشش کرتی ہے۔ سوفی کے چہرے سے انتشار برس رہا ہے۔ جیسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہو لیکن ضبط کرنے کی کوشش شدت سے جاری ہے)

سوفی:۔ یہ رنگین اور خوبصورت پھول۔ اب تو مجھے ان سے بھی نفرت ہوتی جا رہی ہے آہ یہ گلاب کی حسین کلی ــــ رنگ و بو اور نزاکت! ننھی سی نیند میں سو رہے ہیں۔ لیکن اس کے پہلو کا کانٹا۔ (ڈاکٹر مہیش آتا ہے)

ڈاکٹر:۔ اوہ سوفی ــــ بہار بن کر آئی ہو میرے اجڑے باغ میں ــــ؟ میری زندگی کی روشنی تو آگئی۔ اب میں نہیں گر سکتا۔ میرا سہارا میرے ساتھ ہے (قریب آ کر) سوفی! (سوفی نفرت سے منہ پھیر لیتی ہے) میرا چاند مجھ سے خفا ہے۔ مگر میرا جرم

سوفی:۔ ڈاکٹر ــــ مجھے ان نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ ان میں دغا بازی جھلک رہی ہے تم نے چندرا کو لوٹ لیا ہے بھگوان کے لئے یہ جرائم بھرے ہاتھ میری طرف نہ بڑھاؤ۔

ڈاکٹر:۔ سوفی ــــ حد سے نہ بڑھو ــــ میں نے چندرا کو لوٹ لیا ــــ؟ کسی کمزور کو سہارا دینا برا تو نہیں؟ سوفی ڈوبتی ہوئی کو بچا دینا اگر پاپ سمجھتی ہو تو سمجھا کرو۔

سوفی:۔ تم نے ایک کمزور کو سہارا دیا۔ یہ الفاظ تمہارے دل سے نکل رہے ہیں۔ ہاں وہ تمہارے ساتھ چل مرتی اگر تم اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتے ــ مگر میں جانتی ہوں تم تو رس چوسنے کی حد تک ہی کسی پھول کو پسند کرتے ہو!

ڈاکٹر:۔ ہاں ــــ اور زندگی اسی لذت اندوزی کا نام ہے۔ پابندیاں انسانیت کے پاؤں کی بیڑیاں ہیں جو اُسے مفلوج بنا دیتی ہیں

سوفی:۔ تمہارا یہ جادو اب نہیں چل سکتا۔ میں نے تمہاری نئی صبح کی حقیقت بوجھ لی۔ تم انسان کو جانور بنا دینا چاہتے ہو تم انسان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہو؟ تم جانور ہو! دنیا کے ذلیل ترین جانور ــــ

ڈاکٹر:۔ سوتی ــــ (ہونٹ دانتوں کے نیچے دبا لیتا ہے) (اور بیقراری سے ٹہلنے لگتا ہے)

سوفی:۔ خاموش ــــ کتے ــــ میں جانتی ہوں تیرا من رات کی سیاہی سے زیادہ بھیانک اور تاریک ہو چکا ہے۔ تیرے ضمیر کی آواز موت کی نیند سو چکی ہے۔ تو نے اور تیری "نئی صبح" کے خواب دیکھنے والوں نے چندرا کو لوٹ کر ٹھکرا دیا۔ تیرے قریب میں آکر اس نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا۔ میں تجھے خوشخبری دینے آئی ہوں کہ اس نے خودکشی کر لی۔ چندرا نے خودکشی کر لی۔ وہ دیکھ پورب میں اس کی چتا کے شعلوں سے اب تک اجالا ہو رہا ہے۔ بھیڑیئے وہ تیرے پاپ کو کہاں چھپاتی اور کیسے چھپاتی ــ

ڈاکٹر:۔ خودکشی ــــ قاہ قاہ ــ قاہ (قہقہہ) پاپ اور پن کا یہ تخیل، ابھی لوگوں کے دماغوں میں زندہ ہے۔ ابھی نام نہاد انسانیت سسک رہی ہے۔ کب اس کا آخری سانس پورا ہوگا

(بھولا ناتھ اور بنسی داخل ہوتے ہیں)

بھولا ناتھ:۔ کہاں ہے وہ ڈاکٹر کا بچہ ــــ تو ہے تو ــــ تو نے ہی اُسے دواؤں میں زہر پلایا ہے۔ لا میری چندرا کو۔ کہاں چھپا رکھا ہے تو نے اُسے ــــ؟

بنسی:۔ بول ڈاکٹر کے بچے۔ کہاں ہے وہ؟

ڈاکٹر:۔ مجھ سے پوچھنے آتے ہو؟ ہا ہا ہا ــــ (بہت زور سے ہنستا ہے) مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ جاؤ ــــ جاؤ اپنی اسی دقیانوسی سماج سے پوچھو۔ جس نے اس جیسی لاکھوں جوانیوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے ــ وہ مظلوم تھی میں نے اس کے احساس کو جگا دیا اور تم اس طرح اس کا بدلہ چکانے آئے ہو۔

بھولا ناتھ:۔ تم نے مجھ بوڑھے کی لاٹھی چھین لی۔ ڈاکو! تو نے مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا ہے ــ تو اپنے نئے محلوں کی بنیاد ہمارے کھنڈروں پر کیوں رکھتا ہے؟

بنسی:۔ تو نے اُسے دھوکہ دیا ــ میں تیرا سر توڑ دوں گا ــ انیائی کہتا تھا اگر بھگوان ہیں تو بڑے انیائی ہیں کسی کو ہنساتے ہیں اور کسی کو رلاتے ہیں۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اُسے آزاد رہنے دو۔ ہونہہ۔ آزاد رہنے دو ــ تاکہ وہ

جانور ہو جائے۔ اور تیری طرح جو چاہے کرے۔ میں تیرا سر توڑ دوں گا۔ ہوشیار ہو جا۔ انیائی۔

چودھری:۔ (جو عین اسی وقت دلیپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھے داخل ہوتا ہے) بنسی! کیا کرتا ہے مورکھ ــــ؟ ہم جس کو پناہ دیتے ہیں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے میں جانتا ہوں بھولا ناتھ! تمہاری کمر ٹوٹ گئی ہے میں نے کہا تھا کہ پیالے بھر جائیں گے تو کیا ہوگا؟ پیالے بھر گئے تھے چھلک گئے ــــ پکا ہوا پھوڑا کب تک نہ پھوٹتا۔ دلیپ سچ کہتا ہے ــــ ہمیں ایک ایسے راستے کی ضرورت ہے جس پر چل کر ہم شانتی حاصل کر سکیں ــ

دلیپ:۔ بھولا بابا ــــ بابا دلیپ تمہارے سامنے ہے تم اسے جو چاہو کہہ لو۔ تم نے کبھی بھی میری آتما کو دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ میری آنکھوں نے اُفق پہ "وہ کرنیں" دیکھ لی ہیں جو دنیا میں اُجالا پھیلا سکتی ہیں ایک انتہا وہ تھی جس کی حفاظت کے لئے تم نے چندرا کو گنوا دیا اور ایک انتہا وہ ہے جس کی طرف ڈاکٹر بلاتا ہے۔ لیکن روتی ہوئی آنکھ نہ اس وقت ہنس سکی اور نہ اب۔ فطرت انسانی کو اس درمیانی راستے کی تلاش ہے جس پر چل کر اُسے شانتی کی منزل مل سکے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے راستے ہمیشہ ہمیں بھٹکاتے رہے ہیں اور بھٹکاتے رہیں گے۔

(ڈاکٹر آہستہ چپکے سے کھسک جاتا ہے سب لوگ حیرت سے دلیپ کا منہ تک رہے ہیں۔)

★ ★



کبھی زندگی سکوں ہے کبھی زندگی تلاطم
کبھی پاس آگئے تم، کبھی دُور ہو گئے تم

تو ہے شب زدہ مسافر نہ ہو سوزِ دل سے غافل
تری منزلوں سے پہلے ہے فریبِ ماہ و انجم

تجھے کیا خبر کہ کیا ہے میرے درد کی حقیقت
میرا سوز عین راحت میرا غم، غمِ تبسم

نہ خرد تری خرد ہے، نہ جنوں جنوں ہے ورنہ
تری وسعتوں میں ناداں تری منزلیں بھی ہیں گم

میری دُور رس نگاہوں کو ہے جستجو کسی کی
تمھیں رنگ و بُو مبارک، مرے رہنما نہیں تم

مجھے مضطرب کئے ہے، ابھی جستجوئے انساں
تجھے بے خبر ابھی سے ہے تلاشِ ماہ و انجم

نہ ہو غم زدہ مسافر میں یہ راز فاش کردوں
کہ یقیں بھی جلوہ گر ہے پسِ پردۂ توہم

(ادارۂ ادب اسلامی [illegible] پڑھی گئی)

حفیظ میرٹھی

ہائے اس دوریٔ منزل پہ یہ اندازِ خرام
کارواں، موجِ رواں، سیلِ رواں ہوجاتا

تو نے اچھا کیا سمجھا نہ تقاضائے حیات
سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہوجاتا

جلوہ پھر جلوہ تھا پنہاں ہی مستور رہی
دیکھتے رہتے یہاں تک کہ عیاں ہوجاتا

مٹ گیا باغ سے ناموسِ خودی کی خاطر
گُل کہاں رہتا جو ہمرنگِ خزاں ہوجاتا

کیا ارادہ ہے غمِ کوچۂ جاناں والو!
اب تو یہ غم، غمِ تعمیرِ جہاں ہوجاتا

لطف کے رنگ میں آیا ہی نہیں ظلم ابھی
ضبط بھی ضبط نہ رہتا یہ فغاں ہوجاتا

اک طرف موت ہے، اک سمت ہے توہینِ حیات
ہاں تو پھر فیصلۂ سُود و زیاں ہوجاتا

جوہرِ فن بھی کوئی شے تھی نمائش کی حفیظ
تم عیاں کرتے نہ کرتے یہ عیاں ہوجاتا



محمد وارث کامل

امروز و فردا

مستِ نگاہِ نرگسِ مستانہ بن کے جی — حُسنِ نظر فریب سے بیگانہ بن کے جی
اے رہ نوردِ جادۂ امروز! زینہار — گُم کردہ راہ منزلِ فردا نہ بن کے جی
سو سو بگاڑ ہوتے ہیں اک اک بناؤ میں — ناداں! نظر نظر کا تماشا نہ بن کے جی
مٹتے نہیں نقوشِ حقیقت دبے ہوئے! — حرماں نصیب! دامِ نہ بن دانہ بن کے جی
روزِ ازل سے تو ہے پرستارِ لا الٰہ — سرگشتۂ خمارِ مئے لا نہ بن کے جی
انساں وہ کیا کہ جس سے کوئی خوش نہ رہ سکے — جو چاہے بن کے جی مگر ایسا بن کے جی
یزداں پرست پیروئ اہرمن غلط — ہرگز فریب خوردۂ دنیا نہ بن کے جی
بارِ گراں ہیں دل پہ جہاں کی حقیقتیں — رنگینئ حیات کا افسانہ بن کے جی

کامل شعور ہے تو کہاں لطفِ زندگی
جینے کی آرزو ہے تو دیوانہ بن کے جی

●

ادارۂ تعمیر پسند مصنفین میرٹھ میں پیش کی گئی۔

عزیز احمد



گیا دورِ خزاں پھر غنچہ و گُل پر بہار آئی
پیامِ فصلِ گُل لے کر نسیمِ خوش گوار آئی

رہا جب جب خرد کا آستاں مسجودِ انساں کا
زمانہ اس کا شاہد ہے تباہی بار بار آئی

زمانہ کو نہ آیا راس آخر دورِ چنگیزی
تشدد کا فسوں ٹوٹا ترحّم کی پکار آئی

قیامِ امن کی امید کب تک آپ سے کہیے
کوئی تدبیر اب تک آپ کی بر روئے کار آئی

جو مالی تھے وہ جس دن سے چمن کے بن گئے مالک
نہ پھر کوئی کلی چٹکی نہ پھر صوتِ ہزار آئی

ہمارے واسطے تو اس چمن کے پھول ہیں کانٹے
ہمیں کیا چین گلشن میں اگر فصلِ بہار آئی

مری فطرت ہوئی جب سے اسیرِ آشیاں بندی
چمن والوں کے حصے میں قفس سے سوگوار آئی

نجم الاسلام



وہ بھی کیا دن تھے کہ انساں میں خود آرائی نہ تھی
تھی نہ رسوائی جنوں کی عقل سودائی نہ تھی

آج کی سی دہر میں ہنگامہ آرائی نہ تھی
تھی مگر اتنی غمِ دنیا میں پہنائی نہ تھی

ہمتوں پر تھی نہ طاری مُردنی کی کیفیت
جذبۂ غیرت پہ ہرگز بے حسی چھائی نہ تھی

تھا مذاقِ زندگی اس دور کا کتنا بلند
فطرتِ انساں میں ہرگز نالہ فرسائی نہ تھی

آدمی مغرور ہو اتنا تو جب ناداں نہ تھا
بربریت کی کہیں بھی کارفرمائی نہ تھی

فکرِ انسانی نہ تھی اوہامِ باطل کی اسیر
شانِ ایمانی کو فکرِ شانِ دارائی نہ تھی

عشق کیا تھا ضبط و خودداری کا اک پیکر تھا عشق
اور مزاجِ حُسن میں آوارگی آئی نہ تھی

نفرت و وحشت کا دنیا میں نشاں تک بھی نہ تھا
بربریت کی کہیں بھی کارفرمائی نہ تھی

آدمی جیتا تھا بس حق کی رضا کے واسطے
بے یقین و عزم ہوئے جادہ پیمائی نہ تھی

کاش دنیا میں پلٹ آئے وہی دور آج پھر
جس میں سب خوش تھے کسی کو فکرِ رسوائی نہ تھی

ابوالخطیب

فروری ۱۹۵۱ء

ایک تنقید

انوار کا "ادبیات نمبر"

ذیل کا خط انوار کے "ادبیات نمبر" پر ایک تنقید ہے لیکن یہ تنقید ادبیات نمبر سے زیادہ اُس ادب پر ہے جو خدا پرستانہ بنیادوں پر بھارت میں پروان چڑھ رہا ہے۔ تنقید نگار ادب کی تمام قدروں سے واقف ہے۔ خود اُس نے ایک خارزار وادی کو عبور کر کے کھلے میدان میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے۔ اس لئے اس کے نقطۂ نگاہ پر پچھلے راستے کا غبار کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ یہ بات فطری ہے۔ تاہم اُس نے جو مشورے دئے ہیں اور خدا پرست ادیبوں کو جس انداز میں مخاطب کیا ہے قابل قدر ہے۔ اس میں دلبری، انوکھا پن اور افادیت سب ہی کچھ موجود ہے۔ ہم نئے فن کاروں سے عرض کریں گے کہ اس نیز ناقد کی ضرب سے بچ کر نکل جانے کے بجائے ذرا اس سے خراشیں قبول کریں۔ بہت ممکن ہے یہ خراشیں اُن کے ادب میں نئے نقوش اُبھار دیں۔

ادارہ

محترمی!

سلام و رحمت، انوار کا "ادبیات نمبر" ملا۔ مصروفیت کی وجہ سے اپنی پہلی نشست میں اسے بغور نہ پڑھ سکا۔ صرف اہم مضامین، نظموں اور افسانوں پر ... کے لئے نشان لگا کر اُسے آئندہ فرصت کے لئے چھوڑ دیا۔ وہ فرصت مجھے آج مل چکی ہے۔ اس لئے اپنی اس تازہ دمی کی حالت میں اُسے ... کر بیٹھ گیا ہوں ——

نثریات

سب سے پہلی نظر آپ کی انتسابی "دونی" پر پڑی۔ واللہ بڑی چمک رہی تھی۔ جی بے اختیار ہو گیا۔ آخر کار اُسے اُٹھا لیا۔ یقین کیجئے اس دونی کو اسی حساب و کتاب سے خرچ کروں گا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے اس دونی نے میری ہی آنکھوں کو نہیں چُندھیایا بلکہ ہر راہ گیر کی نظر اُس سے ٹکرائی ہوگی۔ انشاء اللہ یہ دونی ضرور ایک تیسرے ادبی محاذ کا ... سل ثابت ہوگی۔ لیکن انتساب کے دوسرے حصے میں آپ کا کنایہ حد درجہ شاعرانہ اور پھبتی خیز ہو گیا ہے جس میں دونی کی سی کھنک باقی نہیں۔ بلکہ آپ کی مخصوص اُبھرتی سنجیدگی بھی پھیکی پڑ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتساب کے دوسرے حصے کو لکھتے وقت آپ کسی اُلجھن میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے اس طرز نے تلخی اور پھبتی کافی اختیار کر لی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ آواز ضرور آج کے جانور نما انسان کے کانوں تک پہنچے گی۔ وہ ... دھیان بھی دے گا۔ کیونکہ خالص مادیت پرستی نے اُسے نہ اُس کی من چاہی دلائی جس کا وہ قرنوں سے انتظار کر رہا تھا۔ اور نہ اس صنعتی ... اس کا کوئی صحیح میلانی مقام متعین کیا۔ جہاں پہنچ کر اپنی اہمیت اور خودی پر غور کر سکتا۔ اس لئے آج اس دنیا میں وہ ہر اس آواز پر غور کرنے ... ہے جو اُسے سُکھ اور اطمینان دے سکے۔ لیکن اگر تُسکھ اُسے پھبتیوں اور طنزیہ جملوں کے ذریعے دیا جائے تو اُسے بھی اُس کا پریشان ذہن ... نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس پھبتی کے فلسفے میں سوائے تضحیک کے اور کچھ نہیں۔ یہ پھبتیاں تو سیاسی دھڑے بندیوں کے ہی کام آ سکتی ہیں۔ ایک داعی حق

... دفتر ماہنامہ انوار، مولوی گنج، لکھنؤ

کو زیب نہیں دیتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ طنز باقی خول آپ کے یہاں غیر شعوری طور پر اکبر کے یہاں سے آیا ہے۔ جو اپنی مقصدیت کے اعتبار سے قطعی صحت مند نہ تھا۔ اکبر تو ایک لٹے پٹے مذہبی طبقے کا مرثیہ خواں تھا، جو چغے اور فرغل پہنے اپنی ڈیوڑھیوں میں بیٹھے نئی نسل پر لعن طعن کر رہے تھے۔ جو اُن کی بات نہ مان کر مادی زندگی کی چکیلی اور ٹیڑھی سڑک پر چل پڑی تھی۔ وہ نئی نسل ان بزرگوں کی بات یوں نہ مانتی تھی کہ اُن کے پاس سوائے تمہیدی باتوں کے ایسا کوئی انقلابی پروگرام نہ تھا جو اس وقت کے مسائل کو حل کر سکتا۔ ان ساختی بزرگوں کے نزدیک اسلام اس کی تہذیب و تمدن صرف چند مخصوص رسم و رواج کے علاوہ کچھ نہ تھے اور وہ انھیں کو کمل بنیادوں پر اپنے بیٹے پوتوں سے چاہتے تھے کہ وہ اُن ایک مخصوص قسم کی وضعداری کی کینوس چڑھا کر اُسے اپنی روزمرہ زندگی کے استعمال میں لے آئیں۔ لیکن کیا یہ اسلام کا صحیح سماجی تصور تھا؟ اس اسلام کا جو اپنے مزاج و فلسفے کے اعتبار سے کسی دوسری بنیادوں پر ٹکنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس نئی نسل نے اکبر کے گروہ کی باتوں پر کبھی کان نہ دھرا۔ بلکہ اُن کی باتوں اور اکبر کے طنزیہ شعروں کو انھوں نے شراب و ناب کے قریب رکھا اور پھر اس کا یہ حال کیا کہ ایک کے ہاتھ میں جام اور دوسرے کی زبان پر اکبر کا طنزیہ شعر۔ اور اسی طرح کے شور و شغب میں اِن تھکے ہاروں کی ناکام زندگیوں کی تمام راتیں بیت گئیں۔ اور مسائل یونہی اُلجھے رہے۔ لیکن جس اسلام کے آپ نمائندے ہیں وہ اپنا مکمل فلسفۂ زندگی رکھتا ہے۔ وہ انسان سے صرف چند مخصوص قسم کی عبادتی حرکات ہی کا مطالبہ نہیں کرتا۔ بلکہ ان حرکات کو وہ سماجی فرض کا ایک ذریعہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ تاکہ اس کے بار بار کے عمل سے انسان کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد آ جائے، کہ وہ ایک اجتماعی مخلوق ہے۔ جماعت بندی میں سب کا بھلا ہے۔ اسی لیے تو جماعت بندی کو اپنی نظریاتی اکائی سمجھ کر اسلام نے صرف اجتماعی احساس ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انسان کے لئے مستقل قوانین وضع کئے۔ جن پر چل کر وہ اپنی اجتماعیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ سوچئے ایسے بنیادی اور نفسیاتی فلسفے کی اشاعت کے لئے کیا ہم تحریر و تقریر کے وہ انداز اختیار کر سکتے ہیں جنھیں سن کر بیمار ذہن حزن و ملال غصہ و پشیمانی اور جنون و وحشت میں مبتلا ہو جائے۔ ہمیں اسلام اہم ([illegible]) کے جوہری عنصر کو سمجھ کر اپنے تحریری اور تقریری انداز وضع کرنے چاہئیں۔ تاکہ ان میں اس کا پورا معنوی جوہر منتقل ہو سکے۔ آپ کے علاوہ کچھ اور نئے لکھنے والے کمیونسٹ تنقید سے بھی غیر شعوری طور پر بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اشتراکی تنقید کا مطالعہ کرتے وقت ان مقاموں پر توجہ نہیں دی جہاں ذہن کو [illegible] پہنچتا ہے، اور وہ ہے ان کی دہشت پسندی، بدگوئی اور الزام تراشی۔ ان کی بعض بعض تحریروں میں الزام تراشی کی فہرست اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ بیچارے لکھنے والے کو یہ تک یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ یہ تنقیدی نقائص کسی چھوٹے موٹے رائٹر ہی میں نہیں پائے جاتے۔ بلکہ لینن سے لے کر گورکی تک اسی قسم کی دشنام طرازی میں مبتلا ہیں۔ وہ مزدور اور کسانوں کو روٹی اور کپڑے کے نام پر بُلاتے ہیں اور مخالفت کا منہ الزام تراشی کے ذریعے بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی سیاسی گاڑی بے روک ٹوک چلتی رہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے آس پاس کے سماجی مسائل کی تحلیل اور تجزیہ کرتے سمے اس ہٹ دھرمی اور غلطی کا کبھی اعادہ نہیں کرنا چاہیئے۔

آپ کا تنقیدی مقالہ ادب میں تحریکیت بہت خوب ہے۔ یہ مقالہ اردو ادب کو انشاء اللہ ایک نئی سمت لے جائے گا۔ اس کی اٹھان بڑی ناقدانہ اور تاثراتی ہے، اور واقعی آپ نے وقت کے بڑے اہم مسئلے کو اُٹھایا ہے۔ مقالے کی ابتدا میں آپ کی نظر نے تحلیل و دلیل سے بڑا اچھا کام لیا ہے۔ تجزیہ بھی پیش نظر رہا ہے۔ لیکن جہاں آپ نے اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھانے کی کوشش کی ہے وہاں آپ کی دلیل او تحلیل نے کمزور پڑ کر ایک شاعرانہ عبارت آرائی کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس مقام پر آپ کا منطقی توازن ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ منطق و دلیل کی اسی مقام پر مقابلتاً زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ زاویۂ نگاہ ادب کے لئے بالکل نیا ہے۔ تفریحی ادب پر آپکی ان ناقدانہ چوٹوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

"ایسا ادب ہمیشہ بڑھے بوڑھوں کی بیٹھکوں اور گاؤں والوں کی رسموں ریتوں، چنڈو خانوں
چرس خانوں اور سیندھی خانوں میں طبلے سارنگی کے ساتھ خوب پھڑکتا ہے۔ مگر جہاں ملکی مسائل حل

ہوتے ہوں بھوکوں کے پیٹ اور ننگوں کے جسم کا سوال ہو جس جگہ خود انسان انسان کے مظالم کا شکار ہو رہا ہو اور خدا
کی سلطنت میں ہر طرف اس کے باغیوں کا راج ہو۔ وہاں یہ ادب اسی لنگڑے لولے اور اندھے بہرے فقیر کی طرح
کمر سے گھسٹ گھسٹ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں اس کے لئے کوئی موقعہ نہیں "۔

اس بھرپور چوٹ میں، آپ کی سنجیدگی۔ اور بذلہ سنجی دونوں متوازن ہیں۔ لیکن میں پھر آپ کے شعری میلان پر چوٹ کر رہا ہوں۔ شاعری کو تنقید میں شامل نہ کیجئے۔ شاعری آدمی سے پرکھ نہیں کرانے دیتی۔ کیونکہ اس کے یہاں مبالغہ زیادہ ہے۔ تیسری تشنگی باقی آپ کے اس مضمون میں یہ ہے کہ جہاں آپ نے فنکاروں آرٹسٹوں اور عام آدمیوں کو خدائی حاکمیت میں آنے کی دعوت دی ہے۔ وہاں اس کی اہمیت کی تفصیل نہیں دی۔ جو لفظ "کیوں"، کی صورت میں اس دعوت کو سنکر پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بے دلیل پیش کش صرف آپ ہی سے آج مخصوص نہیں۔ بلکہ بہت سے مخلص رفیق اس حاکمیت کو اسی طرح سے تحریر و تقریر میں پیش کرتے ہیں۔ یہاں دوسرا سوال یہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ کہ آخر زندگی کے ہر شعبے میں خدائی رہنمائی کیوں؟ اس سے انسان کو کیا مادی فائدہ۔؟ اگر انہی سوالات کو آپ اپنے مضمون میں شامل کر لیتے۔ تو نہ صرف اس مسئلے کی ادبی حیثیت ہی مدلل ہوتی۔ بلکہ اس کی فلسفیانہ توجیہہ بھی متعلقہ شبہات کو دور کر دیتی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان بنیادی توجیہات کی طرف فوراً توجہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ ہماری آج کی موڈرن ایج (Modern Age) کے فلسفیانہ مطالبے ہیں۔ وہ آج ہر نظریہ اسی طرح ٹھوک بجا کر اپنی زندگی میں داخل کرنا چاہتی ہے۔ اس ضمنی سوال کے جواب میں اس اعتراض کا جواب بھی شامل ہو جاتا کہ انسان اپنی پوری ذہنی اور مادی زندگی کو کسی ان دیکھی سماوی قوت کے سپرد کر کے خود اپنی تخلیقی صلاحیتیں کیا ختم نہیں کرے گا۔؟ ان سارے اعتراضات کے پیش نظر ہمیں خدائی حاکمیت کو پیش کرنے کے لئے سائنٹفک طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اس حاکمیت کے تصور میں اس نکتہ کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ کائنات اور زندگی کے بناؤ بگاڑ کے جس طرح اور قوانین ہوتے ہیں۔ جیسے مادے میں حرکت اور تبدیلی کا قانون۔ اسی طرح خدائی حاکمیت بھی اک سماجی اور کائناتی قانون ([illegible]) ہے جس کی رہنمائی میں زندگی بڑھتی اور پنپتی ہے اور جب زندگی اس فطری ڈگر سے ہٹتی ہے تو اس میں بربادی بگاڑ اور گلاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اس مریض معاشرے میں انسانی صلاحیتیں سڑنے لگتی ہیں۔ ہماری تاریخ ہلاکت کے ایسے کئی دوروں سے گزر چکی ہے۔ اور ہمارا حالیہ ہولناک دور بھی اسی گھیرے میں ہے لیکن جب سماج خدائی حاکمیت کے کائناتی قانون کے فطری ڈگر پر چل پڑتا ہے۔ تو انسانی صلاحیتیں اپنے اصل میلانی مقام پر پہنچ کر سماجی خدمات میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اس آپس کے لین دین سے اس میں چمک اور نکھار پیدا ہو جاتا ہے اس کا مادی ثبوت زیادہ واضح اسلامی عہد کے ان ابتدائی چالیس برسوں میں مل سکتا ہے۔ جب قرآن کے آفاقی دستور نے خدائی حاکمیت کے تحت عربی جمہور کو جمع کر کے ایک ریاست کی تشکیل کی۔ یہ چالیس برس کوئی دیومالا نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخ کی مستند کتابوں میں اس وقت کے سماجی کرداروں کا ایک روزنامچہ ہیں۔ جو ابھی تک اپنی انفرادیت اور سماجیت کی بہار دے رہا ہے۔

شعریات

حصۂ نظم میں سعید عقاب نے اپنی نظم "بیزاری" میں شدید غیر مقصدی ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے افق کے پار جانے کے لئے بہت سی اونچی دیواروں کو پھاندنا چاہا۔ اور جنہیں وہ پھاند نہ سکے۔ انھیں گرانے کی کوشش کی ہے۔ انھیں افق کے پار جانے کے لئے پہلے کچھ سوچ لینا چاہیئے تھا اور سوچنے کے ساتھ وہ اپنے آس پاس بھی دیکھ لیتے تو شاید انھیں یہاں بہت سی سماجی تحریکیں مل جاتیں۔ جو ان بیزاریوں کے سد باب کی کوشش میں مصروف ہیں اور خود شاعر کی بیزاری کا سبب بھی بن چکی ہیں۔ یہ ٹکراؤ شاید انھیں یہ بھی بتا دیتا کہ دوسری غیر خدائی تحریکوں کے حل اور اسلامی تحریکوں کے حل میں کیا۔ اور کہاں فرق ہے۔ کاش یہ بھرپور احساساتی نظم اس سماجی تجزیہ سے گزر جاتی۔!!!

ایک سوال یہاں اور پیدا ہوتا ہے کہ پرواز یا ہجرت مادی دنیا سے کیوں کی جائے۔ جس کا مشورہ عقاب صاحب دیتے ہیں۔ آخر بردہ فروش سرمایہ داروں سے نبرد آزمائی کیوں نہ کی جائے۔ کہ جہاں ہر محنت کش کے کچے مکان کے گرتے ہی سرمائے کا محل تیار ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ محنت کش وہاں سے بھی سرک کر اپنی جھونپڑی دوسری جگہ بناتا ہے تو اس جا سے بھی منافع کا سیلاب اُسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ عقاب

صاحب آئیں اور اس سماج کو بدلیں تاکہ ان کو وہ سب کچھ اس سماج میں نہ ملے جوان کی بیزاری کا سبب بن گیا ہے اور اگر وہ ایک اسلامی معاشرہ تعمیر کرسکے تو یقیناً جھونپڑیوں کے محنت کش ان کی زندگی سے محبت بھرے گیت ضرور سن سکیں گے۔ اور پھر ان کی یہ جھونپڑیاں وہ نہ ہوں گی جو سرمائے کے پھیلاؤ سے اپنی جگہ چھوڑ کر گندے نالوں یا کسی مرگھٹ کے قریب بنائی جاتی ہیں۔ آج کے بدحال انسان کو ان ترانوں کی ضرورت نہیں۔ جو اس کی کمر ہمت توڑ کر رکھ دیں۔ بلکہ اسے عزم وجلال کے ساتھ ایسے گیت چاہئیں جو اس سماج کے ڈھانے میں نوکیلی کدال کی جگہ استعمال ہو سکیں۔ ان نوکیلی کدالوں کو دیکھ کر وہ اسے سماجی انقلاب کی ضرورت کا احساس دلائیں۔

اکمل یزدانی کی آزاد نظم (؟) ایک بڑی کامیاب کوشش ہے جس میں بڑے فن کارانہ طور پر صحیح جذبات نگاری کی گئی ہے اندازہ کیجئے مظلوم طبقہ کی خفت و بے چارگی ان مصرعوں میں کتنی ابھر گئی ہے۔

"معاف ہی ہو بابو"

"میرے ننھے بچے کئی دن سے بے آب ودانہ پڑے ہیں"

اور پھر یہ جاگیر دار کا جوابی حملہ

"حرامی کے بچے تیرے واسطے ایک دانہ نہیں ہے، تو انسان نہیں بے ادب جانور ہے، چلا جا یہاں سے۔"

لیکن اس سماجی تجزیہ کے بعد اکمل صاحب صرف سوچتے رہ جاتے ہیں وہ اپنے آس پاس کے ان مظالم کو دیکھ کر صرف سوچا کرتے ہیں۔ کیا انسان پر انسان کے اس ظلم کے انسداد کی تدابیر ان کے پاس نہیں؟ کیا یہ ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ یزدانی صاحب نے بڑا پرانا سبق آدمی کے سامنے پھر کھول کر رکھ دیا ہے۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ ظالم ومظلوم آج دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں کوئی انسانی فرق نہیں۔

یہ ابتدائی سبق آخر کب تک دہرایا جائے گا۔ یزدانی صاحب نے ان میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کہ انسان انسان کی غلامی میں رہ کر اپنے مسائل کو حل نہیں کرسکتا۔ لیکن شاید اس سماجی مطالبے پر یہ اعتراض وارد ہو کہ یہ جانبدارانہ پروپیگنڈہ ہے جس سے ادبی حقیقت نگاری کا گلا گھٹتا ہے تو اس اندیشہ پر میری دوسری گذارش یہ ہے کہ ایسی فراری حقیقت نگاری آج کوئی سماجی حیثیت نہیں رکھتی جو کسی واضح صحت مند نقطۂ نظر کو ظاہر نہ کرسکے۔ آخر اس تجزیہ سے اکمل صاحب کا کیا مقصد ہے۔؟ وہ اپنی نظم کے مخاطب کو کہاں بھیجنا چاہتے ہیں کیا "سرخ عصبیت" کی طرف یا کسی غیر مقصدی دہشت پسندی کی طرف یا بیابان میں سادھو سنت بنانے کے لئے آخر ان کی منزل کہاں ہے؟! —————— دراصل آزاد حقیقت نگاری کے تحت جس غیر جانبداری کا نعرہ لگایا جاتا ہے وہ ایک جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ چال ہے کیونکہ یہ طبقہ اپنے عیش ومفاد کی خاطر ہر چیز کو بے لگام اور آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ گوشت۔ کھاد۔ تمباکو۔ اور دوسری ضروری اشیاء سے لیکر عورت تک ——— تاکہ وقت ضرورت اسے بازار میں ہر جنس آسانی سے مل سکے —————— اس لئے ادب اور فن کو بھی اپنی اس مریضانہ خواہش (جواب ایک فلسفہ کی صورت اختیار کر چکی ہے) کی الجھنوں میں پھنسا کر اس سے اٹھکھیلیاں کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے ہمیں شعوری طور پر ادب اور فن کو بھی دوسرے سماجی علوم اور مادی سائنس کے ساتھ خالص سماجی افادیت اور انقلاب کی طرف لگانا چاہئے۔

ابوالمجاہد زاہد کی نظم "تریب نظر" ہمارے حکمراں طبقہ کے لئے ایک بھرپور چنوتی ([illegible]) ہے اور وہ بھی شاعرانہ اور سنگین لیکن کچھ دقیق ہے۔ اگر مجاہد صاحب اپنے ان تاثرات کو عام زبان میں ادا کرسکیں تو یقیناً ملک کے عوام کو اس کا احساس ہوگا جو آج کانگریسی حکومت سے بیزار بیٹھے ہیں اور جھونپڑیوں میں آواز اسی وقت پہنچے گی۔ جب اُن کی زبان میں یہ مژدہ سنایا جائے گا۔ امید ہے مجاہد صاحب اس عوامی مطالبہ پر غور فرمائیں گے۔

تاج العرفان عثمانی کی آزاد نظم "رفیقۂ حیات" سے "شعریت اور واضح مقصدیت کے اعتبار سے کافی بلند اور پُرتاثیر ہے ان کی اس نظم میں ماضی کے شکوے، کچلی آرزوئیں اور گھٹے ارمان سب ہی کچھ ہے لیکن ان ساری نامرادیوں نے عثمانی صاحب کے دل میں وہ ردعمل پیدا نہیں کیا۔ ایک بے مقصد دہشت پسند ادیب یا شاعر کے دل میں (اپنی ناکامی عشق پر، یا زمانے کے مسلسل دباؤ سے) ہوا کرتا ہے جس کے تحت وہ دنیا کا

سب کچھ توڑ پھوڑ کر جھٹکے سے رومانی فضا میں بھاگ جاتا ہے اور وہیں سے اپنی معشوقہ کو اشارے اور کنائے کرتا ہے اگر وہ اس کی بات پر کان نہیں دھرتی تو پھر لعنتی گداں اس کے گھر پر برستے ہیں ــــــــــــــ اس قسم کے اجتماعی جرم کا اعادہ انھوں نے اپنی نظم میں نہیں کیا بلکہ ان ناکامیوں نے ان میں سماجی ذمہ داریوں کا مزید احساس پیدا کر دیا۔ اور سماجی ذمہ داریوں کے اس احساس کے ساتھ ان میں تفکر اور تدبر بھی ہے وہ ایک سماجی اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر ایکبار مڑ کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ کوئی اور بھی مل جائے۔ جو اس راہ میں ان کا ساتھ دے سکے تو انھیں اپنی رفیقہ حیات عذرا ملتی ہے جس سے وہ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

اب مرے دل میں ہے اک عزم جلیل
ایک واضح ہے تصور میرا
آج پھر معرکۂ حق میں اترنا ہے مجھے
اور شیطان سے ۔ طاغوت سے لڑنا ہے مجھے

- -

پھر ہمارے موجودہ کسالی نظامہائے زندگی کی بساط الٹ کر ایک نئی زندگی کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

پھر میں اس عالم ہستی کا بدل دوں گا نظام
اور ــــــــــــ پھر
آفتاب ایک نیا نکلے گا
اپنی آغوش میں اسلام کی رحمت کو لئے
اور اس نور جہاں تاب سے پھر
جگمگا اٹھے گی دنیا ساری
کیا مرا ساتھ نہ دو گی عذرا ؟
تم اگر آؤ تو اک عزم نیا پا جاؤں
ایک نیا عزم صمیم

افسانہ نگاری

اس مقصدی دوڑ میں ہمارا افسانوی ادب شعری ادب کا ساتھ نہیں دے سکا، تکنیک کی کج روی موضوعات کی کمی اور دوسری افسانوی خصوصیات کا فقدان ہماری ادھک کہانیوں میں بڑا نمایاں نظر آتا ہے اور پھر اکثر کہانیوں پر بیانیہ اسلوبی تیکنیک اس طرح تنی رہتی ہے کہ کہانی کے کرداروں کو خود کہنے سننے کا موقعہ بہت کم ملتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی اسلام پسند ادیبوں کی اپنی آس پاس کی زندگی سے جان پہچان نہیں بڑھی۔ شاید وہ اپنے پڑوسی گھسیٹا کو کوئی افسانوی اہمیت نہیں دیتے جو دن بدن اخلاقی اور معاشی پستی میں جکڑتا جا رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ تانگے والا گھسیٹا اپنی زندگی کی دینی اور مادی قدروں کے مطابق کیا سوچ رہا ہے اور کیوں سوچ رہا ہے۔

کہانی کتابوں سے زیادہ انسان اور اس کے خارجی ماحول کا مطالعہ چاہتی ہے جو اس کے عمل اور ردعمل کا بڑی حد تک ذمے دار رہا کرتا ہے۔ اس لئے ایک افسانوی ادیب کو اپنے سماج کے ہر طبقے سے واقفیت رکھنا چاہیئے۔ اس واقفیت میں اس کے جذبات۔ نفسیات۔ مزاج (اجتماعی اور انفرادی)، رہن سہن کے طریقے اور مخصوص حرکات کا بڑا گہرا جائزہ لینا چاہیئے۔ کیونکہ یہی اجزا جب کہانی میں اپنے مناسب مقام پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ تو اس افسانوی شہ پارے کو اپنے وقت کی Classicality حاصل ہو جاتی ہے لیکن اپنے وقت کے انسان اور اس کے خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ ہمیں دنیا کے کلاسیکل شہ پاروں کو بھی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ہماری ان مذکورہ اجزا کے رکھ رکھاؤ میں صحیح رہنمائی کر سکتے

اس اصولی توجیہ کے بعد مجھے اب ان اسباب کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اسلامی افسانوی ادب کے بگاڑ کا سبب بنے، غالباً اسلامی ادیبوں کے پیش نظر کمیونسٹ اردو افسانہ زیادہ رہا ہے جو ابھی تک خود نامکمل اور ناقص ہے —— کمیونسٹ سیاست نے نہ صرف اردو افسانے کی ہی ہیئت بگاڑی بلکہ دوسری اور بھی ادبی اصناف ان کی باربرداری سے نہ بچ سکیں کمیونسٹ قلم کاروں نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر ادبیات کو —— (Ammunition) کی طرح استعمال کیا۔ اس استعمال میں انھوں نے ان اصناف کے بنیادی اصولی مطالبوں کا بھی خیال نہ رکھا —— بس انھیں ایک کام کرنا تھا —— سرمایہ داری کا اقتداری پتھر کھسک جائے —— اس کھسکاؤ کے لئے ان کے جو ہاتھ پڑا اسے پھینک مارا —— اور اسی مزاجیت ([illegible]) نے ترقی پسندی کی تحریک اور فلسفے کو جنم دیا جو ایک عرصے تک اردو ادب کو مرعوب کرتی رہی۔ پھر بھلا ہمارے نئے لکھنے والے ان اثرات سے خود کو کیسے بچاتے —— اس لئے ہمیں ان تمام کمزوریوں اور ناکامیوں کا خیال کرتے ہوئے صحت مند جدت اور تخلیق کی نشان دہی کرنا پڑے گی —— جس میں ہماری ادبی موروثی اعلیٰ صالح خصوصیات، تاثیر، ہیئت، مواد سب ہی کچھ نکھر کر آئے۔

اگر ہم نے صرف مقصدیت کی دھن میں مواد (Matter) ہی پر ساری توجہ صرف کی تو ہمیں بھی ادبی ناکامی کا ایسا ہی منھ دیکھنا پڑے گا۔ جو آج اشتراکی ترقی پسند ادیبوں کو در پیش ہے۔

لیکن ان ساری ادبی خصوصیات کے ساتھ جدت پر بڑی گہری نظر رکھنا پڑے گی کیونکہ یہ انسان کا جمالیاتی مطالبہ ہے وہ ہر اس چیز میں تنوع چاہتا ہے۔ جسے وہ روزمرہ اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ اس اہم کام کے لئے بھی ہمیں اپنے کلاسیکی ادب اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوی لٹریچر کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ (کیونکہ موجودہ افسانوی خدوخال بالکل یورپی اور بدیسی ہیں۔) خصوصاً افسانے کے لئے ہمیں ان تین زبانوں کے افسانوی ادب کو بڑی گہری نظر سے دیکھنا ہے۔

(۱) انگریزی افسانوی ادب کی کردار نگاری

(۲) فرانسوی افسانوی ادب کی بلند خیالی اور صنعت

(۳) روسی افسانوی ادب کی حقیقت نگاری۔

انگریزی افسانوی ادب انفرادیت کے بڑے فن کارانہ زاویئے دے سکے گا جس کی مدد سے ہم اپنے افسانوی کردار میں رنگ بھر سکتے ہیں لیکن ہمیں ان تمام انفرادی نقطوں کو قبول نہیں کرنا ہے جو اجتماعیت کے لئے نقصان دہ ہوں خصوصاً انگریزی انفرادیت کا اکھل کھرا پن۔ خود پرستی —— ان سماجی نقائص کا اندازہ ہمیں ان صحبتوں میں بھی ہو چکا ہے جو ہم نے ان کے دور غلامی میں اٹھائیں —— ان کی مجلس کا ہر غلام ہندوستانی یہ جانتا ہے کہ انگریز اپنی باہر کی دنیا کو کس نظر سے دیکھتا ہے خود کے مقابلے میں دوسرے کو کیا اہمیت دیتا ہے۔

فرانسوی ادب بلند خیالی فلسفیانہ جستجو اور صنعت کے بہترین نمونے دے سکے گا جس کے لئے ہمیں ان شہرۂ آفاق ادیبوں کی صنعتی رہنمائی قبول کرنا ہوگی۔ بالخصوص والتیر (Voltaire) وکٹر ہیگو (Victor Hugo) مولیاں، بلزاک (Balzac) ایمل زولا، اناطول فرانس وغیرہ کیونکہ روسی نئی کردار نگاری اور واقعہ نگاری جو ترجنیف سے شروع ہو کر گورکی کے ہاتھوں کمال کو پہنچی) انھیں فرانسوی ادیبوں کی رہنمائی کا نتیجہ ہے۔ روسی افسانوی ادب جس گروہ میں ٹالسٹائی۔ گوگول۔ ترجنیف چیخوف گورکی وغیرہ سب ہی شامل ہیں ہمیں خاص توجہ کے ساتھ اپنے مطالعے میں رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس وقت روسی ادب نے ایک خاص راہ پیدا کی۔ اس نے مولیاں اسکول کے افسانوی تحیر کو نکھرتے ہی ختم کر دیا اور اس کی جگہ مقصدیت کو دی۔

چیخوف نے ایک اداس اور بیمار زندگی کو اٹھایا جس میں بظاہر کوئی مانوسیت اور افسانویت نہ تھی بلکہ مقصدیت کی روح نے اس میں ایک عجیب عمل پیدا کر دیا۔ اس کے افسانوں میں انسانی زندگی ہانپتی کانپتی قلم کے سہارے گھسٹتی منزل تک پہونچتی ہے اور وہاں پہونچ کر یا تو اس کے ہوش نہیں رہتے۔ یا پھر وہ دم توڑ دیتی ہے۔ چیخوف نے اپنے زمانے کے غم کی آمیزش سے کہانی کے تحیری عنصر کو بڑی حد تک

واہ ہو یا ———— اس ہمہ امیزش سے ———— جو مسلسل انسان کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اس قسم کی بلند مقصدیت کی اعلیٰ مثالیں اس کی کہانی مشرابی، ولیم یا معیبت اور دوسرے فن پاروں میں مل سکتی ہیں۔

اس کے بعد گورکی آتا ہے جو کردار اور واقعات کے پہلو کو کہانی میں بہت اجاگر کرتا ہے۔ یقیناً اس کے کرداروں میں بھی انفرادیت ہوتی ہے۔ لیکن ایسی مریض انفرادیت نہیں جس کا ذکر ابھی انگریزی افسانے کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ گورکی اپنے افسانوں اور ناولوں میں فرد کے ساتھ اس کا ماحول بھی پیش کرتا ہے اور اس نقشہ کشی میں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فرد کی انفرادیت میں ماحول کتنے رنگ بھرتا ہے۔ ہمیں اس عظیم روسی ادیب کی کردار نگاری کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ لیکن اس کی اس فلسفیانہ کیچڑ سے بھی خود کو بچانا چاہیئے جو وہ جذبات میں بہہ کر ایک فلسفی اور مدبر بننے کی کوشش میں اچھالتا ہے۔ یہ سلسلے تبلیغی مقام اس کے اکثر ناولوں اور افسانوں کے آغاز یا درمیان میں پائے جاتے ہیں جن کا کردار نگاری اور کہانی کے ارتقا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے۔ کہ آج کے افسانوی ادب میں جیتی جاگتی کردار نگاری کا بلاشبہ وہ امام ہے۔ اور اسلامی ادیبوں کو گورکی اور چیخوف کی کرداری صنعت کے زاویوں کو اپنی نئی عمارت کی نیو میں جگہ دینا ہوگی۔ جس سے عمارت کی پائیداری اور جاذبیت بڑھ سکے۔

اس افسانوی ادبیات میں بہہ کر میں بہت دور نکل گیا۔ کیونکہ افسانے کے افسانے کو سنانے کی ضرورت میں ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا۔ تاکہ اسلامی ادب میں ان بنیادی باتوں کا خیال رکھا جا سکے لیکن ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اسلامی افسانہ نگاری ایک احساسی اور سماجی کروٹ لے رہی ہے۔ اور اس کی کئی مثالیں ہمیں اسی ادبیات نمبر میں ملتی ہیں۔ شمس الہدیٰ کا افسانہ مزدور ہی لیجیئے۔ حالانکہ اس میں بھی تکنیک کی خامیاں ہیں۔ لیکن اپنی آس پاس کی زندگی کا احساس کتنا سچا ہے۔ اس سچی ترجمانی کے ساتھ انھیں آئندہ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے قرب وجوار کی زندگی پر تنقیدی نظر ڈال کر اسے افسانوی کینوس میں منتقل کیا کریں۔ تاکہ قاری تک کہانی کا صحیح افادہ پہونچے۔ ادب صرف زندگی کا عکاس ہی نہیں۔ بلکہ وہ اس کا ناقد اور خالق بھی ہے وہ اپنے زمانے کی زندگی کو صرف کاٹتا چھانٹتا ہی نہیں بلکہ سنوار کر اس میں نئی روح بھی پھونکتا ہے۔" یہ کیسے اللہ کے بندے ہیں۔" محترمہ رفعت زہرہ کی ایک تنقیدی ڈائری ہے جس میں تاریخ اور دن شاید انھیں یاد نہ رہا۔ آپ نے اسے افسانوی صورت میں متعارف کرایا ہے لیکن اس میں وہ بنیادی اصول نہیں پائے جاتے جو ایک افسانے کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے اسے ہم ایک ڈائری یا ادبی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس بے تاریخ کی ڈائری میں تنقیدی پہلو بڑا واضح اور قوی ہے۔ رفعت صاحبہ نے اپنی آس پاس کی چیزوں اور ان سماجی گندی مکھیوں کا بڑے قریب اور دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے جو غالباً ہر ہندوستانی گھرانے میں بھنبھنایا کرتی ہیں یہ وادی امائیں اور سماجی امائیں واقعی ایک بہر کھلی نہیں بھبھتیں۔ مجھے اکثر ان کی ان حرکتوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ان مسلم نما جاگیرداروں کی اچکن اور ٹوپی کو بھی نہیں چھوڑا ہے، ہاتھ ان کا وہاں تک بھی پہونچ ہی گیا ———— واقعتاً یہ ان کی اخلاقی اور دینی جرأت ہے اور امید ہے کہ ان کی یہ دینی جرأت دوسری بہنوں کو بھی کچھ کہنے کے لئے اکسا سکے۔ آخر اس طاغوتی نظام کے ڈھلانے میں عورتیں مردوں سے کیوں پیچھے رہیں۔ ان کے بھی کچھ دینی اور سماجی فرائض ہیں لیکن یہ تجزیہ کافی تشنہ اور سطحی ہے۔ کسی سماجی تنقید میں اس کی ان جڑوں کو نہیں فراموش کرنا چاہیئے جس کی وجہ سے اس کے برگ وبار بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ دوسری بات اس ڈائری کے عنوان کے لئے عرض کروں گا۔ رفعت صاحبہ اپنی مخصوص برجستگی عنوان میں برقرار نہ رکھ سکیں حالانکہ زیادہ توجہ ہمیشہ کہانی یا ڈائریوں کے عنوان اور ابتدائی حصے پر صرف کرنا چاہیئے۔ عنوان جتنا ز appealing) ہوگا پڑھنے والے کو اتنا ہی وہ اپنی طرف متوجہ کر سکے گا۔ ایسی ہی تشنگی ہمارے کردار نگار حفیظ احمد خالدی کے متحرک خاکے (جو افسانے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے) "چند گھنٹے شیطان کے ساتھ" میں پائی جاتی ہے اور دوسری کمی خالدی صاحب کے اس خاکے میں یہ ہے کہ انھوں نے اپنا سارا مطمح نظر پہلے ہی سے عنوان کے ذریعہ قاری کے سامنے اجاگر کر دیا ہے ———— ایسی کہانیاں جن میں مقصد کہانی کے اختتام سے پہلے معلوم ہو جائے وہ ناکام بھی جاتی ہیں۔ اس سے دوسرا نقص یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاری کی جستجو انجام کو پا کر ختم ہو جاتی ہے۔ قاری تو کہانی کو اس جذبے کے تحت پڑھتا ہے کہ "دیکھو اب کیا ہوتا ہے"۔ ———— پھر بھی خاکے کے بعض مقام کردار نگاری اور نقشہ کشی کے اعتبار سے ممتاز ہیں مثلاً بال روم ————

نجات اللہ صدیقی کا افسانہ "سرمایہ دار" اسلامی ادب میں ابتدائی افسانوی تکنیک کا دیا کہا جا سکتا ہے یا ان کے اس شہ پارے کو آرٹ کی عملی اصطلاح میں ARCHAI یعنی آرٹ کا ابتدائی عہد کہہ سکتے ہیں۔ جس میں فن اور کمال کے خد وخال اپنی ابتدائی شکل میں ہوتے ہیں اور یہ دور سب کے یہاں آتا ہے جس کی روشنی میں انھوں نے مزدور کا ذہنی تجزیہ، عمل اور رد عمل دکھا کر دکھانے کی کوشش کی ہے اس افسانے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب نے بڑی ناقدانہ نظر سے اپنے آس پاس کا مطالعہ کیا ہے اس کہانی میں صدیقی صاحب کی نظر صرف کردار نگاری تک ہی محدود نہیں رہی جو ان کے افسانوی ہیرو جمن سے متعلق ہے بلکہ انھوں نے ان حرکتوں کی وجہ تحریک بھی اس کے ذہن سے پڑھ لی ہے۔ جو جمن کی حرکت اور سوچ بچار کا سبب بنی ہوئی ہے۔ کہانی کا یہ ہی بڑا بلند مقام ہوتا ہے کہ رائٹر عمل کی وجہ تحریک بھی ساتھ پیش کر دے اور یہ ہی دین اس کی ایک نفسیاتی اور عملی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسری اور بھی افسانوی خصوصیات آپ اس افسانے میں پائیں گے ——— کہانی کا ارتقا اور تجسس، یہ بھی اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جوں جوں کہانی اپنی منزلیں طے کرتی آگے بڑھتی ہے۔ قاری انجام کی فکر میں اس کے ساتھ بے قراری سے بڑھتا چلا جاتا ہے جب وہ کہانی کی آخری منزل پر پہونچ لیتا ہے تو اسے تحیر کن اطمینان ملتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر نجات صاحب اس واقعہ کو ایک طویل مختصر افسانے کی وسعتوں میں پھیلاتے تو شاید پڑھنے والے کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ تبدیلی اس سرمایہ دار میں کیوں آئی جو بظاہر شکل و شباہت، ٹھاٹ باٹ میں کہانی کے مارواڑی سے کسی طرح کم نہ تھا ——— تو یہ صرف ادبی پارہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک مقصدی پارہ بھی بن جاتا۔ اس افسانے میں نجات صاحب نے ایک مسلم خوش حال کو سرمایہ دار کا نام دے کر روشناس کرایا ہے (جو کہ کہانی کا مرکزی نقطہ ہے) لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) پہلا یہ کہ کیا نجات صاحب آج کے سرمایہ دار سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر کسی ایسے صحت مند اور مساواتی نظریے کو قبول کر سکے گا جو اس کے استحصالی کردار کو ختم کر دے۔ ؟

(۲) دوسرا یہ کہ کیا اس سرمایہ دار کو اسلامی ریاست میں اتنی سماجی مراعات حاصل ہوں گی۔ کیا وہ اپنے استحصالی ہتھکنڈے اس آفاقی معاشرے میں استعمال کر سکے گا ؟

میں سمجھتا ہوں کہ اس استحصالی طبقے سرمایہ دار کی اسلامی ریاست میں کوئی جگہ نہیں۔ وہاں کسی قسم کی انفرادیت کو اتنی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ وہ دوسرے کے لئے آزار بن جائے ——— یا یہ انفرادیت پاگل کتے کی طرح سب کو بھنبھوڑتی کاٹتی پھرے ——— اس کی عملی مثال اسلامی حکومت کے ان چالیس برسوں میں مل سکتی ہے ——— اس قرآنی ریاست میں جب کبھی سماجی لوٹ کھسوٹ کے احتمال کا اندیشہ پیدا ہوا تو حکومت نے اپنی گرفت کو اتنا پھیلا دیا کہ اس لوٹ کھسوٹ کو ابھرتے ہی اپنی موت مرنا پڑا۔

جب ہمارے (خوش حال) اور (استحصالی سرمایہ دار) میں اتنا اختیاری اور معنوی فرق ہے تو ہم اس فرق کو اپنی تحریروں میں کیوں ظاہر نہیں کرتے کسی تحریر میں جب لفظ سرمایہ دار استعمال ہوتا ہے۔ تو قاری کا ذہن فوراً اس کے کمینے پن اور استحصال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور مارکس نے بھی اس لفظ کو جہاں استعمال کیا ہے وہاں اس کے ساتھ لوٹ کھسوٹ کو ضروری قرار دیا ہے جو اسلامی ریاست میں قطعی ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے لفظ سرمایہ دار کا استعمال ترک کرنا چاہیئے۔ ورنہ مخالفین کی طرف سے پڑھنے والے کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ کہ دیکھئے صاحب یہ سرمایہ دار سے کچھ امید رکھتے ہیں یا اس کے استحصال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جس نے ہماری زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔ یہ صرف احتمال نہیں ہے بلکہ کمیونسٹ لٹریچر نے یہ حربہ استعمال کیا ہے۔ تین برس تک میں خود اسی بدگمانی میں مبتلا رہا ——— اس لئے ہمیں آج پھر ایک بار ان اصطلاحوں پر غور کر لینا چاہیئے جو اپنی معنوی خصوصیت کے اعتبار سے دوسرے اسکول آف تھاٹس (SCHOOL OF THOUGHTS) سے وابستہ ہیں کیونکہ جب ہماری اسلامی تھیوری میں یہ لفظ داخل ہوتے ہیں تو اپنی معنویت ترک نہیں کرتے جو ہمارے فلسفے کے مزاج سے قطعی مختلف ہیں اس لئے ان کے استعمال سے مفہوم میں خبط اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنے اظہار خیال کے لئے قطعی دوسری اصطلاحوں کو وضع کرنا چاہیئے۔ جو خود اپنا مفہوم متعین کر سکیں ——— الغرض اسلام پسند قلم کاروں اور دانشوروں کا قافلہ اردو ادب میں اپنے خیالوں اور ارادوں کو

لے کر بڑی تیزی سے منزل کی طرف بڑھا رہا ہے ——— کاش اس مقصدی اور اخلاقی جرس کی آواز افلاطون کے کانوں تک پہنچتا جس نے سب سے پہلے ادبیات کو اخلاق اور بلند سیرت کا تابع قرار دیا۔ اور ان اسلامی شعبوں کی کھنک جھنک پر چین بھارت کے مہاودان مہاشے بھرت منی اور مہاشے بھامیہ تک پہونچ جانے چاہئیں۔ جنہوں نے فنکاروں، شعبدوں، درختوں اور رونق کی شائستگی کے حصول کو شاعر کے لئے ضروری قرار دیا۔

فالحمدللہ آج کا ادبی میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ذرا ان کی بساط دیکھئے اور پھر کام دیکھئے ——— یہ خدا کے سپاہی اپنی تلواروں کی دھار تک نہیں دیکھتے ——— بس ڈٹ کر طاغوتی طاقتوں پر گوریلا حملے کر رہے ہیں کوئی للکار للکار کر اپنے آس پاس کی دنیا کو جگا رہا ہے ان کی ہمتوں کو بڑھا رہا ہے۔ نیند کے ماتے اٹھ رہے ہیں دوڑ رہے ہیں ——— بھاگ رہے ہیں اسی قافلے میں شرکت کے لئے ارشد کاظمی "اپنے محبوب" سے اس طرح مخاطب ہو کر اجازت چاہتے ہیں۔

میرے ماحول سے آوازِ فغاں اٹھتی ہے
تیری افسردہ نگاہوں سے بھی واقف ہوں میں
یاد ہیں تیری محبت کے ترانے ——— لیکن
ان محبت کے ترانوں سے نہ بہلا مجھ کو
دیکھ یہ مردہ و افسردہ و بے کس انساں!

میرے محبوب! مجھے اب تو سنبھل جانے دے
اپنے افکار کی تکمیل بھی کرنا ہے مجھے
اپنے ماحول کو تبدیل بھی کرنا ہے مجھے
ہار رہا ہوں سے محبت کے ترانے گائے
میرے نالوں کی خبر سن کے ہیں دوڑے آئے

اسی راہ کا ایک اور مسافر جمال احمد اپنے "آتشیں نغمے" میں اس طرح برستا ہے

جی میں آتا ہے کہ ہر موج کو طوفاں کردوں
خس و خاشاک کو دنیائے گلستاں کردوں

———●———

ادارہ

سحر ہونے سے پہلے

چین اور ادارۂ اقوام

ادارۂ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے جنگ کوریا میں چین کو جارح ------ (AGRESSIVE) قرار دینے کی امریکی قرارداد منظور کرلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب چین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو اقوام متحدہ کے چارٹر کے لحاظ سے ایک جارح کے ساتھ کیا جانا ضروری ہے۔ اس فیصلہ پر روسی بلاک کے حامی برہم ہیں۔ اور ان کو برہم ہونا چاہئیے کیونکہ ادارۂ اقوام نے اس وقت جو فیصلہ کیا ہے وہ امریکی بلاک کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کا نتیجہ ہے حالانکہ اس ادارہ کا سنگ بنیاد بے لاگ فیصلوں کے لئے رکھا گیا تھا۔ لیکن اس معاملہ میں شروع سے ایک ذہنی مغالطہ شامل رہا ہے۔ جب جنگ عظیم ثانی ختم ہوئی تو "انصاف" اور "حق پرستی" کا جھنڈا ان لوگوں کے ہاتھ لگا جو اتفاق سے فاتح تھے۔ حالانکہ یہ فاتح اختتام جنگ سے ایک دن پہلے تک خود اسی طرح ظالم تھے جس طرح جنگ کا دوسرا فریق ظالم تھا۔ ان تمام لڑنے والوں کی اغراض ایک ہی تھیں۔ ہر ایک اپنے اپنے قومی مفاد کی خاطر جنگ کررہا تھا۔ اس میں انسانیت اور حق پرستی کے الفاظ محض پروپیگنڈے کے آلات تھے۔ چنانچہ جیسے ہی جنگ ختم ہوئی۔ اور ان فاتح "حق پسندوں" نے باہمی معاملات کو طے کرنے کے لئے اپنا ایک متحدہ ادارہ بنایا تو اس پر بھی "حق پسندی" کا وہی مصنوعی خول چڑھ گیا۔ ادارۂ اقوام متحدہ اور جنگ عالمگیر میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ جنگ میں فیصلہ سنگینوں اور بموں کے ذریعہ ہوتا ہے اور یہاں دستوری چالبازیوں اور پروپیگنڈے کے دھماکوں سے پہلی "گرم جنگ" کے ختم ہونے کے بعد سے یہ "ٹھنڈی جنگ" پورے زورشور سے جاری ہے۔ اور اب یہ بات اچھی طرح کھل کر سامنے آگئی ہے کہ فاشیت کو ختم کرنے کے لئے جو "اتحادی" ایک "دسترخوان" پر جمع ہوئے تھے خود ان کی اغراض فاشیت سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ کیونکہ جب انھوں نے اپنے معاملات کا تصفیہ شروع کیا تو اسی طرح باہم گتھ گئے جس طرح وہ نازیت اور فاشیت کے خلاف برسرپیکار رہتے تھے۔

ادارۂ اقوام متحدہ کا صحیح اور جائز استعمال صرف اسی وقت ممکن تھا جبکہ اس ادارے کو قوموں کی اغراض کے حوالے کرنے کے بجائے تمام قوموں کو ایک "برتر ضابطے" کے آگے جھکنے پر مجبور کیا جاتا۔ اور بڑی طاقتوں کو حق تنسیخ ---- (VETO) دینے کے بجائے ویٹو صرف غیر جانبدار انصافی عدالت کے پاس ہوتا۔ لیکن اس ادارے کے چلانے والوں میں سے کسی کے پاس نہ ایسا ضابطہ ہے جس کو سب برتر تسلیم کرسکیں۔ اور نہ کوئی ایسا با اخلاق گروہ انسانی سوسائٹی میں سے ابھر کر آیا ہے جو ٹھیک حق پرستی کے جذبہ کے تحت فیصلہ دے سکے۔ ان دونوں کاموں سے پہلے جو قانون خود قانون کا ناجائز استعمال کرنے والوں نے بنایا ہے۔ اور جس کے نفاذ کا حق بھی انھیں جھوٹے حق پسندوں کو حاصل ہے۔ اس میں ہر وقت ایسے رخنے باقی رہیں گے جن سے فائدہ اٹھاکر ایک مکار اور طاقتور قوم دوسری کمزور قوموں کو لوٹ سکے گی۔ اور ان پر ناجائز دباؤ ڈال سکے گی۔ آج روس اور چین کے حامی امریکی قرارداد پر ناک بھنوں چڑھا رہے ہیں۔ لیکن اگر یہی موقع ان کو حاصل ہوتا تو کیا وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسے فیصلے سے چوکتے؟

مسئلۂ کشمیر

مسئلۂ کشمیر کے حل ہونے میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ ادارۂ اقوام متحدہ کیا کررہا ہے اور لیاقت علی خاں اور پنڈت نہرو کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ؟ ان سوالات

پر کافی غور ہوچکا ہے۔ اور اس مسئلہ کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ لیکن اس پر غور کرنے کی ایک شکل باقی ہے کہ اس تنازعہ کے کسی نہ کسی کروٹ بیٹھ جانے کے نتائج مختلف ملکوں اور بلاکوں کے حق میں کیا نکل سکتے ہیں؟ اور کہیں اس کی تاخیر میں ان نتائج کا دخل تو نہیں ہے۔؟!

فرض کیجئے ہندوستان یا پاکستان کسی ایک ملک کے حق میں اس کا فیصلہ ہوجاتا ہے ایسی صورت میں اینگلو امریکی بلاک کو ان دونوں ملکوں پر اپنی سیادت جتلانے اور ان کے درمیان رہ کر "بندر بانٹ" کے فرائض انجام دینے کا ایک اہم ذریعہ ختم ہوجاتا ہے اور اس بات کا امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں ممالک یا ان میں سے ایک اس بلاک کے پنجے سے آزاد ہونے کے لئے فوری جدوجہد شروع کردے اور اس غرض کے لئے کسی دوسرے بلاک سے مل جائے۔ اس خسارے کو اینگلو امریکن بلاک برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کا تو عین منشا یہ ہے کہ یہ قصہ "شب فرقت" سے زیادہ طول کھینچے اور اس طرح بھارت اور پاکستان دونوں اس کی چوکھٹ پر سر جھکائے رہیں۔ یا اگر کوئی فیصلہ ہو بھی تو ایسے حالات میں جبکہ کشمیر مغربی بلاک کی اغراض کے لئے استعمال ہوسکے۔

اب بھارت اور پاکستان پر اس کے اثرات کو دیکھئے۔ اگر پورا کشمیر بھارت والوں کو مل جاتا ہے اور کشمیر کا تصفیہ ختم ہوجاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان کی سرحد پر ایک عظیم خطرے سے نجات مل جائے گی۔ اور اس اہم مسئلہ کے حل ہوتے ہی عوام کی توجہ فوراً داخلی مسائل کی طرف پھر جائے گی اور جو قوتیں مسئلہ کشمیر اور ایسے ہی دوسرے مسائل کی وجہ سے خاموش ہیں وہ اپنے اپنے مطالبات اور نظریات لے کر پوری تیزی سے اٹھ کھڑی ہوں گی۔ یہ صورت حال پورے ملک کی اندرونی فضا کو انتہائی حد تک متغیر کردے گی۔ اسی طرح پاکستان میں موجودہ لیڈر شپ اور قیادت پر سے اعتماد بالکل اٹھ جائے گا۔ اور ایک داخلی انقلاب بالکل یقینی ہوجائے گا۔

اس کے برعکس اگر فیصلہ پاکستان کے حق میں ہو اور کشمیر جموں کو شامل کرکے پاکستان کو مل جائے تو ہندوستان کی موجودہ لیڈر شپ کا خاتمہ یقینی ہے اور پاکستان میں اس سرحدی مسئلہ کے حل ہوتے ہی اندرونی مسائل کے حل کے لئے داخلی کشمکش تیز ہوجائے گی۔ لیکن پاکستان کی اندرونی حالت بہرحال ہند سے اچھی رہے گی۔

اور اگر نتیجہ یہ نکلے کہ کشمیر کسی نہ کسی شکل میں تقسیم ہوجائے تو پھر جس طرح بھارت کے تقسیم ہونے سے مختلف مسائل ان دونوں ملکوں کے انسانوں کو چمٹ گئے ہیں وہ اپنی دوگنی قوت سے اسی طرح اور چمٹ جائیں گے۔ ہندوستان میں بھی داخلی انتشار کی آگ بھڑکے گی اور پاکستان میں بھی داخلی انتشار کی آگ بھڑکے گی۔ اس میں زیادہ نقصان پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کا ہوگا۔ اور ان کے حق میں وہی نتیجہ نکلے گا جو کشمیر کے پوری طرح بھارت کے قبضہ میں چلے جانے سے نکلتا۔ البتہ یہ صورت حال اینگلو امریکن بلاک کے حق میں مفید رہے گی۔

اس جائزے سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل ہونے میں بنیادی رکاوٹیں کیا ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے کسی مسئلہ کو حل کرنے سے پیشتر دونوں ملکوں کے نقطۂ نظر میں زبردست انقلاب آئے۔ دونوں طرف کے عوام اور لیڈر وہی کچھ لینے کے لئے تیار ہوں جو ان کا حق ہے۔ اور دوسرے کو وہی کچھ دیدیں جو اس کا حق ہو۔ بلکہ "حق" کی خاطر ہر ایک اپنا نقصان تک گوارا کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "حق" کہاں ہے۔ اور اس کا معیار کیا ہے۔ ہم اس کو قوم پرستی اور ذاتی اغراض و مصالح کا چراغ لے کر ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ حق صرف انسانیت دوستی اور خدا پرستی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے بغیر حق کا تعین ناممکن ہے۔

ہند کا غذائی بحران

آزادی کے بعد سے ہندوستان کی غذائی حالت دن بدن گرتی جارہی ہے۔ بین الاقوامی تجارت میں ہم دوسروں سے پیچھے ہیں۔ ہمارے سکہ کی قدر ابھی تک برطانیہ کے اسٹرلنگ سے بندھی ہوئی ہے۔ اندرون ملک رشوت خوروں، بلیک مارکیٹ کرنے والوں اور ناجائز نفع اندوزوں نے مہذب ڈکیتی کے ذریعہ عوام کو بدحال کردیا ہے۔ پھر قدرت کی طرف سے مسلسل کوڑے برس رہے ہیں۔ کہیں سیلاب ہے کہیں قحط ہے۔ اور کہیں ٹڈی دل کے حملے ہیں۔ باہر کے ملک اناج دینے میں تساہل برت رہے ہیں۔ عوام بے چین ہیں اور ان کا اعتماد حکومت کے انتظام و

پہلے اٹھنا چاہتا ہے سیاسی پارٹیوں کے لئے موسم سازگار ہے۔ وہ روٹی اور پیٹ کے نام پر عوام کو اپنے ساتھ کر رہی ہیں اور "بھوک" کا نعرہ لگا کر موجودہ اقتدار کے خلاف حملہ بول دینے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ یہ صورت حال انتہائی خطرناک ہے مستقبل کے افق پر سیاہ بدلیاں جمع ہو رہی ہیں نہ معلوم کس وقت دھواں دار بارش شروع ہو جائے۔ اگر ملک کے رہنماؤں نے اس غذائی بحران پر قابو نہیں پایا تو ایک زبردست خلفشار برپا ہو جائے گا۔ اور کسی خارجی خطرے یا بیرونی اندیشے کے بل پر نہ روکا جا سکے گا۔ پہلے سے بدنظمی اور بدامنی کے لئے فضا سازگار ہے۔ "بھوک" کی آگ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ اور مختلف عناصر ایک دم اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اب تک جن طریقوں کو انسانی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ انھیں خیرباد کہہ دیا جائے اور ایسا اصول اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ لوگوں کے اندر دیانتداری خلوص اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں اور ہر انسان اپنے دوسرے انسانی بھائی کی روٹی چھیننے کے بجائے اس کی مدد کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ لوگ اس اصول کو بالعموم خیالی سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ اس کو خیالی کہتے ہیں۔ وہ دراصل بیمار کا علاج کرنے کے بجائے اس کے مرض کو جوں کا توں رکھتے ہوئے اسے کسی نہ کسی طرح زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ اصولاً قطعاً غلط ہے۔ وقتی تدابیر ( ) کے ساتھ ساتھ بنیادی خرابیوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اگر بنیادی خرابی دور نہ ہو تو وقتی علاج محض عارضی شے ہے جس کے بعد پھر اصل مرض عود کر آتا ہے۔ سرمایہ دار ملکوں سے غلہ لیکر بھر دینا محض ایک عارضی علاج ہے اس سے بلیک مارکٹ کرنے والے اور رشوت خور ختم نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کی اور بن آئے گی پھر سوال صرف غلہ ہی کا تو نہیں ہے۔ یہاں تو ہر چیز کی یہی حالت ہے۔ اسی طرح اشتراکیوں کا حل بھی ایک سطحی حل ہے محض جائدادوں کو قومیانے اور چند ایک سرمایہ داروں کا گلا گھونٹ دینے سے کچھ نہیں ہوتا جب سماج کا اخلاقی ڈھانچہ ہی بوسیدہ ہو چکا ہے تو اوپری رنگ و روغن اور ظاہری تبدیلیوں سے یہ آخر کب تک کھڑا رہے گا۔

یہ وقت دراصل دیانت دار اور خدا ترس لوگوں کے باہر نکلنے کا ہے۔ تمام قوموں اور نسلوں کے ایسے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو حجروں کی زینت بنانے کے بجائے اب میدان میں آئیں اور بدکردار لوگوں کو انسانیت کے راستے میں روڑے اٹکانے سے باز رکھیں۔ اگر ایک طرف ایسے لوگ بے لاگ طریقے پر انسانیت کی خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی زندگی سے راستبازی اور شرافت کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ اور دوسری طرف اخلاق کے لٹیروں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ تو پھر سچائی اور دیانت جو اس وقت ایک خیالی چیز معلوم ہوتی ہے جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ دنیا کا ضمیر آج ایسی کسی چیز کو دیکھنے کے لئے بے چین ہے۔ اگر اس کا تجربہ کیا جائے تو یقیناً کامیاب رہے گا۔ اور ہماری ہر مصیبت دیکھتے ہی دیکھتے ٹل جائے گی۔

ہندو کوڈ بل

گزشتہ چند دنوں سے ہند پارلیمنٹ میں "ہندو کوڈ بل" پر بحث ہو رہی ہے۔ یہ بل ہندو قوم کی معاشرتی اصلاح کے لئے بنایا گیا ہے۔ بھارت کے اکثر ذمہ دار اصحاب کو اس کے نفاذ پر اس قدر اصرار ہے کہ انھوں نے اپنے عہدے تک کی بازی لگا دی ہے۔ پہلی وقعہ جب یہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا تھا تو پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ اگر یہ بل منظور نہیں ہوا تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ اب ان کے امتحان کا وقت قریب آ رہا ہے۔ کیونکہ جہاں تک ملک کے عام حالات کا تعلق ہے اور جو بحثیں اب تک اس پر ہو چکی ہیں ان کی روشنی میں یہ یقین کر لینا مشکل ہے کہ یہ پاس ہو سکے گا۔ اور ہندو قوم اس کو برداشت کرے گی۔ اس سوال سے قطع نظر کہ بھارتی حکومت ایک سیکولر گورنمنٹ ہے اس کو کسی قوم ۔۔۔ چاہے وہ بہت تو سرا کوئی اور قوم کے مذہبی معاملات میں دخل در معقولات کا حق نہیں ہے (کیونکہ سیکولرزم کا بھارتی مفروضہ یہی ہے) سوال یہ ہے کسی اصول کو جاری کرنے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ آپ عوام کے دماغوں کو اس کی تائید میں ہموار کئے بغیر اوراس پر ان کی رائے ۔۔۔ دیں اور قانون کی تلوار ہاتھ میں لے کر اسے لوگوں کے حلق میں ٹھونس دیں۔ یہ طریقہ سراسر غیر فطری اور غیر عقلی ہے۔ یہ تو

بہت سا سی وقت تک چل سکتا تھا جب تک ہمارے ملک میں ایک غیر ملکی حکومت قائم تھی لیکن ملک کے لوگوں کی اپنی حکومت بن جانے اور عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ طریقہ نہایت بھونڈا نظر آتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ہندو قوم کے ہمدردوں کو اپنے سماجی نظام میں کچھ خرابیاں نظر آتی ہیں تو ان کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ آپریشن کے ذریعہ سماج کے کچھ اصولوں کو کاٹ کر ان کی جگہ اسلامی نظام اور عیسائیت (جن کی اصلیت صرف "اسلام" ہی ہے) سے کچھ دوسرے اصول لے کر فٹ کر دیئے جائیں۔ آپریشن کا یہ طریقہ بے جان چیزوں کے جوڑنے یا زیادہ سے زیادہ ایک انسان کے اعضا کی اصلاح کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک پوری کی پوری سماج پر یہ عمل جراحی انتہائی خطرناک ہے۔ جن لوگوں نے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس "بل" کے نفاذ سے ہندو قوم کا سماجی نظام متزلزل ہو جائے گا۔ ان کا خیال اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ سماج کی اصلاح کا صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ اس کے اندر پہلے اصلاح کا احساس پیدا کریں۔ پھر یہ احساس محدود نہ ہو بلکہ ہمہ گیر ہو۔ کیونکہ ایک سماج کے مختلف شعبے اس کے بنیادی فلسفے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ایک شعبے میں بھی تبدیلی کرنی ہو تو بنیادی فلسفے پر اثر ڈالنا پڑے گا۔ ورنہ بنیادی اصولوں کو جوں کا توں رکھتے ہوئے کسی چیز میں تبدیلی کرنا لاحاصل ہے۔ اس کے بعد ایک گروہ ایسا ہوگا جو سماج کو اصلاحی مقصد کے لئے اکسائے گا۔ اور اپنی زندگی سے ان اصولوں کا مظاہرہ کرے گا جن کو وہ نافذ کرنا چاہتا ہے۔ پھر ایک زبردست عوامی تحریک کے ذریعہ اپنے اصولوں کی بنیاد پر لوگوں کی تربیت کرے گا۔ اور رائے عامہ کی تائید حاصل کر کے اپنے مقاصد کو قانون کا درجہ دے گا۔ اگر ہندو قوم کے سماجی ڈھانچے کے اندر واقعی خرابیاں ہیں تو انہیں ان تمام مراحل سے گزرنا ہوگا۔ ورنہ ہر ہر خرابی کا الگ الگ علاج کرنا ناممکن ہے۔

آنے والے انتخاب اور مسلمان

کسی ملک میں جب عمومی انتخابات ہوتے ہیں اور اس ملک کی مختلف جماعتیں ان میں حصہ لیتی ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعتیں اپنے اپنے طریقوں اور اصولوں کے مطابق ملک کا انتظام سنبھالنے کے لئے مقابلہ کر رہی ہیں۔ چنانچہ رائے عامہ کی کسوٹی جس جماعت کو کھرا یا کھوٹا ثابت کر دیتی ہے وہ جماعت برسر اقتدار آ جاتی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس دیس یا ملک کا انتظام کرتی ہے۔ جیسے انگلستان کے گزشتہ انتخابات میں لیبر پارٹی قدامت پسندوں اور دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوئی تو اس نے اپنے پروگرام کو ملک میں جاری کیا اور ایک مخصوص طرز کے نظام کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک ہندوستان میں بھی انتخابات ہونے والے ہیں اور ان میں اس دیس کی مختلف پارٹیاں کانگریس، سوشلسٹ اور مہاسبھا وغیرہ حصہ لیں گی۔ ان جماعتوں کے حصہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھارت کی اصلاح و ترقی کا ایک مخصوص پروگرام اپنے پاس رکھتی ہیں۔ اور کامیابی کے بعد اس کو جاری کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن ایک ایسی قوم یا پارٹی جس کے سامنے بھارت کی آئندہ تعمیر جدید کا کوئی نقشہ نہ ہو۔ اور اس کے بڑے بڑے لیڈر یا رہنما صرف ابتدائی اور معمولی ضروریات کو رفع کرنا ہی اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھ رہے ہوں آخر انتخابات کے دنگل میں کو دے تو کس طرح؟ آج مسلمان قوم کی حالت یہی ہے۔ اس کے افراد پراگندہ ہیں۔ اس کے رہنمایان ملت اور خطیبان ملت کے سامنے نہ تو اس قوم کی گرتی ہوئی عمارت کو بچانے کا کوئی پائدار اصول ہے اور نہ بھارت کے تمام انسانوں کی بھلائی کا کوئی پروگرام! ایسی صورت میں یہ لوگ انتخابات کا نام زبان پر لانا تو بڑی بات ہے۔ اس کا خیال تک دماغ میں نہیں لا سکتے۔ ان کا کام تو صرف گزشتہ "معرکہ آرائیوں" کے زخموں کی مرہم پٹی کرنا اور بھیک اور خیرات مانگ کر (جس کو ان اصحاب نے غلط فہمی سے "حقوق" کا نام دے لیا ہے) گزر اوقات کرنا ہے۔ انتخابات اور یہ، چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔

اس کے علاوہ دوسری شکل یہ ہے کہ "مسلمان" کسی نہ کسی جماعت کی تائید کریں اور اپنے ووٹوں کو اس کے حق میں استعمال کریں۔

میں زندہ رہنے کے ڈھنگ کریں۔ لیکن یہ طریقہ ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف خود ان جماعتوں کے لئے جن کے حق میں مسلمان ووٹ دیں گے سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہمارے ملک کی گزشتہ سیاسی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اپنے آپ کو کسی جماعت کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ وہ اس کو لے بیٹھے ہیں۔ نیشلسٹ مسلمان کانگریس کے ساتھ ہوئے تو انھوں نے کانگریس کے شیرازہ کو رفتہ رفتہ منتشر کرنا شروع کر دیا۔ کانگریس کی ہندو اکثریت پہلے دو گروہوں میں بٹی اور اس کے بعد کئی گروہوں میں بٹ گئی۔ حتیٰ کہ یہ اختلاف اس قدر سخت ہو گیا کہ مختلف گروہوں نے الگ الگ جماعتوں کی شکل اختیار کر لی اور مخالف گروہ کے بڑے سے بڑے آدمی اور   انک کی جان لینے سے گریز کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان تمام کاموں میں دوسرے عوامل (FACTORS) بھی کام کرتے رہے ہیں لیکن ایک غیر شعوری عامل "قوم پرست مسلمانوں" کا بھی تھا۔ یہ لوگ ایسے بھولے تھے کہ خود ان کو نہ معلوم ہو سکا کہ ان کے وجود سے اس جماعت پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں جس کے ساتھ یہ تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک فطری بات تھی کہ ایک گروہ اپنی جداگانہ حیثیت کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھتے ہوئے دوسرے گروہ سے رشتہ جوڑے گا تو اس نظام میں اختلال واقع ہوگا لیکن بدقسمتی سے نہ تو مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہے، اور نہ دوسرے گروہوں اور جماعتوں کی سمجھ میں اب تک یہ بات آسکی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ کرنے میں ان کا فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے مسلمان اگر کسی جماعت سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں ــــــ اور اس کے حق میں مفید ہو سکتے ہیں تو صرف اس طرح کہ پہلے وہ ....۔ اپنی جداگانہ حیثیت کو بالکل ختم کر دیں، اپنے مسلمان ہونے سے انکار کر دیں اور اس کے بعد جس گروہ سے ان کا دل چاہے وابستہ ہو جائیں۔ جہاں کہیں بعض "دلیر" مسلمانوں نے ایسا کیا ہے نتیجہ سو فی صد درست رہا ہے یعنی وہ اس جماعت کے حق میں اور وہ جماعت ان کے حق میں مفید ثابت ہوئی ہے۔ مثلاً کمیونسٹ پارٹی میں جو مسلمان ہیں ان کو اسلام کے عقیدے اور نظام زندگی پر کوئی یقین نہیں ہے۔ بلکہ وہ مارکس کے نظریہ تاریخ و جدلیات، اور اسٹالن و لینن کے نظام عمل پر ایمان رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ پارٹی میں کھپ گئے اور کمیونسٹ پارٹی ان کو اپنے اندر ضم کر کے کامیابی سے چل رہی ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے بیک وقت دو کشتیوں میں پیر رکھے انھوں نے ایک طرف کشتیوں کے ملاحوں کو دھوکے میں رکھا اور انھیں باہم لڑا دیا اور دوسری طرف جیسے جیسے کشتیوں کی مسافت معدہ ہوئی ان کی ٹانگیں چرتی چلی گئیں، اور آج تک مسلسل چرتی چلی جا رہی ہیں۔ !

●

شرائط ایجنسی :ــــــ

۱۔ کم از کم ۵ پرچے منگوانا ضروری ہے

۲۔ کمیشن ۲۵ فیصد دیا جائے گا

۳۔ صرف خاص صورتوں میں پرچہ پہلی بار ذریعہ بک پوسٹ بھیجا جائے گا ورنہ وی پی

منیجر

(پرنٹر و پبلشر نے ہمدرد پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار رشدی اسٹریٹ میرٹھ شہر سے شائع کیا)



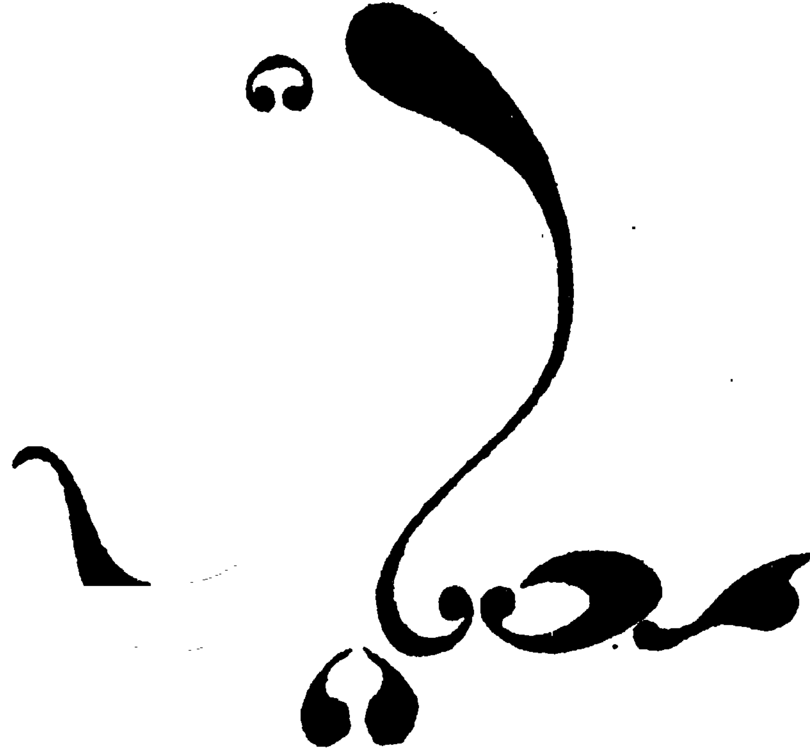


ساقی


معیار

مارچ
سنہ ۱۹۵۱ء

جلد (۱)
شمارہ (۳)



ترتیب دینے والے
اصغر علی عابدی
عبدالقدیر اصغر

تعاون
سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

ہیڈ آفس:- خندق اسٹریٹ۔ میرٹھ شہر
سب آفس:- محلہ کشن گنج۔ دہلی ۶
(صرف مرتب سے خط و کتابت اور تبادلۂ جرائد کے لئے سب آفس)

ترتیب

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ حضرات اپنی رقوم شیخ محمد قمرالدین صاحب پبلشر، اندرون موچی گیٹ لاہور کے پتہ پر روانہ کریں اور ہمارے ہیڈ آفس کو اطلاع دیں۔

ادارہ

نقشِ اوّل

"معیار" خدا کے فضل سے اپنی ادبی دعوت کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ساتھی، ہمدرد اور رفیق ہر ممکنہ کوشش کرکے اسے آگے لا رہے ہیں۔ اس مرحلے پر ہم چند باتیں اپنے ادبی کام کی نوعیت اور طریقے کے بارے میں کہنا چاہتے ہیں۔

ہم جن قدروں کو لے کر اُٹھے ہیں وہ صاف صاف لفظوں میں، خدا پرستی، انسان دوستی، خدا کی ہدایت پر ایمان، اقتصادی عدم توازن کی مخالفت، اور عورت و مرد کی اپنے اپنے دائروں میں آزادی کی قدریں ہیں۔ لیکن یہ قدریں گزشتہ دو سکی نام نہاد مذہبی تحریکوں، انجمنوں اور لیگوں کی وجہ سے سخت بدنام ہو چکی ہیں۔ اور ان کی اصلیت اوہام و خرافات کے پردوں میں کھو گئی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق ان کو معنے پہناتا ہے۔ ایک سے زیادہ خدا ماننے والے بھی خدا پرست، خدا کو (معاذ اللہ) از کار رفتہ ماننے والے بھی خدا پرست، اپنے آپ کو خدا کی ذات میں گم کر دینے والے بھی خدا پرست، اور خدا کی اطاعت کو صرف مندروں اور مسجدوں کی حد تک محدود کرکے بازاروں، عدالتوں، اسمبلی ہالوں اور سیاست کے اونچے اونچے پلاٹ فارموں پر خدا کو فراموش کر دینے والے بھی خدا پرست اور خدا کا نام لے کر اپنا کام چلانے والے پیشہ ور دین دار بھی خدا پرست۔ غرض خدا پرستی کا مفہوم "جتنے منہ اتنی باتیں" کا مصداق بن کر رہ گیا ہے۔ پھر یہی حال دوسری قدروں اور اصولوں کا بھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس تمام جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کریں۔ اور ان اعلیٰ قدروں کے چہرے پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹائیں۔ تاکہ ان کے اصلی خد و خال کو دیکھ کر دنیا اُن کے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکے۔ ہم وقت کی پوری نزاکت کا احساس اور انسان کی ضرورتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرکے اِس مقصد کی خاطر جد و جہد کرنے اُٹھے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کام کس طرح کیا جائے؟ ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے ہر مضمون، ہر مقالے، ہر افسانے اور ہر نظم میں ان قدروں اور اصولوں کا زور دار طریقے پر اعلان کر دیا جائے۔ ہر جگہ ان کو کسی نہ کسی طرح چپکا دیا جائے۔ ہر نظم پر ان کے لیبل لگائے جائیں۔ کچھ دنیا کی تباہی اور بربادی کا تذکرہ ہو۔ کچھ لا مذہبیت کی بُرائی گنائی جائے۔ کچھ عورتوں کی آزادی پر لعن طعن ہو۔ کچھ موجودہ معاشی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے سرمایہ دار پر خوب برسا اور گرجا جائے —— اور پھر رُک کر —— منہ میں آئے ہوئے تھوک کو نگلتے ہوئے کہہ دیا جائے۔ آئیے ہمارے پاس اس کا ایک علاج ہے۔ کیا ہندو بھائی، کیا مسلمان بھائی۔ کیا سکھ بھائی اور کیا کرسچین بھائی، سب کے لئے ہماری دوائی کارگر ہے۔ جیسے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا کوئی بازاری دوا فروش اپنی دوائی بیچ رہا ہو۔ لیکن یہ ہلکا طریقہ قطعاً غلط ہے اور ان اعلیٰ قدروں کی سراسر توہین ہے۔ جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ ادب اشتہار بازی اور پروپیگنڈے کا نام نہیں ہے۔ اعلیٰ درجے کا مقصدی ادب ایک ماہر طبیب کی طرح بیمار کے مرض کی تشخیص کرتا اور اسے ایسی دوائی دیتا ہے جو فوری طور پر چاہے کوئی "شعبدہ" نہ دکھا سکے۔ لیکن دھیرے دھیرے مستقل فائدہ کرے ۔ ہمیں بھی ان قدروں کی خاطر ایسے ہی ادب کو اختیار کرنا ہوگا جو اصلیت کو اُجاگر کر سکے۔ اور ان قدروں کے فائدے کو صحیح معنوں میں دنیا کے سامنے لا سکے۔ اس غرض کے لئے مضامین کو ذرا محنت کرکے اور جان کھپا کر تیار کرنا ہوگا۔ علمی تحقیق اور ہر قسم کے استدلال سے اُنھیں پُر کرنا ہوگا اور اس کے بعد ان اصولوں کے نتائج

اور فائدوں کو بالکل ایک حقیقت کی شکل میں لوگوں کے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس غرض کے لئے بہترین طرزِ نگارش، اسلوب، اندازِ بیان اور تکنیک کی جدتوں کو بھی ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوں تو زورِ دار استدلال۔ زبردست واقعہ نگاری، اور علمی تحقیق سب بیکار ہیں۔

ہم اپنے لکھنے والوں سے عرض کریں گے کہ ہمارے سامنے بازاری دوا فروشوں اور اشتہار باز طبیبوں کا طریقہ نہیں ہے۔ ہم اپنے اصولوں اور طریقے کا صرف اعلان کرنا، اُن کا نام اُچھالنا اور اُن کے حق میں بیجا آوازے لگانا نہیں چاہتے۔ ہم جو کچھ پیش کرنا چاہتے ہیں اُسے ایک قیمتی شے کی طرح پوری سج دھج اور وقار کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے ہیرے جواہرات کے تحفے ایک "شاہی محل" سے دوسرے محل کو بھیجے جاتے ہوں۔ ہم بھی خدائی دربار کے تحفے انسانیت کے ایوان میں اسی تزک و احتشام کیساتھ لائیں گے۔ امید ہے ہمارے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور نظموں میں اپنے مقصد کی خاطر زیادہ گہرائی، پختگی اور رادنچے سے اونچے فنی معیار کو اختیار کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس شمارے میں "جمہوریت کا مستقبل" عبدالوہاب ظہوری کا ترجمہ ہے۔ عبدالوہاب ظہوری اہلِ علم طبقے کے جانے پہچانے آدمی ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کئی چیزیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن اس ترجمہ کا اور ہی رنگ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں مغربی لٹریچر سے کس قسم کے مضامین کو اردو کا جامہ پہنانا چاہیئے۔ "نیا ہندوستان اور اسلام پسند شاعری" موضوع کے اعتبار سے اچھوتا مضمون ہے ـــــ محمد الیاس ندوی ایک جواں سال خدا پرست مفکر ہے۔ اس کی یہ کوشش خدا پرست مقصدی ادب کے تعارف کا اچھا ڈھنگ ہے فسانوں میں "اندھیرے سے اُجالے میں" اقبال نسیم عثمانی کا گہرا مطالعہ ہے۔ اس میں افسانہ نویس اپنے ذہن کے اندر نئی عورت کی کیفیات کو پڑھتا اور اس پر مناسب ضرب لگاتا ہے -

- - - - - - - - - - "سائبان میں" اسمٰعیل ادیب کا پرسوز تجزیہ ہے خیالی مگر اثر انگیز سوسائٹی سے قریب بھی اور دور بھی "پہاڑی پر جہاں ایک نئی بستی آباد تھی"۔ "تصویر کے دو رُخ" راؤ شمشاد علی خاں کا چبھتا ہوا ڈرامہ ہے۔ دوسرا رُخ پڑھ کر تو واقعی دل میں ایک پھانس سی چبھ کر رہ جاتی ہے۔ "سفید گھوڑا" کلاسوں میں جا کر دھوکے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ غزل میں کچھ نئے اور کچھ پرانے فن کار اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں۔ ابوالمجاہد زاہد نے بڑی مقصدی غزل کہی ہے جتنی حزیں نے مقصد کو رومانیت کے ساتھ گھلا ملا کر پیش کیا ہے، مگر عمر نظمی ذرا کھل کر میدان میں آئے ہیں۔ اچھا صاحب یہی سہی - - - - - - - - -

- ـــــــ "نظموں میں پیامِ نو"

سید عقاب کی استعاریت کا نیا نمونہ ہے۔ "تجدید" اسحاق اطہر صدیقی کا انوکھا احساس ہے۔ اطہر صدیقی عملاً ترقی پسند ہے۔ لیکن خدا پرستانہ دعوت کو سُن کر وہ سوچ میں پڑ گیا ہے۔ اور پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا ہے۔ انور اعظمی نے "یکسانی" کی بات خوب کہی۔ جیسے ہمیں یاد تو تھی لیکن پھر یاد آ گئی۔ قیصر افغانی "ساتھی سے" کچھ آہستہ آہستہ کہہ رہے ہیں۔ اور عبدالقدیر اصغر "فرار" لکھ کر غلط قسم کی مقصدیت پر چوٹ کرتا ہے۔ "عورت کا جذبہ" میں ایک مقصدی نظم کا تعارف اور تجزیہ ہے۔ نجم الاسلام کی تنقیدی زبان ترقی پذیر ہے ـــــ "رشتہ کی ڈوری" والے افسانے میں عبدالحلیم ندوی نے ایسے سماج کا نقشہ کھینچا ہے جہاں عورت مرد و نیا میں آزاد پھرتی ہے اور بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہے۔

نقشِ ثانی ______

دونو بلاک ___ اور ہم

امریکی اور روسی بلاک کے درمیان ہماری پوزیشن بالکل غیر متعین ہے۔ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جو فضا میں معلق ہو کر جھولا جھول رہا ہو، یہ صورت حال ایک اتنے بڑے ملک کے لئے جیسا ہندوستان ہے، انتہائی تشویشناک ہے کیونکہ زیادہ عرصے تک ہم اس طرح "جھولا" نہیں جھول سکتے۔ ایک نہ ایک دن ہم کو کسی ایک طرف رکنا پڑے گا۔ اور اگر ہم کسی طرف رکنا نہیں چاہتے اور کسی بلاک کی گود میں اپنے آپ کو ڈالنا نہیں چاہتے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم خود کسی تیسری راہ کے علمبردار ہوں۔ آج دنیا میں زندگی گزارنے کے صرف دو نظام چل رہے ہیں۔ ایک سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نظام ہے اور دوسرا اشتراکیت کا۔ ان دونوں کے رہنما الگ الگ امریکہ اور روس ہیں۔ اس لئے جو ملک یا قوم ان میں سے کسی ایک نظام کو قبول کرے اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ امریکہ یا روس کسی ایک کی برتری کو بھی تسلیم کرے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی ایک کے پیچھے چلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم اشتراکیت یا سرمایہ داری کسی نظام کو بھی اپنے اوپر لادنا نہیں چاہتے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم کہاں ہیں؟ موجودہ صورت حال کے پیش نظر اس کا مختصر جواب صرف یہی ہے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

یہ صحیح ہے کہ سلامتی کونسل میں بھارت کے نمائندے نے ہر بار غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے لیکن غیر جانبداری اصل میں کوئی مقصد نہیں ہو سکتی۔ غیر جانبداری تو اس وقت مفید ہو سکتی ہے جب کسی نئے نقطہ نظر کو پیش کرتے ہوئے اسے اختیار کیا جائے۔ ورنہ اس کے بغیر غیر جانبداری کے جتنے بھی مظاہرے کئے جائیں وہ سب بے کار ہیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھارت کے نمائندے نے آج تک جتنی بار اس کا مظاہرہ کیا وہ بے کار ہی گیا۔ حال میں کوریا کے معاملہ میں ہندوستان نے جو پالیسی اختیار کی اور ایک طرف امریکی بلاک کو منانے اور دوسری طرف کمیونسٹ بلاک کو راضی رکھنے کی جو کوششیں کی گئیں۔ اس پر امریکہ کی اس تجویز نے جس میں کمیونسٹ چین کو "جارح" قرار دیا گیا ہے۔ یکسر پانی پھیر دیا۔ اور اب مایوسی کا ایسا زبردست دورہ پڑا ہے کہ کوریا کیلئے اقوام متحدہ جو خیر سگالی مشن بھیجنا چاہتی ہیں اس میں بھارت کے نمائندے نے شرکت سے انکار کر دیا ہے یہ صورت حال بتا رہی ہے کہ آئندہ بھی اس بے مقصد غیر جانبداری کا دنیا کے حالات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا۔ آپ "روس" نہیں ہیں کہ آپ کی غیر جانبداری اور خاموشی سے زندگی کے مسائل کروٹیں لینے لگیں اور نہ آپ "امریکہ" ہیں کہ آپ کی کسی معاملہ سے علیحدگی حالات کی پیشانی پر شکن پیدا کر دے روس اور امریکہ دو ممتاز نظاموں کے علمبردار ہیں۔ یہ ایسے نظام ہیں جن کے پیچھے دنیا چل رہی ہے۔ اس شان کا ہر قدم ایک اثر رکھتا ہے۔ لیکن جو ملک کوئی جداگانہ راہ نہ رکھتا ہو ___ یا کم از کم اس حد تک نہ رکھتا ہو کہ اس کی جداگانہ حیثیت دنیا پر مسلم ہو جائے تو اس کے تمام اقدامات محض ٹھنڈی گولیوں کے مماثل ہیں جن سے بچے تو کھیل سکتے ہیں مگر کوئی عقلمند آدمی شکار نہیں مار سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کی غیر جانبداری کو دونوں بلاکوں نے اپنی اپنی اغراض کی خاطر خوب استعمال کیا ہے یہ اتنا بڑا ملک محض ایک آلۂ کار بن کر رہ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے خود ہندوستان والوں کو اس کا احساس نہ ہو لیکن بین الاقوامی بساط سیاست کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہمارے مہرے "اونٹ" اور "ہاتھی" کی چال تو چلتے رہے ہیں لیکن "فرزیں" اور "گھوڑا" یہ کبھی نہ بن سکے۔ امریکی اور روسی بلاک کے درمیان جنگ عظیم ثانی کے بعد سے مسلسل جھگڑا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے ان کے جھگڑے چکانے اور ایک کو دوسرے کے خیالات سے آگاہ کرنے کے لئے کسی "درمیانی آدمی" کی ضرورت تھی۔ یہ "درمیانی آدمی

ان کوملی گیا۔ اور یہ ہمارا بد قسمت ملک ہندوستان ہے۔ ہمارے ملک کے رہنما پوری دیانتداری سے بغیر کسی "ذاتی فائدے" کے اس فریضہ کو بخوبی انجام دے رہے ہیں! جب سے ہندوستان نے صیانتی کونسل کے مباحث میں اور ادارۂ اقوام متحدہ کی دوسری کمیٹیوں میں حصہ لینا شروع کیا ہے سُرخ اور سفید روزنامچوں کی چشمک زنی تیز ہوگئی ہے۔ ان کو اپنے خیالات کے تبادلے کا اچھا ذریعہ ہاتھ آیا۔ بھارت کے اکثر سوچنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح بین الاقوامی مسائل میں حصہ لے کر اور "درمیانی راہ" اختیار کر کے ہم نے بھارت کی بین الاقوامی پوزیشن کو اونچا کر دیا ہے۔ حالانکہ ان کی پوزیشن اونچی ہونے کے بجائے مسلسل نیچی رہ رہی ہے۔ جبتک کسی نہ کسی بلاک کا مطلب ان سے نکلتا ہے۔ وہ ان کو سراہتا ہے۔ اور وہ اقوام متحدہ کے آسمان پر روشن ستارے کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ لیکن جونہی اس کا مطلب نکل جاتا ہے وہ صاف آنکھیں پھیر لیتا ہے اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ ابھی کوریا کے معاملہ میں مسٹر بی۔ این۔ راو کی تجویزوں اور کوششوں کا جو حشر ہوا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں اپنی غیر جانبداری اور "درمیانی فرائض" کی انجام دہی کے صلے میں جو کچھ مل رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ملک والوں نے آخر یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ روسی بلاک اور امریکی بلاک میں ہمیشہ لڑائی ٹھنی رہے گی۔ اور ان کو عمر بھر "غیر جانبداری" کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن اونچی بنانے کا موقع ملتا رہے گا۔ اگر حالات پر ہماری نظر گہری ہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ ایک نہ ایک دن ان دونوں بلاکوں میں سمجھوتہ ہو گا۔ چاہے یہ سمجھوتہ جنگ کے بغیر ہو یا جنگ کے ذریعہ ہو لیکن یہ لڑائی تمام عمر تو رہنے کی نہیں۔ اس وقت ہم کہاں ہوں گے؟ انگریزی محاورے کے مطابق "کہیں نہیں" (NO WHERE) جس قدر امریکی اور روسی بلاک کے درمیان جنگ کے امکانات بڑھ رہے ہیں اسی قدر ان دونوں کے باہمی سمجھوتے کا وقت بھی قریب سے قریب تر آ رہا ہے۔ کمیونزم اور سرمایہ داری کے افکار کی نظری اور واقعاتی دونوں بنیادیں موجود ہیں۔ ان دونوں نظاموں کی عمارت مادہ پرستی پر اٹھائی گئی ہے۔ ان دونوں نظاموں میں ایک وسیع انسانی گروہ پر ایک اور گروہ یا طبقہ یا پارٹی کے اقتدار کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظاموں کے تعلقات میں [illegible] صرف یہ ہے کہ دونوں کا طریقہ [illegible]

[illegible] ہے ہیں

[illegible] ملک [illegible] عوام

[illegible] واضح ہوگی دنیا بھی مگر ان

کو ایک دوسرے کا نقصان ہوتا نظر آئے گا یہ لوگ اپنے بقا اور تحفظ کے لئے باہم سمجھوتہ کر لیں گے۔

چنانچہ جب یہ سمجھوتہ ہو جائے گا تو ہمارے جیسے کتنے ہی غیر جانبدار ملکوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے گا اور اس وقت کوئی مسئلہ ایسا نہ رہے گا جس میں ہماری "ثالثی" اور "غیر جانبداری" کی ضرورت پیش آئے بلکہ سرمایہ داری اور اشتمالیت کے علمبردار متحد ہو کر دنیا کی تقسیم کا منصوبہ بنائیں گے اور تمام دنیا کے ممالک اور اقوام کو اپنی غلامی میں جکڑ لیں گے۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابھی تک دنیا کے مظلوم عوام اور ان کے متوسط طبقے کے رہنما کمیونسٹوں اور مغربی جمہوریت پسندوں پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی رائیں ان دونوں کے حق میں بٹی ہوئی ہیں۔ لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ دنیا کے تمام مظلوم پسماندہ اور روندے ہوئے انسان سرخ اور زرد خداؤں کے اقتدار کو ٹھکرا دیں۔ اور ان دونوں کے جوئے سے اپنی گردنیں آزاد کرا لیں۔ فی الحال یہ کشمکش مختلف ممالک میں مغربی جمہوریت پسندوں کے خلاف شروع ہو چکی ہے اور جگہ جگہ اینگلو امریکی بلاک کا طوق غلامی اتار پھینکنے کے لئے مظلوم عوام لڑ رہے ہیں۔ کمیونسٹ رہنما بڑی ہوشیاری سے عوام کے اس فطری جذبہ آزادی کو اپنی تائید میں استعمال کر رہے ہیں اور مغربی سامراج کے اقتداری پنجہ سے چھڑا کر انہیں اس سے زیادہ مکروہ انسانی اقتدار کے شکنجے میں جکڑ رہے ہیں۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ کمیونسٹوں کا یہ دام ہمرنگ زمین عوام اور ان کے مخلص رہنماؤں کو نظر آ جائے گا۔ اور وہ جس طرح مغربی سامراج کے پھندے سے نکلے تھے۔ اسی طرح سرخ سامراج کے پھندے کو بھی کاٹ ڈالیں گے۔ یہ وقت ہوگا جب مغربی سامراج اور روسی سامراج باہم گلے ملیں گے۔ اور ان کے رہنما معافی مانگتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ جائیں گے۔ یہ اتحاد دنیا بھر کے کثیر التعداد مظلوم عوام کے خلاف ہوگا۔ یہ اتحاد ان کے خلاف ہوگا جو صدیوں سے انسانی استبداد کے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں یہ اتحاد اس انسانی اقتدار کی حفاظت کے لئے ہوگا جو ہر زمانے میں خدائی کے دعویداروں نے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں پر جمائے رکھا ہے۔ یہ اتحاد انسانوں کو ان کی اصلی آزادی — یعنی ہر انسانی بندھن سے آزادی — کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کیلئے ہوگا۔ اس غرض کیلئے مادہ پرستی، نفس پرستی اور بداخلاقی کے تمام علمبردار اکٹھے ہو جائیں گے اور انسانیت کے خلاف

دھاوا بولدیں گے۔

سوال یہ ہے کہ اُس وقت ہماری پوزیشن کیا ہوگی؟ کیا ہم اس وقت بھی غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں گے! یقیناً نہیں۔ تو پھر ہم کدھر جائیں گے؟ ہمارے لئے اسوقت صرف دو ہی راستے ہوں گے۔ ہمیں یا تو ان مردار خور گدھوں کے آگے اپنے آپ کو ڈالدینا ہوگا۔ تاکہ وہ ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر ایک دوسرے کو دعوت طعام دیں۔ یا پھر مردانگی سے مظلوم انسانیت کی حمایت اور رہنمائی کیلئے اٹھنا پڑے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس ملک کے باشندے انسانیت کا ساتھ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس فریضہ کو آخر ہم کس طرح انجام دیں گے؟ مظلوموں کی تائید میں محض مادی جنگ کوئی فائدہ نہ دے سکے گی کیونکہ ظالم اس اعتبار سے بہت زیادہ طاقتور ہوگا اور ایک نہ ایک دن مظلوم پر قابو پا جائے گا۔

اس جنگ کی صحیح صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ بھارت والے کسی تیسرے نظام حق کو جو کمیونزم اور سرمایہ داری کے تصور سے الگ ہو اور انسان کو ان کے پنجے سے چھڑاتا ہو، دنیا کے سامنے رکھیں۔ اور اس کی خاطر ایک زبردست اصولی اور اخلاقی جنگ لڑیں۔ چاہے اس کے ساتھ ہی انھیں مادی جنگ بھی کیوں نہ لڑنا پڑے۔ صرف اسی صورت میں ہم ان دونوں بلاکوں سے اپنی علیحدگی یا غیر جانبداری کو ایک موثر غیر جانبداری بنا سکتے ہیں۔ اور کسی معاملہ میں اپنے وجود سے حالات کی پیشانی پر شکن پیدا کر سکتے ہیں۔ آج پورے بھارت کی اور دنیا بھر کے انسانوں کی اس سے بڑی خدمت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم غیر جانبداری کا سطحی مظاہرہ چھوڑ کر کوئی نیا راستہ اختیار کریں اور انسانیت کے سارے قافلہ کو لے کر پوری دلیری سے اس کی طرف بڑھیں۔

ضروری اطلاع

ہم نے ابھی تک ڈاک خانے سے اپنا رجسٹرڈ نمبر نہیں لیا ہے، اس کے لئے درخواست دیدی گئی ہے۔ اور خریداروں کے پتہ سے حسب قاعدہ ڈاک والوں کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ جن خریدار اصحاب کے پاس محکمۂ ڈاک کی طرف سے کوئی پرچہ آئے انھیں بتا دینا چاہئے کہ وہ ماہنامہ معیار کے خریدار ہیں۔

یاد رکھئے آپ جتنی جلدی اطلاع دیں گے ہمارا کام انتہائی آسان ہوگا۔

منیجر

ڈاکٹر ایڈورڈ بینس
سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ

مترجمہ: عبدالوہاب ظہوری

جمہوریت کا مستقبل

یہ ایک ایسے شخص کا مضمون ہے جو سوویٹ روس اور مغربی یورپ کے بیچ میں رہتا ہے اس لئے اس کے خیالات میں بھی درمیانہ پن ہے۔ اس نے ایک آنکھ سے اشتمالیت کو دیکھا ہے تو دوسری آنکھ سے مغربی جمہوریت کو۔ اس کے افکار کا دھارا ان دونوں کے درمیان سے بہہ نکلا ہے۔ مضمون کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والے نے اپنے افکار و نتائج کا دارومدار ہر قسم کی عصبیت سے الگ ہو کر مجرد واقعات پر رکھا ہے۔ اس کی رائے اور اس کے افکار صرف واقعات سے بنے ہیں۔ اور حادثات کی چٹانوں سے ٹکرا کر وہ ایک نتیجہ پر پہنچا ہے۔ یہ نتیجہ کیا ہے؟ جمہوری اور آمری سلطنتوں کے تصادم کے بعد ایک مثالی جمہوریت، مثالی قیادت، اور مثالی تمدن کا ظہور جس کے پیچھے "خالق کائنات کا فکر" کارفرما ہو۔ ! کہیں کہیں مضمون نگار کے افکار میں الجھاؤ پایا جاتا ہے کیونکہ "حق" اس کے سامنے پوری طرح آشکارا نہیں ہے۔ اس الجھاؤ کو ہم نے اپنے تشریحی نوٹوں کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون گزشتہ جنگ عالمگیر کے دوران میں لکھا گیا ہے۔ (ادارہ)

کیا مغربی جمہوریت اور سوویٹ اشتراکیت میں تعاون ہو سکتا ہے؟

دو عالمگیر جنگوں کے درمیان جو وقفہ تھا، وہ تین عظیم الشان نظریات اور تحریکات کے مابین شدید کشمکش پر جا کر ختم ہوا، وہ تین تحریکیں یہ تھیں۔ جمہوری تحریک، نازی و فسطائی تحریک، سوویٹ اشتراکی تحریک۔ لیکن اس جنگ میں موقف تبدیل ہو گیا، جمہوریت اور سوویٹ اشتراکیت ایک ہی صف میں کھڑی ہو گئیں، یہ دونوں اس خونریز جنگ میں نازیت اور فسطائیت کے خلاف "بقول صدر روزولٹ" یہ محسوس کرتے ہوئے گھس پڑیں، کہ یہ جنگ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کی زندگی یا موت کی جنگ بن گئی ہے۔ اس طرح اس جنگ نے ایک نیا قالب اختیار کر لیا، یہ جنگ نہ صرف عسکری تھی، بلکہ نظریاتی جنگ بھی تھی، اشتراکی جمہوری فریق نے یہ اٹل ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک ہتھیار نہ رکھے گا جب تک کہ فسطائی اور نازی اصولوں پر فیصلہ کن ضرب نہ لگا دی جائے۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت اور نازیت و فسطائیت کے درمیان مطابقت و ہم آہنگی پیدا کرنا امر محال ہے ان کے مفادات کے مابین نئے فیصلوں کی ایجاد کی کوشش کرنا محض ان ہی سیاسی اسالیب کی طرف رجوع کرنا ہے جو موجودہ جنگ کا باعث ہوئے، اگر جمہوریت فسطائیت اور نازیت کے مقابلہ میں اتحاد و اتفاق سے کام لیتی اور اپنے ... ہی ... کا موقف ... ہے تو ان کی بقاء و دوام کی کوئی راہ نکلتی۔ ... دنیا اس خونریز جنگ کے جہنم میں کود پڑی۔

تصادم یا تعاون

جب ... کیا جمہوریت پسند انگریز اور امریکی اشتراکیت پرست روسیوں کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتے ہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ... کے نظریات ... کے علمبرداروں کو اس امر پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ صلح و آشتی کی طرف اس وقت تک مائل نہ ہوں جب تک کہ آزاد سرمایہ دارانہ جمہوریت کا خاتمہ کر دیں؟ کیا اشتراکی ان نظریات کو روبہ عمل لائیں گے؟ اور سوویٹ اتحاد کے جھنڈے تلے انگلستان اور امریکہ کے خلاف مقدس جنگ ... ۱۹۴۲ء میں انگلستان اور سوویٹ اتحاد کے درمیان جنگ کے دوران میں عسکری تعاون اور مابعد جنگ دنیا کی تعمیر و تنظیم جدید کے سلسلہ میں جو معاہدہ طے پایا، اور جس کی مدت بیس سال قرار دی گئی، وہ اس امر کی دلیل ہے کہ دونوں صلح پسند فریقوں کے اندر یہ جذبہ کارفرما ہے کہ دوران جنگ میں جس طرح باہمی تعاون کریں گے اسی طرح وہ امن کے زمانہ میں بھی اس تعاون سے کام لیں گے۔ ... کیا یہ معاہدہ جذبۂ تعاون کی دلیل ہے یا کچھ اور؟

میری ذاتی رائے، جو عالمی حالات کے اندازہ سے بنی ہے، یہ ہے کہ آزاد جمہوری اور سوویٹ اشتراکی دونوں نظاموں کے درمیان جنگ کے بعد تعاون ہو سکتا ہے

ہے جس نظر آتا ہی ضروری ہے، جتنا کہ ان دونوں کے لئے جنگ کے درمیان ضروری تھا! اس لئے ان دونوں کے درمیان اگرچہ یہ جذبہ ناگزیر ہے، جو ابتداءً عارضی طور پر نمایاں ہو، پھر وہ مستقل اور دائمی ہو جائے، کیونکہ ان کے اتحاد کے اتنے ہی اسباب ہیں، جتنے کہ ان میں اختلاف کے پہلو پائے جاتے ہیں، یہ لابدی امر ہے، کہ آخر کار اتحاد کے اسباب ہی ان دونوں کے تعلقات پر مسلط ہو جائیں۔

اخلاقی واتحادی پہلو!

مجھے اس سے انکار نہیں ہے، کہ ان میں سے ہر ایک کی تعلیمات کا منبع و ماخذ دو بالکلیہ مختلف و متضاد فلسفے ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے، کہ یہ دونوں فلسفے تاریخ میں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کر چکے ہیں۔[۵۱] اس لحاظ سے ایک ایسے اشتمالی مسلک کا وجود باعث نقصان نہیں، جو ہر اجتماعی و تاریخی تغیر و انقلاب کو اقتصادی اور مادی اسباب و محرکات کا مرجع قرار دیتا ہے، جمہوری مسلک اقتصادی عوامل و محرکات کو نہیں جھٹلاتا، بلکہ وہ اس امر کی تردید کرتا ہے، کہ ان اقتصادی محرکات ہی کو انقلاب کا جوہری سبب یا واحد عنصر قرار دیا جائے، کیونکہ جمہوریت کے پیرو اللہ پر ایمان رکھتے، اور روحانی اسباب و عوامل کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں۔[۵۲] اس کے باوجود میرا دعویٰ ہے، کہ ان دونوں تحریکات سے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں، جب تک کہ ان دونوں کے علمبردار اور حامی، رواداری کو اپنا شعار ٹھہرائیں، اور حریت فکر کا احترام کریں۔

یہ ہیں وہ فلسفیانہ اختلافی پہلو جو دونوں تحریکوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ اتحاد کے وجوہ بھی ہیں، وہ دونوں یکساں طور پر افراد اور قوموں کے درمیان مساوات، اور تمام انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل، طلب علم اور جستجوئے حقیقت میں حصہ لینے کی طرف دعوت دیتی ہیں۔[۵۳] جمہوریت کی دعوت ایک ایسی دعوت ہے، جو انسانی سوسائٹی کی عالمی انسانی تنظیم کے لئے کوشش کرتی ہے، اور اشتراکیت کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ فکری تہذیب کی تعمیر عقلی اساس پر کی جائے، یہ دونوں ایسے نقطے ہیں، جن پر ان دونوں تحریکوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ افراد اور قوموں کے درمیان تفریق کئے بغیر تمام نوع انسانی کی بھلائی اور خوشحالی ہی وہ بلند ترین مقصد اور نصب العین ہے، جس کی تکمیل کے لئے کوشش کرنا ان دونوں کا فریضہ ہے۔[۵۴]

موجودہ بورژوا جمہوریت بلا استثناء تمام خصوصی املاک کو تسلیم کرتی ہے، اس کے باوجود اس نے حکومتی اشتراکیت کے راستہ میں اس طرح آگے قدم بڑھایا ہے کہ اکثر ترقی یافتہ حکومتوں میں وسائل پیداوار، حکومتوں اور افراد کے درمیان منقسم ہو گئے ہیں، اور جو اجتماعی قوانین تنظیم محنت کرتے ہیں، وہ سرکاری قوانین بن گئے ہیں، ان قوانین کی پابندی کرنے والے میں یہ سکت نہیں رہی، کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق، مزدوروں پر شرائط محنت عاید کر سکے، اس میں اتنی طاقت ہی نہیں رہی کہ تمام حال عوام کی مصلحت کا خیال رکھے بغیر اپنے لئے من مانے مخصوص فائدہ مقرر کرے، یہ واقعہ بھی پیش آیا، کہ اکثر صنعتوں اور کارخانوں کی ملکیت حکومتوں اور میونسپل پالٹیوں (MUNICIPALTIES) کی طرف منتقل ہو گئی، اس طرح ہمارے پاس نئی سرمایہ داری کی نشوونما ہو گئی، یہ حکومت یا شہر یا جماعت کی سرمایہ داری تھی جس میں اجتماعی رجحان کارفرما تھا۔[۵۵]

اگرچہ بورژوا جمہوری حکومتیں جس انقلاب سے گذر چکی ہیں، اس نے اب تک ان کو لینن پرست اقتصادی اشتراکیت تک نہیں پہنچایا، لیکن اس نے محسوس طور پر

۵۱۔ یہ فلسفیانہ اتحاد کیا ہے؟ اسے ہیس نے نہیں بتایا لیکن تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ اتحاد در اصل مادہ پرستانہ اور سیکولر تصور زندگی کا اتحاد ہے، جو سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتمالیت دونوں میں پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اشتمالیت جارحانہ اور ہمہ گیر مادہ پرستی کی قائل ہے اور جمہوریت محدود اور غیر خالص مادیت کو لیکر چلتی ہے (مدیر)

۵۲۔ یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مغربی جمہوریت کے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا پر اس اعتبار سے ایمان نہیں رکھتا کہ اس کو زندگی کے اجتماعی اور اقتصادی مسائل میں دخل انداز ہونا چاہئے ان کا خدا پر ایمان صرف انفرادی اور ذاتی چیز ہے۔ جس کا تعلق ملک کے قانون اور سوسائٹی کے نظام سے مطلق نہیں ہے۔ (مدیر)

۵۳۔ اس طرح کی "دعوت" تو دنیا کا تقریباً ہر نظام دیتا ہے۔ پھر اتحاد کے اس سبب کو صرف جمہوریت اور اشتمالیت تک محدود کیوں رکھا جائے؟ اس بنا پر تو تمام نظاموں کے ایک ہونے کا امکان ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی نظام ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کا انکار نہیں کرتا۔ سب اسی ایک دعوے کو لیکر اٹھتے ہیں لیکن اس منزل تک پہنچنے کے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں اسی اعتبار سے ان میں فرق ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں۔ (مدیر)

۵۴۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ موجودہ جمہوریت اور اشتمالیت میں اس اعتبار سے موازنہ کیا جائے کہ اعلیٰ اعلانات کی تکمیل کے لئے کس فلسفہ پر اعتقاد رکھتی اور کس طریقہ کار کو اپناتی ہیں۔

۵۵۔ یہ خیال بہت جدید اور صحیح ہے کہ اشتمالیت نے انفرادی اور محدود سرمایہ داری کو اوپر اٹھایا اور حکومت یا جماعت کی سرمایہ داری قائم کر کے سرمایہ دارانہ نظام کی تکمیل کی

ان کو اسرائیلیت نے قریب کردیا، چنانچہ وسائلِ پیداوار، جو سرمایہ پرست افراد کے لئے وقف تھے، ان سے
سرمایہ پرست، جن معاشی قوانین وضوابط پر مسلط تھے، اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتے تھے، وہ سرکاری نظاموں کے ہاتھ؛ عبدالوہاب ظہوری
حکومتوں کے درمیان یہ قوانین شدت وقوت میں مختلف درجہ رکھتے تھے، جن جمہوری حکومتوں میں اتنی طاقت نہ رہی کہ اپنے اقتصادی
حصہ [illegible] راستہ پر گامزن ہیں اس طرح ہم دیکھتے ہیں، کہ وہ اساسی فرق جو جمہوری اقتصادی نظام کو سوویٹ اقتصادی نظام
[illegible] بڑی حد تک کمزور پڑ چکا تھا۔

اس مقدمہ کے بعد میں دوسرا سوال یہ کرتا ہوں، کہ کیا سوویٹ اشتراکیوں میں اتنی سکت ہے، کہ وہ ان جمہوریتوں کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکے اور ان سے تعاون کرسکتے ہیں، جنہوں نے وسائلِ پیداوار اور بالخصوص کانوں میں اشتراکیت کے اصول کو قبول کرلیا ہے۔؟

میں اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہوں، بیشک اشتراکیوں کے اندر جمہوری حکومتوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کی طاقت ہے۔ کیونکہ اقتصادی آزادانہ [illegible] سرمایہ داری کا دور گذرچکا، یہ ایسا دور تھا جس کے اندر اتنی سکت نہ تھی، کہ کوئی جمہوریت کے مقابلہ میں ہمیشہ باقی رہ سکے۔ اسی لئے ہم جمہوری حکومتوں میں مشاہدہ کررہے ہیں، کہ وہ یکے بعد دیگرے وسائلِ پیداوار، خاص کانوں کی تحویل کے اصول کو رفتہ رفتہ اشتراکی نقطۂ نظر سے تسلیم کررہی ہیں، یہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں، کہ ان حکومتوں کا اقتصادی نظام اس طرح نشوونما پا رہا ہے، کہ وہ عنقریب ایسی سوسائیٹیوں کی تعمیر کا سبب بن جائے گا، جن میں نہ طبقاتی کشمکش ہوگی اور نہ [illegible] ہوگا۔ [۵]

ان میں سرمایہ دارانہ آزاد لین دین کا اصول غائب ہوجائے گا، تاکہ اس کے بجائے پیداوار پر نگرانی اور منافع کی تقسیم کے لئے ترجیہ یافتہ علمی اقتصادی قواعد [illegible] کیونکہ یہ ایسے بنیادی قوانین ہیں جن پر اشتراکی نظام کی بنا قائم ہے۔

اس میں شک نہیں، کہ جب یہ مقصد پورا ہوجائے، تو وہ حکومت اور سماج کی مسلسل ترقی اور سیاسی جدوجہد کے لئے نئے طریقے اختیار کرنے میں ممد ومعاون ہوگا۔ لیکن [illegible] جمہوریت پسند سیاست [illegible] کے لحاظ سے یہ عقیدہ رکھتا ہوں، کہ اس قسم کے مقصد کی تکمیل اس انقلابی طریقہ سے ہونی چاہئے، جو سوسائٹی اور حکومت کی خونریز [illegible] جبر وتشدد کے طریقہ سے اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھا جائے گا، تو سوویٹ اشتراکی نظام اور مابعد جنگ نئے جمہوری نظام کے لئے یہ ممکن ہوگا، کہ وہ [illegible] اتحاد کے ساتھ زندگی بسر کریں، آپس کے اختلافات اور باہم نفرت وعداوت کے جذبات کو دور کریں۔

جمہوریت اور سوویٹ اشتراکیت کے درمیان تیسرا بنیادی فرق اس مزدور طبقہ کی آمریت کا ہے، جو اپنے لئے لینن پرست اشتمالی نظریات کو دعوت دیتا ہے، یہ فرق حقیقی [illegible] جمہوریتوں کا فرض ہے، کہ وہ فسطائی آمریت اور اشتمالی آمریت کے درمیان پوری تمیز کریں، کیونکہ فسطائیت ان لوگوں کی نظر میں ایک دائمی قانونی آمریت ہے، [illegible] اشتمالیت تو ایک عارضی آمریت ہے، جس کا لازمی شمار بورژوائیت اور سرمایہ داری کے خلاف بغاوت ہے جیسا ہم گذشتہ مشاہدہ کرچکے ہیں [illegible] کہ سوویٹ [illegible] اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی آزادیوں کے راستہ پر گامزن ہے، جن سے مغربی جمہوریتیں فیضیاب ہورہی ہیں۔ یہ مغر

[illegible] حقیقت میں بگڑی ہوئی عیسائیت کے خلاف ایک ردعمل تھا، اور جسے سرمایہ داری نے زیادہ وسیع نہیں کیا تھا۔ اشتمالیت نے سرمایہ داری [illegible] چنانچہ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس پر آئندہ سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سوویٹ اشتراکیت کا اتحاد ممکن ہے (مدیر)
[illegible] کے نیچے کوئی دلیل نہیں ہے۔ جب اشتمالیت مادہ پرستی اور خودغرضی کے اس بنیادی محرک کو ختم نہیں کرتی جو دراصل طبقہ وارانہ [illegible] سرمایہ داری قائم کرکے اس کو اوپر سے دبا دیتی ہے تو پھر اس خوش فہمی میں مبتلا ہوجانا صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اشتمالیت جتنے بڑے پیمانے کی [illegible] قائم کرتی ہے اس کے خلاف اتنے ہی بڑے پیمانہ پر کشمکش بھی ہوگی۔ اس کشمکش کی ایک صورت یہ ہے کہ [illegible] ممالک کے ایک ایک [illegible] کر باہم دست وگریباں ہوجائیں۔ چنانچہ کمیونزم کی تاریخ میں ابھی سے اس کشمکش کے آثار نظر آرہے ہیں (مدیر)
[illegible] مارکس کی اس پیشین گوئی کے اعتقاد پرستی ہے جو اس نے اشتمالیت کی تکمیل کے بعد اشتمالی آمریت کے خود بخود "مٹ جانے" کے بارے میں کی ہے [illegible] یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشتمالی آمریت جب ایک بار قائم ہوجاتی ہے تو وہ ایک مدت ماحول سے سازگاری پیدا کرنے کی خاطر اپنی بلند خیالی سے مسلسل نیچے [illegible] اس تنگ خیالی پر لوگوں کا اعتقاد متزلزل نہ ہوجائے آمریت کے شکنجہ کو دن بدن مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔ (مدیر)

اور یہ تعاون ان دونوں فریقوں کے مفاد کو پیش نظر رکھے گا۔
درمیان ایک ایسے قریبی رشتہ کا ذکر
کہ درمیان نہ ہو
بازو کی طرف سوویٹ روس کے رجحان کے متعلق آجکل بکثرت قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، ان قیاس آرائیوں کا سرچشمہ
وہ سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد اور موجودہ جنگ سے پیشتر بعض ان تیز اشتراکی قوانین کی ترمیم کے لئے اختیار کیا گیا، جو انقلاب کے پہلے مرحلے میں ظہور پذیر ہوئے
تھے، محدود زراعتی جائداد کی واپسی، حکومت کے قرضوں پر منافع صادر کرنا، اور امداد باہمی کے اداروں کی تشکیل کرنا، محدود حق میراث کا تصفیہ اور زائد
شخصی آمدنیوں پر خفیف محصول عائد کرنا وغیرہ یہ وہ تدبیریں تھیں، جن کو سامنے رکھ کر بعض مبصرین نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ تدبیریں سوویٹ اتحاد کے بائیں
بازو کی طرف میلان رکھنے اور اس کے بنیادی نظام کو تبدیل کر دینے کا ردعمل ہیں لیکن یہ اندازہ فاش غلطی پر مبنی ہے۔ کیونکہ یہ ترمیم اس کے علمبرداروں کی نظر میں
اشتراکیت پرست سوویٹ جمہوریت کے فطری انقلاب کا ذاتی نتیجہ ہے[۵]
میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر سوویٹ اپنے نظریات کو آمریت کے شائبہ سے محفوظ رکھے اور سیاسی آزادیوں کی راہ میں آگے بڑھے، تو اس کے اور جمہوریتوں کے درمیان
اتحاد کے پورے امکانات پیدا ہو جائیں گے، اور جیسے جیسے سوویٹ اتحاد اس راستہ میں پیشقدمی کرے گا اس کے اور جمہوری حکومتوں کے درمیان جو پردے ہیں
وہ چاک ہوتے جائیں گے، اور ان کے ساتھ سوویٹ اتحاد کا تعاون بین الاقوامی گوشوں میں مضبوط و مستحکم ہو جائے گا۔

موجودہ جنگ کے نتائج واثرات

اس جنگ کے نتائج سے اجتماعی واقتصادی زندگی میں باہم نظم اور ہم آہنگی کا ظہور ہوگا کیونکہ اس جنگ
نے انسانیت کو بھاری قیمت ادا کرنے پر مجبور کیا ہے اس سے پیشتر ماضی میں کسی جنگ نے اتنی بھاری قیمت
ادا کرنے پر انسانیت کو آمادہ نہ کیا تھا، اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت سی بوسیدہ مادی قدریں منہدم ہو جائیں گی، اور ان کے خاتمہ سے یورپ اور دنیا کے تمام ملکوں میں
طبقات اور قوموں کے درمیان اقتصادی ملکیتوں میں مساوات پیدا ہو جائے گی۔

موجودہ جنگ کے میدان میں جو حکومتیں کود پڑیں ان کی مالی حالت اس وقت سے مختلف ہے جبکہ وہ پہلی جنگ عظیم میں داخل ہوئی تھیں، کیونکہ ان میں سے اکثر حکومتیں
پہلی جنگ عظیم میں ایسی حالت میں داخل ہوئیں جبکہ ان کے خزانے سونے اور چاندی سے معمور تھے لیکن اس مرتبہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو چھوڑ کر یہ حکومتیں خالی
خزانوں کی مالک ہیں، ان کے ہی زبون حالت میں آمری حکومتیں بھی اس وقت جنگ میں داخل ہوئیں، جب کہ ان کی مالی حالت خطرناک تھی، اور وہ فقر وافلاس
سے دوچار ہو گئی تھیں، اسی وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ جنگ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر عوام پر بھاری مالی بوجھ ڈالا جا رہا ہے اور حکومتیں ان سے سختی کے ساتھ
قرضے وصول کر رہی ہیں چنانچہ قوم اور حکومت دونوں وقت واحد میں مال کے ذریعہ جنگ کی پرورش کر رہے ہیں، نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ حکومت کا مالیہ قوم
کا مالیہ، اور قوم کا مالیہ حکومت کا مالیہ بن گیا ہے۔ اس طرح دونوں تقریباً ایک ہی خزانے پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس جنگ کے بعض نتائج براہ راست پیداوار اور تمام صنعتوں کی تنظیم سے متعلق تھے، جن کی وجہ سے مصنوعات میں گہری تبدیلی و ترمیم ہوئی کیونکہ وہ تمام
صنعتیں جو جنگ کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں، حکومت یا اس کے انتظامی محکمہ کی نگرانی میں چلی گئیں، بالفاظ دیگر یہ صنعتیں بڑی حد تک حکومت کی ملک بن
گئیں۔ اسی طرح جن صنعتوں کی شاخوں پر مختلف کمپنیاں قابض تھیں، وہ حکومت کی ملک بن گئیں یا حکومت نے ان صنعتوں کو جماعت کی ملک قرار دے دیا
صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کا یہ سلسلہ ہرگز صنعتی شعبوں تک ہی محدود نہ رہے گا بلکہ وہ زراعتی گوشوں پر بھی پھیل جائے گا[۶]
چنانچہ یہ تمام تبدیلیاں ان حکومتوں کو جن میں یہ تبدیلیاں واقع ہوئیں یا ان کے ہونے کی توقع ہے، حکومتی اشتراکیت میں داخل کرنے کا سبب ہرگز نہ ہوں گی بلکہ یہ تبدیلیاں

---

[۵] اشتمالیت کے اپنے مقام سے نیچے اتر آنے کی یہ ایک واضح مثال ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ اس نیچے اترنے اور سرمایہ دارانہ جمہوریت سے مماثلت پیدا کرنے کو سوویٹ جمہوریت کا ارتقا
بتا رہا ہے۔ (مدیر)

[۶] سرمایہ دار حکومتوں کا جنگ کے زمانہ یا غیر معمولی حالات میں اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف ارتقا، در اصل اس بات کی علامت ہے کہ ان حکومتوں کے
کا کردار اس قدر بودا ہو گیا ہے کہ وہ اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایثار اور سرفروشی سے کام نہیں لے سکتے۔ چنانچہ سرمایہ داری اس مرض کو دور کرنے اور مریض کا علاج
کرنے کے بجائے اس کی بیماری کو جوں کا توں دیکھتے ہوئے اس کی جلی ہوئی حالت کے مطابق اس پر نیا خول چڑھا رہی ہے۔ اور اشتمالیت خوش ہے کہ اس نے ترقی یافتہ

طبقات کو ایک دوسرے سے قریب کر دیں گی، ان کے آپس کے امتیازات اور حسد کو مٹا کر انہیں براہِ راست طبقاتی وحدت کے نظام سے وابستہ کر دیں گی"۔

اس قسم کی تبدیلیوں کا جنگ کے دوران رونما ہونا لوگوں کے ذہنوں میں ان کی شدت کو کم کرے گا، کیونکہ جنگ کی ہمیشہ یہ شان رہی ہے کہ وہ عوام کے ذہنوں کو نئے انقلابات اور تغیرات کو قبول کرنے کے لئے تیار کر دیتی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو حکومتیں ایسی اندرونی پریشانیوں اور طوفانی مصائب و مشکلات میں گھر جاتیں، جن سے زندگی کے شعبوں میں کسی قسم کی تبدیلی یا تغیر پیدا کرنا دشوار ہو جاتا۔ یہ تغیر و تبدیلی حکومتوں کی اقتصادی و مالی سیاست پر بھی اثر انداز ہوگی اور جمہوری حکومتیں بعض ان اقتصادی تجربات پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوں گی جن سے آمری حکومتوں اور سوویٹ اشتراکی جمہوری سلطنتوں کو سابقہ پڑ چکا ہے موجودہ دور میں ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض انقلاب انگیز اقتصادی نظریات، ان نظریات کے موافق ہیں، جن کا اعلان برطانیہ کے ممتاز، تجربہ کار ماہرین اقتصادیات نے گذشتہ جنگ کے بعد کیا ہے، لیکن موجودہ جنگ کے بعد تو اقتصادی قدروں کو انسان کے عمل پر موقوف رکھا جائے گا، نہ کہ سونے اور چاندی کے ڈھیر پر، حکومت اس عمل کی قدر و قیمت کا اندازہ کرے گی اور اسی کو اپنے مالیات کا دستور قرار دے گی "پھر حکومت" یورپ کے اکثر شہروں کے مصارف پر قبضہ کرے گی اور ان مصارف کو ایسی تمام انجمنوں اور اداروں کی تحویل میں دیدے گی جو سرمایہ دارانہ ناجائز منفعتوں کی خاطر نہیں، بلکہ رفاہِ عام اور نوعِ انسانی کے مفاد کی خدمت کرتی ہوں، اس وقت ان اداروں میں دولت کا ارتکاز انسانوں کے ایسے مخصوص گروہ کی غیر محدود آمدنیوں کے تحفظ کا وسیلہ ہوگا جو جدوجہد نہیں کرتے بلکہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں[5] بلکہ تمام مالیاتی شعبے حکومت کے سیاسی قوانین کے تابع ہوں گے اور جو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہوں گے۔

جنگ کے بعد زرعی گوشوں میں زبردست اصلاحات رونما ہوں گی چنانچہ حکومتیں زمینوں کے بہت بڑے حصہ پر قابض ہو جائیں گی، تاکہ جدید فنی اصولوں کے ذریعہ جماعت کی مصلحت اور مفاد کی خاطر ان زمینوں کی پیداوار بڑھا دیں، ان زرعی اصلاحات کو بعض ملکوں میں عملی جامہ پہنایا گیا ہے، اور دوسرے ممالک میں یہ نظریات[6] ابھی دائرۂ عمل میں نہیں آ سکے ہیں، لیکن ضرورت اس امر کی مقتضی ہے کہ افراد امدادِ باہمی کی انجمنوں اور بلدی و سرکاری اداروں کے درمیان عادلانہ شکل میں زمینوں کی تقسیم کر دی جائے، تاکہ تمام ان اراضی سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ اسی طرح حکومت کا یہ فرض ہے کہ قوم کے اندر جو زراعت پیشہ اور صنعت پیشہ افراد ہیں ان کے درمیان عددی تناسب کی حفاظت کی کوشش کرے، غالباً اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ زرعی صنعتوں کی تشکیل ہے۔

اگر ان اقتصادی، زرعی، اور صنعتی انقلابات کے اثر سے جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں، اجتماعی زندگی میں یہ توازن اور نظم و ضوابط پیدا ہو جائے، تو انسانیت ایسے معاشرہ کے تصور کی تکمیل سے قریب تر ہو جائے گی جس میں طبقاتی کش مکش کا اصول ناپید ہوگا، یہ معاشرہ خالصتاً اشتراکی بنیاد پر قائم نہ ہوگا، لیکن اس کے اندر جو تغیرات رونما ہوں گے، وہ موجودہ معاشرہ سے بالکلیہ مختلف ہوں گے، چنانچہ اس میں حقوقِ کار، اوقاتِ کار اور ان کی ہم آہنگ مختلف ضمانتیں وغیرہ جیسے بہت سے نئے دستوری اصولوں کا ظہور ہوگا، اور اقتصادی خوش حالی کی بدولت اس بے روزگاری کا خاتمہ ہو جائے گا، جو صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کے عہد میں پھیل گئی تھی۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، کہ جمہوری نظام میں سب سے پہلے فرد کی اصلاح کا خیال رکھنا چاہئے اور یہ اصلاح اس کی ذات سے کرنی چاہئے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی نظام کسی قوم کی حالت میں ہرگز تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا جب تک کہ اس قوم کے افراد بذاتِ خود نہ بدلیں

جنگ کے بعد جمہوری حکومت کا راستہ

پہلی جنگ عظیم کے بعد جمہوری حکومتوں نے اپنے لئے جو سیاست اختیار کی اگر ہم اس کا جائزہ لیں، تو یہ امر منکشف ہو جائے گا، کہ ان حکومتوں نے بڑی بھاری غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے،

دونوں کو دنیا میں رائج کر دیا۔ حالانکہ دونوں ایک غلط قدم اٹھا رہی ہیں۔ ان کے سامنے مریض کی اصلاح اور اس کی بیماری کے علاج کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ بیماری کو سماج میں تغیر سے تعبیر کر کے اس کے سب پر ایک اور نظام لا دہی ہیں۔ (مدیر)

[5] یہ جذبہ تو بہت اچھا ہے۔ لیکن حکومت کے افراد کی آزادانہ جدوجہد پر قبضہ کر لینے سے جہاں بھلائی کی امید ہو سکتی ہے وہیں برائی کی امید بھی ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح کی برائی جیسے ایک سرمایہ دار اپنے اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کرتا ہے۔ (مدیر)

[6] یہاں مصنف نے درمیانی راہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور فرد اور جماعت میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے سرمایہ دارانہ انفرادیت کے جذبہ کی آ

ان غلطیوں کی وجہ سے اکثر لوگ ان جمہوری حکومتوں اور آمری سلطنتوں کے درمیان کچھ فرق نہیں پاتے، اس لئے کہ جمہوری حکومتیں اکثر حالات میں اپنے جمہوری اصولوں سے برگشتہ ہو گئیں، اور انتہائی بھونڈے طریقہ سے ان اصولوں کو معرض عمل لانے سے روگردانی کی، ان کا پہلا مقصد یہ تھا، کہ آمری حکومتوں کے ساتھ معاہدے ہوں کے اصولوں سے میل کھائیں، یا ان کے مخالف ہوں۔

اسی لئے میں اس سیاسی بنیاد کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جس پر بیسویں صدی کی جمہوریت کو اٹھنا چاہیے، نیز وہ کیا طے کرنے ہیں، جنہیں جمہوریت کے رہنماؤں اور پیشواؤں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

علمبرداران جمہوریت کا فریضہ یہ ہے، کہ وہ سیاست پر اس لحاظ سے نگرونظر کریں کہ سیاست اگر ایک طرف حقیقی علم و حکمت ہے تو دوسری طرف وہ ایک فن اور صنعت گری ہے۔ اور ایک خاص فن کارانہ اثر آفریں حالت ہے کیونکہ سیاست خواہ اپنے روحانی گوشوں میں ہو، یا اخلاقی و عملی پہلوؤں میں، اجتماعی اثر آفرینی میں پہلے درجہ پر قدم دھرتی ہے، اس لحاظ سے سیاست علم (SCIENCE) فن (ART) اور فلسفہ (PHILOSOPHY) تینوں ہے۔

علوم و فنون کی درجہ بندی اگر علوم و فنون کی درجہ بندی کریں، تو ان کو ہم ایک دوسرے کے ساتھ حسب ذیل ارتقائی ترتیب میں پائیں گے۔ علم نجوم، ریاضیات، طبعیات، کیمیا، حیاتیات اور علم الاجتماع۔ ان تمام علوم میں علم الاجتماع انتہائی پیچیدہ اور سب سے زیادہ شاندار ہے، کیونکہ وہ انسان کے ساتھ اس لحاظ سے متعلق ہے کہ انسان سماج کا خلیہ (Cell) ہے، اور عام طور پر دنیا کے انقلابات و تغیرات کا محور و مرکز ہے۔ سیاست کا کام تو صرف یہ ہے کہ سائنس کی طرح علم الاجتماع کو عملی طور پر آشکارا کر دے، گویا سیاست عملی علم الاجتماع ہے، یعنی یک علم ہے، جو انسانی زندگی کے سارے اجتماعی مظاہر اور انسان کے تمام افعال اور آرزوں پر محیط ہے، میدان سیاست کے شہسواروں سے سیاست یہ مطالبہ کرتی ہے، کہ وہ ان تمام علوم و فنون سے واقف ہوں، جو انسان اور اس کی سماجی اثر آفرینی سے متعلق ہیں، مثلاً تاریخ، قانون سیاسی اقتصادیات، جغرافیہ، مردم شماری، قومیات، الٰہیات، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ

جمہوری سیاست کے اجزائے ترکیبی جمہوری علم سیاست کے لئے یہ ضروری ہے کہ فرد اور سماج کے موجودہ حالات پر گہری نظر رکھے، ان دونوں کے درمیان جو موجودہ تعلقات ہیں، اور آئندہ ان تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیے، ان سب کا خارجی مطالعہ کرے، سماج کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے حالات و کیفیات کا موضوعی تجزیہ کرے، اس سے اس کا پہلا مقصد حقیقت کی طرف رہنمائی ہو، جمہوری علمبردار سیاست کا فریضہ یہ ہے، کہ ایک سائنسداں کی ذہنیت سے آراستہ ہو، وہ ہر روز کوشش کر کے اپنے اندر عام سیاسی حالت کا مراقبہ کرے، اپنے سیاسی غور و فکر میں ان تخلیلی قوتوں کو اختیار کرے جو ٹھوس اور پختہ کار انسان کو کھلے کھلے اور خامکار انسان سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

یہ سیاست وہ ہے، جو علم و حکمت کے اصولوں پر منطبق ہوتی ہے، رہی وہ سیاست جو بطور ایک فن کے استعمال ہوتی ہے، وہ بعض مصنفوں اور انشاپردازوں کی نظر میں تمام فنون (Arts) سے ارفع و اعلیٰ ہے کیونکہ سیاست داں ایک فن کار (Artist) کی طرح اختراع نواز اور ایجاد پسند ہے، اپنی سیاسی اثر آفرینی کے ذریعہ سماج کو نئے مقاصد کی طرف کھینچتا ہے، اور ہمیشہ اس امر کی سعی کرتا ہے، کہ سماج کی شکلوں اور اس کی زندگی کی تصویروں میں نت نئے رنگ بھرے، اس بارے میں اس کی مثال ایسے مصور کی طرح ہے، جو ہر روز بے جان مادہ کو ایسی شکل میں نمودار کر دیتا ہے، جو اس کی اگلی شکل کے مغائر ہوتی ہے۔

مثالی جمہوری سیاست داں سیاست داں فن کار کی طرح اپنے نفس، اپنی روح، اپنے افکار و احساسات اپنی تجویزوں اور اپنے منصوبوں کو اجتماعی زندگی کے ڈھانچہ میں گھول دیتا ہے۔ وہ سائنس داں کی طرح خواب و خیال کی وادی میں گم، فکر و تدبر کی دنیا میں سرگرداں اور واقعات و حقائق کے میدان میں گامزن ہوتا ہے۔ پھر وہ فنکار کی طرح اپنے تجربات اور معلومات کے اندر تغیر و تبدل پیدا کرنے اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ سیاست داں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نفسیات، نظریات اور عملیات پر پوری دستگاہ رکھے، نفسیات کے بنیادی نظریات پر حاوی ہو۔

بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اجتماعی نظام کو وہ فرد کی حالت سے باندھ دیتا ہے۔ حالانکہ جس طرح فرد جماعت پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح جماعتی نظام بھی افراد کی حالت کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ (مدیر)

لیکن اگر اس کے اندر نفسیاتی مشاہدہ کی قوت موجود نہ ہو تو محض نفسیاتی علم اس کے لئے کافی نہ ہوگا کیونکہ نفسیاتی مشاہدہ ہی کی بدولت وہ انسانوں کے تمام حالات و اثرات کا ادراک کر سکتا ہے، اسی لئے سیاست داں کو زندگی میں طویل تجربات رکھنے والا ہونا چاہئے، کیونکہ کتابیں تنہا اس کی شخصیت کو بنانے کی سکت نہیں رکھتیں۔

اہم اور نازک سیاست کے میدان میں صرف وہی اشخاص قدم دھر سکتے ہیں جو نفسیاتی شعبوں میں پورا تجربہ اور کامل مہارت رکھتے ہوں، اور اپنے لئے ایک ایسا فلسفہ تخلیق کر چکے ہوں، جس کو وہ اپنی سیاست میں استعمال کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے سیاست دان سائنٹسٹ داں بھی ہے، اور فنکار اور فلسفی بھی، کیونکہ وہ سائنس داں کی طرح اجتماعی مظاہر و واقعات کی فطرت کا انکشاف ان کی تحلیل، ان کا تجزیہ اور ان کی حد بندی کرتا ہے اور فنکار کی طرح اشیاء کائنات میں نظم و استحالہ پیدا کرنے اور ان کو ہموار و آراستہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، مستقبل کے امور کو بھانپ لیتا اور ملک کو ایک نئے نقطہ نظر کے ذریعہ آشکار کر دیتا ہے فلسفی کی طرح مخصوص صورتوں میں اور دانشور اور مورخ کی طرح ان مادی و معنوی اسباب کے بارے میں تلاش و جستجو کرتا ہے جن کے ذریعہ سماجی انقلاب کی تکمیل ممکن ہے، سیاستدانوں کی یہ تین بنیادی خصوصیات ہیں، لیکن تنہا یہی صفات کافی نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی شخصیت باوقار ہو، اس کے ایمان میں اعتدال و استقامت ہو، اس کے آراء و افکار مستحکم ہوں، اس کے اندر جرأت اور حوصلہ مندی ہو، اس کے اخلاق پسندیدہ ہوں، اس کی فکر مستقل، اس کی ذات خواہشات نفسانی سے پاک اور صبر و عزیمت کی صفات سے آراستہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مثالی جمہوری سیاست داں، جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے، ایسا شخص نہیں ہے جو متعصب اور سطح بین ہو اور نہ ایسا شخص ہے جو جمہور کو دھوکہ دے، اور غیر نتیجہ خیز انفرادی تدبیر انگیز باتوں کے ذریعہ جمہور کو مبتلائے فریب کرے بلکہ وہ ایسا شخص ہے، جو عملی میدان میں اپنے اخلاق کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جیسا کہ وہ نظریات کے شعبہ میں اپنے فکر و تدبر کا شائستہ مظاہرہ کرتا ہے۔

یہ وہ شخص ہے جو اپنے علم اپنے فن اور اپنے فلسفہ کے ذریعہ ماضی کے چوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اور ان راہوں میں سے مستقبل کی راہ کا انتخاب کر لیتا ہے! اس حسن انتخاب کیلئے اس پر ضروری ہے کہ اپنے [illegible] رائے اور عقیدہ کے درمیان فرق کرے، اس کو موجودہ حالات کے متعلق پوری معلومات ہوں، اور سیاسی مشکلات و مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت ہو، اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ وصف پایا جائے کہ سیاسی میدان میں جو چیز ممکن اور ناممکن ہے اس کا اپنی ذہانت کے ذریعہ اندازہ کرے، اگر وہ ان تمام قوتوں سے کام لیگا جن میں مثالیت (IDEALISM) اور واقعیت یکساں لگتی ہیں، تو اپنی قوم کو راہ راست پر لا سکتا اور اس کو مستقبل کے خطرات اور بے خطر راستہ پر چلنے کے لئے آمادہ کر سکتا ہے۔

میں ان صفات و خصوصیات کی بحث کو تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتا، جو مثالی جمہوری سیاست داں کے اندر وافر طور پر پائی جانی چاہئیں کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ میں ان صفات کی تعداد کو ختم نہ کر سکوں گا لیکن میں مختصراً ان صفات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ سیاست داں کو چاہئے کہ وہ فکر و عمل کا پرستار ہو، عقیدہ اور جد و جہد کا علمبردار ہو، اپنے فکر و نظر کی روشنی میں انسانیت کے لئے تاریخی فلسفیانہ انقلاب کا کھوج لگائے اور اس سے جدید نمونہ اور اعلیٰ مثال پیدا کرے، پھر اس نمونہ اعلیٰ کو عملی گوشوں میں رونما کرنے کے لئے اپنی روزمرہ کی سیاست میں ان فنی اسباب سے کام لے جو اس کے علم اس کے تجربات اس کے اخلاق اور اس کی ثابت قدمی سے حاصل ہوتے ہیں۔

جمہوری نظام میں رہنما کے فرائض

[illegible] جس سے جمہوریت جنگ کے بعد دوچار ہونے والی ہے، کیونکہ جمہوری [illegible] یہ نہیں ہوا کہ وہ ایک فاسد نظام ہے، بلکہ اس لئے انحطاط کا شکار ہوئی کہ [illegible] جمہوری نظام کی قیادت [illegible] وہ اس قیادت کے متعلق سزاوار اور اہل نہ تھے۔

جمہوری ملکوں میں لیڈروں اور رہنماؤں کے انتخاب میں حسب و نسب یا موروثی رسم و رواج، یا دولت و ثروت وغیرہ ان اعتبارات میں سے کسی چیز کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، جن کو قدیم جاگیردارانہ نظام میں پہلا مقام حاصل تھا، بلکہ جمہوری رہنما کا محض اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی کی قوتوں کی بدولت

انتخاب کیا جاتا ہے اس کا انتخاب کرتے وقت صرف انہی خصوصیات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ان کے علاوہ دوسرے اوصاف و خصائص کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ یہ ہے صحیح جمہوری نظام کا مطالبہ اور مقتضا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعض جمہوری حکومتیں اب تک اپنے انتخابات میں جاگیردارانہ اعتبارات و خصوصیات سے متاثر ہیں، چنانچہ مثال کے طور پر انگلستان دارالامرا (HOUSE OF LORDS) کے اراکین کا خود تعین کرتا، اور ان کا مشہور خاندان اور خاص طبقہ سے انتخاب کرتا ہے، اس طرح انگلستان میں رہنماؤں کا ایک ایسا گروہ پایا جاتا ہے، جو اپنا رسوخ و اثر وراثت، دولت و ثروت، اور اس بادشاہ کے ارادے سے حاصل کرتا ہے، جو امرا کا تقرر کرتا ہے، لیکن فرانس جیسی دوسری حکومتوں نے ان اعتبارات کا پوری طرح خاتمہ کر دیا، اپنے انقلاب کے ذریعہ جاگیرداری کے باقی ماندہ آثار مٹا دیئے۔ اور اپنے لیڈروں کا انتخاب اس طرح کرنے لگے، جس میں حسب و نسب اور شخصی اثر کا کچھ بھی دخل نہیں تھا۔

جمہوری و آمری قائد کا موازنہ

یہ تھا وہ طریقہ قیادت جو جمہوری نظام کا ایک ضروری اور اہم بنیادی اصول ہے، لیکن آمری نظام میں قیادت کا طریقہ انقلاب اور بغاوتوں سے ہموار کیا جاتا ہے، لیڈر کسی بغاوت اور انقلاب کے دوش پر سوار ہو کر حکومت کا تختہ الٹ دیتا ہے، اور کچھ عرصہ بعد یہی قائد فیوہرر یا دوتشے کہلانے لگتا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ قائد اور حکومت ایک ہی شئے بننے والی ہے، حکومت کا سارا اقتدار آئندہ اسی قائد کے قبضۂ قدرت میں سمٹ کر آجائے گا، انتخابات ان اختیارات کی کمی بیشی کا کوئی حق نہیں رکھتے، کیونکہ لیڈر حکومت اور قوم کا اشارہ ہے یہی ان دونوں کے ارادہ و اقتدار کا مظہر ہے، چنانچہ لیڈر کا مطلق العنان ارادہ ہی یکساں طور پر ان دونوں کا ارادہ ہے۔

جمہوریت ان طریقوں کا سختی سے انکار کرتی ہے، اس انکار سے ان مشکلات میں دوگنا اور چوگنا اضافہ ہو جاتا ہے، جن سے علمبرداران جمہوریت دوچار ہو رہے ہیں کیونکہ قوم نے جس آمری لیڈر کا آزادانہ انتخاب نہیں کیا ہے، وہ کسی کے سامنے اپنے اعمال کا ہرگز جوابدہ نہ ہوگا، اور اس پر اپنا حساب کتاب پیش کرنے کی ذمہ داری نہ ہوگی، اور نہ ہی اس کے آس پاس کوئی پارلیمان ہوگی، جو اس کی ہر چھوٹی بڑی حرکت کے بارے میں باز پرس کر سکے، اس وقت یہ لیڈر نہایت تیزی سے من مانے تصرف کرے گا۔

بخلاف اس کے جمہوری رہنما اس عقلی نظام کی پیداوار ہے، جو انسانوں کے درمیان مساوات اور روزمرہ کی سیاست میں انقلابی وسائل کی آزادانہ بحث و جستجو کے اصول پر مبنی ہے چنانچہ اس رہنما کا یہ فرض ہے، کہ ان ذمہ داریوں کا احساس کرے جو اس پر عائد کی گئی ہیں، نیز رائے عامہ کے رجحانات کی نگہداشت کرے، وہ روشن ضمیر ہو، ایسی عقل و دانش کا حامل ہو جو ہمیشہ گہرے فکر و تدبر اور تحلیل و تجزیہ کی طرف مائل ہو، اکثر دفعہ جب کہ وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو حیرت و سرگردانی کے عالم میں پڑ جاتا ہے، کیونکہ اس کے ایک طرف پارلیمان ہے اور دوسری طرف اس کی پارٹی ہے پھر رائے عامہ بھی اس کی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی کام شروع کرے، ان تمام عوامل و عناصر کا اس کو پوری طرح اندازہ کرنا ضروری ہے، یہاں جمہوری سیاست داں میں یہ اساسی صفت یعنی آگے بڑھنے اور اقدام کرنے والے لیڈر کی صفت ادھمل ہو جاتی ہے، اور اس پر سوچ بچار کرنے والے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے والے انسان کی صفت غالب آجاتی ہے۔

آمری لیڈر صرف اس امر پر اکتفا کر لیتا ہے، کہ کسی شئے کو اپنا پابند حکم بنائے لیکن جمہوری قائد اپنے مددگاروں سے مشورہ کرتا ہے، اور اپنے ہر قول و فعل کے لئے قوم کے نمائندوں کی ہمنوائی و موافقت حاصل کرنے کا حاجتمند رہتا ہے، اسی لئے جمہوری رہنما کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بلند فکر، شائستہ اور مہذب ہو، تاکہ اپنی قوم کی ضرورتوں کا حقیقی طور پر اندازہ کر سکے، اور اپنے تمام اعمال میں قوم کی خواہشات اور اس کی آرزوؤں کا خیال رکھے، اس کا یہ بھی فرض ہے کہ بہادری کے ساتھ اپنی غیرت و حمیت، اپنے اخلاص و عزیمت اور صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے، تاکہ اس پر عائد کردہ تنقیدوں کا جواب دے سکے۔ اور اس پر ہونے والے تمام اعتراضات کی تردید کر سکے، کیونکہ قوم اپنی حسب مرضی رائے کا اظہار کرنے میں آزاد ہے، قوم کو خاموش کرنے یا اس کے شکوک و شبہات اور اس کے اعتراض کی تردید کا واحد راستہ خوش اسلوبی کے ساتھ بحث کرنا اور مجادلہ کرنا ہے، رہے جبر و اکراہ کے طریقے، تو ان کے لئے جمہوری نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہوری رہنما آمری لیڈر سے پہلے سیاسی بڑھاپے کا شکار ہو جاتا ہے، وہ قوم پرستانہ تصورات سے کنارہ کش ہوتا اور اپنے فرائض کو انجام دینے کے سلسلے میں لوگوں کے طعن و تشنیع کی آماجگاہ بن جاتا ہے، اس لئے اس کا فرض ہے، کہ اس حالت کو تعجب کی نظر سے نہ دیکھے اور اپنی قوم کی پیشانی پر نافرمانی کی مہر ثبت نہ کر دے، کیونکہ جمہوری نظام کے مزاج کا یہی تقاضا ہے کہ صرف تاریخ ہی آئندہ یہ فیصلہ کر سکتی ہے، کہ کونسا رہنما اپنی قوم کے لئے مخلص اور وفا شعار

تھا، اور کس لیڈر نے قوم کی امانت میں خیانت برتی، اور اس کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا۔

درمیانی راہ میں نے جمہوری قیادت کے متعلق اور جمہوری سیاست کے بارے میں اس کے علم و فن ہونے کے لحاظ سے جو خیالات پیش کئے ہیں، ان کا اگر کوئی شخص مطالعہ کرے گا، تو اس عقیدہ میں میرا ہمنوا ہوگا، کہ حکومت کا مثالی شخص وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر جمہوری قائد کی حقیقی صفات اور آمری لیڈر کے بعض اوصاف کو سمیٹنے کی طاقت رکھتا ہو، اس لحاظ سے وہ نہ صرف علم پرور، تعقل پسند اور تحمیں نواز شخص ہوگا نہ کہ نرا فلسفی و متفکر، پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ اقدام پسند اور آہنی عزم و ہمت والا فرد بھی ہوگا چنانچہ اس کے اندر ایک طرف علم و حکمت سے ترکیب پائی ہوئی بلیغ ذہانت، شائستگی اور عالی ظرفی موجود ہوگی تو دوسری طرف فیصلہ کن تیز ارادہ اور جسمانی و روحانی ہمت و حوصلہ ہوگا اور وہ ان دونوں کے امتزاج کا آئینہ دار ہوگا۔[51]

جمہوریت کا مستقبل

جمہوریت اس جنگ میں ان کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گذر چکی ہے جن سے وہ اپنی تاریخ میں آشنا ہوئی ہے، آج کل نازی، فسطائی اور سوویٹ اشتراکی ممالک اور جمہوریت کے درمیان جو سخت تصادم برپا ہے، اس کا اثر جمہوریت پر اس وقت بھی پڑے گا، جبکہ وہ اس جنگ سے کامیاب و فتحمند ہو کر نکلے گی۔

اسی لئے میں ان رجحانات کی طرف عام اشارات کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جن کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے، کہ جمہوریت جنگ کے بعد ان رجحانات کی طرف مائل ہوگی وہ رجحانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جمہوریت کا پہلا رجحان حکومت کے اقتدار کو غالب کرنے اور اس کے سیاسی و اجتماعی فرائض کی زیادتی کی طرف ہوگا، اس معاملہ میں وہ وطن پرست اشتراکیت، فسطائیت اور اشتمالیت کے دوش بدوش چلے گی، لیکن وہ اس انتہائی حد پر نہیں پہنچے گی، جہاں تک ان تحریکوں کے علمبردار پہنچے ہیں، بلکہ وہ ایک حد پر جا کر ٹھہر جائیگی، چنانچہ وہ حکومت کے اختیارات کو خاص شکل کے ساتھ اقتصادی، مالی امور اور مواصلات تک وسیع کر دے گی، کیونکہ ہم نے اس جنگ میں مشاہدہ کر لیا، کہ وہ اس آزاد اقتصادی نظام سے رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی ہے، جو نئے زمانہ کی ضرورتوں کے ساتھ موافقت نہیں کرتا، لیکن جمہوریت اس راہ میں اپنی مجالس دستور ساز اور عدالتی اداروں کو ہرگز قربان نہ کرے گی، جیسا کہ آمری حکومتوں نے قربان کر دیا، بلکہ وہ ان کے احترام کی پاسبان ہوگی، اور اس کے لئے ممکنہ کوشش کرے گی، کہ جمہوریت کے سہ گانہ اختیارات۔ قانون بنانے، قانون چلانے اور فیصلے صادر کرنے ۔۔۔ کے درمیان توازن اور ہم آہنگی برقرار رہے۔

۲۔ جمہوریت کا دوسرا رجحان ان غلطیوں اور کمزوریوں کی تلافی کرنے کی طرف ہوگا۔ جو اب تک جمہوری نظام سے سرزد ہوئی ہیں، نیز یہ رجحان ان کی پوری اصلاح کی کوشش کرنے پر مشتمل ہوگا، ان غلطیوں کا ہراول دستہ وہ نقائص ہیں، جو انتخاب، صحافت اور جماعتوں کے قوانین سے متعلق ہیں، چنانچہ جمہوریت ان تمام میں بالکلیہ ایسی ترمیم و اصلاح پیش کرے گی، جو حقیقی طور پر جمہوریت کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کر دے، صحافت کی اس طرح تنظیم کرے گی، کہ اس میں شر و فساد کے عناصر اور رشوت ستانی کا سلسلہ باقی نہ رہے گا، مختلف پارٹیوں کو اس شکل میں منضبط و مربوط کر دے گی، کہ وہ جمہوری زندگی کا آلہ کار ہو جائیں گی اور تہور انگیز رہنماؤں اور جھوٹے لیڈروں کی خواہشات کا آلہ کار نہ رہیں گی۔ اسی طرح دستور ان متعدد پارٹیوں کی تعین کرے گا، جن کی تشکیل قانونی رو سے جائز ہو، اور ان اصولوں کی تشریح کرے گا، جن پر ان پارٹیوں کو برپا ہونا چاہئے۔

۳۔ جمہوریت اجتماعی مشکلات پر اب تک جتنی توجہ صرف کر رہی تھی، اس سے کہیں زیادہ توجہ ان پر صرف کرے گی، ہم دیکھ رہے ہیں، کہ آمری تنظیمیں خود اپنے لئے بعض اشتراکی تدابیر اپنے مخصوص طریقوں میں اختیار کر رہی ہیں، تاکہ اشتمالیت کے لئے اس کے مزدور طبقوں میں راہ پانے کی گنجائش باقی نہ رکھیں، اس لئے جنگ کے بعد مستقبل کی جمہوریت کا فرض ہے، کہ اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ کرے اور ان انقلابی وسائل کو اختیار کر کے سماجی انقلاب کا تدارک کرے جو مزدور طبقوں کی

---

[51] اس بات میں ڈاکٹر بیتس کا تجربہ بہت صحیح ہے۔ وہ سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ایک مثالی جمہوری ریاست کی رہنمائی صرف وہ افراد حاصل کر سکتے ہیں جن کا کردار بے داغ ہو اور جو پروپیگنڈے اور انتخابات کے موجودہ غلط طریقوں کے ذریعہ اوپر نہ آئے ہوں بلکہ اپنے مثالی کردار کے باعث ابھرے ہوں (مدیر)

محمد ندیم ——— (گرج کر، اے اوئے تو۔ اگنوار کہیں کا۔ پہلے گلاس تو دھوئے۔
چپراسی سہم کر باہر گلاس دھونے چلا جاتا ہے۔ ندیم میز کے نیچے کی دراز سے وہائٹ ہارس کی بوتل نکالتا ہے۔

محمد ندیم ——— (پہلے ساقی سے مخاطب ہو کر) تم کیوں ہو گئے۔ (بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) — لو — غیور — بولو —
اماں ایسی بھی کیا خشکی —

کامریڈ غیور ——— میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ڈائمنڈ ورکس میں ہڑتال تو ضرور ہونی چاہئے

محمد ندیم ——— (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) ہاں بھئی! اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

چپراسی گلاسوں میں برف ڈال ڈال کر رکھتا جاتا ہے اور ندیم وسکی کی بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں میں انڈیلتا جاتا ہے۔

انور ——— مجھے بھی مزا ہو گئی ہے کہ جیسے بھی بن پڑے گی ہڑتال کرا کے چھوڑوں گا۔

محمد ندیم ——— چپراسی! تم باہر جاؤ۔ (چپراسی باہر چلا جاتا ہے۔) سفید گھونٹا گلاسوں میں پہونچ کر وسکی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے
(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

ایجنٹ حضرات اور خریدار اصحاب متوجہ ہوں۔

۱۔ ہم نے بتایا تھا کہ ایجنٹ حضرات کی خدمت میں صرف پہلا پرچہ ذریعہ بک پوسٹ روانہ کیا جائیگا لیکن ہم مسلسل تین اشاعتیں اس طرح روانہ کر چکے ہیں۔
۲۔ ان پرچوں کو ایجنٹ حضرات نے وصول کیا، اور ان کی اشاعت کی جن کے لئے ہم اُن کے مشکور ہیں۔
۳۔ لیکن ——— آئندہ ذریعہ بک پوسٹ پرچے روانہ نہیں کئے جائیں گے۔ لہٰذا جو اصحاب اپنی ایجنسی جاری رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے پچھلے حسابات فوراً دفتر کو روانہ کر دیں۔
۴۔ اگر ماہ اپریل ۵۱ء کی پہلی تاریخ تک ہمارے پاس پچھلی رقوم جمع نہ ہوں تو پھر اس ماہ کے پرچے آپ کی خدمت میں ذریعہ وی۔ پی بھیجے جائیں گے۔ براہِ کرم وی۔ پی وصول کرنے کا انتظام ابھی سے کر لیں۔ تاکہ عین موقع پر آپ کو خفت نہ ہو۔
۵۔ جو اصحاب کسی وجہ سے وی۔ پی واپس کر دیں گے اُن کی ایجنسی مستقل طور پر ختم کر دی جائے گی۔
۶۔ اسی طرح جن خریدار اصحاب کا ماہنامہ "انوار" کا چندہ مدیر "انوار" کے ذمہ باقی تھا اُن کے نام بھی معیار جاری کر دیا گیا تھا۔
۷۔ لیکن جن اصحاب کا چندہ اگلے مہینے میں ختم ہو رہا ہے اُن کی خدمت میں وی۔ پی آ رہا ہے۔ اسے وصول کر کے ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھئے۔

انشاء اللہ آئندہ "معیار" اپنے پورے معیار کے ساتھ پابندیٔ وقت سے شائع ہوتا رہے گا۔

مینیجر

ابوالمجاہد زاہد

غزل

بہار ہم سے خفا ہے چمن بھی بیگانہ
حیات ہے کہ ادا کر رہے ہیں جرمانہ

نہ اب ہے شمع نظر میں نہ رقصِ پروانہ
شریکِ بزم ہوا کون بے حجابانہ

ترے عمل کا ہے پرتو ہر ایک افسانہ
تری حیات نہ کعبہ ہے اور نہ بتخانہ

زبان طرزِ تکلم کو سوچتی ہی رہی
ٹپک پڑا نگہِ شوق سے اک افسانہ

یہ انقلاب بھی میری نظر نے دیکھ لیا
کہ اپنی آگ کے شعلے میں اپنا کاشانہ

وہ آج دُردِ تہِ جام کو ترستے ہیں
کہ جن کے نام سے چلتا تھا دورِ پیمانہ

یہ سب فسانۂ اہلِ جنوں ہی ٹھہرے ہیں
تو پھر کہاں کا گلستاں کہاں کا ویرانہ

ضرور پڑھتا ہوں پرویں کا احترام نہ کر
ترا وجود ہے اے دوست آفتابانہ

نئی شراب بھی ہے جام نو بھی ہے لیکن
غریب اب بھی نہیں باریابِ میخانہ

[illegible]
گزر گئی سحرِ نو بھی بے نیازانہ

بہار آ کے چمن سے گئی انقلاب آ ہی گیا
مزاجِ عشق ہے اب تک وہی غلامانہ

[illegible]
خلوص و شوق ہے منت کشِ بتخانہ

کچھ ایسی سوز [illegible] تنگ و دامن کی لو ہمدم
کہ [illegible] سا شمعِ حرم کا پروانہ

حقی حزیں ایم، اے



راہِ وفا میں اُن کا کچھ دور ساتھ چلنا
لیکن وہ ہر قدم پر عزمِ سفر بدلنا

ہر آستاں پہ جھکنا، ہر در کی خاک ملنا
آخر مرا اُنہی کے نقشِ قدم پہ چلنا

آواز آ رہی ہے اُس پائے نازکی سی
اے دردِ دل ٹھہر جا، اے اشکِ غم سنبھلنا

گو زندگی میں اب تک سو انقلاب آئے
لیکن ہمیں نہ آیا اندازِ غم بدلنا

جن کو ہوئی نہ حاصل تائیدِ اُس نظر کی
اُن حسرتوں کو دل میں آیا نہیں مچلنا

یہ آپ کی نگاہیں جو آج ملتفت ہیں
ہے منحصر انہی پر حالات کا بدلنا

اپنی جبیں پہ گردِ فرشِ حرم سلامت
تجھ کو حزیں مبارک اُس در کی خاک ملنا

عمر نظمی (میرٹھ)



اپنی تدبیر کو جانباز بدلنا ہوگا — زندگی کا تجھے انداز بدلنا ہوگا

اے مغنی مئے توحید کے متوالے سن — ساتھ مضراب کے ہر ساز بدلنا ہوگا

دستِ صیاد سے عصمت کو بچانے کیلئے — بلبلوں کو رخِ پرواز بدلنا ہوگا

قصرِ اسلام کی تعمیر کی خاطر اے دوست — کفر و طاغوت کا اعزاز بدلنا ہوگا

ہمنشیں قوت و امکان کی حد تک تجھ کو — مونس و ہمدم و ہمساز بدلنا ہوگا

کفر و ظلمات کی بستی کو بدلنے کیلئے — تجھکو میدانِ تگ و تاز بدلنا ہوگا

پھاڑنی ہوگی ریا کی یہ قبائے رنگیں — دلق و دستار کا اعجاز بدلنا ہوگا

عشق کی تجھکو بدلنی ہے نیاز آرائی — حسنِ خود بیں کا بھی ہر ناز بدلنا ہوگا

اسوۂ سیدِ کونین کی خاطر نظمی
اپنے ہر کام کا انداز بدلنا ہوگا

"عورت کا خزینہ"

نعیم صدیقی ہماری ادبی تحریک کے معروف قلم کار ہیں۔ اور طنز کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ آپ ایک وقت افسانہ نگار ہیں تو دوسرے وقت شاعر، کبھی سنجیدہ نثر نگار اور کبھی صحافی
غرض بقول تحفے ہمہ پہلو ہیں۔ ماہر ضیائی نے "میں ۔۔ اپنی نظر میں" ایک جگہ نعیم صدیقی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ماہر کی اپنے متعلق رائے کیسی بھی ہو لیکن نعیم صدیقی کے بارے
میں ان کا یہ کہنا کہ وہ بسیار گو ہیں اور ہر جہت، درست معلوم ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے سیاست بھی بندھی ہوئی ہے اور ساتھ ساتھ ادب، سائنس، اور فقہ بھی۔ اور ایک
حد تک یہ چیز ان کی ادبی سرگرمیوں میں مزاحم ہے لیکن اس ہمہ جہتی کے باوجود ایک چیز ان کے یہاں نمایاں ہے اور یہی ان کی ادبی شخصیت کا مشترک پہلو ہے یعنی طنز۔ نعیم صدیقی
کبھی طنز سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھے جا سکتے۔ ان کا طنز ہی ان کی کامیاب انشا پردازی اور نظم نگاری کی چمک دمک اور اثر انگیزی کا ضامن ہے۔ ہر جگہ آپ ان کی تحریر
کے حسن میں طنز کی جھلک پائیں گے۔ شاعری میں نعیم صاحب کا رجحان نظم نگاری کی طرف خاص ہے اور کتنی ہی قابل تعریف نظمیں پیش کر چکے ہیں۔ "عورت کا خزینہ" بھی ان میں
سے ایک ہے جو کئی حیثیتوں سے ان کی دوسری نظموں سے ممتاز ہے۔ "عورت کا خزینہ" صنف نازک کی ارتقا پسندی پر طنز ہے۔ اور بلاشبہ ایک کامیاب طنز۔ مگر اس طنز
کا مقصد محض تفریح یا روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رلانا نہیں ہے نہ تعمیر و ترقی کا انہدام صدیا دشمنانہ پروپگنڈا۔ اس نظم میں ہمیں شدتِ طنز کے ساتھ ساتھ مشاہدات میں
ایک تعمیری جذبہ بھی ملتا ہے۔ اور یہی جذبہ و احساس ہے جو اس تعمیری طنز میں ایک امتیازی وصف پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبۂ خلوص اور تعمیری احساس کچھ اسی نظم سے وابستہ
نہیں۔ نعیم صدیقی کی ہر نگارش سے اس کا اظہار ہوتا ہے بلکہ وہ نظموں میں کامیاب ہی اس کے بل پر ہوتے ہیں۔

"عورت کا خزینہ" میں نعیم صدیقی طنز سے خوب کام لیتے نظر آتے ہیں۔ مزاح کا پہلو اس میں نہیں۔ نعیم کے یہاں ہر جگہ طنز ہی زیادہ ہے۔ ایک گہرے طنزیاتی مقصد کو
چھوڑ کر وہ ادھر ادھر جانا نہیں چاہتے۔ یہ چیز ان کی خصوصیت میں شمار کی جا سکتی ہے اور کمزوری میں بھی۔ خصوصیت میں اس لئے کہ خالص طنز سے سنجیدہ مقصد کی عظمت میں اضافہ
ہوتا ہے۔ اور کمزوری میں اس لئے کہ طنز اور مزاح اپنے ساتھ بہت سی مشترک چیزیں رکھتے ہیں۔ خالص طنز سے مایوسی اور پشیمانی کا احساس زیادہ بڑھتا ہے اور ہمتیں کم ہوتی
ہیں۔ لیکن مزاح کے امتزاج سے وہی بات دوسرا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ انسان میں احساسات طنز و مزاح سے بیدار کئے جائیں تو وہ اپنی کمزوریوں کا احساس بھی کر لیتا ہے
اور خود ان پر ہنس بھی لیتا ہے۔ یوں اصلاح کے مواقع زیادہ مل جاتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے طنز و مزاح کا امتزاج کچھ آسان نہیں۔ یہ ایک بڑی ادبی دولت ہے۔ اکثر
لوگ اردو ادب میں طنز و مزاح کا توازن قائم نہیں رکھ سکے۔ اچھے طنز و مزاح نگار، مزاح نگار زیادہ اور طنز نگار کم ہیں۔ یہ وثر طنز کے مقصد کو نمایاں اور اثر انگیز نہیں ہونے دیتی۔ نعیم
صدیقی اس لحاظ سے انفرادیت رکھتے ہیں کہ وہ طنز نگار زیادہ ہیں اور مزاح نگار کم۔ بلکہ اکثر جگہ وہ خالص طنز نگار معلوم ہوتے ہیں۔ اور مزاح تو بالکل نہیں۔ مایسی جگہ ان کی
تحریریں کبھی کبھی بوجھل بھی بن جاتی ہیں۔ "عورت کا خزینہ" میں طنز ہی طنز ہے۔ مزاح کا پہلو نہیں لیکن یہاں نظم بوجھل ہونے کے بجائے سنجیدگی کا پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ یہ
سنجیدگی طنز و مزاح کے امتزاج کا نتیجہ نہیں بلکہ سنجیدہ مقصد کی عظمت کی جھلک ہے۔

"عورت کا خزینہ" ایک اور لحاظ سے بھی قابل مطالعہ ہے۔ اس کے موضوع میں استقلال اور ہمہ گیری ملتی ہے۔ موضوع کا تعلق کسی عارضی اور محدود چیز سے نہیں
[illegible] کہ ایک بڑے فتنے سے ہے جو انسانی تہذیب پر اندھیری رات بن کر چھا گیا ہے۔ آج کل ہمارے یہاں تنقیدوں میں پروپگنڈے اور ادب کے فرق پر بڑا زور
[illegible] اور یہ بات ہے بھی درست کہ ادب کو پروپیگنڈے سے بلند ہونا چاہئے۔ پروپگنڈا ادب میں آفاقیت کا سب سے بڑا دشمن ہے اور آفاقیت کا فقدان موجود
[illegible] قابل اعتراض پہلو۔ لیکن یہ اعتراض جتنا آسان ہے کوئی مثالی چیز پیش کرنا اس سے کہیں مشکل ہے۔ پروپگنڈے کا رجحان ادب کے "بڑوں" سے پھیلتا ہے۔
[illegible] ثانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

اور یہاں خود ہمارے اچھے فن کار بھی پروپگنڈے اور ادب کا توازن قائم رکھنے میں کامیاب نہیں۔ ہمارے یہاں کتنی چیزیں ایسی ہیں جن میں دوسرے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اور پھر دلچسپی ہی نہ لیں گے تو متاثر کیا خاک ہوں گے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہمارے اچھے لکھنے والوں کے یہاں خلوص اور تعمیری احساس کی فراوانی ہوتی ہے اس لئے ناگواری پیدا نہیں ہونے پاتی یا کم پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے ادیب اور فن کار شاؤں سے متاثر ہو کر ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھتے ہیں۔ مگر ہمہ گیریت اور آفاقیت کی کمی بُری طرح آڑے آتی ہے۔ پروپیگنڈے کا الزام خود ہمارے اچھے لکھنے والوں پر بھی آتا ہے۔ جن کے یہاں موضوعات کی ہمہ گیری اکثر مجروح نظر آتی ہے۔ یہ الزام نعیم صدیقی پر بھی ایک حد تک چسپاں ہوتا ہے۔ "عورت کا حزنیہ" چھوڑ کر میری نظر سے ان کی ایسی کوئی نظم کم ہی گذری ہے۔ جو اپنے موضوع کے اعتبار سے دوسرے حلقوں کے لئے اجنبیت نہ رکھتی ہو۔ یہ اجنبیت پروپگنڈے کے اثر ہی سے تو ملتی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ شدت خلوص اس کمزوری کو یہاں محسوس ہونے کا موقع کم دیتی ہے لیکن یہ پردہ پوشی ہر ایک کے بس کا کھیل نہیں۔ نعیم صدیقی کے یہاں "عورت کا حزنیہ" ایک ایسی چیز ہے جس میں اجنبیت کا احساس نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور کچھ ہے تو خلوص کا رنگ اس پر غالب ہے۔ اس لئے کھٹکتا نہیں۔

ماہی ضیائی نے "عورت کا حزنیہ" کو نعیم صدیقی کا شاہکار کہا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بات آج بھی ویسی ہی درست ہے جیسی دو تین سال پہلے تھی۔ اس عرصے میں نعیم صدیقی نے کئی اچھی نظمیں پیش کی ہیں لیکن "عورت کا حزنیہ" ان پر فوقیت رکھتی ہے۔ عورت کی ارتقا پسندی پر نعیم صدیقی کی ایک تازہ نظم "بالیو! عزیزو! بھائیو" جو "چپ کی داد" کے انداز میں لکھی گئی ہے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ اسے "عورت کا حزنیہ" کے سامنے رکھا جائے تو ادب اور پروپگنڈے کا نازک فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ موضوع قریب قریب دونوں میں ملتا جلتا ہے۔ لیکن پھر بھی تاثرات میں اور انداز بیان میں کھلا ہوا فرق ہے۔

"عورت کا حزنیہ" میں نعیم صدیقی کا احساس اور قوت مشاہدہ بھی قابل داد ہے۔ اس لحاظ سے تو اور بھی کہ شاعر کا کام ہی دنیا کی حقیقتوں کا مشاہدہ کرنا اور کرانا ہے۔ شاعر پر خلوص نظر رکھتا ہے۔ اور دوسروں کو خلوص کے ساتھ مشاہدہ کرانا بھی جانتا ہے ہر اچھے یا بُرے پہلو کو وہ ہمدردانہ انداز میں علاج کے ایک عمومی احساس کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ اس معیار پر اگر "عورت کا حزنیہ" پرکھا جائے تو میں کہوں گا کہ شاعر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ وہ خود بھی مشاہدے کی تیز قوت رکھتا ہے اور دوسروں کو مشاہدہ کرا بھی سکتا ہے۔ اس نظم میں تعلیم و تلقین محسوس نہیں ہوتی۔ اگرچہ موجود ہے اور پوری نظم پر سنجیدگی کی فضا قائم رکھے ہوئے ہے۔ تعلیم و تلقین کی افادیت اپنی جگہ پر لیکن شاعر کا طریقہ واعظانہ نہیں ہوتا۔ نعیم اس راہ سے بھی خوبصورتی کے ساتھ گذر گئے ہیں۔ اس نظم میں وہ تصویر کے دونوں رخ پیش کرنے میں اور بیک وقت پیش کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔ وہ ماضی کی لغزشوں اور خراب نتائج سے ذہن کو سوچنے پر مجبور تو کر دیتے ہیں۔ مگر زخم پر مرہم لگانے میں گھبراہٹ اور ناتجربہ کاری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ "عورت کا حزنیہ" میں علاج اور تعمیر و تطہیر کو پہلے ہی قدم پر غالب نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ ایک ایسا لطیف جذبہ لئے ہوئے نظر آتے ہیں جو محسوس تو ہر کہیں ہوتا ہے لیکن کھٹکتا کہیں نہیں یہ جذبۂ لطیف ان کی شاعری کا عمومی احساس ہے۔ یہ تعلیم و تلقین سے زیادہ سبک اور پر اثر ہوتا ہے۔ اسی خصوصیت پر ان کی اس نظم کی افادی عظمت کا دار و مدار ہے۔

اس نظم کی اشاریت بھی اسے دوسری نظموں کے مقابلے میں فوقیت بخشتی ہے "ملت کا اسلحہ خانہ" ہی مثال کے طور پر لیجئے۔ یہ بھی طنزیہ نظم ہے۔ مگر یہاں طنز حد درجہ بوجھل ہے۔ "عورت کا حزنیہ" اس سے بہت مختلف ہے۔ موضوع ہی نہیں طرز و اسلوب اور زبان کے لحاظ سے بھی۔ میرے نزدیک "عورت کا حزنیہ" کہیں بہتر ہے۔ عورت کا حزنیہ ختم ہونے پر قاری کے ذہن پر ایک کامیاب تاثر چھوڑتی ہے۔ موافق پر بھی اور مخالف پر بھی۔ لیکن ملت کا اسلحہ خانہ کے تاثرات میں وہ تیزی اور تندی نہیں۔ یہی بات نعیم صدیقی کی اور نظموں کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔

عورت کا حزنیہ صنف نازک کی ارتقاپسندی کی داستان ہے نعیم صاحب نے جدیدیت کے اس نازک مگر بہت اہم شکار کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدیدیت سے جہاں ماضی کے ہر اچھے برے پہلو کو ٹھیس لگی ہے۔ عورت بھی اس سے کچھ کم متاثر نہیں ہوئی۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی کہئے۔ ساز خانگی کی مترنم اور پر شور صدائیں انجمن میں اسی جدیدیت کے اثر سے سنائی دیں۔ لوگ اسے زمانے کی بڑی ترقی سمجھتے ہیں۔ اور قوم کی بہبودی کا راستہ خیال کرتے ہیں۔ مگر نعیم صدیقی نے اس معاملے کو ایک اور زاویے سے دیکھا ہے۔ ان کے یہاں خانگی زندگی تمدن کی بنیاد ہے اور اس میں انتشاری کیفیت پیدا کرنا تخریب کے ہم معنی۔

یہ بات جس سلیقے کے ساتھ ادا کی گئی ہے قابل داد ہے۔ پوری نظم میں جس مذاق اور جذبات کی شدت کا احساس ہوتا ہے اور نظموں میں کم پائی

جاتی ہے ۔ جا بجا پھبیاں طنز اور لطیف چوٹیں ملتی ہیں ۔ یہ اس نظم کے حسن کی جان ہیں ۔ نظم کا خاکہ خالص طنزیہ خطوط پر تیار کیا گیا ہے ۔ آغاز بھی خو
انجام بھی خوب ۔ قومی زندگی کے زوال سے قوم کی رگوں کا خون سرد پڑ جایا کرتا ہے ۔ اداسی ۔ ادبار ۔ نکبت پھر تو ساری بلائیں اُمڈ آتی ہیں یہ سب
صحیح ثابت ہو رہا ہے مگر زمانے نے عورت کی خانگی زندگی کو بھی اپنی اداسیوں کا سبب سمجھا ۔ چنانچہ اس قلعے پر نشانہ بازی کی گئی ۔ اور انجام کار آج
ان حالوں کو پہونچ گئی کہ خود اپنی موجودہ روش پر تھکی تھکی نظر آتی ہے ۔ نظم کے آغاز میں اسی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے ۔ نظم میں آغاز ہی سے پھیلاؤ کا اندازہ
ہونے لگتا ہے ۔ اور درمیان میں بعض بعض جگہ تو روانی قابلِ داد ہے ۔ سیلِ رواں کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ شاعر نے آغاز کو انجام تک بڑی خوبی
سے نبایا ہے ۔

نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

کل کی بات ہے کہ تھا سرد خون وطن وطن
اک خزاں چمن چمن ، اک فغاں دمن دمن
تشنہ دل کلی کلی ، تفتہ جاں سمن سمن
تیرگی سی تیرگی ، مرمٹی کرن کرن

اک غلط خسرگی بزم زندگی میں تھی
عورت اک بجھی صدا سازِ خانگی میں تھی

گناہ تو بے شک عورت کے اس اقدام سے پہلے بھی ستھے مگر جان کب کسی میں تھی ، ذوقِ عیش بھی تھا ۔ ہوس کاری بھی تھی ۔ لیکن شاید آج کی سی بے حیائی اور سخت جانی نہیں تھی ۔ عورت کو گھر سے باہر لانے میں ممدوح اہرمن کو بڑی سعی کرنی پڑی ہے ۔ "قومی مصلحوں" کی زبانیں اور قلم آج بھی گونج رہے ہیں ۔ عورت کو دلائل سے مرعوب کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے ۔ زور شور سے بغاوت کی تبلیغ کے جام پلائے گئے ہیں ۔ نعیم صاحب نے اس صورت کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔

وعظ یہ کہا گیا ماؤ ! بہنو ! ! بیٹیو ! ! !
مرد کی ڈسی ہو تم اس سے انتقام لو
مرد کے نفس تمام جھاڑی میں جھونک دو
شہ نشیں پہ بیٹھ کر تم تو مات ہو گئیں
تم نے کیا غضب کیا بیگمات ہو گئیں
ہوتے ہوتے ایک دن دال بھات ہو گئیں

اور اس وعظ کا نتیجہ کیا ہوا کہ :-

' اوئی ' ' نوج ' ایک دن ہاں ہی بن کے رہ گئی

ساس ماں کی یہ "غضب" روندے کے لتاڑ کے
شمع خانہ ہو گئی جلوہ پاشِ انجمن

نعیم صاحب نے عورت کو "غضب" کہہ کے غضب کا طنز کیا ہے ۔ پھر ' اوئی ' اور ' نوج ' کے ساتھ ہاں کا لفظ دیکھیے اور الفاظ کے انتخاب کے قائل ہو جائیے ۔ ان میں بڑے لطیف طنز پوشیدہ ہیں ۔

پھر رواتی اور گھلاوٹ کا لطف ان بندوں میں کتنا پرُلطف ہے:۔

کیا خسر کی اسے ہو گیا میاں کی جان من
تن کی مستقل گھٹن ، من کی مستقل چبھن
غصے کی یہ چاؤں چیں سر کی اک دکھن جلن
نقش جی کے بھاگ اٹھی تک رہے تھے گورکن

ہلہائیں ساریاں سائے سرسرا گئے
بال بو لٹا گئے ، گال مئے بہا گئے
آنکھ چھیڑ کر گئی ، ہونٹ مسکرا گئے
کر رہا تھا ارتقا جلوہ باریوں کا فن

شبنمی لباس میں آگ کی تھیں تیلیاں
'ابر کی' غلاف میں کانچ کی تھیں لڑکیاں
پھٹ پڑی تھیں بدلیاں یہ چلی تھیں بجلیاں
پردہ دار کب رہے آنچل اور پیرہن

غرض کہ عورت شمع خانہ سے جلوہ پاش انجمن بن گئی۔ کل کی قیدی آج آزاد تھی۔ تہذیب و اخلاق میں، عادات و اطوار میں، ارتباط و اختلاط میں، ہر چیز میں آزاد۔ ہر فعل بے قید و بند ہو کر رہ گیا لیکن اس کا انجام:۔

ہر نگاہِ فاقہ کش تلملا کے رہ گئی
حسن کی شعاع کی چوٹ کھا کے رہ گئی

حسن نے ہی جب جامہ دری اختیار کی تو پھر بخیہ گری کون کرے۔

تن نے تن اڑا لیا ، من نے من اڑا لیا
شرم ایک بند وہم ، ضبط قصہ کہن

ہوا و ہوس کے بندوں نے شعاع حسن کو شعلوں میں بدل دیا اور شعلوں کو ہوا دی جانے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ ہوس کاری کی آگ بھڑک اٹھی۔

مردنے کہا کہ آ ہاتھ میں رباب اٹھا
آ کے رقص گاہ میں پائے اضطراب اٹھا

پردے اٹھ گئے قید و بند ٹوٹ چکے رسم و حیا دم توڑ چکی پھر کون تھا کہ اس منظر کو وجود میں آنے سے روکتا:۔

عورت آئی بزم میں خود کو فاش کر گئی
اپنے دل کو آپ ہی قاش قاش کر گئی
صنف کی خودی کا خم پاش پاش کر گئی
بھیڑیے لپک اٹھے آہ کھول کر دہن

مختصر یہ کہ:۔

زندگی کے کھیل میں ہیروئن در آگئی
ہر گلی میں دل لگی ہر سڑک پہ عاشقی

اور پھر:-

عہدنامہ ہائے شوق ، انتظار ، آہٹیں
عرض مدعا کے ساتھ ، اشک ، مسکراہٹیں
جذبہ ہائے خاص کی ، عام ، کلبلاہٹیں

اِس سے جوڑ اُس سے توڑ اِس سے روٹھا اُس سے من

اس بند کو دیکھئے شوخی، طنز اور اشاریت کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ ہر مصرعہ اپنے ساتھ نسائیت کی گہری کا ایک بسیط و عمیق احساس لئے ہوئے ہے۔ اور صنف نازک کے تباہ کن جذبات کی کھلی کھلی ترجمانی کر رہا ہے۔

آخر عورت کے کھل کھیلنے کے بعد اب وہ وقت بھی جلد آ گیا۔ جب اپنے کئے کا ثمرہ ظاہر ہونے والا تھا۔ قدرت کی طرف سے تنبیہ کی جانے والی تھی۔ مواد جسم پہ رستے ہوئے ناسوروں کی شکل میں نمودار ہونے کو تھا۔ دل رو رہے تھے۔ اور آنکھیں اشک مسرت کی بجائے اشک پشیمانی سے لبریز تھیں۔ مگر اب کیا فائدہ کیا حاصل۔ اب تو ۔۔۔ جس سے ڈر رہے تھے لوگ اب وہ بات ہو گئی۔

خلوتوں کے راز کو جسم میں دبائے کون
کس کا اتنا پیٹ ہے اب اسے چھپائے کون
آہ میں نہ مر گئی مجھ پہ رحم کھائے کون

مجھ پہ ٹوٹ کیوں پڑے اژدھے اٹھائے پھن

عورت چلاتی رہی، روتی رہی آنسو بہاتی رہی مگر مرد تو اپنا کام کر گیا اور غم نصیب کے سر پہ اپنا جرم مڑھ کر آگے بڑھ گیا۔ عورت لاکھ چیخی۔

ہائے کیا کروں سکھی ہائے کیا کروں بہن

اور کرتیں بھی کیا یہ عورتیں:-

عقل کی یہ اندھیاں خواہشوں کی ماریاں
یہ عجیب کنوارپن مائیں اور کنواریاں
سو حرام کاریاں اور پھر بچاریاں

یہ سب سورت پیش کرتے ہر شاعر کا لہجہ بہت سخت اور تیز ہو جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہے۔

تم سمجھ رہی تھیں یہ عیش ہے گناہ میں
ڈس رہی ہیں لعنتیں اب گلی میں راہ میں
زہر میں بجھے ہوئے تیر ہر نگاہ میں

پھر مرد نے عورت کی بے بسی کا احساس مٹانے کے لئے ایک اور چال چلی۔ سحر کاری سخن کا سہارا لے کر فلسفے کے ڈوز پلانے شروع کر دیئے۔ عورت کو سمجھا دیا گیا۔ کہ:-

پال ہر گناہ کو پل چکے تو اوڑھ جن

بات پتے کی کہی گئی تھی، عورت کی سمجھ میں آ گئی۔ اور وہ اس پر ڈٹ گئی۔ دل کی ہوس بھڑک اٹھی۔ جذبوں کے سامنے گھنگی کا کیا چلن۔ عورت کو زندگی میں مرد کا آدھا ساتھی کہہ کر کھیتوں اور کارگاہوں کی سمت دھکیل دیا گیا۔ ہرنیوں کو گھیر کر کام پر لگا دیا گیا کہ محنتوں کی کان سے مال دھن کھود لاؤ۔ حور زندگی کی گاڑی میں جوت دی گئی۔ پری سے پہاڑیاں کھدوائی جانے لگیں حسن آوارہ جنگلوں میں جھاڑیاں کاٹنے لگا۔ عورت اس طرح روپوں کی چھان چھن سے عارضی طور پہ خوش تو ہو گئی۔ مگر اس "نوکری" کے ٹھاٹھ میں بخار کی سی جلن بھی چھپی تھی۔ عورت کو ایک خانگی ذمہ داری چھوڑ کر تین تین کام ہائے سخت انجام دینے پڑتے۔ مرد کی ہوس

نے اس سے بھی فائدہ حاصل کی۔ کہاں مرد کہاں بے چاری ضعیف عورت بیچاری اس کی فسوں طرازیوں سے کیا بچتی چنانچہ اس مرد خود غرض، ہوس پیشہ، زن اور جاہل قوتوں کے مقابلے میں عورت کو زندگی کی جنگ میں ہر جگہ شکست ہوئی۔

نظم کے آخری بند عورت کے احساس پر بڑی گہری چوٹیں کرتے ہیں یہ چوٹیں بھی اور ہمدردی و اخلاص کے ساتھ طنز کے بے پناہ وار بھی جن سے تعمیری جذبات صاف جھلکتے نظر آتے ہیں۔

غیرت خودی کو تو کیا کبھی جگائے گی !
دردناک غم فزا تیری روح کی جلن

جب خودی ہرا ہوئی، آئی خودسری تو کیا
روح تو اجڑ چکی جیب گر بھری تو کیا
گود تو ہری نہیں مانگ ہے ہری تو کیا
پاک تھا نفیس تھا آدمی گری کا فن

آخری بند میں نعیم صاحب نے عورت کو پھر اسی زندگی کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں وہ پہلے کہیں مطمئن اور سکون سے رہتی تھی۔

جس میں تو چراغ تھی اس حرم کو یاد کر
جس سے تو نکل چکی اس ارم کو یاد کر
اس عجیب پاک صاف کیف و کم کو یاد کر
ہائے تیری سادگی وائے مکر راہزن

نظم ہر طرح کامیاب ہے اور ایک گہرے اثر کی مالک۔

نعیم صدیقی کی نظموں میں بعض جگہ تو بلا کی روانی ہوتی ہے۔ ان کا الفاظ کا انتخاب بھی مجھے پسند ہے۔ عام طور سے الفاظ میں اشاریت اور طنز وہ ان کے مناسب انتخاب ہی سے پیدا کرتے ہیں اس نظم میں تقریباً ہر جگہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ نظم یوں تو ہر طرح کامیاب ہے لیکن شاید کمی رہ جائے اگر تصویر کا ایک رخ دکھایا جائے اور ایک چھپایا جائے۔ بعض مقامات پر ہلکی سی کھٹک بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً بعض بندوں میں کہیں عورت کے لئے 'تم' استعمال کیا گیا ہے اور کہیں 'تو' کم سے کم ایک بند میں تو ایک ہی لہجہ، اور ایک ہی انداز تخاطب ہونا چاہیئے۔

مثال کے طور پر ان مصرعوں کو دیکھیئے۔

مرد کی ڈسی ہو تم اس سے انتقام لو
نعمت بہتر حیات کر گذر جو آئے بن

تم نے کیا غضب کیا بیگمات ہو گئیں
اب تو سوچ اب تو اٹھ اب تو مان اب تو من

تم سمجھ رہی تھیں یہ عیش ہے گناہ میں
ڈس رہی ہیں لعنتیں اب گلی میں راہ میں
اب تو یونہی روئے جا گنگنائے جا بھجن

کہیں کہیں دوسرے بندوں کے مقابلے میں کچھ مصرعے کمزور معلوم ہوتے ہیں اور نظم کی روانی میں ثقالت پیدا کرتے ہیں۔ ایک مصرع ہے۔

"ہو گئی مجبور رحم اس پہ ندرت اہرمن"

"ہو گئی مجبور رحم" کا ٹکڑا ثقیل ہے اور شاعر کی قوت نظم پر ایک دھبہ۔ اسی طرح ایک مصرعہ ہے۔

"ہونٹ کپکپا اُٹھے گال بجھ بجھا گئے"

ہونٹ کپکپا تو اٹھتے ہیں لیکن گال بجھنے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ چاہے بزعم خود کوئی جدت ہی کیوں نہ ہو۔

ایک اور مصرعہ یہ ہے :

"اے نسائیت کبھی تجھ کو ہوش آئے گی"

ہوش مذکر ہے۔ مونث تو کہیں بھی نہیں بولا جاتا۔ پنجاب میں بھی نہیں۔ اور نہ ضرورت شعری ایسے تصرفات کی اجازت دیتی ہے۔

اس کے باوجود نظم کی خوبیاں اپنی جگہ پر ہیں اور اس میں تو شبہ نہیں کہ خوبیاں کمزوریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ نظم کی روانی کمزوریوں کو کم ہی محسوس ہونے دیتی ہے۔ پھر بھی ان مقامات پر غور کیا جا سکتا ہے۔ نظم نے مجھ پر جو تاثرات چھوڑے تھے میں نے ادا کر دیئے ہیں۔ خوبیوں کے پہلو پر تو مجھے یقین ہے کہ آپ سو فی صدی اتفاق کریں گے۔ دوسرے پہلو پر کچھ کہنا اچھا نہ معلوم ہو تو اسے ذوق کا اختلاف کہہ کر گزر جائیے اور بس —

●

سحر ہونے سے پہلے

عرض البلد ۳۸

دوسری جنگ عظیم کے بعد، امریکہ اور روس کی جاپان پر چڑھائی اور کوریا کی جاپانی فیسزم کے پنجہ سے رہائی کے "صلے" میں یہ طے پایا کہ شمالی کوریا یعنی عرض البلد ۳۸ کے اوپر کا علاقہ روس کی نگرانی میں اور جنوبی کوریا یعنی عرض البلد ۳۸ کے نیچے کا علاقہ امریکہ کی نگرانی میں رہے گا۔ یہ بالکل ویسی ہی صورت تھی جیسی جرمنی کی معاملہ میں پیش آئی لیکن جس دن یہ منحوس تقسیم عمل میں آئی اسی دن تیسری جنگ عظیم کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ شمالی کوریا میں روس نے اپنے پنجے گاڑنے شروع کئے۔ جنوب میں امریکہ نے اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد دونوں علاقوں کے ایک ہو جانے کی ذہنیت پیدا ہوئی اور کب تک نہ ہوتی روس اور امریکہ کے بڑے بڑوں نے اپنی کرسیوں پر نشستیں بدلیں۔ اور سوال پیدا ہوا کہ کونسا کوریا (شمالی یا جنوبی) متحدہ کوریا کا حاکم بنے؟ اس سوال کا مطلب صاف طور پر یہ تھا کہ پورے کوریا پر کس کی سیادت چلے روس کی یا امریکہ کی۔ ان دونوں میں سے کسی کے سامنے کوریا کے مظلوم انسانوں کا مسئلہ نہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مفاد کا پرستار تھا۔ روس کوریا پر سیادت قائم کرکے جاپان اور بحر الکاہل پر اپنی پرچھائیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اور امریکہ کوریا کے سینہ پر ڈاٹ کی طرح لگا رہنے کا آرزومند تھا۔ لیکن اس سے قبل کے حالات کسی کروٹ بیٹھیں شمالی کوریا نے روس کے اشارے پر عرض البلد ۳۸ عبور کرکے جنوبی کوریا پر یلغار کر دی۔ گویا روس نے امریکہ پر حملہ کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اقوام متحدہ پر امریکہ کا کافی اثر ہے۔ اس لئے دستوری ذرائع سے کوریا کا روس کی جھولی میں گر پڑنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ اور وہ یہ کہ تلوار کے بل پر پورے کوریا کو قابو میں لایا جائے۔ کچھ دنوں تک شمالی کوریا والے بڑے جوش و خروش سے لڑے اور روس کے بھاری اسلحہ کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا لیکن امریکہ نے بھی جنوبی کوریا پر قبضہ جمائے رکھنے کی ٹھان لی۔ اور اقوام متحدہ کے ذریعہ جھٹ رزولیوشن پاس کروا کے چھ قوموں کی امداد میدان میں لے آیا۔ نتیجہ میں شمالی کوریا والوں کو جنوب میں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور سارے جنوبی علاقے سے انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ — پھر سوال پیدا ہوا کہ عرض البلد ۳۸ کو عبور کیا جائے؟ یعنی امریکہ روس کے علاقے میں داخل ہو یا نہیں۔ ہندوستان اور اسی طرح کے چند بے زور ممالک چلائے "نہیں" لیکن امریکہ کو اپنی اغراض کی تکمیل کرنی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک شمال سے روس کے اثر کو پوری طرح زائل نہ کر دیا جائے نہ تو پورے کوریا پر اس کی بالادستی قائم ہو سکتی ہے اور نہ جنوب کے سر سے ہی خطرہ ٹل سکتا ہے۔ اس لئے اس نے بھی شمالیوں کی طرح عرض البلد ۳۸ کو عبور کیا۔ اور شمال والوں کو روندتا ہوا منچوریا کی سرحد تک جا پہنچا۔ روس کو شمالی کوریا کی شکست سے سارے ایشیا کے اندر کمیونزم کا وقار متاثر ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے پٹھے چین کو اشارہ کیا۔ کمیونسٹ چین لاکھوں سپاہی لے کر کوریا کے میدان میں کود پڑا۔ اور امریکیوں کو گھیرتا ہوا عرض البلد ۳۸ تک پہنچ گیا۔ یہ کوریا کی جنگ کا دوسرا دور تھا۔ اس وقت پھر یہ مسئلہ اٹھا کہ عرض البلد ۳۸ کو عبور کیا جائے؟ یعنی روس پھر امریکہ کی سرحد میں داخل ہو یا نہیں۔ اس پر پھر کچھ ممالک چیخے "نہیں" لیکن نقار خانے میں طوطی کی پکار کون سنتا۔ چین روندتا ہوا جنوب میں گھس گیا۔ چند روز تک امریکیوں کو پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن اقوام متحدہ کی مشترکہ طاقت اور زبردست بحری امداد کے باعث اب پھر امریکیوں کو فتح نصیب ہو رہی ہے اور وہ عرض البلد ۳۸ کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دوبارہ اسے عبور کیا جائے اور چینیوں کو منچوریا کی سرحد تک دھکیل دیا جائے؟ آثار تو یہی کہتے ہیں کہ ایسا کیا جائے گا لیکن اگر یہ قدم اٹھایا گیا تو یقین ہے کہ آئندہ کوریا کی لڑائی

ایک اور کروٹ بدلے گی۔ اور روس براہِ راست جنگ میں حصہ لے گا۔ وہ اپنے دونوں مہروں کے پٹ جانے کے بعد۔۔۔ تماشائی کی حیثیت میں نہیں رہ سکتا۔ اگر اس نے دوسروں کو کٹوا کر روسیوں کے بجائے کی ٹھانی تو پھر روس کے سارے زیرنگیں ممالک میں چین اور شمالی کوریا سے لیکر مشرقی یورپ تک ہل چل مچ جائے گی اور ہر طرف نئے نئے "یوگوسلاویہ" اُبھر یں گے۔

یہ ہے مرض البلدیہ کا شاخسانہ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس "جنگی سرطان" کا علاج کیا ہے جو بستیوں کی بستیاں نگل رہا ہے۔ اور جس سے تیسری جنگِ عظیم کا خطرہ دن بدن سر پر آرہا ہے۔ کیا اس کا علاج یہ ہے کہ سادھو سنت بن کر دورسے "شانتی" "شانتی" کا صور پھونکا جائے یا یہ ہے کہ ایک "تیسری طاقت" تیار کی جائے جو ایک طرف نظریاتی طور پہ ان بنیادوں کو ڈھادے جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان مصنوعی تقسیم کرکے انسان پر انسان کی خدائی قائم کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف ان بدکار انسانوں کے خلاف اقدام کرے جو ساری دنیا میں اپنے تخریبی افکار سے تباہی پھیلا رہے ہیں۔ اگر دنیا کے کچھ ممالک نے ہمت کرکے یہ کام شروع کیا تو ان کی حمایت کرنے والے اُس دیس میں بھی مل سکتے ہیں۔ جہاں ایٹم بم اگتے ہیں اور انسان سونے میں تولا جاتا ہے اور اُس ملک میں بھی مل سکتے ہیں جو امن کے آہنی پردے کے پیچھے دنیا کو آگ اور خون کے الاؤ میں جھونکنے کی پیہم کوششیں کرتا رہا ہے۔

● ——— اسٹالن کا بیان

طویل خاموشی کے بعد اسٹالن نے بین الاقوامی حالات پر گزشتہ مہینے ایک بیان دیا ہے۔ یہ بیان کئی اعتبار سے قابلِ غور اور اہم ہے۔ اسٹالن نے کہا ہے: "اگر مسٹر اٹیلی کو مالیات اور اقتصادیات کا بہتر علم ہوتا تو وہ سمجھتے کہ روس نے دریائے والگا پر جو بڑا کارخانہ برقابی قایم کیا ہے اور دریائے ڈان کے کنارے جو کارخانے تعمیر کئے ہیں ان پر کروڑوں روبل خرچ ہو رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی حکومت ایسے بڑے صنعتی اداروں کے ساتھ اسلحہ بندی کا کام جاری نہیں رکھ سکتی۔"

مطلب یہ ہے کہ روس جنگ کی نہیں امن کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اینگلو امریکی بلاک سے ہمدردی رکھنے والے روس کی ہر بات کو جھٹلاتے ہیں اور اس کا الٹا مطلب لے لیتے ہیں لیکن روس کی سب باتیں غلط نہیں ہوتیں۔ یہ واقعہ ہے کہ روس ایک معلنہ جنگ (DECLARED WAR) کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے کیونکہ اس طرح کی جنگ چھڑتے ہی تمام دنیا میں نیشنلزم (قوم پرستی) کو فروغ ہوگا۔ اور عوام کی ہمدردیاں اپنے اپنے ملکوں کی طرف پھر جائیں گی جس سے کمیونزم کے "بین الاقوامی" مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ روس کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ بغیر کسی اعلانِ جنگ کے کسی ملک کے کمیونسٹ عناصر کی مدد کرے اور مختلف ہتھکنڈوں اور زیرِ زمین کارروائیوں سے اس ملک کا تختہ الٹ دے اس کے بعد جب وہاں کمیونسٹ عنصر غالب آجائے گا۔ تو کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر ہونے کی وجہ سے خود بخود "اسٹالن اعظم" کی سیادت قائم ہو جائے گی۔ دوسری بات اسٹالن نے یہ کہی ہے: "مسٹر اٹیلی روس کی امن پسندانہ پالیسی کو جابرانہ پالیسی بتائیں گے اور برطانی حکومت کی جابرانہ پالیسی کو امن پسندانہ ظاہر کریں گے تاکہ جھوٹ بول کر انگریزوں کو ایک نئی جنگِ عظیم میں الجھا سکیں۔"

یہ ایک کامیاب وار ہے جو مسٹر اٹیلی پر نہیں بلکہ برطانوی عوام کے ذہن پر کیا گیا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ روس سے لڑائی ہو تو عوام اپنی حکومت کا ساتھ نہ دیں۔ یہی خطرہ ہے جس کی خاطر روس جنگ میں کودنے سے ہچکچاتا ہے۔ اسی بات کو ایک اور انداز میں اسٹالن نے آگے چل کر یوں کہا ہے: "جہاں تک برطانی اور امریکی سپاہیوں کے اوصاف کا تعلق ہے۔ جرمنی اور جاپان کے خلاف لڑائیوں میں ان سپاہیوں نے خود کو دشمن سے بالاتر ثابت کردیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس وقت روسی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے لیکن کوریا میں جنگ ان سپاہیوں کو پسند نہیں ہے۔ اس لئے کہ اہلِ کوریا اپنے وطن کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہیں۔" ——— نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ اہلِ کوریا پر روس اپنی سیادت مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اور برطانوی و امریکی سپاہی اپنی سیادت قائم کرنے کے لئے روس کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ایک اور جگہ اسٹالن نے کہا: "قیامِ امنِ عالم کی ایک وسیع تحریک کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ استعمار پرستوں کی ریشہ دوانیوں کا راز فاش کیا جاسکے۔ جہاں تک روس کا تعلق ہے وہ بدستور قیامِ امن کی پالیسی پر عمل پیرا رہے گا۔"

امن کے اس پردے کے پیچھے یہ منشا صاف جھلک رہا ہے کہ روس فی الحال اس طرح کی لڑائی لڑنے کے لئے تیار نہیں ہے جیسی گذشتہ زمانے میں ہٹلر وغیرہ نے لڑی تھی بلکہ وہ امن کے پردے میں اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔ جہاں تک "استعمار پرستوں" کی ریشہ دوانیوں کا تعلق ہے ان کا پردہ چاک کرنا بہت ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس پردہ کو چاک کرنے کے لئے صرف امن کی تحریک کیوں کافی سمجھی جارہی ہے؟ اس کے لئے تو جنگ بھی کی جاسکتی ہے! پھر یہ عجیب بات ہے کہ "حق" بات کا اظہار

تو کیا جائے ۔ لیکن اس "حق" کے لئے کسی ایثار اور قربانی کا ارادہ نہ ہو۔ ایسی "حق پسندی" حق پسندی نہیں بلکہ باطل پسندی اور مکاری ہے جس سے دنیا کا کوئی عقلمند آدمی دھوکا نہیں کھا سکتا ۔

اسٹالن نے ادارہ اقوام متحدہ پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا: "اقوام متحدہ کو ایک طرف جنگ کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے اور دوسری طرف وہ مساوی حقوق رکھنے والے عالمگیر ادارہ کی حیثیت سے محروم ہوتی جا رہی ہیں ۔ درحقیقت اب یہ ادارہ محض جابرانہ امریکی اقدامات کی ضرورتیں پوری کرتا ہے"!

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اقوام متحدہ کی اکثریت اس وقت امریکہ کے پیچھے چل رہی ہے ۔ لیکن اگر اس نظام میں کوئی تبدیلی ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ روس کے پیچھے چلنا شروع کر دیں گی ۔ ان دونوں کی غلامی سے بے نکر آزاد رہنے اور صرف حق کے پیچھے چلنے کا آخر کیا امکان ہے ؟ کیا روس کوئی ایسا اصول پیش کرتا ہے جس سے اقوام عالم امریکہ اور روس دونوں کی غلامی سے نکل کر صرف حق اور انصاف کے نام پر زندہ رہ سکیں ۔ !

آخر میں اسٹالن نے کہا ہے "کروڑپتی اور ارب پتی امریکی جنگ عظیم کو منافع کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ یہ عناصر حکومتوں پر کنٹرول رکھتے اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اپنے عوام سے ڈرتے ہیں جو لڑائی سے بیزار ہیں ۔ انھیں حالات میں انھیں رجعت پسند حکومتوں کی مدد کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ عوام کو جھوٹ بول کر متاثر کر سکیں ۔ اور نئی جنگ کو مدافعانہ بتا کر امن پسند اقوام (یعنی روس اور اس کے ساتھی) کی امن خواہ پالیسی کو جابرانہ ٹھہرا سکیں"

اس ٹکڑے میں اسٹالن نے بڑی عمدگی سے سرمایہ دار ممالک کی پول کھولی ہے ۔ اور خود کو بہت خوبصورتی سے معصوم ٹھیراتے ہوئے عوام کا بہی خواہ جتایا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغربی سرمایہ دار ممالک جنگ کے پروپیگنڈے کے ذریعہ اپنی اغراض کی تکمیل چاہتے ہیں اور روس "امن" کے پروپیگنڈے کے ذریعہ اپنی اغراض کی تکمیل چاہتا ہے دونوں اپنے اپنے داؤں پر ہیں ۔ بہرحال اسٹالن کا یہ بیان اینگلو امریکی سامراجیوں کے خلاف کیمونسٹ ڈپلومیسی کا ایک اچھا شاہکار ہے ۔ جس میں دھمکی اور پیار سے دوسروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ !

ہند پاکستان تجارتی معاہدہ

خدا کا شکر ہے کہ ہند پاکستان تجارتی معاہدہ ہو گیا ۔ یہ معاہدہ اب تک کیوں نہ ہو سکا ۔؟ اس کے لئے ان عناصر کو ذمہ دار ٹھیرایا جا سکتا ہے جو دنیا میں "قوم پرستی" اور جھوٹی خود کفالت کے تصور کے علمبردار ہیں ۔ اس میں پاکستان اور بھارت کے موجودہ لیڈروں کا کوئی دوش نہیں ۔ غلطی تو ان افکار و خیالات اور ان کے علمبرداروں کی ہے جو انسان اور انسان کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں ۔ اور ایک انسان کو دوسرے انسان کی مدد اور ہمدردی سے روکتے ہیں موجودہ زمانے میں اس فکر کے سب سے بڑے علمبردار مغربی ممالک ہیں ۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہند پاکستان معاہدہ کے راستے میں سب سے بڑی روکاوٹ مغرب کے لوگ تھے ۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ پاکستان اور ہندوستان قریب آئیں اور ان کی متحدہ طاقت اس پورے ذیلی براعظم سے ان کے مفادات کو زائل کر دے ۔ وہ ان دونوں کو لڑا کر اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں ۔ ہماری نظر میں یہ معاہدہ صرف ان دونوں ملکوں کی تجارت ہی کو نہیں کھولتا ۔ بلکہ دلوں کو بھی کھولتا ہے اور اگر اس کے اثرات کو وسیع کیا جائے تو دوسرے معاملات میں بھی بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے اصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اس معاہدہ کے ذریعے ایک بہت بڑے اندرونی خطرے سے موجودہ حکومت کو نجات مل گئی ہے ۔ یہ خطرہ اقتصادی بدحالی کی شکل میں نمودار ہو کر ملک کے داخلی نظم و نسق کو تہس نہس کر دیتا اور شورش پسند طاقتوں کو سر اونچا کرنے کا موقع ملتا لیکن اب ان کو سخت مایوسی ہو گی

بعض جاہل لوگ پاکستانی سکہ کی قدر کو تسلیم کرنے میں ہندوستان کی بے عزتی سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ ایک اضافی شئے ہے آخر دنیا کے دوسرے سکوں کی قیمت تو پاکستان سے بھی زیادہ ہے ۔ کیا ہندوستان ان سے معاملات کرنا چھوڑ دے ؟ کیا وہ امریکہ سے تجارت نہ کرے ۔ برطانیہ سے تجارت نہ کرے ! دنیا کے کئی ممالک کے سکوں کی قدر (VALUE) ہندوستان کے سکے سے زیادہ ہے ۔ اس کے برعکس بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے سکوں کی قدر ہندوستانی سکے سے بہت کم ہے ۔ اصلی سوال سکوں کی قیمتوں کا نہیں بلکہ انسانی ضرورتوں کا ہے اگر ہمیں ضرورت ہے تو ہم دوسرے انسانوں سے تعلقات قائم کریں گے اور ایسے اصولوں کی تلاش کریں گے جو ہمیں مل جل کر رہنا سکھائیں نہ کہ ایسے اصولوں کی جو ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ دیں ۔

ڈاکٹر کھرے اور اسلام

پٹنہ میں اپنی ایک حالیہ پریس کانفرنس کے دوران میں صدر ہندو مہا سبھا ڈاکٹر کھرے نے کہا کہ "دنیا کے لئے اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ صرف اسلام ہے خطرے دراصل تین ہیں اول سرمایہ داری، دوم سامراج، سوم اسلام ازم۔ گذشتہ دو جنگوں کے نتیجہ میں سرمایہ داری دم توڑ رہی ہے۔ مگر اسلام ازم سر اٹھا رہا ہے اور اس نے پہلے ہی ہلہ میں اس ملک کے اندر اسلامی اسٹیٹ قائم کر لی ہے۔ اسلام کی آئیڈیالوجی ہمیشہ جارحانہ رہی ہے۔ اسلام تمام غیر ممالک کو دار الحرب قرار دیتا ہے یعنی دشمن ممالک اور اسلامی ملک کو دار السلام یعنی "امن" کا گھر اور چاہتا ہے کہ ہر ممکن ذرائع سے دار الحرب کو دار السلام بنائے۔ ابھی کراچی میں جو موتمر اسلامی ہوئی ہے۔ اس سے ہندوؤں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر کھرے نے جو کچھ کہا ہے اس سے اکثر "مسلمان" اخبار نویس بہت چراغ پا ہیں کیونکہ اس سے ان کے "اسلام" کو ٹھیس لگتی ہے لیکن عرض یہ ہے کہ حضرت! آج تک آپ اس "اسلام" کا اپنی زندگی سے مظاہرہ کرتے رہے ہیں کیا اس صحیح اسلام کا جو خدا کی کتاب اور رسول صلعم کی سنت میں محفوظ ہے۔ یا اس "اسلام" کا جو صرف آپ کی قومی اور سیاسی اغراض کا آلۂ کار رہا ہے۔ آپ نے اپنی ہر قسم کی خود غرضانہ اور دنیادارانہ جدوجہد پر اسلام کا لیبل لگایا۔ آپ نے کام غیر اسلامی کئے اور ان کو "اسلامی" کے لقب سے نوازا۔ اس طرح سچے اسلام کے مفہوم کو بگاڑنے والے ڈاکٹر کھرے نہیں بلکہ آپ خود ہیں۔ بیچارے ڈاکٹر کھرے پر برسنے اور قلم کے زور سے دنیا کا منہ بند کرنے سے کچھ نہیں ہونا۔ اگر آپ کر سکتے ہیں تو اپنی عملی جدوجہد سے "اسلام" کے اس مفہوم کو بدل دیجئے جو غلط ہے اور صحیح مفہوم کو دنیا کے سامنے لائیے لیکن اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے تاکہ ڈاکٹر کھرے سوچ سوچ کر خود ہی معروف اسلام اور حقیقی اسلام کے درمیان فرق کرنے لگیں تاہم ڈاکٹر کھرے سے ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ حقیقی خطرہ اُن کی نظر میں اسلام ازم ہو یا کمیونزم، سرمایہ داری دم توڑ رہی ہو یا اسٹیٹ کیپٹلزم [illegible] سرمایہ داری) کی شکل میں صرف [illegible] بدل رہی ہو۔ اور اسلام جارحانہ ہو یا اشاعتی اور تبلیغی ہو۔ اس سے بحث نہیں سوال یہ ہے کہ آپ [illegible] اسلام ازم [illegible] کرتے ہیں اگر آپ ہندو قوم کی بھلائی چاہتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہشمند ہیں تو دوسروں کو حریف اور دشمن قرار دے کر ان کے مقابلہ کی غرض سے اپنی قومی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور محض مشترک دشمن کے خوف کی بنیاد پر اپنے افراد کو منظم کرنا صحیح نہیں ہے یہ چیز آپ کے افراد میں خواہ مخواہ [illegible] پیدا کرے گی۔ اور پھر یہ [illegible] کے دن چل سکتی ہے؟ حالات کی معمولی سی تبدیلی اس بنیاد کو ڈھا دیگی۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنے قومی اتحاد ترقی اور [illegible] کوئی مثبت (POSITIVE) اصول اختیار کریں اور اس اصول کی بنیاد پر دنیا کے دوسرے انسانوں کے خوف سے بے پرواہ ہو کر اپنی اصلاح کریں۔ اس سلسلہ میں [illegible] ہو سکتا ہے اگر ابھی تک آپ کے پاس ایسا کوئی نظام زندگی نہیں ہے۔ تو آپ بلا تکلف ان نظاموں میں سے کوئی ایک نظام اپنے [illegible] منتخب کر سکتے ہیں جو آپ کو ابھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

موتمر عالم اسلام

پچھلے دنوں کراچی میں "موتمر عالم اسلام" ہوئی۔ اس موتمر کی کارروائی سنکر عام مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی ہوگی کیونکہ اس میں ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے [illegible] کی خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے ــــ لیکن جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں موتمر عالم اسلام نے اپنی اس "خواہش" کے لئے کوئی ایجابی [illegible] پروگرام میں پیش کیا۔ موتمر نے [illegible] مسلمان ملکوں اور مسلمان عوام کے جن مسائل کا تذکرہ کیا۔ اور ان کے لئے جو قرار دادیں منظور کیں [illegible] دنیا کے حالات سے گھبرا کر ایک جا جمع ہوئے۔ اور روسی اور امریکی بلاک کی توپوں کے درمیان تھرتھراتے ہوئے اپنے آپ کو [illegible] انہی [illegible] کا اظہار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو ضرور اپنے بچاؤ، تحفظ اور اتحاد کا حق حاصل ہے لیکن اس غرض کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب موتمر میں شرکت کرنے والے اتحاد اسلامی کے خواہشمند تھے تو "اتحاد" کی اسلامی بنیادیں سب سے پہلے پیش کرتے۔ اس کے بعد اس میں دنیا کے مسلمانوں کا دنیوی اور اُخروی سعادت ثابت کرتے اور پھر عالم انسانیت کی بھلائی بھی ثابت کرتے۔ اور پھر ایک طرف مسلمانوں کو اور دوسری طرف

تمام انسانیت دوست ملکوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیتے۔ لیکن اس کے برعکس اس کانفرنس میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ صرف خالی خولی الفاظ ہیں مسلمان متحد ہو جائیں۔ مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں۔ مسلمان اسلام کو لے کر اٹھیں۔ لیکن کس طرح، کیوں، اور کس غرض کے لئے یہ سوالات محتاج جواب ہیں۔

دراصل ایک طویل عرصے سے مسلمان عوام اور رہنماؤں کا مزاج بگڑ چکا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی اصولی ہدایات اور تعلیمات کو برتنے کے صحیح طریقے سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ بیشک ان کو اسلام کی تعلیمات کا علم ضرور ہے لیکن بالکل اسی طرح جیسے ایسا علم کتاب میں بند ہوتا ہے۔ ان کے پاس اب وہ علم نہیں ہے جو انسان کے دل میں اپنا مقام رکھتا ہو اور اس کے اعضاء و جوارح سے اپنا اثر دکھاتا ہو۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ مسلمان نام تو لیتے ہیں اسلام کا، لیکن کام کرتے ہیں اپنے نفس کا۔ اپنی ملکی اغراض کا، یا زیادہ سے زیادہ تمام مسلمان ملکوں کی اغراض کا۔ اور ان سب پر لیبل دینی اسلام کا لگتا ہے۔ گزشتہ سالوں میں ہمارے ملک بھارت میں مسلم لیگ نے بھی کچھ ایسا ہی رنگ دکھایا تھا۔ اب یہ مسلم لیگی ذہنیت بھارت سے الگ ہو کر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بڑے پیمانے پر اسی انداز میں ظاہر ہو رہی ہے۔ لیکن جس طرح بھارت کے مسلمانوں کو اس لیگ نے نقصان پہنچایا اسی طرح بڑے پیمانے پر عالمی معاملات میں جب مسلمانوں کی تنظیم اسی لیگی انداز پر کی جائے گی۔ تو مسلمانوں کو سخت نقصان ہو گا۔ چاہے اس طرح وہ بہت زیادہ کھو کر بہت تھوڑا پا لیں۔ ضرورت ہے کہ اب مسلمان قوم پرستانہ نقطۂ نظر کو بدلیں۔ وہ پاکستانی مسلمان ہوں یا عربی، ترکی اور مصری مسلمان۔ اگر وہ واقعی مسلمان رہنا چاہتے۔ اور روسی اور امریکی توپوں کی زد سے انسانیت کو بچانا چاہتے ہیں تو انہیں حق کو اپنی اغراض کی خاطر استعمال کرنے کے بجائے خود کو حق کے حوالے کر کے ہر باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہیئے اور کوئی ایسا پروگرام پیش کرنا چاہیئے جس سے صرف مسلمان ملکوں کا جھوٹا اور وقتی مفاد وابستہ نہ ہو۔ بلکہ مسلمانوں اور دوسرے انسانیت دوست ملکوں کا حقیقی مفاد وابستہ ہو۔ ورنہ جو لوگ مسلمانوں کی اس بین اسلامی تحریک کو سامراج کے نئے ہتھکنڈوں سے تعبیر کرتے ہیں یا "اسلامی امپیریلزم" کا طعنہ دیتے اور اسلام کو ایک جارحانہ تحریک قرار دیتے ہیں، ان کے اعتراضات کا جواب دینا بے سود ہے۔

●

شرائط ایجنسی

۱۔ تمام معاملات میں خدا شناسی اور دیانتداری ضروری ہے۔

۲۔ کم از کم پانچ پرچے منگوانے ہوں گے۔

۳۔ کمیشن صرف ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔

۴۔ خاص صورتوں میں صرف پہلی بار پرچہ پیشگی رقم آنے سے پہلے بھیجا جائے گا۔ ورنہ وی۔ پی۔

۵۔ ڈاک کی خرابی کا دفتر ذمہ دار نہیں۔

منیجر

ڈاکٹر کھرے اور اسلام

پٹنہ میں اپنی ایک حالیہ پریس کانفرنس کے دوران میں صدر ہندو مہا سبھا ڈاکٹر کھرے نے کہا کہ "دنیا کے لئے اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ صرف اسلام ہے خطرے دراصل تین ہیں اول سرمایہ داری، دوم سامراج، سوم اسلام ازم۔ گذشتہ دو جنگوں کے نتیجہ میں سرمایہ داری دم توڑ رہی ہے۔ مگر اسلام ازم سر اٹھا رہا ہے اور اس نے پہلے ہی ہلہ میں اس ملک کے اندر اسلامی اسٹیٹ قائم کرلی ہے۔ اسلام کی آئیڈیالوجی ہمیشہ جارحانہ رہی ہے۔ اسلام تمام غیر ممالک کو دار الحرب قرار دیتا ہے یعنی دشمن کا ملک اور اسلامی ملک کردار السلام یعنی "امن" کا گھر اور چاہتا ہے کہ ہر ممکن ذرائع سے دار الحرب کو دار السلام بنائے۔ ابھی کراچی میں جو موتمر اسلامی ہوئی ہے۔ اس سے ہندوؤں کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔"

ڈاکٹر کھرے نے جو کچھ کہا ہے اس سے اکثر "مسلمان" اخبار نویس بہت چراغ پا ہیں کیونکہ اس سے ان کے "اسلام" کو ٹھیس لگتی ہے لیکن عرض یہ ہے کہ حضرت! آج تک آپ کس "اسلام" کا اپنی زندگی سے مظاہرہ کرتے رہے ہیں کیا اس صحیح اسلام کا جو خدا کی کتاب اور رسول صلعم کی سنت میں محفوظ ہے۔ یا اس "اسلام" کا جو صرف آپ کی قومی اور سیاسی اغراض کا آلہ کار رہا ہے۔ آپ نے اپنی ہر قسم کی خود غرضانہ اور دنیادارانہ جد وجہد پر اسلام کا لیبل لگایا۔ آپ نے کام غیر اسلامی کئے اور ان کو "اسلامی" کے لقب سے نوازا۔ اس طرح سچے اسلام کے مفہوم کو بگاڑنے والے ڈاکٹر کھرے نہیں بلکہ آپ خود ہیں۔ بیچارے ڈاکٹر کھرے پر برسنے اور قلم کے زور سے دنیا کا منہ بند کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آپ کر سکتے ہیں تو اپنی عملی جد وجہد سے "اسلام" کے اس مفہوم کو بدل دیجئے جو غلط ہے اور صحیح مفہوم کو دنیا کے سامنے لائیے لیکن اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ تاکہ ڈاکٹر کھرے سوچ سوچ کر خود ہی معروف اسلام اور حقیقی اسلام کے درمیان فرق کرنے لگیں۔ تاہم ڈاکٹر کھرے سے ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ حقیقی خطرہ اُن کی نظر میں اسلام ازم ہو یا کمیونزم، سرمایہ داری دم توڑ رہی ہو یا اسٹیٹ کیپٹلزم کی شکل میں سرمایہ داری کی شکل بدل رہی ہو۔ اور اسلام جارحانہ ہو یا اشاعتی اور تبلیغی ہو۔ اس سے بحث نہیں سوال یہ ہے کہ آپ خود کو اسلام ازم پیدا کرتے ہیں اگر آپ ہندو قوم کی بھلائی چاہتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہشمند ہیں تو دوسروں کو حریف اور دشمن قرار دیکر ان کے مقابلہ کی غرض سے اپنی قومی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور محض مشترک دشمن کے خوف کی بنیاد پر اپنے افراد کو منظم کرنا صحیح نہیں ہے یہ چیز آپ کے افراد میں خواہ مخواہ احساس کمتری پیدا کرے گی۔ اور پھر یہ کے دن چل سکتی ہے حالات کی معمولی سی تبدیلی اس بنیاد کو ڈھا دیگی۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنے قومی اتحاد ترقی اور بھلائی کے لئے کوئی مثبت (POSITIVE) اصول اختیار کریں اور اس اصول کی بنیاد پر دنیا کے دوسرے انسانوں کے خوف سے بے پرواہ ہو کر اپنی ... اس سلسلہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے اگر ابھی تک آپ کے پاس ایسا کوئی نظام زندگی نہیں ہے۔ تو آپ بلا تکلف ان نظاموں میں سے کوئی ایک نظام اپنے لئے انتخاب کر سکتے ہیں جو آپ کو ابھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں!

موتمر عالم اسلام

پچھلے دنوں کراچی میں "موتمر عالم اسلام" ہوئی۔ اس موتمر کی کارروائی سنکر عام مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی ہوگی کیونکہ اس میں ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ... اور باہمی ... خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے ــــ لیکن جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں موتمر عالم اسلام نے اپنی اس "خواہش" کے لئے کوئی ایجابی اور ... پروگرام نہیں پیش کیا۔ موتمر نے ... مسلمان ملکوں اور مسلمان عوام کے جن مسائل کا تذکرہ کیا اور ان کے لئے جو قرار دادیں منظور کیں ان ... کے ... سامنے اکٹھے ہونے ... دنیا کے حالات سے گھبرا کر ایک جا جمع ہونے۔ اور روسی اور امریکی بلاک کی توپوں کے درمیان تھرتھراتے ہوئے اپنے آپ کو ... کچھ ... پیر دگراموں کا اظہار کیا گیا ہے مسلمانوں کو ضرور اپنے بچاؤ، تحفظ اور اتحاد کا حق حاصل ہے لیکن اس غرض کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ... غلط ہے۔

موتمر ... شرکت کرنے والے اتحاد اسلامی کے خواہشمند تھے تو "اتحاد" کی اسلامی بنیادیں سب سے پہلے پیش کرتے۔ اس کے بعد ... دنیا کے مسلمانوں کا دنیوی اور اخروی مفاد ثابت کرتے اور پھر عالم انسانیت کی بھلائی بھی ثابت کرتے۔ اور پھر ایک طرف مسلمانوں کو اور دوسری طرف

تمام انسانیت دوست ملکوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیتے۔ لیکن اس کے برعکس اس کانفرنس میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ صرف خالی خولی الفاظ ہیں مسلمان متحد ہو جائیں۔ مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں۔ مسلمان اسلام کو بے کر اٹھیں۔ لیکن کس طرح، کیوں، اور کس غرض کے لئے یہ سوالات محتاج جواب ہیں۔

دراصل ایک طویل عرصے سے مسلمان عوام اور رہناؤں کا مزاج بگڑ چکا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی اصولی ہدایات اور تعلیمات کو برتنے کے صحیح طریق سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ بیشک ان کو اسلام کی تعلیمات کا علم ضرور ہے لیکن بالکل اسی طرح جیسے ایک علم کتاب میں بند ہوتا ہے۔ ان کے پاس اب وہ علم نہیں ہے۔ جو انسان کے دل میں اپنا مقام رکھتا ہو اور اس کے اعضاء و جوارح سے اپنا اثر دکھاتا ہو۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ مسلمان نام تو لیتے ہیں اسلام کا۔ لیکن کام کرتے ہیں اپنے نفس کا۔ اپنی ملکی اغراض کا، یا زیادہ سے زیادہ تمام مسلمان ملکوں کی اغراض کا۔ اور ان سب پر لیبل وہی اسلام کا لگتا ہے گزشتہ سالوں میں ہمارے ملک بھارت میں مسلم لیگ نے بھی کچھ ایسا ہی رنگ دکھایا تھا۔ اب یہ مسلم لیگی ذہنیت بھارت سے الگ ہو کر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بڑے پیمانے پر اسی انداز میں ظاہر ہو رہی ہے لیکن جس طرح بھارت کے مسلمانوں کو اس لیگ نے نقصان پہنچایا اسی طرح بڑے پیمانے پر عالمی معاملات میں جب مسلمانوں کی تنظیم اسی لیگی انداز پر کی جائے گی۔ تو مسلمانوں کو سخت نقصان ہو گا چاہے اس طرح وہ بہت زیادہ کھو کر بہت تھوڑا پالیں۔ ضرورت ہے کہ اب مسلمان قوم پرستانہ نقطۂ نظر کو بدلیں۔ وہ پاکستانی مسلمان ہوں یا عربی، ترکی اور مصری مسلمان — اگر وہ واقعی مسلمان رہنا چاہتے۔ اور روسی اور امریکی توپوں کی زد سے انسانیت کو بچانا چاہتے ہیں تو انہیں حق کو اپنی اغراض کی خاطر استعمال کرنے کے بجائے خود کو حق کے حوالے کر کے ہر باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہئیے اور کوئی ایسا پروگرام متعین کرنا چاہئیے جس سے صرف مسلمان ملکوں کا جھوٹا اور وقتی مفاد وابستہ نہ ہو۔ بلکہ مسلمانوں اور دوسرے انسانیت دوست ملکوں کا حقیقی مفاد وابستہ ہو۔ ورنہ جو لوگ مسلمانوں کی اس بین اسلامی تحریک کو سامراج کے نئے ہتھکنڈوں سے تعبیر کرتے ہیں یا "اسلامی امپیریلزم" کا طعنہ دیتے اور اسلام کو ایک جارحانہ تحریک قرار دیتے ہیں۔ ان کے اعتراضات کا جواب دینا بے سود ہے۔

●

شرائط ایجنسی

۱۔ تمام معاملات میں فرض شناسی اور دیانتداری ضروری ہے۔

۲۔ کم از کم پانچ پرچے منگوانے ہوں گے۔

۳۔ کمیشن صرف ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔

۴۔ خاص صورتوں میں صرف پہلی بار پرچہ پیشگی رقم آنے سے پہلے بھیجا جائے گا۔ ورنہ وی۔ پی۔

۵۔ ڈاک کی خرابی کا دفتر ذمہ دار نہیں۔

منیجر

(محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ہمدرد پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر سے شائع کیا)

معیار

Maiyar

Monthly



اپریل
سنہ ۱۹۵۱ء

جلد ۱
شمارہ ۴

معیار

ترتیب دینے والے
اصغر علی عابدی
عبد القدیر اصغر

تعاون
سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ ۔ میرٹھ
سب آفس :- محلہ کشن گنج ۔ دہلی ۶
(صرف مرتب سے خط و کتابت اور تبادلۂ جرائد کے لئے سب آفس)

ترتیب

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ حضرات اپنی رقوم شیخ محمد قمرالدین صاحب پبلشر اندرون موچی گیٹ لاہور کے پتہ پر روانہ کریں اور ہمارے ہیڈ آفس کو اطلاع دیں۔

ادارہ

نقشِ اوّل

کسی نئے ادبی مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اس کے علمبرداروں کو نہ صرف اپنے ادبی مقصد کا شعور ہو بلکہ اُن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اُس کے مطابق زندگی اور اس کی گوناگونی، واقعات اور اُن کے گوشوں۔ حقائق اور اُن کی جزئیات، سوسائٹی اور اُس کے پھیلاؤ پر بھی نہایت وسیع نظر رکھتے ہوں۔ اور انھیں یہ معلوم ہو کہ ان کی سماج کے ہر واقعہ اور حادثہ کی تعبیر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کس طرح کریں۔ بہت سے حقائق کے علمبردار ایسے ہو گزرے ہیں جنھوں نے مخالف نظریات کے مقابلے میں اپنے نظریات کو کامل ہم آہنگی، منطقی ربط اور استدلال کے ساتھ پیش کیا۔ لیکن اپنے بلند فکر کے آسمان سے اُتر کر انھیں انسانی سوسائٹی کی سرزمین اور ایک ایک انسانی ذہن کی کھیتی کو سرسبز و شاداب کرنے کا موقع کبھی نہ ملا۔ اُن کے افکار فضائے بسیط میں غبّارے کی طرح اُبھرے۔ خوبصورت رنگ لئے ہوئے۔ جھلملاتے چراغوں کی اوٹ میں، اپنے دامن کو نور کی تراشوں سے سجائے ———— لیکن غبارہ فضا ہی میں کہیں پھٹ گیا۔ ایک عام آدمی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کوئی چیز فضا میں بلند ہوئی تھی، اور وہ روشن تھی۔ صرف چند لوگوں نے اُسے دیکھا۔ جو پہلے سے بلندیوں کی طرف دیکھنے کے عادی تھے۔ اُنھوں نے واہ واہ کی، اور کھیل ختم ہو گیا۔ زندگی کا شور اور ہنگامہ جس طرح جاری تھا، اُسی طرح جاری رہا۔ گاڑیوں، گھوڑوں اور خوانچہ فروشوں کی چیخ پکار کے درمیان گزرنے والا راہ گیر تو اوپر دیکھ بھی نہ سکتا تھا، وہ نیچے منہ کئے اپنے کام میں لگا رہا۔ اور بلند پایہ افکار بلندیوں ہی میں پرواز کر کے غبارے اور تارہ منڈل کی طرح چھوٹتے اور پھٹتے رہے۔ تاریخ کے دھارے کو موڑنے اور واقعات کی رفتار کو بدلنے میں اُنھوں نے معمولی سا اثر بھی نہ چھوڑا۔ زندگی تباہی کے ایک گڑھے سے نکل کر دوسرے گڑھے کی طرف کوچ کرتی رہی اور اعلیٰ افکار اعلیٰ ذہنی سطح پر پرواز کر کے فضاؤں میں غائب ہوتے رہے۔ بادل آیا اور برسے بغیر ہی اُس کو ہوا اُڑا لے گئی۔

آج ہمیں اس غلطی سے بچنا ہے۔ ہم کو اپنے مقاصد اور اصولوں کو زندگی کے ایک ایک ظرف میں سمونا ہے۔ ایک ایک انسانی ذہن کے سانچے کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے۔ ہمارے سامنے صرف چند "خوش عقیدہ" لوگ ہی نہیں ہیں بلکہ ایک پوری دنیا ہے۔ جس میں ہزاروں قسم کے انسان بستے ہیں۔ جن کی افتاد ذہنی لاتعداد موڑ اور پہلو رکھتی ہے۔ ہمیں ان سب کا جائزہ لینا اور اُن کے اندر گھس کر انھیں اپنے لئے ہموار کرنا ہے۔ پھر ہمارے سامنے زندگی کے اُلجھے ہوئے مسائل اور پھیلاؤ ہے۔ گوناگونی ہے۔ رنگینی ہے۔ تنوع ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں ہیں۔ ہمیں ان سب بولیوں کو سمجھنا، ان سب رنگینیوں سے اُلجھنا، ان سب متنوع مسائل سے نپٹنا اور ان تمام رنگی برنگی واقعات کو اپنے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے۔ ہم ان سے گریز نہیں کر سکتے۔

ہم اُن سے بھاگ نہیں سکتے ۔ اگر ہم ایسا کریں گے اور گوشے اور کنج بسانے لگیں گے تو پھر ہم کتنے ہی بڑے مدعیِ حق سہی، زندگی کے تو کسی کام کے نہیں ۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اصول سوسائٹی پر کسی قسم کا تصرف اور اقتدار حاصل کریں تو ہمیں اس راہ کے ایک ایک پتھر کو الٹنا ہوگا ۔ ہم راستہ کترا کر یا باہر ہی باہر سے کہیں اور نہیں جا سکتے ۔

دراصل کسی ہمہ گیر مسلک کو اختیار کرنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے اُس کو ماننے والے پوری انسانی سوسائٹی اور اُس کے مسائل کو اُس کے مطابق ڈھالنا اور بنانا چاہتے ہیں ۔ جو لوگ یہ کام نہیں کر سکتے یا نہیں کرتے وہ اپنے آپ کو کتنا ہی بڑا "مقصدی" کہیں، زمانہ اُن کو پرکاہ کی برابر اہمیت نہیں دیتا ۔ اُن کا دعویٰ عملاً جھوٹا ثابت ہوتا ہے ۔ اور وہ دراصل بے مقصد لوگ ہی ہوتے ہیں ۔

خدا ہمیں اس غلطی کے ارتکاب سے بچائے ۔

اس شمارے میں:

جنید احمد کاظمی کا تجزیہ "خداپرستی اور مادیت" جذباتی اثرانگیز اور استدلالی ہے ۔ موجودہ مادی دنیا کے اندر آج جن نظریات کے درمیان کشمکش برپا ہے اُس کے ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی فوراً خداپرستانہ نظریہ میدان میں آجائے گا، اور پوری مادہ پرست دنیا کی اس نظریہ سے جنگ ہوگی ۔ جنید احمد کاظمی ابھی سے اس کے لئے تیاریاں کر رہا ہے ۔

"عورت اور اقبال" میں طیب عثمانی ندوی نے اقبالؒ کی خوب نمائندگی کی ہے ۔ دراصل طیب عثمانی نے جس مقصد کے لئے لکھا ہے، اقبال اُسی راہ کا ایک مسافر تھا ۔ اس لئے طیب کو اقبال کے سمجھنے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آئی ۔ غزل "تعمیری ادب" میں نجم الاسلام کا فوٹوگرافک آرٹ ہے ۔ نجم الاسلام کا میلان محض شاعری اور تنقید نگاری سے اب عکاسی اور مصوری کی طرف ہوتا جا رہا ہے ۔ نظموں میں "تضاد" ابوالمجاہد زاہد کی طرف سے آنے والے انتخابات کے لئے ایک پیغام ہے ۔ جو "جلسہ" شروع ہونے سے پہلے بطور تبرک پڑھا جا رہا ہے ۔ سہیل احمد زیدی نصیحت آمیز انداز میں کہتا ہے "سانبھو سوچ لو تو" دوسروں کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی ۔ "؟" متین طارق کی نئی نئی سوچ ہے ۔ ہلکی پھلکی اور معنی خیز ۔ "امین آباد کے بازار" طباطبائی کی گوریاں کی طرح اصل سے بڑھ گئی ہے ۔ باذ فاروقی اچھے "ترجمان" ہیں ۔ "آزمائش" حمایت المقیت صدیقی کا پُرسوز احساس ہے ۔ زندگی کی تعبیر، زندگی کے رُخ کی تعین ۔ غزلوں میں محمد یٰسین تسکین نے مقصد کو آہستہ آہستہ اُبھارا ہے ۔ جیسے گاڑی کو ذرا پیچھے کر کے آگے بڑھایا ہو ۔ نجم الاسلام نے بہت چھوٹی بحر میں بات کہی ہے ۔ دونوں غزلیں ایک نئے رنگ کو پیش کر رہی ہیں ۔ ابوالبیان حمّاد اور ابومحمد امام الدین رام نگری پُرانے لکھنے والے ہیں ۔ انھوں نے قدیم فن کا مظاہرہ کیا ہے ۔

"ادبیات نمبر" کی نظموں پر حفیظ میرٹھی کی تنقید "جامع اور پُرشفقت" ہے ۔ حفیظ کی تنقید سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شاعر دوسروں کی شاعری کو کس نظر سے دیکھ سکتا ہے ۔ اس "تجزیہ" میں اصلاح، مشورہ اور ہدایات تینوں چیزیں شامل ہیں ۔ جو نئے مقصدی شاعروں کے لئے قابلِ غور ہے ۔

"سنہری یادگار" میں فوزی عمری نے تاریخ اور حقیقت کو افسانے کے رنگ میں پیش کیا ہے ۔ مگر اس طرح کہ حقیقت کا تاثر افسانوی خول کی وجہ سے کم نہیں ہو جاتا ۔ سنجات اللہ صدیقی کا "تین کہانیاں" واقعات سے سبق حاصل کرنے کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے ۔ ابن محمود کے "یوں بھی دیکھتے ہیں" میں "تاج محل" اور اُس فکر کا تصادم ہے جو لکھنے والے کے قلب میں تاج ہی کی طرح جگمگا رہی ہے ۔

"کرملین کا انسان" زندگی کا ایک اور مقصد رکھنے والے کی طرف سے دوسرا مقصد رکھنے والوں پر طنز ہے ۔ اس طنز سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ یہ دراصل ایک اور نقطۂ نظر کی پیداوار ہے — ضرورت ہے کہ اس کو پروپیگنڈہ کہہ کر گزر جانے کے بجائے — سمجھنے کی کوشش کی جائے ۔ ہمایوں عرفان کا یہ ترجمہ دوسروں کے افکار سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے ۔

○

نقشِ ثانی ————

کیا ہم تیسرا نظام پیش کر سکتے ہیں؟

اس وقت ہمارے سامنے دو نظام اور دو راستے ہیں۔ ایک راستہ سرمایہ دارانہ جمہوریت اور امپیریلزم کا ہے۔ اور دوسرا راستہ کمیونزم اور سرخ جمہوریت کا۔ لیکن ہم ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستہ کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے سرمایہ دارانہ نظام کے تمام پچھلے کارنامے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس نظام نے کس طرح انسانوں کے ایک طبقے کو لوٹ کھسوٹ۔ ناجائز نفع اندوزی، سودی کاروبار، بلیک مارکیٹ اور اسی طرح کی دوسری بدعنوانیوں کے ذریعہ مفلوک الحال بنا دیا۔ اس نظام نے سیاسی اقتدار کا مالک بظاہر عوام کو قرار دیا۔ اور حکومت کو عوامی حکومت یا جنتا راج کے لقب سے نوازا لیکن عوام کی رائے کو کسی وقت بھی آزاد نہ رہنے دیا گیا۔ بڑے بڑے تاجروں اور مل مالکوں نے روپے کے بل پر ہمیشہ عوام کو بے وقوف بنایا اور ان کی سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، خود ان کے ووٹوں کے ذریعہ ایسے لوگ ان پر مسلط کر دیئے جو عوام کے بہی خواہ اور ہمدرد نہ تھے۔ بلکہ صرف اپنے پیٹ، اپنے جسم، اپنے خاندان اور اپنے دوست احباب کے بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ اس سرمایہ دارانہ جمہوری نظام نے انتہائی دھوکے باز، مکار، چالباز، زمانہ ساز، دنیا پرست، شہرت پسند، خود غرض اور حریص لوگوں کو اونچا اٹھایا، اور شریف، مخلص، نیک اور دیانتدار لوگوں کو نیچے گرایا۔ اس نظام میں عزت اور بڑائی روپیہ کے ساتھ بندھ گئی۔ شرافت اور نیکی کا پیمانہ روپیے کے بل پر اونچا ہونے لگا۔ اور روپیہ نہ ہوا تو نیچے گر گیا۔ اس نظام میں تمام اخلاقی اصول پامال کئے گئے ان کا اصلی جوہر نکالا گیا اور ان کو ذاتی اغراض و مصالح کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ———— بہت سے شریف آدمیوں کو مجبور کر کے ذلیل اور کمینہ بداخلاق اور بدکردار، رشوت خور اور خائن جھوٹا اور دغا باز بنایا گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اپنے اعلیٰ اخلاق اور خصوصیات کو بالائے طاق رکھ دو اور صرف ایک معاشی حیوان بن کر آگے بڑھو۔ اگر اپنے مفاد کی خاطر ہر بُرے سے بُرے کام کو انجام دینے کی ہمت رکھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ پیچھے ہٹ جاؤ۔ اس کے بغیر تمہارے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں۔ تم یہاں ترقیوں کے مدارج طے نہیں کر سکتے تم یہاں بلندیوں پر پہنچ نہیں سکتے تمہاری تجارت، تمہارا کاروبار اور تمہاری صنعت ہر چیز خطرے میں ہے۔ چنانچہ ان اصولوں نے پوری انسانی سوسائٹی میں بگاڑ ہی بگاڑ پیدا کر دیا۔ اور بگاڑ بھی ایسا جو مسلسل ترقی کرتا رہا جو ہر آن فتنہ و فساد کی ایک نئی نسل کو جنم دیتا رہا جس کے بیج سے لحظہ بہ لحظہ خرابی کے ہزاروں پودے اگتے رہے۔ اس اجتماعی شر و فساد کے نتیجہ میں اقوام اور ممالک کے اندرونی ڈھانچے میں فرد فرد کے درمیان کھینچا تانی، کشمکش، زندگی کے ہر میدان میں اندھا دھند مسابقت (UNFAIR COMPETITION) جھوٹی اشتہار بازی، تجارت اور کاروبار میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے والے طریقے، حرام اور حلال کی قید سے آزاد محض منافع پرستی کے تحت نئے نئے ذرائع اور ان کی تکمیل کے لئے جتھہ بندیاں، پیشہ ورانہ ٹولیاں، سیاسی بازی گری، پارٹی بندی، جماعتی رسہ کشی، اور اسی طرح کی سینکڑوں لعنتیں مسلط ہو گئیں۔ پھر قوم اور ملک کے باہر بین الاقوامی معاملات میں جھوٹے معاہدات، عالمگیر جنگیں، دوسرے ملکوں میں زیر زمین کارروائیاں، دوسروں کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانا، کمزور ممالک کے ذرائع پیداوار پر قبضہ کرنا۔ قومی خود سری، بڑائی اور تہذیبی برتری کے دعوے، غیر ممالک میں جھوٹا پروپیگنڈہ، بلاک سازی، گروہ بندی اور دنیا بھر پر اقتدار جمانے کی امنگیں پیدا ہوئیں اور اس طرح گھر سے لیکر بازار تک گندگی ہی گندگی لیپ دی گئی۔ اس نظام کے شریف ترین علمبرداروں نے سیاست عالم کے چوراہے پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے منہ پر تھوکا۔ ایک دوسرے کو گالی دی اور جھوٹے الزامات لگائے۔ آج اس نظام سرمایہ داری سے انسانیت کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ وہ اب جلد سے جلد اس ... بوجھ سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتی ہے۔

ان تمام تلخ ترین تجربات کے بعد کس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ سرمایہ داری کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر قبول کرے اور اسے دانتوں سے پکڑنے کے لئے لپکے۔

سرمایہ داری کے علاوہ جو نظام اشتراکیت یا کمیونزم کے نام سے اس وقت میدان میں ہے وہ بھی کوئی صالح اور بہتر نظام نہیں ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ سرمایہ داری کا بڑا بھائی کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظام اٹھا تو اسی غرض کے لئے تھا کہ سرمایہ داری کی اصلاح کرے لیکن اس کے اندر بھی وہ ساری برائیاں موجود ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام میں ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی گرتی ہوئی پوزیشن کو دیکھنے کے باوجود اپنا دارومدار بھی انھیں فلسفیانہ تصورات پر رکھتا ہے جن پر سرمایہ داری کا دارومدار ہے۔ اگر سرمایہ داری کے پاس تنازع للبقا کا حیاتیاتی نظریہ ہے تو اس کے پاس دوسری شکل میں جدلی مادیت (DIALECTIC MATERIALISM) کا موں بہ جواب مادی تاریخ کے اعتبار سے بالکل ویسا ہی جیسا تنازع البقا کا سرمایہ دارانہ اور قوم پرستانہ نظریہ۔ یہ نظام بھی عوام کی مساوات، عوام کا راج اور انسان کے بھائی چارے کا دعوی کرتا ہے لیکن عملاً ایک پارٹی کے اقتدار کے شکنجے میں سارے انسانوں کو جکڑ دیتا ہے۔ اس کی جمہوریت سرمایہ دارانہ جمہوریت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ وہاں آزادی کے باوجود روپیہ رکھنے والے پروپیگنڈے کے زور سے عوام کو دھوکا دے کر خود اقتدار کی مسند پر بیٹھ جاتے ہیں اور یہاں ایک جماعت اور ایک پارٹی کے نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اقتدار کی گارنٹی لکھ دی جاتی ہے۔ یہ پارٹی برائے نام الیکشن بھی کرواتی ہے۔ عوام سے ووٹ بھی ڈلواتی ہے۔ لیکن یہ سب ایک ڈھونگ ہوتا ہے جو بہت بڑے پیمانے پر رچایا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک دفعہ برسر اقتدار آجانے والی جماعت اول تو دوسری تمام مخالف پارٹیوں کو ختم کر دیتی ہے اور پھر تمام بڑی بڑی املاک جائدادوں اور کارخانوں پر قابض ہو جاتی ہے۔ اس طرح کسی اور کے پاس یہ اختیار رہتا ہی نہیں کہ وہ برسر اقتدار پارٹی کو اپنی جگہ سے ہٹا سکے اور اگر اس کا دل چاہتا ہو تو موجودہ سربراہ کاروں کے بجائے دوسروں کو چن لے۔ اس نظام میں ایک دفعہ جو طبقہ اوپر آگیا سو آگیا۔ اس طرح سرخ جمہوریت بھی انتہائی گھناؤنی اور بدترین قسم کی جمہوریت ثابت ہو چکی ہے۔ جب اس نظام کے کرتا دھرتا بھی سرمایہ داری کی مخالفت کے باوجود سرمایہ داروں ہی کی طرح خود تمام جائدادوں اور زمینات پر بلا شرکت غیرے قابض ہو جاتے ہیں تو اس میں [illegible] فرق ہوا۔ سرمایہ داری تو کمیونزم کی شکل میں صرف [illegible] کے ہاتھ سے نکل کر [illegible] کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ اس طرح گویا سرمایہ اور حکومت و اقتدار اور روپیہ دونوں ایک ہی ہاتھ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ایک بدترین ظلم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کو اپنی جگہ سے اکھاڑنے کا عوام کے پاس کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔ اتنا ذریعہ بھی نہیں جو سرمایہ دارانہ جمہوریت میں دستوری طریقے، ہڑتالوں اور سول نافرمانی کی شکل میں حاصل رہتا ہے۔ اس طرح کمیونزم سرمایہ داری سے بھی زیادہ گھناؤنے پن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ پھر کمیونسٹ نظام میں سرمایہ داری ہی کی طرح گندہ اخلاقی اصول اور طریقے رائج رہتے ہیں۔ بلکہ کمیونزم چونکہ سرمایہ داری کو پچھلے دور کے نظاموں کے مقابلے میں ایک ترقی یافتہ نظام سمجھتی ہے اور اپنے بعد اسی کا درجہ مقرر کرتی ہے اور اپنی عمارت کی تعمیر بھی سرمایہ دارانہ نظام کی گرتی ہوئی بنیادوں پر ہی کرتی ہے اس لئے سرمایہ داری کی ساری برائیوں اور گندگیوں کو یہ اپنے اندر سمو لیتی ہے یہ ان کو جذب کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ سرمایہ داروں کے اقتدار کے [illegible] جو اخلاق فاسدہ، جو بدکاریاں، جو گندگیاں، اور جو برائیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے سرمایہ داری کا دم گھٹ رہا ہے، اس کی جان لبوں پر ہے کمیونزم چاہتی ہے کہ ان کو ڈھانپ لے۔ ان کو ہضم کرے اور ایسا نظام پیش کرے جو ان گندگیوں اور غلاظتوں کے جسم پر ٹھیک بیٹھ سکے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ ساری برائیاں ایک دور کی ترقی یافتہ اخلاقی قدریں ہیں "نئے خارجی حالات" کی۔ اور سرمایہ داری ان قدروں کے اوپر ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ لہذا وہ ان "قدروں" کے مطابق ایک ٹھیک سا نظام پیش کرتی ہے۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کمیونزم سرمایہ دارانہ عہد کے جھوٹ، خیانت، بدعہدی فریب اور دغا کو ایک اصول اور ضابطہ کے تحت جائز قرار دیتی ہے۔ زناکاری عیاشی، عریانی اور عورت مرد کے آزادانہ اختلاط کے لئے باقاعدہ اصول بناتی ہے۔ معاشی لوٹ کھسوٹ کو اپنی انتہا تک پہنچاتی ہے اور اسٹیٹ اور سرمایہ کو ایک جا جمع کر کے اسٹیٹ کو غیر معمولی اختیار دیتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے عوام کا خون چوسے۔ امپیریلزم کی طرح یہ بھی توسیعی پالیسی (EXPANSION POLICY) رکھتی ہے اور دوسرے کمزور ممالک کو عوامی انقلاب کے نام پر اسی طرح ہضم کر لینا چاہتی ہے جس طرح سامراج شاہی۔ تہذیب شائستگی اور جمہوریت سکھانے کے بہانے ہضم کرتی رہی ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں یہ سامراج شاہی سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس کا نعرہ تبلیغی نعرہ ہے اور یہ بین الاقوامی تنظیم کے بل پر آگے بڑھتی ہے۔ دوسرے ممالک میں زیر زمین تحریکیں چلانا، توڑ پھوڑ، سازشیں، اقتدار کے لئے مکر و فریب، دغا، چالبازی، عیاری، بدعہدی، واقعات کی غلط تعبیریں اس نئی نام نہاد انقلابی تحریک کا طرۂ امتیاز

۔ یہ تحریک، یہ نظام، سرمایہ دارانہ عہد کی برائیوں کو اپنی انتہائی حد تک ترقی دیتا ہے؛ اور انسانیت کی پیٹھ میں خود انسانیت کے نام پر خنجر گھونپ دیتا ہے۔ ابھی اس نظام کے خد و خال بعض لوگوں کے سامنے کھل کر نہیں آئے۔ یہ لوگ اس قدر عقیدت میں مبتلا ہیں کہ کمیونزم کے خلاف ہر واقعہ کو پروپیگنڈا قرار دیتے ہیں اور آہنی پردے کے پیچھے سے آنے والی ہر اطلاع اور روسی حکومت کی تیار کردہ ساری رپورٹیں اور اعداد و شمار بیان کو وحی آسمانی کی طرح یقین آ جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ہوش کی دوا کریں تو تنگ نظری اور جوابی پروپیگنڈے کو نظر انداز کر کے خود کمیونسٹ نظریات پر آزادانہ غور و خوص کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں اور کمیونزم کے رچائے ہوئے ڈھونگ کو سمجھ سکتے ہیں اور اگر وہ ان تمام باتوں سے اصلیت تک نہیں پہنچ سکتے تو پھر وقت کا انتظار کریں۔ وقت آئے گا اور انہیں سمجھائے گا۔

یہ ہے سرمایہ داری اور کمیونزم کا اصلی روپ۔ اس لئے یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی سمجھدار آدمی ان دونوں نظامات میں سے کسی کو اپنے لئے پسند نہیں کر سکتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم کونسا نظام قبول کریں؟ یا خود ہم کوئی تیرا نظام پیش کر سکتے ہیں؟ جو کچھ بھی ہو، غور طلب بات یہ ہے کہ اس تیسرے نظام کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں، اگر ہمیں واقعی ایک نیا نظام درکار رہے۔

سرمایہ داری اور کمیونزم کے تجربہ کی روشنی میں بنیادی طور پر یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ اس تیسرے نظام میں ان دونوں نظاموں کی برائیوں سے پرہیز ضروری ہے۔ چنانچہ ان دونوں نظاموں میں ایک جماعت یا ایک طبقہ کو غیر محدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور یہی چیز فتنے کا اصلی سبب ہے۔ نئے نظام میں کسی انسانی طبقے یا جماعت کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں ایسے اختیارات نہیں دئے جا سکتے۔ اگر برتری اور بالادستی کسی کو حاصل ہو سکتی ہے تو وہ صرف اس دستور، اس قانون، اور اس کتاب ہدایت کو حاصل ہو سکتی ہے جس کو سارے عوام اور پوری سوسائٹی تسلیم کرے۔

تیسرا نظام ایسا ہوگا کہ آئے دن کی ایجادات، اختراعات اور تغیر پذیر وزن اقع پیداوار کے ساتھ اس کے اندر کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ بلکہ ہر نئی ایجاد اور تمدنی ترقی کے ساتھ وہ بھی اپنی لچک میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اور اجتہاد اور تحقیق کے ذریعہ نئے طریقوں کو اپنے اندر سموتا چلا جائے گا۔ اس طرح طبقہ وارانہ کشمکش، بے روزگاری، جنگ و جدال اور لوٹ کھسوٹ کی نوبت نہیں آئے گی اور انسانی سماج بغیر کسی جدلی عمل یا تنازع للبقاء کے ترقی کرتا رہے گا۔

تیسرا نظام سوسائٹی میں ایسے اصول رائج کرے گا جن کے ذریعہ لوگ صرف اپنے حقوق طلب کرنا ہی نہیں بلکہ اپنے فرائض (DUTIES) کو بھی پہچانیں۔ وہ ہر ہر فرد میں ہم آہنگی اور تعاون کا جذبہ پیدا کرے گا۔ مختلف طبقوں اور پیشوں میں کشمکش کے بجائے ملاپ اور بھائی چارے کا اصول رائج کرے گا

تیسرا نظام ہر قسم کی خود غرضی کو بے روک ٹوک جاری رہنے نہیں دے گا۔ وہ شخصی، قومی، نسلی، وطنی، طبقہ وارانہ اور جماعتی تمام تنگ نظریوں اور خود غرضیوں کو جو ان دونوں نظاموں میں موجود ہیں ختم کرے گا۔ اور ان کے بجائے وسیع النظری اور عام انسانی ہمدردی کے اصول کو رائج کرے گا۔

تیسرا نظام ہر قسم کی دنیاداری یا دنیا پرستی یا وقتی فائدوں کی طلب کو بھی کالعدم قرار دے گا کیونکہ انسانیت کو تباہ کرنے والے سارے نظامات میں چاہے وہ تھیوکریسی ہو، فیوڈلزم ہو، شاہی ہو، کیپٹلزم ہو یا کمیونزم یہ بلا برابر موجود رہی ہے اور اسی وجہ سے ان سب کی ظاہری تبدیلیوں کے باوجود نتائج ہمیشہ ایک ہی نکلتے رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیزیں عرصے سے انسانیت کو تباہ و برباد کرنے والے نظاموں میں مشترک چلی آ رہی ہیں ان کو چھوڑنا ـــ بلکہ ان کو مٹانا اور پامال کرنا، اور ان کے بجائے انسانی فطرت کے مطابق اعلیٰ اخلاقی اصولوں، ابدی حقیقتوں اور دائمی سچائیوں کو جاری کرنا ضروری ہے ـــ ایسا کئے بغیر ہرگز کوئی تیسرا نیا نظام وجود میں نہیں آ سکتا۔

اب ہندوستان والوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا وہ سرمایہ داری اور کمیونزم کے بجائے ایسے کسی تیسرے نظام کو قبول کر سکتے ہیں یا یہ ـــ اگر قبول نہیں کر سکتے تو کیا وہ خود ایسا کوئی نظام پیش کر سکتے ہیں؟ دراصل اس سوال کے جواب ہی پر ہندوستان کے مستقبل کا دار

جنید احمد کاظمی

خداپرستی اور مادّیت

(ایک تجزیہ)

یہ کوئی انوکھی چیز نہیں کہ حق او رصداقت پر باطل نے یورش کی ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش قدیم ہے۔ لیکن حق ہمیشہ ہر یورش کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا رہا ہے۔ اور بالآخر باطل کو شکست کھانی پڑی ہے۔ شب کی ظلمت صبح کے نور سے شرما کر کافور ہو جاتی ہے حسین ستاروں کی رونق، چاند کی بے پناہ روشنی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ اور حق ہمیشہ ہر نرغے سے مسکراتا ہوا باہر آ جاتا ہے۔

حق اور باطل کی یہ جنگ کسی ایک رزمگاہ میں محدود بھی نہیں ہے۔ بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی اس جنگ کی لپیٹ میں آ گئے ہیں چنانچہ آج بزعم خود مدعیان علم و دانش کی زبان سے ایک ایسی حقیقت کا اظہار سننے میں آ رہا ہے۔ جو درحقیقت محتاج ثبوت نہیں۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ اس تمام کائنات کا پیدا کرنیوالا، چلانیوالا اور ختم کر دینے کی قوت رکھنے والا کوئی ضرور ہے لیکن نہیں ہے کہ سارا کارخانہ بغیر کسی ہستی کے چلائے چل رہا ہو بلکہ پورا انتظام ایک زبردست نگران کے زیر نگرانی قایم ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف کہ اس کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے۔ دراصل انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہمیشہ، ہر دور میں، ہر ملک اور ہر ماحول میں انسان نے ایک معبود کی احتیاج محسوس کی ہے۔ اور اس کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہا ہے۔ پتھر کا دور ہو لوہے کا عہد ہو یا آج کا دور سائنس، ہمیشہ انسان کے سامنے اس ضرورت کا احساس رہا ہے جو کچھ تاریخ کا سرمایہ آپ کے پاس ہے اس کا ابتدائی باب اٹھا کر دیکھیے۔ انسان، غاروں۔ پیڑ کے کھوہوں، اور پہاڑ کے دروں میں رہتا تھا۔ کپڑوں کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ جنگلی جانوروں پر گذر اوقات کرتا تھا۔ لیکن بگولوں اور بونڈر کو، سانپوں اور بچھوؤں کو درختوں اور پہاڑوں کو اپنا معبود سمجھتا تھا۔ اور آگے بڑھیے۔ انسان کی عقل نے کسی جگہ کچھ اور ترقی کی۔ اور وہ سورج، چاند، ستارے اور آسمان کا پجاری بن گیا۔ کسی قدر اور روشن خیالی پیدا ہوئی۔ کوشش نے روح کو معبود کی صف میں لا کھڑا کیا۔ آج کا دور دور سائنس ہے۔ بلاشبہ ماہرین علم طبیعات کی ایک بڑی تعداد ایسے وجود کی منکر ہے لیکن انہیں میں سے اکثر نقوش ہمیں ایسے بھی مل جاتے ہیں جنھوں نے کھلے الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اس کارگاہِ ہستی کا کوئی ناظم ضرور ہے۔ مثلاً ماسین، ملین، ایڈورڈ، ہربرٹ اسپنسر، پروفیسر لینا، جرمنی کا آئن اسٹائن، ڈاکٹر مبکرا نڈ، وغیرہ۔

جس طرح ایک خاندان کے افراد محسوس کرتے ہیں کہ ان کا کوئی سردھرا ہونا چاہیئے۔ ایک شہر کے شہری محسوس کرتے ہیں۔ کہ شہر کا کوئی منتظم ہونا چاہیئے۔ ایک ملک کے بسنے والے محسوس کرتے ہیں۔ کہ ملک کا کوئی نگران ہونا چاہیئے۔ ٹھیک اسی طرح اس طویل و عریض کائنات کے بسنے والے انسانوں کا یہ احساس بھی بالکل فطری ہے۔ کہ اس کارگہ ہستی کا کوئی مربّی اور سرپرست ہونا چاہیئے۔

درمیان میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقسام معبود کی یہ کثرت کیوں ہوئی؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ جب دنیا عہد طفولیت سے گذر رہی تھی۔ تو انسان کی معلومات بھی محدود تھیں۔ کہیں پر وہ پہاڑوں کے پر ہیبت سلسلے سے مرعوب ہوا۔ اور اسے خدا بنا ڈالا۔ کہیں سمندر کی پرشور موجوں سے سہم کر اسے معبود کی صف میں لا کھڑا کیا۔ کہیں سورج، چاند، تارے اور ہوا کی قوت سے خوف

کھاکر اور ان کی افادیت سے متاثر ہوکر ان کی پرستش کرنے لگا۔ کہیں گھٹے کی اس قربانی سے کہ وہ اپنے بچے کی محبت کو بالائے طاق رکھ کر سارا دودھ انسان کے سپرد کر دیتی ہے —— اپنے جوان بیٹوں کو دھوپ، سردی، گرمی اور بارش کا مقابلہ کرنے کے لئے کسان کے سپرد کر دیتی ہے۔ حیرت زدہ ہوکر اس کے آگے سر نیاز خم کر دیتا ہے۔ اور اسی کی بندگی کرنے لگتا ہے۔ کہیں سانپوں اور بچھوؤں کے زہر سے خوف کھاکر انھیں کی پوجا کرنے لگتا ہے۔

جب دنیا عہد طفلی سے گذر کر دور شباب میں داخل ہوئی۔ اور سائنس کی نت نئی معلومات نے اُن تمام چیزوں کی اصلی ماہیت کا سراغ لگا لیا۔ تو پھر یہ سارے کے سارے معبود، معبودوں کی صف میں سے نکل کر عباد (بندوں) کی صف میں داخل ہوگئے۔ اور ان تمام چیزوں کا شمار قدرت میں نہیں بلکہ مظاہر قدرت میں ہونے لگا۔ اور تلاش معبود کی وہی مہم از سر نو شروع ہوگئی جو اس سے قبل کئی مرتبہ شروع ہوچکی تھی۔

مختصر یہ کہ ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں ایک معبود کا پجاری رہا ہے۔ صابی (ستارہ پرست) نے سورج کی بندگی کی۔ زرتشتیوں نے آتش پرستی میں اپنی نجات سمجھی۔ ہندوالوں نے پتھروں اور گایوں کے آگے اپنا سر جھکایا۔ ایرانیوں نے تاروں کی بندگی میں اپنے آپ کو دیدیا امام یورپ نے مادہ کو معبود سمجھا۔ اور مسلم نے وحدہٗ لاشریک کی الوہیت کا اعلان کیا۔ حالی نے اسی حقیقت کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا — آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے — انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

مادیت کے اصول: آیئے اب ہم اس گروہ کی طرف متوجہ ہوں جس نے اس حقیقت کا انکار کیا ہے۔ یہ طبقہ مادہ پرستوں کے نام سے موسوم ہے۔ درحقیقت انسان ہر اُس چیز پر بڑی جلدی ایمان لے آتا ہے۔ جو مرئی ہو۔ اور اس کے احاطۂ ادراک و احساس میں آسکے۔ خدا کو چونکہ کسی نے دیکھا نہیں۔ اس لئے تمام اسباب کے ہوتے ہوئے بھی اس طبقہ نے خدا کا انکار کر دیا ہے لیکن اگر منکرین خدا ذرا بھی انصاف سے کام لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے معلوم نہیں کتنی اَن دیکھی چیزوں پر ایمان لا رکھا ہے۔ جن چیزوں پر سائنس کی بنیاد ہے۔ مثلاً انرجی، کشش ارضی، ایتھر، ...... وغیرہ وہ سب کی سب غیر مرئی ہیں۔ ان میں سے کسی شے کو کسی سائنسدان نے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن اگر ان چیزوں کو سائنس میں کوئی جگہ نہ دی جائے۔ تو ساری عمارت منہدم ہو جائے۔ پھر کیا کسی نے روح کو دیکھا ہے۔ اگر نہیں دیکھا تو اس پر آمنا و صدقنا کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ چند چیزیں مثال کے طور پہ پیش کی گئیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عفریت مادہ کے مجروح، معلوم نہیں کتنی ان دیکھی چیزوں پر ایمان لے آتے ہیں جو اُن کے محسوسات کے دائرہ سے بالکل باہر ہیں۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اس فہرست میں اُس قوت کا اضافہ کرنے سے کتراتے ہیں۔ جو تمام دنیا کی خالق ہے۔ منکرین خدا اس اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم نے بلاشبہ ان چیزوں کو نہیں دیکھا لیکن اُن چیزوں پر ہم اس طرح ایمان لائے ہیں جس طرح دھواں دیکھ کر آگ کی موجودگی پر۔ دھوپ دیکھ کر ابر کی ناپیدگی پر یقین کر لیتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے اسباب کو دیکھ کر فاعل اسباب کی موجودگی پر صحت کا سرٹیفکٹ دے دیتے ہیں لیکن اگر ایسی ہی بات ہے اور آپ اپنے قول میں صادق ہیں تو یہی اصول وجود باری کے مسئلہ میں کیوں نہیں اختیار کرتے۔ کیا تمام مظاہر فطرت قدرت کی صناعیاں، اور کائنات کی باریکیاں پکار پکار کر نہیں کہہ رہی ہیں کہ ؎

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

یہ تو ان اشیاء کے متعلق تھا۔ جو حقیقتاً غیر مرئی ہیں۔ بہت سی موجودہ چیزیں بھی ایسی ہیں۔ جو ہم میں سے اکثر نے نہیں دیکھیں۔ لیکن ہم ان پر اس لئے ایمان لاتے ہیں کہ ان چیزوں کو ماہرین نے معلوم کیا ہے۔ مثلاً ہم میں سے ہر شخص نے امریکہ نہیں دیکھا۔ ہر شخص نے سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کی اونچائی نہیں ناپی۔ ہر شخص نے زمین کا محیط اور اس کے قطر کی پیمائش نہیں کی۔ ہم سب ان تمام چیزوں کو محض دوسروں پر "ایمان" لاکر صحیح سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید ہماری زندگی دو دن کے لئے بھی دشوار ہو جائے۔ پھر اگر ہم ماہرین

علم الطبیعات کے اِن تجربات اور مشاہدات کو سندِ صحت دیتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اِن بزرگ شخصیتوں کے مشاہدات پر ایمان لاکر جنھوں نے بچشم خود احساس سے ماورا اشیاء کا مشاہدہ کیا ہے۔ اُس خالق کے وجود کو نہ مانیں جس نے تمام کائنات کو وجود بخشا ہے۔

آپ گذشتہ ماہرین سائنس کے تجربات پر ایک نگاہ ڈالئے کیا تھیلز کا یہ انکشاف کہ زمین پانی پر تیرتی ہوئی ایک ٹکیہ ہے قطعاً قابل التفات ہے! کیا " ANAKAMINS " کی یہ تحقیق کہ تارے شیشے کے بنے ہوئے ہیں۔ اور آسمان میں جڑے ہوئے ہیں کوئی وزن رکھتی ہے! کیا فیثا غورث کا یہ قول کہ تمام کائنات زمین کے گرد گھوم رہی ہے۔ آج کی دنیائے سائنس میں کوئی جگہ پاسکتا ہے۔ کیا آپ آج بھی یہ سننے کو تیار ہیں کہ نباتات میں زندگی نہیں۔ اسی طرح کے معلوم نہیں کتنے انکشافات ہیں جنھیں زمانہ نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ آپ کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ سائنس کی فراہم کردہ موجودہ معلومات مستقبل میں بھی روشنی کا کام دینگی!!

خدا پرستی کے اُصول :- اب آپ دوسری طرف ان علمائے کائنات پر نگاہ ڈالئے جو ان معروف اور غیر معروف ہستیوں کے علاوہ جو دنیا کی ہر قوم میں پیدا ہوئیں۔

ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، اسحٰق، یعقوب اور محمد (علیہم السلام) کے اسمائے گرامی سے مشہور ہیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں صدیاں گذر گئیں۔ دنیا کہیں سے کہیں پہونچ گئی۔ لیکن کیا ان کا ایک قول بھی غلط ثابت ہو سکا۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ اور یقیناً نہیں ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انسان، شیکسپیر، روسو، کانٹ، برگساں، اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کی تحقیقات کو بلاچون وچرا تسلیم کرلیتا ہے۔ اور ان سچی روحوں کے اقوال کو جو انتہائی بلند عزم، عفیف، ذکی، پرکیرکٹر، اور راسخ علم کی حامل تھیں، غلط سمجھتا ہے۔ اگر یہ محض ہٹ دھرمی، ضد اور ڈھٹائی نہیں، تو کیا ہے؟ اگر ہم ماڈرن سائنس کے نظریۂ تخلیق کائنات پر نگاہ ڈالیں۔ تو ہم کو یہ جواب ملتا ہے کہ سب سے پہلے فضا میں دھواں ہی دھواں تھا جس کو سائنس کی اصطلاح میں ذرات برقیہ کہہ سکتے ہیں۔ ان ذرات میں، زمین، آسمان، کواکب، ہوا اور پانی وغیرہ بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس لئے اتفاقی طور پر اس سے یہ اجرام سماوی تیار ہوگئے۔ ایک سیارہ حرکت کرتا ہوا آفتاب کے قریب سے گذرا۔ اور آفتاب کی کشش سے اس کا ایک ٹکڑا اس سے علیحدہ ہوکر گھومنے لگا۔ یہی ہماری زمین کہلائی۔ زمین جب ٹھنڈی ہوئی۔ تو چاروں طرف چھائے ہوئے بخارات پانی کی شکل میں برس پڑے۔ پانی زمین کے اندر پہونچا۔ تو زلزلے آئے۔ جو پہاڑوں کے بنانے کے موجب ہوئے۔ کہیں زمین ابھری کہیں بیٹھ گئی۔ اور اس میں پانی بھر گیا۔ یہ سمندر کہلائے۔ سمندر کے قریب "امیبا" کی تخلیق ہوئی۔ جو واحد الخلیہ ہے اور جس کے ترکیبی اجزا، ہائیڈروجن، آکسیجن، کاربن اور نائٹروجن وغیرہ ہیں۔ اسی سے نباتات وغیرہ پیدا ہوئے۔ اور آخر میں حیوانات نے جنم لیا۔ اور یہ سب کچھ محض اتفاقی طور پر خود بخود ہوگیا۔

اب آیئے ہم اس انکشاف کا تجزیہ کرکے دیکھیں کہ اس میں کچھ واقعیت بھی ہوسکتی ہے یا محض وہم واندازہ ہے۔ جب ہم کائنات پر ایک تحقیقی نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے انتہائی نظم وسلیقہ، ترتیب اور قرینے سے قایم کر حرکت زمین، گردش شمس وقمر، ترکیب کواکب، نظم لیل ونہار، اطاعت باد وآب وغیرہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔ کہ ان کا خالق اور ان کو وجود بخشنے والا ایک انتہائی مدبر، عقلمند، منتظم، اور ہمہ بین وہمہ داں ہستی ہے۔ وہ کوئی اندھیر نگری کا راجا نہیں ہے کہ جس کا راج چوپٹ راج ہو۔ بلکہ اس کے راج میں ہر چیز انتہائی نظم ونسق کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہونے کے بجائے مغرب سے طلوع ہونے لگے۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ تارے اپنی متعین راہوں کو چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرلیں۔ یہ امر بھی قطعی محال ہے کہ پانی اپنی فطرت بدل کر بجائے جانب نشیب کے فراز کو بہنے لگے۔ آگ کی خاصیت جلانے کی ہے۔ وہ جلائیگی پانی اپنے مقررہ اصولوں کے تحت آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ آپ اس سے آگ کو روشن نہیں کرسکتے۔ آپ منہ سے کھانے کے بجائے ناک سے نہیں کھا سکتے اور ناک سے سانس لینے کے بجائے کان سے سانس نہیں لے سکتے۔ ہر چیز کے لئے کچھ اصول مقرر ہیں۔ جن سے وہ سرمو انحراف نہیں کرسکتی۔ کیا اس قسم کا نظم وضبط، کنٹرول، اور اطاعت محض اتفاقاً پیدا ہوسکتی ہے۔ اور ایک ایسی شے ہے اور ایک ایسے ذرہ بے مقدار

سے جو خود اندھا بہرا۔ بے حس اور بے شعور ہو؟ ایک کاریگر اپنی مصنوعات سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک معمار کی ذہانت اس کی تیار کردہ عمارات سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک عورت کی قابلیت اور نفاست کا اظہار اُس کے گھر کی آرائش و زیبائش سے ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ایک بادشاہ کی قابلیت اس کی رعایا کی خوشحالی، امن، چین اور معاشی سکون و اطمینان ہی سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کوئی صناع ہو تو کند ذہن لیکن اس کی مصنوعات اپنا جواب نہ رکھتی ہوں۔ ایک معمار ہو تو بالکل بیوقوف لیکن اُس کی تیار کردہ عمارتیں لا ثانی ہوں۔ ایک عورت ہو تو بالکل بدسلیقہ لیکن اس کے گھر کی آراستگی اور زینت دیکھ کر بے اختیار داد تحسین دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایک بادشاہ ہو تو امور سلطنت سے بالکل نابلد لیکن اس کی حدود سلطنت میں امن و سکون، خوشحالی اور اطمینان کا دور دورہ ہو۔ ہر کام انتہائی نظم و ضبط سے ہو رہا ہو۔ اس کے مقرر کردہ قواعد کی پوری پوری پابندی کی جا رہی ہو۔ پھر اگر یہ تمام باتیں ناممکن ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا "خالق" عقل و سمجھ اور فہم و ادراک سے عاری ہو۔ لیکن کائنات کی ہر شے بالکل موزوں انداز اور سب طریقے پر ایک مقررہ اصول کے تحت اپنا فرض انجام دے رہی ہو!

آپ دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں آئے دن دیکھتے ہیں کہ حکومت نے ذرا بھی تساہل سے کام لیا۔ اور اُس کا نظم بگڑ گیا لیکن فطرت کے قوانین اب بھی اسی طرح پوری حفاظت کے ساتھ جاری و نافذ ہیں جس طرح ازل میں تھے۔ اشیاء کائنات کے تناسب اور انتہائی موزونیت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ پانی جو ہمارے، آپ کے اور تمام نباتات و حیوانات کے لئے مدار حیات ہے۔ دو حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے مرکب ہے۔ اس دوا دراک کے تناسب کے علاوہ آپ لاکھوں اور کروڑوں مرکبات ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مختلف تناسبات سے تیار کر ڈالیں۔ ان میں سے ہر مرکب ایک زہر ہلاہل ہوگا۔ غور کیا آپ نے کس قدر دانا اور بینا ہے وہ ہستی کیا یہ سب محض اتفاق کے نتیجہ میں حاصل ہو سکتا ہے؟

آیئے اب اُن اجزا کی داستان بھی سنئے جنھیں آپ عناصر کہتے ہیں۔ کائنات کی ہر شے چند عناصر سے مرکب ہے۔ چند اجزاء آکسیجن، نائٹروجن، ہائیڈروجن اور نمک وغیرہ سے حیوانات، پتے، پھل، پھول، شاخیں، مختلف رنگ، مختلف ذائقے سبھی کچھ تیار ہوئے۔ اجزاء ایک، لیکن اُن سے بنی ہوئی چیزیں مختلف۔!

وہی اجزا کہیں پھول کی تخلیق کرتے ہیں۔ کہیں خار کی۔ کہیں بحر کی۔ کہیں بر کی۔ کہیں شجر کی، کہیں حجر کی، کہیں شہد فراہم کرتے ہیں۔ اور کہیں حنظل۔ انہیں اجزا سے شعرا رہنما و فارس کی ہیرو ئن بلبل بھی وجود میں آئی۔ اور مکروہ صورت زاغ و زغن بھی پیدا ہوئے۔ کپاس اور گندم دونوں ہی آٹھ عناصر سے پیدا ہوئے۔ لیکن دونوں کے رنگ و ذائقہ اور صورت شکل میں کتنا اختلاف ہے! کوئلہ اور ہیرا دونوں کاربن ہی کی پیداوار ہیں۔ لیکن ایک لوہار کی بھٹی میں جلایا جاتا ہے۔ اور دوسرا بادشاہ کے تاج کو زینت بخشتا ہے بس۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کائنات کی ہر شے خواہ وہ جمادات ہو یا نباتات، حیوانات ہوں یا انسان سبھی ان چند عناصر سے مرکب ہیں ؎

حقیقت ایک ہر شے کی ہے نوری ہو کہ ناری ہو ∴ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

پھر کیا محض "اتفاق" اس قدر باریک صناعی کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور کیسی باریکی! اقدار کا یہ تناسب صرف موٹی چیزوں میں ہی نہیں ہے۔ تاریک ترین غاروں میں مکڑی کا بچہ [illegible] نہیں ہو سکتا [illegible] گہرائی میں گھڑیال کا بچہ گھڑیال ہی ہوگا۔ مچھلی نہیں ہو سکتا۔ ذرا قانون کی آہنی گرفت تو دیکھئے کہ آپ کے دل کی دھڑکن ایک منٹ میں ۷۲ دفعہ سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اللہ اکبر اس کی قدرت کس قدر محیط ہے۔ لیکن افسوس ہے ان عقل کے اندھوں پر جنہوں نے کرشمہ ہائے قدرت کو ہم سے کہیں زیادہ سمجھا ہے۔ اور وہ ابھی تک یہی کہے جا رہے ہیں کہ کائنات کے خالق محض چند اجزاء ہیں

جو بالکل بے بس۔ بے شعور۔ بے حس اور فہم و ادراک سے عاری ہیں۔ کیا کوئی ایسی ہستی جو خود سن نہ سکتی ہو۔ دوسروں کو قوت سمع دے سکتی ہے۔ اور کیا کوئی چیز جو خود دیکھ نہ سکتی ہو۔ دوسروں کو قوت بصر دے سکتی ہے ؟

رات کو آسمان کی جانب نظر کیجئے۔ کہکشاں کی شاہراہ کتنی حسین اور دلفریب نظر آتی ہے۔ ستارے اپنی اپنی متعینہ گذرگاہوں پر گامزن ہیں۔ شہاب ثاقب کشش ارضی کی وجہ سے زمین کی طرف کھینچے چلے آرہے ہیں۔ چاند اپنے مقررہ راستہ پر گردش کر رہا ہے۔ کچھ ثوابت اپنی جگہ پر قایم ہیں۔ ان ثوابت و سیاروں کی تعداد کتنی ہے۔ کوئی صحیح طور پر شمار نہیں کر سکتا۔ سب محو خرام ہیں۔ ہماری زمین بھی برابر حرکت کر رہی ہے۔ لیکن ہم کو احساس تک نہیں۔ پھر یہی اکیلی زمین کیا کروڑوں کرّے ہماری زمین سے کہیں بڑے اسی فضا میں پیر رہے ہیں۔ صرف مشتری ہماری زمین سے ۱۳ گنا بڑا ہے۔ لیکن کہیں تصادم نہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ سب سیارے اصول کشش کے تحت اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ بجائے اتفاق نے یہ کیسے طے کیا کہ چاند اور سورج کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیئے۔ زمین اور مشتری میں یہ دوری ہونی چاہیئے۔ زحل اور مریخ کو ایک دوسرے سے اتنا دور ہونا چاہیئے۔ تاکہ کشش کا توازن برابر رہے۔

آیئے ایک نگاہ سمندر پر بھی ڈالیے۔ اس کی خطرناک لہروں کو اور مہیب مد و جزر کو آخر کون قوت روکے ہوئے ہے۔ وہ دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور ساحل سے ٹکرا کر واپس چلا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھوکا شیر جنگلہ میں بند ہے۔ قریب میں کوئی انسان آتا ہے تو اُسے دیکھ کر جھپٹتا ہے۔ لیکن لوہے کی سلاخیں اسے روک لیتی ہیں۔ آپ استدلال کریں گے کہ پانی فراز کی طرف نہیں بہتا۔ وہ ہمیشہ اپنی سطح تلاش کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پانی خشکی کا تین گنا ہے اگر عقل کل نے اپنی انتہائی لیاقت سے زمین کو پست و بلند نہ بنایا ہوتا۔ اور یہ زمین ہموار و مسطح ہوتی تو تمام پانی ہی پانی ہوتا۔ اور اس کی گہرائی اس وقت زمین پر دس ہزار فٹ ہوتی۔ کیا آپ ان نکات [illegible] اس سائنس کا احاطہ کر سکتے تھے۔

پُرہیبت و پُرعظمت پہاڑوں کی طرف نگاہ ڈالیے۔ وہ کس طرح متانت و سنجیدگی سے کون صف بستہ کھڑے ہیں وہ آپ کو جامد نظر آتے ہیں لیکن سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ اگر کہیں ماؤنٹ ایورسٹ گر پڑے تو معلوم نہیں کتنی بستیاں تباہ ہو جائیں۔ آخر کونسی قوت ان کو تھامے ہوئے ہے۔ اس دفعہ بھی مادہ کا پجاری بول اٹھیگا۔ کہ یہ سب مادہ کے کرشمے ہیں۔ لیکن میں اُس سے پوچھتا ہوں کیونکہ یہ وہی مادہ ہے جسے خود اپنی خودی کی خبر نہیں۔ کیا کوئی ہستی جو خود اپنی ہستی کی خبر نہیں رکھتی۔ دوسروں کی خبرگیری کر سکتی ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے کیڑے بھی ملیں گے۔ جن کو اگر آپ اپنی دو انگلیوں کے بیچ میں پکڑنا چاہیں۔ تو وہ پِس جائیں گے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بھی ہماری طرح دل و دماغ، ناک، کان، آنکھ، رگیں، پٹھے وغیرہ سبھی اعضا رکھتے ہیں۔ غور کیجئے [illegible] اور عقلمند ہے۔ کیا ایک لاشعور ہستی سے بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے!

اگر آپ سے کہا جائے کہ یہ شہر لندن تو خود بخود بن گیا۔ اس کے بازاروں اور کالونیوں کی رونق خود بخود پیدا ہو گئی۔ اس میں انڈر گراؤنڈ ریل گاڑیاں خود بخود دوڑ رہی ہیں۔ اس کی سر بفلک عمارتیں از خود وجود میں آگئیں۔ یا یہ کہا جائے کہ یہ سب کچھ از خود تو نہیں ہوا۔ لیکن ایک بچے نے اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہے۔ تو شاید آپ ایسا کہنے والے کو سٹری سودائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اتنی بڑی کائنات کی پیدائش کو امر اتفاقیہ کہتے ہیں۔ اور اس کے نظم و نسق کو ایک لاشعور اور بیجان مادہ کا مرہون منت سمجھتے ہیں۔ اور اُس خالق کائنات کے متعلق یہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ جو نہ معلوم کتنے لندن، پیرس، اور سوئٹزرلینڈ پیدا کر چکا۔ اور جس کی صناعی اور باریکی خود اُس کے وجود پر دلالت کر رہی ہے۔

[illegible] کی ناکامی!

اس موقعہ پر علامہ حسین آفندی نے ایک نہایت عمدہ مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں ایک دانا و بینا ہستی پر یقین رکھنے والے کی اور ایک مادہ پرست کی مثال بالکل ان

دو شخصوں کی طرح ہے۔ جو ایک عالیشان کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اُس کا ہر کمرہ اور نشستگاہ انتہائی سلیقہ سے مزین تھا۔ سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کا فرش تھا۔ جا بجا کرسیاں اور صوفے ترتیب سے رکھے تھے۔ دیواروں پر مختلف مناظر آویزاں تھے۔ تھرما میٹر اور بیرومیٹر بھی نصب تھے۔ باہر ایک سرسبز و شاداب باغ تھا۔ میوہ جات کے درخت ترتیب سے صف بہ صف کھڑے تھے۔ پھولوں کی کیاریاں بھی نہایت سلیقہ سے تیار کی گئی تھیں۔ مختلف طیور نغمہ سنجی کر رہے تھے۔ درمیان میں ایک صاف و شفاف نہر جاری تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ان میں سے ایک شخص بے اختیار پکار اٹھا۔ کہ ہو نہ ہو اس کوٹھی اور اس باغ کا بنانے والا انتہائی عقلمند۔ باسلیقہ، اور فن باغبانی و انجینئری میں یکتا ہے۔ دوسرے نے کہا نہیں تم غلط کہتے ہو اسے کسی نے باقاعدہ بنایا نہیں ہے۔ بلکہ برسوں سے ہوا مٹی اڑا اڑا کر یہاں لاتی رہی تھی۔ اس کے مختلف تودے یہاں جمتے گئے۔ پانی اور ہوا کے دستبرد نے لاکھوں اور کروڑوں برس کے بعد اسے مختلف شکلیں دے دے کر اس شکل کا بنا دیا ہے۔ اور یہ جو نہر بہہ رہی ہے وہ بھی دراصل اُس پہاڑی کا ایک چشمہ تھا جس نے اپنا رُخ بدل کر یہاں بہنا شروع کر دیا ہے۔ یہ پھول کے پودے جو دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کی پیدائش بھی یہاں اُن بیجوں سے ہوئی جنھیں ہوا اپنے ساتھ اُڑا لائی تھی۔ یہ میووں کے پیڑ بھی پہلے منتشر حالت میں تھے۔ سینکڑوں ہزاروں دفعہ گرے خشک ہوئے اور بالآخر اُن کے بیج اس انداز پر اُگ آئے۔ کہ وہ باقاعدہ کیاریوں کی شکل میں نظر آ رہے ہیں۔ یہ تھرمامیٹر، بیرومیٹر اور فرنیچر دراصل کوئی قافلہ ادھر چھوڑ گیا تھا۔ ہوا ان کو اُڑا لائی۔ اسی نے ان کو اس طرح سے ترتیب دے دیا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے وہ سب باد و باراں کے معماروں کا طفیل ہے۔ اور محض "اتفاقات" کا نتیجہ ہے"

اب آپ ان دونوں آدمیوں کے جواب پر غور کیجئے۔ اور پھر تعصب کا چشمہ اتار کر بتلایئے کہ کس کا فیصلہ قرین قیاس ہے۔ اور پھر یہ فیصلہ کرنے کے بعد ذرا چاروں طرف چھائی ہوئی۔ کائنات کی نزاکت، نفاست بخیہ گری۔ اور باریکی پر نگاہ ڈالیے۔ جس کے مختلف علوم علم الانسان اور، علم الحیوانات وغیرہ پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ اُن کا کوئی شمار نہیں ہے۔ اس کے باوجود علم انسانی خود محققین کے نزدیک وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک قطرہ کو سمندر سے ہے۔

اتنا سمجھے کہ کچھ نہ سمجھے افسوس ⁖ معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا

تو پھر کیا یہ سب کچھ اتفاقیہ امور کا نتیجہ ہو سکتا ہے، کیا چند اجزاء جو اندھے، بہرے، بے حس و بے شعور ہیں، ان ساری چیزوں کو پیدا کر سکتے ہیں؟ غالباً ہر شخص جس کے سر میں دماغ ہے اور دماغ میں کوئی فتور نہیں ہے۔ اس بات سے انکار کر دے گا۔

اگر محض اتفاق کا اصول تخلیق کائنات میں کارفرما ہوتا تو کائنات کا نظم و ضبط اور ترتیب و سلیقہ ہرگز برقرار نہ رہتا۔ "وہم اور اتفاق" کے اصول پر آپ ایک چھوٹی سی چڑیا بھی نہیں مار سکتے۔ آپ اپنے کسی مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہ ہوں گے۔ تا آنکہ آپ قصد و ارادہ سے کام نہ لیں۔ کسی چمن میں مالی اگر اسی اصول پر بیج ادھر اُدھر چھڑک دے تو کیا آپ یہ امید کرتے ہیں کہ جب پودے اُگیں گے تو نہایت سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ اُگیں گے۔ جب چھوٹی چھوٹی چیزوں میں یہ اصول فیل ہو جاتا ہے تو اتنی بڑی کائنات اس اصول پر کیسے چل سکتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آم کے پیڑ میں بیر نہیں لگتے۔ اور ہیرا ملی نہیں پیدا کر سکتا۔

مرغی سے انڈے کے بجائے بچے نہیں پیدا ہونے لگتے۔ رحم مادر میں انسان کا بچہ انسان ہی بنتا ہے۔ گدھا نہیں بنتا آپ کے جسم کے اندر معززہ جگہوں پر متعینہ اعضاء کے بجائے کوئی دوسرا عضو تشکیل نہیں پاتا۔ اگر کائنات محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ تو اتفاق کا نتیجہ ہرگز یکرنگی اور ترتیب نہیں ہوتا۔ اتفاق کے نتیجہ میں تو کائنات کی تمام اشیاء کو اپنی ہیئت و صورت بدلتے رہنا چاہیئے۔ پھر یہی نہیں اگر کائنات اتفاقیہ پیدا ہو گئی ہے۔ تو اس میں تخریب کا پہلو کیوں نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہر شے نہایت موزوں ہے اور ہزاروں خوبیاں لئے ہوئے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا پانی کیوں نہیں پیدا ہوا جو بالکل زہر ہوتا۔ اور ایسی ہوا کیوں نہیں چلتی جو سم قاتل ہو۔ سورج زمین سے قریب اور قریب کیوں نہیں ہو جاتا کہ تمام کائنات جل جاتی۔ یا قدرے اور بلند کیوں نہیں ہو جاتا کہ پانی بخارات بن کر برس نہ سکتا۔

زمیں اپنی کیلی پر ترچھی کیوں ہے ۔ سیدھی کیوں نہیں کہ موسم ہمیشہ یکساں رہتے اور دن رات برابر ہوتے ۔ آخر اس "اتفاق" کے نتیجہ میں ہر پہلو تعمیر کا کیوں نکلتا ہے ۔ تخریب کا کوئی شائبہ کیوں نظر نہیں آتا ۔ بہرحال یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں دلائل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اتفاق کا یہ اصول محض ایک ڈھکوسلہ ہے جسے مغرب کے مادہ پرستوں نے اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے بنایا تھا ۔ تاکہ اس کے بہانے دنیا کے دوسرے انسانوں کو خوب لوٹیں اور وہ "مذہب" کے نام پر یا خدا پرستی کے نام پر ان کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں ۔ بے شک مذہب کے خلاف "اس طرح کے ردعمل میں جاہلانہ مذہبیت کا بھی بڑا دخل ہے جس نے ترقیوں کے راستے میں حائل ہو کر انسان کو بلا دلیل کے خدا سے برگشتہ کر دیا ۔ لیکن اب یہ دور لد رہا ہے ۔ اب مشرق کے طول و عرض میں خالص خدا پرستی جو خالق کائنات کی حاکمیت کا اقرار اور انسان پر انسان کی حاکمیت کی نفی کرتی ہے انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھ رہی ہے ۔ ایک طرف وہ خود غرض مذہبی پیشواؤں کے جھوٹے مذہب کی دیوار دل کو گرا دیگی اور دوسری طرف مادہ پرستوں کے ہوش بھی ٹھکانے لگا دیگی ۔"

○

پیبلو نرودا

کریملن کا انسان

یہ نظم انڈو سوویٹ جرنل مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی ہے ۔ جو روسی حکومت کے زیر سرپرستی نکلتا ہے ۔ اس میں جذبۂ عبودیت کی ایک جھلک ہے ۔ جیسا کہ پولینڈ کے اسٹالن پرست انجینئر نے کہا "روشنی مشرق سے آتی ہے ، اور مدد اسٹالن کی طرف سے ، جو ماسکو میں ہے " بالکل اسی طرح جیسے کوئی خدا پرست ، خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہو کر کہتا ہے "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ۔ (ایاک نعبد و ایاک نستعین)

وہ یہ کریملن کے تین کمروں میں
جوزف اسٹالن نام کا ایک انسان رہتا ہے
جس کے کمرے میں دیر تک روشنی رہا کرتی ہے — رات بھر
خود اس کا ملک اور دنیا اس کو آرام بہت کم دیتی ہے ۔
گو وہ سرے اکابرین نے اپنا ایک وطن بنایا
لیکن اس نے اپنے تخیلات کو عملی جامہ پہنایا
ایک وطن کی تعمیر کی
پھر اس کی حفاظت کی
وہ اپنے وسیع وطن کا ایک حصہ ہے ،
چونکہ وطن آرام نہیں کرتا
اس لئے وہ بھی نہیں
کچھ دنوں پہلے برف اور بارود نے
اس کو پرانے دشمنوں کا مقابلہ کرتے دیکھا
جن کا ارادہ تھا (اور اب بھی ہے)
[illegible] کریں
[illegible] اور جہالت

اور ان گنت غریبوں کی آہوں کا
وہ رینگلنس اور ڈینی کنسی کے خلاف تھا ۔
جن کو مغرب نے بھیجا تھا کلچر کی حفاظت کے لئے
ان کی کھال وہاں نکال لی گئی تھی
اور ان کی عیاری نمایاں ہو گئی تھی
وہ لوگ جلادوں کے ہمدرد تھے
لیکن اس وسیع ملک میں
اسٹالن نے دن رات محنت کی
لیکن پھر ایک سیلاب کی شکل میں
جرمن آئے جنھیں چیمبرلین نے تندرست و توانا کیا تھا
صرف اسٹالن نے ان کی ہر محاذ پر مزاحمت کی
جب کہ وہ بڑھ رہے تھے یا پیچھے ہٹ رہے تھے
اور برلن تک اس کے بیٹے
ایک عظیم غول کی شکل میں
آئے
اور روس کا پیغام امن پھیلا دیا ۔!!

طیب عثمانی ندوی

عورت اور اقبالؒ

اس دور کی "تہذیب جدید" کے بطن سے جہاں اور بہت سے نئے نئے مسئلے پیدا ہوئے اُن میں سے ایک مسئلہ عظیم "عورت" کا بھی ہے۔
یہ مسئلہ آج جتنا نیا ہے اتنا ہی پرانا بھی - جدید اس قدر کہ شاید آج سب سے زیادہ "نیا پن" اس مسئلہ میں ہے ، اور قدامت کا یہ حال کہ
جب سے دنیا کا وجود ہوا اُس وقت سے معاشرت میں "عورت" کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ بن کر نمودار ہوتا رہا ہے - علماء و مفکرین نے ہر دور
اور ہر زمانے میں اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوششیں کیں - مگر بجائے سلجھنے کے اُلجھاؤ بڑھتا ہی گیا - ہر ناخن سے مزید گرہیں پڑتی گئیں۔
اور یہ مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

"مسئلہ زن" کی ہر دور اور ہر زمانے میں ایک خاص اہمیت رہی ہے - کب اور کس زمانے میں عورت کی کیا حیثیت تھی ؟ اور اس میں کس
طرح رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی ؟ یہ تاریخ کا ایک طویل تجزیہ ہوگا - اس وقت میرا موضوع عورت کی تاریخی حیثیت بیان کرنا نہیں ہے - بلکہ
عورت کا صحیح مقام اقبال نے جو تعین کیا ہے اُسے پیش کرنا ہے۔
اقبال کا فکر چونکہ اسلامی فکر ہے ، اور اسلام نے عورت کو جو مقام بلند عطا کیا ہے اور اس کو پستی سے جس بلندی پر لا کھڑا کیا ہے
اُس سے کوئی بھی صاحبِ فکر و نظر انکار نہیں کر سکتا - عورت کی حیثیت اور اس کی اہمیت کو اقبال کے فکر کی جولانیوں نے اس طرح بیان
کیا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اُسی درج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اُسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

آپ نے دیکھا اقبال نے عورت کے مقام کو کائنات میں کس قدر اہم دکھایا ہے - کائنات کی یہ ساری بوقلمونی صرف اُسی کے وجود سے رنگین
ہے - اُسی کی ذات سے زندگی کے ساز میں ایک سوز ہے ، ورنہ اُس کے بغیر یہ جہانِ رنگ و بُو ایک بے جان لاشہ ہے جس میں نہ کوئی زندگی
ہے اور نہ سوز و گداز - اور اس کے شرف و منزلت کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی مشتِ خاک کے سامنے "ثریا" بھی شرمسار ہے اور یہیں
تک نہیں بلکہ آج ہر عزت و شرف اُسی کے درج کا ایک موتی ہے۔
اسلام نے عورت کو جو مقام بلند بخشا ہے ، جس کی صحیح تعبیر علامہ اقبال کی زبانی آپ نے دیکھی لیکن آج تہذیب کے فرزند "عورت کو جو
مقام عطا کر رہے ہیں وہ ہر عورت و مرد کے لئے قابلِ توجہ اور باعثِ حسرت و افسوس ہے - نام نہاد "مساوات" کے نعرہ نے خود عورت کو مسحور کر رکھا
ہے اور خود غرض مرد اپنی خود غرضی اور ہوس کی تکمیل کے لئے اس شعلہ میں ہوا دے کر مزید تیزی پیدا کر رہا ہے - تاکہ اس کی عصمت اور
عزت و شرافت میں آگ لگ جائے اور وہ مرد کی ہوس رانیوں کے چرنوں پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا دے - اس ہلاکت و بربادی اور تباہی ا
خرابی میں قصور کچھ "عورت" ہی کا نہیں بلکہ یہ سارا فساد فرنگی معاشرت کا پیدا کردہ ہے - اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے ، اور عورت کی معصومیت کا کتنا
خیال رکھا ہے۔

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

مغربی تہذیب کی [illegible] معاشرت کا فساد جو پھوٹا تو اس کا اثر مرد و عورت دونوں پر پڑا۔ اس مغربی معاشرت کا کمال جس حد تک ہے اس کا ایک سوال کے عنوان سے [illegible] مشرق نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بے کار و زن تہی آغوش

آج کی دنیا میں عورت سے [illegible] اہم اور بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ ہے "پردہ" کا۔ پردہ کے کیا فوائد ہیں؟ اور اس سے کیا کیا نقصانات مترتب ہوتے ہیں [illegible] پردہ ضروری ہے یا نہیں؟ اس قسم کے جتنے سوالات ہیں یا ہو سکتے ہیں اس پر ارباب فکر نے تو اچھی خاصی تصنیفیں کی ہیں، اور ابھی اس پر مزید لکھی جا سکتی ہیں لیکن اس وقت اس مسئلہ کو ہم اقبال ہی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

اقبال کی [illegible] وہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم "عورت" کے "پردہ" میں رہنے یا نہ رہنے کے متعلق کیا کہتے ہو؟ ابھی خود "مرد" تو "پردہ" سے باہر نکلا ہی نہیں [illegible] عورت [illegible] نشین ہے مرد بھی "خلوت نشین" ہے۔ ابھی اولاد آدم خود پردہ میں ہے۔

تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے — وہ خلوت نشیں ہے، یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردہ میں اولاد آدم — کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

اقبال بے پردگی پر پردہ کو ترجیح دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ "خلوت" بہرحال "جلوت" سے بہتر ہے۔ اس دور کی ساری برائی "جلوت" ہی کی ہوس سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ نگاہیں تو روشن ہیں لیکن "آئینۂ دل" تاریک و مکدر ہے اور ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ "ذوق نظر" اپنے حدود پر [illegible] اگر اپنی حدود سے بڑھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ افکار ابتر و پراگندہ ہو جائیں۔ اس "مسئلہ پردہ" میں بھی ذوق نظر نے اپنی حدود [illegible] کے نتیجہ میں آج افکار و خیالات کتنے پراگندہ اور پریشان ہو کر رہ گئے ہیں۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے — روشن ہے نگاہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے — ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

خلوت کو [illegible] کہ اقبال کی بلند نظری نے کتنی اچھی دلیل فراہم کی ہے۔ یہ اسی کے فکر عمیق کا حق ہے [illegible]

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے — وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

[illegible] جس میں انسانی خودی پروان چڑھتی اور خودگیر ہوتی ہے کہیں اور تو کیا اب دیر و حرم میں بھی میسر نہیں۔

خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر و لیکن — خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

[illegible] دوسرا نعرہ جو آج [illegible] لگایا جا رہا ہے، وہ "آزادی نسواں" کا ہے۔ اس "نعرہ" کے پس منظر میں بھی وہی مرد کی خود غرضی کام کر رہی ہے جس نے صنف نازک کو کارخانوں، دفتروں اور زندگی کے دوسرے پرمشقت کاموں میں لا کھڑا کیا ہے، اور [illegible] "شمع محفل" بنا دیا ہے۔ اس پر عورت بھی خوش ہے، آہ، مغرب کا خوش نما فریب! اس مسئلہ میں علامہ اقبال کی کیا رائے ہے:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں، یہ زہر ہے یہ قند

[illegible] کہ عورت کے لئے کونسی چیز زہر ہلاہل ہے اور کیا قند شیریں لیکن اس کے [illegible]؟

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب　　پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اور اس "راز" کو عورت ہی کی عقل و بصیرت پر چھوڑتا ہے۔ کیونکہ مردانِ خردمند کی معذوری و مجبوری ظاہر ہے۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش　　مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند

یوں تو اقبال نے اس مسئلہ کو خود عورت ہی کی بصیرت اور فراست پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس "راز" کو خود اس کی بصیرت فاش کرے تو اچھا ہے لیکن اُسے عورت کی یہ مظلومیت دیکھ کر رہا نہ گیا، اور آخر میں ایک ہلکا سا اشارہ کر ہی دیا۔

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ　　آزادیِ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

یہ (؟) سوالیہ نشان اس کی نصیحت و بصیرت کے لئے کافی ہے۔

ایک تیسری چیز جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا ہے وہ ہے عورت کے لئے موجودہ مغربی تعلیم کا حاصل کرنا تاکہ وہ تہذیبِ فرنگ میں پوری طرح فٹ آسکے۔ مغربی تہذیب و تمدن نے عورت کو اُس کے جس مقام سے ہٹا دیا ہے یعنی اس کا "ماں" ہونا، وہ اربابِ فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آج مغرب زدہ لڑکیاں "ماں" بننے سے جس قدر گھبراتی ہیں وہ سب پر عیاں ہے اور اس کے لئے جتنے جتن کئے جاتے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ انسانیت کی یہ موت اقبال سے دیکھی نہ گئی اور وہ چیخ اُٹھا۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت　　ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

یہ "تہذیبِ فرنگی" اُسی مغربی تعلیم ہی کا تو کرشمہ ہے جس کے حصول کے بعد عورت اپنا مقام کھو بیٹھی ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن　　کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن　　ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

جس علم سے "جنسِ لطیف" "جنسِ کثیف" بننے کی کوشش کرے اور جس علم سے نسوانیت کا خون ہو جس سے عورت میں "نسائیت" کے بجائے "بے تکلف جبلیت" کا اظہار ہو، وہ علم، علم نہیں بلکہ موت ہے، اور یہ انسانیت کے لئے ایک المناک حادثہ، اور اُس کی موت کا پیام ہے۔

اقبال کہتا ہے یہ سچ ہے کہ دنیا نے عورت کو جو مقام دینا چاہیئے تھا وہ نہ دیا خصوصاً مشرق میں وہ بہت مظلوم ہے اور اس کی اس مظلومی سے میں خود بھی بہت غمناک ہوں۔

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت　　نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اقبال کے نزدیک عورت کی یہ مظلومیت یقیناً قابلِ افسوس ہے اور اس عقدہ کی گرہ کشائی مشکل ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اُس کے ردِ عمل میں اپنی انسانیت کو بھی کھو بیٹھے۔ یہاں تک کہ اس کی عقل پر ایسا پردہ پڑ جائے کہ زہر و قند کی بھی تمیز نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے عورت کی اصل حقیقت کی طرف اس نظم کے ابتدا ہی میں اشارہ کر دیا ہے۔ تاکہ عورت کی صحیح حیثیت متعین ہو سکے۔

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر　　غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

اقبال کے نزدیک "جوہرِ عورت" کی "نمود" "مرہونِ منت" ہے غیروں کی، اور سچ تو یہ ہے کہ "بے منتِ غیر" اُس کے جوہر کے آب میں تاب پیدا نہیں ہو سکتی۔

اقبال عورت اور اس کے مقام کو خوب سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے متعلق ایک "زندہ حقیقت" میرے سینے میں پوشیدہ ہے اور جو بات آج ایک اچھا خاصا "مولوی" کہنے سے گھبراتا ہے اُسے وہ بہانگِ دہل کہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ مغربی تہذیب کی پروردہ دنیا چاہے جو بھی کہے لیکن جو حقیقت ہے وہ بہرحال حقیقت ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ عورت کا آخری حل پیش کر دیتا ہے۔

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور　　کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی　　نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اقبال کے خیال میں جو قوم اس "زندہ حقیقت" کو نہ دیکھ سکے اور اپنی آنکھوں پر مغربی تہذیب و تمدن کی وہی موٹی عینک لگائے رہے تو وہ قوم بہت جلد ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوگی اور اس قوم کا خورشید جہاں تاب نہ ہو سکے گا۔ بلکہ جلد ہی زرد ہو کر رہ جائے گا۔

جس قوم نے اِس زندہ حقیقت کو نہ پایا　　اُس قوم کا خورشید [illegible]

نجم الاسلام

غزل تعمیری ادب میں

غزل میں تعمیری رجحانات کا تقاضہ کیا ہے اور ہم غزل میں کیا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا سوال ہے جس کو اکثر غزل گو شعرا تعمیری و اسلامی ادب کا نام سنکر سمجھنا چاہتے ہیں۔ مدعا کی وضاحت میں کتنے ہی تنقیدی مضامین و مقالوں سے کام لیا جائے۔ لیکن مقصد صاف نہیں ہوتا جب تک تعمیری غزل ہی نمونتاً پیش نہ کی جائے۔ خود میرٹھ میں اس قسم کا ایک تجربہ ہوا ہے۔ یہاں کے اچھے غزل گو شاعر ہمارے نقطۂ نظر سے متعارف ہونا اور قریب آنا چاہتے تھے لیکن جب کبھی وہ غزل میں یہ راہ اختیار کرتے۔ غزل یا تو نعت کی صورت اختیار کر لیتی یا سیاسی ہو کر رہجاتی اس میں وہ شگفتگی نہ رہتی جو غزل کا امتیاز ہے۔ اور ہم تنقید سے اپنا مقصد واضح نہ کر سکتے لیکن ایک مرتبہ میرٹھ ہی کے ایک اچھے غزل گو شاعر حفیظ حزیں ادارۂ ادب اسلامی کی ایک نشست میں تشریف لائے حزیں کی ادبی زندگی میں رومانیت مرکزی درجہ رکھتی ہے۔ پھر بھی ماحول کی مناسبت سے انھوں نے ایک غزل سنائی جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

راہ وفا میں، نکل کچھ دور ساتھ چلنا ۔۔۔ لیکن وہ ہر قدم پر عزم سفر بدلنا
ہر آستاں پہ جھکنا ہر در کی خاک ملنا ۔۔۔ آخر سرا مہ ان کے نقش قدم پہ چلنا
جنکو ہوا نہ حاصل تا بندا سن نظر کی ۔۔۔ ان حسرتوں کو دل میں بیانہیں مچلنا

غزل تعمیری ادب کی آئینہ دار تھی۔ غزل میں تعمیری رجحان سے ہمارا مطلب کبھی نعت کی قسم کی کوئی چیز تخلیق کرنا نہیں۔ بلکہ ایسا ہی پائدار ادب پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ بہت سراہا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شاعر کے سامنے غزل میں ہمارے نقطۂ نظر کی وضاحت جتنی ان اشعار کی مثال سے ہوئی تنقید و تفہیم سے ایک عرصے میں نہ ہو پاتی۔

آج کل غزل میں سیاسی رنگ عام ہوتا جا رہا ہے۔ اور زندگی کی تلخیوں کا پہلو ناگوار حد تک بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اچھے اچھے غزل گو شعرا کی غزلیں آفاقیت اور دوام سے عاری ہوتی ہیں جس طرح غزل کو اس کے لغوی معنوں میں محدود کرنا درست نہیں اسی طرح اسے یکسر سیاسی خیالات کا تختۂ مشق بنا دینا بھی صحیح نہیں۔ غزل میں کتنے ہی موضوع ہوتے ہیں۔ جذبات و احساسات شگفتگی اور سوز و گداز تصوف حسن و عشق۔ اخلاقی نظریات۔ انسانی کیفیات۔ کائنات اور انسان مسئلہ جزو کل۔ جبر و اختیار شرم و گناہ۔ خوف عصیان۔ رحمت پر بھروسہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی جا سکتی ہے اور اپنے مقصد کے تحت کی جا سکتی ہے۔ اس طرح جو کچھ کہا جائیگا اس میں تغزل بھی ہوگا۔ اور آفاقیت اور دوام بھی۔ افادیت بھی رچی ہوئی ہوگی۔ اور ادبیت بھی جلوہ گر ہوگی۔ اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ غزل پروپیگنڈے کی سطح سے اونچی ہو کر سامنے آسکے گی۔

کچھ ان ہی تصورات کے تحت میں نے چاہا کہ چند ایک تعمیری غزلیں منتخب کر کے پیش کی جائیں۔ لیکن اس کے لئے وقت چاہیئے۔ اس سلسلے میں حفیظ میرٹھی مجھے اپنے سے قریب نظر آئے۔ اس لئے یہاں میں ان کے کلام کا کچھ انتخاب پیش کروں گا۔ خود میں نے بھی تعمیری ادب کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے غزلیں کہی ہیں۔ اپنے متعلق میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ پھر بھی اتنا کہوں گا کہ اک کوشش ضرور کی ہے یہ جرات شاید اس صورت میں نمایاں نہ ہوتی اگر عامی ضیائی "میں۔ اپنی نظر میں" لکھ کر خود کو منظر عام پر نہ لاتے۔ اسی طرح دیگر تعمیر پسند غزل گو شعرا بھی اگر منتخبہ غزلیں شائع فرمائیں تو میرے خیال میں ایک اچھا اقدام ہوگا۔ تعمیری غزل کا رنگ نکھر کر سامنے آسکے گا۔ اور اس کی نمائندگی کرنے والا ایک مجموعۂ غزل بھی اس سے تیار کیا جا سکے گا۔ غزل میں نیا نقطۂ نظر سمجھانے کے لئے ایسے مجموعہ کی سخت ضرورت ہے۔ انتخابات ملاحظہ ہوں۔

دور ہوتی جا رہی ہے منزل انسانیت ۔۔۔ جانے یہ دنیا ہے کس کافر کی بہکائی ہوئی
ہر گھڑی عہد محبت، ہر نفس پاس وفا ۔۔۔ بیڑیاں یہ بھی ہیں لیکن ناک پہنائی ہوئی
ہو گئی شاید مسرت کی حقیقت بے نقاب ۔۔۔ ہر منقی کی صدا ہے آج بھرائی ہوئی
اے معاذ اللہ یہ معیار ایثار و خلوص ۔۔۔ قعر گمنامی سے ہم نکلے تو رسوائی ہوئی
میری جانب ہو چکے بڑھنا ذرا اہل کرم ۔۔۔ ہاں یہ دنیا ہے اسی سائل کی ٹھکرائی ہوئی

(حفیظ میرٹھی)

ہوا قدرداں اس قدر تو زمانہ — کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ
مجھے دوستی کی قسم دینے والے — مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ
نہ پڑ ماضی و حال کی الجھنوں میں — صداقت نہیں ہے اسیر زمانہ
اس اک مرکز دین و دنیا سے ہٹ کر — نہ میرا ٹھکانہ نہ تیرا ٹھکانہ
کوئی مرحلہ ہو کوئی معرکہ ہو — نظر عارفانہ قدم غازیانہ

(ایضاً)

نہ ہوں حیران میرے ہتھوں پہ مہربان میرے — فقط فرہاد کا حیلہ سا پیدا کر لیا میں نے
الٰہی کونسی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی — کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے
خزاں کے خوف سے پھولوں نے شکلیں بدل ڈالیں — ادھر رنگ قبا کچھ اور گہرا کر لیا میں نے
ادھر آ آج مجھ سے راز سوز و ساز بھی کہہ دو — رگوں میں خون دل میں درد پیدا کر لیا میں نے
کبھی ایسی بھی رت لائیگی فطرت باغ عالم میں — کہ جب جس شاخ پر چاہا بسیرا کر لیا میں نے

(ایضاً)

ہر سکوں کی تہ میں آتش فشاں رکھتا ہوں میں — ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں
اے پرستاران نغمہ چھوڑ کر تار رباب — آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں
ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان گلستاں — آدمی ہوں عزم تعمیر جہاں رکھتا ہوں میں
آج تک گذری اجل کی آرزو میں زندگی — زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں
مجھ سے کب ہوتی بھلا پابندی رسم وجود — انکی دلداری کی خاطر جسم و جاں رکھتا ہوں میں

(ایضاً)

جب دیکھنے کی طرح سے دیکھا تری جانب — جلوے بھی نمایاں ہوئے پردے بھی نظر آئے
اک عشق ہی یکسر ہی سر دار ہے تنہا — ارباب خرد آئے نہ اصحاب نظر آئے
خاک بھی نہ بن پائے ابھی اہل گماں سے — کچھ اہل یقیں خوں سے ادھر رنگ بھی بھر آئے
ہٹتی ہی نہیں اب ترے جلووں سے نگاہیں — آنکھوں کو بڑی دیر میں آداب نظر آئے
یہ وقت عمل اور حفیظ آپ کی مستی — اچھی نہیں وہ نیند جو ہنگام سحر آئے

(ایضاً)

اپنی آنکھوں سے لہو اپنا جگر دیکھ لیا — جو کچھ آیا تیری محفل میں نظر دیکھ لیا
آشنا ہی جانئے اس دور میں مفہوم سکوں — جان سی آ گئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا
جگمگانے لگے ذرے سے تو ستارے بنے — تیرا اندھیر بھی اے نور سحر دیکھ لیا
یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں — جانے کیا ہوگا جو ساقی نے ادھر دیکھ لیا
چار تنکوں کا تصور ہی کیا تھا کہ حفیظ — ہر طرف سلسلۂ برق و شرر دیکھ لیا

(ایضاً)

دماغ اہل سیاست پہ اعتبار نہ کر — دماغ اہل سیاست خراب ہو بھی چکا

کھلیں کہ بند رہیں راحتوں کے دروازے — حریم صبر میں دل باریاب ہو بھی چکا
قصور دار منزلوں سے جب رہے محروم — شکست دل نے خبر دی عتاب ہو بھی چکا
پیام دوست کی محفل کو آرزو ہی رہی — خطاب ہونا تھا جس سے خطاب ہو بھی چکا
اسی لئے تو یہ مضراب و تار روتے ہیں — حفیظ تارک چنگ و رباب ہو بھی چکا

(ایضاً)

خرد کی بات نہیں گر گذر بھی جائے دل — خرد کو فرق یقین و گمان نہیں معلوم
خلوص عشق ذرا تو بھی دیکھنا بڑھ کر — حجاب ہے کہ نظر درمیاں نہیں معلوم
تمام راہ لہو میں ہے غرق اے منزل — کہاں تک آئے تھے سود و زیاں نہیں معلوم
خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو — کدھر کدھر سے اٹھیگا دھواں نہیں معلوم
حفیظ ہم تو روانہ ہوئے خدا حافظ — قدم اٹھائیگا کب کارواں نہیں معلوم

(ایضاً)

اگر میں رہ بھی جاؤں تجھ خاک رہگذر ہو کر — نہ چھوڑوں گا خیال منزل ہستی بشر ہو کر
فریب آگہی دیتا ہے دل کیا معتبر ہو کر — کبھی ہوش و خرد بنکر کبھی علم و خبر ہو کر
صدا اٹھے تو پھر اے دل صدائے کارگر ہو کر — تری آتش نوائی رہ نہ جائے شور و شر ہو کر
وہ دل رہ جائیں جن کی سب دعائیں بے اثر ہو کر — وہ آئے تو سہی رحمت کے آگے چشم تر ہو کر
وہ افتادہ طبیعت ساتھ کیا دے ہمسفر ہو کر — جو ہوا فتادگی پر مطمئن بابال و پر ہو کر

(نجم)

نہ آساں دیکھنے والے نہ مشکل دیکھنے والے — یہاں مقصود ہیں کچھ حسن منزل دیکھنے والے
ذرا دیکھیں تہ دامان دل بھی اک نظر آ کر — تماشائے سکون شورش دل دیکھنے والے
نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے قیامت تک قیامت کو — ہر اک فتنے کا فقط دنیا میں حاصل دیکھنے والے

(ایضاً)

یہ راز زندگی میں نے بہت کچھ کھو کے سمجھا ہے — کہ اپنی خامیوں کو بھول جانا سخت دھوکا ہے
جنون شوق اس معیار پر برسوں میں سمجھا ہے — جہاں ذروں سے منزل کا پتہ معلوم ہوتا ہے
جو ممکن ہو تو اے ساقی شناسا کر حقائق سے — ملا لطف غم ہستی تری مے سے نہ مینا سے
خدائی کو وہ کیا سمجھیں خدا کے کیا وہ قائل ہوں — یہ دنیا جنکی آنکھوں میں تماشا ہی تماشا ہے
وہی انساں جو شکوہ سنج ہے جبر مشیت کا — وہی آزاد ہو کر نت نئے فتنے اٹھاتا ہے

(ایضاً)

بسانے اٹھ رہے ہیں اک نیا گلشن وہ دیوانے — چمن میں لٹ کے بھی جنکو ہوا ناسازگار آئی
عجب تھی فطرت انساں مگر رہ گئی بن کے — کہیں بے اختیار آئی کہیں بااختیار آئی
ازل سے جب بھی آئی روح انساں نام اسکا تھا — نہ یکسر بے خبر آئی نہ یکسر ہوشیار آئی
جنوں کے وصف خودداری کو ہم نے جب کبھی دیکھا — خرد کی خود ستائی پہ ہنسی بے اختیار آئی

مجھے تسلیم شان و شوکت تہذیب نو لیکن — جو سچ پوچھو تو نجم روح عصر حاضر سوگوار آئی

(ایضاً)

ہے یقیں شوق جادہ پیمائی — شرم اے نجم تیری دانائی
زندگی جیسے اک تماشا ہے — اور وہ بھی فقط تماشائی
کوئی منزل ہے اور نہ کچھ مقصد — آدمی ہو رہا ہے ہرجائی
ہو گیا آفت بشر بشر کا غلام — آخرش شیدہ طینت کی بن آئی
جیسے حق گوئی بھی ہو کوئی گناہ — لحظہ لحظہ ہے خوف رسوائی

(ایضاً)

اس قدر رکھیں میں تڑپ لے درد پنہاں تابہ سینے — دل کی ہر آواز پہ ہر چیز رقصاں چاہیئے
غم چھپاتا ہے تو سنی ضبط غم کیسا غضب تھا — ایک ہلکا سا تبسم بھی نمایاں چاہیئے
یا تو اک حالت میں دل پر نفس اک بار تھا — یا اسی دل کے لئے آب حیواں چاہیئے
آہی جائیگی کہیں سے طاقت پرواز بھی — حوصلہ اے نجم ہمدوش سلیماں چاہیئے

(ایضاً)

خلافت پر لٹیرا ہو گیا بھی ہے — مگر اب یہ ادارہ جمہوری بھی ہے
کوئی فہم و نظر سے کام تو لے — حقیقت ماورائی [illegible] بھی ہو
ذرا سمجھتا تو کوئی کہتا ہے [illegible] — [illegible] پاس بھی ہو دوری بھی ہو
عجب کیا ہم [illegible] ہو زمانہ — [illegible] کا کوئی [illegible] بھی ہو

(ایضاً)

کتنی متحیر کن صفت [illegible] زمانہ [illegible] — [illegible] خیالوں کا تماشا ہو
کیا خاک حقیقت [illegible] انسان [illegible] — [illegible] کا [illegible]
خود کبھی جو بہلا نے انسان [illegible] — دنیا کی حقیقت کو [illegible]
کیا جبر کا شکوہ ہے بیجا جور زمانہ ہے — سب [illegible] ہمت کی پستی کا بہانا [illegible]

(ایضاً)

یہ ہے تعمیر پسند غزل کا نمونہ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعمیری شاعری کیا ہے اور غزل کو کس [illegible] سے جا رہی ہے۔ گزشتہ دور میں ترقی پسند شاعر [illegible] کے [illegible] چلنے کی شاعری پر [illegible] کچھ [illegible] کی اور [illegible] جیسی [illegible] سے مقصد [illegible] ہم آہنگ کرکے پیش کیں لیکن محدود مقصدیت سطحیت پسندی اور زمانے کو تماشہ سمجھنے والوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ آرٹ کو اس کی گہرائیوں سے کھینچ کر اوپر لاتے اور دل کے گوشوں میں حقیقت کی تلاش کرتے۔ ان کے مادی نقطۂ نظر نے خاص طور پر غزل کے لئے انھیں بالکل ناکارہ کر دیا۔ غزل اپنی تکمیل کے لئے اعلیٰ درجہ کا مشاہدۂ اندرون (INTROSPECTION) چاہتی ہے۔ ان کے عقیدے کی رو سے اس کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اس کی تلافی غزل کی شہادت، اس کی تاریخ، وقت، اور مقام پیدائش پر چوٹ کرکے کرتے ہیں۔ تعمیر پسند ادیبوں کا رویہ اس کے برعکس ہے۔ یہ لوگ مشاہدۂ اندرون و بیرون دونوں کے قائل ہیں۔ اس لئے یہ لوگ شعوری طور پر قبول کئے ہوئے حقائق کو بہت آسانی سے اپنے لاشعور کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ ان کی غزل اسی کوشش کا آئینہ دار ہے۔ اس طرح انھوں نے غزل کے دامن سے بجا ستم کے داغ دھبے صاف کرکے اسے عصمت دیا کیزگی کا سبز جوڑا پہنانے کا کام شروع کر دیا ہے۔

میں نے مشتے از خروارے کے مصداق صرف چند غزلیں پیش کی ہیں۔ ضرورت ہے کہ دوسرے تعمیر پسند غزل گو شاعر بھی اس طرف توجہ کریں اور تعمیری غزل گوئی کو متعارف کرانے کے لئے اپنی منتخب کردہ غزلیں سامنے لائیں۔ اس طرح چیدہ چیدہ غزلوں کا ایک اچھا مجموعہ بھی آسانی سے تیار ہو جائے گا۔ ورنہ اس کی تیاری اور چھپائی ایک آدمی کا کام نہیں۔

نئی تعمیر دنیا کی سامان [illegible]
نئی زمیں نیا آسماں نیا آئین
[illegible] غضب دنیا
[illegible]

ابوالمجاہد زاہد

تضاد

جب تمہارا مدعا ہے زندگی کی برتری
ملک میں رائج کرو صالح نظامِ زندگی
چاہتا ہوں میں کہ رنگ و نسل کا جھگڑا مٹے
تاکہ انسانوں کو ہر طوفاں سے چھٹکارا ملے

اور تم مضطر ہو اس کشتی کو کھینے کے لئے

ہے نگاہوں میں مری جمہوریت سازی کی ریت
ایک دانا مرد پر دس عقل کے اندھوں کی جیت
ہو چکا ہے ہر سیاسی پارٹی کا راز فاش
کر رہا ہوں میں "خدا کے جاں نثاروں" کو تلاش

اور تم بیکل "وطن" پر جان دینے کے لئے

ہے خدا کی "حاکمیت" امنِ عالم کی اساس
آدمی کو "کبریائی" بھی کبھی آئی ہے راس
میں تو "لادینی نظامِ ملک" سے بیزار ہوں
سطوتِ باطل سے لڑنے کے لئے تیار ہوں

اور تم آئے ہو مجھ سے "ووٹ" لینے کے لئے

سہیل احمد زیدی

ساتھیو سوچ تو لو!

اس سے پہلے کہ یہ جذبات میں ڈوبے اقدام
دہر کو نارِ جہنم کے کنارے کر دیں
اس سے پہلے کہ یہ پُر جوش و مسلسل نعرے
ظلمت و ظلم کے طوفاں کو اشارے کر دیں
اس سے پہلے کہ شیاطین کے خونی پھندے
قتلِ انسان کا دُنیا کو بہانا دے دیں
اہلِ شر اوڑھ کے مزدور کی کفنی کا نقاب
آمریت کے تقدس کو سہارا دے دیں
ساتھیو سوچ تو لو ——

جانتے ہو کہ مذاہب کے لبادے اوڑھے
پنڈت و پیر نے ہر گام پہ لُوٹا ہم کو!
جانتے ہو کہ شب و روز دلاسے دے کر
اسی زردار نے جی کھول کے چُوسا ہم کو!
جانتے سب ہیں زر و حرص کے بازاروں میں
روٹیاں پھینک کے انسان خریدے اس نے
ظلم کرتا رہا "مجبور یہ" مزدوروں پر
جاگنے ہی نہ دئے اپنے نصیبے اس نے
ساتھیو سوچ تو لو ——

جاں بلب آج ہے، انسان مگر اے ساتھی
موت ڈوبی ہوئی نبضوں کا مداوا تو نہیں
آج قارون کے قدموں پہ ہے دنیا لیکن
کفرِ انسان کی فطرت کا تقاضا تو نہیں
نور درکار ہے ہم کو تو ستاروں کی قسم
تیرہ و تار فضاؤں سے گزرنا ہوگا
عظمتِ حق کا اگر سر میں ہے سودا ہمدم
رائج الوقت نظاموں سے نپٹنا ہوگا

○

متین طارق

"؟"

شور ہے دنیا جاگی جاگی   اُٹھی بیٹھی ، تڑپی ، ناچی
لیکن دل ہے بیکل بیکل   آنکھیں غم سے جل تھل جل تھل
درد اُفق پر پھیلا پھیلا   سارا جیون میلا میلا
سب کی نظریں خونی خونی   پریم کی بستی سُونی سُونی
حرص کا جذبہ گہرا گہرا   بغض کا دریا ٹھہرا ٹھہرا
ہوش کی راہیں بھٹکی بھٹکی   ظلم کی موجیں اُٹھی اُٹھی
چلتی رشوت بکتی عصمت   جھوٹے دعوے جھوٹی لعنت
حق کا تقاضا سویا سویا   زیست کا مقصد کھویا کھویا
جیسے رستہ پا نہ سکے ہوں   کالے بھتنے ناچ رہے ہوں

کون کہے گا اس کو ترقی
ذہن ہو مردہ آنکھ ہو اندھی

بدر الدین فاروقی ایم اے

"احمق آباد" کے بازار

(رالیف ہوجسن کی نظم "STUPIDITY STREET" کا منظوم ترجمہ)

اپنی آنکھوں سے ہے دیکھا میں نے
چہچہاتے ہوئے رنگین پرند
بیچے جاتے تھے دکانوں پہ وہاں
پیٹ انسان کا بھرنے کے لئے
کن دو کانوں پہ بھلا ـــــــ
احمق آباد کے بازاروں میں!

پھر تصور میں یہ دیکھا میں نے
گھن لگا گیہوں کے انباروں کو
خاک ہی خاک دکانوں پہ نظر آتی تھی
پیٹ انسان کا بھرنے کے لئے
اور بکری کے لئے کچھ بھی نہ تھا
احمق آباد کے بازاروں میں!!

حمایت المقبت صدیقی

آزمائش

اُن کے اعمال کا بدلہ اُنھیں یہاں نہ ملا
اور کیسے ملتا ——— ؟
اُن کے اعمال کی فہرس ہے طویل ———
جو ہیں دنیا میں فسادی بن کر
سرکش و ظالم و خونخوار بہائم جیسے
ریچھ اور بھیڑیئے اور باؤلے کتوں جیسے
خونِ انساں کے بہانے والے
اور مظلوم کو ہر طرح ستانے والے
گوہرِ عصمت و عفت کے لٹیرے، ڈاکو
اپنے اعمال پہ مسرور رہیں یاں
خوابِ غفلت میں پڑے چور رہیں یاں
عیش و عشرت میں تمام عمر گنوانے والے
یوں گزر جاتے ہیں اس دنیا سے
جیسے راہب ———
صاف بچ جاتے ہیں ہر جرم کے جرمانے سے
اور کوئی اُن کو سزا بھی نہیں دینے پاتا
اور کیسے دیتا ——— ؟
اُن کے اعمال کی فہرس ہے طویل
لیکن ———
جب یہ جاتے ہیں خداوندِ دو عالم کے حضور
ساتھ ہوتی ہے وہاں عصمت و عفت کی پکار
اور معصوم کی آہ ———
گھیر لیتے ہیں ستائے ہوئے مظلوم انساں
بہر انصاف ———
یہ حیران و پریشان و پراگندہ خیال
وقت کو روئیں گے چلائیں گے، سر پیٹیں گے
لیکن بے سُود ———
عدل فرمائے گا جب مالکِ یومِ آخر
اپنی مرضی کے خلاف
اپنے اعمال کا بدلہ وہ وہیں پائیں گے
وقت گزرے وہ بہت روئیں گے چلائیں گے
اپنے اعمال کی بخشش کے لئے ———
لیکن بے سُود
"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"
ہے یہ جینا تو فقط عارضی اور دو روزہ
آزمائش کے لئے ———
اس میں اعمال کا بدلہ کبھی ملتا ہی نہیں
اور کیسے ملتا ——— ؟
اُن کے اعمال کی فہرس ہے طویل ———

O

فوزی عمری

سنہری یادگار

یہ افسانہ (FICTION) نہیں بلکہ تاریخ انسانی کی ایک گداز اور اثر انگیز حقیقت ہے

مکہ اور مدینہ کے درمیان پھیلے ہوئے ریگستان میں جا بجا ہرے بھرے نخلستان پائے جاتے ہیں، جہاں تپتی ہوئی ریت کے سینہ بریاں سے سرد و شفاف پانی کے چشمے بھی ابل پڑے ہیں اور سیکڑوں میل طول و عرض میں پھیلے ہوئے اس ریگزار میں قدرت کی جمال آرائیوں اور بوقلمونیوں کا عجیب دلفریب اور نظر افروز منظر پیش کرتے ہیں۔ تھکے ماندے مسافر جب آفتاب کی تپش اور "تنور سوختہ" کی جلن سے بے قرار ہو جاتے ہیں تو ان درختوں کے سایہ میں آرام کرتے اور ان کے نیچے بہنے والے "چشمۂ سلسبیل" سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ محسوس کرتے ہیں کہ دوزخ سے نکلکر جنت میں داخل ہونے والوں کے کیف و سرور کا کیا عالم ہوتا ہے؟

اسی قسم کا ایک نخلستان تھا جو اپنے قدرتی محاسن اور فطری جمال کے علاوہ انسانی فکر و نظر کی صناعانہ خوبیوں کا بھی ایک نظر فریب مرقع تھا باغ کے بیچوں بیچ مالک کا دار الاقامہ اور اس کے اطراف ایک نہایت خوبصورت اور دلکش چمن تھا جو خود ایک مضبوط چہار دیواری کے احاطہ میں محفوظ تھا۔ مختلف قسم کے خوشنما درختوں، انگور کی بیلوں، رنگ برنگ کے پھولوں اور جا بجا چھوٹے ہوئے رنگین اور ٹھنڈے نظاروں نے اس کے فطری جمال میں چار چاند لگا دئے تھے۔

اتفاقاً ایک نوجوان رہگیر سفر کی تکان سے چور اور دھوپ کی تپش سے جھورا ادھر آ نکلا اور اس نخلستان کو رحمت الٰہی سمجھ کر اتر پڑا۔ وضو کیا، نماز پڑھی اور کچھ کھا پی کر سیراب ہوا تو کچھ دیر کے لئے چشمہ کے قریب لیٹ گیا اور بہت جلد ایک گہری نیند میں ڈوب گیا۔ ادھر اس کا شتر بے مہار جس کو اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا، نشیب و فراز سے بے خبر، جھاڑیوں اور درختوں کو روندتا ہوا بے تحاشا چلا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں سوء اتفاق سے باغ کے چمنستان میں داخل ہوا اور چند ہی منٹوں میں ایک زرین اور قیمتی انگور کی بیل پامال کر ڈالی باغ کا نگہبان ایک خوش عقیدہ مسلمان بوڑھا تھا جو مسجد کے لئے ایک چٹائی کے بننے میں ہمہ تن مصروف تھا اس کی گردن اچانک اٹھی تو دیکھا

اپنے آقا کی متاع عزیز ایک وحشی کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے۔ بے اختیار اپنی لاٹھی اونٹ پر دے ماری اور وہ بھاگ گیا۔ لیکن دوبارہ اونٹ چمن میں ایک دوسرے راستہ سے داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ بھی بوڑھے نے ہانک دیا۔ اب تیسری بار جو داخل ہوا تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنا سارا زور لگا کر ایک آخری ضرب لگائی۔ لاٹھی اب کی دفعہ اونٹ کے ایک نہایت ہی نرم و نازک عضو پر پڑی، وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا اور تڑپتا ہوا تھوڑی دیر میں مر گیا یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اونٹ کا مالک پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی نیند کے ایک جھونکے نے اس متاع عزیز پر یہ ظلم ڈھایا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بیدار ہوا۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا، آفتاب کی کرنیں اپنی اصلی تمازت کھو چکی تھیں اور درختوں کے سایے دراز ہو چلے تھے گویا ایک فطری مسلم کی حیثیت سے رب العالمین کے دربار میں رکوع و سجود کے لئے نیازمندانہ جھکے ہوئے تھے۔ نوجوان مسافر نے دیکھا کہ روانگی کا وقت ہو چکا ہے مگر اس نے ایک دیندار اور حقیقی مسلم کی طرح اولاً وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر دربار الٰہی میں دست بدعا ہو گیا۔ ان اولین فرائض سے فراغت کے بعد اس نے سفر کی تیاری کرنی چاہی۔ دیکھا تو اس کا رفیق سفر اونٹ غائب تھا۔ ادھر ادھر گھوم کر تلاش کیا اور حسرت سے دور دور تک نگاہوں سے بیابان کا گوشہ گوشہ چھان مارا، مگر اس کا منظور نظر کہیں نہیں تھا "آخر خدا کی اس زمین پر چلا کہاں گیا؟" اس نے درد بھری آواز میں کہا پھر وہ ادھر ادھر گھومتا ہوا چمن میں پہنچا دور سے ایک امید کی کرن نمودار ہوئی لیکن نزدیک پہنچنے پر وہ برق بن کر اس کی متاع صبر پر ٹوٹ پڑی اپنے دست و بازو، مونس و غمگسار اور ایک بے نظیر وفادار کو مردہ دیکھ کر اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ وہ دیر تک مبہوت، سراپا حسرت و یاس بنا کھڑا رہا اسی اثنا میں ایک پیرمرد اس کے روبرو آیا، سلام کیا اور نہایت ہی لجاجت آمیز لہجہ میں عرض کیا۔ "عزیزم معاف کرنا، مجھ سے چوک ہو گئی۔ میں نے قصداً اس کو قتل نہیں کیا میرا مقصود اتنا ہی تھا کہ ایک اونٹ کو اپنے آقا کی گراں بہا انگور کی بیل روندتے ہوئے دیکھ کر ہانکنے کی غرض سے اس پر اپنا

عصا پھینکا، جو سوئے اتفاق سے اس کے کسی ایک نازک مقام پر لگا اور موت کا باعث ہوا۔

مسلم نوجوان جوش غضب میں بے خود ہو رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا تھا، اور کسی قسم کی معذرت سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسی عالم وارفتگی میں اس نے کہا "او بڈھے احمق! تو اتنا دلیر و بے باک ہو گیا کہ میرے اونٹ پر دست درازی کرسکے اور لشنہ انتقام سے چور اس نے دونوں ہاتھوں سے بوڑھے کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی نحیف و ناتواں گردن مشکل سے اس کے دست جھٹکے کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں موت کی غمازی کرنے لگیں اور زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ اس کے دونوں پاؤں لڑکھڑا گئے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ مردہ ہو کر زمین پر گر پڑا۔

جب نوجوان مسافر ہوش میں آیا تو اپنی اس ناجائز حرکت پر بےحد نادم اور پریشان ہوا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ عرق ندامت سے تر بتر ہو رہا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا، پاؤں بوجھل ہو گئے اور سراپا ماتم بنا کھڑا تھا۔ اس نے ایک انسان کی جان ناحق لی تھی اور اسلام کے ایک مقدس اصول کی بے حرمتی کی تھی۔ ندامت کے قطروں نے اس کے آئینہ دل میں وہ صفت جہاں نمائی پیدا کردی کہ اس کی آنکھوں میں حجۃ الوداع کا آخری عظیم الشان اسلامی اجتماع، تصویر کی طرح حرکت کرنے لگا جہاں اس کے محبوب حقیقی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری وصیت فرمائی تھی۔

اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا "مسلمانو! تمہارے مال، خون، اور آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اور اس مبارک شہر میں" یہ مبارک الفاظ اگرچہ کئی سال قبل عرفات کے چٹیل میدان میں کہے گئے تھے، لیکن ابھی تک ان کی صدائے بازگشت نوجوان کے سامعہ اور دل پر تعلیاں سی گرا رہی تھی۔ اس نے اپنے متعلق یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اسلام کا ایک مجرم ہے۔ بہت دیر تک وہ انہی خیالات میں غرق تھا کہ یک بارگی ہمت اور جرات نے اس کے جسم میں ایک تازگی کی لہر دوڑا دی۔ اس نے کہا "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا" لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہونا چاہئے؟ اور جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو متضاد آوازیں سنائی دیں۔ ایک طرف اس کے نفس نے سمجھایا کہ میاں! اس میں شک نہیں تم نے بوڑھے میاں کو ناحق مار ڈالا اور غلطی کی، لیکن کوئی دیکھنے والا بھی تو نہیں تھا؟ یہاں تو کسی کا پتہ نہیں چہ جائیکہ مدعی اور گواہ اور پھر تم

اور عدالت کی کوٹھری!! دیکھو چپکے سے فرار ہوجاؤ۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ضمیر نے اندر سے آواز دی کہ خبردار! اگر تو نے ایسا کیا تو سچے پیروان اسلام کی فہرست سے تیرا نام کاٹ دیا جائے گا۔ اگر کوئی دیکھنے والا انسان نہیں تھا تو انسان کو پیدا کرنے والا لطیف و خبیر کہاں چلا گیا تھا؟ اگر کوئی مدعی نہیں پیدا ہوا تو ضمیر ایمانی سے بڑا دعویدار کون ہوسکتا ہے؟ آخر ایک یوم الفصل ایسا بھی تو آنے والا ہے جس میں تیرے اعضاء و جوارح اور قلب و ضمیر یہ فریضہ شہادت ادا کریں گے۔ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ تو کیا وہ عبرت ناک منظر تجھے اس امر پر آمادہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ جو شہادت اور گواہی تیرے ہاتھ پاؤں اور زبان و دل کل خود تیرے ہی خلاف دیں گے جب کہ تو بے بس و ناچار ہوگا، وہ فریضہ آج ہی تو اپنے خلاف گواہ اور مدعی بن کر ادا کر دے۔ کچھ دیر تک وہ اسی قسم کے متضاد خیالات کی رو میں بہ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ضمیر و ایمان کے نور نے اپنے حریف کا پردہ چاک کردیا اور مسلم نوجوان پوری طرح آمادہ ہوگیا، کہ جو بھی ہو آخرت کی دائمی رسوائی اور عذاب سے بچنا چاہئے اور دنیا کی رسوائی اور ذلت کو اس کی عزت اور آرام کی طرح آنی اور فانی سمجھنا چاہئے۔ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ وَهُمْ لَا يُنْصَرُونَ چنانچہ وہ مقتول کے گھر پہنچا اور اس کے دونوں فرزندوں کو اپنا پورا ماجرا بے کم و کاست سنا دیا، جنہوں نے اس کو ہمراہ لے کر مدینہ کی راہ لی۔

یہ وہ مبارک عہد تھا جبکہ خلافت اسلامی کے حدود مصر و شام اور ایران و ہندوستان تک پہنچ گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف کا چرچا ملک کے ہر گوشہ میں ہو رہا تھا اور حریت و مساوات کا سبق ہر شخص عملاً پڑھ رہا تھا اور فی الجملہ وہ مقصد پورا ہو رہا تھا جس کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا یعنی اسلام کے ہمہ گیر و عالمگیر اصولوں کی بنیاد پر ایک منظم اسٹیٹ وجود میں آ گیا تھا۔ جس کا باطن صاف اور شفاف اور جس کا ظاہر سیدھا سادھا اور اپنے باطن کا ترجمان تھا۔ جو یک رنگ تھا اور صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا تھا۔ اور اسی لئے یگانے اور بیگانے، دوست اور دشمن، ملکی اور غیر ملکی سبھی سے خراج تحسین وصول کر رہا تھا۔ قبائل کے قبائل، قوموں کی قومیں اور ملک کے ملک یکے بعد دیگرے اس کے نظر فریب ظاہر اور دل فریب باطن کے حلقہ دوام میں اسیر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور یہ

سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا کہ انہوں نے پہلے اپنے آپ کو یک رنگ بنا لیا تھا۔ ایمان ان کا باطن تھا اور عمل صالح اس کا ظاہر اور ہر ایک دوسرے کا واحد ترجمان اور اس کے نورانی محاسن کے جلوے اپنے اندر رکھنے والا تھا۔

این دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم الذی ارتضیٰ لہم۔ (ترجمہ)

اللہ کا وعدہ ہے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور نیک کام کئے، ضرور عنقریب انہیں زمین میں خلیفہ بنا کر رہے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو ان کے لئے قائم کر دے گا جو اس کے پاس پسندیدہ ہے۔

الغرض تینوں آدمیوں کا یہ شکستہ حال قافلہ ایک عرصہ کی دشت نوردی کے بعد مدینہ پہنچا اور سیدھے مسجد نبوی کی راہ لی جو اس وقت ایک مقدس عبادت گاہ ہونے کے علاوہ دنیا کا عظیم الشان ہائیکورٹ بھی تھی۔ خلیفۂ اسلام اپنے چند خاص احباب کے ساتھ بیٹھا ہوا امور سلطنت کے بارے میں گفت و شنید کر رہا تھا جو غالباً اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان تھے۔ قافلہ مسجد میں داخل ہوا اور سلام کے بعد تینوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ ہر ایک کی نگاہیں خلیفہ کی شخصیت کا سراغ لگانے میں کوشاں تھیں، مگر اس کی سادگی اور بے تکلفی اور فروتنی اور خاکساری نے پہچاننے میں رکاوٹ پیدا کر رکھی تھی۔ خلیفۂ اسلام اپنے سادہ بلکہ پھٹے پرانے کپڑوں اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہتا مگر اس کے روحانی جاہ جلال اور شان و شکوہ کا یہ عالم تھا کہ اس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے دلوں میں دھڑکا اور جسموں میں رعشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اور اسی سادگی کے عالم میں ملک شام کا سفر کرتا تو یوں محسوس کیا جاتا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا ہے۔ الغرض کچھ دیر کے بعد نماز کا وقت آ گیا تو خود خلیفہ نے نماز پڑھائی۔ اس لئے کہ امامت کا منصب جلیل اس وقت خلیفۂ وقت کے سپرد تھا یا اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا عامل اس اہم فریضہ کو ادا کیا کرتا تھا۔ یہ ان اپاہج قسم کے لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھتا تھا جن کے متعلق علامہ اقبالؔ نے فرمایا ہے

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے ؟
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

کی حدود مسجد کے منبر و محراب سے لیکر حکومت و سیاست کے ایوان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی لئے خلیفۂ وقت ایک طرف مسجد کی تولیت کا فرض انجام دیتا تو دوسری طرف سلطنت و حکومت کے انصرام و انتظام کے فرائض بھی ادا کرتا۔ کبھی میدان جنگ میں سپہ سالاری کے لباس میں جلوہ گر ہوتا اور کبھی اسی بارگاہ قدس میں ایک قاضی اور حاکم کی حیثیت اختیار کر لیتا، قضاء مقدمات، تنفیذ امور اقامت حدود الٰہی و تعلقات اقوام و دول اور تدبیر مملکت کے اہم فرائض انجام دیتا تاکہ خلافت کے منصب جلیل اور عظیم الشان اعزاز کو بھی اللہ کو دی ہوئی امانت سمجھے اور اس مالک کی کبریائی اور عظمت و جلال کی تصویر زیادہ نمایاں ہو کر اس کی آنکھوں میں پھر جائے جس کے گھر میں بیٹھ کر وہ فرائض خلافت انجام دے رہا ہے

نماز سے فارغ ہونے کے بعد تین اشخاص نے خلیفہ سے بلا تکلف ملاقات کی۔ ان میں ایک مستغاث علیہ تھا اور دو مستغیث۔ ایک نے فوراً اپنے مقدمہ کی تقریر شروع کر دی۔ یہ مقتول کا بڑا لڑکا تھا۔ "امیر المومنین! (مجرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ شخص ہمارے نخلستان میں ٹھہرا اور آرام لینے کے لئے کچھ دیر لیٹا تو گہری نیند میں چلا گیا۔ ادھر اس کا شتر بے مہار جس کو اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا، ہمارے مالک کے چمن میں گھس پڑا اور ایک قیمتی انگور کی بیل روند ڈالی۔ والد محترم نے جو اس باغ کے نگہبان تھے اس کو دوبارہ سہ بارہ ہانکا۔ سوئے اتفاق سے آپکا عصا اونٹ کے کسی نازک مقام پر گرا اور جانکنی موت کا باعث ہوا۔ والد محترم نے اس کو قصداً ہلاک نہیں کیا تھا، انہوں نے اپنی دانست میں اپنی ڈیوٹی ادا کرنی چاہی تھی اور بس۔ یہ شخص اس وقت تک بے خبر سو رہا تھا، اگر والد صاحب چاہتے تو چپکے ... رہ جاتے اور تجاہل عارفانہ سے کام لے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اس رویہ کو دیانت داری اور راستبازی کے خلاف سمجھا جو ایک سچے پیرو اسلام کا شیوہ نہیں ہو سکتا ہمیں اب تک ان کے مربیانہ پند و نصائح یاد ہیں جو سچائی اور راستبازی کے بارہ میں ہمیشہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کی تاکید تھی کہ بیٹا ہمیشہ سچ بولنا۔ ایک مسلمان کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا سچائی محمد رسول اللہ صلعم کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہی وہ جوہر گراں بہا تھا جو آپ کی جبین روشن پر قبل بعثت کے تاریک دور میں بھی درخشاں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا روئے انور دیکھتے ہی ابو جہل اور ابولہب جیسے کذاب و مفتری بھی "صادق" اور "امین" بول پڑتے تھے۔ ایسا ایک سچا مسلمان جس کے قلب و نظر میں اسلام کی صداقتیں اس طرح رچی ہوئی ہوں کس طرح اپنے جرم پر پردہ پوشی کر سکتا تھا وہ سیدھے اس نوجوان کے پاس آئے اور پورا واقعہ سنا کر انتہائی لجاجت آمیز لہجہ میں اپنے قصور پر ندامت و حسرت

کا اظہار کیا اور خلوص دل سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ لیکن یہ کمبخت بجائے اس کے کہ ان کے جذبۂ صدق و ایمان کی قدر کرتا، اس مقدس بوڑھی جان پر بری طرح ٹوٹ پڑا، اور جوش انتقام میں اُن کا گلا گھونٹ دیا۔" اس دردانگیز داستان سے مجمع پر ایک ماتم خیز سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص کی تجسس آمیز نگاہ حیرت رہ رہ کر نوجوان مجرم کی تصویر خجالت سے ٹکراتی تھی۔ لیکن سب کی زبانوں پر ایک معنی خیز سکوت طاری تھا کہ دفعتاً ایک کڑکتی ہوئی آواز خموشی کو توڑتی ہوئی پیدا ہوئی " اس بیان کے متعلق تم کیا کہنا چاہتے ہو!" خلیفہ نے نوجوان مجرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب امیر" نوجوان نے کہا اور ندامت سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اور اس کے ہر لفظ سے حسرت و اندوہ ٹپک رہے تھے۔ "اس بیان کا ایک ایک حرف حقیقت و صداقت پر مبنی اور مجھے تسلیم ہے۔ میں اپنے کئے پر سخت نادم و پشیمان ہوں۔ اور اس داغ کو دھونے کے لئے اپنا خون پیش کرتا ہوں شاید کہ اس کے ذریعہ اپنے آقائے حقیقی کے روبرو کھڑے ہونے کا اہل ہو جاؤں۔ ہاں جو چیز میرے احساس دل کا کانٹا بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ میں اسلام کا ایک منحوس پیرو ثابت ہوا۔ اسلامی حدود سے تجاوز کر کے اور اس کی مقدس اور پاکیزہ تعلیمات کے صحیفہ پر ایک سیہ کاری کا داغ لگا دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ چھوٹا بڑے کی تعظیم کرے۔ نیز آپ نے اپنے آخری پیغام حجۃ الوداع کے وعظ میں اپنی امت کو وصیت فرمائی تھی کہ ایک مسلمان کا مال، جان اور آبرو دوسرے پر حرام ہے۔ لیکن افسوس کہ ان مبارک اور پاک تعلیمات سے میں نے گردن موڑ لی ان کا کوئی پاس نہ کیا اور بجائے اس کے کہ ایک معمر و ضعیف مسلمان کی تکریم کرتا انتہائی بے حرمتی کے ساتھ اس کے قتل کا باعث بنا۔ اب اسلام کے قانون عدالت کے روبرو میرا سر نیاز خم ہے شاید کہ اسی مستعار حیات دنیوی کی متاع قلیل کے ذریعہ آخرت کی حقیقی زندگی کا سرمایہ نجات حاصل کر لوں۔"

حاضرین مجلس حیرتناک تقریر کے ایک ایک لفظ سے متاثر ہوئے تھے اور نوجوان کی اسلامی جرأت پر نعرہ ہائے تحسین و آفرین بلند کر رہے تھے کہ اس نے موت کے روبرو کھڑے ہونے کے باوجود حق اور صدق سے منہ نہ موڑا اور بے خوف و خطر وہ بات کہہ ڈالی جو کہنے کی تھی۔

"بہت خوب" خلیفہ نے مسرت بیز لہجہ میں فرمایا "ایک مسلمان کا یہی شیوہ رہنا چاہئے کہ اظہار حق اور اقرار جرم کے لئے اس کو بلا خوف لومۃ لائم

۔۔۔قت کرنی چاہئے گو کہ تم اس وقت ایک قاتل ہو مگر میں تمہیں اس جذبہ صداقت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ بے شک اسلام اپنے ہر ایک فرزند و عقیدتمند سے اسی چیز کی امید اور مطالبہ کرتا ہے۔ اسلام کا ایک سچا پیرو میں اس وقت بھی جھوٹ نہیں بول سکتا جب کہ موت کا بھیانک چہرہ دیکھ کر صداقت پرستی کے بڑے بڑے دعویداروں کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بزدل اور دوں ہمت نہیں ہوتا کہ حقیقت پر پردہ ڈال کر آنے والے خطرے سے بچنے کی ذلیل تدبیر اختیار کرے۔ دنیا میں اسلامیوں کی ایک ہی جماعت ہے جن کی کتاب زندگی میں "خوف" اور "حزن" کے الفاظ نہیں ملتے انہیں نہ مستقبل کا خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ ماضی کا حزن ستاتا ہے ان کا دست جنوں آگے بڑھ کر رب العالمین کا دامن رحمت تھام لیتا ہے اور وہ اس مقام بلند "علیین" پر پہنچ جاتے ہیں جہاں گزشتہ زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہونا چاہئے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

پیارے فرزند۔ خلیفہ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا "تمہارے اس جذبہ صدق و اخلاص کا احترام کرنے کے باوجود میں تمہاری کوئی مدد اور سفارش نہیں کر سکتا۔ اسلام کا قانون اٹل ہے قرآن مجید کی یہ آیت قصاص قیامت تک آنے والے مسلمانوں کیلئے عموماً اور دادا کے لئے خصوصاً پیام امن و آشتی اور انسانی جان کے احترام کا نغمۂ جانفزا پیش کرتی ہے۔ ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب (اور قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ اے عقل والو) اس کا ایک ایک حرف اٹل ہے مستقبل اور انسانیت کے بقا و تحفظ کا ذمہ دار رہیگا۔" اسلئے تمہیں سزا کا منتظر رہنا چاہئے۔ صدر جمہوریہ خلافت اسلامی کی پوزیشن اس سے زیادہ نہیں کہ اسلامی پارلیمنٹ سے استصواب لئے کرنے کے بعد قرآن کے فیصلوں کا اجرا و نفاذ کرے وان احکم بینھم بما انزل اللّٰہ (اور تم اللہ کی اتاری ہوئی چیز کے مطابق فیصلہ کرو) اسلامی قوانین نہ تو مغربی اصول جمہوریت کی طرح عوام کے ہاتھوں کا کھلونا بن سکتے ہیں نہ اصول فاشزم اور نازی ازم کے ماتحت قوم پرستوں کے جذبہ پر بھینٹ چڑھائے جا سکتے ہیں اور نہ انہیں استبداد شخصی اور آمریت مطلقہ کے شکنجوں میں الٹ پلٹ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال نوجوان قصاص کا حکم ۔۔۔

نجات اللہ صدیقی

تین کہانیاں

ندی کا پانی اسی طرح بہہ رہا تھا۔ دھارا پیچ و خم کھاتا اپنی عمومی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کنارے کا پانی بھی اپنی مدھم رفتاری سے ——— شاید تھم تھم کر کنارِ دریا پر جلے ہوئے جھونپڑوں اور ویران کھنڈروں کو چشمِ پُرنم سے دیکھتا اور کچھ سوچتا ہوا بہہ رہا تھا، اور اس کی ننھی ننھی موجوں کے کاندھوں پر سوار ایک تنکا ——— ایک معمولی سا تنکا بہا چلا جا رہا تھا۔ شاید تنکا بھی اُداس تھا۔ ہاں یہ تنکا اُداس تھا، اور بالکل اسی کی طرح وہ تنکا بھی جو دس گز پیچھے موجوں کے سہارے اس کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہوا بھی شاید اسی لئے چلی اور موجوں کی روانی تیز ہوئی۔ تاکہ دونوں تنکوں کو ملا دے۔ تنکوں کا ملاپ۔ شاید دنیا کا سب سے حقیر واقعہ ——— لیکن مورّخ کے لئے ایک باب۔ داستان گو کے لئے ایک نئی داستان اور افسانہ نگار کیلئے ایک نیا پلاٹ تھا

وہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ کیوں۔ شاید چاروں طرف پھیلے ہوئے پانی میں ایک ہم جنس سے ملاقات نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا۔ اس لئے کہ ایک نے دوسرے سے اس کی قومیت، وطن اور نسل کی بابت کوئی سوال نہ کیا۔ وہ دونوں تنکے تھے۔ دونوں آب و خاک کے امتزاج کی پیداوار۔ دونوں ایک ہی صناع کی کاریگری کے نتیجے۔ تو وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے رہے۔ یہاں تک کہ متلاطم پانی ٹھہر گیا۔ فضا میں سکون ہو گیا، اور اب ایک نے دوسرے کو ہمہ تن سوال بن کر دیکھا۔ شائد ایک دوسرے کی داستانِ حیات سننا چاہتے تھے، اور کمزور تنکا بولا:

"میرا اوّلین وطن مغربی پنجاب کا ایک سرسبز بھرا لہلہاتا کھیت تھا۔ میں شبنم سے نہاتا۔ کرنوں سے کھیلتا۔ دوشِ نسیم پر جھومتے جھولتا اور چاند تاروں سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن پھر۔ قدرت کے نظام کے مطابق اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ کھلیان میں منتقل ہونا پڑا ——— دوسرے اسے کوستے ہیں، لیکن ساتھی، فطرت کے طریقے موزوں ہی ہو سکتے ہیں۔ میں تو اس پر ریشانی نہیں کرتا۔ ہاں تو پھر ایک دن اپنے پورے گروہ کے ساتھ میں ایک مکان کی چھپر میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ مکان میرے مالک نے اپنے نوجوان بیٹے کے لئے بنایا تھا۔ میرا مالک۔ وہ ایک گرانڈیل سکھ تھا۔ اُس کا جوان بیٹا ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اُس کے بازو گٹھے ہوئے تھے اور اس کا سینہ چوڑا تھا۔ وہ ایک طاقتور پنجابی کی طرح قوی ہیکل تھا۔ وہ میرے نیچے اپنی جوانی کی حسین راتیں گزارتا رہا۔ اس کے بیاہ کو چند ہی ماہ تو ہوئے تھے۔ اس کی بیوی کو بھی اللہ نے اچھی صورت اور بھرا ہوا بدن عطا کیا تھا۔ تو ساتھی دن گزارتے رہے، اور بالآخر کچھ دن ایسے آئے کہ میرا مالک نوجوان اس کا باپ اور اس کی دولہن سب گھبرائے گھبرائے سے رہنے لگے۔ وہ رات کو دیر دیر تک جاگتے اور عجیب عجیب باتیں کرتے۔ جیسے کوئی آفت آنے والی ہو۔ کبھی وہ سوچتے یہ بستی چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ لیکن پھر وہ خود ہی جواب دیتے کہ بھاگ کر کہاں جائیں۔ کس چیز کے بل پر جئیں۔ وہ کسان تھے۔ روپے والے نہ تھے۔ اپنا کھیت اور اپنے مویشی چھوڑ کر وہ کیسے زندہ رہ سکتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے کہ بھاگ کر جانا ناممکن تھا۔ رستے میں جان بچنی ناممکن تھی ——— لیکن ساتھی میں نے تو یہ دیکھا کہ اس بستی کے ہندو زمیندار۔ اس بستی کا سکھ نمبردار یہ سب منتقل ہو گئے۔

اپنے گھر بار سبھی چھوڑ کر چلے گئے لیکن میرا مالک وہیں رہ گیا۔ آخر کار ایک دن آیا۔ اف وہ دن بڑا ہولناک تھا۔ جب پاس کے گاؤں سے ایک شور سا اٹھا۔ تڑا تڑ لکڑیاں جلنے کی آواز آ رہی تھی۔ شعلے بلند ہو رہے تھے، اور میرے مالک بے بسی کے عالم میں ادھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ دُور سے ایک جتھا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اللہ اکبر کی فلک شگاف آوازیں آ رہی تھیں اور میرے مالکوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ پھر انھوں نے اپنی کرپانیں سونت لیں لیکن جتنے سب نوجوان، بوڑھے اٹھے، جو۔ لیکن اُن کی آنکھیں بے نور تھیں۔ وہ خالی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے۔ جیسے موت کی غشی طاری ہو، اور جتھا قریب آتا جا رہا تھا۔ اللہ اکبر کا نعرہ شدت سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہم حیرت سے انگشت بدنداں تھے۔ یہ کیوں؟ اس بستی والوں نے کیا کیا۔ انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا۔ یہ کوئی نیک انسانوں کی بستی نہیں تھی۔ ان میں شراب نوشی عام تھی۔ زنا اور فحاشی کبھی زیادہ بری نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ ان کے اندر بداخلاقیاں رچ بس گئی تھیں یہ سب کچھ تھا۔ لیکن انھوں نے آنے والوں کا کیا بگاڑا تھا۔ آنے والوں کو اُن سے کیا نقصان پہنچا تھا۔ آنے والے قریب آتے جا رہے تھے۔

"پاکستان زندہ باد۔ سکھوں کو مار ڈالو۔ مسلم لیگ، زندہ باد، ایک بھی سکھ زندہ نہ بچے۔ ناپاکوں سے پاکستان کو پاک کرو۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر!"——

یہ اور اسی قبیل کے دوسرے نعرے بلند ہوتے جا رہے تھے بستی والوں کا حال ظاہر تھا لیکن ہم کسی اور خیال میں غلطاں و پیچاں تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ پاکستان کی زندگی کو سکھوں کی موت کیوں درکار ہے۔ پاکستان خود زندہ رہے پھلے پھولے۔ لیکن اس کے لئے ایک قوم کا خاتمہ کیوں شرط تھی۔ کیا اس منزل سے گزرنے کے لئے لاشوں کے پل ضروری ہیں۔ کیا اس سرزمین کو پاک کرنے کے لئے خون سے نہانا ضروری ہے۔ آخر یہ کیوں ہو رہا تھا، اور پھر آنے والے ایک دم قریب آ گئے۔ ہم نے دیکھا اُن کی آنکھوں میں بھیڑیے اور چیتے ناچ رہے تھے اُن کے دماغ پر درندگی کی حکومت تھی۔ اُن کی آنکھیں شہوت پرستی کے جذبے سے چمک رہی تھیں۔ وہ چھرا گھونپنے کے بعد مقتولوں کی جیب کو تلاش رہے تھے اور اپنی جھولیاں بھرتے تھے —— کیا یہ سب اسی لئے ہو رہا تھا۔ ہم حیران تھے۔ ہم نے اُن کی آنکھوں سے اُن کے دلوں میں جھانک کر دیکھا کیا اس اللہ اکبر کا اُن کے دل سے تعلق ہے۔ نہیں، بالکل نہیں۔ وہاں شیطان مسکراتے نظر آئے۔ اُن کے دل اللہ کے خوف سے خالی تھے، اُن میں جوابدہی کا احساس نہ تھا، جو غلط کاری سے پہلے ہاتھ پکڑ لیتا۔ اُن کو حیات اُخروی کی پروا نہیں تھی۔ جس کے بوجھ سے آگے بڑھنے سے قبل پاؤں زمین میں دھنس جاتے۔ اُن کی داڑھیاں ظلمت کے ڈھکانے تھے، جو دین کے نور سے نا آشنا تھیں، اور لاشیں گرتی جا رہی تھیں۔ مرد تقریباً ختم ہو چکے۔ آنے والوں نے اب گھروں کی راہ لی۔ وہ بند کواڑوں کو دھکوں سے توڑتے اور آگ کے سپرد کرتے گئے۔ عورتوں کی چیخ پکار کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ چار پانچ کا ایک گروہ ایک دھکے سے ہمارے گھر میں بھی گھس گیا۔ ایسا دھکا جس سے چھوٹ دل گیا۔ اور میں اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ دور جا پڑا۔ وہ ظالم اس کی سینہ کو گھسیٹ کر باہر لائے۔ اور ایک نے جو لوٹ مار میں بھی سب سے آگے تھا اور نعرہ لگانے میں بھی۔ . . . . . .

اور یہی چاروں طرف ہو رہا تھا، پھر دوسرا اور تیسرا اور بالآخر جب عورت کے چہرے پر ایک بھیانک مردنی چھا گئی تو وہ آگے بڑھے اور آگے بڑھنے سے قبل —— اُف۔ میرے رفیق آگے بڑھنے سے قبل انھوں نے اس کے سر کو بھی کھوپڑیوں کے اسی سلسلے میں شامل کر لیا جو ایک علم کے طور پر ایک کے ہاتھ میں تھا اور پھر مکانات کو شعلوں کی نذر کرتے ہوئے یہ جتھا نعرۂ تکبیر بلند کرتا —— آگے بڑھ گیا۔ پوری بستی پر موت کا سناٹا چھا چکا تھا۔ زمین سرخ ہو چکی تھی اور سرخ شعلے بلند ہو کر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ اور پھر کچھ گھنٹوں کے بعد ہوا کے ایک مہربان جھونکے نے بہتوں کے ساتھ مجھے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا اور اسی طرح میں وہاں سے یہاں پہونچا۔" یہ کہہ کر تنکے نے یکایک خاموشی اختیار کر لی۔ موجوں کا سکوت اور فضا کا سکون جیسے اس داستان کے سننے کے بعد ہی دوسرے تنکے سے بھی کچھ سننا چاہتا تھا، ایک موج نے آگے بڑھ کر دونوں کو اچھال دیا اور پھر دوسرے تنکے کی داستان شروع ہو گئی۔

"میں دیا سلائی کا تنکا ہوں۔ یہ تو تو نے جان ہی لیا ہوگا اور

میں ایک ڈبیہ میں بند اپنے قوی ہیکل سکھ مالک کی الماری میں مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ میں پڑا ہوا تھا۔ بالآخر ایک دن تین چار سکھ میرے مالک کے کمرہ میں جمع تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا تو سگرٹ جلانے کے لئے وہ ڈبیہ کھلی جس کا ایک تنکا میں بھی تھا۔ اس وقت بڑی ہی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ گرو نانک، گرو گوبند سنگھ اور اورنگ زیب کے تذکرے ہو رہے تھے۔ مسلمان قوم کے خلاف نفرت پسینے کے ساتھ ہی ہر سکھ کی آنکھ سے شعلے نکل رہے تھے۔ "مشرقی پنجاب کے لئے ننگ ہوگا اگر ایک مسلمان بچہ بھی اس زمین پر سانس لیتا ہوا باقی رہ جائے"۔ اور اسی قسم کے دوسرے اونچے اونچے بول تاریخ اور قوم پرستی کے سہارے کہے جا رہے تھے۔ میز پر گھونسہ مارنے کی وجہ سے کبھی کبھی ہر بوتل کھنکھنا رہی تھی۔ بالآخر ایک ایک کرکے بوتلیں خالی ہوگئیں۔ ان کی سرخی آنکھوں سے شعلے بن کر نکلنے لگی۔ ہر ایک کی نسیں ابھر آئیں۔ اور یہ گفتگو آگے بڑھتی رہی۔ قریب کے ایک گاؤں کا تذکرہ تھا۔ اس گاؤں کی کچھ دوشیزاؤں کے بھی تذکرے تھے۔ غلے، روپے پیسے اور زیورات کی بھی بات تھی۔ کسی کسی روپے والے کے بھاگ نکلنے پر دانت بھی پیسے جا رہے تھے۔ حکومت کو گالیاں بھی دی جا رہی تھیں۔ کرپانوں کے علاوہ بندوقوں اور ہاتھ کے بموں کے بھی تذکرے تھے۔ بالآخر کیپٹن کردیال جوش میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ فوج میں ایک سپاہی تھا۔ اس جیسے کئی سپاہی اس محفل میں موجود تھے۔ سب اسے کیپٹن کہا کرتے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آج ہی رات، بس آج ہی کی رات اس نے زمین پر اپنا بھاری بوٹ پٹکتے ہوئے کہا اور پھر واہ گرو اور خالصہ کی جے۔ اکالی دل زندہ باد۔ پاکستان مردہ باد۔ ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑو کے بلند بانگ نعروں میں یہ گروہ بستی بھر کے جوانوں کو جمع کرتا ہوا پٹرول کی بوتلوں، دستی بموں، بندوقوں اور کرپانوں کے ساتھ ایک سمت کو چل کھڑا ہوا۔ میں اپنے مالک کی جیب ہی میں تھا، بالآخر میرا مالک اور پورا جتھا ایک گاؤں کے قریب پہنچ گیا۔ بستی کے سر پر منڈلانے والی بداعمالیاں مسکراتی ہوئی آنے والے عذاب کی منتظر تھیں۔ لیکن بستی والوں نے اس جتھے والوں کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ان کے دل سکھوں کی طرف سے نفرت سے بھرپور ضرور تھے۔ وہ مغربی پنجاب میں سکھوں کے قتل عام کی خبر سن کر خوش ضرور ہوتے تھے۔

لیکن انھوں نے ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا تھا یہ لوگ آگے بڑھتے گئے جوش بڑھتا گیا۔ سکھ پنتھ کے نعرے بلند ہوتے گئے، اور دلوں کی حرکت تیز ہوتی رہی۔ اس کے آگے کیا ہوا وہی، جو تو نے بیان کیا۔ دلوں کا حال بھی وہی تھا۔ آنکھوں میں بھی وہی چمک تھی۔ دماغوں میں بھی وہی ہیجان تھا۔ وہی ہیجان جب قوم پرستی اور لادینیت نے مل کر پیدا کیا تھا۔ بالآخر جب عورتیں دم توڑنے لگیں۔ جب مردوں کے خون سے زمین رنگ گئی۔ جب ننھے ننھے بچوں کو فضا میں پھینک کر برچھیوں کی نوک پر واپس لینے کا بھیانک کھیل ختم ہوگیا۔ جب جوان پستانوں کے تراشنے سے جی بھر گیا۔ جب بہت سی نوجوان عورتوں کو ننگی کرکے ساتھ لے لیا گیا۔ جب یہ سب کھیل ختم ہوگئے۔ جب لہلہاتی پکی فصلوں میں آگ لگائی جا چکی۔ جب ہر قابل قدر سامان، زیور اور روپیہ لوٹا جا چکا اور آگ کے شعلے اس حد کو پہنچ گئے کہ پوری بستی کا خاک سیاہ ہو جانا یقینی ہوگیا اور جب بوڑھی عورتوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں برچھی کے سہارے ڈھکیلا جا چکا تو صبح ہوتی دیکھ کر جتھا واپس چلا اور اسی ہنگامے ہی میں ——— مجھے یاد بھی نہیں کس طرح میں نیچے گرا اور جلد ہی کسی طرح ان لہروں کے سہارے خود کو ہچکولے کھاتا ہوا پایا۔ شاید اس سخت بارش ہی کی مہربانی تھی جس نے حیوانیت اور ظلم کی سیاہی دھو ڈالنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

——— ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ موجوں میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ ساکت فضا پر جیسے طوفان آگیا۔ موجیں ان مناظر کے سامنے آنے سے بے چین ہوگئیں۔ وہ سب یہ داستانیں نہ سن سکتی تھیں۔ ان میں اتنی برداشت کا مادہ نہ تھا اور ایک حساس موج نے آگے بڑھ کر دونوں تنکوں کو اٹھا کنارے پر پھینک دیا۔

اسی وقت، عین اسی وقت ——— ہوا کے کاندھوں پر سوار ——— کپڑے کا ایک ٹکڑا۔ جانے کہاں سے اڑتا ہوا آکر اسی جگہ پر گرا۔ اور دونوں تنکوں کو اس نے ڈھانک لیا۔ وہ اضطراب پسند نہ تھا۔ وہ زمین کے سینے سے چمٹ گیا اور تنکے بھی اس سے چمٹ گئے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں۔ تنکوں نے محسوس کیا کہ کپڑے سے بھی وہی بو آرہی تھی جو ان کے اندر سے

اس وقت آئی تھی جب ان قوموں نے [illegible] پیش نہیں کیا تھا۔ انسانیت خون کی بو ——— [illegible] غور سے دیکھا، اس کی سرخی کسی خونی داستان کا دیباچہ تھی اور دونوں ہمہ تن سوال بن گئے۔
دل جلا کپڑا بھی بولنے لگا۔

"تم شاید مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ میرے رنگ نے تمہارے دل میں بہت سے خیالات پیدا کر دیئے ہوں گے [illegible] ہوں۔ ہاں میں اسی لئے باقی رہ گیا۔ اس پاکیزہ جسم سے [illegible] کے بعد میں اسی لئے زندہ ہوں کہ اس کائنات کے گوشہ گوشہ پر ہوا کے دوش پر اڑتا رہوں اور اپنی داستان سناتا رہوں۔ میری داستان زندگی کی داستان ہے۔ انسانیت کی آس ہے۔ میری داستان آدمی کے لئے امید کا آخری پیغام ہے۔ میں اسے ضرور سناؤں گا۔ تم ہی کو نہیں۔ اس دریا کے ہر ہر قطرے اور اس زمین کے ایک ایک ذرّے کو تاکہ ان میں سے ہر ایک اسے دوہرائے، اسے آدم کے بچوں تک پہنچائے۔ تاکہ یہ عام ہو۔ اور یہی میرا مشن ہے۔ میں ایک قمیص کا ٹکڑا ہوں۔ وہ قمیص جو سرحد کے ایک نوجوان کے پاکیزہ بدن پر تھی۔ میں تمہارے سامنے اس نوجوان کا [illegible] دوں۔ وہ ایک [illegible] جوان تھا۔ اس نے کچھ دنوں سے داڑھی رکھائی تھی۔ اس کی داڑھی گھنیری تھی۔ اور اس کے درمیان اس کا چہرہ بادلی کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ وہ سرحد کا جوان تھا اور ہمت و شجاعت اس کی فطرت تھی۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں۔ اس کے آگے بھی وہ بہت کچھ تھا۔ جب قتل عام شروع ہو گیا ——— ہاں جب سرحد میں غیر مسلم نسل سے ہونا ایک گردن زدنی جرم ہو گیا تو اس کے دل کا وہ اضطراب جو اس ڈیڑھ سال کے اندر برابر اس کے دل میں کروٹیں لیتا رہا۔ وہ اضطراب جو برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اضطراب جو اسے راتوں کو جاگنے پر مجبور کرتا۔ جو اس کو [illegible] آنسو رلاتا، وہ اضطراب یکایک اپنی آخری حد تک بڑھ گیا۔ پوری بستی اس کے خلاف تھی۔ وہ اللہ کی ہدایات اور برگزیدہ نبیوں کے ارشادات پیش کرتا۔ لیکن اس کو جواب میں قوم پرستی کے تقاضے اور پاکستان کی مصلحت کے سبق پڑھائے جاتے۔ وہ لوگوں کو سب سے بڑے آخری لیڈر اور ہادیٔ اعظم کی طرف بلاتا ———

——— لیکن اس کو جواب میں نئے لیڈروں اور تازہ خداؤں کے ارشادات سنائے جاتے اور وہ بستی والوں سے مایوس ہو چلا تھا۔ لوگ اس پر طعنے بھی کستے۔ کبھی اس سے کہا جاتا کہ تو قوم کا غدار ہے اور کبھی اس کے اصول کو نیا مذہب اور اس کی باتوں کو نئی باتوں سے تعبیر کیا جاتا۔ حالانکہ اس کی باتیں صاف تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ قوم پرستی کو خدا پرستی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ تم لوگوں کی جان محض اس لئے نہیں لے سکتے کہ وہ تمہارے ہم قوم نہیں۔ خدا نے جسے زندگی کا حق دیا ہے اسے اس حق سے محروم کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ تم خدا سے ڈرو۔ اگر آج تم نے اس سے بغاوت کی تو کل کو اس کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔ یہ اس نے بار بار کہا تھا لیکن اسے اس کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا تھا۔ بہرحال اب تک وہ صبر و ضبط کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیتا رہا تھا۔ اسے بالکل ناکامی بھی نہیں ہوئی تھی۔ دو اور نوجوان اس کے ہمنوا ہو چلے تھے۔ اور اس کی آواز آس پاس کی بستیوں میں بھی بعض سنجیدہ لوگوں کو متاثر کر رہی تھی تو اس نوجوان کے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس بستی میں غیر مسلم کا ایک ہی گھر تھا، اور اس میں بھی صرف چند آدمی۔ ایک بوڑھا، اس کا جوان بیٹا، دو جوان لڑکیاں اور بس کل یہی آبادی تھی۔ میرے نوجوان کو ان کی فکر بہت ستاتی تھی۔ آخرکار وہ سوچنے لگا تھا کہ یہ لوگ بستی کو چھوڑ دیتے لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا نہ کرنے کی وجہ کیا تھی اور اس کے پاس ان وجوہ کا علاج کچھ نہ تھا۔ بہرحال وہ ان [illegible] کوششیں کر رہا تھا۔ اس نے بستی والوں سے مایوس ہو کر خود ان کی حفاظت کی ٹھان لی۔ اب وہ راتوں کو ان کے مکان ہی پر سویا کرتا تھا، اور اس چیز نے بستی والوں کو اس کا دشمن بنا دیا اور آخر ایک رات کو وہ وقت آ ہی گیا ——— ایک جتھا۔ اسی قسم کا ایک جتھا جیسا کہ ان دنوں عموماً چلا کرتا تھا، اس مکان پر حملہ آور ہوا۔ اس جتھے سے تکبیر کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اور جتھے والے قوم پرستی کے نشے میں چور تھے۔ ان کی آنکھوں میں جنون کی جھلک تھی، شہوت کی چمک تھی اور زر پرستی کی ہوس۔ انھوں نے اس نوجوان کی پرواہ نہ کی۔ انھوں نے بیدردی کے ساتھ اسے قتل کر دیا، اور میرا مالک۔ وہ آخری لمحے تک ان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ان کے بچاؤ کے لئے لڑتا رہا۔ آخرکار انھوں نے اسے مار ہی ڈالا۔ وہ جو موت کے وقت اگر اپنے بچاؤ

کے انجام سے لرزاں اور ان غیر مسلموں کے قتل سے پریشان تھا تو اپنے مقام پر خنداں بھی تھا۔ میں اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا اس کی دلی کیفیات کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ اسے احساس تھا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس نے آخرت کی زندگی اور خدا کی مرضی کو سامنے رکھ کر جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے انجام پر مطمئن اپنی جان دے دی۔ ظالموں نے مرنے کے بعد بھی اس پر ترس نہ کھائی۔ ان غیر مسلم مردوں کے ساتھ ہی انھوں نے اس لاش کو بھی پاس کی ایک پہاڑی پر ڈال دیا اور پھر —— پھر قانونِ قدرت کے مطابق ان لاشوں کے ساتھ وہی ہوا جو اس طرح افتادہ لاشوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اور جب پرندوں نے نوچ نوچ کر مجھے اس بدن سے الگ کیا تب سے میں اُڑ رہا ہوں۔ پرواز کر رہا ہوں تاکہ ساری دنیا کو اس نوجوان کا پیغام سناؤں۔ یہی پیدائش ہے اور یہی میری زندگی۔ ہوا جو اب تک مضطرب تھی ٹھہر گئی۔ دریا کا پانی ٹھہر کر کچھ سوچنے لگا۔ درختوں کے پتے رک گئے۔ وہ تنکوں کی داستان سے فضا میں جو بے انتہا ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ کپڑے کے ٹکڑے کی آپ بیتی نے اسے دبا دیا۔ اُمید کا اُجالا تاریکی پر غالب آ رہا تھا۔ ایک ہی بات تھی جو سب کی سمجھ میں آ گئی۔ ہوا پھر چلی مگر دوسرے رُخ کو۔ دریا کا پانی پھر آگے بڑھا۔ مگر مضطرب نہیں مطمئن اور درختوں کے پتے آنے والی بہار کے تصور میں جھومنے لگے!

شرائط ایجنسی

۱۔ تمام معاملات میں [illegible]زی اور دیانتداری ضروری ہے۔
۲۔ کم از کم پانچ پرچے منگوانے ہوں گے۔
۳۔ کمیشن صرف ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔
۴۔ خاص صورتوں میں صرف پہلی بار پرچہ پیشگی رقم آنے سے پہلے بھیجا جائے گا۔ ورنہ وی۔ پی۔
۵۔ ڈاک کی خرابی کا دفتر ذمہ دار نہیں۔

منیجر

ابن محمود

"یوں بھی دیکھتے ہیں"

"اچھا تو بہتر ہے۔" میں نے اطمینان کی خاطر ایک بار اور تائید کرا لینی چاہی۔

"ہاں بھئی طے ہے کہہ جو دیا ایک بار۔" انور نے بار بار کے تائیدی کلمات سے تنگ آکر بات ختم کر دینے کے انداز میں کہا۔

"طے تو ہے یہ میں بھی جانتا ہوں۔ پر میرے کہنے کا مطلب یہ تھا ۔ ۔" میں نے ایک اور پانسہ پھینکتے ہوئے بات ادھوری رکھ لی۔

"وہ کیا؟ کہہ بھی ڈالو!" انور نے تیزی سے کہا۔

"میں یہ کہنے جا رہا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آمد و رفت کا جو صرفہ ہوگا آپ کے ذمہ" میں نے الفاظ اچھی طرح چبا چبا کر ادا کئے۔

"وہ کیوں؟" انور نے سوال کیا

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ ارے بھائی آپ جو ٹھہرے بڑے بھائی۔ سمجھے نا" میں نے کہا۔

"اچھا تسلیم۔ مگر یہ [illegible] کہنے کی کونسی بات تھی" انور بولے۔

"[illegible]"

انور نے میرے کچھ کہنے سے پہلے کہا "میں جانتا ہوں یہ اس لئے کہ تمہیں علم ہے کہ ہم تم دونوں ایک ہی حال میں ہیں [illegible] مارے [illegible] جو وہ [illegible] اور [illegible] بندی لے یا [illegible] اور [illegible] کی [illegible] ساری [illegible] کی جا رہی ہیں۔ شاید خیال کیا [illegible] ہوگا [illegible] بچا رکھتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ بجٹ ہمیشہ [illegible]

[illegible] مطلب یہ ہے کہ آپ کا حق ہوتا ہے۔ [illegible] ایسی صورت میں کہ حق ہونے کے باوجود اگر حق کی ادائیگی کی کوئی صورت ممکن نہ ہوتی تو پھر کسی اور بھی پہلو سے سوچا جا سکتا

"کیا مطلب؟" انور نے پیشانی پر شکنیں ڈال لیں۔

"میں بتاؤں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "بھائی جان۔ وہ جو ادارہ "شعور" کی طرف سے "لیک" پر ڈیڑھ سو کی انعامی پیشکش نے بجٹ میں اضافہ کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھے نا!" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی طرف اشارہ ہے" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"شریر کہیں کے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کے کانوں تک بھنک جا چکی ہے!" انور نے مسکرا کر کہا۔

"آپ یہ سب رہنے دیجئے میں اطمینان چاہتا ہوں" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"خیر یونہی سہی" انور نے کہا، اور اس کے بغیر چارہ ہی کیا رہ گیا تھا۔

"اچھا تو پھر لگے ہاتھوں یہ بھی طے کر ڈالئے کب چلنا ہوگا" میں نے پوچھا۔

"کون سے زیادہ دن ہیں دو ہی مہینے تو اور ہیں چھٹیوں کے۔ پھر فرصت سے سیر ہوگی" انور نے کہا۔

"بہت اچھا" میں نے خوشی سے کہا۔

(۳)

آگرہ اسٹیشن پر اترتے ہی ہمارے دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگے۔ ہم نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسٹیشن کے احاطے کو پار کر کے تانگے کا رخ کیا۔ ہمارے لئے ایک ایک لمحہ پہاڑ ہوا جا رہا تھا۔ تانگے کی رفتار سے تیز چلنے کی خواہش رکھتے ہوئے تاج پہنچ جانا چاہتے تھے، اور پھر کیوں نہ ہو۔ مدتوں بعد آج تاج کی سیاحت کی آرزو پوری ہو رہی تھی ——— اس سلسلے میں ہماری سیاحت اور تحقیقات کے وہ سارے منصوبے ابھر ابھر کر لوح ذہن پر آ رہے تھے، جو اب سے پہلے

ارادے کے عبوری دَور میں باندھے جا چکے تھے۔ آگرے کی سیر کے نت نئے پروگرام ذہن میں بن رہے تھے اور عجیب عجیب تصوّرات سامنے آرہے تھے۔

"تاج محل کیا ویسا ہی ہوگا جیسا ہم نے سن رکھا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر سوچتے گھبرانے کی کیا بات ہے کوئی دم میں سامنے آیا چاہتا ہے۔ وہ سامنے ہے" وہ بھی کوئی لمحہ ہوگا ہم نے سوچا اور وہ عدم سے وجود کے سامنے پہلی بار اور بالکل پہلی بار آیا تھا۔ وہ بھی کوئی لمحہ تھا اور پھر آئندہ بھی آتا رہے گا۔ وہ بھی لمحے ہوں گے۔ مگر عجیب تر بات ہے کہ تاج گویا ایک ہی لمحے میں ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ ہنوز روزِ اوّل ہے۔ ہمارے ذہن سوچوں کا ایک عجیب سا چیٹر یا گھرنیا جا رہا تھا۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کی واحد ترین بے مثال خوبصورت عمارت ہے جیسا کہ اس کے بارے میں اب تک دنیا والوں کا متفقہ فیصلہ ہے تو پھر اسے وہ سب کچھ ہونا چاہیے جیسا اسے مشہور کر رکھا ہے۔ اور پھر ہم سوچنے لگے ایک ایسی عمارت جو صفحۂ گیتی پر آپ اپنی مثال بن کر رہی اس کی تعمیر کا فخر مسلمان قوم کے ایک شہنشاہ کے حصّے میں آیا۔ یہ سوچتے سوچتے ہمارے قمیص ہمارے سینوں پر تنگ ہونے لگے اور ہماری گردنیں اونچی اٹھ گئیں۔

(۳)

لیکن ہماری یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جلد ہی ہمارے چہرے قلبی واردات کی دگرگونی کے ترجمان بن چکے تھے، الور تو پہلے ہی سے تاج میں قدم رکھتے ہی ایسے دکھائی پڑتے تھے، جیسے وہ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں، ایسا کیوں تھا یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا ـــــــ لیکن میرے دل پر ایک سخت چوٹ پڑی جب ہم اسی مسلمان شہنشاہ کی بنائی ہوئی اتنی ہی تاریخی جتنا تاج محل ہے، مسجد میں ادائے فرض کی خاطر داخل ہوئے۔ یہ مسجد تاج سے کچھ ہی فاصلے پر جمنا کے کنارے تھی۔ ہندوستان کی زمین پر پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے یہ دو انسانی اور ملیٔ عظمتوں کے نشان ـــــــ مسلمانوں کے اصولِ خلافت الٰہی کا منہ چڑھا رہے تھے۔ وہ مقام جہاں سے خدائے بلند و برتر کی عظمتوں کی پکار رات دن پانچ پانچ بار بلند کی جاتی ہے۔ اسے شاہجہاں اتنی وقعت بھی نہ دے سکا جتنی ایک عورت کے بے جان لاشے کے مقبرے کو اس نے دی۔ تاج محل آخر ہے ہی کیا ـــ مٹی اور

ناپاک پانی کی ایک بوند کے امتزاج سے بنی ہوئی ایک عورت اور پھر وہ بھی موت کے ہاتھوں گھونٹی ہوئی بے جان لاش کی ایک مشتِ خاک کی یادگار اور بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف تو یہ کروڑہا کی دولت صرف کر دی گئی خاک کے ایک بیکار محض ڈھیر کی یادگار کی تعمیر خاطر، اور یہ خدائے واحد کی بزرگی و برتری کی پکار اُٹھانے والا منارہ تو اسے یہ مقام نہ مل سکا۔ دنیا اپنے ایک ایک گوشے سے سمٹ سمٹ کر تاج کی سیاحت و زیارت کی خاطر آتی ہے۔ تاج ہمیشہ خوشیوں کے ترانوں اور قہقہوں کی گونج سے معمور رہا کرتا ہے لیکن یہ کون جان سکے اور اس جاننے کی دردسری ہی کیوں خرید نے جائے کہ ان آنے والوں میں سے کتنے ہوتے ہیں جو جمنا کے کنارے ایک ہی ہاتھوں کے بنائے ہوئے دو گھروں میں سے اس دوسرے گھر کا رُخ کر کے آتے ہیں۔ "مقصود کا کھوج" کون لاسکے اور اس کا احساس کیسے ممکن ہو۔ جب اس ایک "ہاتھ" ہی کو اپنے دو نقوش میں اس کا سراغ نہ مل سکا اور احساس کی کوئی کرن نمودار نہ ہو سکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو ناممکن ہے کہ خدائی عظمتوں کی پکار پھیلانے والا مقام انسانی ہاتھوں کی عظمت ہی اور عزت افزائی کا محتاج رہے۔ خداوند کی کبریائی اور جلالت انسانوں کی ممنونِ احسان اور رہینِ منّت ہو سکے۔ یہ ہی بہت ہے کہ انسان اپنی کبریائی کا سکّہ چلا سکے اور اس کی جہلت اس سے بھی بڑھ کر۔ خدائی عظمتوں کی دھوم آپ اپنے بل بوتے پر مچی ہے۔ اسے کسی "سہارے" کا شرمناک داغ چھو تک بھی نہیں گیا، اس کا شہرہ مٹی کے زمینی شہروں میں نہیں دلوں کی زندہ و پائندہ روحانی بستیوں میں ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ساڑھے چار ہزار برس پہلے مٹی اور پتھروں کے ٹکڑوں سے جوڑ کر ایک بوڑھے ہاتھ سے تعمیر کی ہوئی ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے بلند کی ہوئی خدائی عظمت کی پکار پر آج بھی ہر سال دنیا کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے نشیب و فراز و بلند و پست سے سمٹ سمٹا کر لو کھنچ کھنچا کر قافلے اُمنڈ آتے ہیں۔ حالانکہ وہ آواز مٹی کے بنے ہوئے کانوں میں گونج پیدا کرنے کی خاطر نہیں آرہی ہے اور نہ ہی وہ دیواریں دنیا کی کوئی اچھوتا اور خوبصورت محل ہیں، جو "انسانی آرٹ" کا قابلِ فخر کارنامہ ہو سکیں اور جس سے ظاہر بین نگاہیں دل کشی و دل رُبائی کے نادر نمونوں کی چمک دمک اور خیرگی پا سکیں۔ اس کی طرف والہانہ کھنچے والوں کے ہجوم میں کون جا سکے۔ وہ کوئی زمینی شہر

کی خوبصورت عمارت تو نہیں وہ تو دلوں کی ایک بستی ہے جیتی جاگتی۔ اور چلتی ہوئی۔ کون وہ نظر پیدا کر سکے جو دنیا میں ان دو عظمتوں کے نقوش میں تقابلی [illegible] اور نظارے کا حوصلہ خود میں پیدا کرے اور دو "ہاتھوں کے فرق" کو دیکھ سکے۔

وگرنہ بظاہر ہونے کے باوجود کہ ایک ہاتھ کے دو نقش میں یہ دوسرا نقش جس میں اسلامی غیرت کے تمام تر دینی و ملی احساس کو ہند کے اسلامی شہنشاہ نے دفن کر دیا ہے۔ اپنی عظمت کی دھوم ہوا سے جانے خاطر کی سہارے کا طرح تو اپنی پیشانی پر نہ سہار [illegible] اس نے انسانی ظرف کو چھلکا دیا۔ مگر ظرف کے اس چھلکاؤ پر اس کی نظا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مزار و مقبرہ ہی [illegible] رہا جس کے سونے شونے پڑے ہوئے در و دیوار پر مزار [illegible] بیان نے چراغ نے گل ہونے پر پروانہ سوز دنے صدائے بلبلے [illegible] احساس کے کانوں سے گزرتی تیر کی طرح دل میں پیوست ہوئی جا رہی ہیں۔ یہ مسجد جس کے کھنڈر نما [illegible] پر زاغ و زغن بوم و شپرہ شب و روز مرثیہ خوانی کیا کرتے ہیں [illegible] آنے والی آنکھوں میں آپ اپنے پر ایک طنز ہے۔ وہ [illegible] معنوں میں ایک ماتم کدہ ہے جو اپنے وجود بخشنے والے محسنین کے کھوئے ہوئے [illegible] پر ماتم کر رہی ہے۔ میرا دماغ احساس کا ایک جو الامکھی بنتا جا رہا تھا اور فکری لاوا پھٹنے کے قریب تھا۔

(۴)

"[illegible] دیکھ لیا کہو کیسا پایا" اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ [illegible] انور آئے تھے جو اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ایک [illegible] کوشش کرتے ہوئے بول رہے تھے۔

"[illegible] انور بھائی جیسا کچھ سنا تھا اس سے کہیں [illegible] پایا" میں نے درد کے ساتھ جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک ہے میرے بھائی" انور نے کہا میرا بھی یہی [illegible] ہے کہ تاج اس سے کہیں آگے ہے جتنا ہم اس کے بارے [illegible] آئے تھے۔ اچھا حامد تمہارا کیا خیال ہے؟"

دوسرے ہی تیزی سے بول پڑا "کیسا خیال!"

"یہ کہ میں اپنے تاثر کو ایک نغمے کا روپ دوں گا، ایک بالکل [illegible] اور اچھوتا نغمہ وہ جس کی گونج دنیا کو چونکا دے۔ اور اس بستی کے مکینوں میں ایک ہلچل ڈال دے۔ وہ نغمہ کہ جس میں اب تک کی دنیا کی نظروں سے اوجھل شدہ حقیقتوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کے ابھار کو سموؤں گا"۔

"اور وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تاج تو بھی باعث رسوائی اسلام ہے"؟ انور گنگنانے لگے۔

انور نے جیسے میرے دل کی بات کہہ دی۔ "اچھا یہ مطلع عرض ہو رہا ہے"، میں نے کہا۔

"نہیں یہ ہو گا مقطع" انور بولے۔

اور میری نظروں تلے تصور نے انور کا پورا نغمہ پھیلا دیا۔ ایک اچھوتا شاہکار ہو گا یہ میرے نوجوان شاعر کا۔ میں سوچنے لگا۔

"کتنی بھولی ہے حامد یہ دنیا" انور نے میرے خیالات کی رو روک دی "وہ تاج کو شاہجہاں کا ایک قابل فخر کارنامہ قرار دیتی ہے۔ اور محبت کا ایک انمٹ نقوش گردانتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے۔ اور اس کا شاہد میری آنکھیں اس کے ایک ایک نقش میں کر رہی ہیں کہ تاج ظلم و جور کا ایک بار ہے خدا کی مقدس زمین پر۔ جتنا کے بلوریں جھلملاتے شیشے میں دکھائی پڑنے والے عکس کے ماورا اس مادی لباس پر تمام تر قوم و ملت کے کاڑھے پسینوں، غریبوں اور مفلسوں کے خون تڑپتے ہوئے قطروں، بے نواؤں اور غمگساروں کے آنسوؤں کی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ اس کی بنیادوں کی ایک ایک اینٹ سے خون کی بو آ رہی ہے۔ یہی اگر ایسا ہوتا کہ شاہجہاں اپنے ہاتھوں سے تنکوں کو جمع کر کر کے ہوش کا ایک چھپر ڈال دیتا تو وہ محبت کی ایک امٹ یادگار ہوتی" انور پورے جوش بھرے انداز میں کہہ رہے تھے اور خدا جانے کیا کیا کہہ جاتے کہ میں بول پڑا۔

"اچھا اس نظریے ـــــــــــــــ بھائی انور آپ اس خیال میں اچھے خاصے ترقی پسند سے نظر آ رہے ہیں"۔

"کہہ سکتے ہو تم" انور نے کہا۔

"اور میں" میں نے بات کو ایک ادبی موڑ دے دیا "تو دل کی دنیا میں روح کے زندہ احساس کے صفحات پر خون کی ایک لکیر کھینچوں گا جس میں تاج کی پوری داستان سمیٹ دوں گا۔ دنیا والوں کے سامنے تاج کی کہانی ایک اور ڈھنگ سے آئے گی جو

انھیں نظر کا ایک اور انداز دے سکے"۔
"اور وہ کس طرح سے" انور نے پوچھا۔
پھر میں کہتا رہا اور دل کا بخار اُگلتا رہا۔
انور بولے "اور میں کیا کہنا چاہتا ہوں تم سمجھے، وہ تو ایک تمہید سی تھی۔ بات سامنے لانے کی، جو تمہارے سامنے آئی، وگرنہ ہم دونوں ظاہری دنیا میں ہمسفر ہونے کے ساتھ ساتھ خیالاتی اور احساساتی ہمسفر بھی ...."
اور میں گنگنانے لگا "تاج تو بھی باعث رسوائی اسلام ہے"۔
"مگر! انور کہنے لگے "کتنی نظریں ہوتی ہیں اور دیکھنے کے کتنے زاویے"۔
"مگر واقعی دیکھنا کتنا دشوار ہوتا ہے" ...... اور پھر
"اور اس نظر کا پیدا ہونا" میں نے کہا۔
"ہے تو سہی، مگر دنیا ہے گی ...." انور ایک گہرا سانس لے کر خاص تاثر کے انداز میں بولے۔
اور میں بیچ ہی سے بول پڑا ——— !
"کم از کم اتنا تو کہ یوں بھی دیکھتے ہیں"!

O

آج کل کی تفریحات دوسروں کے نقطہائے نظر یعنی دوسروں کے بنائے ہوئے ریڈیو کے پروگراموں یا سینما کے فلموں کے تابع ہوتی ہیں۔ اس لئے ان غلامانہ تفریحوں سے ہماری تفریحی اُمنگیں اور خوش باشی کے ولولے روز بروز افسردہ اور مردہ ہوتے جا رہے ہیں، اور اپنی تفریح کے سامان خود کرنے کی خواہشیں اور صلاحیتیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر آج کل کی میکانکی تفریحات یونہی ہم پر مسلط رہیں اور آرام طلبی بھی ہمارے تفریحی پروگراموں کی ضروریات میں داخل ہو گئی تو خود ساختہ تفریحوں کی فرحت اور مسرت سے ہم بالکل ناآشنا ہو جائیں گے اور ہمارے اندر خود اپنے آپ کو خوش کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی جس سے ہماری زندگیاں بالکل ہی بے کیف اور میکانکی ہو کر رہ جائیں گی۔ خدا اس دن سے نوعِ انسان کو بچائے"!

(ماخوذ)

محمد یٰسین تسکین

غزل

جنونِ محبت کی راہیں بہت ہیں
نظر چاہیئے جلوہ گاہیں بہت ہیں

جہاں در جہاں سیرگاہیں بہت ہیں
طلب ہی نہیں ورنہ راہیں بہت ہیں

سجائی تو ہے بزم ساقی نے لیکن
دلوں کی کمی ہے نگاہیں بہت ہیں

قدم رکھ نہ غیروں کے نقشِ قدم پر
ترے سامنے اور راہیں بہت ہیں

جبیں تیرے در پر جھکی تھی نہ جب تک
سمجھتے تھے ہم سجدہ گاہیں بہت ہیں

یہ کیا ہے مقام اے جنونِ محبت
کہ منزل نہیں اور راہیں بہت ہیں

ذرا حُسن پیدا تو کر زندگی میں
تری منتظر جلوہ گاہیں بہت ہیں

کوئی مردِ حق ہی نہیں ورنہ تسکیںؔ
مساجد بہت خانقاہیں بہت ہیں

دو غزلیں

نجم الاسلام

●

کیا خوب ہے سعیِ مصلحانہ
کچھ اور بگڑ گیا زمانہ

ہر شے پہ گماں حقیقتوں کا
اور اصل حقیقتیں فسانہ

ہر سمت بلائے خود فریبی
ہر سمت غرورِ عامیانہ

بھٹکی ہے کہاں کہاں خرد بھی
بہکا ہے کہاں کہاں زمانہ

اے درسِ نشاط دینے والے
دے کوئی پیامِ غازیانہ

●

دیکھ تو محرومیِ چمن
دل بے نور آنکھیں روشن

ساتھی ساتھی کا دشمن
ہائے غضب دنیا کا چلن

ابرِ کرم کے پردے میں
آج ستم ہے صاعقہ زن

کھوئی کھوئی ہے دنیا
بہکا بہکا سارا وطن

ایک ہی جامِ نفرت سے
تلخ ہیں اب تک کام و دہن

تھوڑی اس کی ہر تخریب
ٹھہرا جب دیوانہ من

ہائے وہ پس ماندہ رہرو
ٹوٹ پڑے جس پر رہزن

ابوالبیان حمّاد

●

کہیں کوندی ہے پھر برقِ بلا کیا تمناؤں کا خرمن جل گیا کیا
تپش کیا، درد کیا، کرب و بلا کیا ملی ہے ہم کو بھی سوغات کیا کیا
فلک تھرّایا کانپ اُٹھی زمیں بھی مرا دلدوز نالہ کر گیا کیا
کوئی مجھکو ذرا یہ تو بتا دے شہیدِ آرزو کا خوں بہا کیا
کسی کو اور بھی دنیا میں یارب ملا ہے یہ دلِ درد آشنا کیا
محبت کی ابھی تو ابتدا ہے نہیں معلوم ہوگی انتہا کیا
بُھلایا ہے جو پیمانِ محبت نہیں ہے پاسِ ناموسِ وفا کیا
کسی کی سمت کھنچکر جا رہا ہوں مرے جذبِ دلی کا پُوچھنا کیا
وفا ہے اقتضائے عینِ الفت مرا دل، اور ہوگا بیوفا کیا
میں ہوں تصویرِ درد و پیکرِ غم بتاؤں کیا کہ اپنا مدعا کیا
الٰہی آگ سی دل میں لگی ہے کوئی مجھ سا بھی ہوگا دِلجلا کیا
دعا وہ ہے کہ جو قسمت بدل دے نہ ہو تاثیر جس میں وہ دُعا کیا
جہانِ درد ہے سینہ میں پنہاں سُنائیں ہم اُنھیں اپنی کتھا کیا

کوئی حمّاد کو پھر سے جگا دے
فسانہ کہتے کہتے سو گیا کیا

ابو محمد امام الدین رامنگری

●

یہ دلکش سماں، یہ حسیں رات ساقی یہ پھولوں کا موسم، یہ برسات ساقی
جو بہکے ہوئے ہیں خیالات ساقی تو قابو سے باہر ہیں جذبات ساقی
ترے جشن کی آج ہے رات ساقی مری آج تو ہو مدارات ساقی
جو مجھ پر ہوں تیرے عنایات ساقی تو ہر رات ہو جشن کی رات ساقی
تری مست آنکھوں میں کچھ پڑھ رہا ہوں سمجھتا ہوں تیرے اشارات ساقی
نہ آئیں گے کیا دور میں جام و مینا گذر جائیگی کیا یونہی رات ساقی
یہ بزمِ جہاں بزمِ بے نُور ہوتی نہ ہوتی جو اس میں تری ذات ساقی
عنایت تری چاہیئے میکشوں پر گھٹا کیا ہی؟ کیا شے ہی برسات ساقی
تری بخششِ بیکراں پر ہیں شاہد ترے لطف ہائے بدیہات ساقی
مری زندگی کے ہیں روشن حقائق ترے لطف کے چند لمحات ساقی

عقیدے میں حافظ کے الہام وہ ہے
جو نکلے زباں سے تری بات ساقی

حفیظ میرٹھی

ایک جائزہ

"ادبیات نمبر" کی نظمیں

(اس مضمون میں "ادبیات نمبر" کی نظموں کے پس منظر میں نئی مقصدی شاعری پر تبصرہ ملتا ہے ———— ادارہ)

"انوار" کے ادبیات نمبر میں فہرست کی رو سے انیس یا اٹھارہ شاعروں کی اکیس تخلیقات شامل ہیں جن میں دو غزلیں ہیں، چودہ پابند یا تقریباً پابند منظومات دو معرا نظمیں، دو آزاد نظمیں اور ایک گیت۔ دو قطعات، ایک شعر اور ایک نظم کو فہرست میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ شعر اور قطعات کے شامل فہرست نہ ہونے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے مگر نظم کا وہ جرم نہ معلوم ہو سکا جس کی پاداش میں اس بیچاری کو ایک چھوڑ تین سزائیں بھگتنا پڑیں۔ ایک تو درج فہرست نہیں دوسرے بے عنوان ہے اور تیسرے برادری باہر یعنی انجمن نظم میں رونق افروز ہونے کے بجائے محفل افسانہ میں درد تہہ جام بن کر رہ گئی ہے۔

حصۂ نظم کا افتتاح نجم الاسلام کی "ادبیات" سے کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یہی نظم سب سے زیادہ مناسب بھی تھی۔ تعمیر پسند فنکار نے اپنے مخصوص ادبی نقطۂ نظر کا اظہار بڑی جامعیت سے کیا ہے۔ ذیل کے اشعار ادب کے ساتھ اس ہونہار شاعر کی شیفتگی، خلوص اور دل سوزی کا پتہ دیتے ہیں۔

چمن چمن میں پیام سحر کے چرچے ہوں — کلی کلی کو بناؤں میں رازدار ادب
اسے پیام حقیقت سے آشنا کر دوں — مچل رہی ہے تمنائے بے قرار ادب
ہر ایک ذہن کو بخشوں وہ مرکز تخئیل — کہ پھر رہے نہ زمانے میں خلفشار ادب
ادیب پیکر ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں — وہ خامکار ادب ہو کہ پختہ کار ادب

اس نظم میں دو ایک مقالات ایسے بھی ہیں جن پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دینا بیجا نہ ہوگا مثال کے طور پر ایک شعر ہے۔

خوشا وہ فکر سخن دے گئی جو حق کا پیام — زہے وہ جس نے فزوں تر کیا وقار ادب

پہلے مصرعہ کا "CONSTRUCTION" اس بات کا متقاضی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں زہے وہ کے بعد 'فکر سخن' کی قسم کی کوئی چیز ہونی چاہئے مگر شاعر نے اس ضرورت کا احساس نہیں کیا اور شعر میں نقص باقی رہ گیا۔

ابوالبیان حماد نے 'بہار' سے کچھ نئی کیفیتیں حاصل کی ہیں۔

فکر پاکیزہ ہے ہم آہنگ رہ ہمراز بہار — پھر نہ کیوں ہو جائے رنگین و سرافراز بہار
اللہ اللہ موسم گل کی بہار آرائیاں — یہ ہے اعجاز حقیقت یا ہے اعجاز بہار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، کالے کالے سے ہیں رنگ — درحقیقت ہے نرالا سا یہ انداز بہار

جہاں تک فن کی پختگی کا تعلق ہے یہ نظم اس کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ مگر انداز بیان کی رنگینی کے نیچے مقصدیت کے خدوخال حُسن ظن کی خوردبین کے بغیر مانی سے نظر نہیں آتے۔ حماد صاحب کی یہ خصوصیت کچھ اسی نظم کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ میری نظر سے ان کا جتنا کلام گذرا ہے اس کا بڑا حصہ میں نے یہی پایا ہے۔ ان کی منظوم تخلیقات کا مطالعہ اگر زبان کی صحت و صفائی کے خیال سے کیا جائے تو زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ "بہار" میں بھی ان کی کہنہ مشق سے نکھار پیدا ہے۔ محض ایک شعر بلکہ ایک مصرعہ ایسا ہے جو اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔

کیا چھپے گی بھی عروس گلشن ہستی کی جوت　　　غنچہ ہائے نوشگفتہ جب ہوں غماز بہار

"کیا چھپے گی بھی" کے ٹکڑے کی جگہ اگر "چھپ سکے گی کیا" یا "چھپ نہیں سکتی" کی قسم کا کوئی ٹکڑا رکھ دیا جاتا تو مصرعہ زیادہ چست ہو جاتا۔

"فریب نظر" میں ابوالمجاہد زاہد نے نئے ہندوستان کی زبوں حالی کا جائزہ لیا ہے۔

بعد مدت جگمگائی صبح آزادی تو کیا　　　جوش پر ہے آج بھی تاریک اجالوں کی بہار
گونجتے ہیں آج بھی شیطاں کے خونیں قہقہے　　　آج بھی انسان میں حیوانیت ہے آشکار

ظاہری . . . . خرابیاں تو سب کے سامنے ہیں مگر زاہد نے اس بنیادی خرابی کی طرف اشارہ کیا ہے جو تمام خرابیوں کو جنم دینے والی ہے۔

بڑھ رہی ہے آج بھی لامذہبیت کی لیسانار　　　آج بھی انسان ہے اپنے لئے قانون ساز
بے خدا بندوں کے سر میں ہے خدائی کا جنوں　　　آج بھی نظروں سے پوشیدہ ہے بدامنی کا راز

مقصدیت کے لحاظ سے "فریب نظر" ایک اچھی نظم ہے، فن کے اعتبار سے بھی اس کو برا نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی دو چار مقامات ایسے ہیں جہاں سے گزرتے ہوئے باذوق طبیعتیں ایک قسم کی کھٹک محسوس کرتی ہیں۔

"خوشیوں کا باب" "مجبور استبداد" اور "شاداب دھوپ" پر زاہد صاحب ایک مرتبہ اور غور فرمائیں تو انشاءاللہ کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔

اے۔ ایس زیدی کے "اشارے" بھی معنی خیز ہیں۔ صورت حال کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے۔

یہ ضلالت کے ڈھیر، یہ انساں　　　لا دے ذلتوں کے بار گراں
تجزیوں کی حسیں راہوں پر　　　ٹوٹی ٹوٹی سی رہگزاروں پر
منزلوں کے نشاں نہیں معلوم　　　مطمئن عزم راستی معدوم
ہیں رواں جھوٹے سہاروں سے　　　پھر بہک جائیں گے کناروں سے

زیدی، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے اس قافلہ کی مضحکہ خیز حرکتوں کا صرف تماشائی بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ روشنی بھی دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر قافلے والوں کے دل تلاش حق کے جذبے ہی سے خالی ہوں تو اس کا کیا علاج۔

منزلوں پر چراغ جلتے ہیں　　　اور اندھیروں کے دل دھڑکتے ہیں
ان چراغوں کی کچھ طلب تو ہو　　　ان ارادوں میں اک لپک تو ہو !

نمایاں زبان پر کم قدرت ہونے کی وجہ سے ایک آدھ جگہ ابہام کا پردہ ضرورت سے زیادہ دبیز ہو گیا ہے اور کہیں کہیں اشعار کے درمیان خلا بھی پایا جاتا ہے۔

اگرچہ نظام باطل کی منحوس شب اپنے اندر بے شمار ہولناکیاں رکھتی ہے مگر ارشد کاظمی اس خونیں رات میں بھی امن و مسرت کی سحر کا پیغام دیتا ہے اور اس شعور کے ساتھ کہ اس سحر کا خورشید روحانی فضاؤں سے نہیں بلکہ سعی و ایثار کی پرخطر وادیوں سے طلوع ہوتا ہے۔

تیری افسردہ نگاہوں سے بھی واقف ہوں میں　　　اپنے افکار کی تکمیل بھی کرنا ہے مجھے
یاد ہیں تیری محبت کے ترانے لیکن　　　اپنے ماحول کو تبدیل بھی کرنا ہے مجھے

ارشد ایک پختہ کار شاعر ہیں مگر "پیغام سحر" میں بعض جگہ ان کی اس خصوصیت کا ثبوت نہیں ملتا ـــ مثلاً

یہ ستم خوردہ یہ انسانوں کی زندہ لاشیں　　　ان بچاروں کو تو احساس زیاں تک بھی نہیں

آہ یہ بے بس و مجبور و شکستہ فطرت　　　　کیسے خاموش ہیں گویا کہ زبان تک بھی نہیں

اور

"تاکہ ان بے بس و بے کس کا سہارا ڈھونڈھوں"

اور

"زندگی موت کے سلچے میں اتر جائے گی"

ارشد جس طرح "پیغام سحر" میں نقیب نورین کر نمودار ہوئے ہیں اسی طرح امید میں بھی بہت پرامید نظر آتے ہیں۔

وہ بڑھ گئے ہیں مہیب سائے، نظر نظر میں فریب پنہاں　　　　خلوص رسوا ہوا جہاں میں وفا کے پیکر میں دندناتے

یہ ہلکی ہلکی صدا اٹھی ہے وفا کے پیکر نکل رہے ہیں　　　　وفا کے پیکر نکل رہے ہیں جفا کے پیکر سنبھل رہے ہیں
لپکتے شعلے ابھر چکے ہیں، سلگتے نالے بکھر چکے ہیں　　　　ستم کے بانی بڑی ہی سرعت سے اپنی فطرت بدل رہے ہیں

ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے شاعر کی خوش فہمی ہو[۵] مگر اتنا تو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ خلوص کی رسوائی تیزی سے ختم ہو رہی ہے اور جس دن یہ رسوائی نیکنامی میں تبدیل ہوگئی اسی روز وفا کے پیکر وفاشعاروں کے درمیان ہوں گے۔ ابھرے شعلے دور دور تک بھڑکیں گے اور ستم کے بانی بھی اپنی فطرت بدلنے پر خود کو مجبور پائیں گے۔

عبدالباسط مقصد کی "جادۂ منزل" نے نعیم صدیقی کی تائید کی ہے۔ وہی شدت احساس ہے۔ وہی روانی اور وہی طنطنہ۔ یہاں تک کہ نئی بداحتیاطی بھی وہی۔

۱؎
شاہی کے فسانے ختم ہوئے　　　　جمہور کی سالاری آئی
پر اونچے اونچے محلوں میں　　　　بجتی ہے ابھی تک شہنائی

۲؎
یہ صحرا، دریا، یہ جل تھل　　　　یہ محل، یہ ڈیرے کس کے ہیں؟
یہ کھیت یہ دولت یہ کانیں　　　　یہ چاند ستارے کس کے ہیں؟

۳؎
ہم اس کی شاہی منوانے　　　　ماحول سے لڑتے جائیں گے
دامن کو بچا کر ہر صورت　　　　کانٹوں سے گذرتے جائیں گے

۴؎
وہ شاہ ہے شاہی اس کے لئے　　　　سب اس کے عاجز بندے ہیں
ہر رنگ و نسل ہر ملت کے　　　　معبود اسی کو کہتے ہیں

۵؎ یہ سطور ۱۳ رمئی سے پہلے لکھی گئی تھیں۔ میں اس وقت بھی ان میں کسی خاص تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتا مگر کل کی خوش فہمی کو آج بصیرت تسلیم کئے بغیر بھی چارہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شاعر فن کے ساتھ ساتھ روحانیت میں بھی ترقی کر رہے ہیں۔

✧　　✧　　✧

"سلسلہ" کوئی مستقل نظم نہیں ہے بلکہ انور اعظمی کی سات رباعیات کا مجموعہ ہے۔ انور صاحب نے رباعی کو "مسلمان" بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ کام ہمارے نوجوان فنکاروں کے بجائے اگر کچھ بزرگ انجام دیں تو زیادہ مناسب ہے چونکہ اس صنفِ سخن کے اوزان و بحور سے گذرنے کے لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے جہاں نئے خون والے ہزار احتیاط کے باوجود اکثر "پھسل" جاتے ہیں۔

ہاں ظلم کی بنیاد پھسل جائے گی — تفریق کی دوپہر بھی ڈھل جائے گی
ہرچند کہ ہے وقت کی گراں زنجیر — اسلام کے شعلے سے پگھل جائے گی

تو سعیٔ وفا دہر میں برباد سہی — دل گردشِ افلاک سے ناشاد سہی
کچھ ہو تو نشاں زخمِ جنوں کا اے دل — منزل نہ ہو تو منزل کی جواں یاد سہی

دوسری رباعی کا چوتھا مصرعہ غیر موزوں ہے اور پہلی رباعی کا تیسرا مصرعہ ایک مختلف بحر میں جا پہنچا ہے۔ اصل بحر برقرار رکھنے کیلئے "گراں" کو "گرآں" پڑھنا ہوگا۔ جو زبان اور لغت کے اعتبار سے غلط ہے۔

سعید عقاب اپنی نظم میں ایسے ماحول سے بیزاری کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں جس کا حال یہ ہو کہ:۔

حسد کے سانپ جہاں رینگتے ہوں سینوں میں — دغا کے بھوت جہاں قہقہے لگاتے ہوں
جہاں ہو باپ کی دولت بھری دفینوں میں — جہاں کے لوگ خدا کو بھی بھول جاتے ہوں

یہاں تک تو ہم بھی متفق ہیں مگر اس بیزاری کے بعد جو قدم اٹھایا گیا ہے۔ وہ جدوجہد کا قدم نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ اسے فرار نہ تسلیم کریں۔ مگر یہ ہجرت بھی نہیں کہی جا سکتی:۔

افق کے پار جزیروں میں گا رہا ہے کوئی — مرے دماغ سے نکلے ہوئے رسیلے گیت
نہ روک، جانے دے مجھ کو بلا رہا ہے کوئی — سنا رہا ہے ستاروں کو کوئی میرے گیت

اولوالعزم شاعر کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کے گیتوں کا پیغام مجبور محض ستاروں کے لئے نہیں بلکہ اس نوعِ انسانی کیلئے ہے جس کو زندگی میں کچھ اختیارات بھی دے گئے ہیں۔

نیر مسعود نے نظم "انسانیت کی سحر" میں فروغ احمد نے راشد کی مشہور نظم "بے کراں رات کے سناٹے میں" کی آڑ لے کر طنز لطیف کے نشتر سے سرخ سویرے کی حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے۔

ٹوٹ جا ڈالے اگر اپنی جوانی کی سبیل — ذوقِ عصیاں کی قسم، لذتِ[۲] عصیاں کی قسم
دم میں ہو جائے ابھی اس شبِ آدم کی سحر — دم میں ہو جائے ابھی اس شبِ آدم کی سحر
آہ! باقی ہے مگر تجھ میں وہی شرم و حجاب — بے کراں رات کے سناٹے سے
بڑھ کے خود ہاتھ میں مینا کو اٹھا سکتے ہیں — ہوگا وہ سرخ سویرا پیدا
دینِ رندانہ میں جائز نہیں کوتہ دستی — جو مرے خواب کی ہوگا تعبیر

دوسری معرانظم ریاض الدین عاجز کی ہے۔ ماضی کے نقوش ریاض کے لئے بہت اہم ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ رجعت کا انعطاف پسند ہے۔

بلکہ اس لئے کہ ان سے اس نے رازِ حیات معلوم کیا ہے ۔

مری نگاہ میں کچھ دھند لکے ہیں[1] ماضی کے
دل و دماغ پہ اس طرح چھائے جاتے ہیں
کہ جیسے کھوئی ہوئی عظمتوں کے نام و نشاں
اسی غبار میں اپنا[2] دیار رکھتے ہیں
مگر گمان نہ کرنا کہ پیچھے پلٹا ہوں
یہ دھندلکے ہی مرے پاس آئے جاتے ہیں

آزاد نظم کی مخالفت اور موافقت میں اب تک بہت کچھ کہا جا چکا ہے مگر ہمیں اس فضول بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں دنیائے شاعری میں اگر اس کا وجود ہے تو ہم اس کے ذریعہ بھی اپنا پیغام انسانیت تک پہنچانے کی کوشش کریں گے مختلف اصنافِ ادب کے بارے میں ہماری پالیسی وہی ہے جو زبانوں کے بارے میں ہے ۔ ہماری گفتگو کے اصل موضوعات آبِ حیات اور زہرِ ہلاہل ہیں ۔ جامِ بلوریں اور کوزۂ سفالیں نہیں ۔

جس طرح ہر صنفِ سخن کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے اسی طرح آزاد نظم کی بھی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ حسین مصرعے اس میں حسین تر معلوم ہوتے ہیں مختلف بحروں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جب ایسے مصرعے نظم میں آتے ہیں تو سننے یا پڑھنے والے چاہے اصل مفہوم کو اچھی طرح نہ سمجھے ہوں ۔ مگر بے اختیار پھڑک اٹھتے ہیں ۔ کسی نہ کسی حد تک اس قسم کے مصرعے تاج العرفان عثمانی کی نظم میں بھی ملتے ہیں ۔ مثلاً

اُف گناہوں کے اندھیرے میں حیا ڈوب گئی

یا

یہ تراشے ہوئے تہذیب کے رنگیں اصنام

یا

اور دروازہ پہ لہراتے ہیں زریں پردے

کسی آزاد نظم میں اس قسم کے مصرعے جس قدر زیادہ حسین اور جتنی کثیر تعداد میں ہوں گے نظم کا تاثر اتنا ہی بڑھ جائے گا ۔ شکر کا مقام ہے کہ ادبیات نمبر کی آزاد نظمیں نسبتاً معیاری ہیں ۔ ورنہ اس سے پہلے تک ہمارے یہاں اس طرز کی جو نظمیں شائع ہوئی ہیں انھیں دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم آزاد نظموں کی تخلیق اس صنفِ سخن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے کر رہے ہیں ۔ تاج العرفان نے اپنی نظم "رفیقۂ حیات سے" میں ہمارے مجاہدوں کی ایک نہایت پاک آرزو کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے ۔

اب مرے دل میں ہے[1] اک عزم جلیل
ایک واضح ہے تصور میرا
آج پھر معرکۂ حق میں اترنا ہے مجھے
اور شیطان سے طاغوت سے لڑنا ہے مجھے
یہ تراشے ہوئے تہذیب کے رنگین اصنام
یہ زر و سیم یہ رسم اجداد
سینکڑوں لات[2] و منات
کتنے آمادۂ پیکار ہیں طاغوت یہاں
جن سے لڑنا ہے مجھے جن سے نپٹنا ہے مجھے
اور اس عالمِ کہنہ کو بدلنا ہے مجھے
کیا مرا ساتھ نہ دو گی عذرا ؟ !

آزاد نظم کے سلسلہ میں ایک ضروری گذارش یہ ہے کہ مختلف بحروں یا کم و بیش ارکان کے استعمال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے شاعر آہنگ کا لحاظ رکھنا بھی چھوڑ دیں ، آہنگ ہی وہ چیز ہے جس سے آزاد نظم صنفِ شاعری میں شمار کئے جانے کے قابل رہ سکتی ہے ۔ اس سے میری مراد یہ ہے ۔ کہ مصرعے چھوٹے بڑے ہونے کے باوجود ایسے نہ ہوں جن کو روانی کے ساتھ نہ پڑھا جا سکے یا پڑھتے وقت ذوق کو جھٹکے لگیں ۔ دو مربوط مصرعوں کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے خواہ ان کی بحریں مختلف ہوں ۔ اس کی مثال اسی نظم سے سمجھئے

(۱) اور ______ پھر

آفتاب ایک نیا نکلے گا
اپنے آغوش میں اسلام کی رحمت کو لئے
اور اس نور جہاں تاب سے پھر
جگمگا اٹھے گی دنیا[3] ساری
کیا مرا ساتھ نہ دو گی عذرا؟
تم اگر آؤ تو اک عزم نیا پا جاؤں
اک نیا عزم صمیم

یہ تو تھی ہم آہنگی کی مثال اب ذرا بے آہنگی کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصرعے آپس میں گھل مل نہیں سکے ۔

کس قدر قعر ذلت میں گرا ہے انساں
خون انسانیت کا ارزاں ہے
آگ اور خون سے ہے سرخ زمیں

یہ بے آہنگی اس نظم میں اور بھی کئی جگہ پائی جاتی ہے جس کو اہل ذوق آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں

دوسری آزاد نظم اکمل یزدانی کی ہے ۔ ایک منظر ملاحظہ فرمائیے :۔

اٹھو سالے الو[1] حرامی کے بچے
ترے باپ نے سالے دیکھی تھی کرسی
جو تو آکے بیٹھا ہے مہاراج بن کر
وہ بیچارہ[2] نتھو
جھکائے جبیں ہاتھ باندھے کھڑا تھا
کوئی بھولا بھالا سا معصوم دہقان
کسی پیر کی بارگہ میں ہو جیسے

حساس شاعر یہ منظر دیکھ کر ایک گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے اور ساتھ ہی ہمیں بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے

پتاجی بھی انسان نتھو بھی انسان
بنایا ہے دونوں کو جب اک خدا نے
تو پھر ایک کیوں کہے دوسرے کو
جو لکڑی کی کرسی پہ[4] وہ بیٹھ جائے
"اٹھو سالے الو حرامی کے بچے"
"تو انساں نہیں بے ادب جانور ہے"

اس نظم میں اکمل کا آرٹ پہلے سے بہت کچھ نکھر گیا ہے ۔ اصل میں ہمارا ادب ابھی ان منزلوں میں ہے جہاں بات کرنے کا ایسا انداز نہیں اختیار کیا جا سکتا جس سے سننے والے متوحش ہو جائیں ۔ دنیا کے ادب میں ہماری دعوت لاکھ نرالی سہی پھر بھی ہمیں اس کو ان قدروں کے سہارے آگے بڑھانا ہوگا ۔ جو دوسروں کے نزدیک ابھی کچھ اہمیت رکھتی ہیں ۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ امتیاز رنگ و نسل ، اجتماعیت اور انفرادیت کی کشمکش ۔ سماجی اونچ نیچ ، معاشی عدم توازن جنسی بدنظمیوں ۔ قومی عصبیتوں ، جنگ کی تباہ کاریوں اور روزانہ کی زندگی میں نظر آنے والی چھوٹی بڑی ان گنت خرابیوں کا علاج جزوی اصلاحات سے ممکن نہیں اور ان خرابیوں کو مستقل مرض سمجھ کر توجہ کا مرکز بنا لینے سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اصل خرابی دوسری ہی ہے اور وہی ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے ۔ یہ ہمارا ایمان ہے مگر ہم اپنی دعوت پیش کرتے وقت زندگی کے ان جیتے جاگتے مسائل سے صرف نظر نہیں کر سکتے ۔ چونکہ بنیادی خرابی دنیا کی نظر سے پوشیدہ ہے اس لئے ظاہری خرابیوں کے ماہرانہ تجزیے سے ذہنوں کو اصل خرابی کا کھوج لگانے پر اکسانا ضروری ہے ۔ یہ نظم ایک حد تک اس اصول کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے ہر خیال کے لوگوں کے سامنے بلا جھجک پیش کی جا سکتی ہے ۔ اکثر کامریڈ اس کو اپنی ہی آواز سمجھیں گے مگر اسلامی شاعر کے نقطۂ نظر کی انفرادیت اس میں بھی جلوہ گر ہے ۔ صرف ایک مصرعہ "بنایا ہے دونوں کو جب اک خدا نے" سے پوری نظم کا رخ اشتراکیت سے اسلام کی طرف پھر گیا ہے ۔

ان خوبیوں کے علاوہ اس نظم میں کچھ خامیاں بھی ہیں ۔ آہنگ کا لحاظ اس نظم میں کبھی نہیں رکھا گیا ہے ۔ شروع سے لے کر "پتاجی تھے اندر" تک یہ نقص موجود ہے ۔ دوسرے یہ کہ نظم کے پورے پلیٹ فارم میں "پتاجی" کا ٹکڑا بہت بے جوڑ معلوم ہوتا ہے ۔ اس کی جگہ "والد صاحب" یا "ابا جان" قسم کا کیرکٹر ہونا چاہیے تھا ۔ تیسرے یہ کہ "سالے" "حرامی" کے الفاظ اسلامی ادب کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے ۔ اس میں شک نہیں کہ

ان الفاظ کے استعمال سے انداز بیان کا زور بہت بڑھ گیا ہے اور جذبات کی تصویر کشی میں ان سے کافی مدد ملی ہے مگر اچھا ہوتا اگر ان الفاظ کا کام کچھ ایسے الفاظ سے لیا جاتا کہ ابتذال بھی ہلکا پڑ جاتا اور " NA URALITY " بھی برقرار رہتی آخر ہر تیاجی کے بگڑنے کا دنیا میں ایک ہی انداز تو نہیں ہے !

ایک آخری بات اور ہے مگر وہ بے اکمل صاحب کے کان میں کہنے کی اس لئے کوئی اور صاحب سننے کی زحمت نہ فرمائیں اور اگر سن لیں تو سمجھنے کی کوشش سے باز رہیں۔ کہنا یہ ہے کہ بھائی یہ "بیٹھک،" اور "بچھاور،" عام اردو داں لوگوں کی زبان تو ہے نہیں۔ البتہ اگر کسی مخصوص صوبہ میں مقامی طور پر بولی جاتی ہو تو بات دوسری ہے ۔

آج کے ہندوستان میں ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے گیتوں سے کام لینا بھی ناگزیر ہے۔ مگر اس طرف ہمارے شاعروں کی توجہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اس کا سبب غالباً ہندی زبان سے ناواقفیت ہے۔ تعمیر پسند فن کاروں کو چاہئیے کہ اس زبان کو سیکھ کر براہ راست ہندی شاعری کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد ہی ان کے گیتوں میں رس آسکتا ہے اور وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ ہندی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اپیل کر سکیں۔ دو چار سنے سنائے ہیٹنیٹ الفاظ کے بل پر ہم کتنے معرکے سر کر سکیں گے۔ پھر بھی اصغر عابدی کا یہ گیت جو ادبیات نمبر میں ہمارے سامنے ہے۔ تعمیری گیت لکھنے والوں کے لئے ایک اچھا محرک بن سکتا ہے۔ ہندی شاعری کے ایک بہت پرانے موضوع کو عابدی نے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے ۔

میں بسنت رت کی دھن گاؤں !　　　میں بسنت رت کی دھن گاؤں
تم کلی کلی کے ـــــ متوارے　　　تم پات پات کے دیوانے
تم بھینی خوشبو کے مارے　　　تم پیاری تتلی کے پیارے

میں پھول کے مالک کا متوالا　　　خوشبو کے داتا کا دیوانا
چنچل تتلی کے ناچ میں جس نے　　　پات پات کی بات میں جس نے
پریم کی اپنے ریت جگائی　　　راج کی اپنے بات بتائی

گیت کے موڑ پر شاعر نے بحر کی پٹری بدلی ہے ۔

" میں پھول کے مالک کا متوالا　　　خوشبو کے داتا کا دیوانا

اس سے پہلے جو بحر استعمال ہو رہی ہے اس میں بلا کی روانی ہے۔ ایسی رواں بحر کے بعد اس گھسٹتی ہوئی بحر نے گیت میں ایک بے سرا پن پیدا کر دیا ہے۔ ہندی شاعری سے ناآشنا حضرات کا ذوق تو اس کو اور زیادہ محسوس کرے گا۔

اسی گیت میں ایک جگہ دو مصرعے ہموزن نہیں ہو پائے ہیں ۔

تم ناچو گاؤ ترٹ پاؤ　　　بن بن گن گن چھم چھم

توجہ فرمائیے دوسرا مصرعہ "چھم چھم" کی موسیقیت پر بے خود ہو کر " ONCE MORE " کا مطالبہ کر رہا ہے۔

ادبیات نمبر میں غزلوں کی تعداد بہت مایوس کن ہے پورے حصۂ نظم میں کل دو غزلیں شامل ہیں۔ اس صنف سخن کی طرف سے تعمیری شاعروں کی یہ بے اعتنائی کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتی جدید طرز کی نظمیں مغرب زدہ نوجوانوں کو متوجہ کرنے اور اسلامی ادب سے رجعت پسندی کا

الزام ہٹانے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ مگر اردو لکھے پڑھے عوام کی بہت بڑی اکثریت کا ذوق ان سے ابھی تک ایک قسم کی وحشت اور اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ عوام اور متوسط درجہ کے باذوق لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے تو غزل سے زیادہ کارآمد اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کے ذہن اس کی سیدھی سادی ٹیکنک سے اچھی طرح مانوس ہوتے ہیں اور غزل کے اشعار میں یاد رہ جانے کی بھی سب سے زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے شعرا اس طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوں۔ ہمارے سہ ماہی غزل میں بیشتر غزلیں اس قسم کی ہیں جنہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر غزل نہیں بلکہ کوئی نظم کہنا چاہتا تھا۔ مگر مہارت نہ ہونے کی وجہ سے جب اشعار میں وہ ربط قائم نہ ہو سکا جو ایک نظم کے لئے ضروری ہے تو اس نے اس مخلوق کا نام غزل رکھ دیا۔

اس میدان میں قدم رکھنے سے پہلے غزل اور نظم کا یہ فرق ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے کہ غزل کلیات سے بحث کرتی ہے جبکہ نظم کا زیادہ تعلق جزئیات سے ہے غزل کا دار و مدار پورا شعر پر ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں اتنی جامعیت ہونی چاہیئے کہ جس مضمون کو آپ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دو مصرعوں میں سما جائے اگر اس کی وضاحت کے لئے آپ کو اسی زمین میں اور شعر کہنے پڑیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ کسی جذبہ، احساس یا خیال کو ٹھہر ٹھہر کر بیان کرنا نظم کے لئے جتنا صحیح ہے غزل کے لئے اتنا ہی غلط ہے۔

غزل کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اشاروں کنایوں سے گذر کر ان اشیا کا . . . صاف صاف نام لینے سے حتی الامکان گریز کرتی ہے جو واقعی زیر بحث ہیں اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی لطافت اور آفاقیت کھو دے گی اس کی تمثیلی انداز میں گفتگو کرنے کی ادا اسے زمان و مکان کی حدود سے بالاتر کر دیتی ہے اس موقع پر آپ سوال کریں گے کہ اگر ہم غزل میں حقائق کو کھول کھول کر بیان کرنے اور خرابیوں پر نام بنام تنقید کرنے سے باز رہیں تو لوگ ہماری غزلوں کے اشعار کا وہ مفہوم نہ سمجھ سکیں گے جو ہم سمجھانا چاہتے ہیں۔ یہ اندیشہ اپنی جگہ درست ہے مگر اس کا دفعیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے مقررین صحافی، ناولسٹ، ڈرامہ نگار اور دوسرے نثر لکھنے والے غزل کے اشعار کو اپنی تخلیقات میں اس سلیقہ کے ساتھ اور بامو قع استعمال کریں کہ پڑھنے والوں کے ذہن نشین وہی مطالب ہو جائیں جو شاعروں نے ان میں جان بوجھ کر رکھے ہیں۔ تنقیدی مقالوں میں بھی اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے تو غزل پسند حلقہ کا انداز تطبیق رفتہ رفتہ بدل جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اسلامی تحریک عملاً جس قدر وسعت اختیار کرے گی۔ عوام کے دل و دماغ پرانے تصورات سے ہٹ کر ان مسائل کی طرف رجوع ہوں گے جو ہمارے نزدیک زیادہ اہم ہیں اور اس طرح بھی اسلامی غزل کے لئے بالآخر ایک سازگار رفتہ پیدا ہو جائے گی۔ اس اندازہ کی تائید میں یہ حقیقت پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ آشیاں، صیاد، قفس، ساقی، محفل وغیرہ کے معنیٰ آج پہلے سے بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ واقعات کے خاموش مفسر نے ان الفاظ کی اتنی واضح تفسیر کی ہے کہ ابہام کی گنجائش نہیں رہی۔

عرض کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ غزل کے ذریعہ ہم اپنا مخصوص پیغام تشریحات اور توضیحات کے بغیر محض اشاروں کنایوں میں دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اور ان اشاروں کنایوں کے صحیح مفہوم متعین کرنا خود غزل کا کام نہیں بلکہ دوسری اصنافِ ادب اور اس سوسائٹی کا کام ہے جو ادب کو حقیقی اقدارِ حیات کا علمبردار دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر آیاتِ الٰہی کے غلط مطالب نکالے جائیں تو حق شناس گروہ اصل عبارت میں اضافہ کرنے کے بجائے ان آیات کا صحیح مفہوم اپنے لٹریچر اور عمل کے ذریعہ پیش کرے گا تاکہ حقیقت سب کے سامنے آجائے۔

غزل کے متعلق مجھے عرض تو بہت کچھ کرنا ہے مگر اس کا یہ موقع نہیں ان شاء اللہ کسی دوسری صحبت میں اس موضوع پر اپنی گذارشات تفصیل سے پیش کروں گا یہاں تو ادبیات نمبر میں صرف دو غزلیں ہیں۔ ایک راقم الحروف کی اور دوسری محترمہ مسز ایم۔ اے قریشی کی۔ اپنی غزل پر توجہ دلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رہی دوسری غزل سو اس کے متعلق بھی میری رائے اس نقطۂ نظر کی روشنی میں آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ یہاں اتنا اور عرض کر دوں کہ "بن جا" وغیرہ قسم کی ردیفوں کے ساتھ غزل کے اچھے اشعار شاذ و نادر ہی نکلتے ہیں۔

یہ حفنی کی نظم اصل میں ایک غزل ہے جس کو "انقلابات" کا عنوان دے کر نظموں کی صف میں شامل کر دیا گیا ہے۔ حفنی صاحب میں کامیاب غزل گو بننے کی صلاحیتیں معلوم ہوتی ہیں بشرطیکہ وہ ایک غزل میں ایک ہی مضمون کے متعدد اشعار کہنے کی کوشش نہ کریں اور شعروں کی کثرت سے زیادہ ان کی صحت کا

خیال کریں اگر وہ اپنے اشعار پر بغور نظر ثانی کر لیا کریں تو بہت سی خامیاں خود بخود دور ہو سکتی ہیں مثلاً "انقلابات" ہی کا ایک شعر ہے۔

سوز جگر تو نیر جگر ہی نہیں رہا — کیوں ڈھونڈتے ہو اب کہ حرارت کدھر گئی

تھوڑے سے غور و فکر کے بعد شاعر اس کو یوں بھی کہہ سکتا تھا۔

سوز جگر کہاں کہ جگر ہی نہیں رہا — کیوں پوچھتے ہو اب کہ حرارت کدھر گئی

اسی طرح ایک شعر میں ذم کا پہلو بری طرح نمایاں ہے۔

چھیڑا یہ کس نے آج رگ کائنات کو — پہلے تو کچھ دبی وہ مگر پھر ابھر گئی

بہتر ہوتا کہ شاعر طبیعت پر ذرا سا جبر کرکے اس شعر کو غزل ہی سے خارج کر دیتا۔

اسی غزل میں آگے ایک اور شعر ملتا ہے۔

اُف رے جنونِ عقل کی باطل پرستیاں — آزاد ہوکے دہر کو برباد کر گئی

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے 'کر گئی' کا فاعل "جنونِ عقل" میں سے 'عقل' کو قرار دیا ہے حالانکہ اصل فاعل 'جنون' ہے جو مذکر ہے نہ کہ مونث۔

نسیم احمد کی نظم ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ کچھ حصہ ملاحظہ فرمایئے۔

غریب بھوک سے مرا امیر نے شراب پی — یہ مذہبی لباس میں شکم پرست پیرجی
کوئی تڑپ کے رہ گیا کسی کو آگئی ہنسی — یہ دیوتا کے جانشیں پروہت اور مہنت جی
کسی کا گھر اجاڑ کے کسی نے داد عیش دی — یہ بستیوں میں آگئے ہیں ریچھ اور لومڑی

"نغمۂ آتشیں" میں ایک قسم کا اُبال اور "سرزمینِ مخادم" میں کسی قدر اتھلا پن پایا جاتا ہے۔ اول الذکر کے شاعر اپنے آرٹ میں تھوڑا سا ٹھہراؤ اور ثانی الذکر کے مصنف کسی قدر گہرائی پیدا کریں۔

"توبہ" "نتیجۂ فکر و احساس ہے جناب "ر" دین علیگ کا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس مقالہ کے شروع میں "انیس یا اٹھارہ" کا ایک فقرہ تحریر کیا گیا تھا اس وقت اس کی تک آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہوگی۔ اب موقع ہے کہ لگے ہاتھوں یہ معمہ بھی حل کر دیا جائے۔ اس سے پہلے ایک معرا نظم "نقوش" کے عنوان سے ریاض الدین علیگ کے نام کے ساتھ آپ کی نظر سے گذر چکی ہے اور اس پابند مگر غیر مقفیٰ نظم "توبہ" پر تحریر ہے "ر" دین علیگ۔ مسئلہ صاف ہے یعنی اگر یہ دو نظمیں دو شاعروں کی ہیں تو ادبیات نمبر کے شاعر ہوئے انیس ورنہ اٹھارہ۔

اس جملۂ معترضہ سے محظوظ ہونے کے بعد بر سر مطلب آجایئے۔ اب تک اردو شاعری میں توبہ، تقویٰ اور اسی قسم کی دوسری اسلامی اصطلاحات کو ایسے مسخ شدہ انداز میں پیش کیا جاتا رہا ہے کہ لوگ ان الفاظ کو سن کر حقارت سے منہ بنا لیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس فریب کا پردہ مسلسل چاک کیا جاتا رہے تا آنکہ اس قسم کے الفاظ اپنے کھوئے ہوئے اصل معنیٰ حاصل کر لیں۔

یوں کروں ذکر لذتِ طاعات — تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور

(حالی)

اس کام کے لئے بڑی صلاحیت، حسنِ سلیقہ اور فنی مہارت درکار ہے۔ اگر ذرا بھی ادھر ادھر ہوا گیا تو فن کار "ملاّ" بنا کر رکھ دیا جائے گا۔ "ر" دین نے توبہ ایسے خشک موضوع کو سیلے اور پرکیف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں اک نئی حیات کی روش پہ مڑ گیا ہوں آج — میں چل چلا کے منزلِ حیات پا گیا ہوں آج

میں اک مہیب دھند لکے سے دور ہو گیا ہوں آج　　　میں انبساطِ جاوداں کا راز پا گیا ہوں آج

عام طور سے توبہ کا خیال زندگی کے اس موڑ پر آتا ہے جب تائب میں اچھے یا بُرے کسی بھی قسم کے عمل کی قوت باقی نہیں رہتی۔ ایک منزل اس سے پہلے بھی آ سکتی ہے جب ایک سانس میں توبہ کی جاتی ہے۔ اور دوسرے سانس میں توڑ دی جاتی ہے۔ مگر اسلامی شاعر کی توبہ ان دونوں سے مختلف ہے وہ برائی کے راستہ کو شکستہ پا ہو کر نہیں چھوڑتا بلکہ اس سے ہٹتا ہی اس لئے ہے کہ نیکی کی راہ پر اُسے پہلے سے بھی کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ گامزن ہونا ہے۔

میں غیر حق کی ظلمتوں کو دور کر سکوں گا اب!　　　میں نورِ حق سے بزم اک نئی سجا سکوں گا اب

میں زندگی کو زندگی کا روپ دے سکوں گا اب　　　میں خود کو پا سکوں گا اور سب کو پا سکوں گا اب

غزل کے علاوہ راقم الحروف کی ایک نظم بھی ادبیات نمبر میں شامل ہے اس پر بھی تنقید و تبصرہ کا حق تو دوسروں ہی کو پہنچتا ہے مگر اپنی صفائی پیش کرنے کے سلسلہ میں یہاں مختصراً کچھ عرض کر دینا مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نظم کے چھٹے بند سے متعلق جو حاشیہ دیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ اس بند میں تنقید مارکس کی کُلیت پسندی پر نہیں بلکہ اس کے نظریۂ تاریخ پر کی گئی ہے۔ "عہدِ زریں" سے مراد سرمایہ داری کا سنہری دور ہے جس کے انسانیت سوز اندھیرے گذشتہ نظاموں کے تاریک پہلوؤں سے کہیں زیادہ ظلمت سامانیاں اپنے دامن میں رکھتے ہیں۔

اسی نظم کے آخری بند کا تیسرا مصرعہ اس طرح شائع کیا گیا ہے۔

دھماکے، زلزلے، طوفان، آندھی[1]

اس بندۂ پُر تقصیر نے "آندھی" کے بجائے "بہیم" کا لفظ رکھا تھا مگر کسی صاحب نے غالباً اس خیال سے کہ چاروں مصرعے ہم قافیہ نہ ہو جائیں یہ "اصلاح" فرمائی ہے جس سے میں متفق نہیں۔ ایک کامیاب نظم کو ہتھوڑی کی ہلکی چوٹوں سے شروع ہو کر گھنوں کی گرج پر ختم ہونا چاہیئے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے مروجہ ٹیکنک میں خفیف سی تبدیلی دانستہ کی ہے۔ بہرحال ناظرین کرام آخری بند کو اس طرح پڑھیں۔

یہ گیسیں ہیں، یہ پوڈر ہیں، یہ ایٹم　　دمادم دمادم دمادم

دھماکے، زلزلے، طوفان بہیم　　اور اس کے بعد یہ دنیا جہنم

یہی انسانیت کی انتہا ہے

مگر انسان "ترقی" کر رہا ہے

دو قطعات اور ایک شعر جو غالباً جگہ پُر کرنے کے لئے شائع کئے گئے ہیں معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ کم از کم خاص نمبروں میں اس قسم کے مواد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔ ہمارے رسائل کا نصب العین دوسرے رسالوں کے مقاصد سے بہت اونچا ہے۔ بھرتی کی پالیسی ہمیں زیب نہیں دیتی۔ اس کے علاوہ ایسی تخلیقات سے اسلامی ادب کے وقار کو ٹھیس لگنے کا بھی اندیشہ ہے۔

زبان کی کمزوریوں اور خامیوں کی طرف کسی موقع میں پہلے بھی اشارہ کر آیا ہوں۔ پھر بھی اسی قبیل کی چند خامیاں ایسی ہیں جو ترتیب مضمون کے پیش نظر اس ذیل میں شامل نہ آ سکیں۔ یہاں بھی میں طوالت کے خوف سے ان پر کچھ گفتگو کرنے کے بجائے انھیں بجنسہ نقل کئے دیتا ہوں۔ شعرائے کرام ان پر خود ہی تنقیدی نگاہ ڈال لیں۔ چونکہ یہ کوتاہیاں کچھ ایسی باریک نہیں اور میرے خیال میں نادانی سے زیادہ بے پروائی کا نتیجہ ہیں۔

"زہر بھرے ہوئے تیروں[1] سے ہو گئے مجروح"　|　"اور دنیا کچھ نہ پائے[2] گی"

"ہر طرف ہے فریب دھوکہ دشر"　|　"نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے ہیں"

"دم میں ہو جائے ابھی اس شبِ آدم کی سحر"　|　"بہت اہم ہیں وہ میری حیات کی خاطر"

---

[1] اس مصرعہ میں یہ تبدیلی اور تشریحی نوٹ دراصل حفیظ صاحب کے "سکریٹریٹ" ہی کے کسی صاحب کی کارگزاری تھی۔ (عابدی)

"نبضِ آہن و سلاسل کو بھی گرماتے ہیں"

"اب عزم کرچکا ہوں میں اب عہد کرچکا ہوں میں"

زبان اور فن کی خامیوں کے باوجود ادبیات نمبر کا حصۂ نظم واقعی قابلِ قدر ہے۔ اس کے شاعروں کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ انھوں نے محض اپنی ذہانت اور احساسِ فرض کے زور پر بہت ہی قلیل عرصہ کی مشق سے اتنے حوصلہ افزا نتائج پیش کئے ہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے میں دو ایک باتیں اپنے ساتھی شاعروں کے غور و فکر کے لئے رکھ دینا چاہتا ہوں۔

جو لوگ یہ سمجھ گئے ہیں کہ انھیں کیا لکھنا ہے وہ اب یہ جاننے کی زیادہ کوشش کریں۔ کہ کس طرح لکھنا ہے اور اس کے لئے انھیں [illegible] شاعروں کے منتخب کلام اور شاہکاروں کے غائر مطالعہ کا اہتمام بہت جلد کر لینا ہے۔ اکثر احباب ہمیں مفید مشورے دیتے وقت مقصدیت کا استعمال [illegible] کرتے ہیں۔ مگر میں ان سے متفق نہیں ہوں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اسلامی شاعروں کو اب سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی [illegible] کو انتہائی حسین اور پُر تاثیر کس طرح بنائیں ایسی منظومات جو مقصدیت سے پُر مگر دلکشی سے خالی ہوں صرف آرٹ ہی کے نقطۂ نظر سے ناکام [illegible] مقصد کے لئے بھی بے فائدہ ہیں۔ ناقدین اگر مقصدیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیں گے۔ تو ہمارے شاعر عالم بننے کی کوششوں میں [illegible] یہ کچھ اچھا نہ ہوگا۔ چونکہ ہمارا علمی مورچہ تو خدا کے فضل سے پہلے ہی کافی سے زیادہ مضبوط ہے۔ اور جو دماغ اس طرف لگے ہوئے ہیں وہ [illegible] محتاج نہیں سادیوں اور خصوصًا شاعروں کا اصل کام عقل کو اپیل کرنا نہیں بلکہ جذبات کو اپیل کرنا ہے اور جذبات کو خاطر خواہ طور پر ہم اسی وقت اپیل کرسکتے ہیں جب ہماری تخلیقات تکلف اور آورد سے پاک ہوں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم خود کو ضروری حد تک ڈھیلا چھوڑ دیں۔

اداریہ

سحر ہونے سے پہلے

رزم آرا کا قتل

گزشتہ مہینہ ایران کے وزیر اعظم جنرل رزم آرا قتل کر دیئے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قاتل ایک مسلم جماعت "فدایان اسلام" سے تعلق رکھتا ہے۔ قتل کا سبب رزم آرا کی وہ پالیسی ہے جو اس نے ایرانی تیل کو غیروں کے ہاتھ میں رکھنے کے سلسلہ میں اختیار کی تھی۔ اور "فدایان اسلام" جو اپنے آپکو ایرانی رائے عامہ کا نمائندہ کہتی ہے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ ایرانی تیل پر صرف ایران کا قبضہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے اس نے رزم آرا کو پستول کا نشانہ بنایا۔ فدایان اسلام کے لیڈر ابو القاسم کاشانی نے اس قتل کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر اور لوگوں نے بھی رزم آرا کی پالیسی کی تائید کی تو انہیں بھی جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ ان حالات سے ایسا زبردست دباؤ پڑا ہے کہ ایرانی مجلس (LOWER HOUSE) نے تیل کو قومی بنانے کا بل منظور کر لیا اور اب اس بات پر غور ہو رہا ہے کہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی مدت ۹۳ سال تھی جس کے اختتام کو ابھی ۴۳ سال باقی ہیں۔ یہ کمپنی انگریزوں کی قائم کردہ ہے اور اس میں حکومت برطانیہ اور امریکہ کے مفادات ہیں۔ اگر ایرانی حکومت نے کوئی عملی قدم اٹھایا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے براہ راست حکومت برطانیہ سے ٹکر لینی ہوگی۔ اور پھر ممکن ہے امریکہ بھی بیچ میں ٹانگ اڑائے۔ سوال یہ ہے کہ ایران میں اتنا دم خم ہے کہ وہ برطانیہ سے ٹکر لے سکے؟ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ایرانی تیل سے اہل برطانیہ کو ہٹایا جائے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف ایران ہی سے کیا سارے مشرق وسطیٰ اور ایشیا سے تمام مغربی اثرات کو جلد از جلد دور کرنا ضروری ہے۔ یہ لوگ انسانیت کا خون چوسنے والی جونکیں ہیں جو دنیا کے اتنے بڑے علاقے کے انسانوں کو خاک میں مار کر خود موٹے ہو رہے ہیں۔ پھر یہ بھی درست ہے کہ اگر یہ باتوں کے بھوت باتوں سے نہ مانیں تو انہیں لاتیں مار کر ہی نکالا جائے۔ سوال تو یہی ہے کہ کیا ان کے حریفوں میں اتنا بل بوتا ہے کہ وہ ان سے دو دو ہاتھ کر سکیں؟ اگر نہیں تو پھر کس برتے پر تتا پانی کیا جائے! جہاں تک مشرق وسطیٰ کے ممالک کا تعلق ہے اور ان میں ایران بھی شامل ہے، ان کی ہوا تو اسی وقت نکل گئی تھی جب انہوں نے اس نظام زندگی کو خیرباد کہا جو ان کے عروج و ترقی کا ضامن تھا۔ اب اس کے بغیر یہ کوئی بات کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کے غبارے میں ہوا بھری جا رہی ہے بس ایک وقتی سا ہنگامہ اور جوش اور پھر وہی خاموشی اور سکوت۔ یہ ہنگامی اور وقتی سیاست عرصے سے اس علاقے کے مسلمانوں کے پیش نظر ہے جو انہیں تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے یا پھر یہ کہ یورپ کی مختلف طاقتوں کے درمیان رہ کر ایک آدھ چال میں چل لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہم نے بڑا تیر مارا۔ گزشتہ جنگ عظیم میں ترکی نے دو مختلف طاقتوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنے آپ کو جنگ سے بچائے رکھا۔ لیکن یہ وقتی سا فائدہ کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ آج ایران بھی روس اور برطانیہ کے درمیان کھڑا ہو کر اپنے معاملات کی گاڑی آگے بڑھا رہا ہے۔ لیکن یہ ایک خطرناک کھیل ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک کے پنجہ سے نکل کر دوسرے کے پنجے میں چلے جانے کا ہر آن اندیشہ ہے۔ اصولی طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی گروہ اپنے آپ کو غیروں کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ پامردی اور فکری بنیادوں پر پہلے اپنے عوام کی تربیت کرے، اس کے بعد اپنے ملک کے نظام حکومت اور نظام سیاست کو بدلے اور پھر دوسروں سے دو دو ہاتھ کرے۔ اس کے بجائے تیز طریقہ پر محض ایک رات کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بچکانہ پن ہے۔ آج "فدایان اسلام" ہرگز کوئی مذہبی تحریک نہیں ہو سکتی۔ اس نے قتل سے اپنی جدوجہد کا اقدام کر کے سخت ترین حماقت کی ہے۔ اور اپنے بہت سے دشمنوں کو بھی یہی طریقہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

حکومتِ پاکستان کے خلاف سازش

مغربی پنجاب کے الیکشن کے دوران میں مسٹر لیاقت علی خاں نے اچانک ایک خطرناک سازش کا انکشاف کیا جس میں فیض احمد فیض، کرنل اکبر خاں چیف آف اسٹاف پاکستان آرمی، بریگیڈیئر ایم۔ لطیف اور دوسرے روشن خیال بیگمات کو ملوث بتایا گیا ہے۔ ان لوگوں کا منصوبہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لیاقت علی خاں اور پاکستانی حکومت کے دیگر وزراء کو ایک ساتھ گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے جس کے بعد فوجی حکومت قائم کر دی جائے اور پھر رائے عامہ کی تائید حاصل کرنے کے لئے کشمیر پر بھارت کے خلاف چڑھائی شروع ہو۔ بتایا گیا ہے کہ اس سازش میں کمیونسٹ روس کا درپردہ ہاتھ ہے اور اب کمیونزم سامنے سے انقلاب برپا کرنے میں ناکام ہو کر پیچھے کے دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

جہاں تک اس سازش اور اس کے عقب میں کام کرنے والے عناصر کا تعلق ہے ان کی حقیقی صورت حال کے بارے میں تو فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے اسباب، اثرات و نتائج اور آئندہ کے امکانات بالکل روشن ہیں۔

۱- پاکستان بننے کے بعد سے لیاقت علی خاں اور ان کے حصہ دار وزراء نے پاکستان میں ایسی حکومت قائم کر رکھی ہے جس کا دار و مدار کسی اصول اور نظریہ پر نہیں ہے بلکہ صرف سیفٹی ایکٹ اور حکمران طبقے کے بلا روک ٹوک اقتدار پر ہے۔ چنانچہ یہ سازش اس اقتدار پرستی اور طبقہ وارانہ آمریت کا قرار واقعی ردعمل ہے۔ جو اگرچہ بیجا سہی لیکن اس کے اسباب کے ذمہ دار سازش کرنے والوں سے زیادہ خود سازش سے الگ رہنے والے ہیں۔

۲- پاکستان اگرچہ نام کے اعتبار سے "اسلامی مملکت" کہلاتا ہے مگر اصل میں یہ ایک غیر اسلامی قومی اسٹیٹ ہے یہاں اب تک نہ کوئی اسلامی اصول نافذ ہوا اور نہ اسے نافذ کرنے کا موجودہ حکمران ارادہ رکھتے ہیں بلکہ یہ لوگ الٹا اسلامی اصولوں کو نافذ کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کو پاکستان کا غدار کہتے ہیں۔ لیکن اس سازش سے اندازہ ہوتا ہے کہ غدار کون ہے؟ آج کے زمانے میں کوئی قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ قومی غداروں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اب قومی محبت کا دور ختم ہو چکا ہے یہ زمانہ صرف اصولی تحریکوں یا طبقہ وارانہ تحریکوں کا ہے۔ جو لوگ نادانی سے قوم پرستی اور وطن پرستی کو اپنے لئے ضروری سمجھ رہے ہیں وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں۔ دنیا کی تمام قومی جمہوری لادینی ریاستوں میں اصولی بنیادوں پر کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے اور یہ کشمکش کسی نہ کسی کروٹ بیٹھنے والی ہے اس لئے ان قومی ریاستوں کے لئے ضروری ہے کہ اب قوم پرستی کا ڈھول پیٹنا بند کر دیں اور کوئی ٹھوس نظام زندگی رکھتے ہوں تو اسے پیش کریں۔ ورنہ یہ قوم قوم چلاتے رہیں گے اور قوم والے ان کی بغل میں سے اٹھ کر ان کے اقتدار کا تختہ الٹ دیں گے۔ اب تمام قوم پرست ملکوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے سائے میں ہزاروں "غداران قوم" پل رہے ہیں اور یہ لوگ اصول کی بنیاد پر کسی وقت بھی موجودہ حکمرانوں کے پیروں تلے کی زمین سرکا سکتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے متعدد بلاکوں میں روسی اور امریکی بلاک نمایاں ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے ذیلی ملکوں کو توڑنے کے لئے طرح طرح کے کھیل کھیل رہے ہیں۔ امریکہ مشرقی یورپ ...... مشرقی وسطیٰ اور ایشیا میں عجیب و غریب سازشیں کر رہا ہے اور روس یورپی ملکوں اور ایشیا میں مغرب کے چیلے چانٹوں کی خلاف اسی قسم کی کوششیں کر رہا ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے کہ اس سازش میں روس کا ہاتھ ہے اور فیض احمد فیض روس سے متعلق ہو چکے ہیں تو پھر یہ سازش بھی روس ہی کی ایک چال ہے جس کا خاکہ فیض کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ماسکو میں بیٹھ کر بنایا گیا ہے۔ اس واقعہ سے ان تمام ملکوں کو ہوشیار ہو جانا چاہئے جو کمیونسٹ ملکوں کے کندھے سے کندھا لگائے بیٹھے ہیں۔ گرفتار شدہ بیگمات کا کردار بھی قابل غور ہے۔ اس وقت پاکستان میں بڑے زور شور سے "عورتوں کی آزادی" کی تحریک چل رہی ہے اس تحریک میں زیادہ تر پاکستان کے حکمران طبقہ کی بیگمات شریک ہیں۔ یہ خواتین چاہتی ہیں کہ پاکستانی عورت کو ان اصولوں پر چلایا جائے جن پر روس برطانیہ اور امریکہ کی عورت چل رہی ہے۔ کیونکہ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر پاکستان میں "خدانخواستہ" اسلامی اصول رائج ہو گئے تو پھر ان پر زبردستی پردے کی لعنت مسلط کر دی جائے گی۔ اور سارا عیش کرکرا ہو جائے گا۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ اس ڈر سے ان کی بعض نمائندہ خواتین نے ایک ایسا نظام لانے کی خاطر جو ان کے عیش اور "آزادی" کا خیر خواہ ہے اس سازش میں ہاتھ بٹایا ہو۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نوع کی تمام خواتین بیگم اکبر خاں اور ان کی ساتھیوں کی طرح اپنے "عیش" کی خاطر پاکستان سے غداری کو ترجیح دیں گی لیکن اس قسم کی خواتین میں ایک بڑا گروہ ضرور ایسا موجود ہے جو یقیناً پاکستان کا غدار ہے۔ اگر لیاقت علی خاں سلسلہ وار ان بیگمات کی تحقیقات کرائیں تو ان پر درون خانہ کے کئی راز اور منکشف ہو سکتے ہیں۔

۵۔ یہ خیال کہ اس سازش کا دائرہ اثر صرف ان چند اصحاب تک محدود ہے جو گرفتار کئے گئے۔ یا اسی نوع کے کچھ اور اصحاب ہیں جنہیں چھان بین کے ذریعہ نکال دیا جائے تو بس پھر فضا صاف ہو جائے گی۔ قطعاً غلط اور لغو ہے۔ دراصل اس سازش کے انکشاف کا صرف یہ مطلب ہے کہ زیر زمین ثابت سا لاوا پک رہا ہے ایک مستقل گروہ اس طرز پر سوچنے والوں کا موجود ہے۔ اور یہ گروہ فوج، سول دفاتر، صحافت ہر شعبہ زندگی میں گھسا ہوا ہے اور چوٹی کے آدمیوں پر اپنا اثر رکھتا ہے۔ اس کو پاک کرنے کی صورت صرف یہ نہیں ہو سکتی کہ چند گنے چنے آدمیوں کو گرفتار کر لیا جائے بلکہ فتنے کے دفعیہ کی صحیح صورت صرف یہ ہے کہ ہمہ گیر فکری بنیادوں پر پوری سوسائٹی میں ایک انقلاب برپا ہو اور سارا نظام صرف ان لوگوں سے بنایا جائے جو کردار کے اعتبار سے آزمائے ہوئے اور خدا ترس ہوں۔

۶۔ اس سازش کے انکشاف سے پاکستان کے مستقبل پر ایسی ہی سازشوں کے کچھ اور سائے بھی لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں دراصل اس ایک سازش نے دوسری بہت سی سازشوں کو راستہ بتا دیا ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ سازشوں میں روسیوں کا ہاتھ ہوگا یا امریکیوں اور برطانیوں کا لیکن ایک ایسی سوسائٹی میں جو جاہ طلبوں، دنیا داروں اور منفعت پرستوں سے بھری ہوئی ہو۔ جس کے بڑے بڑے لوگوں نے عین قتل و خون کے ہنگاموں میں صرف اپنے ذاتی بچاؤ کی فکر کی ہو اور قومی خودداری کو روپے اور عہدے کے عوض فروخت کیا ہو ۱۹۴۷ء آخر اس طرح کے فتنوں کو ابھر آنے کو کون روک سکتا ہے۔

مسٹر لیاقت علی خان اور مسلم لیگ والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ زلزلہ جو موجودہ حکومت کے ایوانوں کو ہلاتا ہوا گذر گیا کوئی معمولی چیز نہیں تھی یہ قدرت کی جانب سے پاکستان والوں کو پہلی تنبیہ ہے اگر اس پر وہ ہوشیار نہ ہوئے اور انہوں نے اپنے آپ کو ٹھیک نہ کیا تو پھر اس طرح کی اور ایک آدھ تنبیہ کے بعد پاکستان کا خدا ہی حافظ ہے۔

ہندوستانی کلچر

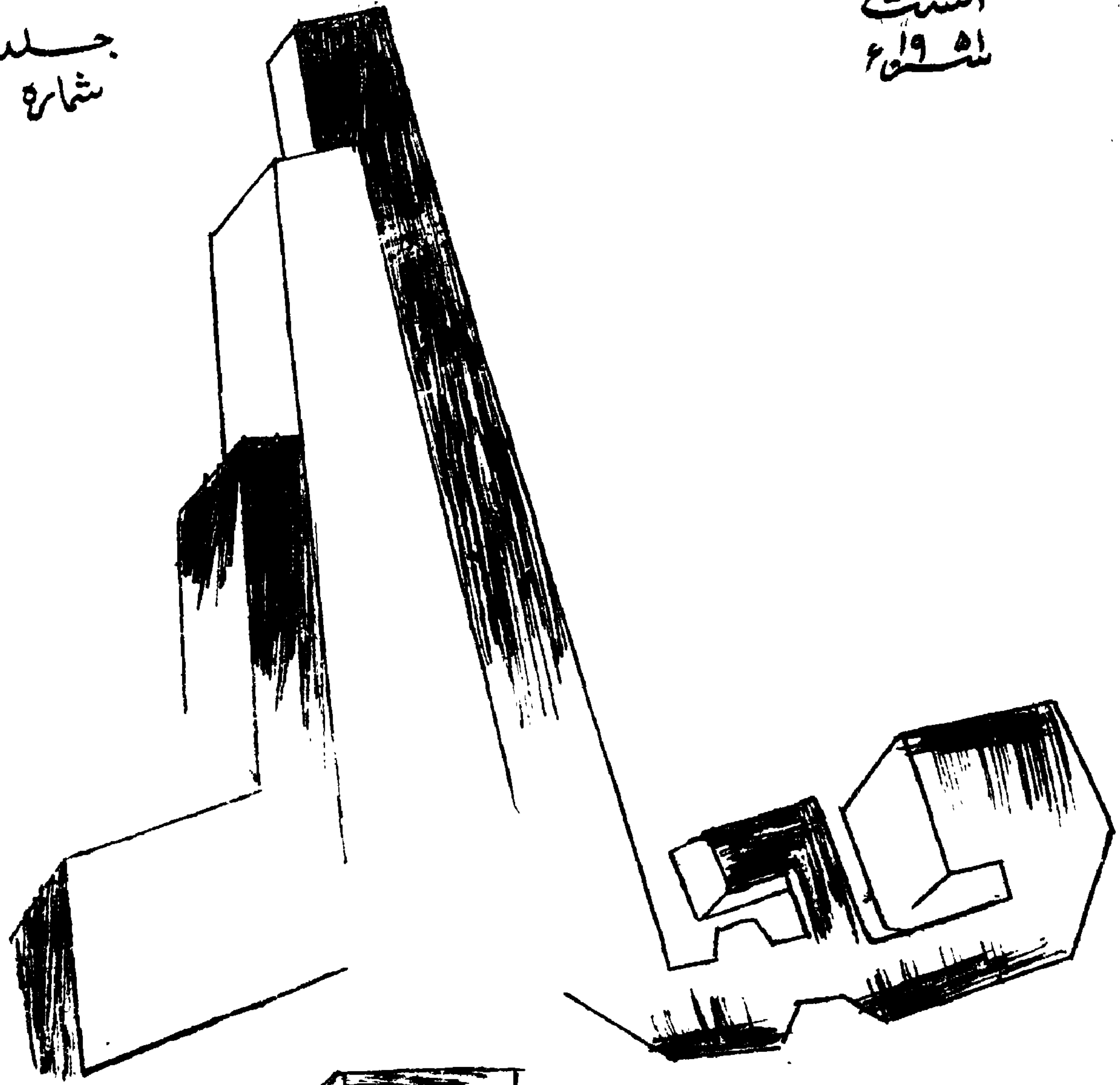
آجکل بھارت میں "کلچر" کا بہت چرچا ہے۔ ہر طرف سے انڈین کلچر کو ترقی دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ابھی حال میں لال قلعہ کے دیوان خاص میں جو سنگ مرمر کی ایک منقش عمارت ہے، مرمریں سم والی دیویوں نے رقص و سرود کا مظاہرہ کیا اور کھنک دار آواز والے گویوں نے اپنا کمال دکھایا۔ اس اجتماع میں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے مصور، فنکار، ادیب، رقاص اور گویے شریک ہوئے تھے۔ حکومت کے ذمہ دار آدمیوں نے نہ صرف اس کے افتتاح میں حصہ لیا بلکہ اس کی کئی ایک کانفرنسوں میں شرکت کی اور ایک وزیر نے پینڈل صدارت قبول فرمائی۔ آخر میں جو تجاویز پاس ہوئیں اور جو پروگرام بنایا گیا اس میں سارے ملک میں جگہ جگہ مصوری، رقص و سرود، موسیقی اور دیگر علوم و فنون کی تعلیم و تربیت کے سنٹر کھولنے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

ان تمام حالات کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں ایک خاص طرز فکر (کلچر) کو ظاہر کرنے والی اور اس کی پیداوار ہیں یہاں انہیں کو بجائے خود کلچر سمجھا رہا ہے۔ حالانکہ کلچر کوئی مادی چیز نہیں ہے۔ کلچر تو کسی نظام فکر (SYSTEM OF THOUGHT) کو کہتے ہیں جس کے کسی سوسائٹی پر اثر انداز ہونے سے خاص قسم کا تمدن (CIVILISATION) ظہور میں آتا ہے اور مختلف فنون اور آرٹ وجود میں آتے ہیں مگر یہاں کلچر کی اصل حقیقت تو پردہ راز میں چھپی ہوئی ہے اور کلچر کے مظاہر کو کلچر کے نام سے رائج کیا جا رہا ہے آخر اس الٹی ترتیب کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کے علمبردار خود دھوکے میں مبتلا ہیں۔ یا وہ دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں؟ اگر معاملہ یہ ہے کہ انہیں خود انڈین کلچر کا علم نہیں ہے تو انہیں بتایا جا سکتا ہے کہ ان مظاہر کے تعلق سے جن کو وہ انڈین کلچر کہہ رہے ہیں اصلی کلچر "ہندو فلسفہ حیات" ہے پھر اس فلسفہ پر مغربی فلسفہ کی چھاپ بھی پڑ گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ملکر ان مظاہر کے پیچھے کام کر رہی ہیں جن کو آج انڈین کلچر کے نام سے ترقی دی جا رہی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہندو کلچر کا نام لینے سے چونکہ بہت سارے اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور خود ہندو قوم بھی اپنے کلچر کے بارے میں متفق علیہ نہیں ہے، اس لئے حکومت کی مشینری ایک مخصوص طرز فکر کو انڈین کلچر کے نام سے بھارت کے سارے ہندوؤں اور غیر ہندوؤں پر نافذ کر دینا چاہتی ہے۔ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے میں بڑی ہوشیاری اور دانشمندی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ لیکن ان کلچر کے متوالوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک چیز کو اگر اس کا نام لئے بغیر رائج کیا جائے گا تو کیا وہ اپنے نتائج و اثرات کو ظاہر کرنے سے بچ سکتی ہے اور کیا اس سے وہ اختلافات نہیں ابھر سکتے جن سے بچنے کے لئے یہ چکر دار راستہ اختیار کیا گیا ہے؟!


Naiyar

جلد (۱)
شمارہ (۷)

اگست
سنہ ۱۹۵۱ء



ترتیب دینے والے
اصغر علی عابدی
عبدالقدیر اصغر

تعاون
سالانہ پانچ روپئے
فی پرچہ آٹھ آنے

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ - میرٹھ
سب آفس :- محلہ کشن گنج - دہلی
(مضامین، تبادلہ جرائد اور ترسیل زر کے لئے ہیڈ آفس)

ترتیب

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ حضرات اپنی رقوم شیخ محمد قمرالدین صاحب پبلشر اندرون موچی گیٹ لاہور کے پتہ پر روانہ کریں اور ہمارے ہیڈ آفس کو اطلاع دیں۔

ادارہ

نقشِ اوّل

ہر شخص میں قدرت نے مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں۔ مختلف مزاج و رجحان دیئے ہیں۔ ان ہی صلاحیتوں کے مطابق ہر ایک کا اپنا دائرہ عمل ہوتا ہے۔ یہ فطرت کی ودیعت کردہ صلاحیتیں اگر صحیح دائرہ عمل پالیتی ہیں تو انہیں نشو و نما کا پورا موقع مل جاتا ہے اور اگر صلاحیتیں پہچاننے اور دائرہ عمل کے انتخاب میں غلطی ہو جاتی ہے ۔ تو ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں یہ بنیادی سی بات ہے جسے ہمارے ہر لکھنے والے کو سامنے رکھنا ہے۔ ہمارے کرم فرماؤں کی ایک بڑی تعداد "ادیب بننے" کی دھن میں سرشار ہے اور "شاعری سیکھنے" کے شوق میں سرمست۔ ٹھیک ہے۔ ہم اس پر کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ہمارے ساتھی ایک بار سنجیدگی سے اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لیں اور پھر اگر وہ دنیا کے کسی اور مفید کام کے لئے اپنے آپ کو موزوں تر پاتے ہوں تو اسی دائرہ عمل میں اپنی فطری صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں۔ اور اگر فی الواقع انہیں ادبی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ تو امانت سمجھ کر ان صلاحیتوں کو حق کی راہ میں لگا دیں۔

ہمارے کتنے ہی لکھنے والوں کی تخلیقات پڑھ کر جی میں آتا ہے کہ ان سے پوچھا جائے "شعر گفتن چہ ضرور؟" ایسے کرم فرما اگر آئندہ تخلیقات بھیجنے سے پہلے ہماری گذارشات کو مدنظر رکھ لیں تو یہ بھی ہمارے ساتھ ایک طرح کا تعاون ہوگا۔ "معیار" نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی سے گریزاں نہیں۔ نہ اس کی افادیت سے غافل۔ لیکن حوصلہ افزائی کے یہ معنی بھی نہیں کہ معیار کو پستیوں میں گھسیٹ لایا جائے۔ ہماری مشکلات کا اندازہ کیجئے کہ ایک طرف نئے مقصد، نئی منزل اور نئے جادہ کے راہیوں کا عزم سفر بھی ابھارنا ہے۔ ان کو آگے بڑھنے کا پورا موقع بھی فراہم کرنا ہے۔ اور دوسری جانب ادب کے دوسرے مورچوں پر انتہائی نظم اور سلیقے سے اپنی قوت افادیت اور اہمیت کا سکہ بھی چلانا اور جمانا ہے۔ ایک طرف نئے نئے سپاہیوں کی تربیت بھی ہمارے ذمہ ہے اور فرض ہے اور دوسری طرف اپنے مورچہ پر بہترین جرنیلوں اور جدید ترین آلات سے مسلح سپاہیوں کو جاہلی ادب کی طاقتوں کے مقابلہ میں پیش کرنا بھی ہے۔ موجودہ الحادی ادب بڑی تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اب اگر ہمیں اپنے آپ کو اس سے بہتر اور مفید تر ثابت کرنا ہے تو ادب کو معیاری شکل میں پیش کرنا ہوگا ——— اور ظاہر ہے کہ یہ کام نوآموز ادیبوں کی مشق سے سر نہیں ہو سکتا اس کے لئے تو ہمیں اپنے بہترین سے بہترین سپاہیوں کو میدان میں لا اتارنا ہے۔

ہمارے نئے لکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ اپنی مشق تو ضرور جاری رکھیں اور مقامی ادبی حلقوں میں تخلیقات پیش کر کے مفید مشورے بھی حاصل کرتے رہا کریں۔ لیکن "معیار" کو نواز کر عدم اشاعت کی صورت میں برہم نہ ہوا کریں۔ وہ خود سوچیں کہ کیا "معیار" کا معیار پست دیکھنے پر وہ تیار ہو سکتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ کچھ اپنے "تجربہ کار ادبی ساتھیوں" کی خدمت میں بھی گذارش ہے اور وہ یہ کہ معیار سے اگر انہیں کچھ بھی لگاؤ ہے تو اب ادبی سستی کا لبادہ اتار پھینکیں ——— واللہ تعمیری اور تخریبی عناصر کی کشمکش روز بروز شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی ہلکی ہلکی سی غفلتوں سے وہ تعمیری مورچے میں کسی رخنہ کا باعث بن جائیں۔ یا اپنی پوری قوتیں اس معرکہ میں جھونکنے سے پہلوتہی کر جائیں۔

اس شمارہ میں: "اشتراکی نقاد" میں عالم عرفانی نے مارکسی فلسفہ کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے تنقیدی پیمانوں کی اصلیت سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے بعض اہم مقامات سے مقالہ نگار سرسری گذر گیا ہے۔ ان مباحث پر قلم اٹھاتے وقت اگر طوالت کے اندیشہ کو سامنے ہی نہ آنے دیا جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔

محب اللہ ندوی نے "ہمارا ادب اور ہمارے فرائض" میں کسی قدر کھل کر گفتگو کی ہے اور اردو ادب کی تاریخ پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالنے کے بعد ادب کی صحیح سمت سفر کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ ہمارے دوسرے اہل فکر و قلم بھی اس اشارہ کو سلیقہ سے واضح کرنے کی طرف توجہ دیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔ نجم الاسلام کا "زاہد کا سیاسی تفکر" ایک تعمیر پسند شاعر کو روشناس کرانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ تعمیری غزل پر تنقید کے کچھ پیمانے دینے کی کوشش بھی ہے۔

اپنے مقالہ میں نجم نے ابوالمجاہد زاہد کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ پہلے نظم نگار رہے اور بعد میں غزل گو" اس دعوے کے ایک حصہ کا ثبوت زاہد کی نظم "نا گزیر" . . . میں پایا جاتا ہے۔

ابوالعرفان کی "تبیل" نفس پرور ملّاؤں، خود غرض سرمایہ داروں اور خونی پرولتاریہ ڈکٹیٹرشپ کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔

ندیم قاسمی رزم گاہِ ادب میں الحادی طاقتوں سے برسرِ پیکار ہونے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہوکر آیا ہے۔ اس کے ہتھیاروں کی آب و تاب "سنگِ میل" میں جھلک رہی ہے۔

عبدالباسط مقصد "نیا آفتاب" لیکر مطلعِ معیار سے پھر طلوع ہو رہا ہے۔

حیدر علی حیدر نے اپنے سندر گیت کی تانوں سے دکھیاری جنتا کو "ستیہ" اور "استیہ" راجوں کا بھید بھاؤ سمجھایا ہے۔

"ہیرو" پڑھکر اگر آپ کو احساس ہو جائے کہ الحادی نظام میں آزادی کس طرح لاقانونیت اور من مانے کرتوتوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ انور اعظمی اپنے افسانہ میں کامیاب ہے۔

"شاشن ری" محمود فاروقی کا طنز آمیز شاہکار ہے۔ اس کو پڑھکر واقعی کو ریا ایک کونے ڈِش کی طرح نظر آنے لگتا ہے جس کے نیچے انسانی لاشیں ایندھن کی طرح سلگ رہی ہوں اور جس کے اوپر انسانی جسم مرغی کے چوزوں کی طرح بھونے جا رہے ہوں اور جس کے گرد بہت سے جلاد نما باورچی طرح طرح کی کفگیریں پکڑے کھڑے ہوں۔

"شیطان مرگیا" منیر حسین کی اشتہ تصور کا نتیجہ ہے۔ منیر نے شیطان کے جنازہ میں شریک ہونے والے چوروں، اُچکوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ اُن مہذب "شخصیتوں" اور گروہوں کو بھی ماتم کناں دکھایا ہے جو ہمارے آپکے سامنے رات دن اپنی "شرافت" اور "عظمت" کا ڈھول پیٹا کرتے ہیں۔

مولانا وارث کامل بی، اے معاون مدیر "مدینہ" دوسری مرتبہ "بزمِ معیار" میں شریک ہو رہے ہیں۔ جس طرح مولانا کے ذہنی ارتقاء میں مشرقی اور مغربی دونوں علوم کا ہاتھ ہے اسی طرح اُن کی غزل بھی قدیم و جدید رنگِ تغزل کے امتزاج کی حامل ہے۔

حقی حزیں کٹر غزل گو شاعر ہیں اور حسن و عشق کے علاوہ کسی اور چیز کا حق غزل پر تسلیم نہیں کرتے مگر "معیار" کی خاطر کبھی کبھی اپنی مدعا میں تبدیلی لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس شمارہ کی غزل میں آپ انہیں "غمِ جاناں" کے بجائے "غمِ دوراں" کی باتیں کرتا ہوا پائیں گے۔ اللہ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

شاکر تسلیم نے ہر سانس کے دعوتِ تسلیم و رضا ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ نوجوان شاعر کو یہ ذہنی انقلاب مبارک ہو۔

جمیل حسین ناسخ کے ساقی نامہ سے مقصدیت چھلکی پڑتی ہے تغزل کی بے کیفی پر نہ جائیے، غزل بھر کیف پاکیزہ کیفیتوں سے خالی نہیں۔

"پسند اپنی اپنی" کا سلسلہ چھیڑ جانے پر قارئینِ معیار نے اظہارِ پسندیدگی کیا ہے اور کچھ انتخابات بھی اس مستقل عنوان کے تحت اشاعت کے لئے بھیجے ہیں۔ ادارہ ان حضرات کا ممنون ہے مگر اس کے ساتھ ہی ادنیٰ گذارش ہے کہ اشعار کا انتخاب کرتے وقت اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو پیشِ نظر رکھا جائے ورنہ اس سلسلہ سے وہ فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا جو ہم چاہتے ہیں۔

ایک دوسرے مستقل عنوان "مسائلِ زمانہ" کے متعلق بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اس پر سنجیدہ انداز کے بجائے مزاحیہ انداز میں لکھا جایا کرے۔ متوقع ہے کہ قارئین اس تجویز پر اپنی بیش قیمت آراء سے ادارہ کو مطلع فرمائیں گے۔ کسی فیصلہ پر پہنچنے تک یہ سلسلہ سابقہ طرز پر ہی جاری رہے گا۔

نقشِ ثانی

ہماری موجودہ صحافت

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ عالمی سیاست کی سب ہی اُلجھنیں اس وقت ایشیا میں جنم لے رہی ہیں کوریا کی جنگ۔ ایرانی تیل کا جھگڑا۔ کشمیر کا مستقبل اور عرب ممالک کی بحرانی کیفیت۔ یہ سب مسائل ایشیا کی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ اور ان پر روسی اور امریکی طاقتیں پوری طرح اثرانداز اور برسرِ عمل ہیں۔ پچھلی جنگ نے حالات کچھ اس تیزی سے بدلے ہیں کہ ایشیا دنیا کی حالت پر براہِ راست اثرانداز ہو رہا ہے ضرورت ہے کہ اب ایشیا اپنے حالات کے تقاضوں کو پہچانتا اور اپنے آپ کو مغربی طاقتوں کا آلہ کار اور چالوں کا شکار بننے سے بچائیں۔ ایشیا کے نزاعی معاملات میں بظاہر استقلال اور علاحدگی سی نظر آتی ہے۔ اور الجھنیں مستقل پس منظر اور مخصوص حالات کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہیں لیکن بصیرت و بصارت سے کام لیا جائے تو واقعات کی تہ میں ایک ایسا ربط نظر آئے گا جو امریکی اور روسی بلاکوں کی کشاکشِ پیہم کا شاخسانہ ہے۔ اور معلوم ہو سکے گا کہ الجھنوں کی تمام تر ذمہ داری ان ہی دو بلاکوں پر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ لڑائی قوموں کی آزادی کے تحفظ اور عوام کی پشت پناہی کے نام پر لڑی جا رہی ہے لیکن دل فریب دعوؤں سے آگے گذر کر عمل کے آئینے میں حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہر مسئلہ، ہر کشمکش، ہر نزاع اور ہر جھگڑے میں مفاد پرستی کارفرما نظر آئے گی۔ یہ مفاد پرستی اس مزاج کا خاصہ ہے جس پر امریکی استعماریت اور روسی استبداد کے نظام تعمیر کئے گئے ہیں۔ مادہ پرستی نے ان نظاموں کے حاملین کو حسین الفاظ کے پردوں میں گندے سے گندے اور مکروہ سے مکروہ فائدے حاصل کرنے سکھائے ہیں۔ اور اپنے ہر جور کو کرم، ہر ظلم کو لطف اور ہر غلط کاری کو راست روی کر دکھانا بتایا ہے۔ ان بلاکوں کی تعمیر جن نظریات پر کی گئی ہے وہ خالص مادہ پرستانہ اور غیر اخلاقی ہیں۔ ان نظریات کی کجی ہی دراصل موجودہ پریشانیوں کی ذمہ دار ہے۔ بظاہر روسی نظریات میں اور امریکی رجحانات میں بُعد المشرقین معلوم ہوتا ہے لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ روسی حکومت نے بھی استبداد و فساد کا وہی کھیل کھیلا ہے جس پر ہم امریکہ سے بیزار ہیں۔ بباطن دونوں کے مزاج کا خمیر ایک ہی ہے۔ فرق ہے اتنا کہ دونوں میں مفاد کا شدید ٹکراؤ موجود ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ مفاد اور فساد کا چولی دامن کا ساتھ چلا آیا ہے بقول شخصے ؂

مف مفاد اتًا مفاد اتًا مفاد اتًا مفاد　　　　فس فساد اتًا فساد اتًا فساد اتًا فساد

اعتماد دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک پر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انتہائی نادانی کی بات ہوگی اگر ہم آزمائے ہوئے ظالموں کو پھر آزمانے کی کوشش کریں۔ اور روسی بلاک یا امریکی بلاک کسی کی گود میں بیٹھ کر اپنے کو محفوظ سمجھیں۔ اب تو صرف ایک اور ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ جو ہمیں روسی اور امریکی چالوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ اور وہ ایک نئے نظام کی تعمیر کے علاوہ کچھ نہیں۔ جب تک ایک ایسا اخلاقی نظام وجود میں نہ آئے گا جس کے پیشِ نظر تمام چھوٹے چھوٹے گروہی اور طبقاتی فائدوں کے بجائے انسانیت کا احترام ہو ہم دنیا میں امن و مسرت کا زمانہ نہ دیکھ سکیں گے۔ ایسا نظام صرف خدا پرستانہ نظام ہی ہو سکتا ہے امن عزیز ہے تو جلد یا بدیر آخر کار اسی نتیجے پر پہونچنا ہے کہ خدا پرستانہ نظام کا قیام ایک ناگزیر ضرورت اور ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

اس تمہید کے بعد دیکھنا چاہئے کہ ہمارا صحافتی حلقہ مسائل کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ تاکہ ان دیکھنے والوں کی نظر دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ہماری صحافت کہاں جا رہی ہے۔ آئیے عالمی مسائل اور خالص بھارتی معاملات کا جائزہ صحافتی نقطۂ نظر سے لیں۔ عالمی مسائل پر تبصرہ جب بھی موجودہ صحافتی حلقوں میں کیا جاتا ہے اشتراکی اور امریکی نظریات کی روشنی میں کیا جاتا ہے اور بھارتی مسائل قومی نقطۂ نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ہماری صحافت کی عام روش ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روش سے جانبداری کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ انصاف کی راہ دونوں انتہاؤں کے درمیان سے گذرتی ہے۔ اس وقت ہم موجودہ صحافت کا خاکہ پیش کر کے ایک متوازن زاویہ نگاہ سامنے لانے کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، جب عالمی مسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے تو دو ہی نقاطِ نظر اور دو ہی زاویہ ہائے نگاہ سے لیا جاتا ہے یعنی اشتراکی نقطۂ نظر سے یا امریکی جمہوریت سے کسی حد تک متاثر ہو کر۔ انصاف پسندی کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھا جائے تو یہ یک رُخی رجحان ذہنی اور میلاناتی بھی ایک فکری کج روی لئے ہوئے ہے۔ اور یہ فکری کج روی انتہا پسندی پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ایک اشتراکی مبصر ہر واقعہ میں اور تاریخ کے ہر گوشے میں اپنے

کام کی بات ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے اس تگ و دو میں اسے واقعات سے کتنا ہی دور ہٹ جانا پڑے، اور حقائق سے چشم پوشی ہی کیوں نہ کرنی پڑے، اس کے یہاں کچھ دلفریب نعرے اور کچھ دل خوش کن مستقبل کی امیدیں ہیں اور نفرت کے جذبات بھڑکانے کے محرکات، ان ہی بنیادوں پر وہ تخریب و انہدام کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کا مخالف ایک ناقد اور ایک صحافی ہر واقعہ کو اس طرح توڑ مروڑ کر دکھاتا ہے کہ گویا تخریب کا واحد ذمہ دار اشتراکی طبقہ ہے اور ہر مسئلے کی تشریح اس نہج سے کرتا ہے کہ جیسے دوسرا فریق یعنی امریکہ خطاؤں سے بری ہے اور قوم کی بھلائی کا ٹھیکہ دار۔ حالانکہ اصل حقیقت جو کچھ ہے ہر دانا و بینا پر ظاہر ہے۔ دونوں پر ہی الزام خطا کاری آتا ہے، اور آنا حق بجانب ہے۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ایک مبصر و ناقد کو یک رخی پالیسی کے بجائے حق پسندی اور میانہ روی کی راہ پر گامزن ہونا چاہئے۔ اصل چیز جس پر کسی شئے کی قدر کا تعین ہو سکتا ہے اور کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے وہ حق پسندی اور انسانیت دوستی ہے۔ نہ کہ گروہی مفاد، ہر شئے کو اس کے اصلی رنگ روپ میں دکھانا ہی نقد کا اعلیٰ معیار ہوتا ہے۔ رہی اصولی نقد کے تعین کی بات، تو اس کے لئے بنیاد انسانی بھلائی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ بغیر اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ہم کیونکر کسی مسئلے کے حسن و قبح اور خیر و شر کا اندازہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

موجودہ صحافت کے جائزے سے کئی کام کی باتیں سامنے آجائیں گی۔ ذہنی طور پر ہمارے ملک کی صحافت کا ایک اچھا خاصا حلقہ ہے جو اشتراکیت کی جانب جھکاؤ رکھتا ہے، یہ ہو سکتا ہے ______ کہ اس حلقے میں اشتراکی نظریات پوری پوری طرح اپنائے ہوئے نہ ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکیت، کسان اور مزدوران کے ذہن پر سایہ کئے ہوئے ہیں جو ان کے سوچ بچار پر ہلکی سی آمیزشوں کے ساتھ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ حلقہ امریکہ کی ہر حال میں مخالفت کے ساتھ میدان میں آتا ہے اور اپنے آپ کو سامراجیت کا سب سے بڑا دشمن ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ اسے ہر واقعہ میں جہاں تخریب و تظلم کا کوئی بھی پہلو ہوتا ہے اپنے مخالف کی موجودگی محسوس ہونے لگتی ہے گویا اشتراکیت خطاؤں سے معصوم ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ روس کے ساتھ اس کی پالیسی جانبدارانہ ہوتی ہے۔ روس کی ہر بات میں اور ہر اقدام میں اسے خیر کا پہلو نظر آجاتا ہے، جس طرح ساون کے اندھے کو ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیا کرتی ہے۔ یا پھر اگر مصلحت کا تقاضا نہیں ہوتا تو روس کی کھلم کھلا ہمدردی کے بجائے کچھ خوشنما الفاظ، حسین استعاروں، اور دلفریب نعروں کا سہارا لیکر عوام دوستی اور مزدور نوازی کا جذبہ نمایاں کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ بالواسطہ ہمدردی ان میں سے اکثر کے نزدیک انصاف پسندی اور غیر جانبداری کے مترادف ہے لیکن یہ محض گمانِ باطل ہے اور وہم خیال سے زیادہ کچھ نہیں۔ مصلحت کے تقاضے اگر انہیں مجبور نہ کر دیں تو صحافت کے اس حلقے کے بہت سے "پارسا" اپنا لبادہ اتار پھینکیں اور اسی کھلم کھلا حمایت پر اتر آئیں جس سے وہ احتراز کر رہے ہیں اور یوں بزعم خود غیر جانبداری کا مظاہرہ کر کے اپنے آپ کو بالاتر دکھانا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی عام سیاسی فضا ابھی اس کے لئے پوری طرح سازگار نہیں کہ صحافتی حلقے کھلم کھلا اشتراکیت کی ہم نوائی اور روس کی ہمدردی کر کے بھی اپنی ساکھ قایم رکھ سکیں۔ اس روش میں بھی بڑی اجنبیت باقی ہے، اس لئے کہ نہ تو حکومت کی نظر میں ہی اس روش کو بہ نظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے اور نہ عوام میں ہی کوئی خاص سند قبولیت حاصل ہے۔ عوام میں اس نقطۂ نظر کو قبولیت عام حاصل نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اشتراکیت سے بیزار ہیں اور شعوری حیثیت سے غیر مطمئن ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ عوام کو مزدور اور کسان کی ہمدردی کے نعروں سے لگاؤ بڑھتا جاتا ہے لیکن یہ جذبہ قوم پرستی کے دائرے میں محدود ہے۔ ہمارے ملک میں اکثر ایسے بیانات سننے میں آتے ہیں کہ یہاں اشتراکیت پنپ نہیں سکتی۔ یہاں کے عوام مذہبی ہیں، وہ اسلام کے ماننے والے ہیں۔ وہ ہندو ہیں، انہیں گاندھی واد پیارا ہے، یہ سب باتیں حقیقت سے ذرا ہٹی ہوئی ہیں۔ ہمارے عوام نہ تو پورے مسلمان ہیں نہ پورے گاندھی کے چیلے، گاندھی واد ایک نظری چیز ہے جس کی صحیح عملی شکل کہیں اور بھی نظر نہیں آسکتی۔ بھارتی عوام کی بھاری اکثریت کو نظریاتی حیثیت سے اگر کچھ نام دیا جا سکتا ہے تو وہ قوم پرست ہے۔ اور اس قوم پرستی کی قسمیں بھی کتنی ہی ہیں۔ یہاں دو بڑی قسموں سے بات سمجھائی جا سکتی ہے۔ ایک جارحانہ قوم پرستی Aggressive Nationalism اور دوسرے Moderate nationalism مثلاً۔ ایک طبقہ قوم پرستی کی دبا میں اتنا شدید ہے کہ وہ دوسرے ممالک کو اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھانے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ اس کے یہاں قوم پرستی کے معنی صرف اپنی قوم کا بھلا اور ہر جائز و ناجائز صورت سے بھلا ہیں۔ یہی جارحانہ قوم پرستی ہے، تنگ نظری اسی کو تو کہتے ہیں — میری خواہش، میرا طبقہ، میرا فرقہ، میری قوم آدمی ان جھگڑوں میں پھنس کر وسیع القلب کہاں رہ سکتا ہے۔

قوم پرستوں کا دوسرا گروہ Moderate اور ذرا ______ Progressive کہا جا سکتا ہے اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ عرف

انخصوصیت کے باعث کہ اس طبقے میں قوم پرستی کا مفہوم جارحانہ قوم پرستی سے نسبتاً زیادہ وسعت رکھتا ہے۔
یہ تو بھارتی عوام کی ذہنی حالت ہے، اب رہا صحافت کا معاملہ وہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ ہماری صحافت بھی ان ہی خطوط پر جا رہی ہے۔ ملکی معاملات پر ان دونوں
طرح کے صحافتی حلقوں کا تبصرہ مختلف ہوتا ہے۔ مسئلہ کشمیر، اُردو اور قومی زبان کا معاملہ، حکومت پر نکتہ چینی، تحریر و تقریر کی آزادی۔ فرقہ وارانہ معاملات، سب پر ان کے
نظریات اساسی کا اختلاف اشماندانہ ہو کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً جس حلقے کو ہم نے (moderate nationalists) سے موسوم کیا ہے اس کے موئد و
حامی اخبارات مسئلہ کشمیر پر قومی نقطۂ نظر سے اپنے خیالات کا اظہار جب بھی کرتے ہیں تو جارحانہ قوم پرست اخباروں کی طرح قوم پرستی کے سہارے محض جنگ اور نفرت
اور قومی برتری کے جذبات مشتعل کر کے سستی صحافت کا ثبوت کم ہی دیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات اور مدعا کو سنجیدہ طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے
moderate nationalists حلقے کی تعداد جارحانہ قوم پرست اخباروں کے مقابلے میں کم ہے اس لئے کہ ہمارا موجودہ اخباری مذاق جس چیز کا مطالبہ کرتا ہے اس
کی سیری اشتعال انگیز تبصروں ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا ہے یہ تھوڑی تعداد کچھ نہ کچھ وزن رکھتی ہے۔
اسی طرح زبان کے معاملے میں صحافت کا ایک حلقہ جہاں تنگ نظری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور قوم پرستی کے جوش حدود سے آگے نکل کر بات کہتا ہے، وہاں ایک طبقے
میں اس مسئلے پر سوچ بچار کرتے وقت ذرا سنجیدگی ملتی ہے۔ پہلے حلقے میں اکثریت کی زبان جاری کرنے اور اس کی ترقی کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ دوسری زبانوں کو یک قلم
موقوف کر دیا جائے۔ تنگ نظرانہ قوم پرستی اس کے علمی پہلو سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ کیا ممکن ہو سکتا ہے کہ زبانیں راتوں رات بدل دی جایا کریں لیکن تنگ نظرانہ قوم پرستی
شامل اپنے تہذیبی ورثہ کی ترقی کے ساتھ دوسرے تہذیبی ورثوں کا استیصال بالجبر چاہتی ہے۔ صحافت کا دوسرا حلقہ اس موضوع پر یوں سوچتا ہے کہ قومی زبان کو غالب
کرنے کی جدوجہد کا مطلب یہ نہیں کہ تدریج اور مصلحت قطعاً نظر کر دی جائیں۔ وہ بالقول دوسری زبانوں کا بدخواہ ہو کر سامنے نہیں آتا۔ بلکہ ایک مدت میں بتدریج وہ کام
کرنے کا حامی ہے جو دوسرے صحافتی حلقے کی طرف سے گھنٹوں اور دنوں میں ہو جانا چاہئے۔ دیگر مسائل میں بھی یہ اختلاف نظر محسوس کیا جا سکتا ہے۔
اب عالمی مسائل پر ہماری موجودہ صحافت کا تبصرہ دیکھ لیجئے۔ تبصرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ یا تو اشتراکیت کے تاثر کا اظہار ہوتا ہے یا سرمایہ دار ممالک کی
جانبداری کا انعکاس، مثال کے طور پر کوریا کی جنگ کا معاملہ ہے، بھارت کے بعض اخبار جو اشتراکیت پر نظری حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں وہ تو بدحال، روس کی پشت
پناہی پر تلے ہوئے ہیں۔ دوسرے اخبار جو اشتراکیت سے متاثر نہیں وہ ادارہ اقوام متحدہ کی ایک حد تک حمایت کر چکے ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے
کہ آخر ادارہ اقوام متحدہ کوئی خدائی قانون کی طرح تو نہیں جہاں لاگ لپیٹ کی گنجائش نہ ہو۔ اس ادارے کو بھی اپنی اغراض کا آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب بات
ہے کہ ہمارے صحافتی حلقے مسئلہ کشمیر پر تو ادارہ اقوام متحدہ کے وجود کی افادیت کا ہی قطعی انکار کر دیتے ہیں اور کوریا کے معاملے میں وہی یا ان میں سے کچھ نہ کچھ ادارہ
اقوام متحدہ کے گن گانے لگتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے تو ہم کہیں گے کہ ابھی عالمی سیاست کے میدان میں ہماری صحافت کا معیار اونچا نہیں،
ملکی مسائل کے بارے میں ہم اس لئے کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ جزئیات کے بجائے اتنی ہی تنقید بہت کافی ہے کہ قوم پرستانہ ہمارے نظریات ابھی وسعت اور ہمہ گیری
چاہتے ہیں۔ انسانی مسائل حل کرنے کے لئے پوری دنیا پر نظر چاہئے۔ قوموں، گروہوں، طبقوں اور فرقوں میں تقسیم ہو کر ممکن ہے جزوی اور وقتی طور پر اپنا
بھلا ہو جاتا ہو لیکن وہ لوگ جو محض اپنے فائدے سے زیادہ پوری انسانیت کا فائدہ چاہتے ہیں اس روش کو پسند نہیں کریں گے۔ عالمی امن کے لئے یہ طرز فکر ایک
بھاری رکاوٹ ہے۔ اس طرز فکر میں اصلاح ہوئے بغیر نہ عالمی معاملات میں ہماری رائے صائب ہو سکتی ہے اور نہ نتیجتاً ملکی مسائل میں ہی سود مند۔
بعض اوقات ہماری صحافت میں خیالات کا تضاد بہت ہی مضحکہ انگیز بن جاتا ہے ۔ اکثر وہ جو کچھ اپنے ملکی معاملات کے بارے میں رائے رکھتے ہیں۔ عالمی
سیاست پر ان کی رائے سے ٹکرا جاتی ہے۔ اس تضاد کا سبب ہی یہ ہے کہ وہ کوئی عالم گیر نظام، کوئی برتر اخلاقی ضابطہ، کوئی طاقتور ترین واحد ذات پر یقین نہیں
رکھتے۔ ان کے شعور میں انتشار ہے۔ اور اسے دور کرنے کا صرف یہی علاج ہے کہ ٹھنڈے دل سے وہ اپنی حالت کا جائزہ لیں۔ جوش، اشتعال، اور نعرہ بازی
چھوڑ دیں اور سنجیدگی کے ساتھ ایک ایسے عالم گیر نظام کو اپنائیں جو انہیں محدود دائروں سے بھی نکال دے اور اشتراکیت و سرمایہ داری کی لعنتوں سے بھی نجات
دلا سکے ہمیں ہر چیز کو جانچنے کے لئے بہرحال ایک معیار، ایک کسوٹی، اور کچھ اصول درکار ہوتے ہیں۔ تو پھر اپنے معاملات کا جائزہ لینے اور مسائل پر رائے دینے
سے پہلے ہم کیوں نہ اپنی آرا کو ایک برتر اخلاقی ضابطہ سامنے رکھ کر پرکھ لیا کریں۔ کوریا کی جنگ کا مسئلہ ہرگز اس طرح طے نہیں ہو سکتا کہ ایک فریق دوسرے کو
جارح کہہ دے اور دوسرا پہلے کو جنگ میں پہل کرنے والا گردانے، اور نہ امریکہ یا روس میں سے کسی کی اچھائی برائی کرنے سے نتیجہ خیز بات سامنے آ سکتی ہے

بلکہ جذباتی طور پر ادارہ اقوام متحدہ کو بھی مطعون کرنے سے کچھ حاصل نہیں غلطیوں کا سرچشمہ وہ افکار ہیں جن پر آج تمام ممالک دیوانے گھوڑے کی طرح تیز لائے بھاگے جا رہے ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ ایک عالمی ادارہ ہے اس کے قیام کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا یہ بات ٹھیک نہیں کہ جب تک اس ادارے کے نظام میں تبدیلی اور مزاج میں انقلاب نہیں ہوتا اس کی افادیت مٹی کے تودوں میں چھپا ہوا سونا ہے۔ اور کیچڑ میں گرا ہوا ہیرا۔ اس ادارے کو چلانے کیلئے طبقاتی اور قومی مفاد سے بالاتر اخلاقی ضابطہ حیات کی پائندار اساس ناگزیر ہے۔

یہ اس بنیادی طرز فکر کی طرف مجمل سا اشارہ ہے۔ جو نہ صرف ہمارے صحافتی معیار کو آسمان کی سی بلندی دے سکتا ہے بلکہ دنیا کے مسائل کا حل ہے۔ جزئیات کی تفصیل اس نقطۂ نظر کو اپنانے کے بعد آپ سے آپ سامنے آتی چلی جائے گی۔ اور ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں دیکھی اور دکھائی جا سکے گی۔

ضروری تصحیح :— جولائی کے شمارہ میں کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ تصحیح فرمائیے۔

ع　کھیتوں میں پسینہ اُگتا ہے ننگے بھوکے دہقانوں کا

(اس دورِ نحوست ساماں میں —— ابو المجاہد زاہد)

ع　کھل گیا ہے آدمِ نو کی سیاست کا بھرم

(مداوا —— احمد پرویز)

ع　اِک قدم آگے بڑھا، بڑھ کے فقط لوٹ گیا

(بیچارگی —— اے۔ ایس۔ زیدی)

اشتراکی نقّاد

عالم عرفانی۔ بی۔اے

لینن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم اخلاق اور مذہب کچھ نہیں جانتے اخلاق وہی ہے، جو ہمارے مقاصد کو پُورا کرسکے۔ دراصل یہ نظریہ مارکس کے فلسفہ کی صدائے بازگشت ہے کیونکہ اُس کے نزدیک اخلاق و مذہب معاشی تبدیلیوں کی بناپر وجود میں آتے ہیں، اور ہر دور میں صاحب اقتدار طبقہ ایسے اخلاقی اُصولوں کو وضع کرلیتا ہے، جو اس کے مفاد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوسکیں۔ جو لوگ مذہب و اخلاق کا یہ عجیب غریب مفہوم لے کر اٹھیں، نوعِ انسانی ان سے بجز تباہی و بربادی کے اور کیا توقع رکھ سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے دیانت داری، سچائی اور انصاف کی اُمید رکھنا ہی حماقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نقّادوں کی تنقید عجیب مضحکہ انگیز ہوکر رہ گئی ہے۔ انہوں نے یہ ایک عام اُصول بنالیا ہے کہ اگر لکھنے والا کوئی اشتراکی ہے، تو اس کی تعریف میں ایسی قصیدہ خوانی ہوگی کہ خاقانی اور انوری بھی اپنے اشعار کم مائگی پر متاسف و پریشان نظر آنے لگیں۔ اُس کے ہر ابہام و اہمال میں معانی کا دریا بہتا ہوا دکھایا جائے گا اس کے اغلاق اور ثقالت پر جدّت طرازی کی مہر لگائی جائے گی اس کی عریانیت اور لذتیت کو حقیقت نگاری کا نام دیا جائے گا اس کی کھلی ہوئی فراریت کو عین ترقی پسندی قرار دیا جائے گا لیکن اگر بدقسمتی سے وہ لکھنے والا "اشتراکی" نہیں ہے تو اس کے محاسنِ کلام کو تو خیر نظر انداز کر ہی دیا جائے گا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر ممکن سعی تاویل کے ذریعہ اسے رجعت پسند، قدامت پرست اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ اُن کا ایک عام انداز ہے جس کا ثبوت ہمیں قدم قدم پر ملتا ہے۔ اپنی اس ادبی بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اکثر چند غیر مانوس الفاظ مثلاً اذعانیت، اضافیت اور جدلیاتی ارتقا وغیرہ کا ورد کرتے رہتے ہیں حالانکہ بسا اوقات بیان کے اُلجھاؤ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان الفاظ کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفیانہ اصطلاحات کے مخصوص مفہوم کو سمجھنے کے لئے خاص ذہنی شعور کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب یہ اصطلاحات سطحی نظر رکھنے والوں کے ہاتھوں پڑ جاتی ہیں، تو پھر اُن کے مطالب خبط ہونے لگتے ہیں، اور ان کی صورتیں مسخ ہوجاتی ہیں۔ آیئے ہم ان اصطلاحوں کا جائزہ لیں۔

اضافیت کیا ہے

مثال کے طور پر اسی لفظ "اضافیت" کو لیجئے۔ ایک اشتراکی ہمیشہ اخلاقی اقدار کو اضافی کہکر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس سرمایہ دارانہ ماحول میں قتل و غارت گری، کذب و افتراء، مکر و فریب، نقضِ عہد، غرض سبھی کچھ جائز ہے۔ جنسی تعلقات کے سلسلے میں بھی ان کے متوہمانہ نظریات کچھ اسی نوعیت کے ہیں "شادی بیاہ کی رسمیں اُس زمانے کی یادگار ہیں جبکہ عورت ایک فرد کی ملکیت متصور ہوتی تھی اب چونکہ قومی ملکیت کا دَور ہے۔ اس لئے دوسری تمام چیزوں کی طرح عورت کا قومی ملکیت ہونا بھی ضروری ہے۔"

یہاں اِس بات کا موقع نہیں کہ "اضافیت" پر کوئی تفصیلی بحث کی جاسکے، اس لئے پیچیدہ علمی مباحث سے ہٹ کر ہم اپنے اشتراکی نقّادوں سے ایک نہایت آسان سوال کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر اضافیت کا مندرجہ بالا مفہوم ہی صحیح ہے تو کیا کوئی ایسا بھی ماحول پیدا ہوسکتا ہے جس میں عوامی مفاد سے غدّاری یا عورتوں کی تذلیل جائز ہو؟ اس کا جواب اگر نفی میں ہے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ کچھ ایسی اخلاقی اقدار بھی ہیں جو اپنی دائمی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اس طرح فلسفۂ اشتراکیت کی ساری عمارت متزلزل نظر آنے لگتی ہے۔ اور اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کوئی معقول انسان جس کے دل میں انسانیت کے لئے کچھ بھی درد ہے اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت سے مستقل اخلاقی اقدار کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ اس نظریہ کی رُو سے نتائج میں تغیر اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ شاہد و مشہود دونوں یا اُن میں سے کسی ایک کی حیثیت بدل جائے، لیکن اگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر برقرار ہیں، تو نتیجہ ہمیشہ یکساں ہوگا۔

اب دوسری اصطلاح لیجئے۔

تغیر کا مفہوم

لفظ "تغیر" سے ایک دوسری اہم بحث کا افتتاح ہوتا ہے اور جب تک اس کے مفہوم کا تجزیہ نہ کیا جائے اضافیت کی بحث نامکمل رہیگی۔ اشتراکی تحریروں میں اس قسم کے جملے بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ "دنیا کی ہر چیز ہر لمحہ متغیر ہے"۔ "دنیا میں کوئی چیز جامد (STATIC) نہیں ہر چیز متحرک (DYNAMIC) ہے"۔ اور اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اب پرانے تمام اصول و قوانین کو "نقش ونگارِ طاقِ نسیاں" سے زیادہ اہمیت نہ دینی چاہئے۔ لیکن یہ دلیل تغیر کے غلط مفہوم پر قایم ہے، اور اس میں دو بنیادی غلطیاں ہیں۔ دراصل تغیر صرف مظاہر میں ہوتا ہے۔ انسانی فطرت، بلکہ ہر چیز کی بنیادی خصوصیات میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کی ایک مقررہ ترکیب سے ہمیشہ پانی ہی بنے گا۔ اس میں زمان ومکان کی کوئی قید نہیں، یہی حالت فطرت انسانی کی ہے۔ معاش کی فکر انسان کو ہزار سال پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ انسان کا جذبۂ جنسی جیسا کل تھا ویسا ہی آج بھی ہے۔ جذباتِ محبت ونفرت، غیظ وترحم، رشک وحسد میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اگر دائمی تغیر کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ایک شخص ابھی غیظ وغضب میں تھرتھرا رہا تھا۔ اور چند لمحوں میں وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا، اور اس تھوڑے سے وقت میں بھی اس کی حالت غضب میں برابر تبدیلی ہوتی رہی ہے تو کوئی شخص اسے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر سکتا۔ لیکن تغیر کا یہ مفہوم قطعی غلط ہے کہ انسانی فطرت سے غیظ وغضب کا عنصر ہمیشہ کے لئے خارج ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرد ضبطِ نفس کے ذریعہ اس عنصر کو بالفعل ختم کر دے، لیکن بالقوۃ وہ پھر بھی باقی رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے اصول ہیں جو کسی تغیر سے متاثر نہیں ہوتے۔ مثلاً اصولِ مساوات کو لیجئے۔ وہ لوگ یقیناً انتہائی تنگ نظر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ اصول کسی خاص دور، مقام، طبقہ یا جنس کے لئے مخصوص ہو سکتا ہے یا دنیا میں کوئی ایسا بھی انقلاب آئے گا جس میں نظریۂ مساواتِ انسانیت کے لئے مضر ثابت ہو گا۔

پھر لفظ تغیر کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں اس کی مختلف نوعیتوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ تغیر کبھی دائرے کی شکل میں ہوتا ہے کبھی ابتداء سے عروج اور عروج سے زوال کی طرف۔ اور کبھی مستقلاً عروج کی طرف وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس تمام بحث کا مقصد یہ ہے کہ معاشری مسائل میں نظریۂ اضافیت کی تطبیق کوئی آسان کام نہیں، فطرتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں پر یکساں نظر رکھنا انسانی طاقت سے باہر ہے؛ اور اسی لئے ہم خدائی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ خود حرکت، وجود نظریہ اضافیت کے تابع ہیں۔ ایک چیز ایک لحاظ سے جامد، لیکن دوسرے لحاظ سے متحرک ہے۔ لہذا ہمیں ضرورت بھی ایسے ہی قوانین کی ہے جو بیک وقت، دونوں صفات کے حامل ہوں۔ انسانی زندگی ایسے ہی ہزاروں تضاد پر قائم ہے۔ اور ان کا لحاظ ایک حکیم مطلق ہی کر سکتا ہے۔ خیال کیجئے کہ زہر جس لحاظ سے نقصان دہ ہے۔ اس لحاظ سے ہمیشہ نقصان دہ ہے۔ اور جس حیثیت سے مفید ہے اس حیثیت سے ہمیشہ مفید ہے۔ دراصل مشکل سوال یہ ہے کہ "اس حیثیت" کا تعین کون کرے۔

ـــہ یہ توضیحی نکتہ جو بظاہر متناقض باتوں پر مشتمل ہے اسلامی اصولوں سے خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف تین مثالیں کافی ہوں گی حرمتِ خونِ انسانی کے مسئلہ کو لیجئے۔ قرآن و حدیث میں اس کی مختلف صورتیں اس طرح پیش کی گئی ہیں۔

(۱) جس نے ایک بیگناہ کو قتل کیا، اس نے گویا تمام نوعِ انسانی کو قتل کیا، (۲) تمہارے اوپر حرام کر دیا گیا کہ تم بغیر کسی حق کے کسی کی جان لو، (۳) تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے، اور پھر ان کے برعکس یہ حکم "ان سے قتال کرو ان فساد پھیلانے والوں سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہی مسئلہ قتل ہے، لیکن خارجی حالات کے ماتحت برابر تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ اور پھر بھی متعلقہ قوانین اپنی جگہ اٹل ہیں۔

یہی صورت جنسی تعلقات کی ہے۔ ایک لحاظ سے صرف جائز بلکہ مستحسن اور دوسرے لحاظ سے دنیا کے بدترین جرم۔ جائز اس طریقے سے جو انسانوں کا طریقہ ہے اور ناجائز اس طرح سے جو حیوانوں کا طریقہ ہے۔ اب یہ فیصلہ ہمارے ہاتھوں میں ہے کہ ہم انسانی اصولوں پر عمل کریں، یا پھر اسی حیوانیت کی طرف لوٹ جائیں، جو خدائی اصولوں سے ہٹ کر انسانوں نے نفس پرستی کیلئے اختیار کی تھی تیسری مثال جو موجودہ حالات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، چوری کی سزا سے متعلق ہے عام حالات میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کی گئی ہے لیکن کھانے پینے کی چیزوں میں یہ قانون بدل جاتا ہے۔ پھر قحط وغیرہ کی مخصوص حالتوں میں تو یہ قانون بالکل خارجی تغیرات کا تابع ہوتا ہے۔ فطری قوانین اس طرح بنتے ہیں۔

نظریہ اضافت کے لحاظ سے اگر دو اشخاص ایک ہی سمت میں ایک ہی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں، تو ایک شخص کے لحاظ سے دوسرے شخص کی رفتار ہمیشہ صفر ہوگی۔ ایسا نہیں ہے کہ آج یہ حرکتِ اضافی صفر ہو لیکن کل بیس یا تیس میل کی ہو جائے۔ یہی حالت معاشرتی تغیرات کی بھی ہے۔ جب کبھی بھی معاشرہ میں ایک خاص صورتِ حال رونما ہوگی، نتیجہ بھی یکساں ہوگا اور اسی لئے علاج کی بھی ایک ہی نوعیت ہوگی۔ جس طرح دنیا کی بے شمار چیزیں محض چند عناصر کی ترکیب سے پیدا ہوئی ہیں اسی طرح انسانی سماج کے ہزاروں متنوع پہلوؤں کی بنیاد بھی چند ابدی حقائق پر قائم ہے۔

اس لئے ان کے متعلق بنیادی اصول بھی دائمی ہی ہو سکتے ہیں۔ خواہ فروعات میں روزانہ تغیرات ہوتے رہیں۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ مذہب پر حملہ کرتے ہوئے اشتراکی حضرات کو ہر چیز متغیر نظر آنے لگتی ہے لیکن مارکس کے بنیادی نظریات میں سے انہیں کوئی چیز بدلتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی۔

"تغیر" اور "اضافیت" کی طرح ایک لفظ "ترقی" بھی ہے، جس کا اشتراکی نقادوں نے بہت ہی غیر ذمہ دارانہ استعمال کیا ہے۔ وہ "ترقی پسندی" اور "اشتراکیت" کو ہمیشہ مترادف الفاظ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور اس لفظ پر انہوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے لیکن یہ اجارہ داری اب ختم ہو جانا چاہئے۔ ترقی پسندی کا صرف ایک ہی مفہوم ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے اعمال کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھے جن کی افادیت زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لئے ذریعۂ رحمت ثابت ہوتی رہے۔ آیئے ہم اشتراکی اصولوں کو انسان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر منطبق کرکے دیکھیں کہ وہ کہاں تک ترقی پسندانہ ہیں۔

سیاسی ترقی کا تجزیہ

انسان مختلف ادوار میں مختلف خداؤں کی پرستش کرتا رہا ہے۔ یہ ادوار توہم پرستی سے شروع ہو کر بادشاہ پرستی، نسل پرستی، قوم پرستی، وطن پرستی سے گذرتے ہوئے خالص نفس پرستی پر ختم ہوتے ہیں۔ زیادہ غور کرنے سے ان تمام صورتوں میں ہمیں دو چیزیں مشترک نظر آتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان نے جب بھی خدا کی حکومت سے بغاوت کی ہے۔ وہ ہمیشہ ہزاروں دوسرے خداؤں کا ذلیل شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ آج ہم اگر سرمایہ داروں اور اشتراکیوں کے خداؤں کی ایک فہرست مرتب کریں تو اُن میں خاص خاص خداؤں کے نام یہ ہونگے۔

سرمایہ، قوم، نسل، رنگ، اسٹالن، روٹی، شہوانیت، غیر محدود انفرادیت، فرعونی اجتماعیت،

دوسری بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی صورت ایسی نہیں ہے جو نفس پرستی سے خالی ہو، اگرچہ اس نفسانیت کی تکمیل مارکسی فلسفہ سے ہوئی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ نفس پرستی بغیر جبر کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے فرعون سے لے کر ٹرومن اور اسٹالن تک سب نے مختلف نام دے دے کر اس پالیسی کو اپنایا ہے۔ اس پالیسی کے آخری دو نام "جمہوریت کی حفاظت" اور "عوامی راج" ہیں۔

اِن تمام سیاسی تصورات کے بالمقابل قرآن کے اِس انقلابی تصور کو دیکھئے جو اس چھوٹے سے جملے میں پوشیدہ ہے۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (مختلف خدا تمہارے لئے بہتر ہیں یا ایک خدائے قہار) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (سروری کا زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے)

صرف یہی ایک ایسی صورت ہے جو انسان کو شہوانیت، فرعونیت اور آمریت کی غلامی سے نجات دلا سکتی ہے، یہی اور صرف یہی صورت ہے کہ انسان حاکم اور محکوم طبقے میں تقسیم ہونے سے محفوظ رہے اس لئے یہی ترقی پسندانہ سیاسی نظریہ ہے۔

معاشی ارتقا کا جائزہ

اب معاشی ارتقا کا سوال آتا ہے۔ کیا "قومی ملکیت" سے سرمایہ دارانہ جبر و استحصال کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا "قومی ملکیت" سرمایہ دارانہ ذہنیت کی آخری کڑی اور عوام کو لوٹنے کا بدترین آلۂ کار ہے؟ ان سوالوں کے جواب کے لئے مندرجہ ذیل مقدمات پر نظر ڈالئے۔

ع یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مارکس کے بعد سے دنیا میں بڑی تبدیلیاں ہو چکی ہیں ذرائعِ پیداوار بھی بہت بدل چکے ہیں۔ مارکس "بھاپ" کے دور کا فرد ہے اور "بجلی" کا دور ہے۔ بلکہ اب تو انسان "ایٹمی" دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ اگر تغیر کا یہی سطحی مفہوم لیا جائے، تو مارکسی فلسفہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔

دُنیا کا کوئی بھی نظامِ حکومت ہو، حکومت کی مشینری کو چلانے والے بہرحال چند ہی اشخاص ہوں گے۔ مارکسی نقطۂ نظر سے اخلاق و مذہب معاشی استحصال کے ذرائع سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ایسے اخلاق سے بے بہرہ لوگوں کے ہاتھ میں فوج، زمین، کارخانے، ریڈیو، سینما، کالج اور ہسپتال، غرض دُنیا کی ہر چیز پہونچ جاتی ہے۔

کیا ایسے لامحدود اختیارات حاصل کرکے یہ لوگ یکایک معصوم فرشتے بن جاتے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر اشتراکیوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں آجاتی ہیں تو سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے سیاسی حریفوں اور نکتہ چینیاں کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ رہ گئے عوام تو ان کو جانوروں کی طرح وہی کام کرنا ہوتے ہیں، جو حکمران طبقہ ان سے کرانا چاہتا ہے۔ دراصل اشتراکی طریقۂ کار کا طبعی نتیجہ یہی ہوتا ہے کوئی دوسری صورت پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اس المیہ کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ عوام کے لئے ایسی حکومت سے نجات پانے کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ اوّل اس لئے کہ عوام کے ہاتھ میں دُنیا کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی (کیونکہ صرف نعرہ بازی، اور جھوٹے پروپیگنڈے سے تو اشتراکی اپنی خواہش کی رائے عامہ بنا کرتے) دوسرے اس لئے کہ عوام کو ہمیشہ یہی باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دُنیا کی ساری نعمتیں صرف اشتراکی ملکوں میں پائی جاتی ہیں، باقی دُنیا میں اور کہیں نہ تو سکول ہیں، نہ ہسپتال، اور نہ عورتوں کو آزادی ہے، نہ رفاہِ عام کی کوئی صورت ہے۔

کیا معاشیات کا یہی ترقی پسند نظریہ ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام ہی کی طرح کیا یہ بھی انسانی آزادی کو ختم کرنے اور عوام کا خون چوسنے کا ذریعہ نہیں ہے؟ آئیے اب ہم اس مثالی نظامِ معیشت کا تجزیہ کریں، جو اسلام ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس نظام کی تین بنیادی خصوصیات ہیں:

سب سے پہلے اسلام احکام (یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی تلقین) اور نواہی (یعنی سود، عیاشی، بدکاری، بے پردگی، جوا، شراب، سٹہ، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کی ممانعت) کے ذریعہ افراد کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ ان میں انسانی ہمدردی، ذمہ داری اور عالمگیر اخوت کا احساس پیدا ہو۔ دُنیا کی ہر چیز کو خدا کی ملکیت قرار دے کر وہ خود غرضی جیسے خبیث عامل کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

پھر وہ یہیں پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ہر شخص کی بنیادی ضروریات کی کفالت حکومت کی ذمہ داری پر ڈال دیتا ہے تاکہ کوئی فرد کسی دوسرے پر معاشی دباؤ نہ ڈال سکے۔

اس نظام میں عوام کو اتنی آزادی دی گئی ہے کہ ایک معمولی بدو خلیفۂ وقت کا دامن پکڑ کر سوال کرے کہ سب کو ایک ہی چادر ملی ہے، تونے دو چادریں کہاں سے لے لیں۔

ہم دُنیا کے اہلِ نظر سے سوال کرتے ہیں کہ وہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا فیصلہ کریں۔

معیشت اور سیاست کے ان بنیادی تصورات کو اگر عملی شکل میں دیکھنا ہو تو اسلام اور اشتراکیت کے سب سے بڑے علمبرداروں کی سوانح حیات پر نظر ڈالئے۔ ایک وہ تھے کہ دس دس ملکوں پر بیک وقت حکومت کرتے ہوئے بھی سوکھی روٹیاں کھاتے تھے۔ بارہ پیوند کا کپڑا پہنتے تھے۔ جھونپڑی میں رہتے تھے۔ زمین ہی پر سو رہتے تھے، اور تکیہ کے بجائے سر کے نیچے پتھر رکھ لیا کرتے تھے۔

دوسری طرف روس کے اشتراکی راج کے بانی مارشل اسٹالن صاحب اپنے گمشدہ بیٹے کی تلاش کے لئے اسی ہزار پونڈ کا انعام رکھتے ہیں اور شہنشاہِ ایران کی شادی میں لاکھوں روپے کے تحفے بھیجتے ہیں۔

ایک طرف وہ لوگ تھے کہ ایک ایک مسلم کی فریاد پر پورے مسلمانوں کو مدد کو طلب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں

"تم نے انسانوں کو کب سے غلام بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد ہی پیدا کیا تھا"

دوسری طرف یہ مساوات کا ڈھونگ رچانے والے ہیں، جن کے نزدیک غیر اشتراکی کو تو خیر زندہ رہنے کا حق ہی حاصل نہیں، لیکن خود ٹراٹسکی جیسے زبردست اشتراکیوں کو بھی محض اس جرم میں قتل، خودکشی یا جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے صاحبِ اقتدار طبقہ پر نکتہ چینی کی۔ یہ بھی ایک عجیب ہتھیار ہے کہ جس نے تنقید کے لئے منہ کھولا اسے فوراً سرمایہ دار، رجعت پسند، قدامت پرست کہکر زندہ درگور کر دیا۔

معاشرتی ارتقاء | اب ہم اس مسئلہ کے تیسرے حصے یعنی معاشرتی ترقی کو پیش کریں گے: "COMMUNIST MANIFESTO"

اور "CAPITAL" (جو اشتراکیوں کے لئے قرآن اور انجیل سے کم نہیں) کو پڑھکر ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ آخر ایک اشتراکی سماج اور ایک حیوانی سماج میں کون سی ایسی چیز ہے جسے ہم وجہ امتیاز بنائیں۔ معاشرت کا سب سے اہم پہلو عورت اور مرد کے جنسی تعلقات پر قایم ہے۔ اگر انسان کی معاشرتی ترقی یہی ہے کہ وہ کتوں، گھوڑوں اور گدھوں کی طرح صنفی تسکین کا سامان کرے۔ تو ہم اپنی "رجعت پسندی" پر فخر کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اور ہرگز ایسا نہیں ہے، تو ہمارے لئے اسلام سے بہتر کوئی راہ نہیں۔ جس میں نکاح کو انتہائی آسان اور زناکاری کو انتہائی مشکل بنادیا گیا ہے۔

دوسرا مسئلہ عورت کی آزادی کا ہے۔ یہاں پھر اگر آزادی کا وہی مفہوم ہے جس کا اُوپر تذکرہ ہوا۔ تو یقیناً ایسی آزادی اسلام میں نہ مردوں کو حاصل ہوسکتی ہے، اور نہ عورتوں کو۔ آزاد جنسی اختلاط کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ لیکن اگر آزادی سے مراد تعلیم کی آزادی، تقریر کی آزادی، انجمنیں بنانے کی آزادی یا ایک فقرے میں، اپنی خودی کو آشکارا کرنے کی آزادی ہے، تو اسلام نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کے لئے ہر طرح کے موقع فراہم کرتا ہے۔ اِس سلسلے میں اسلام کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے عورت کی معاشی کفالت کی ذمہ داری مرد پر ڈال دی ہے۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام معاشرت کا عورت پر یہ سب سے بڑا ظلم ہے، کہ ماحول انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ تلاش معاش کی فکر کریں، عورت کو ایک جھوٹی مساوات کا دہوکہ دیا گیا ہے، ایک عورت حیض و حمل کی مصیبتیں بہر حال اٹھائے گی، اب اگر اسے کلرکی اور مزدوری بھی کرنا پڑے، تو یہ عورت کی تباہی، اور نتیجتاً انسانی معاشرت کی تباہی ہو گی، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، کہ اسلام نے عورت کو مرد کی معاشی غلامی میں دیدیا ہے۔ عورت کو وہ تمام پیشے اختیار کرنے کی اجازت ہے، جو آزادانہ جنسی اختلاط سے الگ ہوں لیکن یہ صرف اجازت ہے، کوئی تاکیدی حکم نہیں ہے اور ہر حالت میں اس کا قانونی حق شوہر، باپ اور ریاست پر باقی رہتا ہے۔

ایسا ہی آزادانہ ماحول اُن عورتوں کو جنم دیتا ہے جو اپنے بیٹے کی لاش کو سُولی پر چڑھا دیکھکر کہہ دیتی ہیں۔ "اچھا، یہ سوار ابھی تک مرکب سے نہیں اترا"[۹] ایک مسلمان عورت محض معاش یا پردے کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوسکتی کیونکہ "نیم مرد" بننے کی کوشش کئے بغیر اس کو اسلامی معاشرہ میں وہی عزت کا مقام حاصل ہے جو مرد کو ہے لیکن ایک سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نظام میں جب تک وہ دفتروں اور کارخانوں میں مردوں کی ہوس کا ہدف نہ بنے، اُسے کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان عورت اپنی نسائیت پر فخر کرتی ہے۔ کیونکہ مزدوری اور کلرکی کے بغیر بھی وہ انسانی سماج کے لئے اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ مرد۔

ھُنّ لباسٌ لکم و انتم لباسٌ لھنّ (قرآن) (عورتیں تمہارا لباس ہیں؛ اور تم عورتوں کیلئے لباس ہو) ولھنّ مثل الذی علیھن بالمعروف (قرآن) (اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے کہ مردوں کے) ما اکرم النساء الا کریم، وما اھانھنّ الا لئیم (حدیث) (عورتوں کی عزت وہی کرتا ہے جو خود شریف ہے اور ان کی وہی شخص تحقیر کرتا ہے جو خود کمینہ ہے) طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مرد اور عورت پر فرض ہے)

اشتراکیوں کو جہاں کہیں بھی کامیابی حاصل ہوئی وہ ہرگز ہرگز اس لئے نہیں ہوئی کہ اشتراکیت میں کوئی ترقی پسندانہ عنصر بھی شامل ہے بلکہ صرف اس لئے ہوئی کہ مارکس نے انسان کے سفلی جذبات کو اُبھار کر انہیں ایک منظم شکل دیدی ہے۔ لڑکیوں کو آزادی کا دھوکہ دیکر نوجوانوں کو دعوتِ نظارہ دی جاتی ہے، یہ چیز اُن کی کشش کے لئے ایک زبردست رشوت ہے۔ عورتوں کا اتنا ذلیل استعمال شاید کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ آج اُن لوگوں کی کوششیں بھی دھندلی ہوگئیں، جو عورتوں کو زہریلی ناگن اور بس کی گانٹھ کہہ کہہ کر ذلیل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

کاش عورتیں اپنی حالت پر غور کریں

(باقی آیندہ)

---

[۹] ہم کو یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ یہ نوجوان عام طور پر بورژوا طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ آزادی کی متوالی لڑکیاں بھی۔

ہمارا ادب اور ہمارے فرائض

محب اللہ ندوی۔ ایم۔ اے

ادب نہ تمام تر "برائے ادب" ہوتا ہے اور نہ تمام تر "برائے زندگی" بلکہ معتدل نظریہ یہ ہے کہ ادب، برائے ادب بھی ہوتا ہے اور برائے زندگی بھی جو ادب محض "برائے زندگی" ہوگا وہ نرا فلسفہ ہے۔ اسے ادب کہنا غلط ہے اور اسی طرح جو ادب صرف برائے ادب ہو، اُسے آخر ادب کیوں کہا جائے۔ اس کا نام صناعی کیوں نہ رکھا جائے، اور اگر صنعت و نقش نگاری کو لکڑی پتھر ہی کے ساتھ مخصوص ہونے پر اصرار ہو تو اس قسم کے ادب کو زیادہ سے زیادہ مصوری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ خواہ مخواہ ادب کا ایک نیا نام تراشنا محض زیادتی ہے۔

ادب دراصل نام ہے حیات و کائنات پر نقد و تبصرہ کا، ایسے انداز میں جو ہمارے اندر نہ صرف یہ کہ فہم و بصیرت کی روشنی پیدا کرے بلکہ احساس و وجدان کو بھی بیدار کر دے۔ عمدہ ادب وہی ہے جو ہماری دنیا کو نہ تمام تر جذباتی بنا دے اور نہ تمام تر ذہنی و خیالی، بلکہ عقل اور دل دونوں کو باہم متوازن رکھے، جذبات کو فہم و بصیرت کی گرفت سے آزاد کر کے ہم کو بدمست اور شتر بے مہار نہ بنا دے یا پورے طور پر عقل و فراست کا قیدی بنا کر ہم کو بیکار نہ کر دے۔ جو قوم اس قسم کا معتدل ادب رکھتی ہے وہ آگے بڑھتی ہے لیکن جس قوم کا ادب غیر معتدل اور غیر متوازن ہوتا ہے وہ یا تو محض سوچتی رہتی ہے یا پھر جذبات کی دنیا میں مست ہو کر اپنی انسانیت کھو بیٹھتی ہے۔

بدقسمتی سے اُردو ادب نے اپنے کسی دور میں بھی اس معیار کو سامنے نہ رکھا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں اس نے باقاعدہ ادبی حیثیت اختیار کی۔ یہ زمانہ فہم و حکمت کا زمانہ نہ تھا۔ سنجیدہ اخلاق اور بلند کرداری کا عہد نہ تھا۔ پورا ملک پست جذبات کا شکار رہتا۔ سیاسی قوت میں انتشار سہی لیکن عیش و عشرت کے مظاہر میں کوئی ابتری نہ تھی زندگی کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین نہ تھا۔ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کا دلدادہ اور حیوانی لطف و مسرت کا شیدائی تھا۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواندہ اور ناخواندہ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو زمانہ کے تقاضہ کو پورے طور پر سمجھتا ہو اور اس کے مطابق ملک کے خیالات و جذبات کی تنظیم کا صحیح احساس رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کا ادب کوئی اُونچا معیار ہمارے سامنے پیش نہیں کرتا۔

نزولِ آفات اور ہجوم مصائب کے بعد ہمارے ادیبوں کی آنکھیں ضرور کھلیں مگر افسوس کہ اس موقع پر بھی انہوں نے زندگی کا صحیح جائزہ نہیں لیا ضرورت تھی کہ وہ اجتماعی جذبات کو بیدار کرتے۔ مگر بجائے اس کے انہوں نے تمام تر انفرادیت کو سامنے رکھا اور خودی کی اہمیت کو نظر انداز کر کے یاس و قنوطیت کو اپنا موضوع بنا لیا۔ بعض عمدہ مضامین بھی ان کے یہاں آئے مثلاً صبر۔ توکل۔ قناعت وغیرہ۔ اس وقت ان کی تعلیم ضروری تھی مگر افسوس کہ ان کی خوشنمائی محض عنوان کی حد تک رہی۔ ورنہ ان کا جو غلط مفہوم ہمارے ذہن نشین کیا گیا اس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

اِس دور کے شعر و ادب کے متعلق یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں۔ اُردو تنقید کے مشہور اصحاب فکر نے قریب قریب اسی رائے کا اظہار کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی شاعری نے قوم کے مذاق کو بالکلیہ تباہ کر کے رکھ دیا۔ عشق مجازی کے پردہ میں عشقِ حقیقی کا سراغ عوام کیا لگا سکتے ہیں۔ عوام تو وہی سمجھیں گے جس کی الفاظ رہنمائی کریں۔ پھر اگر درون بطن شاعر کی صحیح تشریح شرح و حواشی سے ہی ہو سکتی ہے تو پھر ہر زبان کے افکار غیر پسندیدہ میں تصوف و اخلاق کے نکات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکثر اشعار کو استعارہ و کنایہ کا سہارا دے کر بلند معانی کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے مگر انہیں دواوین میں ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جو صاف طور پر بتائیں گے کہ کہنے والا عشق حقیقی کی وادی میں نہیں بلکہ عشق مجازی کے کوچے میں گھوم رہا ہے۔ ورنہ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ مثال کے طور پر میر کو لے لیجئے۔ اُردو شعر و ادب میں ان کے مرتبہ سے ہر شخص واقف ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب ✦ اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

استعارہ و کنایہ کی پوری تفصیل کے بعد بھی آج تک کوئی پاکیزہ تاویل مجھ میں نہیں آتی۔ مرزا غالب کسی تعارف کے محتاج نہیں، اقبال بھی ان

سے پیرِ مرغِ تخیل کی نارسائی دیکھکر حیرت کا اظہار کر گئے ہیں۔ غالب کا بھی ایک شعر ملاحظہ فرما لیجئے ؎

وصول دمتیا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ٭ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

جس مجموعہ میں ایسے اشعار ہوں انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ یا تو ان اشعار کی توضیح بقیہ اشعار کی روشنی میں کی جائے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو کیوں نہ بقیہ اشعار بھی اسی نوع کی چیز سمجھے جائیں۔ جبکہ الفاظ بھی اس کی طرف رہنمائی کر رہے ہوں۔[1]

یہ ہمارے شعر و ادب کا پہلا دور تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ انگریزی حکومت مضبوط ہو چکی ہے۔ سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی غلام ہو چکے ہیں۔ سوسائٹی صرف مغربی تہذیب و معاشرت ہی کو اپناتی نہیں چلی جا رہی ہے بلکہ فکر و عمل کے ہر گوشہ میں مغربی علم و حکمت کے بت نصب ہوتے چلے جا رہے ہیں ہمارا شعر و ادب بھی قدیم روش چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر رہا ہے۔ نظم و نثر میں ایک انقلابِ عظیم نظر آ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب مغرب کے فیض سے ادب و زندگی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور ہمارا ادب ہماری زندگی کے ہر مرحلہ پر ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ سرسید اسکول کے افق سے اس امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جمود میں حرکت اور سکون میں جنبش ضرور پیدا ہوئی۔ مگر ہر حرکت اور ہر جنبش کو زندگی کے آثار میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ خودکشی بھی تو آخر ایک قسم کی جنبش ہی ہے مگر اس حرکت میں زندگی نہیں ہلاکت ہے، میرے نزدیک بالکل یہی حال اس دورِ ثانی کا ہے۔ قدیم شاعری اپنی تمام برائیوں کے باوجود پوری قوم کے لئے مہلک نہ تھی۔ اس کا تعلق پوری قوم سے نہ تھا۔ ایک مخصوص حلقہ کی چیز تھی اور پھر دوسرے یہ کہ دورِ اول کا ادب محض ایک ذریعۂ تفریح تھا۔ نوابوں اور امیروں کی محفلوں میں غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ تھا جو بہت عوامی ہوا تو مشاعرہ کی حد تک پہنچا۔ اس سے زیادہ اس کی وسعت نہ تھی کسی خاص نظریۂ حیات کی اشاعت یا کسی خاص مسلک کی دعوت کا کام اس سے نہ لیا جاتا تھا۔ دورِ اول کا ادب تمام تر برائے ادب تھا۔ مگر دورِ ثانی میں یہ بات نہ رہی۔ اس زمانے کا ادب مقصدی اور اصلاحی بن گیا۔ مگر افسوس کہ ادب برائے زندگی کے حامیوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ ان کی مغرب کی کورانہ تقلید مغربی زہر کو شیریں بنا بنا کر حلق کے نیچے اتار رہی ہے، ایک تو یونہی مذہب عملاً مسجد و خانقاہ کا ہم معنی ہو گیا تھا۔ اب عقلاً اور عقیدۃً بھی اس کی صداقت پر ضرب لگ رہی تھی۔ یورپ نے مذہب کو ایک پرائیویٹ چیز قرار دے کر مادی ترقی حاصل کی تھی اور مادی ترقی ہی کو قدر و قیمت کی چیز اور زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا۔ ہمارے مغرب زدہ مصلحین نے بھی اس نظریہ کو اپنا فلسفۂ حیات بنایا۔ ان کی نگاہوں میں بھی اصل چیز مادی ترقی ہی قرار پائی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اخلاقی قدروں کو بھی اپنے ادب میں جگہ دی مگر اس کی حیثیت ثانوی درجہ کی رکھی۔ اس زمانے کے پورے لٹریچر کو پڑھ جائیے۔ یقیناً ہر صفحہ بلکہ ہر سطر میں مذہب، اخلاق، تہذیب اور شرافت کا تذکرہ ملے گا۔ لیکن جب آپ کتاب ختم کر کے اٹھیں گے تو اس احساس کے ساتھ اٹھیں گے کہ یہ سب صحیح مگر بغیر مادی ترقی کے یہ سب قدریں بیکار ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والا بجائے اعلیٰ اخلاقی نظریۂ حیات کے مغرب کے فلسفۂ زندگی پر ایمان لا چکا ہے۔ اور اس نئے مذہب فکر کا مطیع پوری قوم کو بنا تا چلا جا رہا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اپنی اس گمراہی کو نہ رہبر محسوس کر رہا ہے نہ راہ رو، اس دور کے رہنماؤں اور ادیبوں نے مسجد میں ملا کی اذان سن کر مذہب کو بالکل محفوظ سمجھا اور یہ نہ دیکھا ایک فرعون ان کی آیندہ نسلوں کو قتل کر رہا ہے۔ کام ہلاک کرنے ہی کا ہو رہا ہے صرف صورت بدلی ہوئی ہے۔ سب سے پہلے اس دور میں اس حقیقت پر اکبر کی نظر پڑی اور اپنے خاص انداز میں اس نے اس راز کو فاش کرنا شروع کیا ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا ٭ افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مگر اکبر بھی اصل مرض کا کوئی علاج نہ بتا سکا، اس نے مرض کی تشخیص ضرور کی، خطرہ کو محسوس بھی کیا اور کرایا بھی، لیکن کوئی نسخۂ کیمیا نہ دے سکا۔ یہ حصہ اقبال کا تھا۔ اردو ادب میں اقبال وہ تنہا شخص ہے جس نے ادب سے پہلے پہل صحیح طور پر کام لیا۔ اس کا ادب، برائے ادب بھی ہے اور برائے زندگی بھی

---

[1] مقالہ نگار کا یہ خیال اپنی جگہ درست ہے کہ قدیم روائتی شاعری کا بیشتر حصہ غیر اخلاقی عناصر کی آمیزشیں لئے ہوئے ہے، لیکن اس خیال کی بنیاد پر وہ صالح عنصر کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جو گو مختصر ہی مگر قدیم روائتی شاعری کے سرمائے میں کبھی کبھی غیر شعوری طور پر بھی داخل ہوتا رہا ہے۔ مجموعی تاثر سے کسی چیز کی افادیت تو جانچی جا سکتی ہے لیکن حقائق کو جھٹلا کر اچھائی یا برائی کا یکسر اطلاق درست نہیں، اور پھر مستقبل میں ادب کی تعمیر کے یہ معنی کب ہوتے ہیں کہ ماضی یا حال سے مطلقاً گریز کیا جائے۔ (ن۔ ق)

اس سے احساس و وجدان بھی بیدار ہوتے ہیں اور فہم و بصیرت کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ اس کے یہاں فن بھی ہے اور زندگی بھی۔ مصوری بھی ہے اور حکمت و فلسفہ بھی۔ بجا طور پر امید کی جا سکتی تھی کہ جب ملک کے سامنے اتنا عمدہ نمونہ آ چکا ہے تو اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔ مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"
اقبال کی زندگی کی ابتدا اس غریب کی ذات سے ہوئی اور اسی پر ختم ہوئی۔

پھر ادیبوں نے ایک نیا میدان اپنے لئے تلاش کر لیا۔ جو مصرعۂ طرح کی مانند چل پڑا۔ یہ نیا دور ترقی پسندی کا دور تھا۔ ماسکو اس کا کعبۂ مقصود اور روس کا فلسفۂ حیات اس کا مذہب طے پایا۔ ہمارے ترقی پسند اصحاب اس کا اقرار کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حیثیت ہے کہ ترقی پسندوں کا ادب ایک پروپگنڈہ لٹریچر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اشتراکیت کو زندگی کے لئے بہترین مسلک سمجھتے ہیں اور نئے سانچوں اور نئے تقاضوں کا نقاب ڈال کر اپنے اس فلسفۂ حیات کو عوام میں مقبول بنانے کی خاطر ادب سے فائدہ اٹھا رہے ہیں یہ بات اگر یہیں تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی مگر افسوس تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ادب میں پوری بیباکی سے اخلاقی بیہودگی کو راہ دی۔ ہمارے یہ ادبا مرد عورت کو اپنے ادب میں پوری عریانی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ پھر ان کے مختلف اعضا کی سختی نرمی، نشیب و فراز اور سطح و عمق وغیرہ کو ایک ایک کر کے ٹٹولتے ہیں۔ اور اس طرح ٹٹولتے ہیں کہ شرافت ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جانے کی تمنا کرنے لگتی ہے۔

ایک انقلابی شاعر ایک عورت کو کپڑے بدلتے دیکھ کر "زندگی کی ترجمانی" پر اتر آتا ہے اور اس کی زبان "حقیقت ترجمان" اس طرح گویا ہوتی ہے

نیم عریاں ہی نہا کر تو چلی آئی ہے
رس بھرے میووں سے لبریز ہے جنت تیری
صاف آئینہ میں رقصاں ہے ترا عکس جمیل

اس طرح کے چند بند کہہ جانے کے بعد وہ محسوس کرتا ہے کہ حقیقت کی صحیح ترجمانی ابھی نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے اس کی تکمیل یوں کی جاتی ہے

چھٹا جاتا ہے ترے جسم سے یوں تیرا قمیص + ڈر ہے شانے نہ بٹن توڑ کے عریاں ہو جائیں
نیفہ سرکا کے نہ بل ریشمی شلوار میں ڈال + ڈر رہا ہوں کہ کہیں یہ ترا مطلب تو نہیں
کہ مجھے منزلِ مقصد پہ پہونچنے کے لئے + اتنے پُرپیچ مراحل سے گذرنا ہو گا

یہاں انقلابی شاعر اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ہفت خواں کی پُرپیچ منزل تک پہونچنے کے لئے اسے سخت مصائب برداشت کرنے پڑیں گے۔ خدا معلوم منزلِ مقصود تک پہونچنے میں کامیابی ہو گی بھی یا نہیں۔ اس لئے کچھ فرمائش کرتا ہے۔ لڑکی اس فرمائش کو ٹھکرا دیتی ہے بس پھر کیا تھا۔ وہ رجعت پسندوں کے تمدن سے بگڑ جاتا ہے اور خاص اشتراکی زبان میں اس کو تمدن کا ظلم قرار دیتا ہے۔ لڑکی کو یہ سمجھاتا ہے کہ یہ تم پر تمدن کا ظلم ہے، پھر ایک فرمائش کر کے ناخوش ہو جاتا ہے۔

اِس تمدن نے بڑا ظلم کیا ہے تجھ پر + ہر حسیں شے پہ ضروری تو نہ تھی قیدِ حجاب
خیر ہنستی ہوئی اٹھلاتی ہوئی گھر سے نکل + آنکھیں بچھنے کو ہیں بیتاب ترے رستوں میں

یہ شعرا و ادبا، ان لوگوں کو جو اشتراکیت پر ایمان نہیں لائے ہیں شہنشاہیت پسند، عوام کے بدخواہ اور انقلاب کے دشمن سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو جمہوریت پسند، عوام کا خیرخواہ اور انقلاب دوست، مگر داد دیجئے انقلاب بپا کرنے کے اچھوتے طریقے کی، ایک مہ لقا اور مہ جبیں کو دعوتِ انقلاب دی جا رہی ہے۔

اے مہ لقا، اے مہ جبیں
تجھ کو قسم اس جسم کی
تجھ سے مری درخواست ہے
جنتا کی تو اک فرد ہے
میں بھی اسی کا رکن ہوں
میں اور تو چاہیں تو کر دیں انقلاب

کس طرح؟ اسے اب سنئے۔ انقلاب بپا کرنے کے طریقہ کی تلقین اس طرح کی جا رہی ہے۔

گر ایک رات
کرے بسر تو میرے ساتھ
تو حرج ہی کیا، کچھ نہیں
کوئی دیکھے گا نہیں، کوئی جانے گا نہیں

تہذیب و شرافت اجازت نہیں دیتی ورنہ اس سے زیادہ فحش چیزیں انقلاب و ترقی کے مسحور کن نام پر ان کے یہاں موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ ترقی اور جدت کے الفاظ سے مرعوب ہو کر اسی قسم کے لٹریچر کو ہاتھوں ہاتھ لے رہا ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہماری موجودہ اور آیندہ نسل کس قسم کی ذہنیت اور کس قسم کے اخلاق کی مالک ہوگی۔ اردو شعر و ادب کی اس پوری تاریخ کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ تھا ہے کہ جو لوگ صحتمند ادب کی تخلیق چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے اپنے گذشتہ و موجودہ ادب کا جائزہ لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ان کا مقابلہ کس سے ہوگا اور ان کا محاذ کونسا ہوگا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے قدیم و جدید ادب کے متعلق ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے جائزہ کو تلخیص کی صورت میں سامنے رکھ دیں۔ جائزہ کے مطابق ہمارے شعر و ادب کی تقسیم دو حصوں میں ہو سکتی ہے قدیم ادب اور جدید ادب۔

قدیم ادب کی بنیادیں حسب ذیل موضوعات پر ہیں۔

(۱) تصوف اور اخلاق کا مسخ شدہ فلسفہ
(۲) بیمار تصورات حسن و عشق
(۳) رومانی تخئیلیت

اور جدید ادب کے اساسی عناصر یہ ہیں۔

(۱) معاشی ناہمواری کی تشہیر
(۲) اخلاقی اور سماجی ضابطوں سے نفرت
(۳) انقلاب کے نام پر تخریب و انتقام

اب تعمیری ادب کے حامیوں کے سامنے سوال یہ آتا ہے کہ وہ کیا کریں۔ جواب صاف ہے۔ وہ اپنا ایک خاص نصب العین، ایک خاص فلسفہ حیات رکھتے ہیں۔ ایک مخصوص طرز فکر کے مالک ہیں۔ اس حیات و کائنات کو کھیل نہیں سمجھتے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ دنیا کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد کا میدان ہے۔ ظاہر ہے کہ تعمیری ادب کے حامیوں کو اردو ادب کے پورے سرمایۂ نظم و نثر میں ایسا مواد کم ہی ملے گا۔ عمدہ ادبیات سے اردو قطعاً تہی دامن تو نہیں ہے لیکن وہ حصہ اتنا کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ہمارے سامنے کوئی اتنا صحتمند ادب موجود نہیں ہے تو پھر کس چیز کو ہم نمونہ بنا کر کام کریں۔ میرے نزدیک اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے قرآنی حقائق کا نہایت گہرا مطالعہ ہونا چاہئے۔ نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ قرآن جس قسم کا اعلیٰ معاشرہ عملی طور پر وجود میں لانا چاہتا ہے اس کی صحیح تصویر اپنے تمام خد و خال کے ساتھ ہماری قوت متصورہ کے سامنے آ جائے۔ اور دلائل و براہین سے ذہن مزین ہو کر وجدان کے ارتقا میں تعاون کر سکے۔ جب یہ کچھ ہو جائے تو پھر اردو ادب پر پورا عبور حاصل کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جدید رجحانات کا علم اور ترقی پسند افکار سے واقفیت بھی بہم پہنچانا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ آپ صحیح معنوں میں فاسد ادب کو دنیا سے فنا کرنا چاہتے ہیں تو آپ خواہ ناول لکھیں یا افسانہ اور شعر و شاعری کو اپنا موضوع بنائیں یا ڈرامہ کو آپ کے قلم سے جو سطر بھی نکلے اس سے ایک طرف اگر خیالات میں انقلاب ہو تو دوسری طرف جذبات میں طاقتور طوفان اٹھنا چاہئے۔ جب یہ سب کچھ کر لیا جائے تب کہیں جا کر موجودہ ادب کے منفی اثرات سے سوسائٹی

کو بچایا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کے بغیر کوششیں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکیں گی۔

معیار:— مقالہ نگار نے خاصی محنت سے اپنے مخصوص انداز میں ادب کے مختلف ادوار کا جائزہ لیکر قارئین کو ایک نتیجہ پر پہونچانے کی کوشش کی ہے خصوصاً نذیر احمد، حالی، شبلی کے دور کے ضمن میں جو انگریزی تسلط کے بعد سے شروع ہوتا ہے بڑی جچی تلی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ترقی پسند ادب پر مقالہ نگار سرسری سی نظر ڈال کر گذر گیا ہے۔ ترقی پسند ادب کی بنیاد عریانیت پر ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ اہم کچھ اور قدریں بھی ہیں جن کا خود مقالہ نگار نے تذکرہ کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان سب ہی بنیادی اقدار کا ویسا ہی تنقیدی جائزہ لیا جاتا جیسا کہ عریانیت اور فحش نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادب کے جائزہ کے بعد تعمیری ادب سامنے آتا ہے۔ اور یہی تنقید نگار کا مقصود اصلی ہے۔ یہ حصہ سب سے زیادہ وضاحت کا مستحق تھا۔ خود عنوان کے لحاظ سے بھی اور تعمیری ادب سے تعاون کے پیش نظر بھی۔ لیکن مقالہ نگار نے ادھر سب سے کم توجہ دی ہے۔

فی الواقع ادبی رجحانات کی ان توضیحات کے بعد یہ سوال بہت اہم ہے کہ اعلیٰ ادب کیا ہے اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے ہم پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں تعمیری ادب کی بنیادیں ایک ٹھوس فکری نظام پر استوار کی جا رہی ہیں۔ یہ نقطہ نظر مخصوص معیار نقد و نظر کا حامی ہے۔ اور اس کا راستہ قدیم روایتی ادب اور جدید انقلابی ادب دونوں سے جدا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں ہر مذہب فکر کے بنیادی خیالات ہی اتنے مختلف ہیں کہ ہر ایک کی حیثیت کا تعین ان ہی کی بنیاد پر ہو جاتا ہے۔ قدیم روایتی ادب زندگی کو جامد تصور کرتا ہے، اور کائناتی نظام میں اپنے آپ کو مجبور محض سمجھکر زندگی کی دوڑ دھوپ سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس موجودہ انقلابی نظریات ادب، زندگی کی باگیں سراسر اپنے خود مختار ہاتھوں میں لے کر چلانا چاہتے ہیں۔ اور کسی کائناتی نظام یا اخلاقی ضابطہ کے قائل نہیں۔ ان کے یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ اور ہر چیز نامکمل، یہاں تک کہ کائناتی نظام اور اخلاقی اقدار بھی اس سے مبرا نہیں، وہ ان میں بھی تبدیلی کی گنجائش سمجھتے ہیں اور سماجی انقلاب کے لئے کسی ایسے اصول کے پابند نہیں جو ہر دور کی ضروریات یکساں طور پر پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ان دونوں تصورات سے الگ تعمیری ادب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کائنات ایک منضبط نظام اور پائیدار ضابطہ لئے ہوئے ہے۔ اور ہر شے کی حرکت و نمایت، جمود و تعطل، تعمیر و ترقی، تخریب و انتشار، سعی و جہد، تفاضل و تساہل میں ایک طاقتور ترین اور برتر انتظام و انصرام اور نگرانی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار اٹل ہیں۔ زمان و مکان کی حدود سے بالا اور تغیر سے بے نیاز، آدمی نہ مجبور محض ہے نہ بالکل خود مختار، متوازن راستہ جبر و اختیار کے بیچ میں سے گذرتا ہے اور انسانی فلاح کائناتی ضابطہ اور اعلیٰ ترین اخلاقی نظام کی پیروی میں مضمر ہے۔ اصل سرچشمۂ تخریب و انتشار معاشی ناہمواری نہیں بلکہ اخلاقی معیار کا فقدان ہے یہ تعمیری ادب کی بنیادی اقدار ہیں۔ اس تعمیری نقطۂ نظر کے تحت جہاں انسان پر ایک کائناتی ضابطہ عائد ہوتا ہے وہیں حقائق کی نقاب کشائی کے بعد زندگی کے ایک مقصد میں جد و جہد اور سعی و عمل کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ تعمیری ادب کے اخلاقی نقطۂ نظر میں اور قدیم روایتی ادب کے اخلاقی نقطۂ نظر میں بہت بُعد ہے۔ یہاں مسخ شدہ اخلاقی فلسفہ پر ادب کی بنیاد نہیں بلکہ ہمہ گیر اور صحتمند تصور اخلاق پر نظریات قائم ہیں۔ اس ادب میں اعلیٰ اور کامل ترین ہستی سے عشق و شیفتگی اور اعلیٰ مقصد سے لگاؤ ضرور ہے اور اخلاقی حدود میں انسانی محبت بھی پسند کی جا سکتی ہے۔ لیکن زندگی کو ناکارہ کرنے والے ادعا و میلانات کی گنجائش نہیں۔ اور نہ اس رومانی تخیلیت کی جس میں پھنسکر ذہن کارگاہ ہستی کی مشکلات سے خوف کھانے لگتا ہے اور فراری ذہنیت پرورش پانے لگتی ہے۔

ترقی پسند حضرات ادب کی پیدائش کا مقصد وہ بتاتے ہیں جو آگے بڑھکر متعلقہ شعبوں کو اپنی حدود میں لے لیتا ہے لیکن تعمیری ادب اخلاقی اقدار سے ذہنی سعی و جہد کا آغاز کرتا ہے اور آگے بڑھکر معاشی، سیاسی اور سماجی سب ہی مسائل حیات سے بحث کرتا ہے۔ قدیم ادب خالص ذوقی چیز ہے اور ترقی پسند ادب بزعم خود خالص افادی۔ مگر اعلیٰ ادب دونوں کا حسین امتزاج ہوا کرتا ہے۔ یہی تعمیری ادب کا نظریہ ہے۔ پھر جس طرح زندگی تصوری پہلو بھی رکھتی ہے اور مادی بھی، اعلیٰ ادب میں بھی دونوں کی جھلک متوازن ساتھ ہوتی ہے لیکن قدیم ادب کی خامی یہ ہے کہ وہ تصوری زیادہ ہے۔ اور جدید ادب مادی ہے۔ تعمیری ادب بنیادی طور پر اپنے آپ کو تصوری اور مادی کا متوازن رکھنا چاہتا ہے جیسا کہ ہر اعلیٰ ادب کی خصوصیت ہوتی ہے۔ کسی ایک جزو پر

پُوری توجہ دینے سے وہ اثرات کب پیدا کئے جا سکتے ہیں جو مختلف اجزا کی فطری اور متوازن شیرازہ بندی سے حاصل ہوتے ہیں۔

اب اگر ہم ادب کو صحتمند دیکھنا چاہتے ہیں اور زندگی پر اس کے ذریعہ خوشگوار اثرات ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ موجودہ نظریاتِ ادب اور قدیم روایتی ادب کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں اور ان دونوں خطرناک انتہاؤں سے الگ تعمیری نظریۂ ادب کو اپنائیں۔ یہ نہ صرف تعمیری ادب سے تعاون ہوگا بلکہ براہِ راست ہم ایک اعلیٰ مقصدی زندگی کے حصول کی طرف گامزن ہو سکیں گے، ظاہر ہے کہ اعلیٰ مقصدی اور پاکیزہ صحتمند زندگی انسان کی فطری خواہش ہے، اور اس کے حصول کی کوشش اس کے بنیادی فرائض میں داخل ہے۔ جب یہ طے ہے تو پھر اس سے آگے بڑھکر کیا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اعلیٰ مقصدی اور اخلاقی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ ادب میں بھی وہی نظریہ پیش نظر رکھنا درست ہے جو اپنی تہ میں پاکیزہ اور اعلیٰ اخلاقی و تعمیری تصوّرات رکھتا ہے،

ان چند توضیحی معروضات کے بعد ہم مقالہ کے آخری حصّے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں مقالہ نگار کا رخ یک لخت پوری ادبی دنیا سے ہٹ کر صرف تعمیری ادب کے حامیوں کی جانب پھر گیا ہے۔ انداز تخاطب کی اس بسرعت تبدیلی میں خلا محسوس ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ افادیت کا خیال رکھتے ہوئے۔ عمومی انداز بیان آخری حصّے میں بھی برقرار رکھا جاتا۔ اور ذہن کو خود اس نتیجہ پر پہونچنے کا موقعہ فراہم کیا جاتا جہاں مقالہ نگار زبردستے آیا ہے۔ ہماری ادبی تحریک صرف تحریک اسلامی کے کارکنوں تک ہی محدود نہ ہونی چاہئے۔ ادب سے ہر مکتب خیال کے اشخاص دلچسپی رکھتے ہیں اور ہمیں سب ہی کا خیال رکھنا ہوگا۔ قرآنی حقائق ہمارا معیار ہیں لیکن ادبی دنیا کو ماننے پر تو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی دنیا نعتوں، قصیدوں، اور مرثیوں سے قرآنی حقائق پر ایمان نہیں لا سکتی، ہم اگر اس نازک فرق کا خیال نہ رکھیں گے تو دوسرے مکاتیب خیال کے اصحاب ہماری تحریروں میں قومی ادب کی بُو پاکر چھوڑ دیں گے۔ اور تعمیری ادب کا مقصد ہی ناتمام رہ جائے گا۔

مقالہ نگار نے عالم بننے کی طرف زور دیا ہے لیکن اتنا تو وہ بھی تسلیم کرے گا کہ ہر عالم دین، ادیب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر ادیب، عالم دین، جہاں تک ہمارے ادباء کو اپنے مقصد اور نظریات سے گہری واقفیت حاصل کرنے کی ہدایت کا تعلق ہے، وہ مناسب ہے اور بروقت، لیکن ساتھ ہی ساتھ ادبی اور فنی ارتقاء بھی بنیادی طور پر اہم ہے، اور ہماری ادبی تحریک کے موجودہ دور میں نہایت ضروری۔۔

(ن۔ ک)

زاہد کا سیاسی تفکّر — اس کی غزلوں میں

نجم الاسلام

ابوالمجاہد زاہد کے بارے میں اکثر میں نے سوچا ہے کہ شاید وہ کسی ایسی سیاسی جماعت کا سرگرم کارکن رہا ہے۔ جسے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر بھی ناکامیوں کا ہی منہ دیکھنا پڑا۔ ناکامیوں کا یہ احساس زاہد کے کلام میں اکثر اُبھر آیا ہے اور میری طرح دوسرے پڑھنے والوں کو بھی یہ چیز محسوس ہوئی ہے۔ زاہد نے جب بھی اپنی نظموں کے خاکے بنائے ہیں۔ سیاسی تار و پُود سے بنائے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کے جمالیاتی احساس اور کائناتی تفکّر کے پیچھے بھی مجھے ایک رچی ہوئی سیاسی جذبہ کی تڑپ ملی ہے۔ زاہد کا یہ رجحان کسی سطحی تعلق کی بنا پر نہیں معلوم ہوتا۔ یہ اس کی ذہنی افتاد کا آئینہ ہے۔ وہ ایسا شاعر ہے جس کی زندگی سیاسی طوفانوں اور مشکلات کی چٹانوں سے ٹکراتی اُچھلتی اور راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ زاہد نے زندگی اور اس کی مشکل سے مشکل اور کٹھن سے کٹھن راہوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ مشکل ترین راہ سے گزرا ہے۔ اُس نے ادب کے قدیم ماحول میں آنکھ کھول کر چاروں طرف شعور د احساس و کشمکش و اضطراب اور تلاش و تجسس کی نگاہ ڈال کر جائزہ لیا ہے۔ زاہد نے جب چھیڑا ہے زندگی کے ابھرتے ہوئے مسائل اور اٹھتے ہوئے ہنگاموں کو چھیڑا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ترقی پسندی کا مدعی ہے اور اپنی ذہنی تعمیر کی بنیاد مارکسی نظریۂ ادب پر رکھتا ہے۔ یہ بات ہرگز ترقی پسندی تک محدود نہیں۔ زاہد زندگی کے اس نظریہ پر ایمان رکھتا ہے جو مارکسی نظریہ سے زیادہ سماجی شعور دیتا ہے اور قریب الفطرت بلکہ عین فطرت ہے۔

زاہد زندگی کے اس نظریہ کے ساتھ ہی ساتھ قدیم اسالیب کا بھی کچھ نہ کچھ قائل ہے اور یہ اس کی ذہنی اُفتاد کی انفرادیت ہے۔ زاہد شاعر ہے۔ اُس نے زندگی کے تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

اُس نے نظم کے علاوہ غزل کو بھی اپنے احساسات کا کچھ حصہ دیا ہے۔ اِس غیر متوازن دور میں جب کہ ہر چیز اپنا اصل مقام کھو بیٹھی ہے یہ روش قابلِ ستائش ہے۔ اکثر ناواقف نظموں پر جان چھڑکتے ہیں تو یکسر غزل کی برائی شروع کر دیتے ہیں اور اس پر قدامت زدگی اور بوسیدگی کا الزام لگاتے ہیں اور دوسری طرف کچھ لوگ غزل کے مدّاح ہوتے ہیں تو اس طرح کہ ادب کا بقیہ تمام ذخیرہ انہیں ہیچ نظر آنے لگتا ہے اور ہر نئی چیز گناہ معلوم ہوتی ہے۔

زاہد نے نظموں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد غزل کو چھوا۔ نظموں میں عمومی شعور اس کا سیاسی جذبہ تھا۔ سیاسی موضوعات پر اس نے طرح طرح سے اظہار خیال کیا ہے۔ شاعری میں کھلے کھلے طریقہ سے افکار پیش کرنا کوئی بڑی ادبی کوشش نہ سہی لیکن مقصد کا عشق اور ہر حال میں عشق مقاماتِ این و آں کب دیکھتا ہے۔ زاہد تو کب کا سیاسی موقف بدل چکا۔ اندازِ فکر بدل چکا۔ افکار و خیالات کی باگ موڑ چکا۔ وہ متحدہ قومیت کے نظریات چھوڑ کر اسلامی افکار کی جانب آیا ہے۔ اس لئے پچھلی زندگی کا کچھ نہ کچھ عکس اس میں آج بھی موجود ہے اور یہ بہت حد تک فکری ہے۔ یہ عکس اکثر ناکامی کی تلخی بن کر اُبھرتا ہے، جسے تعمیری احساس و فکر نے ایک نئے مقصد کی خاطر کچھ صحت مند زاویہ دینے کی کوشش کی ہے۔ فکر کا یہ رُخ مستقبل کا اچھا پیشین گو ہے۔

غزل کے میدان میں زاہد ان تمام خصوصیات کے ساتھ قدم رکھتا ہے جو نظموں میں اُس کی نمایاں خصوصیات کہی جائیں گی اور غزل کے مخصوص مزاج کے مطابق وہ خود کو بدلنے کی کوشش کرے بھی تو کامیابی محال ہے۔ اس لئے کہ ذہن پر اس طرح کی ٹھونس ٹھانس موثر نہیں ہوتی۔ غزل میں زاہد کا وہی موضوع رہا ہے جو اُس کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی آزادی کی ناکامیاں۔ آزادی نے زاہد میں ایک ایسی تلخی پوری ہے جسے اس کی شاعری جس دیر میں بھلا سکے گی۔

غزل کے اشعار میں دیکھئے اس نے آزادی پر کیا کچھ کہا ہے۔

قفس سے چھٹنے پہ شاد تھے ہم کہ لذّتِ زندگی ملے گی ✦ یہ کیا خبر تھی بہارِ گلشن لہو میں ڈوبی ہوئی ملے گی

صبح تو ظلمت میں ڈھل کر رہ گئی ✤ زندگی دو گام چل کر رہ گئی
اب ہیں اپنے پانوں اپنی بیڑیاں ✤ اجنبی زنجیر گل کر رہ گئی

یہی کیا وفاداریوں کے صلے ہیں ✤ تمنا تھی پھولوں کی کانٹے ملے ہیں

کریں کس سے اپنی تباہی کا شکوہ ✤ کہ خود رہنما رہزنوں سے ملے ہیں
بہار چمن پر نہ یوں مطمئن ہو ✤ کچھ ایسے بھی غنچے ہیں جو بن کھلے ہیں

شگفتگی گل و غنچہ سے آشکار نہیں ✤ کہیں خزاں تو پسِ پردۂ بہار نہیں

زاہد کی افتادِ طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ خالص غزل کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہوئے بھی سیاسی فکر اس کے شعر کے سانچے میں غیر شعوری طور پر ڈھل جاتی ہے۔ زاہد کے متعلق اس رائے نے اکثر مجھے یہ خیال کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس کے ان اشعار کے پیچھے بھی سیاسی مقصد رقصاں ہے جو بظاہر غیر سیاسی معلوم ہوتے ہیں۔

نہ عشق میں وہ خلوص باقی نہ حسن میں وہ وفا شعاری ✤ وہ ہم نہیں ہیں وہ تم نہیں ہو وہ دل نہیں وہ نظر نہیں ہے

جفا کا بھی نہیں جن کو سلیقہ ✤ سبق دیتے ہیں وہ ہم کو وفا کے
مٹاتے ہو مگر یہ بھی تو سوچو ✤ بنا سکتے بھی ہو مجھ کو مٹا کے
چمن کا غنچہ غنچہ مضطرب ہے ✤ کہاں جاتی ہے شبنم منہ دھلا کے

غزل کے یہ وہ اشعار ہیں جن میں سطحی نظر سے تعبیر کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا لیکن اگر غزل کی زبان اور اس کی روایات کو پس منظر میں رکھا جائے اور شاعر کی اپنی ذہنی حالت سے پیش منظر کا کام لیا جائے تو واقعات منعکس ہو ہو کر صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ زاہد کی ایسی فکر کے چند اچھے نمونے یہ بھی ہیں

آج بھی دار و رسن کا ہو رہا ہے اہتمام ✤ دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں ہے کوئی منصور بھی

دل کی حسرت دل میں پل کر رہ گئی ✤ موج دریا میں اچھل کر رہ گئی

پیچیدہ ہو رہی ہے ہر راہ زندگی کی ✤ گھبرا رہی ہے دنیا تمیز خیر و شر سے

زاہد کا یہ شعر "دل کی حسرت دل میں پل کر رہ گئی" ظاہر میں چند سادہ سے الفاظ کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے لیکن اسی شعر کو سیاسی پس منظر کا سہارا لے کر پڑھا جائے تو کتاب زندگی کا ایک المناک باب سامنے آجاتا ہے۔ اس خصوصیت کی داد غزل کی صنف کو بھی پہونچتی ہے اور زاہد کے سیاسی تفکر کو بھی۔ غزل اپنے مخصوص موضوعات اور مخصوص ڈھانچہ رکھتی ہے۔ جس میں بہت سوچ سمجھ کر ہی جدت کا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ یہاں شگفتگی، لوچ، اور ہمہ گیر تاثر کے ساتھ ساتھ جدت کا مظاہرہ بڑا مشکل ہے۔ ایک بات کتنے ہی طریقوں سے کہی جا سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ غزل میں ہر کہی ہوئی بات کا انداز معیار تغزل پر پورا اترتا ہو۔ موجودہ دور کی غزلوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی خیالات کے اظہار کا وہی انداز اختیار کر لیا جاتا ہے جو نظموں میں ہوتا ہے۔ اس انداز میں غزل کے نقطۂ نظر سے بڑی خامی ہے۔ غزل رمزیاتی اور کنایاتی اسلوب چاہتی ہے۔ اس کی زبان بھی مخصوص ہوتی ہے اور الفاظ بھی

غزل کے اچھے اشعار کا رنگ سیاسی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے اعلیٰ تنقیدی شعور کی ضرورت ہے۔ سیاسی رنگ پیش کرتے ہوئے اِس اجنبیت کو کبھی سراہا نہیں جا سکتا جو سیاست کی نعرہ بازی سے غزل کے نرم و سبک لحن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کے اشعار میں اگر نظموں کا انداز اختیار کیا جائے گا اور غزل کی خصوصیات نظر انداز کر دی جائیں گی تو غزل وقتی، عارضی اور سطحی ہو کر رہ جائے گی۔

زاؔہد کے یہاں بھی اچھے اشعار کے ساتھ کمزور اور وقتی اشعار کی آمیزش ہے اور اکثر جب اِس آمیزش کا رنگ غالب ہو جاتا ہے تو زاؔہد اس وقت غزل گو ہی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ صرف ادنیٰ سی توجہ کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں غزلیت کا فقدان صاف نظر آتا ہے اور دھوکا ہوتا ہے کہ کہیں یہ اشعار نظم کے تو نہیں۔

کبھی نہ نسل و وطن پرستی کی تیرگی کو شکست ہو گی ✦ کبھی تو شامِ الم مٹے گی کبھی تو صبحِ خوشی ملے گی

کفر و الحاد سے انسانِ خدا آج بھی ہے ✦ شعلہ گوں مشرق و مغرب کی فضا آج بھی ہے
اجنبی شعبدہ گر جا بھی چکے ہیں لیکن ✦ اپنے گلزار کی مسموم ہوا آج بھی ہے

کچھ ایسی شوخ ہے رنگِ وطن کی لو ہمدم ✦ کہ ہے طواف میں شمعِ حرم کا پروانہ

حیات کی تیز روشنی کو چھپائیں گے کب تک اہلِ ایوان ✦ طلسمِ زر کو جو توڑ دیں میں ان اشکباروں کا ساتھ دوں گا

اس کو صرف اللہ کا ڈر اور اسے دنیا کا غم ✦ بس یہی تو مومن و کافر کی اِک پہچان ہے

پناہِ دہر ہے اسلام ہی کے سائے میں ✦ یہ وہ چمن ہے جہاں گل ہی گل ہیں خار نہیں

حیات بندگیٔ حق کا نام ہے زاؔہد ✦ بغیر بندگیٔ حق حیات کچھ بھی نہیں

خدا و مذہب کا مضحکہ آپ خوب جی کھول کر اڑائیں ✦ مگر یہ ہے خانقاہِ زاہد کسی شرابی کا گھر نہیں ہے

اِن اشعار کے مضامین سے ہمیں اتفاق ہے مگر یہ تغزل کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ یا تو یہ سطحی اور وقتی رنگ لئے ہوئے ہیں یا ان میں نظموں کا سا اندازِ بیان ہے۔ غزل کی میٹھی زبان اور اس کے رموز و کنایات یہاں نہیں ملتے بلکہ باتیں "وعظ" ہو کر رہ گئی ہیں۔ زاؔہد کے علاوہ دیگر تعمیر پسند شعراء کے یہاں بھی یہ خامی پائی جاتی ہیں۔ لیکن زاؔہد کا تو یہ خاص موضوع ہے۔ زاؔہد کے تعارف و تذکرہ کی ضرورت اِسی لئے محسوس ہوئی کہ جہاں اس کی غزلیں ارتقاء کی سمت گامزن ہیں اور ان سے تعمیری غزلوں کا پسندیدہ پہلو سامنے آ سکتا ہے وہاں وہ اپنے ساتھ کچھ غیر مناسب اور غیر مفید آمیزشیں بھی لئے ہوئے ہیں۔ سطورِ بالا سے جہاں زاؔہد کے بارے میں ایک رائے قائم ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی غزل کے تعمیری پہلو پر بھی بر سبیلِ تذکرہ کچھ نہ کچھ سوچنے کا مواد ہمارے غزل گو شعراء کے سامنے آ جائے گا۔

غزل اور نظم کے اندازِ بیان اور زبان کا فرق ذیل کی مثالوں سے نمایاں ہو سکے گا۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزل کے لئے نعرہ بازی اور نظم کا سا انداز کتنا مضر ہے۔ اور اچھی غزل کی کیا خصوصیات ہیں۔ پہلے وہ اشعار دیئے جاتے ہیں جن میں غزلیت کا فقدان ہے اور اس کے نیچے انہیں کے ہم مضمون اچھے اشعار۔

انقلاب :-

نئی سحر کے حسین سورج تجھے غریبوں سے واسطہ کیا ✦ جہاں اُجالا ہے سیم وزر کا وہیں تیری روشنی ملے گی

(زاہد)

سسک رہے ہیں اندھیرے میں جھونپڑے اب تک ✦ گذر گئی سحر نو بھی بے نیازانہ

(زاہد)

یہی کیا وفاداریوں کے صلے ہیں ✦ تمنا تھی پھولوں کی کانٹے ملے ہیں

آزادی :-

(زاہد)

اجنبی شعبدہ گر جا بھی چکے ہیں لیکن ✦ اپنے گلزار کی مسموم ہوا آج بھی ہے

(زاہد)

اب ہیں اپنے پاؤں اپنی بیڑیاں ✦ اجنبی زنجیر گل کر رہ گئی

اسرارِ حیات :-

(زاہد)

حیات بندگی حق کا نام ہے زاہد ✦ بغیر بندگی حق حیات کچھ بھی نہیں

(زاہد)

اس پر آسائشِ بقا ہے حرام ✦ جو تیری راہ میں فنا نہ ہوا

(حسرت)

جینا بھی آگیا مجھے مرنا بھی آگیا ✦ پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

خدا و مذہب :-

(اصغر)

خدا و مذہب کا مضحکہ آپ خوب جی کھول کر اڑائیں ✦ مگر یہ ہے خانقاہِ زاہد کسی شرابی کا گھر نہیں ہے

(زاہد)

یہاں شاعر کا لہجہ سخت قابلِ تنقید ہے۔ اگر اس انداز کو کسی درجہ میں بھی باقی رکھا گیا تو مجھے کہنے دیجئے "ملائیت" کہ کربات سنی ان سنی کردی جائے گی۔ حسرت کے اس شعر سے اُوپر کے شعر میں لہجہ کے حُسن و قبح کا اندازہ کیجئے۔

دے سکا کوئی نہ دہری کے وساوس کا جواب ✦ تیرے دیوانۂ وارفتہ طبیعت کے سوا

(حسرت)

یہ شعر حسرت کے بہترین اشعار میں سے نہیں لیکن غزل اور نظم کا فرق "خانقاہِ زاہد" "دیوانۂ وارفتہ طبیعت" ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ چند اور شعر ملاحظہ ہوں۔

وطنیت :-

وطن کے قوم کے اور مصلحت کے بت تراشے ہیں ✦ ذرا دیکھیں صنم زار مسلماں دیکھنے والے
کچھ ایسی شوخ ہے رنگ وطن کی تو ہمدم ✦ کہ ہے طواف میں شمع حرم کا پروانہ

(زاہد)

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں ✦ آدمی ہوں عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

(حفیظ میرٹھی)

بے راہ روی :-

کفر و الحاد سے اِنسان خدا آج بھی ہے ✦ شعلہ گوں مشرق و مغرب کی فضا آج بھی ہے

(زاہد)

دُور ہوتی جا رہی ہے منزلِ اِنسانیت ✦ جانے یہ دُنیا ہے کس کافر کی بھٹکائی ہوئی

(حفیظ میرٹھی)

اکثر ایسے اشعار بھی ہیں کہ ان کا ایک مصرع نظم سے مناسبت رکھتا ہے اور دوسرا غزل کی خصوصیات کا حامل ہے۔ مثلاً

کبھی تو نسل و وطن پرستی کی تیرگی کو شکست ہوگی ✦ کبھی تو شامِ الم ہٹے گی کبھی تو صبحِ خوشی ملے گی

مصرع ثانی میں جو غزلیت ہے وہ پہلے مصرع میں کہاں۔ نسل و وطن پرستی جیسے الفاظ غزل کی زبان میں اجنبی کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کا نباہ بڑا مشکل ہے۔ غزل کی زبان انتہائی مُترنم و سبک الفاظ اور استعاراتی انداز چاہتی ہے۔ جہاں کہیں اجنبی سا لفظ غزل میں آتا ہے۔ وہیں شعر کی پوری فضا متاثر ہو جاتی ہے۔ زاہد کا اِسی طرح کا ایک اور شعر ہے۔

نئی شراب بھی ہے جامِ نَو بھی ہے لیکن ✦ غریب اب بھی نہیں باریابِ میخانہ

نئی شراب اور جامِ نو کے پہلو بہ پہلو "غریب" کا لفظ بہت غریب سا محسوس ہوتا ہے۔ اِسی طرح پہلے شعر میں "وطن اور رنگ و نسل" کے تذکرے کی بجائے اگر آشیان و گلستاں کا استعمال کیا جاتا تو غزل کی زبان برقرار رہ سکتی تھی۔

غزل میں سیاسی خیالات کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے لیکن کامیابی اس وقت تک محال ہے جب تک سیاسی اصطلاحات چھوڑ کر غزل کی اصطلاحات سے کام نہ لیا جائے۔ غزل میں جہاں اور کتنے ہی مضامین ہیں وہاں انقلابِ زمانہ بھی ہے لیکن اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ غزل کا موضوع فقط انقلابِ زمانہ ہے اور اس کے لئے بھی غزل کی پابندیاں نباہنا ضروری نہیں تو یہ نقطۂ نظر سراسر غلط ہے۔

نظموں میں سیاسی افکار کا اظہار عام ہے اِس لئے میں نے زاہد کی نظموں کو یہاں شامل نہیں کیا ہے۔ غزل میں زاہد نے سیاسی شعور سے کام لیا ہے یہ تجربہ کیسا رہا ہے اس کے بارے میں میرا خیال ہے زاہد ہر جگہ پُوری طرح کامیاب نہیں۔ غزل میں سیاسی موضوعات اکثر سطحیت کا موجب ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اِس بات کا اعتراف بھی برمحل ہوگا کہ زاہد نے جہاں غزل کی خصوصیات کا لحاظ رکھا ہے وہاں سیاسی مسائل بھی حل ہو گئے ہیں اور اس طرح زاہد کی اِنفرادی خصوصیت کے ساتھ غزل کی خصوصیات بھی برقرار رہ سکی ہیں۔ شعر کے دونوں پہلوؤں کا یہ توازن قابلِ تعریف ہے لیکن یہ زاہد کے یہاں ذرا کم ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے نظم نگار ہے اور اس کے بعد غزل گو۔

آیندہ شمارہ کی ہلکی سی جھلک

ابو المجاہد زاہد

ناگزیر

سوچتا ہوں تو مری رُوح لرز جاتی ہے
آتشِ جنگ بھڑکنے کے لئے ہے بیتاب
مسکراتا ہے فسوں کار اندھیرے کا شباب
کوششِ امن جہاں تاب ہے اک نقش برآب
ذہنِ اقوام سے سانپوں کی بساند آتی ہے

جھوٹے آقاؤں کے ہاتھوں میں ہے دُنیا کا نظام
ہے فضاؤں پہ محیط آتش و آہن کا فسوں
اشرف الخلق کی حالت ہے درندوں سے زبوں
شوق سے پیتا ہے انسان ہی انساں کا خوں
زندگی بھول گئی عصمت و اخلاق کا نام

کھل گیا آج چمکدار تمدن کا بھرم
ہمنشیں مصلحت و قوم و وطن کی پوجا
دیکھ تو لائی ہے دُنیا پہ تباہی کیا کیا
یہ تڑپتا ہوا ماحول یہ بے چین فضا
تشنۂ امن و مسرت ہے عرب ہو کہ عجم

بے کلی جادۂ اسلام پر آنے تک ہے
آدمیت کو درندوں سے چھڑانے تک ہے
رسم طاغوت پرستی کے مٹانے تک ہے
اپنے رُوٹھے ہوئے مالک کو منانے تک ہے
ایک اللہ کو معبود بنانے تک ہے

ایک اللہ کو معبود بنانا ہوگا ، اپنے رُوٹھے ہوئے مالک کو منانا ہوگا

جیل

ابوالعرفان مظاہری

(۱)

مسجد کی محراب کے آگے
حلوے کی اِک تاب کے اُوپر
خواہش کے ہر دام میں اُلجھا
مُلّا بیٹھا اُونگھ رہا ہے
کاہل مُلّا!
غافل مُلّا!
بھاگ رے ساتھی بھاگ یہاں سے

(۲)

چمنی کے تاریک دھوئیں میں
لوہے کے اِک جال کے اندر
پُونجی کے عفریت کا لقمہ
محنت کش اِک چیخ رہا ہے
بھوکا ننگا!
دُبلا پتلا!
بھاگ رے ساتھی بھاگ یہاں سے

(۳)

آہن کی دیوار کے پیچھے
محنت کے انبار کے اُوپر
کیموتوں کے ناچ گھروں میں
خونی آمر ناچ رہا ہے
ظالم آمر!
جابر آمر!
بھاگ رے ساتھی بھاگ یہاں سے

(۴)

سارے جگ میں آگ لگی ہے
پُوری دُنیا ناگ بنی ہے
رُوحِ آدم کانپ اُٹھی ہے
جھپٹے ہیں خُونخوار درندے
جبڑے کھولے!
دانت نکالے!
بھاگ رے ساتھی بھاگ یہاں سے

(۵)

مکتب کے آثار شکستہ
ایوان ہے انصاف سے خالی
سینوں میں ایمان کی لاشیں
بستی یہ ویران ہے ساتھی کس درجہ سنسان ہے ساتھی
شاید قبرستان ہے ساتھی
بھاگ رے ساتھی بھاگ یہاں سے

(۶)

کابل ملا خواب کا بندہ
پونجی پتی مزدور کا دشمن
آمر کے منہ خون لگا ہے
حاضر کے یہ تین خدا ہیں
پورب ان کا ———
پچھم ان کا ———
ساری دنیا ان کی دنیا

(۷)

سارا عالم جیل بنا ہے
جیلر اس کے تین خدا ہیں
اس کی راہیں بند ہیں کب
اس سے کیونکر بھاگ سکیں گے
اس میں جینا
اس میں مرنا
اپنی تو تقدیر یہی ہے

(۸)

لیکن ساتھی سوچ تو کب تک
ملا، آمر، پونجی پتی یہ
اپنے پہرے دار رہیں گے
آؤ مل کر جیل کو توڑیں
سارے ساتھی
سارے قیدی
خود چھوٹیں اور سب کو چھڑائیں

(۹)

دنیا کو آباد کریں پھر
اس کو اک گلزار بنا دیں
اس کی اک آزاد فضا ہو
جس میں اطمینان ہو سب کو
ظالم کوئی
جابر کوئی
جس میں ہرگز سانس نہ لے پھر

(۱۰)

لیکن یہ سب کیونکر ہو گا
سوچ اے ساتھی کھوج اے ساتھی

سنگِ میل

رزمی کیفی

عطا یہ کس نے کر دیا ہمیں لباسِ زندگی ! — یہ زندگی حقیقتاً ہے زندگی، کہ خواب ہے !!
خرد کے ناخنوں سے یہ سُلجھ سکیں نہ گُتھیاں — مشاہدوں نہ تجربوں کے پاس ہی جواب ہے
نگاہِ جُستجو یہاں بجائے خود حجاب ہے

اُدھر تبسّمِ سحر، اِدھر ہے نالۂ شبی — اُدھر ہے زندگی نشاط اِدھر حیاتِ غم ہی غم
کہیں تو مسکراہٹیں بھی زرنگار و زرفشاں — کہیں یہ گریۂ الم مزید باعثِ ستم
زبانِ حالِ دہر پر صدائے انقلاب ہے

قدم قدم پہ ٹھوکریں، ہیں منزلیں مٹی مٹی — نہ عزم ہے نہ ہے یقیں نہ ساتھ زاد و راحلہ
زبان پر نفس نفس کی ہے صدائے العطش ، — تلاشِ آبِ پرسکون میں رواں ہے قافلہ
نظر کے سامنے مگر سراب ہی سراب ہے"

وہ نازیوں کی یورشیں ! وہ اشتراکی دغدغے !! — ہیں فتنہ ہائے نو بہ نو بنامِ امن پروری
تراش کر بہیمیت نے اپنے خوشنما سے نام — زمیں کو خوں سے بھر دیا بپا کی جنگِ زرگری
یہ زندگی ہے کاہے کو عذاب ہی عذاب ہے

جہنموں سے روشناس کر کے "روحِ عصر" کو — "ترقیوں کی جنتیں" جہان میں بسائیں گے
ہم یوں کر رہے ہیں آدمی کی ہڈیوں کے ڈھیر — کہ سُرخ دیوتا کے آستانہ پر چڑھائیں گے
کتابِ عافیت کا یہ ابھی تو ایک باب ہے

محیط ہیں فضائے مُلک و قوم پر چہار سُو   یہ سُود خوار زر پرست بھیڑیوں کی ٹولیاں
سفینۂ ہوس رواں ہے قُلزمِ لہو پہ آہ   کہ ہیں نصیب آدمی کو گیس اور گولیاں
نہ پُوچھ حال بیکسوں کا کس قدر خراب ہے
دلبغاوتوں کی زد میں آنہ جائیں قصرِ زرنگار!   فروغِ صبحِ زندگی کو چھُو نہ لے شبِ اجل!!)
زہے کہ پی رہے ہیں اب وہ جامِ صحت غریب   کہ جو لٹا چکے ہیں بسترِ الم پہ اُس کو کل
لہو مگر غریب ہی کا شاملِ شراب ہے

ابھی غلام آدمی کا آدمی ہے اے ندیم!   ابھی غلام فطرتیں بھٹک رہی ہیں چار سُو
ابھی تو محترم نہیں ہیں آدمی کے جان و مال   ابھی تو سامراجیوں کے پاس رہن ہے لہو
غرض ابھی غلامیوں پہ ہر طرف شباب ہے
اُٹھو کہ ہاتھ میں ہم اپنے لیں زمامِ اقتدار   بتائیں اہلِ ذوقِ بندگی کو رازِ بندگی
جُھکائیں آؤ اب جبینِ سجدہ اُس کے در پہ ہم   نیاز جس کا ہے بجائے خود بھی نازِ زندگی
وہی جو ہر شکستہ دل کا مرکزِ خطاب ہے

تبصرہ کیلئے کتب و جرائد موصولہ

موجِ نیل ——— قاضی زین العابدین سجّاد میرٹھی
ماہنامہ کرن ——— گیا
ماہنامہ تجلی ——— دیوبند

نیا آفتاب

عبدالباسط مقصد

(۱)

قدم قدم پہ جہنم کی آگ کے شعلے — حیات موت کے دامن میں کپکپاتی ہوئی
ہر ایک صبح ہے دنیا کو موت کا پیغام — ہر ایک شام الم خون میں نہاتی ہوئی

(۲)

نظام پیٹ کا جمہور و آمریت کا — نشانِ منزلِ مقصود کو بتا نہ سکا
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی ابتک — نجات ظلم و ستم سے کبھی دلا نہ سکا

(۳)

وہی تڑپ، وہی مجبوریاں، وہی غربت — وہی ملال، وہی غم کے رینگتے سائے
وہی فساد، وہی شر ہے، اور وہی الحاد — کہاں پھر ایسے میں اِنسانیت سکوں پائے

(۴)

نظر نظر میں ہے غم اور نفس نفس میں خلش — یہ اِنتشار، یہ ہلچل، یہ بے بسی ذلّت
اُٹھو کہ حق کی صدائیں فضا میں گونج گئیں — چلو کہ چھائی ہے پروردگار کی رحمت

(۵)

عمل کی شمعیں جلاؤ ہے ظلمتوں کا ہجوم — سناؤ ہر کس و ناکس کو امن کا پیغام
بلند اور کرو جذبہ شوقِ حق کیلئے — اس انقلاب کو لاؤ جو بخشے امنِ دوام

(۶)

سمٹ کے آئے گی مرکز پہ پھر یہی دنیا — یہیں سے ایک نیا آفتاب اُبھرے گا
نظامِ حق ہی زمانے کو اے جہاں والو — نئی حیات، لگن، آرزو نئی دے گا

بولو کس کا راج — ؟

حیدر علی حیدر

۱

امن کی مالا ٹوٹ رہے گی
سُندر دھرتی کانپ رہے گی
کرودھ اگنی ناچ رہے گی من کا اگر ہم راج بسائیں
من کا اگر ہم راج

اُپوّن جیون جاگ رہے گا
من آنند سے جھوم اُٹھے گا
امن کا دھارا پھوٹ بہے گا رب کا گر ہم راج بسائیں
رب کا گر ہم راج

بولو دُکھ کی ماری جنتا
بولو سُکھ کی پیاسی جنتا
بولو گوری کالی جنتا بولو کس کا راج بسائیں ؟
بولو کس کا راج ؟

۲

جگ سارا رن بھوم بنے گا
منش منش کا خون بہے گا
اَنیائے اور ظلم رہے گا من کا گر ہم راج بسائیں
من کا گر ہم راج

دھرتی سورگ لوک بنے گی
جگ کی شوبھا رقص کرے گی
رُوپ نیائے جھوم اُٹھے گی رب کا گر ہم راج بسائیں
رب کا گر ہم راج

بولو دُکھ کی ماری جنتا!
بولو سُکھ کی پیاسی جنتا!
بولو گوری کالی جنتا بولو کس کا راج بسائیں؟
بولو کس کا راج ؟

۳

آشاؤں کا کال پڑے گا
دُکھیا را سنسار رہے گا
جیون ساگر سوکھ رہے گا من کا اگر ہم راج بسائیں
من کا اگر ہم راج

گھُمڑ گھُمڑ کے بادل چھائے
چھاجوں اَمرت پانی برسے
سوکھا جیون ساگر بھر دے رب کا اگر ہم راج بسائیں
رب کا اگر ہم راج

بولو دُکھ کی ماری جنتا!
بولو سُکھ کی پیاسی جنتا!
بولو گوری کالی جنتا بولو کس کا راج بسائیں؟
بولو کس کا راج ؟

ہیرو

انور عظیمی

ہولی کے دن بلراج صبح کو گھر سے نکلا تو دوپہر، شام اور آدھی رات تک باہر ہی رہا۔ ہنگو ساؤ کے یہاں اس سال محفل جمی۔ وِشن نگر کے جتنے جوان اور لڑکے تھے وہ صبح ہی سے ڈھولک لیکر بیٹھ گئے اور دوپہر تک گاتا رہا۔ بلراج پہلی بار پوری سرگرمی کے ساتھ جمگھٹا میں شریک ہوا تھا اور اس سال بھانگ گھوٹنے کی خدمت اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

ہنگو ساؤ سال بھر جتنی ترش روئی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ آج اس سے کہیں زیادہ فراخ دلی کے ساتھ لوگوں کی آؤ بھگت کر رہا تھا اور گاؤں کے نوجوان بھی اس کی پچھلی بداخلاقیوں کو بالکل بھلا کر آئے تھے۔ اکھاڑے کے بیچ میں بیٹھ کر جب اس نے ڈھولک پیروں کے نیچے داب کر بجانی شروع کی تو لڑکے اور جوان تمام اس کی طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ ابھی بھانگ سے زیادہ کوئی میٹھی چیز پلا دے گا۔ اور جب اس نے اپنا گانا ختم کیا تو زور سے یکبارگی کبیر بول کر بچے اس کے گلے سے اس طرح لپٹ گئے جیسے وہ ان کا بہت پرانا اور بے تکلف دوست ہے۔

ہنگو نے لڑکوں کو ہٹاتے ہوئے کہا، بلراج، جیون کا تو یہی مزا ہے۔ کون جانے کل کیا کشٹ آپڑے، آج تو من بھگتون کا من میلا نہ کرو۔

بلراج نے لوٹا اٹھایا اور تیزی سے اکھاڑے کے جوانوں کو پلانے لگا۔ ایک بچے نے کہا۔

"بلراج چاچا! ایک لوٹا ہمیں بھی دو"

بلراج دینا ہی چاہتا تھا کہ ہنگو نے جلدی سے کہا۔

"ہیں! ہیں!! مورکھ بالکوں کا جیون تو نہ خراب کر"

اور بلراج رک گیا لیکن اکھاڑے کو محسوس ہوا جیسے بے وقت فلسفی ہو گیا ہے۔ بچوں کو وہ ہنگو یاد آ گیا۔ جب وہ منت خوشامد کرنے کے بعد بھی انہیں ایک بیڑی دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ہنگو نے اس تاثر کا جائزہ لیا اور بلراج سے جو حیرت کے ساتھ ہنگو کو دیکھ رہا تھا کہا۔

"بلراج! جوانی کی ترنگ اور چیز ہے"

بلراج ہنستے ہوئے بولا۔ کاکا! تم بہت بے وقت سٹھیا جاتے ہو، یہ مورکھ تمہارا پھر لکچر تھوڑے سمجھیں گے، یہ تو جانیں گے کہ ہنگو کاکا ایک لوٹا بھانگ کو منہ دیکھ گیا۔

ہنگو مسکرایا۔ اور بلراج کو اشارا کیا۔ بچے کچھ تو چپ ہو گئے اور کچھ چلوؤں میں لیکر ایک دوسرے پر چھینٹیں اڑانے لگے۔

شام کے قریب بلراج پر نشہ سوار ہوا اور بچوں نے تالی بجائی کسی نے اس کا دامن کھینچا۔ کسی نے اس کی ٹانگوں کو پکڑا۔ نوجوانوں نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر جو تالی پیٹی ہے تو اس کا دماغ چکرا گیا۔ اور وہ کبیر بولتا ہوا ایک راستہ پر ہو لیا۔ بھیڑ اس کے پیچھے چلی۔ گاؤں میں شور مچ گیا کہ اس سال بلراج پر نشہ سوار ہوا۔ اور گاؤں کے بہت سے لوگ جو ابھی تک اکھاڑے میں شامل نہ ہوئے تھے۔ لپک کر آئے اور اسی بھیڑ میں شامل ہو کر ہنگامہ مچانے لگے۔

بلراج ایک گلی سے گذرتے ہوئے چیخا۔ "مجاج بگڑ گیا ہے۔ ابھی لگاتا ہوں دو تھپڑ۔" بھیڑ کو معلوم ہوا کہ بلراج پر زمینداری کا نشہ سوار ہوا ہے۔ بچے چلائے "کون ہے بلراج چاچا"

"اجی! پلے میں دو پیسے کیا ہو گئے ہیں کہ مجاج اسمان پر پہونچ گیا۔ اگر راجپوت کی ہڈی ہے تو نہیں ڈالا تو نام نہیں"

بچے چنگھاڑے "مارو! ہوس بگڑ گیا ہے" نوجوانوں نے ایک بوڑھے آدمی کی کمر میں کپڑا اینٹھا اور اسے گھسیٹتے ہوئے بلراج کے سامنے لے آئے اور بولے۔

"بابو! بڑی دقت سے آیا ہے۔ دس گنا لگان دے کر سمجھتا ہے کہ اب بابو کی راج دھانی سے نکل گیا ہے"

بلراج پھنکار کر بڑھا اور بوڑھے کو ایک دیوار پر ڈھکیل دیا۔ بوڑھا گالی بکتا ہوا اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا گھر کی طرف چلا گیا۔ بھیڑ آگے بڑھی۔ بچے زور سے چنگھاڑے اور بلراج سڑک کی طرف دوڑتے ہوئے پھنکارا۔

"جانے نہ دو! بھیا، روج روج کے ٹنٹا کو آج ختم ہی کر دو۔ اتنا مارو! بھیجا نکل آئے حرامی کا"

نوجوان قہقہہ لگاتے ہوئے لپکے۔ بچوں نے ایک دوسرے کو ڈھکیل کر آگے بڑھایا۔ بلراج نے پھر للکارا۔

"من راج بھیا! بھیا!! پہلے ایک لٹھ کنتو حرامی کو دو"

مجمع سمجھ گیا کہ اس وقت وہ اپنے پڑوسی کنتو پر حملہ آور ہے۔ اور جو دنوں سے آپس میں جو جھگڑا چلا آرہا ہے۔ اس وقت طے ہو رہا ہے۔ بچوں نے لپک کر بلراج کی پگڑی کھینچی اور جوانوں نے جلدی سے ایک نوعمر لڑکے کو

پکڑ کر اس کے سامنے کیا۔ بلراج نے پورے جوش میں ہوا میں اپنا گھونسہ بلند کیا اور اس پر حملہ آور ہوا۔ لڑکا جھک کر دور جا کھڑا ہوا اور بلراج جھٹکے میں گر پڑا۔ بچے لگے تالی اور زور زور سے بجانے۔ سیٹیاں اور زور سے جھنکاریں نوجوانوں نے بڑی بلند آواز میں کبیر الاپا۔ اور بلراج ترنگ میں آ کر برہا گانے لگا۔

ہجوم اب سڑک سے گذر کر آبادی کی طرف ہو گیا تھا۔ بچے بلراج کے آگے پیچھے دوڑتے پھر رہے تھے۔ نوجوان ایک دوسرے کے بیچ میں سے راستہ بنا کر آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک عورت دروازہ پر کھڑی ہوئی مجمع کو اپنی طرف آتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی قریب پہونچی تو اس نے لوٹے کے رنگ کو مجمع پر پھینکا اور لپک کر گھر کے اندر چلی گئی۔ نوجوانوں نے کبیر بول بول کر ہنگامہ مچا دیا۔ اور بلراج بھی ٹھہر کر کبیر بولنے لگا۔ ایک نوجوان نے کہا۔

"سونا بھوجی ہے۔ بڑی چنچل ہے" اور ایک محبت آمیز گالی دی۔

بلراج سونا کا نام سنتے ہی ہنکارنے لگا۔ اور کبیر بولتے بولتے یکایک اس کی طرف مڑ گیا۔ ترنگ میں وہ وہ گانے گائے کہ سونا کی گھر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔ اسی دوران میں گاؤں کی عورتیں گھروں سے نکل کر راستہ پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور بلراج کی اٹھائی ہوئی قیامت کو دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

بلراج نے عورتوں کو دیکھا تو زور زور سے چیخا۔ ان کی طرف رخ کر کے کبیر بولنی شروع کر دی۔ نوجوانوں نے تالی بجائی۔ بچوں نے بلراج کی ٹانگوں کو گھسیٹا اور بلراج لپک کر عورتوں کی طرف بڑھا۔ عورتوں نے ایک لڑکی کو بھیڑ کی طرف دھکیل دیا اور اس کی درگت بن گئی۔ لڑکی اٹھ کر ہانپتی کانپتی بھاگی مگر لڑکی کے چھوٹے بھائی نے غصہ میں بلراج کو ایک اینٹ کھینچ ماری۔

نوجوانوں کو بچہ کی یہ حرکت پسند نہ آئی اور انہوں نے بچہ کی قاعدے سے گوشمالی کر دی۔ بلراج نے اپنا سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"ابے سنگھو! ذرا دو ہنٹر دینا تو کمینوں کی پیٹھ پر۔"

ایک نوجوان بڑھا۔ اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"چھما کرو! دروگر جی! بچہ مورکھ ہے۔ اونچ نیچ کی کیا کھبر؟"

"ابے سنگھو! یہ کون چیخ رہا ہے۔ ہٹاؤ کتے کو یہاں سے۔" بلراج نے گردن کو جھٹکے سے ہلاتے ہوئے حکم دیا۔

نوجوان نے بلراج کا قدم تھام لیا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"دروگر جی! ایک مورکھ پہ اتنے کھپا ہت ہو۔ ما بھی دو! تمہارے حکم سے کون باہر ہو سکے ہے۔"

دوسرا نوجوان گردن جھکاتے ہوئے سفارش کرنے لگا۔

"دروگر جی۔ بڑے لوگ ہو۔ دیالو مہاراج ہو۔ تنک تنک بات پر اتنی ناراجی۔ سرکار ٹھیک نہیں۔ بچہ ہے گھڑک ڈانٹ دو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ابے سنگھو۔" بلراج غرایا۔ اور اس کی گردن تن گئی۔ "ذرا دینا تو چنڑا۔ یہ حرامی یوں نہ مانیں گے۔ سو پشت سے تو جوتا کھاتے آئے ہیں۔ یہ سیدھی بات سے تھوڑے مانتے ہیں۔"

ایک لڑکے نے آہستہ سے لکڑی تھما دی۔ اور بلراج اسے لے کر لڑکے پر ٹوٹ پڑا۔ لڑکا پھرتیلا تھا اور بلراج نشہ میں بدمست، یہ جتنے جوش میں بڑھا لڑکے نے اتنی ہی آہستگی سے لپک کر اس کی ٹانگیں تھام لیں۔ لڑکوں نے پیچھے سے تالی بجائی اور بلراج لڑھکتا ہوا ایک گڈھے میں جا گرا۔

بڑی دقت سے بلراج کو بھیڑ نے گڑھے سے نکالا۔ اور اسے لے کر گاؤں کی گلیوں میں دوڑنے لگے۔ نشہ پوری طرح بلراج کے دماغ کو دبوچے ہوئے تھا۔ بچوں کی تالیاں، جوانوں کے قہقہے۔ بھیڑ کی بھنبھناہٹ نے اس نشہ کو اور تیز کر دیا تھا۔ رات آدھی کے قریب پہونچ چکی تھی۔ اور گاؤں کے تالاب پر چاندنی کی چادر یوں بچھی ہوئی تھی جیسے کسی میدان میں چاندی پگھلا کر بہا دی گئی ہو۔ ہوا کی نرم روی سے بس لہریں چاند کو پانی میں ہچکولے دے رہی تھیں۔ بھیڑ گلی سے ہوتی ہوئی تالاب پر پہونچی۔ اور بلراج نے ٹھٹھک کر بڑے غور سے چاند کو دیکھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"اس جھلکے کو لے آؤ۔ یہ رانی کے ماتھے پر جھلکے گا۔" بلراج نے حکم دیا۔

"راجا اندر" پنڈت اونکار نے کہا۔ "جل پری کہتی ہے رانی اس سے زیادہ سندر نہیں ہے۔"

بلراج غراتے ہوئے بولا۔

"جل پری کو پھانسی دی جائے۔ رانی اس سے سندر ہے۔"

اور چند نوجوانوں نے ایک بوڑھی عورت کو گھسیٹ کر آگے کیا۔ بلراج نے ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا "یہ چڑیل آگ میں بھونی جائے گی۔" اور لپک کر اس کے گلے کو دبوچ لیا۔ بڑھی عورت لڑکھڑا کر گری اور جھٹکے میں بلراج لڑھک کر دوسری طرف جا گرا۔ نوجوانوں نے پہلی بار ہولی کی جے پکاری۔ اور لڑکے پہلے پہل کبیر للکارے۔ عورت گھبرا کر بھاگ گئی اور بہت دور جا کر کوسنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ شرارت اپنی ہم عمر سے کرنا چاہئے تھی۔

اب کے بار چند ایک جوانوں نے بلراج کو اٹھایا۔ اس میں سکت نہیں رہ گئی تھی مگر جوانوں کے ولولے کی اور بچوں کی امنگ کی ابھی پوری طرح تسکین نہیں ہوئی تھی۔ بلراج اٹھتے ہی گھبرا کر بھاگا۔ بچے گھنگھناتے ہوئے

جوان خنخناتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے۔ بلراج کے منہ میں کف پر کف آ رہے تھے اور وہ تھک کر اس ڈرامہ کے آخری منظر کو دکھلا کر پردہ گرانا ہی چاہتا تھا کہ نوجوانوں نے دلیپ سنگھ کے دروازے پر اس کو جالیا۔

بلراج ٹھٹھکا۔ اور دلیپ سنگھ کے سفید مکان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بڑی سا پھو (صاف) دھوتی ہے۔ رام جانے۔"

لڑکے کھلکھلا کر ہنسے، ایک جوان نے اس کے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"دلیپ سنگھ کی کوٹھی ہے۔" اور ایک دوستانہ گالی دی۔

"ہوں" بلراج نے کہا۔ اور مجمع کو خیال ہوا کہ اب وہ ہوش میں آ جائے گا۔ ایک جوان نے اسے لٹا کر زبردستی حلق میں بھانگ انڈیل دی۔ بلراج بھنا کر اٹھا۔ اور مکان کی طرف رخ کر کے دلیپ سنگھ کو دھمکانے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دھمکی سے آگے بڑھ کر گالیاں بکنے لگا۔ بھیڑ میں سے ایک نے اسکے نشہ کو تیز کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے گورو (جانور) ہانک لے گیا۔ بلراج"

بلراج نے پھرتی سے گردن کو موڑا۔ اور دلیپ سنگھ کو گالیوں سے مخاطب کرتے ہوئے ڈکارا۔

"سامنے سے لے جاؤ تو مردئی (مردانگی) ہے۔" عورتوں کی طرح گھر میں کیوں دبکے ہو۔"

دلیپ سنگھ کے مکان کا دروازہ کھلا۔ اس کا جوان لڑکا غصہ میں تلملایا ہوا نکلا۔ دروازے ہی سے اس نے ڈانٹا۔

"تم لوگ کیا اودھم مچاتے ہو۔ دو چار گھڑی کی دنگی بہت ہے۔"

بچوں نے کہا "ہم رات بھر ہولی منائیں گے۔ آج کون روک ہے۔

جوانوں نے کہا۔" سرکار! یہ سمے روج روج کہاں ملتا ہے۔" مگر دلیپ سنگھ کے جوان نے ڈانٹ کر کہا۔" دور ہو جاؤ یہاں سے، رات کی نیند خراب کر دی۔" اور چند غلیظ گالیاں دیں۔

بلراج نے اس کی طرف مکا اٹھاتے ہوئے کہا۔" بھیجا توڑ دوں گا۔ ساری سرکاری بھول جاؤ گے۔" دروازے پر کھڑے ہوئے جوان کو تاؤ آگیا اور اس نے بلراج کے سر پر دو ڈنڈے جما دیئے۔

بلراج تو چکرا کر گر گیا۔ مگر بھیڑ میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔

"غریبوں کی خوشی دیکھی نہیں جاتی۔"

"مجاج بگڑ گیا ہے۔"

"اپنی موج میں بڑا جرا اید رد کریں، غریبوں کی تنک سی خوشی پر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔"

"سمے سمے کی بات ہے۔ کل تک دلیپ سنگھ اپنے دوارے بھانگ پلاتے تھے۔ آج ان کے پوت کو اتنی دنگی کھلتی ہے۔"

نوجوان جو دروازے کی طرف پلٹ چکا تھا مڑتے ہوئے بولا

"یہ کیا بھنبھناہٹ لگا رکھی ہے۔ دھیرے سے دفع ہو جاؤ نہیں تو خیر نہیں ہو گی۔"

بھیڑ سے ایک نوجوان نے للکارا

"تم ہمارا اکھاڑا نہیں اکھاڑ سکتے۔"

دوسرے نے کہا

"اب ترم ساہی (خرم شاہی) کا سمے لد گیا۔"

"بچا! ہم تم سے کم نہیں۔" تیسرے نے ڈینگ ماری۔

چوتھا بپھر کر بہت آگے بڑھ گیا۔

"تمہاری مجال کیا! اب ہم آجاد ہیں۔"

نوجوان کو تاؤ آگیا، وہ گالیاں بکتے ہوئے آگے بڑھا۔ بھیڑ اس کی طرف لپکی۔ نوجوان پر خون سوار تھا اس نے رکھے ہوئے لوہے کے چھڑوں کو اٹھایا اور بولا۔

"آگے بڑھے تو کھوپڑی سرخ ہو جائے گی۔"

"کون جودھا ہے؟ بلراج پھنکارا۔" مار دیا جانے نہ پائے حرامی۔"

نوجوان اور بھبکا۔ ایک چھڑ مجمع کے سر پر پٹک مارا۔ بچے بھاگ گئے۔ جوان دبک کر کھسک گئے۔ دو چار سر کو کھجاتے ہوئے دور کھڑے ہو گئے بلراج نے للکارا۔

"ہم آجادی پر کٹ مریں گے۔"

ایک بھی آگے نہیں بڑھا۔ بلراج نے دوسرا نعرہ لگایا۔

"جنتا کی حکومت ہے۔"

نوجوان سر کھجاتے رہے۔ بلراج نے تیسری بوتل حلق میں انڈیلی۔

"ہم کسی کے دبیل نہیں"

اور نوجوان آہستہ سے بلراج کو پکڑ کر دور لے گئے۔

صبح کو نکلا ہوا بلراج آدھی رات تک گھر نہیں پہونچا۔ رات آدھی منزل طے کر کے دور نکل گئی تھی۔ وہ اونچائی سے نشیب کی طرف لڑھک رہی تھی۔ اور طبعاً بہت تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ چاند کو آسمان کے بیچ میں چھوڑ کر ستارے بھاگ رہے تھے۔ چڑیاں آپس میں آزادانہ اظہار خیال کر رہی تھیں

اور بلراج ابھی تک گھر نہیں پہونچا تھا۔ گھر والے انتظار کے بعد سو گئے تھے۔ آج انہیں بلراج کی ترنگ میں مداخلت کرنے کا حق نہیں تھا۔

نوجوانوں کی بھیڑ بلراج کو لے کر دلیپ سنگھ کے مکان سے واپس آئی اور صبح تک بیٹھے ہوئے چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ ہنگو ساؤ اس محفل کے بیچ میں نہیں تھا بلکہ وہ دُور ہی سے کھاٹ پر لیٹا ہوا مشورے دے رہا تھا۔ نوجوانوں کا کہنا تھا

"تیوہار کی خوشی میں کسی کو اڑچن ڈالنے کا حق نہیں۔"

ہنگو ساؤ کہتا تھا۔

"بڑے لوگوں کے منہ لگنا بھی غلط ہے۔ پھر دلیپ سنگھ کا لڑکا پڑھا لکھا ہے اُسے اِن تیوہاروں سے کیا دلچسپی۔"

مگر ہنگو ساؤ کی بات نہیں سنی گئی اور جوانوں نے طے کیا کہ پورا گاؤں کل ہڑتال کر دے اور دلیپ سنگھ کے لڑکے سے معافی منگوائے اور اس وقت سے گاؤں میں ایک ہنگامہ مچا یا گیا۔ صبح ہوتے ہوتے ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بچے جانور میدان کی طرف لے جانے کے بجائے گلی ڈنڈا کھیلنے لگے۔ عورتیں برتن مانجھنے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ گپ میں لگ گئیں۔ بوڑھے کھیت کی طرف نہیں گئے بلکہ حقہ لے کر بیٹھ گئے۔ ان کی پیشانیوں پر آج زیادہ بل تھے۔ نوجوان ابھی تک ہنگو ساؤ کے اکھاڑے میں جمے ہوئے تھے۔ اور یہ فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ پورے گاؤں کو ہم نوا بنا کر جلوس نکالا جائے۔

آخر کار گاؤں میں آدمی گھما دیا گیا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے جمع ہونے لگے اور آزادی کے تحفظ کے مسئلہ پر دائیں برسنے لگیں۔ اونکار پنڈت نے کہا "یہ تو بابو کی ادھرمی ہے۔ ان کا جب تک پُن دان نہ کریں کوئی کام نہ کرے۔ یہ بڑے آدمی اگر دھرم کو یونہی بھرشٹ کرتے رہے تو ...."

پنڈت اونکار چپ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

"یہ کوئی نئی ریت تھوڑی ہے" ایک بڈھے نے کہا "جوانی کے یہی دو تین تیوہار تو ہیں۔ ان میں نہ کھُل کھیلیں گے تو بے چارے اپنے دل میں کیا کہیں گے۔"

ایک اور نے کہا "مجھی کو بھیا! رات بلراج نے بدمستی میں ڈھکیل دیا۔ مدا ہولی کی رات میں کون کھیال کرے۔"

اور لوگ اس بڈھے سے رات کی تفصیلات پوچھتے رہے۔ بڈھا ہنستا ہوا بیان کرتا رہا۔ مجمع کی سنجیدگی ظرافت میں بدل گئی۔ بچے، جوان، بوڑھے۔ تمام رات کے قصے بیان کرنے لگے۔ اور مجمع ان کو سُن سُن کر ہنستا رہا۔ جب جل پری کی بات آئی تو ایک بڈھے نے کہا۔

"جھوٹ تھوڑی ہے۔ گریبوں کی دلہنیں کیا کم سُندر ہیں۔"

دوسرے نے کہا

"مدا بلراج کو جو مرل جاتا تو یہ بھی دوسروں کو تھوڑے دیتا۔ اپنی ہی رانی کی للار (پیشانی) پر چمکاتا۔"

بلراج نے گردن جھکالی تو ایک جوان نے کہا۔

"اور چاچا، رات کو سُندری کاکی جل پری بنی تھی۔"

سُندری کاکی نے تیزی سے کہا "تمہاری جوانی بھوانی لے جائیں۔ آنکھ پر موٹائی چھا گئی تھی۔ تنک خیال نہیں کون پری ہے اور کون آپدی۔"

اور بوڑھے۔ بچے۔ جوان ہنسنے لگے۔

اس کے بعد پھر دلیپ سنگھ کے مکان کی بات چیت چھڑ گئی اور لوگوں نے مشترکہ اعلان کیا۔

"یہ بڑے لوگوں کا اپدرد ہے۔"

اونکار پنڈت تُنتنائے

"دھرم پر جو بلدان ہو جائے مدا دھرم کیسے بھرشٹ ہو۔"

ایک نوجوان نے کہا

"آجادی ملی ہے اِسی لئے کہ اب بھی ہم بڑوں کے دبیل رہیں؟"

بچوں نے تالی بجائی۔ عورتیں بھنبھنانے لگیں۔ دوسرے نوجوان نے کہا

"اب وہ سمے لد گیا۔ جب گردن مروڑ کے جو چاہتے تھے کرا لیتے۔

"لگان نہیں دیں گے" آواز آئی

"کام بند کر دیں گے" ہنگامہ اُٹھا

"راستہ چلنا دوبھر کر دینگے" قیامت مچی

"ہم خون چوس لیں گے" عورتیں گھبرا گئیں

"آجادی" لے کے رہیں گے

"بلراج کی" جے

"لے کے رہیں گے" آجادی

"دھرم" بھرشٹ نہ ہوگا

"دشمن کا" ستیاناس

اور "بلراج کی" جے

عورتیں سمٹ گئیں۔ بچے بھاگ گئے۔ بوڑھے گردن جھکانے لگے۔ جوانوں نے زقند بھری۔ اونکار پنڈت منتر پڑھنے لگے۔ اور صبح سے نکلا ہوا بلراج گھر نہیں لوٹا۔ بلکہ اب وہ ہیرو تھا۔

شاشن ری

محمود فاروقی

شاشن ری کی عمر تو ویسے کچھ زیادہ نہ تھی لیکن دیکھنے میں وہ بہت زیادہ معمر معلوم ہوتا تھا۔ اس کو نہ جاننے والا بھی اس کے چہرہ کو دیکھکر بآسانی اندازہ لگا لیتا تھا کہ وہ کس قدر ستم رسیدہ ہے۔

میری جب اس سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت زیادہ سہما ہوا اور خوفزدہ ہے۔ میز کی دوسری جانب دونوں ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ ٹکائے اس نے بڑے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"جنگ کب ختم ہوگی؟"

میں نے جواب دیا۔ "جنگ کے ختم ہونے کا ابھی کوئی امکان نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

اس مختصر سے سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا اور نہ ہی میرے لئے یہ ممکن تھا کہ جس بے ساختگی سے سوال کیا گیا تھا اسی بے ساختگی سے میں جواب بھی دے دیتا۔

میں نے اس کے سوال کو ٹالنے کے لئے رسٹورنٹ کے ملازم کو بھولے ہوئے چیری لانے کا آرڈر دے دیا۔

شاشن ری کے بشرہ سے بھی یہی اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے سوال کا جواب لینا نہیں چاہتا اور شاید وہ اس سوال کو بھول بھی گیا تھا چنانچہ وہ ایک بے خبری کے عالم میں ان امریکی ٹامیوں کو دیکھتا رہا جو ابھی ابھی سنگاپور کی بندرگاہ پر اترے تھے۔

کہر آلود شام میں موٹے موٹے لبادے پہنے جب وہ بندرگاہ کے پل سے اتر رہے تھے تو مجھے بحری ڈاکوؤں کے متعلق پڑھی ہوئی بہت ساری کہانیاں یاد آگئیں چنانچہ میں نے روایتی گوراتا کا قصہ چھیڑ دیا کہ وہ کس طرح جزیرہ ہوناشش سے نکل بھاگا تھا۔

لیکن شاشن ری کسی اور ہی خیال میں غرق تھا۔ اس نے بھونے ہوئے چیری کے ایک خالی پیکٹ کو اپنی مضطرب انگلیوں سے مسلتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان لٹیروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں عالمی امن کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ امن کے متعلق اگر میں کوئی ایسی تجویز پیش کرسکوں جو ابھی تک کسی کے ذہن میں نہ آئی ہو تو بتاؤ کیا یہ ایک عجیب و غریب کارنامہ نہ ہوگا؟"

"کیا تم نے ایسی کوئی بات سوچی ہے؟"

"ہاں تھوڑی بہت لیکن ابھی میں پورے یقین سے اسے پیش نہیں کرسکتا!"

پھر وہ کچھ دیر رک کر کہنے لگا۔

"اصل میں مجھے اس غرض کے لئے ایک بڑی قربانی دینی ہوگی۔"

"کیا کوئی خطرناک تجویز ہے؟"

"بہت زیادہ اس کے لئے تو میں ــــــ!"

پھر نہ جانے کیوں اس نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا اور اچانک ایک دوسری ہی بات پوچھ بیٹھا۔

"لوگ اس شخص کو کیا کہیں گے جو اپنے وطن کو ساری دنیا کیلئے قربان کردے ـــــ کیا اس کے اس اقدام کو وطن سے غداری پر محمول کیا جائیگا؟"

"شاید نہیں۔" میں نے اس کی باتوں سے اکتاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ بات وطن پرستی کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتی۔"

"وطن پرستی..... " وہ قدرے پرجوش ہوگیا۔ "کیا..... کیا یہ ساری زمین ہمارا وطن نہیں ہے آخر انسان کب تک ان سمندروں، پہاڑوں اور جزیروں کی حدود میں گرفتار رہے گا!"

اس قدر کہہ کر وہ کچھ اس طرح خاموش ہوگیا جیسے وہ اپنی کہی ہوئی بات کے وزن سے دبا جا رہا ہو۔

اس گفتگو کے بعد چند ہفتوں تک میری شاشن ری سے کوئی ملاقات نہ ہوسکی..... البتہ اس دوران میں میرا یہ گمان قوی ہوگیا کہ شاشن ری کا دماغی توازن کچھ نہ کچھ ضرور بگڑنے لگا ہے....... ہونا بھی یہی چاہئے تھا کوریا میں اس پر جو کچھ بیتی تھی اس کا تقاضہ بھی یہی تھا۔

پہلے شمالی حملہ میں کمیونسٹوں نے اس کی لڑکی کے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا تھا اور دوسرے جنوبی حملہ میں اس کی رہی سہی پونجی کو جس طرح امریکی سپاہیوں نے لوٹا تھا اور پھر عام طور سے جس طرح اس کا وطن دو مخالف قوتوں کی رسہ کشی میں تباہ ہو رہا تھا اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ شاشن ری پاگل ہو جاتا۔

بہرحال میں اپنی معروفیات میں اس کے متعلق کچھ زیادہ سوچ نہیں سکا۔

ایک دوپہر کو جب میں اس چھوٹے سے نیلے رنگ کے چوبی ریسٹورنٹ میں بیٹھا بندرگاہ کی چہل پہل دیکھ رہا تھا شاشن ری پانچویں ڈک کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ حسب معمول زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اور اپنی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے الجھے الجھے ہوئے انداز میں چل رہا تھا۔
ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کے بعد پہلے تو اس نے اچٹتی ہوئی نظر ہر طرف ڈالی اس کے بعد تیزی سے چلتا ہوا وہ میرے مقابل کی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

"جنگ کب ختم ہوگی؟" عادت کے موافق اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ اور حسب معمول کسی جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بول اٹھا!

"ان لوگوں کو آخر جنگ کرنے کا حق ہی کیا ہے۔ اس دنیا کو نہ تو ان لوگوں نے تخلیق کیا اور نہ ہی وہ اس پر مالکانہ حقوق رکھتے ہیں..... پھر میں پوچھتا ہوں آخر اس طرح اپنا اپنا قبضہ جمانے کا اختیار ان کو مل کہاں سے گیا..... بتاؤ! چپ کیوں ہو!"

آخری جملہ کچھ ایسے انداز میں چلا کر اس نے کہا جیسے اس لڑائی کا تنہا میں ہی ذمہ دار ہوں اور میں ہی ساری زمین پر قبضہ جمائے بیٹھا ہوں اس کی آواز پر قریب کی میز پر بیٹھی ہوئی انگریز لڑکیاں چونک سی گئیں.... مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

وہ مبہوت بنا کبھی مجھ کو اور کبھی ان لڑکیوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا جیسے وہ ہماری کیفیت کو بے معنی اور بے موقع سمجھ رہا ہو...... اس وقت اس کی ہیئت کچھ ایسی مضحکہ خیز ہو گئی تھی کہ دیکھ دیکھ مجھے ہنسی آئی جا رہی تھی میں نے بمشکل اپنے اوپر قابو پایا۔

بلاشبہ وہ اس وقت یوں معلوم دے رہا تھا جیسے مرغی کا کوئی بڑا سا بھونا ہوا چوزہ زندہ ہو کر پلیٹ میں اٹھ بیٹھا ہو۔

اس کی اس حالت پر مجھے بڑا ترس سا آ گیا جنگ نے واقعی اسے بھون کر رکھ دیا تھا اس کے کنپٹی کے پاس سے اڑے اڑے بال اس کے زردی مائل چہرے کی پیلی پیلی شکنیں چھدری چھدری پلکوں کی سرخ سوجن اور بے چین پتلیوں کا درد انگیز توحش..... آخر کیا یہ باتیں اس واقعہ کا ثبوت نہیں تھیں کہ اسے بڑی مہارت کے ساتھ ہلکی ہلکی آنچ پر بھونا گیا ہے۔

اس کو دیکھتے دیکھتے میرے تصور میں بڑی گہرائی پیدا ہو گئی..... مجھے گویا ایک تکونی ڈش کی طرح نظر آنے لگا جس کے نیچے انسانی لاشیں ایندھن کی طرح سلگ رہی تھیں اور جس کے اوپر انسانی جسم مرغی کے چوزوں کی طرح بھونے جا رہے تھے اور جس کے اطراف بہت سارے جلاد نما باورچی طرح طرح کی کفگیریں پکڑے کھڑے ہوئے تھے۔

ایک چوزہ اس گرم گرم ڈش میں سے بھاگ نکلا..... میں نے دیکھا وہ شاشن ری تھا!

جنگ کسی صورت بند نہ ہوگی۔ شاشن ری کی آواز سے میں چونک اٹھا اور بغیر کچھ سوچے میں نے جواب دیا۔

"ہاں کسی صورت بند نہ ہوگی!"

"لوگ بہت لالچی اور حریص ہو گئے ہیں۔" اس نے میرے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے لالچ کو ختم کرنے کے لئے کوئی بھی شخص کسی بہتر خیال کو پیش نہیں کر سکتا..... اس لئے میں نے سوچا ہے!"

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش ہو گیا پھر میز پر قدرے جھک کر آہستہ آہستہ بولنے لگا..... "میں نے سوچا ہے کہ جنگ کو ہمیشہ جاری رہنا چاہئے!"

"ہمیشہ" میں چونک سا گیا۔

"ہاں ہمیشہ..... میں اس بارے میں ایک مفصل تجویز اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اگر مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ قبل از وقت ظاہر نہ ہوگی تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ صرف تمہیں! اس لئے کہ تم مجھے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ معقول اور سنجیدہ معلوم ہوتے ہو" میں نے اس سے وعدہ کیا!

شاشن ری نے کچھ دیر تک اطمینان کے لئے مجھے گھورا پھر اس نے اٹھ کر دریچہ کی جھلمل گرا دی اس کے بعد بڑی احتیاط سے ایک شکن آلود لفافہ اپنی جیب سے نکال کر مجھے دے دیا۔

یہ لفافہ مسٹر لی معتمد عمومی اقوام متحدہ کا موسومہ تھا۔ اندر دو تین صفحات پر سلامتی کونسل کے نام ایک باقاعدہ تجویز درج تھی۔ معتمد کے موسومہ پرچہ میں شاشن ری نے تحریر کیا تھا۔

"میں اب ایسی ساری تدابیر سے مایوس ہو چکا ہوں جو جنگ کو روکنے کے لئے انسانی دماغ سوچ سکتے ہیں انسانی عقل کے سوچے ہوئے سارے منصوبے خواہ وہ اشتراکی ہوں یا جمہوری امن قائم کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مجھے اب ایسے کسی تصور پر اعتقاد و یقین نہیں رہا ہے۔

دنیا کو تباہی سے بچانے کی اب ایک ہی تدبیر رہ جاتی ہے

کہ جنگ کو مستقلاً ایک مخصوص خطۂ زمین میں محدود کر دیا جائے۔ اس غرض کے لئے میں آپ کی خدمت میں ایک مفصل تجویز روانہ کر رہا ہوں اور متوقع ہوں کہ آپ اسے سلامتی کونسل کے قریبی اجلاس میں پیش کر دیں۔

ایک تباہ حال کورین
جو دُنیا کا بہی خواہ ہے
شاشن ری

اس خط سے منسلکہ تحریر میں شاشن ری نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

"کوریا کو امریکی اور اشتراکی عقلمندوں نے مل کر پُوری طرح تباہ و برباد کر دیا ہے اب کوریا کی سرزمین انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی ہے اس لئے اقوام متحدہ جزیرہ نما کوریا کو مستقلاً ایک ایسا محصورہ خطہ قرار دے دے جو صرف جنگ کے لئے مخصوص ہو اور وہاں سکونت اور آبادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دے دی جائے۔ کوریا مشترکہ طور پر ساری دُنیا کے ممالک کا وقف ہوگا اور اسے کسی ملک کی مخصوص ملکیت قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس خطۂ زمین کو دنیا کے سارے ممالک جس وقت ضرورت محسوس کریں گے جنگ کے لئے استعمال کر سکیں گے۔

اگر کسی تصفیہ کے لئے دو ملک جنگ کرنا چاہیں تو وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر کوریا چلے جائیں اور وہاں جس قدر جی چاہے جنگ کریں اور جیسے اور جتنے قسم کے ہتھیار چاہیں استعمال کریں جو ملک اس لڑائی میں ہار جائے وہ متنازعہ فیہ مسائل میں فاتح ملک کی شرائط کو تسلیم کرے۔ مثلاً۔ ہند اور پاکستان کشمیر پر قبضہ کرنا چاہتے ہوں اور ان کے لئے بجز لڑائی کے کوئی اور صورت نہ رہ گئی ہو تو وہ اپنی اپنی فوجیں اور سامانِ جنگ لے کر کوریا چلے جائیں اور وہاں جی بھر کر قوت آزمائی کرلیں ان میں سے جو لڑائی جیت جائے اقوام متحدہ کشمیر پر اس کے قبضہ کو تسلیم کرے۔

دونوں ملکوں کی فتح و شکست کے فیصلہ یا مقررہ قواعد جنگ کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ کے مبصر برسرِ موقع موجود رہیں جو ان دونوں کی لڑائی کے نتائج کا اعلان کرتے رہیں۔ اس طرح جنگ مخصوص خطۂ زمین میں محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اور بقیہ ساری دُنیا تباہی و بربادی سے بچ جائے گی اور انسانی قوتیں اور صلاحیتیں تعمیری کام میں صرف ہونے لگیں گی"

اپنی اس تجویز کے دوسرے جُز میں شاشن ری نے تحریر کیا تھا۔

"اگر یہ طریقہ بتدریج ترقی کرتا رہے تو ایک وقت وہ بھی آسکتا ہے جبکہ خود کسی ملک کو براہِ راست لڑائی کا انتظام کرنے کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ متعدد ایسی ایجنسیاں قائم ہو جائیں گی۔ جو لڑنے والے ممالک سے لڑائی کا ٹھیکہ حاصل کرلیں گی۔ اور اس طرح مختلف ملکوں کی بجائے ان کی نمائندہ ایجنسیاں اس مخصوص خطۂ جنگ میں لڑائی کا انتظام کریں گی۔

اس طرح مختلف ممالک کا بہت سارا خرچ اور وقت بچ جائے گا۔ انہیں صرف لڑنے والی ایجنسیوں کے ٹنڈر ادا کرنے ہوں گے اور اقوام متحدہ میں کوریا کے میدانِ جنگ کے انتظامات کے لئے تھوڑا بہت خرچ داخل کرنا ہوگا جس پر ان کو لڑائی کا اجازت نامہ حسب پروگرام مل جایا کرے گا۔ . . . .

اس قسم کی ٹھیکہ دار ایجنسیوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اقوام متحدہ سے اپنا لائسنس حاصل کرلیں اگر بغیر لائسنس کے کوئی ایجنسی جنگ کا کاروبار شروع کر دے یا اقوام متحدہ کی اجازت کے بغیر کوریا میں لڑائی لڑی جائے تو اس کو غیر قانونی قرار دیدیا جائے اور مجرمین پر اقوام متحدہ کی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے"

اس آنے والے مستقبل کے متعلق شاشن ری نے بڑی رنگین اور جذباتی عبارت لکھی تھی اور ایک طرح منظر کشی کرتے ہوئے تحریر کیا تھا۔

"وہ بھی کیا وقت ہوگا جبکہ اخباروں میں کرایہ پر لڑنے والی ایجنسیوں کے اشتہارات شائع ہوں گے کہ . . . .

"ہم بہترین لڑائی کا ساز و سامان رکھتے ہیں ہماری ایجنسی کو تجربہ کار ماہرین جنگ کی خدمات حاصل ہیں اور ایسے خفیہ ہتھیار بھی موجود ہیں۔ جن کا علم دُنیا بھر میں کسی اور ایجنسی کو نہیں ہے . . . . ہمیشہ فتح و کامرانی کے لئے ہمارے تجارتی نشان کو یاد رکھئے"

اور حکومتیں جنگ کے ٹنڈر طلب کریں گی . . . . .

"ٹنڈر مطلوب ہیں ایسی لڑاکا کمپنیوں کے جو پانچ ایٹم بم۔ دو ہائیڈروجن بم۔ ۵۰ ہزار جٹ طیارے اور ۵ لاکھ پیدل

فوج وغیرہ وغیرہ فراہم کرسکیں۔ نیز ان کو جنگ کا دیرینہ تجربہ بھی حاصل ہو۔ درخواست کے ساتھ فتوحات۔ مہارت اور تجربہ کی اسناد منسلک کی جائیں۔"

اور پھر جب دو ایجنسیوں میں لڑائی ہو گی تو ساری دنیا میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا جائے گا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں اطمینان کے ساتھ بیٹھے دو ملکوں کی لڑائی کا منظر اس طرح دیکھتے رہیں گے۔ جس طرح وہ فٹ بال میچ دیکھتے ہیں۔"

اِس تجویز کے آخر میں شاشن ری نے بڑے دردمندانہ الفاظ میں لکھا تھا کہ میں بڑے ایثار اور قربانی سے کام لیتے ہوئے اپنے وطن کوریا کی سرزمین کو ساری دُنیا کے لئے بطور وقف کے پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ مجھے اس کا بڑا دکھ اور قلق ہے لیکن اس وقت بجز اس کے کوئی اور صورت ممکن نہیں ہے۔

میں نے ایک عجیب کیفیت میں کہ مجھے کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور زیادہ تر بچارے شاشن ری پر ترس..... اس دلچسپ تحریر کو ختم کیا۔ اِس دوران میں شاشن ری بڑی بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ اِس ملاقات کے بعد بہت عرصہ تک مجھے شاشن ری نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں امریکہ واپس چلا گیا۔ امریکہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد مجھے بہ حیثیت رپورٹر کے لیک سکسس میں متعین کر دیا گیا۔ اپنے فرائض کے دوران میں جب کبھی مجھے معتمد عمومی مسٹر لی سے ملاقات کا موقع ملتا مجھے شاشن ری یاد آ جاتا۔ میں نے کئی بار سوچا بھی کہ ان سے معلوم کروں کہ کبھی شاشن ری نامی کسی شخص نے آپ کے نام کوئی خط سنگھا پور سے لکھا تھا لیکن میری ہمت نہیں پڑی۔

مگر شاشن ری سے ایک اور ملاقات خدا نے مقدر میں رکھی تھی جس کی تفصیل جس قدر دلچسپ ہے اُسی قدر عبرت انگیز بھی ہے۔ اِن دنوں اقوام متحدہ کے دفاتر بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ میرے کاموں میں بھی بڑی زیادتی ہو گئی تھی اصل میں اس وقت دُنیا کے چار بڑے انسانی عالمی مسائل کو قطعی طور پر حل کرنے کے لئے پہلی مرتبہ اقوام متحدہ میں جمع ہو رہے تھے اور یہ سارا ہنگامہ انہی کی خاطر بپا ہوا تھا.... اِس دوران میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا عین اس وقت جبکہ چار بڑوں کی کانفرنس کے انعقاد میں صرف نصف گھنٹہ کی دیر تھی۔

ایک سارجنٹ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ کانفرنس ہال کے کمرے کسی نے اندر سے بند کر لئے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں اندر سے سُنائی دے رہی ہیں۔ میں بھی دوسروں کے ساتھ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور بدقت ہم نے ہال کے بڑے دروازے کو کھولا۔

ایک شخص تمام میزوں اور کرسیوں کو اُٹھا اُٹھا کر پھینک رہا تھا تمام سرکاری اشلہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"اقوام متحدہ تمہاری ملکیت نہیں ہے یہ خدا کی ملکیت ہے"

جب اس کی نظر ہم پر پڑی تو وہ چلآیا۔۔۔

"ابھی عوام کو یہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں"

ہم نے جب اِسے پکڑنا چاہا تو وہ مزاحمت پر آمادہ ہو گیا بمشکل اس پر قابو پایا گیا اور تسموں سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے۔

جب ہم اِسے کشاں کشاں نچلی منزل کی طرف لے جا رہے تھے تو وہ بُری طرح چلا رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو..... دُنیا کو امن کی ضرورت ہے۔
اقوام متحدہ خدا کی ملکیت ہے۔
مجھے امن چاہیئے امن"

بہرحال ہم گھسیٹتے ہوئے اِسے نیچے لے گئے اور وہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں اسے بند کر دیا۔

لنچ کے بعد میں مزید تحقیق کے لئے اس کمرہ میں گیا جہاں اسے بند کر دیا گیا تھا..... وہ بیچارا پاگل ایک لانبے کوچ پر گردن ٹکائے آنکھیں بند کئے سو رہا تھا میری آہٹ پاکر اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں پھر کچھ دیر تک وہ مجھے گھورتا رہا اس کے بعد اس نے مجھے اپنے قریب بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بڑے تھکے ہوئے انداز میں اچانک دریافت کیا۔

"کیا جنگ ختم ہو گئی؟"

"اوہ" میں چونک پڑا۔

لیکن افسوس اس کو اپنے سوال کا جواب سننے کا موقع نہ ملا۔

اس کی گردن کوچ کی پُشت پر ڈھلکتی چلی گئی اور اس کی بے نور پتلیاں منجمد ہو کر رہ گئیں صرف ایک مرتبہ اس کے سارے بدن میں اینٹھن سی پیدا ہوئی اور اس کے لب آہستہ آہستہ ہلے وہ اپنے آخری

وقت میں وہی جملہ دہرا رہا تھا۔

"امن چاہئے امن"

"اقوام متحدہ خدا کی ملکیت ہے"

پہلی مرتبہ مجھے اس کا گھٹتا ہوا فقرہ بہت زیادہ قیمتی اور بامعنی معلوم ہوا اور میں اس کی اکھڑتی ہوئی روح کے سامنے تعظیماً جھک گیا۔

مجھے لیک سکسس کی وہ عجیب و غریب سہ پہر ہمیشہ یاد رہے گی جبکہ اقوام متحدہ کے ایک کمرہ میں ایک لانبے کوچ پر ایک غریب کورین کا بے جان لاشہ پڑا ہوا تھا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ ایک روشن دان سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کمرہ کے اوپر دنیا کے چار بڑے عقلمند خدا کی ملکیت کا بٹوارہ کرتے آپس میں الجھ رہے تھے۔ اس کمرے سے نکلتے وقت جو آخری خیال میرے ذہن میں گھوم رہا تھا وہ یہ تھا کہ

"شاشن ری کا جنون ان چار بڑوں کی دانشمندی سے زیادہ قیمتی اور باوقار ہے"

کاش دنیا عظیم تر شاشن ری کو پہچان سکے جو کوریا کی ابلتی ہوئی تکونی ڈشتن سے ایک جھلسے ہوئے چوزہ کی طرح پھاند کر بھاگ نکلا تھا۔!

(ادارۂ ادب اسلامی کے کل ہند اجتماع میں پڑھا گیا)

شرائط ایجنسی

۱۔ دیانت داری اور حسابات کی ادائیگی میں باقاعدگی شرط اوّل ہے۔

۲۔ کم سے کم ۵ عدد پرچے منگوانے ہوں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فیصدی دیا جائے گا۔

۴۔ سول ایجنسی کی صورت میں سَو عدد پرچے منگوانے ہوں گے۔

۵۔ پرچہ ذریعہ وی۔ پی یا پیشگی قیمت آنے پر روانہ کیا جائے گا۔

۶۔ صرف خاص صورتوں میں یہ رعایت کی جائے گی کہ پہلی دفعہ پرچہ بذریعۂ بک پوسٹ بھیجا جائے گا۔

۷۔ ڈاک خرچ میں صرف بک پوسٹ کا خرچ دفتر کے ذمّہ ہوگا۔

۸۔ ڈاک کی خرابی کا ذمّہ دار دفتر نہ ہوگا۔

(منیجر)

منیر حسین

شیطان مرگیا

جیسے کسی نے مجھ سے کہا "شیطان مرگیا"

میں اِک دم چونک پڑا۔ "شیطان مرگیا! کیا بات پیدا کی ہے؟ یعنی جناب شیطان الرجیم داغِ مفارقت دے گئے؟ اور وہ جو انہیں اللہ میاں نے مہلت وغیرہ دی تھی وہ سب کیا ہوئی؟ کیا قیامت آگئی ہے؟"

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں گھبرا کر باہر نکلا۔ دیکھا تو باہر واقعی ایک چھوٹی موٹی قیامت آئی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا ماتمی جلوس نکالا جا رہا تھا۔ اور ہر طرف سے فریاد و شیون کی صدائیں آرہی تھیں۔ لوگ سیاہ ماتمی لباس پہنے سینہ پیٹتے۔ آہیں بھرتے چلے جا رہے تھے۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں اور چہرے اس طرح اُترے ہوئے جیسے کوئی بہت بڑا آدمی یا لیڈر مرگیا ہو۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آچلی تھی کہ پڑوس کے گھر سے وکیل صاحب غم کا سیاہ لباس پہنے منہ لٹکائے تشریف لائے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اِس لئے میں نے قریب جا کر زور سے کہا:

"وکیل صاحب خیریت تو ہے؟"

سیاہ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولے "آہ۔ اب خیریت کہاں۔ ہماری روزی کا اب اللہ حافظ ہے۔"

"کیا ہوا۔ کچھ بتائیے تو؟ کیا واقعی شیطان مرگیا؟"

انہوں نے ایک آہ بھری "جی ہاں صاحب کیا کہا جائے۔ بہت دنوں سے مرحوم کی جان کو ایک روگ لگ گیا تھا۔ آخر کل شب جاں بحق ہوئے۔ انا للہ

انہوں نے یہ آیت پوری پڑھی بھی نہیں تھی کہ قریب ہی سے ایک مولانا سفید لباس پہنے، خوشبو لگائے مسکراتا ہوا چہرہ لئے اِک دم بول اُٹھے۔

"وکیل صاحب۔ انا للہ نہیں، لاحول پڑھیئے لاحول"

اب میں نے اور وکیل صاحب نے انہیں ذرا غور سے دیکھا۔ اس رنج و غم کے ماحول میں وہی ایک شخص نظر آرہے تھے جو اس قدر شاداں و فرحاں اور اچھا لباس پہنے موجود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انہیں کوئی غم ہی نہیں ہے۔ باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ بلکہ پھٹی جا رہی تھیں۔ وکیل صاحب نے ذرا کڑوے انداز سے کہا "مولانا۔ مرنے کے بعد تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ مُردوں کا ذکر بُرائی کے ساتھ کیا جائے؟"

قریب تھا کہ مولانا اور وکیل صاحب میں کوئی گرماگرم بحث چھڑ جاتی میں وہاں سے ہٹ آیا۔ اور اندر جا کر اپنی دُوربین اٹھا لایا۔ تاکہ ذرا تفصیل سے اِس مجمع کا جائزہ لیا جائے۔

جب میں لوٹا تو شیطان کا جنازہ کافی دُور نکل چکا تھا بس ایک لکڑی کا سیاہ بکس سا نظر آرہا تھا جس کے پیچھے ایک بے انتہا لمبا جلوس رونے اور افسوس کرنے والوں کا گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ ایک تختِ رواں پر پڑی۔ جسے بہت سے مزدور اپنے سروں پر اٹھائے لئے جا رہے تھے، ان میں ہر رنگ کے اور ہر نسل کے لوگ تھے۔ لیکن مجھے زیادہ تر کوریا، جاپان، فلسطین، اور کشمیر وغیرہ کے لوگ نظر آئے۔ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ پیٹ پیٹھ سے لگے ہوئے تھے پسلیاں کھلی ہوئی تھیں، اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ اب گرے اور اب گرے۔ اُوپر دُنیا کی تمام بڑی بڑی اقوام کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ اور ان کے خاص نمائندے ماتمی لباس پہنے شریک تھے۔ جناب صدر فرما رہے تھے "مرحوم نہ صرف دُنیا کی سب سے بڑی ہستی تھے بلکہ اس ادارہ کے بہت بڑے محسن بھی تھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ اس ادارے کی رُوحِ رواں تھے۔" تختِ رواں دُور ہونے کی وجہ سے میں پوری تقریر نہیں سُن سکا۔ کہیں کہیں سے ایک آدھ جملہ کان میں پڑ جاتا تھا۔ مثلاً "یہ ادارہ شاید اب اپنا وجود کھو بیٹھے ..... ہم لوگ بالکل یتیم ہو گئے" اور اسی قسم کے جملے۔ ہر جملہ پر آہ و فریاد کا ایک شور اُٹھتا تھا۔ ہاں کسی کسی چھوٹے ملک کا نمائندہ خوشی کی تالیاں بھی بجا دیتا تھا۔

لیکن میں زیادہ تفصیل سے اس دلچسپ منظر کو نہ دیکھ سکا کیونکہ یہ بہت جلدی گذر گیا۔ ان کے بعد معزز لوگوں کا ایک گروہ آیا۔ ان میں دنیا کی تمام پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں کے کثیر تعداد میں ممبران اور عہدے داران تھے۔ کئی کمیشنوں کے ممبر تھے۔ حال تو سب کا برا تھا لیکن وزرائے خارجہ اور وزیر پرمٹ کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک کے بجائے دو دو رومال تھے جن سے باری باری آنسو پونچھتے تھے۔ ایک ملک کے وزیر خوراک کو میں نے دیکھا غریب کو تقریر کرنے کا بھی ہوش نہیں تھا لیکن سب سے زیادہ تعجب مجھے ایک پنجابی لباس پہنے مسکراتے ہوئے ممبر کو دیکھ کر ہوا۔ آپ قدم قدم پر ہنستے اور دوسروں کے آنسو پونچھتے چلے جا رہے تھے۔

یہ گروہ خاصا دلچسپ تھا لیکن اتنی جلدی گذر گیا کہ تفصیل میں زیادہ دیکھ ہی نہ سکا۔ دوسرے ان کے بعد جو گروپ آیا اُس نے اپنی طرف توجہ مبذول کرائی۔ ان میں سب سے آگے آگے دنیا بھر کے چور، اُچکے، ڈاکو، قاتل، بدمعاش، کوکین فروش، اور بلیک مارکیٹر تھے۔ ان سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور باوجود قسی القلب ہونے کے اکثر کی آنکھیں واقعی نم تھیں۔ ایک بڑے مزے کا واقعہ ہوا۔ ایک جیب کترے صاحب نے موقع پا کر ایک تالا توڑنے والے کی جیب صاف کر دی۔ لیکن کچھ خیال آتے ہی فوراً سب چیزیں واپس کر دیں۔ اور بے چارہ معافی مانگنے لگا۔ لیکن تالا توڑنے والے نے سب اوزار واپس کر دیئے اور کہا۔ "اب مجھے ہی ان کا کیا کرنا ہے" یہ کہہ کر ایک سرد آہ کھینچی۔ اور آنسو ڈبڈبا آئے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی نظر آیا۔ مگر وہ مسکراتا ہنستا چلا جا رہا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں ہنس رہا تھا۔ ممکن ہے کہ ڈاکو وغیرہ اُس سے زبردستی کچھ کام کراتے ہوں۔

انہی کے بالکل پیچھے محکمہ پولیس اور سول سپلائز اور راشن وغیرہ کے اکثر عمال آرہے تھے۔ کئی عدالتوں کے افسران بھی تھے۔ ان سب کا بھی وہی حال تھا لیکن یہ گروپ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں تھا۔ ہاں۔ انہی میں مجھے اپنے محلے کے شکر کے راشن کی ایجنسی کے مالک بھی ملے۔ آپ شکر میں ریت اور آٹا وغیرہ ملا کر فروخت فرماتے تھے۔ اور کافی بلند آواز سے روتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی سر میں دھول بھی جھونک لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ اور میں ذرا بے دلی سے دوسرے گروپ کا انتظار کرنے لگا۔

یہ گروپ ابھی قریب بھی نہیں آیا تھا کہ کان میں باجوں اور موسیقی کی تانیں آنی شروع ہو گئیں۔ پہلے شبہ ہوا شاید ریڈیو پر ساز سنگیت کا پروگرام ہو رہا ہے اور ایک ساتھ کئی ریڈیو بج رہے ہیں۔ کہیں سے فلمی گانوں کی آواز آ رہی تھی۔ مثلاً "گھبرا کے جو ہم سر کو ٹکرائیں تو اچھا ہو"، "چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا"...... "کیا مل گیا بھگوان تمہیں دل کو دکھا کے"..... اور کچھ دوسرے گانے جن میں اکثر جوانی، مستانی، بالم، ساجن، نجریا، کمریا اور گدرا، انار وغیرہ الفاظ کے سوا اور کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ساز سنگیت کا یہ ماگھ میلا جب قریب آیا تو معلوم ہوا کہ زمانے بھر کے ارباب نشاط، طوائفیں، فلم ایکٹرز اور ایکٹریسیں اور رقاص وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ آہیں بھرنے اور رونے رلانے کی ایکٹنگ میں تو پہلے ہی طاق تھے۔ لیکن اس وقت واقعی حال برا تھا۔ کئی ایکٹریسیں سچ مچ کے آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ میں نے چارلی چیپلن اور لارل ہارڈی مشہور امریکی مسخروں کو دیکھا۔ غریبوں سے ڈھنگ سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہ سب ایک ہی لباس میں تھے۔ یعنی وہی ماتمی سیاہ لباس۔ فلم ڈائرکٹروں کی حالت بھی تباہ تھی۔ غش پر غش آ رہے تھے۔ چند مشہور اُردو شعرا بھی ان کے پیچھے گھسٹتے پھسٹتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کے ہوش آج واقعی اُڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی کچھ مشہور مکالمے اور کہانی لکھنے والے ادیب بھی تھے۔ ان سب کے چہروں سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی ٹریجڈی پر غور کر رہے ہوں اور اپنی اولین فرصت میں اسے کسی فلم والے کے ہاتھ بیچ دیں گے۔

ارباب نشاط کے گروپ کے ساتھ ہی ان کے تمام اُستاد، ہارمونیم طبلہ سکھانے والے، شہر کے شوقین مزاج، بگڑے رئیس، مشتاق اور چاہنے والے، اور دو چار پان اور چائے کی دوکان والے بھی تھے۔ انہیں میں میں نے ملک کے مشہور ادیب اور شعرا کو دیکھا۔ نوحے اور مرثیئے کے اشعار پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں کے ساتھ عریاں اور فحش نگار وغیرہ بھی تھے۔ ہاں ایک چیز بہت عجیب معلوم ہوئی کہ زنانِ بازاری بہت خوش خوش، مسکراتی چلی جا رہی تھیں۔ جیسے انہیں بڑی کی سی خوشی ہو۔ یا کسی بڑے ظلم سے نجات مل گئی ہو۔ ان کے چہروں پر اُسی پرانی معصومیت کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی تھی جو عموماً عورتوں میں پائی جاتی ہے۔

یہ گروپ بیحد دلچسپ تھا۔ امریکی فلم ایکٹریسیں۔ ہالی وڈ کے بہترین چہرے، بڑے بڑے مشہور آرٹسٹ، جنہیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ سب ایک حال میں چلے جا رہے تھے۔ یہ جلوس خاصا لمبا تھا۔ اور بہت دیر تک بغیر ایکٹنگ کئے روتا پیٹتا چلتا رہا۔

انہی کے بالکل پیچھے کالج اور یونیورسٹی کی بے پردہ فیشن پرست آزاد خیال لڑکیاں تھیں۔ ان کے چہرے آج غازے سے محروم تھے۔ اور ہونٹ لپ سٹک سے

آنز اور عجیب مایوسی کے عالم میں سیاہ ماتمی لباس پہنے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھیں۔ انہیں کے دائیں بائیں شوقین مزاج، فیشن پرست کالج کے طلبا تھے۔ ان کے چہرے بھی اُجڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں تیل تک نہیں تھا۔ ٹائیاں ڈھیلی پڑی تھیں۔ اور نگاہیں اِدھر اُدھر نہیں اُٹھ رہی تھیں کہیں کہیں ایک آدھ لکچرار اور پروفیسر بھی نظر آجاتے تھے۔ یہ تعلیم یافتہ گروپ بہت مہذب انداز سے آہستہ آہستہ SLOW MARCH کرتا ہوا چلتا رہا۔ میں نے سوچا چلو آج کالج کی تو چھٹی ہوئی۔

ان طالب علموں کے بعد کچھ اور طالب علم آئے۔ یہ سب کالجوں کے تھے۔ لیکن اکثر ان میں سے شیطان کی موت کے غم میں گرفتار نہیں معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یہ ہنستے بھی نہیں تھے۔ غرض کچھ عجیب عالم میں تھے، جیسے نہ اِدھر ہوں نہ اُدھر، اس گروپ کی بہت کثرت تھی۔ ایک بہت مشہور یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھکر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ شاید شیطان کی موت پر غمگین نہ ہوں گے، یہ سب سیاہ شیروانی اور سیاہ برقعے پہنے تھے۔ جیسے پوری یونیورسٹی شیطان کے غم میں ماتم کناں ہو۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بات نہیں تھی۔ ان کی مخصوص پوشاک یا یونیفارم ہی یہی تھا۔ اس بات سے مجھے کافی خوشی ہوئی لیکن بہت غور کرنے پر بھی چہروں سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ حالت غم کی ہے یا خوشی کی۔ معدودے چند لوگ سفید کپڑوں میں خوش خوش چلے جا رہے تھے۔ البتہ لڑکیوں نے اپنے برقعوں کے نقاب گورے گورے چہروں سے اُٹھا رکھے تھے۔ خدا جانے اس سے مقصود اظہار مسرت تھا . . . . یا . . . . کچھ اور . . . . . .

ان کے بعد اسکولوں کے لڑکے تھے۔ یہ لوگ بالکل بے تعلق چلے جا رہے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ لڑکے بھی جنہیں شیطان کا چیلا کہا جاتا تھا کچھ زیادہ مغموم نہ تھے۔ ہاں بڑے لڑکے کچھ زیادہ مغموم معلوم ہو رہے تھے۔ بہرحال میرا جی ننھے بچوں کو دیکھکر بہت خوش ہوا۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور بے داغ معصومیت کا نور تھا۔

شام ہو رہی تھی اور وقت بہت تیزی سے گذر رہا تھا۔ میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اُدھر ہجوم بھی کچھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں واپس ہونے کو تھا کہ دُور سے کچھ مشاعرہ کا سا شور سُنائی دیا۔ جیسے کسی چلتے ہوئے شعر پر داد سے چھت اُڑ گئی ہو۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے شیطان کی موت پر کوئی مرثیہ۔ یا تاریخی مصرع ہی مل جائے گا۔ ادیبوں، شاعروں، اور افسانہ نگاروں وغیرہ کا یہ ہجوم تین مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک گروہ سرخ کپڑے پہنے، ہتھوڑے درانتی سے قلم کا کام لیتا، پیٹ پیٹتا، انگارے، لاوے، شفق، خون اور جنس سے اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ان کا سر پیٹ کی جگہ تھا۔ اور پیٹ سر کی جگہ۔ یہ لوگ منہ بسورتے آزاد نظموں میں مرثیے کہتے چلے جا رہے تھے۔ علاوہ خون اور آگ کے میری سمجھ میں نہ آسکا۔

دوسرا گروہ آنکھوں پر پٹی باندھے، کانوں میں تیل ڈالے خراماں خراماں چلا آ رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ کہیں باہر کی فضا سے ان کے شیش محل اور رومان بھرے خواب ٹوٹ نہ جائیں۔ یہ لوگ کہکشاں، بہار، گل و بلبل، ہجر و وصال اور خیالی محبوبوں کے جور و ستم کا تذکرہ کرتے گرتے پڑتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی باتیں اتنی دقیانوسی اور گھسی ہوئی تھیں کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔

تیسرے گروہ کی ابتدا میں بہت ہی عجیب قسم کے لوگ تھے۔ یہ لوگ کپڑوں اور شکل کے لحاظ سے تو بہت ہی مذہبی اور پرہیز گار معلوم ہوتے تھے لیکن انکے پاس جو شمع تھی اُسے انہوں نے احتیاط سے متبرک رومالوں اور عماموں میں چھپا رکھا تھا۔ تاکہ کہیں اُسے ہوا نہ لگ جائے۔ ان میں سے کچھ کے پاس تو واقعی قلم دوات تھے لیکن بیشتر ڈنڈوں اور نیزوں سے مسلح تھے۔ اور کچھ کے پاس تو ایک فہرست کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جس میں کچھ اس قسم کی تفصیلیں تھیں کہ بلی اگر کوئیں میں گر جائے تو کتنے ڈول نکالے جائیں۔ اور بلی کے تعاقب میں اگر کتا بھی وہیں گر پڑے تب کتنے ڈول نکالے جائیں۔

ان کے بالکل پیچھے ایک چھوٹا سا گروہ اور آ رہا تھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا اور تاریکیاں چھانے کو تھیں لیکن یہ لوگ ایک شمع جلائے۔ قدم بڑھائے چلے آ رہے تھے۔ چہروں سے بشاشت اور عزم و استقلال نمایاں تھا۔ جیسے یہ مٹھی بھر ادیب زمانے بھر سے لڑنے جا رہے ہوں اور اپنی کم تعداد سے بالکل لاپروا ہوں۔

جب یہ لوگ بھی گذر گئے تو میں اندر کمرے کی طرف چلا تاکہ ریڈیو پر شیطان کی تجہیز و تکفین کا آنکھوں دیکھا حال سنوں۔ لیکن میں اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک عجیب آدمی جگمگاتے کپڑے پہنے۔ خوشبو میں بسا ہنستا، مسکراتا چلا آ رہا ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ میں نے سوچا۔ تمام لوگ جا چکے ہیں۔ یہ کون شخص ہو سکتا ہے جو اس قدر آزاد ہے اور خوش بھی۔

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو"
جواب ملا۔ "آپ یقین نہیں کریں گے"

میں نے کہا "نہیں۔ آپ بتائیں تو سہی آپ ہیں کون؟"

اُس نے ذرا غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "میں شیطان ہوں"

ارے۔ میری ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی "شیطان تم یہاں! لوگ تو تمھارا جنازہ لے جارہے ہیں؟"

"وہ میرا جنازہ نہیں ہے"

"پھر کیا ہے؟"

"مردم شماری ہے" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مردم شماری؟؟ کیا مطلب؟"

میں ہر سال اپنے پیرودں کی مردم شماری کرتا ہوں۔ پہلے تو میں اُس کفن میں مرنے کا بہانہ کرکے لیٹ گیا۔ لیکن پھر چپکے سے نکل بھاگا۔ اُس سیاہ ڈبے میں ایک مشین لگی ہوئی ہے جو آپ سے آپ میرے جنازہ پر رونے والوں کا شمار کرلے گی"

"اُف میرے اللہ" میں نے کہا "تو یہ سب ڈھونگ اِس لئے رچایا گیا تھا" ساتھ ہی میری نظروں کے سامنے وہ بے شمار مغموم چہرے اور لا متناہی ہجوم گھوم گیا جو ابھی گذرا تھا۔ میں نے زور سے چیخ ماری اور ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

شام ہوچکی تھی میں تیسرے پہر سے ۱۹۵۱ء میں ہونے والی مردم شماری کے فائلوں کو پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ سُورج کی آخری زرد کرنیں مردم شماری کے پیلے کارڈوں پر پڑتی ہوئی کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔

۱۔ معیار کے لئے مضامین سب آفس کے بجائے ہیڈ آفس آنے چاہئیں۔

۲۔ مضمون نگار اصحاب مضامین صاف اور خوش خط روانہ کریں۔

۳۔ مضامین کاغذ کے صرف ایک طرف لکھے جائیں۔

۴۔ ہمیشہ مقصد کی خاطر لکھئے مگر اس طرح کہ فن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

۵۔ جواب طلب اُمور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیں۔

غزل

محمد وارث کامل

عالمِ شوق و ذوق میں طے ہوئے سخت مرحلے
پھر وہی ہم ہیں، پھر وہی شام و سحر کے مشغلے

پھر ہیں مقامِ شوق پر منزلِ امتحان سے دور
بانگِ درا کے منتظر دیدہ و دل کے قافلے

چشمِ کرم کا شکریہ ضعفِ نظر کے باوجود
پست نہیں ہوئے کبھی دل کے بلند حوصلے

سیر نہیں ہوئے ابھی بادہ کشانِ تشنہ لب
پھر درِ میکدہ کھلے دورِ مئے ازل چلے

کاملِ رمز ناشناس زورِ بیاں سے فائدہ؟
حل نہ ہوئے نہ ہوں کبھی بحث و نظر سے مسئلے

جہاں بدلا جہاں کے طور بدلے زمین و آسماں کے دَور بدلے
ازل سے گردشیں ہی گردشیں ہیں خدا معلوم کیا کچھ اور بدلے

(محمد وارث کامل)

غزل

حقی حزیں۔ ایم۔ اے

دل میں کیوں اندیشۂ سود و زیاں پیدا کریں
اپنی دُنیا ماورائے این و آں پیدا کریں

اک طلسمِ حیرت افزا ہے فضائے کائنات
اس سکوتِ بحر میں موجِ رواں پیدا کریں

ہو زباں پر ہی فقط کیوں گفتگو کا انحصار
خامشی میں بھی اک اندازِ بیاں پیدا کریں

ہر نفس ہو آشنائے رازِ تعمیرِ حیات
ہر قدم پر جراءتِ عزمِ جواں پیدا کریں

یہ جہانِ مختصر، یہ تنگیٔ دامانِ دل
ہاں اسی میں وسعتِ کون و مکاں پیدا کریں

کیا خوشی آئے گی چمن کو چند روزہ زندگی
آؤ سامانِ بہارِ بے خزاں پیدا کریں

پھر ضرورت ہے کہ اس دورِ ہلاکت میں حزیں
صبر کے پیغام سے امن و اماں پیدا کریں

شاکر تسلیم

غزل

کوئی میری طرح اس دور میں برباد نہیں
لیکن اس پر بھی مجھے شکوۂ بیداد نہیں

ہمنشیں مجھ کو غمِ شورشِ الحاد نہیں
یہ وہ تعمیر ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں

یا تو یہ شور کہ ہر گام پہ اک حشرِ جدید
یا یہ سنّاٹا کہ جیسے کوئی آباد نہیں

میرے محبوب اس آشوبِ زمانہ کی قسم
غمِ ہستی کے سوا اب مجھے کچھ یاد نہیں

نظریئے سینکڑوں اور جادۂ ہستی مفقود
ہیں مفکّر تو بہت سے کوئی نقّاد نہیں

اس کا ہر سانس ہے اک دعوتِ تسلیم و رضا
کون کہتا ہے کہ شاکر کو خدا یاد نہیں

غزل

جمیل حسین ناسخ

خرد کے ہاتھ میں یہ کیسا جام ہے ساقی
جو پی رہا ہے وہی تشنہ کام ہے ساقی

محال ہے کہ تجسس ہو اور ناکامی
طلب نہیں ہے ابھی ذوقِ خام ہے ساقی

زمانہ صبحِ حقیقت سمجھ رہا ہے جسے
خرد کے جلوؤں کی رنگین شام ہے ساقی

کہاں کے امن و اماں اور کہاں کی آزادی
زمانہ آپ ہی خود اپنا دام ہے ساقی

دلوں کی خیر ہو پیہم دھڑک رہی ہے نظر
نویدِ صبح میں تعمیرِ شام ہے ساقی

بھٹک رہا ہے اُجالوں میں بھی زمانہ آج
یہ کیسا دور یہ کیسا نظام ہے ساقی

فریب خوردہٗ منزل نہیں جنوں میرا
مری فغاں میں سحر کا پیام ہے ساقی

ادارہ

پسند اپنی اپنی

اصغر گونڈوی

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو — پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے — اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے — جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

اس کو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے — جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال — اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت — میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی — جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

جینا بھی آ گیا، مجھے مرنا بھی آ گیا — پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے، نہ جل کر خاک ہونا ہے — یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں — اِک تازہ زندگی ہے ہر اِک اضطراب میں

خیال اپنا اپنا

ایک عورت دو ملک[1]

"ایک عورت دو ملک" اسعد گیلانی کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجموعہ کے پہلے افسانہ کے نام سے مجموعہ کو بھی موسوم کیا گیا ہے۔ سرورق اور نام دونوں اپنے اندر اتنی جاذبیت رکھتے ہیں کہ دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی متاثر ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں جنسی تسکین اور سستے مذاق کے افسانے نہیں جیسا کہ آج کل عام ہیں۔ قاری کو اُن میں اُس سوسائٹی کا عمیق مطالعہ ملتا ہے جس کے ہم سب کسی نہ کسی حیثیت سے رکن ہیں۔ پڑھنے والے کو سنجیدہ موضوعات کی وادی پرخار میں اس طریقہ سے داخل کیا جاتا ہے کہ وہ محسوس بھی نہیں کر پاتا کہ اس کو اپنی ہی سوسائٹی پر تنقید کے تیر و نشتر چلائے جا رہے ہیں۔ اور پھر آگے چل کر ایک ایسا ماحول تیار ہو جاتا ہے کہ خود پڑھنے والے کا دماغ اپنے اُوپر تنقید کرنے لگتا ہے اور دوسروں کی تنقید ٹھنڈے دل سے گوارا بھی کر لیتا ہے۔

اسعد نے ماحول کے اس گندے اور تعفن زدہ پہلو کو پیش کیا ہے جسے دیکھتے سب چلے آئے ہیں مگر گہرے لگاؤ کی بنا پر اس سے ہٹ کر بہتر ڈھانچہ سوچنے کے عادی نہیں۔ ہماری سوسائٹی کا مزاج کچھ اس طرح کا ساخت ہوا ہے کہ ہم اس سوسائٹی کو ہی اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں اور خود کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے اخلاقی اور اقتصادی اور معاشرتی معاملات غرض ہر پہلو میں ہم کو اپنے آپ کو اسی رائج الوقت نظام میں کرنا ہوتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی کا ماحول صالح ہے اور وہ اپنے آپ کو موجودہ ماحول میں پاتا ہے تو ایک طرف تو اس کو اپنی شخصیت واحد نظر آتی ہے، دوسری جانب اس "صالحیت" سے عظیم نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس شخص میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی قیمت اپنی ہی نظر میں ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔ جس کا اثر اجتماعی طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ ماحول سازگار بنانے کے لئے اسی دُنیا کے الٹے سیدھے ہتھیار چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس میدان کا غازی نہ ہونے کی وجہ سے منہ کی کھانی پڑتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چارہ نہ اِدھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا۔ اس کی زندگی صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔

مجموعہ کا پہلا افسانہ "ایک عورت دو ملک" جس کی افادیت اور انفرادیت کی بنا پر مصنف نے مجموعہ کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ موجودہ دور پر نہایت عمدہ تنقید ہے۔ مصنف نے کسی خاص جیتے جاگتے کیریکٹر کا تذکرہ نہیں کیا لیکن قاری کو یہ پھر بھی صاف معلوم ہوتا جاتا ہے کہ اس میں دو ملکوں کی عورت کا موازنہ ہے۔ افسانہ کی ابتدا اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ دماغ کو مجبور یا جیسے دُور دراز ملک کا تصور دلا کر اور موجودہ جنگ سے قریب تر ہونے کی بنا پر کسی اجنبیت کے احساس کے بغیر نئی نئی وادیوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اور پھر جسم مشرق میں رُوح مغرب حلول ہو کر اپنی کارگزاریاں دکھلاتی ہے۔ یہ رُوح عورت کے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اور اپنی افسوں طرازیوں سے مشرق کے عروق مُردہ کو حیاتِ نو کا مژدہ سنا کر خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہے لیکن یہ سحر دیرپا نہیں ہوتا۔ ڈالروں کا سامان حرب اور توپ و تفنگ۔ جو مشرق کی عورت کو جہیز میں ملا تھا۔ وہ سب مسمار ہوتا جاتا ہے۔ افق پر سُرخ سُرخ بگولے اٹھ کر اس کو ڈھا دیتے ہیں۔ اور یہ عورت میڈم چیانگ کائی شیک کے مشرقی جسم کی صورت میں بظاہر چھوڑ کر مر جاتی ہے جس نے چین کی رسوائی میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ پھر وہی عورت دوسرا جنم لیتی ہے اور پاکستان میں جا کر ظاہر ہوتی ہے۔ اور اپنی افسوں کاری سے سالارِ ملت کو پھانس لیتی ہے۔ اسعد یہاں ایک لیتا ہے اور اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے ہو جاتا ہے مجبور یہ یا بالفاظ دیگر چین میں تو اس ساحرہ کا طلسم مغرب نے توڑا لیکن پاکستان میں یہ ساحرہ اپنے خنجر سے اپنے کو خود ہی ختم کرنے لگی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے جس کا علمبردار بن کر اسعد افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آیا ہے۔

ایک یہ پہلا ہی افسانہ کیا اس مجموعہ کے کسی بھی افسانہ کو لے لیجئے آپ کو اسعد کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہوا محسوس ہوگا، جسے فطرت احساس نے حروف کی شکل میں سامنے لا رکھا ہے۔ دماغی اُپج اور وسعت خیال کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فقروں کی بندشیں اس قدر کامیاب ہیں کہ جو فقرہ نکل گیا وہ اپنی مستقل

[1] مکتبہ افکار نو۔ یعقوب خاں روڈ، کراچی سے تین روپیہ [illegible] ہے۔

جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسعد کو اپنے احساسات کے اظہار پر اچھی قدرت حاصل ہے۔ اس کے ایک افسانے "لہروں کے نیچے" میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ "روشنی اور سائے" بھی عمدہ مثال ہے۔

اسعد کے افسانوں کے موضوع زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس قدر قریب تر ہیں اور مقصدیت اور افادیت کے لحاظ سے اتنے اچھے ہیں کہ تعمیری ادب ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ وہ لوگ جو ادب برائے ادب کہہ کر اپنی ذہنی تسکین کو الفاظ کے حسین و جمیل مجسموں سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ مجموعہ نقیب نور ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آؤ "تجربہ و شہود" اندھیروں میں بھٹکنے والو! ادب سے زندگی کی تعمیر کا کام لو اور ادب میں انقلاب لاؤ۔ جب لوگوں کے مقاصد ہی کچھ اور ہوں تو پھر ذرائع میں کیونکر یکسانی ہو سکتی ہے۔ اگر صحیح اور اعلیٰ مقصد کے لئے ادب تخلیق کیا جائے تو پھر ذریعہ کی حیثیت سے بھی ادب میں چمک دمک اور اثر انگیزی پیدا کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ ماسکو کو اپنا قبلہ بنا رہے ہیں اسعد ان کو بھی خاموش دعوت دیتا ہے کہ وہ آئیں اور گھُپ اندھیروں کے بجائے آفتاب حقیقت سے اکتساب نور کریں۔

جہاں تک اسعد گیلانی کے اس مجموعہ کی فنی خوبیوں کا تعلق ہے وہ اپنا ایک مقام رکھتی ہیں لیکن یہ بھی کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کہیں کہیں وہ "زاہد خشک" اور "ناصح" ضرورت سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ایسے مواقع پر ابھی انہیں فن۔۔۔ اونچائی پر لے جانے کے لئے اپنے انداز میں تھوڑی شگفتگی اور نکھار پیدا کرنے کی ضرورت ہے تب ہی افسانے کی یہ عروس جمیل، لباس حریر میں اپنی سحر آفرینیوں کو دوبالا کرے گی اور مقصد سے اتفاق کرنے والے نئے نئے متوالے ڈھونڈھ نکالے گی۔

اس ذرا سی کبھی کبھار کی کمزوری سے قطع نظر اسعد کو اپنے آرٹ میں کمال حاصل ہے اور وہ نئے افسانوی ادب میں اگر میر کارواں نہیں تو کم سے کم صف اول کے گنے چنے نقیبوں میں ضرور ایک اچھا مقام رکھتا ہے۔

(ص ۔ ع)

بقیہ مسائل زمانہ

تباہ ہو جائے۔ اور سلسلہ جنبانی شروع ہو گئی ہے لیکن یہ صورت غصہ میں چور ایرانی عوام کو شاید ناپسند ہے۔ ڈاکٹر مصدق کی سمجھوتہ کی بات چیت پر آمادگی نے ہی ان کے بارے میں غلط فہمی پھیلا دی۔ اور انہیں ایک بیان میں اپنے خلوص کا ڈھنڈورا پیٹ کر عوام کو مطمئن کرنا پڑا۔

عوام کا یہ جوش اپنی جگہ کتنا ہی شدید سہی لیکن جہاں امریکہ اور برطانیہ کی پالیسی قابل تنقید ہے۔ وہاں ایرانی عوام سے اتنا پوچھنا بھی غلط نہ ہوگا کہ کیا وہ صرف تیل کو تومیا کر استعماریت کے پنجوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔ صرف ہاتھ بدل جانے سے نجات نہیں ملتی۔ ایرانی قومیت اور برطانوی سامراج کی جنگ میں کل ایران کا عزم اور استقلال اسے کامیاب بنا سکتا ہے لیکن کچھ دن گذرنے نہ پائیں گے کہ یہی قوم پرستی عوام کے لئے وبال بن جائے گی۔ ایران کو اس معاملے میں ہندوستان کے موجودہ انقلاب سے سبق لینا چاہئے۔ قومی انقلاب عارضی نشہ ہے جو جلد اُتر جاتا ہے۔ اس کے لانے والے اپنی سیرت کی تعمیر سے قطعاً غافل ہوتے ہیں۔ ایران کو اقتصادی انقلاب کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے اخلاقی انقلاب کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے بغیر وہ معاشی ناانصافیاں کبھی نہ ہو سکیں گی جن سے تنگ آ کر ایران برطانوی سامراج کے خاتمہ کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے لئے قوم پرستی کو موجودہ مشکلات کا حل سمجھ رہا ہے۔

یہ مسائل زمانہ

شاہ عبداللہ

پچھلے دنوں شاہ عبداللہ کے قتل کی خبر بھی سن لی گئی۔ مشرق وسطیٰ میں اکابرین حکومت کی جانیں بڑی سستی ہوتی جا رہی ہیں۔

عرب ممالک اس وقت عجیب ہنگامی حالات سے دوچار ہیں۔ ہر صبح نئی حیرت سامانیاں لے کر طلوع اور ہر شام محشر اضطراب کے جلو میں نمودار ہوتی ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اِدھر سے اُدھر تک برطانوی سامراج کے خلاف عوام میں نفرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ عرب ممالک کے اکابرین حکومت بڑی مشکل میں مبتلا ہیں کس کس کو خوش رکھیں کس کس کی ناخوشی کی پروا نہ کریں۔ اب تک وہ اپنی افتاد مزاج، اپنے زاویۂ فکر اور طریق جہانداری سے مجبور ہو کر برطانوی سامراج سے دل خوش کن اُمیدیں لگاتے رہے ہیں۔ ذہنی مرعوبیت نے انھیں برطانوی اقتدار کے آگے جھکائے ہی رکھا۔ اور برطانوی حکومت نے بھی ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ عرب ممالک اپنی آزادی اور اپنی پالیسی کی انفرادیت برطانوی حکومت کی خواہشات پر قربان کر بیٹھے۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ سعودی عرب۔ مصر سب میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ نے کچھ ایسا جال بچھایا تھا کہ مشرق وسطیٰ کی اقتصادیات بالکلیہ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ انتہا یہ کہ کھلے طور پر خارجی سیاسیات کے ساتھ داخلی معاملات تک کو بعض جگہ برطانوی دباؤ متاثر کرنے لگا۔

یہ صورت حال شاید یونہی چلتی رہتی اگر دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی سیاسیات میں برطانیہ کے وقار کو دھکا نہ لگتا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک حالات سے عبرت نہ حاصل کرتے۔ عرب ممالک کے عوام آہستہ آہستہ بیدار ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں اپنے حکمرانوں کی برطانیہ کے سامنے کاسہ لیسی کی پالیسی بغاوت پر اُبھار رہی ہے۔ اور حکمرانوں کی ساحری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ عوام شدت سے اپنی قیادتوں کو بدل دینے کے خواہاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ ذہنی انقلاب کی طولانی راہ طے کئے بغیر خونی انقلاب سے چشم زدن میں کام کر جائیں۔ عوام کے اس جذبہ کے پیچھے بظاہر کوئی سوچی سمجھی ہوئی اور متوازن راہِ عمل نہیں معلوم ہوتی۔ یہ سب انتہاپسندی اور انتقامی جذبات کے نتیجہ میں کیا جا رہا ہے۔ شام میں خونی انقلاب کا کھیل پہلے کھیلا جا چکا ہے اور کئی قائدین اس کی نذر ہو چکے ہیں۔ ایرانی عوام ابھی کچھ عرصہ ہوا یہی نسخہ آزما چکے ہیں۔ موجودہ وزیر اعظم کو دھمکیاں دی جا چکی ہیں۔ اس سے پہلے مصر کے وزیر اعظم کی جان اخوان المسلمین کے ایک فرد کے ہاتھوں جا ہی چکی ہے۔ عراق میں بیزاری کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے وہاں اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ خون آشامی کا یہی حال رہا تو ایک دن مشرق وسطیٰ نراج کا شکار ہو جائے گا۔

اکابرین حکومت کو قتل کر ڈالنے کا یہ عوامی رجحان سخت قابلِ تنقید اور ناپسندیدہ ہے۔ قیادت لاکھ بری سہی لیکن شر کو شر ہی سے توڑنا ناممکن نہیں۔ اگر عوامی جماعتیں بحیثیت جماعت اس جدال و قتال میں حصہ لے رہی ہیں تو یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ انقلابی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اور اسلامی نقطۂ نظر سے بھی خصوصاً اس لئے کہ عرب حکومتیں اپنے اُوپر اسلام کا لیبل لگائے ہوئے بھی ہیں۔ انقلاب ایک خاص تدریج کے ساتھ آیا کرتا ہے۔ پہلے عوام کی ذہنی تعمیر اور فکری انقلاب کا مرحلہ آتا ہے۔ پھر ایک حد تک قابل اطمینان تیاری کے بعد قیادت میں تبدیلی لائی جاتی ہے۔ انقلاب کا یہ طریقہ فطری ہے اور اسی سے پائیدار تبدیلی ممکن بھی ہے۔ ایسے خونی انقلاب جن کے پیچھے صرف اندھے انتقامی جذبات ہوتے ہیں کبھی دیرپا نہیں ہوتے۔ نشہ چڑھتا ہے اور جلد اتر جاتا ہے۔ اور اگر اکابرین حکومت کا قتل جماعت کے افراد کی شخصی کارگزاری ہے تو یہ صورت بھی عرب ممالک کی عوامی جماعتوں کے حق میں کچھ اچھی نہیں۔ اس سے عوام کی بے راہ روی۔ بدنظمی اور بے سرے پن کا اظہار ہوتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ عرب ممالک کے عوام میں بیداری کے آثار نظر تو ضرور آتے ہیں لیکن ان کی اساس پائیدار نہیں۔ اپنے آپ کو سامراجیت کے پنجے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ انقلاب کی بنیادیں ایک مضبوط نظام فکر اور ٹھوس راہِ عمل پر ہوں۔ اور عوام کی اخلاقی تعمیر کے لئے اسلامی نظام اخلاق کو اس کی اصلی شکل میں اپنایا جائے۔ تاکہ آیندہ اٹھنے والا قدم غارت گری کی طرف نہیں بلکہ امن عالم کی جانب بڑھے۔ موجودہ عرب ممالک میں قوم پرستی کی شدید وبا پھیلی ہوئی ہے جو اسلامی نظام فکر کے سراسر منافی ہے ضرورت ہے کہ قوم پرستی کے ذریعہ اپنی مشکلات رفع کرنے کے بجائے ہمہ گیر اور عالمی نقطۂ نظر سے اسلامی نظام کی روشنی میں اپنے مسائل کو حل کیا جائے۔ تاکہ نہ صرف اپنی ہی مشکلات ختم ہوں بلکہ پوری دنیا کو ایک نئے نظام کی طرف دعوت دی جا سکے اور امن کا مژدہ سنایا جا سکے۔

کوریا میں کیا ہو رہا ہے

روسی نمایندے جیکب ملک کے پیغام صلح سے جب کوریا کی جنگ میں امن کی جھلک دکھائی تھی تو اس جھلک سے دنیا بڑی متحیر ہوئی تھی کہ یکایک بھیڑیوں کی فطرت کیونکر بدل گئی۔ مگر اب دن گذرنے پر صلح کی جھلک اپنی چمک دمک کھوتی جارہی ہے۔ کیسانگ کانفرنس ہو رہی ہے۔ دنیا بھر کی امن پسند نگاہیں امید لگائے تک رہی ہیں لیکن ہنوز کوئی نقطۂ اتحاد نظر نہیں آتا۔ امن کا ڈھونگ رچانے کو ہر فریق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر معتدل رہا ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ کوریا کے میدانوں میں اب بھی تباہ کاریاں برابر جاری ہیں۔ ٹرومین روس کے جنگی منصوبوں پر چیخ رہے ہیں وہ اپنے ساتھی ممالک میں فوجی طاقت بڑھا رہا ہے۔ اس کے یہ عزائم ہیں، یہ ارادے ہیں۔ اور خدا جانے کیا کیا۔ ادھر روس، امریکہ کی منصوبہ بندیوں پر گلا پھاڑ رہا ہے کہ مغربی جرمنی۔ آسٹریلیا، جاپان، فارموسا، سب جگہ اقتصادی اور فوجی امداد کے جال بچھا کر اپنا محاذ مضبوط کر رہا ہے۔ ایران میں بھی اب دخل اندازی کی ابتدا کر دی ہے۔ ہر ایک اپنی آنکھ کے شہتیر کو نظر انداز کر کے دوسرے کی آنکھ کا تنکا دکھا رہا ہے۔ کیا ان عملی اقدامات کے بعد امن کے زبانی دعوؤں کی کوئی حقیقت رہ جاتی ہے؟ جنوبی کوریا پر امریکہ نے کرم کیا تھا۔ وہ بری طرح پس چکا۔ شمالی کوریا پر روس کا دست شفقت ہے وہ بھی جنگ کے پاٹوں میں کچلا جا چکا۔ اس لطف و کرم کی داد کون دے سکتا ہے۔

سمجھے گا اس کا درد کون، شورشِ کائنات میں
تم نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

بتاؤ! جنگ یا امن

مسئلہ کشمیر ڈاکٹر گراہم کے آنے کے بعد بھی اسی طرح دونوں ملکوں کے لئے پیچیدہ بنا ہوا ہے جیسا کہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حکومتیں ادارہ اقوام متحدہ کی ان طفل تسلیوں سے بالکل تنگ آ چکی ہیں۔ پاکستان میں بیزاری کے اس رجحان نے ذہنوں کو جنگ کی طرف پھیر دیا ہے۔ ذمہ دار نمائندوں کے بیانات میں پچھلے دنوں یہ بیزاری نمایاں طور پر ابھر آئی تھی۔ جس کے ردِّ عمل کے طور پر بھارت کی جانب سے حفاظتی تدابیر کے سلسلے میں فوج حرکت میں آ گئی۔ سرحد پر بھارت کی فوج کی موجودگی نے پاکستانی حکومت کو اور بھڑکا دیا۔ وزیر اعظم پاکستان تو شدتِ غیظ میں یہاں تک کہہ بیٹھے کہ آج سے ہمارا قومی نشان ہمارا فولادی مکہ ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی عوام میں ان غلط فہمیوں اور جنگ کی افواہوں نے بڑی سراسیگی اور ہراس پھیلایا۔ فرقہ پرست عناصر کے لئے اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے الگ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو کا رویہ قابلِ تعریف ہے کہ انہوں نے سطحی جذباتیت اور راندے جذبۂ جنگ کا جواب ترکی بہ ترکی اور انتقامی لہجے میں دینے سے احتراز کیا اور سنجیدگی کی مثال قائم کی۔ پنڈت نہرو کی تقریر سے بہت کچھ جنگ کی ابھرتی ہوئی لہریں دب گئیں لیکن پھر بھی ابھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ جنگ بالکل ٹل گئی۔ گو کہا یہی جا رہا ہے۔ اس لئے کہ جنگ کی افواہوں کے محرکات ہنوز قایم و باقی ہیں بھارت کے فرقہ پرست عناصر بزدلی کا طعنہ دے کر عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔

دونوں ملکوں کے حالات تو ایسے ہیں کہ کوئی بھی جنگ کی پالیسی اختیار کر کے فائدے میں نہیں رہ سکتا۔ قوم پرستانہ اور فرقہ پرستانہ ذہنیتیں جنگ جنگ کا نعرہ لگانے سے پھر بھی نہیں چوکتیں۔ عوام تذبذب کے دوراہے پر ہیں۔

اب انہیں کون بتائے کہ جنگ چھڑے گی یا نہیں ؟

آخر کوئی اصول بھی ہے ؟

کانگریس کے موجودہ سرگروہوں سے اختلافات کی بنا پر جا پارٹی وجود میں آئی۔ اچاریہ کرپلانی اور قدوائی انتخابی ہنگامے میں اپنی سمجھ الگ بنانے کی فکر کرنے لگے۔ بنیادی طور پر انھیں کانگریس سے اختلافات نہیں۔ اختلاف ہے تو ٹنڈن جی کے نقطۂ نظر سے جس کا اظہار مسٹر قدوائی نے کانگریس سے استعفیٰ دیتے وقت کیا ہے۔ کانگریس سے استعفیٰ دینے کے ساتھ انہوں نے کابینہ سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اور یہ اصولی طور پر ٹھیک بھی تھا۔ جب کانگریس سے نظریاتی اختلاف تھا تو کابینہ میں رہ کر کیونکر کام کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ کابینہ کانگریس کی بنائی ہوئی ہے لیکن پنڈت نہرو نے بغیر کسی اصولی مفاہمت کے مسٹر قدوائی کو استعفیٰ واپس لینے پر راضی کر لیا۔ اور کابینہ میں رہتے ہوئے کانگریس سے علاحدگی اور اس کی مخالفت کی اجازت بھی دے دی۔ یہ رویہ کتنا ہی صلح کل کیوں نہ ہو لیکن اصولی طور پر اور عملی حیثیت سے سخت قابل گرفت تھا۔ اس پر ٹنڈن جی کا لب تنقید جنبش میں آگیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ٹنڈن جی کی تنقید تنگ نظری پر محمول ہے۔ یہ صحیح نہیں یہ بے اصولی کہاں تک نبھ سکتی ہے۔

"بے آئینی" نظام حکومت میں زبردست رخنہ ہے۔ اور جماعتی نظام کی جڑیں کھوکھلی کر دینے والا فتنہ۔ قدوائی اور اجیت پرشاد جین ہی کیا یہ تو ایک اصولی سی بات ہے۔ جس پر خود ٹنڈن جی کا عمل بھی ٹھیک اسی طرح پر کہا جا سکتا ہے جس طرح قدوائی اور اجیت پرشاد جین کا۔ ٹنڈن جی اب تک کانگریس کے کتنے ہی اصولوں کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتے رہے ہیں۔

مرہم پٹی کہاں کہاں کی جائے۔ یہاں تو نظام میں ہی بنیادی خلا محسوس ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس زاویۂ نظر اور طریقۂ فکر کا جائزہ لیا جائے اور ان قوم پرستانہ اصولوں کا تجزیہ کیا جائے جن پر ہمارے یہاں کا نظام چل رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس ہمہ دوش ثریا عمارت کی خشتِ اوّل ہی کج ہو۔

ہیری مین کی کوششیں

صدر امریکہ کے مشیر خاص مسٹر ہیری مین تہران میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور ایرانی تیل کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں ایران نے ان کی بات ہی سننے اور سمجھنے سے جوش میں انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب لب و لہجہ بدلتا سا جاتا ہے۔ برطانیہ کی تو بین الاقوامی پوزیشن ایسی خراب ہو گئی ہے کہ اس کی صدا میں اثر نہیں۔ لیکن ایران کے معاملے میں امریکہ بھی زیر دستوں سے زبردستی کر کے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ امریکہ اس معاملے میں اگر خاموش رہتا ہے تو اس کے مخالف بالا جیت لے جائیں گے اور برطانیہ کا ہر حال میں ساتھ دیتا ہے تو روس کی طرف ایران کے مائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایران کو منانا ہے تو وہ کوئی بات ماننے پر تیار معلوم نہیں ہوتا۔ خود اس کا اپنا مفاد اس میں ہے مشرق وسطیٰ میں کسی طرح اس کے پاؤں جم جائیں۔ اس لئے کہ آئندہ شکست و فتح میں مشرق وسطیٰ اہم حصہ لینے والا ہے۔ وہاں روسی اثرات پہلے سے ہیں اور برطانیہ نے بھی اپنے امپیریلزم کا ٹھاٹ باٹ جار رکھا ہے گو تیزی سے ختم ہوتا جا رہا ہے لیکن موجود نہیں تو امریکہ کا اثر۔ امریکہ برطانوی اقتدار کی خالی جگہ کو اپنے آپ سے بڑے معصومانہ انداز میں پُر کرنا چاہتا ہے۔

ایرانی قومیت اور شہنشاہیت کا یہ تصادم روس کے حق میں کیسا رہتا ہے؟ یہ سوال آج بہت اہم ہے جس کا [illegible] جواب آئندہ زمانہ سکے گا۔ ہیری مین نے لگ لپٹ کر، ڈرا دھمکا کر اور خوشامد درآمد ہر طریقے سے ایران کو اتنا مائل کیا ہے کہ [illegible] کی بات چیت پر [illegible]

RAFIQ SPECIAL NO 112

RAFIQ 112

گارنٹی ہی اطمینان کی کسوٹی ہے

رفیق ریزر فیکٹری ۱۱۲
کوٹلہ اسٹریٹ میرٹھ

رفیق ریزر فیکٹری ۱۱۲
کوٹلہ اسٹریٹ میرٹھ

نہایت جاں فشانی اور انتھک کوششوں سے ۱۹۴۰ء سے بہترین ہالو گراؤنڈ استرے کامیابی سے تیار کرکے ملک کی اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے، اس کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھکر مارکیٹ میں سستے اور گھٹیا ولائتی و جرمنی استرے ہندوستانی صنعت کو نقصان پہونچانے کے لئے سپلائی کئے گئے ہیں۔ جو تجربہ سے ناپسندیدہ اور نہایت ناکارہ ثابت ہو رہے ہیں بھولے اور سیدھے بار بر محض جرمنی یا ولائتی نام کی وجہ سے خرید کر اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ جنہیں ناقص ثابت ہونے یا ایک ہفتہ میں ٹوٹنے پر کوئی دوکاندار بھی واپس نہیں لیتا۔ آپ اپنے پیسے بغیر واپسی کی شرط کے ہرگز ضائع نہ کریں۔ ہوشیار اور آزمودہ باربر صرف

رفیق ۱۱۲ ساختہ استرے

خرید کر استعمال کرتے ہیں۔ جن کی ہر طرح قابلِ اطمینان پائیداری و تسلی بخش ہونے کی سو فیصدی گارنٹی دی جاتی ہے۔ اور کسی قسم کا نقص ہونے پر واپسی کی شرط ہے۔ آپ بھی

رفیق ۱۱۲ استرے ہی خریدیں

وہی مال خریدیں جو اس کسوٹی پر پورا اترے

چیف ایجنٹس برائے ہندوستان

لائٹ ٹریڈرز عیدگاہ میرٹھ شہر

جدید ڈاکٹری کتابیں

۱۔ شفاء الامراض۔ ڈاکٹری حصّہ اوّل و دوم، سوم۔

اس کتاب میں انگریزی حرف تہجی کے مطابق امراض کی قرابادینی مفردات و مرکبات اور پٹینٹ ادویات کا بیان کیا گیا ہے۔ تینوں حصّوں میں صرف ڈی تک کے امراض کی مجرّب دوائیں دی گئی ہیں اور آخر میں چند مجربات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت تینوں حصّے تین روپئے۔

۲۔ قرطاس مجرّبات۔ طبع دوم

اس کتاب میں اوزان و پیمانے، نسخہ نویسی اور عام امراض کی زود اثر دوائیں اور نسخے بیان کئے گئے ہیں۔ پاکٹ پری اسکرائیبر کے بہت سے نسخے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت فی جلد دو روپئے علاوہ محصول ڈاک۔

۳۔ آزمودہ دوائیں۔ حصّہ اوّل

اس کتاب میں مکمل اوزان اور پیمانے، برٹش فارماکوپیا کے چیدہ اور خاص مرکبات درج کئے گئے ہیں۔ انجکشن اور ٹکیوں کا طریقہ استعمال خاص طور پر بیان کیا گیا ہے کئی سو انگریزی جدید ترین ادویہ کا میٹریا میڈیکا اور طریقہ استعمال درج ہے۔ موجودہ وقت ایک اہم اغراض کی کتاب ہے بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۲۸ قیمت فی جلد تین روپئے

۴۔ جلدی امراض کا علاج

اس کتاب میں امراض جلد میں مجرب دواؤں کا میٹریا میڈیکا اور فارماکو پیا دیا گیا ہے اور چند منتخب مجربات بھی دیئے گئے ہیں۔
قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے

۵۔ خارشں ۔ یہ انگریزی کے ایک خاص مقالہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں خارش پر بحث۔ اسباب، علامات، انداز، اور طریقہ علاج اور مجرّب ادویات کا بیان کیا گیا ہے۔ قیمت فی کاپی آٹھ آنے۔

۶۔ افیون ۔ از ڈاکٹر آر۔ این۔ چوپڑہ۔
ڈاکٹر موصوف کی کتاب "ہندوستان کی دیسی دواؤں" سے ماخوذ ایک مقالۂ افیون کا اُردو ترجمہ ہے۔ قیمت فی کاپی آٹھ آنے

۷۔ رسالہ مغربی طب ماہوار میرٹھ

ایڈیٹر:۔ ڈاکٹر بشیر الدین مصری چندہ سالانہ چار روپئے فی کاپی چھ آنے یہ رسالہ ایلوپیتھک ڈاکٹروں کی اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عرصہ چار سال سے جاری ہے۔ ہر ماہ جدید ترین ادویات اور معالجات پر بحث کرتا ہے۔ اور ڈاکٹری کے محیر العقول کارنامے پیش کرتا ہے۔ اور طبیب کے لئے مغربی طب کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ **کامیاب انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن میرٹھ شہر**

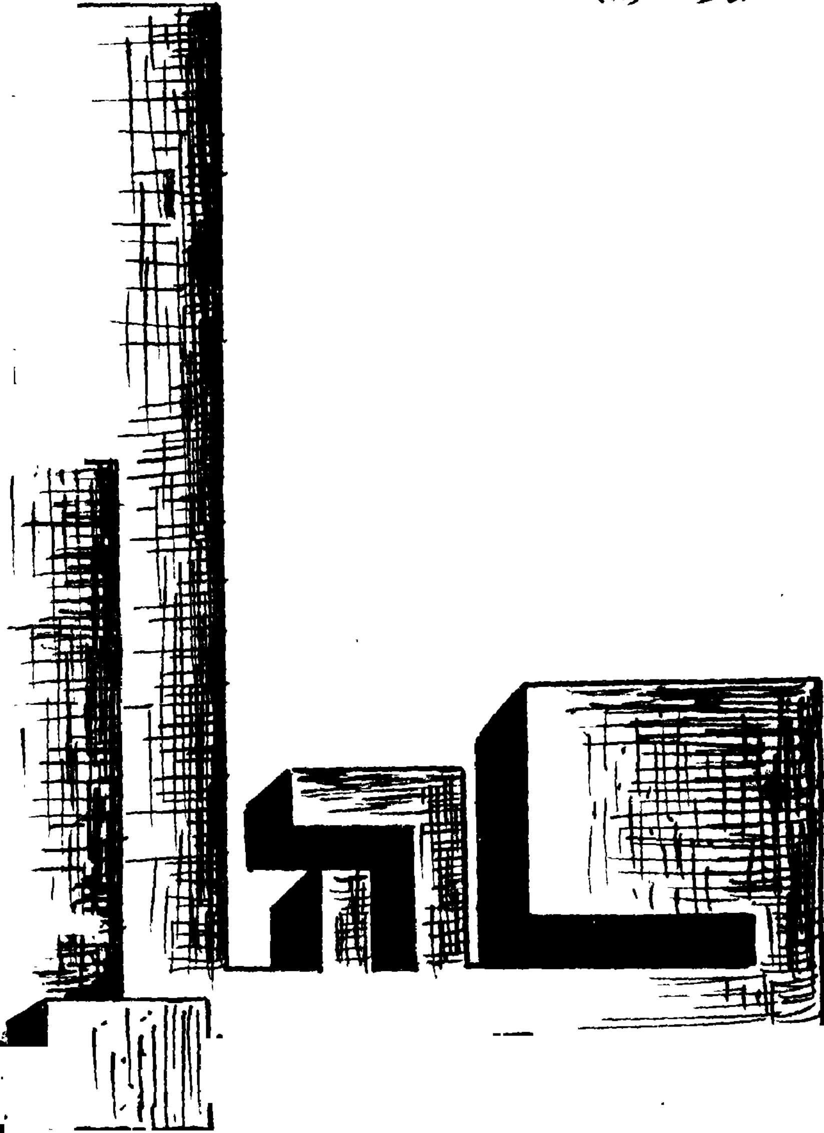
محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ سے شائع کیا۔


معیار
Maiyar

صحتمند اور تعمیری ادب کا علمبردار

جلد (۱)
شمارہ (۸)

ستمبر
سنہ ۱۹۵۱ء



ترتیب دینے والے
اصغر علی عابدی
نجم الاسلام

تعاون

سالانہ	پانچ روپیہ
فی پرچہ	آٹھ آنے

ھیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ
سب آفس :- محلہ کشن گنج دہلی

ترتیب

فکر و تحقیق

طنز و مزاح

رنگ و نور

ڈرامہ

جام و سندان

پسند اپنی اپنی

خیال اپنا اپنا

یہ مسائلِ زمانہ

ادارہ

نقشِ اوّل

۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب نے اُردو ادب اور شاعری پر ایک نمایاں اثر ڈالا ہے۔ اس سے پہلے نظم و نثر عام طور سے انفرادی احساسات کی مظہر ہوا کرتی تھیں اور اجتماعی شعور ان میں برائے نام ہی پایا جاتا تھا۔ مگر اب معاملہ اس کے قطعی برعکس ہے۔ جو کبھی "ادب برائے زندگی" کی آواز سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتے تھے۔ آج اس قسم کے نعرے خود ان کی زبانوں پر ہیں۔ بظاہر یہ صورتِ حال ہماری شاعری اور ادب کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ توقعات قائم کرنے سے پہلے اس ذخیرہ کی قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔

اس قسم کی شاعری اور ادب کا سب سے بڑا محرک تقسیم کے بعد پیش آنے والے واقعات کا ردِ عمل ہے۔ روزناموں، سہ روزہ، ہفت روزہ اخبارات، ماہناموں، سال ناموں کا کوئی شمارہ ایسا نہیں ملے گا جس کے صفحات اس قسم کے اشعار اور ادب پاروں سے خالی ہوں۔ تنہائی کی گنگناہٹوں سے لے کر آل انڈیا مشاعروں تک کسی نہ کسی نے میں یہ رونا ہر جگہ سُنا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد کی یہ تبدیلی بعض لحاظ سے جہاں کچھ خوشگوار پہلو رکھتی ہے وہاں بڑی حد تک اس کی تبدیلیوں میں ناخوشگواریاں بھی ہیں۔ خوشگوار تو اس لحاظ سے کہ اس سے پہلے کا وہ ادب جو چند گھِسے پِٹے خطوط پر چل رہا تھا۔ اس کے دائرہ میں کچھ وسعت آ گئی۔ اور خیالات میں اجتماعی رجحان نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ تصوراتی ادب تو آزادی اور اس کے اثرات سے یہاں تک بدلا کہ اس کی مخصوص اصطلاحیں جو پہلے رومانی پس منظر رکھتی تھیں اب ان میں واقعاتی اور سیاسی رنگ جھلکنے لگا۔ یہ تبدیلی ایک لحاظ سے بڑی امید افزا رہی اور تدریجی ترقی کے عین مطابق۔

او ادب میں یہ تبدیلی ناخوشگوار اس پہلو سے ہے کہ اس میں سیاسی نعرہ بازی اور ہنگامہ آرائی کے رجحان نے سطحیت کی راہ پیدا کر دی۔ قومی نظمیں، قومی گیت، اور اسی طرح کے افسانے، ڈرامے ایک طبقے کے مقاصد کے حصول میں مددگار تو ہوتے رہے اور ان سے پروپگنڈے کا کام لیا جاتا رہا لیکن وہ ہمہ گیری، گہرائی اور اثر انگیزی مفقود ہو گئی جس کی بدولت ادب ادب کہلاتا ہے۔ ہمارے ادب میں تبدیلی او تغیر کا یہ پہلو ادب کے لئے بڑا مضر اور خطرناک ہے۔ اس طرح کے ادب سے استقلال، آفاقیت اور دوام کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ادب میں یہ سطحیت کہاں سے آئی؟ آج یہ سوال ہمارے ادب کے مستقبل کے لئے بے حد ضروری بن کر سامنے آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سطحیت سیاسی نعرہ بازی کی پیداوار ہے۔ سیاسی نعرہ بازی ایک طرح کا اُبال ہوتا ہے۔ جو اُٹھتا ہے اور کچھ وقت گذرنے پر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس سیاسی جوش کے نتائج جس کے پیچھے کوئی فکر، کوئی احساس، کوئی واضح نصب العین اور بلند مقصد کا شعور نہیں ہوتا ——— سطحیت ہی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی صورت ہمارے ادب میں موجود ہے۔ موجودہ ادب میں قدیم روایتی ادب کے مقابلے میں ہلکی سی مقصدیت ضرور ہے لیکن واضح مفہوم اور مقصد کی ایسی روشنی ہنوز معدوم ہے جو ادب کا مستقبل تابناک بنا سکے۔ یہی موجودہ ادب کی سطحیت کا بنیادی سبب ہے۔

مستقبل میں ادب کی تعمیر کے لئے ہمیں ان تمام پہلوؤں اور خلاؤں کو سامنے رکھنا ہے جن کی بدولت موجودہ ادب بے اثر ہوتا جا رہا ہے۔

اِس شمارہ میں:— عالم عرفانی کے "اشتراکی نقاد" کی پہلی قسط ہماری توقعات سے زیادہ مقبول ہوئی۔ زیرِ نظر دوسری قسط میں مقالہ نگار نے انفرادیت، اجتماعیت، اذعانیت، واقعیت وغیرہ موضوعات سے متعلق اشتراکی تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے جامع اور مدلّل گفتگو کی ہے۔

"تعمیری ادب کیا ہے" میں طیب عثمانی نے ادب کا صحیح مقصد متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے حصول کے کچھ طریقے بھی بتائے ہیں۔ دعاوی کی مناسبت سے اگر دلائل کا بھی اہتمام کر لیا جاتا تو مقالہ اور زیادہ باوقار ہو جاتا۔

ظرافت کے لحاظ سے معیار اب تک تہی دامن چلا آ رہا تھا مگر اس مرتبہ یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ مجلہ ماہی معیار پر دو نظریں" ملا رموزی کا نیم مزاحیہ اور نیم سنجیدہ مطالعہ ہے گلابی اُردو کے لذت آشنا اس گنگا جمنی اسلوب میں ایک نیا لطف محسوس کریں گے، یہ مضمون ہلکی پھلکی ظرافت کے ساتھ اپنے اندر ایک وزنی افادیت بھی رکھتا ہے۔

متین طارق کا "ایجادات" بھی طنز و مزاح کا اچھا نمونہ ہے۔ اس طرف طارق نے اگر پوری توجہ کی تو ترقی کے بہت کچھ امکانات ہیں۔

"گفت و شنید" اپنا ایک مخصوص پس منظر رکھتی ہے جو رفتہ رفتہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس نظم کا "حرف شکایت" تنہا عروج قادری کے دوست ہی کی نہیں بلکہ ہمارے بھی بہت سے پرانے دوستوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو "لفظِ جواب" کو بھی ایسے سب ساتھیوں کے دل کی آواز کیوں نہ سمجھا جائے جنہیں مقصدِ حیات کا شعور ہو گیا ہے۔ اور جو اس شعور کے تقاضوں کے باعث احباب کی رنگین صحبتوں سے غیر حاضر رہ کر محبت آمیز ملامتوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں

"تعمیر پسندوں کے نام" سعید عقاب کا پیغام ہے۔ ایک زخمی احساس اور جراحتوں کا جذبہ لئے ہوئے۔

سہیل احمد زیدی نے "اعتراف" میں خود اپنی قوم کے کردار پر کھلی تنقید کی ہے۔ یہ نظم حق گوئی اور اخلاقی جرأت کی قابلِ قدر مثال ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی ادب اور قومی ادب کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کی حیثیت رکھتی ہے۔

عزیز احمد کی "سرگذشت" مئے کہنہ کو جامِ نو میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

احمد حسین انصاری نے "بجھے دیئے" میں بجھنے والے دیوں نے ایک روشنی کا پیغام دیا ہے۔ کاش پڑھنے والے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کہانی، مکالمے، مناظر، داد آپ بڑا نہ مانیں تو گیت بھی، سب چیزیں دلکش ہیں۔ یہ دلچسپ ڈرامہ اس شمارہ میں افسانوں کی کمی کو محسوس نہ ہونے دے گا۔

حصۂ غزل میں ندرت، تسکین، حفیظ، اور نسیم نے مختلف رنگ کے پھولوں سے گلدستہ سجایا ہے۔ آگے قارئین کی اپنی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ ندرت میرٹھی قدیم رنگِ تغزل کے مشہور فنکار ہیں اور موجودہ دور کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کی فنی حیثیت مسلّم ہے۔ تسکین بڑی میٹھی اور نرم و شائستہ زبان لیکر آئے ہیں جس میں پاکیزگیٔ خیال کا عنصر نمایاں ہے۔ اور یہی ان کی کامیاب غزل گوئی کا سبب ہے۔ مقصدی اشعار کہتے وقت تسکین نے داخلیت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے یہی اس غزل کی سب بڑی خصوصیت ہے۔ نسیم میانگری کی غزل میں "واقعیت" غالب عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہ رنگ پسند کرنے والے یقیناً نسیم کی اس کوشش کو سراہیں گے۔

تبصرہ کے لئے بہت سی کتابیں آئی ہوئی ہیں، اور کچھ رسائل بھی۔ بعض چیزیں تفصیلی اظہارِ خیال چاہتی ہیں۔ اس لئے آہستہ آہستہ پیش کی جائیں گی مرسلین انتظار فرمائیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ محض اندازوں اور قیافوں کے بل پر یہ اہم خدمت انجام دیں۔ پڑھے بے پڑھے تبصرے اڑا دینے کی روش آج کل عام ہو گئی ہے۔ مگر معیار کا دامن ان شاء اللہ اس سے آلودہ نہ ہونے پائے گا۔

نقشِ ثانی ——

بھارت کے عوام کیا کریں

دُنیا اس وقت بہت نازک اور ہیجانی دور سے گذر رہی ہے، کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کے عوام اپنی حالت سے مطمئن اور حکومت پر پُورا بھروسہ رکھتے ہوں۔ کون سا ملک ہے جو عوام کی بے چینی سے خالی ہو، ہند و پاکستان کے حالات پر نظر ڈال لیجئے، مشرق بعید کا حال دیکھئے، مشرقِ وسطیٰ کا جائزہ لے لیجئے، انقلاب کی لہریں دوڑ دوڑ کر امن و سکون کے خیالی محلوں سے ٹکرا رہی ہیں، ایران، شام اور مصر کے کتنے اکابرین حکومت اور عوامی رہنما ایک دوسرے کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اُتر چکے ہیں، پچھلے دنوں شاہ اردن کو قتل کیا جا چکا ہے۔ ایران الگ چیخ رہا ہے، اور خدا معلوم کیا کچھ اور ہوگا، خود بھارت کے عوام پر گہری نظر ڈالئے، کیا فی الواقع یہاں کے عوام موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ تو موجودہ حکمراں طبقہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ وہ آزادی کے پُورے فائدے حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے، عوام میں یہ جذبہ اور شدّت سے موجود ہے، کتنے ہی رجحانات عوام میں پرورش پا رہے ہیں لیکن عوام ابھی پُوری طرح اس مرحلہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں۔ کہ وہ ایک جہت ہو کر تبدیلی کی جدوجہد کریں۔ اس وقت وہ دو راہے پر ہیں۔ اور تباہی و امن، کامیابی اور ناکامی، مسرت و غم، اور اُمید و یاس کی طرف تذبذب کی حالت میں دیکھ رہے ہیں، ان کا اگلا قدم انھیں کامیاب بھی بنا سکتا ہے اور پہلے کی طرح ناکام بھی، اِس نازک مرحلے پر بھارت کے عوام پر سوچ سمجھکر قدم اٹھانے کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، یہ مستقبل کے فیصلے کا وقت ہے۔ اس وقت کسی پست ذہنیت اور کم نظری کا مظاہرہ اپنا مستقبل بگاڑنے کے مترادف ہوگا۔ بھارت کے عوام کو حالات سے سبق اور دُنیا کے عوام کے پچھلے تجربات اور موجودہ حالت سے پُورا پُورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ مزید کوئی ایسا غلط اقدام کرنا جس کے نتائج ہمارے سامنے آچکے ہوں سراسر نادانی ہوگی،

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام اس بے چینی کو دُور کیونکر کریں اور دُنیا کے حالات سے کیا سبق لیں کہ سکون کی فضا پیدا کرنے میں کامیابی ممکن نظر آسکے؟

اس سے پہلے ان صفحات میں بھارت کی ذہنی بیداری کا جائزہ لیا جا چکا ہے، اور ان عوامی اور اقتدار پسند گروہوں کا مجمل تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔ جو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے چکے ہیں۔ اور آیندہ اس کے بناؤ بگاڑ کے ذمہ دار بننے والے ہیں۔ ان سب گذارشات سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ بھارت کے عوام ہماری معروضات کے آئینے میں اپنا حقیقی مقام پہچانیں، صحیح رہنماؤں کا انتخاب کریں اور اس آزادی سے پُورا فائدہ اٹھا کر جو انہیں امتحان کے لئے سونپی گئی ہے سلامتی کی راہ اپنائیں۔

بھارت میں جہاں پُوری دُنیا کی ہیجانی کیفیت اپنا اثر دکھا رہی ہے، وہاں کچھ ہنگامی اور مقامی حالات بھی ایسے ہیں کہ عوام ان سے شدید طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، انتخابات کی دوڑ دھوپ نے اکثر افراد اور جماعتوں کو "دیوانہ وار رفتہ طبیعت" بنا دیا ہے، اور انتخابات کی دُھن میں ہر اُلٹے سیدھے پروپگنڈے اور عوام کو پرچانے کی سعی کا آغاز ہو چکا ہے۔ بھارت کے عوام تحیّر و تذبذب کے مقام پر ہیں، کس پر بھروسہ کریں کدھر جائیں، مسئلہ کشمیر کی الجھن بھی چل رہی ہے، لیکن یہ حالات دیرپا نہیں، حالات کا ایک ریلہ خس و خاشاک کی طرح جذبات کی تندی کو بہالے جائے گا۔ اور یہ صورت نہیں رہے گی، اس لئے اس ہنگامی صورت حال سے قطع نظر عوام کو ایسا حل سوچنا ہے جو

پائیدار ثابت ہو سکے، انجام کے لحاظ سے ہنگامی مسائل کا کچھ بھی فیصلہ ہو بہر طور ایک ایسے حل کی ضرورت باقی رہتی ہے جو بھارت کو بے چینی اور کشاکش سے نجات دلا سکے۔

بھارتی عوام کی موجودہ بے چینی کا بظاہر بڑا سبب حکمراں طبقہ کی کمزوری ہے، عوام ایسا ہی سوچتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ بے چینی کا سبب ان ہی کی سیرتوں کی کمزوری ہے، آزادی کے وہ سپاہی جنہوں نے عوام کی برسوں رہنمائی کی ہے، اب ان میں سخت پھوٹ پڑ چکی ہے، ہر ایک اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کر رہا ہے۔ عوام اس طبقہ کی اخلاقی حالت کو عمل کی کسوٹی پر پچھلے چار پانچ برس سے پرکھتے چلے آرہے ہیں۔ انھیں حیرت ہے کہ کل یہ آزادی کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دینے والے کس طرح بلا کے مفاد پرست اور انتہا کے خویش پرور بن گئے ہیں اور چند مستثنیات سے قطع نظر کیونکر انہوں نے اپنا بھلا کرنے کے لئے عوامی مفاد کا خون کیا ہے، یہ سب کچھ اخلاقی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ جب تک ایک اجنبی طاقت سے سیاسی لڑائی جاری رہی یہ کمزوریاں چھپی رہیں اور ان کی طرف عوام کی نگاہ کبھی نہیں گئی، لیکن اجنبی طاقت سے جدوجہد کرنے کا دباؤ جُوں ہی کاندھوں سے ہٹا، چھپی ہوئی کمزوریاں سامنے آگئیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعمیر کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا، جو کچھ کیا گیا محض اقتدار پسندی کے جذبہ کے تحت کیا گیا، اِس طرح سیاسی انقلاب تو بے شک آگیا اور اجنبی زنجیر گل کر رہ گئی لیکن اخلاقی انقلاب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پاؤں میں اپنی ہی بیڑیاں ڈال لی گئیں۔

اجنبی زنجیر گل کر رہ گئی ✣ اب ہیں اپنے پاؤں اپنی بیڑیاں (زاہد)

آج بھی جو چیز سب سے زیادہ باعثِ تشویش ہے وہ یہی ہے کہ اگر موجودہ حکمراں طبقہ کو اس کی جگہ سے ہٹا بھی دیا جاتا ہے تو وہ دوسرا کون ایسا گروہ ہے جو اخلاقی اوصاف سے پُوری طرح بہرہ ور ہے۔ اور اس سے وہ کمزوریاں سرزد ہونے کا امکان نہ ہو جو موجودہ طبقے سے ظہور میں آرہی ہیں۔ اگر وہ طبقہ کل حکمراں بن جائے جس نے کل تک کام تو کانگریس کے پہلو بہ پہلو کیا ہے لیکن کسی وجہ سے اب الگ ہو چکا ہے تو اس پر بھی یہی اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ کس اخلاقی قوت کے بھروسہ پر عوام کی باگیں ان کے ہاتھوں میں دے دی جائیں جبکہ ان کے اخلاق اور ان کی سیرتیں بھی بعینہٖ اسی فضا میں پلی اور بڑھی ہیں جس میں موجودہ حکمراں طبقہ کی سیرتیں اور اخلاق، اقتدار ہاتھ میں آنے پر کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ طبقہ بھی موجودہ حکمراں طبقہ کی طرح اپنا رویہ بنائے، اِس طرح اِس گروہ سے بھی بغیر کسی اخلاقی تبدیلی کے عوام کی بھلائی کی اُمید لگانی مناسب نہیں معلوم ہوتی، اِس گروہ کے بعد فرقہ پرست عناصر ہیں۔ ان سے کون وسیع النظر شخص عوام کی بھلائی کی اُمید لگا سکتا ہے، اس کے یہاں نہ تو کوئی واضح معاشی پروگرام ہے نہ سیاسی، جس میں انفرادیت اور جامعیت بھی ہو اور سب کو اپیل بھی کر سکے اور نہ کچھ اخلاقی نظام ہی کارفرما نظر آتا ہے جس پر کسی مستقل اور پائدار تعمیر کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اور اگر اشتراکی گروہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے اور معاشی انقلاب کی بنا پڑ جاتی ہے تو بھی کیا یہ طبقہ اتنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کر سکے گا کہ بدعنوانیاں نہ پھیلنے پائیں۔ جبکہ اس نظام میں اخلاق فاضلہ تو کیا، معمولی اخلاقی اوصاف کی بھی کوئی مستقل حیثیت نہیں، یہ گروہ برسرِ اقتدار آئے گا تو کیا بھارت میں روس کی طرح آمرانہ اور جابرانہ نظام مسلّط نہ ہو جائے گا؟ ان اندیشوں سے کوئی صحیح الفکر آدمی صرفِ نظر نہیں کر سکتا، قطع نظر اس سے کہ اشتراکیت کا معاشی نظام اور سیاسی ضابطہ کسوٹی پر کتنا کھرا کھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں اعلیٰ اخلاقی نظام کا فقدان سب سے بڑی قابلِ تنقید کمزوری ہے، اِسی طرح کی کمزوری دوسرے طبقوں میں بھی موجود ہے۔

اِن سب معروضات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اخلاقی تعمیر کی ہمارے یہاں کتنی بھاری کمی ہے یہی کمی بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس کمی کے سبب سے آج عملی طور پر آزادی محول بازی ہو کر رہ گئی ہے۔ عوام میں سے بعض طبقے تو آزادی کی تلخ کامی سے اتنا اُلٹا اثر لیتے ہیں کہ بعض اوقات اجنبی طاقت ہی انھیں اپنے حکمرانوں کے مقابلے میں اچھی معلوم ہونے لگتی ہے، خوشی کی بات ہے کہ عوام کو اب اِس بات کا احساس کچھ کچھ تو ہو چلا ہے کہ بے سیرت و کردار لوگوں کی قیادت سے ہی مصائب پھیلتے ہیں۔ اور فساد کی جڑ یہی ہے۔ اور یہ کہ اچھے اخلاق کے لوگوں کے اُوپر آئے بغیر انسان کی بھلائی ممکن نہیں۔ لیکن یہ نقوش ابھی ذرا دھندلے دھندلے ہیں۔ بھارت کے عوام میں سے اب ایک ایسا گروہ اُوپر آنا

چاہیئے جو اخلاقی نظام کی اہمیت سے پوری طرح باخبر ہو۔ اور اپنے اندر وہ اخلاقی اوصاف پیدا کرنے کی طرف آمادہ اور انہیں اُبھارنے کی کوشش کے لئے تیار ہو جو انسانی سیرت کی تعمیر کے لئے اساس کا کام دیتے ہیں۔

مغربی افکار کے تسلّط نے ہمارے ذہنوں کو کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے کہ ہم مادی قوت اور سیاسی طاقت ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ حالیہ تجربات نے اسے غلط ثابت کر دکھایا ہے اور پچھلی تاریخ بھی گواہ ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں، ہمارا اجتماعی نظام نہ تو مادی قوت کے بغیر طاقتور بن سکتا ہے اور نہ اخلاقی طاقت کے بغیر، دونوں ضروری ہیں۔ مگر فیصلہ کُن اور قابلِ اعتماد قوت اخلاقی قوت ہی ہوتی ہے۔

عوام کو موجودہ حکمراں طبقہ میں تبدیلی لانے سے پہلے اس گروہ کی نشان دہی اور اس کے افراد کی سیرتوں کی تعمیر ضروری ہے جو اخلاقی بنیادوں پر سماج کی تعمیرِ نو کا پیغام سُنا سکے، پھر عوامی اصلاح کے ساتھ ساتھ حکمراں طبقہ میں ایسی اخلاقی بھلائیوں کی بھی ضرورت ہے کہ وہ عوام کی اصلاح میں رخنہ کے بجائے معاون بن سکیں۔ ایسا گروہ اگر ہم تیار کر سکے تو بلاشبہ وہ سرمایۂ انسانیت کہلائے جانے کا پُوری طرح مستحق ہوگا۔ اور اسی سے سماج کی بھلائی کی توقع لگائی جا سکتی ہے۔ ایسے گروہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ عوام کا ایک اچھا خاصا عنصر ایک اعلیٰ اور ہمہ گیر نصب العین پر متفق ہو جائے۔ اور اپنے اس مقصد پر جان مال اور انفرادی مفاد قربان کر سکے، اور محبّت و اخوت کی ایک عام فضا پیدا ہو جائے، ساتھ ہی ساتھ عوام کا اخلاقی شعور اتنا بیدار ہو کہ وہ کسی غلط کار کو اپنی رہنمائی نہ سونپیں، اور اپنے رہنما اور رہزن میں تمیز کر سکیں۔ یہ تمیزِ صحیح و غلط اگر پیدا ہو جائے پھر ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسے گروہ اور ایسے سماج میں کوئی ایسی چیز مشکل ہی سے پنپ سکتی جو اجتماعی بھلائی کے خلاف پڑتی ہو، اور موجودہ اقتدار پسند طبقہ کی پیدا کردہ تمام خرابیوں کا سدِّ باب ہو سکتا ہے۔

یہ تمام باتیں سماج کی نئی تعمیر سے متعلق ہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ بھارت کے حالات اور مجموعی حیثیت سے دُنیا کے حالات سے اگر کچھ سبق لیا جا سکتا ہے تو وہ ہماری گذارشات سے کہاں تک مطابقت کرتا ہے۔

یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ بھارت کی آزادی کی جد وجہد قومی جذبات اُبھار کر کی گئی ہے۔ نیشنلزم کا ایک جوش تھا اور غیر ملکی طاقت سے بیزاری کا شدید احساس جو عملی قوتوں کے لئے آگ پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی ہمہ گیر اصول، عالمی نظام اور بین الانسانی نظریات نہ تھے اور نہ زندگی کا کوئی مستقل ضابطہ جو دُور تک ساتھ دے سکتا، چنانچہ یہ ہوا کہ اقتدار کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو جانے کے بعد وہ شیرازہ جو پہلے بندھا ہوا تھا منتشر ہونے لگا، رہنماؤں اور عوام میں ذہنی بیداری کی علامات تو پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن بنیادوں میں کوئی انقلاب نہ ہوا تھا، یہ صورت چلتی رہی اور مغربی اثرات سے ذہن برابر مرعوب ہی رہے۔ آج وہی غیر مکمل انقلاب اور ناقص تبدیلی، تنگ نظرانہ قوم پرستی، اور مغربی اثرات سے مرعوبیت طرح طرح سے عوامی مشکلات میں اضافہ کا باعث بن رہی ہیں، اور اخلاقی نظام پر کاری ضرب لگا رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پہلے مکمل ذہنی انقلاب آتا، مغربی اثرات سے مرعوبیت کا قلع قمع کیا جاتا اور اس کی جگہ انسانیت پسند اعلیٰ اصول ذہن میں اُتارے جاتے، لیکن اب حال یہ ہے کہ مغربی طاقت کے ہٹنے کے بعد بھی مغربی افکار، مغربی نظامِ سیاست، مغربی طرزِ تمدّن، اور مغربی طریقِ جہانداری موجود ہے، یہ سب کچھ بے ترتیب اور غیر مکمل انقلاب کی بدولت ہو رہا ہے۔

دُنیا کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جاہلی سیاست نے ذہنوں کو کچھ اِس طرح بگاڑ دیا ہے کہ جنگی انقلاب کی طرف عوام مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ذہنی انقلاب کی راہ میں صبر و تحمّل سے کام لینا پڑتا ہے اور تدریج سے مراحل طے ہوتے ہیں، لیکن فوجی قسم کے اِنقلاب مار دھاڑ، جبر و تشدّد، قتل و غارت سے آتے ہیں، ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا، اور یہ کچھ تعمیری اقدام نہیں کہا جا سکتا، لیکن کم سے کم مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے ممالک کی یہی روِش ہوتی جا رہی ہے کہ وہ حکمراں طبقہ میں جبر و تشدّد اور قتل و غارت سے انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ عوامی گروہوں کا مقصد کچھ بھی ہو یہ طریقِ کار مناسب نہیں اور نتیجہ کے لحاظ سے سُود مند نہیں، بھارت میں گاندھی جی کی جان اِسی طریق کی بدولت جا چکی، کسی تبدیلی کے لئے ایسا قدم نہ اُٹھنا چاہئے تھا، دُنیا کے جو ممالک یہ تشدّد پسندانہ رجحان رکھتے ہیں وہ تعمیری مقاصد میں کامیاب نہیں کہے جا سکتے، اور نہ عوام کو سکون دلانے میں ان کی کوششیں بار آور ہوئی ہیں۔

بھارت کے عوام کو ایک صالح ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے۔ موجودہ سماج کو اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ ہماری ان گذارشات میں فضا کے لحاظ سے اجنبیت تو ضرور ہے اور اس کا ہمیں احساس بھی ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ "موجودہ صحرائی صداؤں" میں سے ایک صدا بن کر رہ جائیں، خصوصاً جبکہ ہم سمجھتے ہیں سماجی انتشار، سیاسی بدحالی اور معاشی ناہمواری۔ سب خرابیوں کا سرچشمہ اخلاق کا فقدان ہے۔

عالم عرفانی بی۔ اے

اشتراکی نقاد

اشتراکیوں کا دوسرا حملہ سرمایہ داری سے کچلے ہوئے عوام پر ہوتا ہے۔ بھوک سے مارے ہوئے انسانوں کو جب یہ فریب دیا جائے کہ اشتراکی نظام میں تمام دنیا کی دولت تمہارے قدموں کے نیچے ہوگی تو ان کا فریب کھا جانا قطعی فطری بات ہے یہاں ایک ساہوکار، سرمایہ دار کی طرح ایک اشتراکی بھی، عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ورنہ وہ سوال کریں کہ جب ساری چیزیں حکومت کے ہاتھ میں ہوں گی، تو ہماری آزادی کی ضمانت کیا ہوگی۔

درحقیقت مخصوص حالات کو چھوڑ کر، دنیا میں دولت کی کبھی بھی قلت نہیں ہوئی لیکن یہ انسان کی بڑی بدقسمتی ہے کہ وسائل پر ہمیشہ ایک خاص طبقہ کا قبضہ رہا ہے۔ جاگیرداری سے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دولت آئی اور سرمایہ داروں سے اشتراکی چھین لینے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ ہمیشہ یونہی چلتا رہے گا تاوقتیکہ انسان اس عظیم انقلابی تصور کو نہ اپنائے کہ دولت صرف خدا کی ملکیت ہے۔ اور اس کو اس طرح گردش میں رہنا چاہئے کہ ہر شخص اپنی ضروریات کی تکمیل کرے۔

ویسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو۔ (قرآن) (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہاری ضروریات سے زیادہ ہو)

دراصل سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی بنیاد ہی ایسے فلسفہ پر رکھی گئی ہے کہ دنیا کبھی فتنہ و فساد سے خالی نہ ہوسکے۔ سرمایہ داریت ڈارون کے نظریہ تنازع للبقاء اور بقاء اصلح پر قائم ہے۔ اور اشتراکیت مارکس کے نظریہ طبقاتی کش مکش پر۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دونوں جبریت محض کے قائل ہیں.... یعنی لڑو، کٹو، مرو.... گویا اس کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعۂ ترقی موجود ہی نہیں۔ خصوصاً اشتراکیوں میں تعصب اور تنگ نظری اس طرح سما گئی ہے کہ وہ کسی تیسری راہ کے امکان ہی سے انکار کرتے ہیں۔

کیا واقعی انسان اس قدر مجبور ہے؟ کیا حقیقتاً انسان ایک ایسی ہی بے جان مشین ہے کہ معاشی چکر کے ساتھ گھومتا رہے اور بس؟ اور کیا دراصل "انفرادیت" اور "اجتماعیت" آگ اور پانی کی طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں؟ کیا ان میں کوئی توافق ممکن نہیں؟ آیئے دیکھیں یہ کہاں تک درست ہے۔

انفرادیت اور اجتماعیت

یقیناً غیر محدود انفرادی آزادی (جیسا کہ سرمایہ دارانہ خود غرضی کا نتیجہ ہے) انسانیت کے لئے ایک لعنت ہے۔ ہم جماعت اور اس کے ہمہ گیر اثرات سے انکار نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہم اتنے خود غرض ہیں کہ معاشرہ کی بھلائی اور برائی سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ وہ ادیب جو نہایت معصومیت سے کہتا ہے کہ ہم تو جو کچھ لکھتے ہیں اپنے لئے لکھتے ہیں۔ مذہب اور جماعت کو اس میں مداخلت کرنے کا کیا حق ہے۔ دراصل خود اک فریب میں مبتلا ہے اور دوسروں کو فریب میں رکھنا چاہتا ہے۔ ایک ادیب جو کچھ لکھتا ہے اس میں بہرحال ماحول کے اثرات شامل ہوتے ہیں۔ اور جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خواہ ادیب چاہے یا نہ چاہے۔ اس لئے یہ بات قطعی واضح ہے کہ معاشرہ سے ہمارا تعلق منقطع نہیں ہوسکتا۔ اس اقرار کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ افراد اپنی ذاتی خصوصیات رکھتے ہیں۔ اور جماعت کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انسانوں کے گروہ کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جاسکتا۔ دراصل جماعتی اثرات کی حقیقت تسلیم کرنے سے انفرادیت کی نفی نہیں ہوتی۔ انسان کی طبیعت کو متعین کرنے والے عوامل تین ہیں۔ وراثت، ماحول۔ اور انسانی ارادہ۔ ورنہ ایک ہی ماحول میں قاعدہ کے مطابق تمام انسانوں سے بالکل یکساں اعمال صادر ہونے چاہئیں۔ اور ایسا ہونا بالکل مہمل ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان نے جب کبھی بھی خدائی نظام سے بغاوت کی ہے، وہ توازن و اعتدال کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا ہے۔ ایک اشتراکی سے پوچھیے تو وہ انفرادیت کی ایسی گھناؤنی تصویر کھینچے گا کہ آپ واقعی اس سے نفرت کرنے لگیں اور اگر آپ ایک سرمایہ دار سے سوال کریں تو وہ اجتماعیت کو ایسی بھیانک شکل میں پیش کرے گا کہ آپ خوف زدہ ہو جائیں۔ اسی طرح ایک مادیت پرست روحانیت سے اس طرح انکار کر جائے گا جس طرح ایک CYNIC روشنی کے وجود سے انکار کر دیتا ہے اور ایک روحانیتِ محض کا قائل اپنی حیات کی بنیاد ہی نفیِ حیات پر رکھتا ہے۔ یہ انتہا پسندانہ صورتیں قطعی مضحکہ انگیز ہیں۔

ایک گمراہ کن بنائے استدلال

استدلال کا یہ طریقہ انتہائی شرمناک ہے کہ کسی مسئلہ کے مادی یا معاشی پہلو کا اثبات کیا جائے اور نتیجہ یہ نکالا جائے کہ اس میں اخلاقی یا روحانی جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ حالانکہ اصولی حیثیت سے ایسا نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے اخلاق و روحانیت کی نفی کا ثبوت پیش کرنا چاہئے جسے قطعی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی حالت اجتماعیت اور انفرادیت وغیرہ دیگر مسائل کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اسباب و علل کے لامتناہی سلسلہ پر قائم ہے اگر کوئی شخص کسی ایک جزوی سبب کو لے کر اسے کلی حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا تو یقیناً اسے بڑی فریب کاری سے کام لینا ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ PARADOX یہ ہے کہ جو لوگ انفرادی آزادی کے اتنے سخت مخالف ہیں۔ وہی مذہب پر محض اس لئے اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں کہیں پردہ کی پابندی ہے کہیں عیاشیوں پر قدغن ہے۔ اور کہیں شراب و کباب کی مخالفت ہے۔

"اگر ہماری پرانی شاعری میں ترغیبِ گناہ کا چسکا نہ ہوتا، تو شاید ہمارے لئے یہ بالکل ہی بے معنی ہو جاتی۔"

(ممتاز حسین: نئی اور پرانی شاعری کا بنیادی فرق)

گویا معاشیات سے معاشرت تک آتے آتے ساری اجتماعیت خالص "INDIVIDUALISTIC HEDONISM" (اپی کیورس نظریۂ ذاتی لذتیت) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ گناہ محض اس لئے گناہ ہے کہ وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ دراصل یہی مذہبی پابندیاں ہیں جو نوعِ انسانی کے لئے آزادی، خوش حالی، ترقی بلکہ اس کی بقاء کے لئے ضمانت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ورنہ اگر لذت پرستی کی یہ لے اسی طرح بڑھتی رہی تو آنے والی نسلیں لندن، پیرس، ماسکو، اور نیویارک کے کھنڈرات کی تلاش میں اسی طرح سرگرداں نظر آئیں گی جس طرح آج ہم بابل اور نینوا کے کھنڈرات تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

ذہنیت

انہیں پابندیوں کے ضمن میں ہم کو اذعانیت (DOGMATISM) کا طعنہ بھی دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ دنیا کی کونسی ایسی اصولی تحریک ہے جو اپنے DOGMAS نہیں رکھتی۔ کیا اشتراکیت ان DOGMAS سے خالی ہے۔ دراصل قابلِ نفرت صرف "DOGMATIC ATTITUDE" ہوتا ہے اور اس کے بدترین شکار یہی اشتراکی ہیں۔ مارکس نے کہہ دیا تھا کہ جو کچھ ہے مادہ ہے، روحانیت کوئی چیز نہیں۔ اب ہر اشتراکی یہی بات دہراتا ہوا نظر آتا ہے اور اگر آپ نہ تسلیم کریں تو وہ جان لینے پر آمادہ ہو جائے۔ مارکس نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ دنیا میں ساری تبدیلیوں کی بنیادی وجہ معاشی ہوتی ہے۔ اب کوئی اشتراکی کسی دوسری بات کے سننے تک کا روادار نہیں ہوتا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ ہر دور میں صاحبِ اقتدار طبقہ اپنی مرضی کے مطابق اخلاقی نظام کی تشکیل کر لیتا ہے۔ اب ہر اشتراکی اخلاق و مذہب کے خلاف ایک محاذ بنانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ غرض ہم نہیں جانتے کہ مارکس کے بنیادی نظریات میں کسی اشتراکی نے آج تک کوئی تبدیلی گوارا کی ہو۔ ایسے ——— FANATICS (مذہبی جنون رکھنے والے) ہمیں اذعانیت کا طعنہ دیتے ہیں۔

کمزوریاں

اگر مارکس کوئی خدائے علیم و خبیر وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے، تب تو خیر ——— ورنہ ہم اس کی مندرجہ ذیل چار کمزوریوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

(۱) مارکس اپنے ذاتی تعصبات کا حامل رہا ہے، جن کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

(۲) اس کے مخصوص ماحول نے اسے انتہا پسندی کی طرف مائل کر دیا تھا۔

(۳) اُس کا علم تمام عالم اور اس کے تضاد و تنوع کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا۔
(۴) کسی ایک شخص کا ذہن ابتدائے آفرینش سے انجام آفرینش تک کے تمام حوادث و انقلابات اور ان کے اسباب و علل پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

جب حقیقت یہ ہے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اُس کی باتوں کو وحی الٰہی کی طرح صحیح تسلیم کر کے ہر جگہ اور ہر موقعہ پر دہراتے رہیں محض تو ہمات انتہا پسندانہ جذبات پر نظام حیات کی تشکیل نہیں ہوا کرتی۔ یہ بات قطعی دعوی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ مارکس کے ایک ایک نظریہ کو اس طرح باطل کر دیتی ہے جیسے سیلاب کے طوفانی تھپیڑے مٹی کی دیواروں کو گراتے چلے جائیں۔ یہاں سر تا دھاندلی کے علاوہ مبلغین مارکسیت کیلئے اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ مارکس کے نقطۂ نظر سے تاریخی تغیرات کا دارومدار طریقہ پیداوار کی تبدیلیوں پر ہے۔ لیکن اسلام کے ہمہ گیر انقلاب سے پہلے یا بعد اس قسم کی کسی تبدیلی کا نشان نہیں ملتا۔ اگر بعد ہی میں کوئی تغیر ہوتا تو شاید پھر بھی اشتراکیوں کے لئے کوئی گنجائش باقی رہتی۔ اور وہ فوراً سبب کو نتیجہ اور نتیجہ کو سبب بنا کر پیش کر دیتے۔ جیسی کہ ان کی عام عادت ہے۔ لیکن یہاں یہ اُمید بھی نہیں رہتی۔ بات یہ ہے کہ سیاست، معیشت اور معاشرت میں تعلق صرف عمل اور ردِ عمل کا ہوتا ہے؟ نہ یہ کہ ہم ایک چیز کو مستقل سبب اور دوسری کو مستقل نتیجہ فرض کر لیں۔

مارکس کے نظریہ کے مطابق اخلاق و مذہب صاحبِ اقتدار طبقے کے لئے ناجائز معاشی استحصال کے ذرائع سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لیکن کیا حقیقتاً اسلام کے ابتدائی دور میں اس قسم کی کوئی ایک بھی مثال دی جا سکتی ہے۔ اِس دور میں صاحبِ اقتدار طبقے کی فقیرانہ زندگی ایک ایسا حیرت انگیز جس کی مثال آج تک کہیں اور نہیں ملتی۔ اِسی طرح مارکس کے دوسرے تمام نظریات یہاں نہایت کس پرسی کے عالم میں دم توڑنے لگتے ہیں۔

مارکس کبھی اِس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ اولادِ آدم صرف حیوان نہیں بلکہ انسان بھی ہے۔ اس لئے اُس کی بنیادی ضروریات میں معاش اور ... کے علاوہ اخلاق بھی شامل ہیں۔ انسان کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ محض کھوکھلی نظریہ بازی کے ذریعہ اپنی ترقی پسندی ثابت کرنا چاہتا ہے اور اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ترقی پسندانہ اور رجعت پسندانہ اعمال اور نظریات کی جانچ کے لئے بھی ایک معیار کی ضرورت ہے۔ اور یہ معیار ایک مکمل خدائی ضابطہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد اشتراکی تنقید میں حقیقت نگاری بڑا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر بھی نگاہ ڈال لی جائے۔

حقیقت نگاری کی حقیقت

اشتراکی تنقید کا ایک اہم پہلو وہ دلائل ہیں جو عریانیت کے جواز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک گروہ اس عریانیت کو حقیقت نگاری، سماج کی تصویر کشی، یا ادبی زبان میں "محاکات" نام دیتا ہے۔ دوسرا گروہ جو ادیب زیادہ اپنے کو فلسفی کی حیثیت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ انسان سے جس چیز کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس کی طرف اور زیادہ لپکتا ہے۔ اِس لئے ہمیں ہر بات صاف صاف بیان کرنی چاہئے۔ ایک تیسرا گروہ ہے جو معاشرہ کو جنسی معلومات بہم پہنچانے کی خدمت انجام دینا چاہتا ہے تاکہ لوگ خرابیوں سے محفوظ رہیں۔

جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے۔ اس کے لئے ہم اپنے اشتراکی ادیبوں سے صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی "حقیقت نگاری" میں ابھی کمی ابھی باقی ہے۔ سینے۔ اور کمر۔ پنڈلی اور رانوں تک تو آپ آ ہی چکے ہیں۔ اب تھوڑی سی ہمت کر کے ایک قدم اور بڑھائیے۔ اِس سلسلے میں ایک ... اور ... کہ آپ نام بھی سب ہندوستانی اور عوامی استعمال کیا کیجئے، ...... وہی بازاری الفاظ جو ہمارے ملک کے "عوام" استعمال کیا کرتے ہیں۔ تاکہ حقیقت نگاری کا حق ادا ہو سکے۔ یہ عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کر کے آپ "بورژوائی" ادب کی تخلیق کیوں کرتے ہیں؟ یہ بالکل بورژوائی ذہنیت ہے اور ... بزدلی کی نشانی۔ یہ کمبخت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گھر کی پلی ہوئی "شرم و حیا" اب بھی آپ کی "ترقی" کی راہ میں روڑا بنی ہوئی ہے۔

دوسری دو دلیلیں بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں۔ اِن دلائل کا تعلق اِس عالم رنگ و بو سے تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ دلیل سازوں کی خیالی دنیا اتنی ہی معصوم ہو۔ کم سے کم ہم سے یہ اُمید رکھنا بیکار ہے کہ اِس فراری ادب اور اس کے بھیانک اثرات سے پیدا شدہ نتائج کو محض صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ بن کر گوارا کر لیں۔ اگر ادب میں افادیت کی ضرورت ہے تو پھر وحشیانہ لذتیت کو ختم ہونا پڑے گا۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔

دوسری دلیل ایک مرتبہ میراجی نے ایک انگریز مفکر کے حوالے سے پیش کی تھی۔

اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ایک شاعرانہ حقیقت کو خواہ مخواہ فلسفیانہ حقیقت فرض کر لیا گیا ہے۔ ایک شاعر حقیقت کے صرف اس پہلو کو پیش کرتا ہے جو کسی خاص موقع پر اسے بہت زیادہ متاثر کرتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک فلسفی جذبات سے نہیں بلکہ بحدِ امکان خالص عقل سے کام لے کر حقیقت کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یقیناً ہم بہت سی چیزوں میں محض اس لئے کشش محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے نئی ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم اکثر چیزوں سے محض اس لئے دور بھاگتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے "نئی" ہیں۔ اور کوئی معقول وجہ ہم اس کے لئے نہیں پیش کر سکتے۔ مثال کے طور پر مغربی تہذیب ہی کے مختلف پہلوؤں کو لیجئے، بہت سے لوگوں نے پردے کی مخالفت کی حالانکہ بے پردگی صرف حیوانوں کی سوسائٹی ہی میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ انسانی سماج میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ دوسرے لوگ تھے جنھوں نے علمی انکشافات کے خلاف نفرت پھیلانا اپنا شعار بنا لیا۔ حالانکہ تخلیقی جذبہ زندہ انسانوں کی فطرت کا جزو ہوتا ہے۔ آج کل حقیقتِ شعری کو ایک فلسفیانہ نظریئے کی حیثیت میں پیش کرنے کا لوگوں میں عام مرض سا ہو گیا ہے۔ آپ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فرائڈ اور مارکس کا سارا فلسفہ یہی "شاعری" ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

میرا جی نے عریانیت کے جواز میں اپنی دلیل پیش کرتے وقت اس حقیقت کو قطعی نظرانداز کر دیا کہ وہ تمام باتیں جن کی بنیاد بہیمانہ لذت پرستی یا ذاتی منفعت پر قائم ہے ذرا سی اشتعال انگیزی پر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں اور ان کا انجام ایک مکمل تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں کبھی بھی نہیں آسکی کہ بچوں کو چوری کے گر سکھایئے تاکہ وہ چوری نہ کریں۔ اُن سے رہزنی اور درندگی کی حکایات مزے لے لے کر بیان کیجئے تاکہ وہ حیوانیت کا مظاہرہ نہ کریں۔

اس سلسلے میں اگر تحلیلِ نفسی سے کام لیا جائے تو ان تمام نظریہ بازوں کے اعصاب پر عورت سوار نظر آئے گی۔ ایک بہیمانہ نفسانیت کے علاوہ ان دلائل کے پس منظر میں اور کسی شے کا وجود نہیں۔ لیکن اب یہ صورت باقی نہ رہنا چاہئے۔ عورت کو بیسوا کے روپ میں پیش کر کے کب تک نسائیت کی توہین کی جائے گی۔ اس جاہلی ادب کو مٹ جانا چاہئے! ہم اسے مٹا کر ہی رہیں گے۔

ادب کا مقصد

اشتراکی تنقید میں ایک دوسرا اہم مسئلہ مقصدِ ادب کی تعین کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی کتاب "ادب اور انقلاب" کا تذکرہ کافی ہوگا کیونکہ اشتراکیوں کی تحریروں میں عموماً ایسی یکسانیت ہوتی ہے کہ کسی ایک کتاب کا جائزہ دراصل اس قسم کی تمام کتابوں کے جائزہ کے برابر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین نے اپنی اس کتاب میں اُن باتوں پر نظر ڈالی ہے جنھیں وقتاً فوقتاً ادب کا مقصد قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کیا "تلاشِ حقیقت" کو ادب کا مقصد بنایا جا سکتا ہے؟ اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حقیقت کو آج تک کون پا سکا ہے کہ اُسے ادب کا مقصد ٹھہرایا جائے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ایسی طفلانہ دلیل دیتے ہوئے جھجک نہیں محسوس ہوئی۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ عینِ حقیقت کو پا جانا انسان کے لئے ممکن نہیں، اور اسی لئے ہم خدائی ضوابط کے محتاج ہیں لیکن کیا کوئی شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ علمی دنیا کی ساری ہما ہمی کا دارومدار اسی جذبۂ "تلاشِ حقیقت" پر ہے۔ پھر آگے چل کر اُن کا یہ کہنا بھی عجیب ہے کہ انسان کا بنیادی مسئلہ صرف معاش کا مسئلہ ہے اس لئے اسی کو مقصدِ ادب بھی ہونا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ جب حقیقت کا سراغ لگایا ہی نہیں جا سکتا تو پھر یہ حقیقت کیسے کھلی کہ انسان کا بنیادی مسئلہ صرف معاش کا مسئلہ ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "تخلیقِ حسن" کو ادب کا مقصد قرار دینے پر اعتراض کیا ہے۔ یہاں پھر اُن کا طرزِ استدلال طفلانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "حسن" کی آج تک کوئی جامع مانع تعریف نہیں ہو سکی، اس لئے اسے مقصدِ ادب کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ کیا دُنیا میں کسی چیز کی بھی مکمل تعریف کی جا چکی ہے؟

۲۔ کیا انسان کی اس محدود عقل کے ساتھ کسی چیز کی آخری تعریف ممکن بھی ہے۔؟

۳۔ کیا ہم کسی چیز کو محض اس لئے نظرانداز کر سکتے ہیں کہ اس کی آخری تعریف نہیں ہو سکی؟

اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں دُنیا کے تمام مسائل سے نظریں ہٹا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جانا پڑے گا کیونکہ روحانیت، مادیت، معیشت، سیاست، وغیرہ حتیٰ کہ زندگی و موت کی بھی کوئی آخری تعریف آج تک نہیں ہو سکی ہے۔

دراصل "تعریف" کا مسئلہ بجائے خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور اس میں "کنارہ" یا "MARGIN" کا تصور بہت ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ کسی چیز کی تعریف کرتے ہوئے پریشانی کا سامنا عموماً صرف "MARGIN" پر ہوتا ہے۔ ورنہ عملی ضروریات کے لئے ہم ہر چیز کا ایک تصور اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ مثلاً

ایک شاہراہ کو دیکھئے۔ ہمیں راستے کی حقیقت معلوم ہے۔ لیکن جب ہم شاہراہ کے دونوں کناروں پر نظر ڈالتے ہیں تو اُس وقت یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ کس نقطہ تک ہم شاہراہ کی وسعت کو تسلیم کریں اور کس نقطے سے اس کے وجود کا انکار کر دیں۔

اصل مشکل یہ ہے کہ اشتراکیوں کا نظریۂ زندگی انتہائی تنگ اور محدود ہے اور اسی لئے انہیں اس قسم کے مہمل دلائل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم بھی "ادب برائے زندگی" کے قائل ہیں۔ لیکن ہم زندگی کے کسی خاص پہلو کو "کل زندگی" کہنے کے لئے تیار نہیں۔ زندگی کے ہزار پہلو ہیں اور ہر پہلو کو خواہ وہ رُوحانی ہو یا مادّی، معاشرتی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا اخلاقی، ایک مناسب جگہ دینا ضروری ہے۔ تلاشِ حقیقت زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح تخلیقِ حسن کا جذبہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کیونکہ ہم ہر چیز میں نظم و ترتیب، توازن و ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ نراج کے لئے ایک صالح معاشرہ میں کوئی گنجائش نہیں، عام اس سے کہ وہ "نراج" داخلی ہو یا خارجی، ادبی ہو یا غیر ادبی، جنسی ہو یا اخلاقی، ؎

غلط بیانی کی مہم

اشتراکی نقاد جس طرح عوام کو ذہنی مغالطوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی ایک مثال اور پیش کرنا ضروری ہے۔ اشتراکی حضرات نے یہ ایک مہم سی جاری کر رکھی ہے کہ اُن تمام پیغمبرانِ انسانیت کی تحقیر کی جائے جو سینکڑوں سال گذر جانے کے بعد بھی عوام کے دلوں پر اپنی حکومت قایم کئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جن برگزیدہ ہستیوں کا ایک ایک لفظ نوعِ انسانی کے لئے اخوت و محبت اور انسانی ہمدردی کا پیغام ہے۔ اُن کی عظمت کو کم کرنے کے لئے بھی "بڑی فن کاری" کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ کسی نہایت اعلیٰ نظریہ کا ربط کسی قطعی بیہودہ بات سے قایم کر دیتے ہیں اور درمیان کی بہت سی کڑیاں یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ "نئی اور پرانی شاعری کے بنیادی فرق" میں ممتاز حسین نے حدیث شریف "من عرف نفسہ عرف ربہ" کی تشریح اِن الفاظ میں کی ہے۔

"جب وہ رُوح آزما انسان فطرت کی پُر اسرار گتھیوں کو سلجھانے میں ناکام ہو جاتا ہے تو اپنے نفس کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔"

اس کے بعد یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نظریہ نے لوگوں سے عملی طاقت سلب کر لی اور ظلم کے خلاف جد و جہد کرنے کی ان میں سکت باقی نہیں رہی اور پھر غالبؔ کا یہ شعر لکھ دیا گیا ہے: ؎

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسماں ✤ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

گویا اس قسم کے بے عملی سکھانے والے اشعار اسی حدیث کا نتیجہ ہیں۔

ایسی اُتھلی باتوں کا جواب تو خاموشی ہی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں جبکہ ہر طرف جھوٹ اور فریب کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ خاموشی اختیار کر لینا بھی کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہم پُوچھتے ہیں کہ کیا وہ انسانِ اعظمؐ اولادِ آدم کی معاشری زندگی کو سنوارنے میں ناکام رہا؟ کیا وہ ہادیٔ برحق جس کے نقش نقش میں قوت و شوکت کا پیام تھا۔ انسانوں کو بے عملی کا سبق دیتا رہا؟ اور کیا یہ دیانت داری ہے کہ دورِ رسالت اور دورِ خلافت کے مکمل ترین انسانی سماج کا رشتہ غالبؔ کے جاگیردارانہ نظامِ حیات کے ساتھ قایم کیا جائے۔

تاریخ انسانیت کا حرف حرف شاہد ہے کہ اسلام سے زیادہ عظیم الشان تعمیری انقلاب دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوا۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ "انقلاب کے ساتھ تعمیری" کا لفظ سُن کر چونک اٹھیں گے۔ لیکن یہی چیز اس انقلاب کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہم انقلاب فرانس اور انقلاب روس سے ناواقف نہیں! اس قدر قتل و غارت گری، تباہی و بربادی کے بعد بھی نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ایک زار کے بجائے دوسرا اسٹالن انسانوں پر خدائی کرنے لگا۔ اب اُس انقلاب کو بھی دیکھئے جس میں نہ بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، نہ کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کیا گیا۔ نہ کسی کے مال و دولت پر بے جا تصرف کیا گیا۔

؎ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تلاشِ حقیقت، جمالیت اور افادیت کو متضاد چیزیں خیال کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں "حسن" کا "نظریۂ افادیت" تسلیم نہیں، لیکن ادب میں مندرجۂ بالا باتوں کو جمع کر دینا ہی کمالِ فن کی دلیل ہے۔ اقبالؔ اور دوسرے بڑے ادباء کا کلام اس دعوی کی واضح دلیل ہے۔

اور پھر بھی جو لوگ ہزاروں سال سے غلام اور آقا، عربی اور حبشی، قریشی اور انصاری کے امتیازات پر ذلت و عزت کی عمارت قایم کئے ہوئے تھے۔ یکا یک "ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم" (خدا کے نزدیک تم میں سے وہی سب سے زیادہ عزت رکھتا ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو) کے پیغام کے آگے جھک گئے۔ جن لوگوں کے نزدیک عورت کی حیثیت ایک ذلیل مخلوق اور ایک عریاں رقص کرنے والے کھلونے سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں "ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" کی زندہ تصویر بن گئے ؛ اور جو لوگ بیٹی پیدا ہوتے ہی اسے زندہ دفن کرنے کی فکر میں رہتے تھے "وباتی ذنب قتلت" کی آواز سے کانپنے لگے۔

وہ ذاتِ پاکؐ جس نے انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کو اک نئی راہ پر لگا دیا۔ افسوس کہ یہ کور چشم اسے "فراریت" کا طعنہ دیتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کر دیا "لا رھبانیۃ فی الاسلام" (اسلام میں ترک دنیا کی تعلیم نہیں ہے) "الاسلام حرکۃ" (اسلام حرکت کا نام ہے) اُن پر یہ تنگ نظر بے عملی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ اُن کی عملی قوتوں کو دیکھنا ہو تو قیصر و کسریٰ کے قصرہائے استبداد کو دیکھو جو آج بھی اپنی قسمت پر نوحہ کناں ہیں یہی وہ لوگ تھے جو ظلم و حیوانیت کو مٹانے کے لئے ٹوٹی ہوئی تلواریں اور تنکوں جیسے تیر لیکر انسانی خداؤں کے پہاڑوں اور طوفانوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ سیلابوں کا راستہ روک دیتے تھے اور آندھیوں کے رُخ پھیر دیتے تھے۔　　　　(باقی آیندہ)

تعمیری ادب کیا ہے؟

طیب عثمانی ندوی

آج تعمیری ادب رواں دواں جس تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہا ہے اور ادب کی پچھلی تمام قدریں جس طرح میدان چھوڑ رہی ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی یہ اندھیاری اب ختم ہونے والی ہے اور تعمیری ادب کا نیا آفتاب طلوع ہو کر جلد ہی سارے عالم کو اپنے آغوش میں لے لینے والا ہے۔ مشرق سے ابھرتی ہوئی تیز سنہری کرنیں آسمانِ ادب پر پھیل رہی ہیں۔ خدا نے چاہا تو عنقریب تعمیری ادب کا آفتاب نصف النہار کو پہنچکر عالم ادب کو جگمگا دے گا۔

تعمیری ادب کیا ہے؟ اِس سوال کے پیدا ہونے سے پہلے ادب کیا ہے؟ ادب کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات ہمارے ذہنوں میں اکثر ابھرا کرتے ہیں

آج یہ سوال ہر اُس شخص کی زبان پر ہے جس کو ذرا سا بھی ادب سے کچھ لگاؤ ہے کہ ادب کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ اگر ادب ہماری زندگی کی تعمیر میں ممد و معاون نہیں ہے تو پھر ایسا ادب نہ صرف یہ کہ ہمارے لئے بیکار و عبث ہے بلکہ مضر اور مہلک بھی۔ ادب کو ہمارے افکار کی تصویر، خیالات کا پر تو، نظریات کا حامی اور ہماری زندگی کا ترجمان ہونا چاہئے لیکن اگر ادب "زندگی" کا نرا ترجمان ہی ہو کر رہ جائے خواہ وہ زندگی کیسی بھی ہو؟ تو پھر ہر گھناؤنی زندگی کا عکس، ہر گندی ذہنیت کی تصویر اور ہر گمراہ کن خیال کا پر تو ادب میں پایا جائے گا۔ آج ترقی پسند ادب کے نام سے ہر قسم کی گندگی، فحاشی اور ذہنی آوارگی ہمارے ادب میں پائی جاتی ہے۔ "ادب اور زندگی" کا نعرہ سب سے زیادہ ہمارے ترقی پسند ادبا و مصنفین ہی لگاتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ فحش اور گھناؤنا ادب اُن کے "ادب برائے زندگی" کی اُبھری ہوئی تصویر ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ سماج کی سچی تصویریں ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اس سڑے ہوئے سماج کی اصلاح کے لئے یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اس کے تعفن کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور سماج کے گندے نالوں کا رخ ہمارے فن کار سوسائٹی کے صالح عنصر کی طرف پھیر دیں۔ جس سے پوری فضا متعفن ہو جائے اور یہ وبا پورے معاشرے میں پھوٹ پڑے۔

سماج کی سچی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ ہر فن کار و ادیب اپنی ذہنی کاوشیں سوسائٹی کے صالح اور پاکیزہ عنصر کو اجاگر کرنے اور پروان چڑھانے میں صرف کرے، اس طور پر کہ زندگی کی سچی تصویروں کے ابھرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقی اصلاح بھی ہو جائے۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا وہ تو "ادب اور زندگی" سے متعلق چند باتیں تھیں۔ لیکن اسی سلسلہ میں جو شئے قابل توجہ اور سب سے زیادہ اہم ہے وہ ہے زندگی اور اس کی ضرورتوں کو سمجھنا اور اس کا صحیح مقام متعین کرنا تاکہ ہمارا ادب اُسی سچی زندگی کی تصویر ہو۔ ہمارے ترقی پسند ادبا کے نزدیک انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت "روٹی" اور "جنسی خواہش" کی تسکین ہے، یہ دونوں چیزیں اُن کے نزدیک سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گویا اُن کے نظریۂ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت روٹی اور جنس کو حاصل ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حیوانوں کی سب سے اہم ضرورت غذا ہے۔ پھر انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز کونسی چیز رہ جاتی ہے؟ پھر در اصل جو شئے انسان کو تمام مخلوقات میں افضل و برتر بناتی ہے وہ روٹی اور جنسی ضرورتیں نہیں ہیں کیونکہ ان میں تو دونوں برابر ہیں بلکہ وہ انسانی قلب و دماغ ہے۔ اگر انسان نے اپنی دماغی قوتوں سے کام نہ لیا ہوتا اور ارتقا کی منزلیں طے نہ کی ہوتیں تو پھر انسان و حیوان میں فرق ہی کیا رہتا؟ اِس وقت میرا موضوع اشتراکیت نہیں ہے بلکہ ادب ہے، اور ادب کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ دنیا کی ایک بڑی آبادی کو روٹی مل جائے اور بس! انسانی زندگی میں روٹی کو اہمیت ضرور حاصل ہے لیکن انسان صرف "روٹی" کا نام نہیں۔

میرے نزدیک انسان کی سب سے اہم اور قیمتی شئے اس کا قلبی سکون اور دماغی نشوونما ہے۔ اِس بنیاد پر ادب کی ایک نئی عمارت قائم ہوتی ہے جسے عرفان

اور وجدان و ادراک کہتے ہیں۔

ایک ادیب کا دل جتنا بیدار اور ضمیر جتنا ہوشیار ہوگا۔ اتنا ہی عرفان و آگہی کی قوتوں میں اضافہ ہوگا۔ اس حیثیت سے ادب کی دو قسمیں کوفی ہوں گی۔ ایک بے ضمیر ادب، دوسرا باضمیر ادب۔ بے ضمیر ادب سے مراد وہ ادب ہے جو صرف دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جس کے اندر دھڑکتے ہوئے دل کی حرارت مفقود ہو۔ ذہنی ورزش کے نتیجہ میں پُر شکوہ الفاظ، چست جملوں کا ڈھیر تو ضرور ہو لیکن بذاتِ خود اس کے اندر کوئی جان اور [illegible] ح نہ ہو۔ دل کی آواز اور ضمیر کی پکار سے وہ پورا ادب خالی ہو۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا باضمیر ادب ہے۔ جو ادیب کے ضمیر کی آواز اور دل کی پکار ہوتا ہے۔ اس میں آورد نہیں بلکہ آمد ہوتی ہے۔ ایک صاحبِ ضمیر ادیب جو کچھ بھی لکھے گا یا کہے گا اس کے اندر ایک خاص قسم کا جوش ہوگا۔ تڑپ ہوگی۔ تاثیر و دل آویزی ہوگی۔ غرض کہ اس کے اندر وہ سب کچھ ہوگا جو ایک صاحبِ عرفان انشا پرداز میں ہونا چاہیئے۔

عرفان و ادراک اور ایمان و یقین جن کا تعلق قلب سے ہوتا ہے تعمیری ادب میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے پیدا ہو جانے کے بعد ہی اسلام پسند ادیب اور دوسرے ادباء کے درمیان ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور یہی چیز ان کو دوسرے انشا پردازوں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

جب تک ایک ادیب کے قلب میں عرفان و ایمان اور یقین کے سوتے نہیں پھوٹیں گے۔ اس وقت اُن کے ادب میں نہ زندگی ہوگی اور نہ تاثیر و دل آویزی پائی جائے گی۔ اس کے علاوہ سادگی، برجستگی و بے ساختگی، قوت و جوش، درد، بقائے دوام ایک صاحب ایمان و عرفان ادیب کے ادب و انشا کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو اُن کے ادب کو زندہ جاوید بنا دیں گے۔ تعمیری ادب کی اساس ان ہی جملہ خصوصیات پر قائم ہونی چاہیئے۔

مُلّا رموزی

مجلّہ ماہی "معیار" پر دو نظریں

مُلّا رموزی عصرِ حاضر کے گنے چُنے صاحبِ طرز ادیبوں میں سے ہیں۔ "معیار" کی حوصلہ افزائی کے لئے موصوف نے ہماری خواہش پر اپنے مخصوص انداز میں تذکرہ و تبصرہ کیا ہے۔ موجودہ دور میں جبکہ علمی اور فلمی، تعمیر پسند اور ترقی زدہ غرض اچھے بُرے ہر پرچے کو ایک ہی آنکھ سے دیکھا جا رہا ہے اور کوئی انفرادیت محسوس نہیں کی جا رہی ہے ہمیں خوشی ہے کہ مُلّا صاحب نے اس عام روش سے ہٹ کر بازاری اور معیاری پرچوں کو الگ الگ سطح پر رکھا ہے۔ اور بڑی حد تک معیار کو اصلی رنگ میں دیکھنے اور دکھانے کی سعی کی ہے۔ یہ مبارک سعی صرف "معیار" کیلئے حوصلہ افزا ہی نہیں بلکہ تعمیری ادب کے روشن مستقبل کی علامت بھی ہے۔

"معیار پر دو نظریں" ڈالنے کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہر حال یہ نظر "پہلی نظر" ہے جہاں تک معیار میں مزید شگفتگی کی ضرورت کا تعلق ہے اس کا احساس پہلے سے بھی ہمیں تھا اور اب مُلّا صاحب نے بھی توجہ دلائی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ علمیت برقرار رکھتے ہوئے بھی "معیار" کو زیادہ سے زیادہ شگفتہ شکل میں پیش کیا جائے۔

(ن ـ ق)

فخامت منزلت فضیلت مرتبت جناب گرامی "میرٹھ صاحب" زاد لطفہٗ

آپ کا نامۂ کرم بے تاریخ مجھے مبلغ ۳ اگست ۱۹۵۱ء کو ملا۔

آج تک تو یہ دیکھا کہ دماغی مرعوبیت، اور ذاتی فراست کی کوتاہی کی وجہ سے مسلمان لوگ اُردو کی خط و کتابت میں بھی دستخط انگریزی ہی میں فرماتے ہیں۔ دوسری کوتاہ فہمی یہ ہے کہ ۹۹ فیصدی مسلمان لوگ اُردو میں اس طرح دستخط فرماتے ہیں کہ "لکھیں موسیٰ اور پڑھیں عیسیٰ" گویا ان بے ذہن انسانوں کے خیال میں دستخط اصل نام اور تخلص سے ہٹ کر کوئی ایسی چیز ہے جس کو صرف خدا سمجھے، لیکن ایک ذہین اور فاضل انسان کو جواب لکھتے وقت یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اپنے خط لکھنے والے کو اسلامی تہذیب و شرافت کے مطابق نام و آداب و القاب سے مخاطب کرے مگر وہ سر پکڑ کر رہ جاتا ہے جب وہ اس نوع کے دستخط کے صحیح حروف تک نہیں پڑھ سکتا مثلاً آپ ہی پڑھ کر بتا دیجئے کہ اس دستخط سے کس نام یا مخفف کو اخذ کریں لیکن آپ نے نام تخلص اور اصل دستخط کے عوض خوذ کو صرف "میرٹھ" لکھکر مجھے جس طرح خوش کیا۔ اُردو داں و خواں طبقہ کا کوئی دوسرا شخص اس طرح خوش نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک جدت، اختراع، اور سُوجھ بُوجھ ہی سے تو محروم ہے جس کے رسوا کُن نتائج آج سب کے سامنے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمایئے کہ میں کیوں خوش ہوا میرے عزیز یا دشمن بھائی آپ کو قبلہ خواجہ حسن نظامی کی قسم کہ آپ میرے ۳۰ برس کے مضامین جمع کرکے ملاحظہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ میں نے کتنا اور کس کس طرح لکھا ہے کہ اے ہندوستانیو! نقالی اور تقلید کی زندگی ترک کرکے ایجاد و اجتہاد اور اچھوتے پن کی کوشش کرو مگر لوگوں میں اس کی استعداد ہو تب! دوسرے ہمیشہ لکھا اور آج لکھ رہا ہوں کہ جس مطبع نول کشور لکھنؤ کی ادبی خدمات کے پُل باندھے جاتے ہیں مگر اسی مطبع عجیب سے انگریزوں کے خفیہ نمک خواروں نے اسلام اور تہذیب اسلامی کے نام سے ایسے اخبار اور کتابیں شائع کی ہیں عرت چھپوائی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تمام رفعت خیالی کو احساس کمتری کی دق میں مبتلا کر دیا۔ مثلاً یہ ایسے ہی کرم خوردہ اور انگریزی نمک چشیدہ اصحاب قلم و مؤلفین کی ابتدائی درسی کتابوں کا مسلمان کُش سلیقہ ہے جو اچھا خاصا فاضل شریف خاندان،

اولوالعزم مسلمان جب کسی کو خط لکھتا ہے تو نام کے ساتھ یہ پست، ذلیل اور احساس کمتری سے اُٹے ہوئے الفاظ ضرور ضرور لکھتا ہے۔ خادم، تابعدار، کفش بردار، حقیر، احقر، کمترین، فدوی، نمک خوار، نمک پروردہ، پے مال، ذرہ ناچیز، خاک پا، خاک نشین، خدمت گذار، دعاگو، عاصی پُر معاصی، حقیر، فقیر، سراپا تقصیر، نیاز مند، نیاز کیش، نیاز آگیں، آثم، طالب کرم، اور علماء کے ہاں جائیے تو وہاں غفرلہٗ، عفی عنہ، کان اللہ لہٗ وغیرہ کی تہذیب ملے گی۔ اب آپ ٹھیرے آدمی فاضل! ایک ایک لفظ کے معنٰی میں مجھے بلندی، اولوالعزمی اور شاہانہ عالی حوصلگی کا کوئی مطلب مفہوم اور ترجمہ بتا دیجیے بجز خود کو پست تر انسان سمجھنے اور سمجھا جانے کے! اب ذرا اصل کی طرف جائیے اور مکاتیب رسول اللہ علیہ التحیتہ کے نام نامی کے ساتھ بجز من عبد اللہ کے مجھے تو کچھ نہ ملا۔

اس کے بعد میں آپ کے خود کو "میرٹھ" لکھنے سے جن حقائق کی بنا پر خوش ہوا افسوس کہ مسلمان سینما داں اور ہوٹل آگاہ ہونے کی وجہ سے عمر بھر اس وسعتِ معلومات کے ساتھ خوش نہ ہوسکتے تھے وہ یہ کہ ۱۹۴۵ء میں جرمن حکومت نے خود کو بے چارہ سمجھکر ایک عارضی التوائے جنگ پر گفت و شنید کی ذلت قبول کی تو اس کے آغاز کے لئے منجانب جرمن گورنمنٹ جو پہلا خطاب کیا گیا اس میں خطاب کرنے والے نے بجائے نام عہدے وغیرہ کے خود کو صرف "برلن" کہا تھا کیا معنٰی کہ باوجود شکست کے مزاجی بلندی اور دماغی نخوت شاہانہ گویا دستخط میں دمکتی ہی رہی بعین اسی طرح آپ نے جب خود کو "میرٹھ" لکھا تو مجھے اپنے حافظے نے سیرۃ بلند کا یہ واقعہ پیش کیا۔ اب میں نے اپنے محققانہ ملکہ سے کام لیا تو رسالہ "معیار" سے متعلق ہوکر دو ماحولی عناصر بھی ایسے ہی ملے مثلاً خود رسالہ کے نام میں بلندی کیا بلکہ حد بلندی ہے، دوسرے آپ جس محلہ میں رہتے ہیں اُس کا نام خوش بختی سے "خندق" ہے جس کو دُنیا کے سب سے بلند حوصلہ اور اولوالعزم انسان ہی استعمال کرتے ہیں نہ کہ "واللہ" "چنا نچہ" قسم کے اِنسان۔

آمدم برسر رسالہ "معیار"

آپ نے حُسنِ اتفاق سے یا میری چاروں بیویوں کی دعا سے مجھے لکھا پڑھا اور وہ بھی بہت اُونچے درجہ کا لکھا پڑھا آدمی سمجھکر یہ بھی لکھا کہ "معیار" پر اپنی رائے سے ادارہ "معیار" کو مطلع فرمائیے گویا اُصولاً اب میں جو کچھ عرض کروں گا وہ آپ میرٹھ صاحب مدظلہٗ سے نہیں بلکہ رسالہ "معیار" کے ادارہ سے عرض کروں گا۔ لہٰذا ادارہ "معیار" میرٹھ کے محترم مدیرین!

بعد سلام مسنون آنکہ

معلوم ہو کہ اس سے پہلے "معیار" کا غالباً مئی نمبر مجھے اس بے توجہی، بے اعتنائی، اور بے پروا انداز سے بغیر کسی مخاطبت کے اس طرح ملا تھا گویا نہ میں آدمی نہ آدم زاد بس جو کچھ ہیں وہ فقط آپ، اس کا جو اثر مجھ ۳۷ برس کے لکھنے والے پر ہوا جس کو آج کل "ردِ عمل" لکھتے ہیں وہ یہ کہ بس وہ یہ ــــــ لیکن اس مرتبہ بخت جو بیدار ہوا ایک کی جگہ دو نعمتیں اور وہ بھی ایک ساتھ یعنی تہذیب خطاب اور جولائی ۱۹۵۱ء کا "معیار" بھی۔

اس لئے اصلیت میں دو آنکھیں ہیں نہ کہ ایک اِس لئے میری دو نظروں نے اس کو پڑھکر جو نتائج استخراج کئے وہ اور جو خامیاں محسوس کیں وہ حاضر ہیں کیونکہ قانوناً جب مجھ سے رائے طلب کی گئی ہے تو کیا چوکتا ہوں جو نہ کہوں، لہٰذا صاف تو ایک طرف، صفا سُنیئے کہ۔

۱ــــــ رسالہ کاغذ، لکھائی، چھپائی کے حساب سے اتنا دلکش، دل ربا، دلگیر، دل نواز، اور دلچسپ ہے کہ اس حُسن ظاہری پر اس) کو جو نہ خریدے اُس کو شرناری خریدیں تو بہتر۔

۲ــــــ اس کے بعد کتابت کا ایک تو ہوتا ہے "خوشنویسی" یعنی حُرف کاتب کے حروف کا ضابطہ حروف کی خوبصورتی لیتے ہوئے تکمیل تحریر حروف، اور دوسرا درجہ ہے جو خوبصورتی سے بھی اہم ہے کاتب کا صحیح لکھنا اور ان دونوں کی بقا کاتب کی شدید محنت اور حاضر دماغی ہے لیکن ہندوستانی آب و ہوا ہی میں "مسلسل محنت" اور غور و فکر کی استعداد کم بلکہ کمتر ہے اِس لئے ۹۹ فیصدی کاتب "محنت چور" ہونے کے اثر سے غلط نگار ہوتے ہیں اور بے غور و احتیاط جو لکھتے ہیں تو اس کا یہ تلخ تاثر و نتیجہ نہ کاتب کو معلوم نہ ایڈیٹر کو معلوم یعنی غلط کتابت ہی کے باعث ۲۵ فیصدی اعلیٰ تعلیم یافتہ اُردو کو پڑھنے سے توبہ کر چکے ہیں اور ہر سطر پر کاتب کو شریف آدمی ہونے پر بھی گالیاں عنایت فرمائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُردو میں یہ انگریزوں وغیرہ کی ایجاد کی ہوئی مشین عرف "ٹائپ" کی ضرورت اور طلب محسوس ہوئی اِس لئے میں آپ کے رسالے کے کاتب اور کاتبوں کو داد دیتا ہوں کہ ان میں الحمد للہ یہ نقص کم بلکہ کافی حد تک نہیں، ہے اس لئے وہ تعلیم یافتہ ہی نہیں جو اس رسالہ کے خریدار پیدا نہ کرے۔

نمبر ۳ کا معاملہ قدرے قابلِ غور ہے اور وہ ہے قواعد کی رُو سے اس کے مضامین اور نظموں کا صحیح ہونا سو اس معاملہ میں رسالہ کے مضامین

اور نظمیں یقیناً محتاج اصلاح ہیں جس کا مزوری سبب یہ ہے کہ ویسے تو ہر زبان عوام ہی سے پیدا ہوتی ہے اور بہنایت بے تحاشہ مگر ہر جگہ کے عوام میں جو خواص ہوتے ہیں وہ اس بازاری زبان کو حدودِ علم وحجت میں بند کرتے رہتے ہیں۔ جس کے صدقہ سے یہ زبان پھر "علمی زبان" تسلیم کی جانے لگتی ہے، چنانچہ یہ "خفیہ اتفاق" ہے کہ میں "ملا رموزی بقلم خود" کم نظروں کے خیال میں "صرف مزاح نگار" قرار پایا لیکن بفضلِ خدا میں اُن بزرگوں کی آخری صف میں بھی کام کر چکا ہوں جنہوں نے اُردو کو "علمی زبان" کا رُتبہ دلایا اور اس میں داخل ہونے والے غلط الفاظ کا سر قلم کرتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء تک اُردو اس حد تک "علمی بن گئی" کہ دیکھ لیجیے کہ ایک مکمل سلطنت عرف پاکستان اُس کو ہم سے چُرا کر لے بھاگی اور آج اپنا سب کاروبار اسی زبان میں کر رہی ہے۔

اس لئے اب جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندوستان میں اُردو شروع ہوئی وہ اُردو کی تیسری نسل ہے۔ یعنی پہلی نسل از دلی دکنی تا انیس و دبیر، اور دوسری نسل از انیس و دبیر تا شبلی و ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں اور غفنفر نہ آئے تو تا ملا رموزی جس کے تنقیدی مضامین بہت کم لوگوں نے پڑھے ہیں چونکہ اس تیسری نسل کا ابھی بچپن ہے اسی لئے دیکھ لیجیے کہ آج کل اُردو کے اخباروں، رسالوں اور شاعری میں کیسے کیسے منہ بولتے بچے کام کر رہے ہیں لہٰذا جب تک کہ یہ بچے پختگی کی عمر کو نہ پہونچیں گے غریب اُردو میں بازاری، مہمل، بے معنی اور سطحی الفاظ کی بھر مار رہے گی، اس لئے اس زمانے میں ہندوستان میں اُردو کے جتنے خواجہ خضر باقی ہیں ان کا اور اچھی تعلیم و ذہانت کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ اُردو میں بے حد سادہ زبان تو ضرور استعمال کریں مگر صحت الفاظ اور مسلّمہ قواعد کا لحاظ رکھیں تب تو ادیب ورنہ مشر چیلے۔

اب بے حد خصوصیت سے ایک بات یہ عرض کرنا ہے کہ "معیار" میں جتنے مضامین بغرض تبلیغ دین شائع ہوں خواہ وہ کتنے ہی مصطلحاتی عرف ٹیکنیکل ہوں اُن میں مقصد تبلیغ کو وسیع کرنے کے لئے زبان کو حتی المقدور بے حد آسان اور عام فہم بنایا جائے جیسا کہ اس مقصد کے لئے خود قرآن حکیم میں حکم دیا گیا ہے اور تدبیر بتائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ لہٰذا اس لئے تبلیغی مقالات کے مسائل خواہ کتنے ہی گاڑھے علمی ہوں مگر اُن کو ذہانت کی گرمی سے اتنا پگھلایا جائے کہ وہ عوام کی پتلی سمجھ میں آ سکیں حالانکہ میں تبلیغی جرائد و رسائل کی تحریروں میں دیکھ رہا ہوں کہ ان میں اتنی "بلغ العلائیت" پیدا کی جاتی ہے اور مکے شریف کی ایسی ادق اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں کہ آگے پڑھئے اور پیچھے کا بھولتے جائیے۔

نمبر ۲ بہت اچھا ہے کیا معنی کہ اس رسالے میں آپ کا مقصد تبلیغ دین، مقصد انسانیت کی تشویق و تحریص، اور اصلاح نفس و کردار اصحاب علم پر معاً واضح ہو جاتا ہے مگر داد دیتا ہوں کہ آپ نے اس رسالے کو خشک "بیت المقدس" نہ بنایا بلکہ تنوع اور رنگا رنگ مضامین سے اس کو تبلیغ کی "جمعیۃ الاقوام" بنایا جس سے ہر طبقہ اور ہر ذوق کا انسان اس کو پڑھ سکتا ہے اور اگر اس پر بھی نہ پڑھے تو گویا وہ لکھا پڑھا ہی نہیں بلکہ موٹر کار ہے لسان الغیب میں نے اپنے ذوق کے مطابق اس کے جو مضامین بستر علالت پر کبھی لیٹ کر کبھی بیٹھ کر اور کبھی ترچھا ہو کر اور کبھی نمازی قاعدہ سے بیٹھ کر کافی غور سے پڑھے اُن میں مجھے اور میری بیوی نمبر ۳ لغایت نمبر ۴ کو جو مضمون بے حد پسند آیا بلکہ از حد پسند آیا وہ تھا۔ "ہندوستان کی ذہنی بیداری"۔ از مولوی اصغر عابدی مدیر "معیار"۔ اس کے بعد اس رسالے کے صفحات کے مجلّے کے آخر حصہ میں "مسائل زمانہ" والے "شذرات" از جناب مولوی منشی ادارہ صاحب" ان مضامین کو ہم سب نے جن وجوہ سے پسند کیا وہ یہ ہیں کہ

اُردو کے ۹۹ فیصدی رسالے اور ۷۰ فیصدی اخبار اور اگر دہلی میں عابدی صاحب تلاش فرمائیں تو ۲۵ فیصدی ایسے مؤلف بھی مل جائیں گے جو بقلم خود کندۂ ناتراش ہے اور ہر نہیں لیکن روزی کے مارے ہوئے ذی استعداد لوگوں کو بے حد کم معاوضہ دیکر صاحب کتاب بنے ہوئے ہیں اور یہی حال ایڈیٹروں کا ہے یہ اڈیٹروں ہی کی تو کم مائگی ہے کہ اُردو کے اخبار اور رسالے عوام اور بازار کی سطح سے اونچے ہو کر رہبر اور مدبر کے رتبۂ اعلیٰ کو نہ پہونچ سکے۔ لیکن مبارک کہ "معیار" کے از ایڈیٹر لغایت معاونت تک بقلم خود ایسی استعداد رکھتے ہیں کہ اگر "معیار" میں لکھنے والے کُل کے کُل ملا رموزی ہڑتال بھی کر دیں تو یہ سب مل کر پورے رسالے کو لکھ کر پھینک دیں گے۔

ان مضامین کا اصل ملکہ کمال اصغر عابدی اور ادارہ کی وسعت معلومات، زمانہ شناسی، اور استخراج نتائج کی بہترین قابلیت ہے جو ان مضامین میں موجود ہے ورنہ ملا رموزی جہاں درباری قسم کا خوشامدی اور بد لحاظ ہے وہاں اُس کا وطن آبائی شمالی افغانستان کے صوبۂ بدخشاں کا قصبہ "کاکل" ہے اور جس کا جی چاہے وہ بھوپال آکر ملا رموزی سے پشتو اور افغان فارسی میں گفتگو کر کے دیکھ لے کہ اُس میں پہاڑی جرأت، بیباکی اور لٹھ پن موجود ہے یا نہیں اور وہ جو آج آٹھ ماہ کی طویل و شدید علالت

میں بھی بد پرہیزی اور شکاری گشت سے باز نہیں آرہا تو یہ سی نسلی انفانیت کا ڈینشن نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا لکھنؤ کا کوئی "واللہ" "چنانچہ" بھی ایسا کرسکتا تھا اور نظم ونثر کا جو طوفان بستر علالت پر سے اٹھائے ہوئے ہے وہ اُس کی "فولادی وٹامن والی تشکم شکن غذاؤں" ہی کا تو صدقہ ہے۔ اس لئے آپ سب کے مضامین کو پڑھکر پھر آس پاس پڑے ہوئے سینمائی رنگ کے "ترقی پسند رسالوں" پر نظر بھی نہ ڈالی گئی البتہ اگر افسوس ہوا تو یہ کہ مسلمانانِ ہند میں سب کچھ ہے مگر تعلیم ہی نہیں ہے۔ اس لئے اب جس کمال تک اظہار کی

ذمہ داری آپ سب پر ہے وہ یہ کہ چاہے رسالہ "معیار" پر مالی مشکلات کے پہاڑ گر پڑیں مگر آپ ہمت، اولوالعزمی اور جلال مردانگی سے اس کو جاری ہی رکھیں۔ وقت معین سب فراہم کردے گا زیادہ ہدیۂ محبت۔

مگر ہاں وہ خوب یاد آئی کہ اگر میرٹھ سے کوئی صاحب بھوپال آئیں تو شہر آگرہ سے دو مٹی کی ہانڈیاں کھانا پکانے والی نک پالش اور اچار چٹنی والی لیکر مجھ ملا رموزی کو بھوپال کے محلہ چھاؤنی میں پہنچا دیں تب میں سمجھوں گا کہ وہ رسالہ "معیار" کے قدردان ہیں۔

شرائط ایجنسی

۱ــــ دیانتداری اور حسابات کی ادائیگی میں باقاعدگی شرطِ اوّل ہے۔

۲ــــ کم سے کم ۵ عدد پرچے منگوانے پر ایجنسی دی جائے گی۔

۳ــــ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔

۴ــــ سول ایجنسی کی صورت میں ۱۰۰ عدد پرچے منگوانے ہوں گے۔

۵ــــ سول ایجنسی کو کمیشن ۳۳ فیصدی دیا جائے گا۔

۶ــــ سول ایجنسی سے ایک ماہ کی رقم پیشگی بطور ضمانت وصول کی جائے گی۔

۷ــــ ڈاک خرچ میں صرف ایک پوسٹ کارڈ خرچ دفتر کے ذمّہ ہوگا۔

۸ــــ ڈاک کی خرابی کا دفتر ذمّہ دار نہ ہوگا۔

(مینیجر)

متین طارق

ایجادات

پرانی بات چلی آتی ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" اور یہ آپ جانتے ہیں کہ ایجاد زندگی کو آگے بڑھاتی ہے بڑھانا کیا۔ میں کہتا ہوں تیز بھگاتی ہے۔ چنانچہ یہ ایجادات کا ہی فیضان ہے کہ آج انسان منہ اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے نہ اسے سوچنے کی فرصت ہے نہ دم مارنے کی "دراڑ" کا اور وقت نکلا اور وقت نکلنے کے بعد پھر پچھتائے کچھ نہیں ہوتا سوائے ہاتھ ملنے کے حالانکہ ایجادوں کا اصل منشا یہی ہے کہ انسان ہاتھ ملنے سے چھٹکارا پا جائے۔

ایک وقت تھا کہ وہ طلسم ہوش ربا جیسی کتابیں لکھکر حکیم اشراق کی طرح ایک گولے میں فوج کی فوج کو ختم کرنے کے خواب دیکھتا تھا کبھی جادو کے قالین پر بیٹھکر چین ماچین کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ ایجادوں نے کہا اے میرے بندے ہاتھ نہ مل تیرے لئے ہی ہنری فورڈ کی موٹریں تیار ہو رہی ہیں۔ پاک ایرویز جاری ہے پری چہرہ بننے کے لئے گیلی کورا کا پاؤڈر ہے ہمیشہ موٹا تازہ رہنے کے لئے کلیسیم کے انجکشن ہیں مگر تو خدا کے واسطے کسی طرح ہاتھ ملنے سے باز آ کیونکہ ہاتھ ملتے رہنے سے آدمی گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا اور گھاٹ کا بھی شاید رہ جائے لیکن گھر کا تو سو فیصدی نہیں ہو سکتا کیونکہ "انتقال آبادی" نے انسان کے اس حق کو اس سے اسی طرح چھین لیا ہے جس طرح الف لیلے کا جن چین کی شہزادی کو اس کے عاشق زار سے چھین لے گیا تھا۔

چنانچہ اب اگر کوئی علوم متعارفہ کا طالب علم اس کی تعریف کرنا چاہے تو وہ یہ کہ انسان وہ مہذب جانور ہے جو اپنی پیٹھ پر اپنا سامان لادے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو جاتا ہے گویا گھڑی کے پنڈولم کی طرح اسے کسی وقت قرار نہیں اور شاید اب کوئی دن میں اکبرالہ آبادی کی پیشین گوئی کے مطابق

"کٹے گی اب عمر ہوٹلوں میں مریں گے ہم اسپتال جاکر"

اس کے ثبوت کے لئے بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اب بستیوں میں ہوٹل زیادہ بن رہے ہیں اور گھر کم نیز امریکہ نے "آٹھواں گھر" کی ایجاد کرکے تو بالکل ہی تصدیق کر دی ہے کہ ع

"فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی"

شاید آپ کہیں کہ انسان کامل کی تعریف تو یہ ہوئی اور جو لوگ اپنی جگہ مقیم ہیں وہ کس گنتی میں ہیں تو میری طرف سے سیدھا سادہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہیں ابوالہول کے مجسمے کے مجاور جو محض اسی لئے ہیں کہ آنے والے انہیں دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔ اس موقع پر شاید یہ شبہ گذرے کہ ایجادیں بجائے خود ایک عبرت ہیں۔ ریلوں کے ٹکراؤ، ایٹم کی تباہی جہازوں کا بحر میں کھو جانا کیا کسی تباہی سے کم ہے جس کے معنی ہیں کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ایجادیں نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ ادھر ایجادیں آتی ہیں ادھر تباہی۔ مگر سنئے جناب یہ ہے آپ کی تنگ نظری۔ صاف سی بات ہے پہلے آبادیوں کی قلت تھی۔ انسان کم تھے۔ حادثات بھی کم واقع ہوتے تھے۔ اب انسانوں کی کثرت ہے۔ بستیاں قریب قریب ہیں اس لئے تباہ کاریوں کے اعداد جلدی جلدی سامنے آجاتے ہیں اس میں ایجادات کا کیا قصور موت ہر صورت میں آنی ہے آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ورنہ تو آپ کسی اخبار کو اٹھا کر دیکھئے ایجادات نے آپ کو

کیا دوا، السک، والحم دیکر چار نکاح کرنے کی طاقت عطا نہیں کی۔

کیا لکس کا صابن صرف جلد نہ صاف کر کے دعوت نظارہ بہم نہیں پہنچاتا۔

کیا پیشن نے سردیوں میں گرم رکھنے کا انتظام نہیں کیا۔

کیا وِلس کے سگریٹ نے آپ کے مشغلوں میں اضافہ نہیں کیا۔

اسی لئے لوگ ایجادوں کو زندہ رکھنے کی فکر میں ہیں کیونکہ وہ زندگی بخشتی ہیں۔ طاقت دیتی ہیں۔ دانتوں کو چمکاتی ہیں۔ گنجا پن دور کرتی ہیں نیز ساتھ ساتھ موجد کو ہمیشگی کی زندگی عطا کرتی ہیں۔

آپ خود اندازہ کیجئے جارج اسٹیفنسن آج زندہ نہیں لیکن اس کا نام ریلوں کے ساتھ کچھ اس طرح چپکا ہے جیسے اسکولوں کے ساتھ لڑکے، منشی جی کے کان سے قلم اور گھنٹہ گھر سے گھڑیال نیز جیب تک لڑکے، قلم، گھڑیال اور ریلیں زندہ ہیں کوئی بھی اسکول، منشی جی، گھنٹہ گھر

اور سٹیفنسن کو نہیں بھول سکتا۔ بھول بھی کیسے اسکول انسان ڈھالتے ہیں۔ منشی جی کا قلم دوٹروں کی فہرست تیار کرتا ہے جن سے آگے چل کر جمہوری، سوشلسٹ، کیمونسٹ طرز کی حکومتیں چلتی ہیں۔ گھڑیال سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ریلیں ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں اور اسی قسم کی چیزیں مثلاً پنیسیلین کے انجکشن زندگی وصحت عطا کرتے ہیں۔ پونڈ کی کریم آرٹ و زیبائش میں مدد دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر آدمی ایجاد میں لگا ہوا ہے۔ گاؤں کی گھوسن سے لے کر بڑے سے بڑا سائنس داں، ادیب، اُستاد، صناع، ایجادات کا بندہ ہے خواہ وہ گندہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ہمیں ایجاد کے معاملے میں اگر کچھ کہنا ہے تو وہ اسی گندگی کے سلسلے میں۔

سائنس داں تو آپ جانتے ہیں کہ کیوں ایجاد کرتا ہے کیونکہ اُس کا پیشہ ہے مگر یہ اور لوگوں کا معاملہ ذرا غور طلب ہے۔ گھوسن کو دیکھو وہ سوجن سے گھی میں گھی ملا کر گھی کی کیمیاوی تبدیلی کرتی ہے جیسے کسی بقراط نے اُسے نسخہ میں لکھ دیا ہے کہ آج کے انسانوں کا علاج اسی نسخۂ کیمیا سے ممکن ہے۔ اب ہزار کہو سنو کہ یہ ایجاد نہیں تباہی ہے، بے ایمانی ہے۔ اس سے کھجلی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے آنتیں خشک ہو جاتی ہیں مگر وہ مرغے کی ایک ٹانگ کہ یہ ایجاد ہے اور ہر ایجاد اس لئے ہوتی ہے کہ اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

چنانچہ اِس اندھا دھند ایجادگری کے ثبوت میں یُوں لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر میں اِس ادبی مجلس میں صرف ادبی تمثیل پر ہی اکتفا کرتا ہوں جو کبھی "ادبی دُنیا" نے شائع کی تھی یعنی غالب کی مشہور غزل جس میں دریا کو کوزہ میں بند کرتے ہوئے کہا گیا ہے ؎

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اب یار لوگوں نے ایجادی زعم میں اس کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

عشق جنہیں ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے، مجھے، تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

اب نہ اُٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیسا بکتا ہوں میں
گو یا نکما کر دیا
تمہارے عشق نے

گرتا ہوں اور اُٹھتا ہوں میں
اُٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اِتنا نکما کر دیا

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اُس وقت تھا میں آدمی

اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

یا اِسی غزل کا دوسرا شعر ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

نئے انداز میں اِس طرح ادا کیا گیا ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اِک اِک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ اُلفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

شاید آپ سوچیں کہ اِس اختصاری دور میں جبکہ انسان ناول کے بجائے افسانے، اخبار کے بدلے ریڈیو اور کتاب کے بجائے دیباچہ پڑھنے پر عمل کر رہا ہے اِس طولانی تشریح کی کیا ضرورت تھی تو اصل بات یہ ہے کہ یہ تو کسی کسی کا حصہ ہے جسے مولا دے، باقی بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان ایجادیں کرتا ہے۔ آگے

بڑھتا ہے جب ایجادیں بند ہوجاتی ہیں تو یہ ترقی رک جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے موٹر کے پہیے میں بریک لگ جانے سے پہیوں کی گردش رک جاتی ہے۔ گردش کے دھوکے میں آپ آدمی کو بھی خدانخواستہ پہیہ نہ سمجھ بیٹھئے گا اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ چلتا کم اور لڑھکتا زیادہ ہے پہیوں کی طرح بلکہ پہیوں سے بھی تیز آگے بڑھنے پر آتا ہے تو خدا بننے کی کوشش کرتا ہے گرنے پر آتا ہے تو شیطان سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں حالتیں اس کے لئے خراب ہیں۔

مگر چھوڑیئے آپ کو ان جھنجھٹوں سے کیا۔ بات یہ تھی کہ ایجادیں کرنا اب ایک فن بن گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نئے دور میں لائبریریوں اور کتاب گھروں سے رسالے چرانے کی جدت کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کو آرٹ تصور کیا جاتا ہے جو آدمی یہ اور اس قسم کے کام نہیں کرسکتا وہ پرانا، باؤلا، قدامت پرست نہ جانے کن کن ناموں سے یاد کیا جاتا ہے گویا دن دھاڑے سورج کی روشنی میں سفید جھوٹ بولنا نیز اپنی ٹیکنک سے پتہ نہ چلنے دینا کہ یہ ڈھول کا پول دھوکے کی ٹٹی ہے بلکہ الٹا مخاطب کے دل میں یہ بٹھا دینا کہ سوائے ان صاحب کے آج تک سچ بولنے والا پیدا ہی نہیں ہوا آج سب سے بڑی جدت ہے جو اس کو اپنا لیتا ہے اس کے لئے کامیابی کی راہ کھل جاتی ہے وہ عیش وآرام کی فضا میں سانس لیتا ہے اس کے منہ سے بلیک اینڈ وائٹ کا سگریٹ لگ جاتا ہے۔ پیر میں فلیکس کمپنی کا جوتا آجاتا ہے اس کی بیوی چراغ خانہ کے بجائے شمع انجمن بن جاتی ہے خود اس کی زندگی قصبہ کے کور دہ سے چل کر چوپاٹی پر پہنچ جاتی ہے۔

شاید آپ کہیں کہ یہ تو دولت کی فراوانی سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں آپ کا خیال بالکل درست دولت جدت سے وابستہ ہے اور ہر جدت کے بعد دولت آتی ہے۔ یہ دوسری بات کہ وہ ہاتھ میں نہ ہو چیک بکوں میں ہو۔ اور انسان اس کی تحصیل کے لئے گھر سے بینک اور بینک سے گھر کا چکر کاٹتا رہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ چکر کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ سوینار مند کو کچھ پیش گوئی کا دعویٰ تو ہے نہیں کہ میں آپ کو پرانے کاہنوں کی طرح مقررہ تاریخ بتا دوں کہ آپ کے لئے کب اور کیونکر فاتحہ خوانی کا موقع آئے گا البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر ابتدا کی ایک انتہا ہے جس کے لئے

"پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ"

عروج قادری

گفت و شنید

حرفِ شکایت

آکے واپس ہوا ہوں کل سے یہاں بیسوں بار
جب سے رہتا ہے ترے پاؤں میں چکر اے دوست
تھک گئے پاؤں ہوا وقت بھی میرا بیکار
گھر میں رہنا ہی تجھے ہوگیا کارِ دشوار

بات کیا ہے کہ ملاقات بھی موقوف ہوئی
اب نہ تفریح کے جلسے ہیں نہ نغمہ نہ سرود
روشِ پرسشِ حالات بھی موقوف ہوئی
دوستوں کی وہ مدارات بھی موقوف ہوئی

اب تو اِس گھر میں بہلنے کی کوئی بات نہیں
تُو کبھی میرے لئے فرش ہوا جاتا تھا
محفلِ عیش نہیں حرف و حکایات نہیں
ہائے اب مجھ سے وہ پہلی سی مراعات نہیں

کیسی دلچسپ ہے امسال بہاراں اے دوست
صحنِ گلشن میں تھرکتا ہوا اک شعلہ ہے
ذرہ ذرہ ہے یہاں آج غزل خواں اے دوست
یہ گلِ لالہ جو ہے شاخ پہ جنباں اے دوست

تجھ کو گرماتی نہیں کیا شفقِ صبح و مسا
اس کی گرمی سے مرے خون کی گردش ہوئی تیز
آگ ہے آگ، شفق نام ہے یوں ہی اس کا
جاگ اٹھا جذبۂ خوابیدہ مرے سینے کا

بلبلیں بھی ترے جذبات کو اکسا نہ سکیں
حد بھی ہے خنکیِ جذبات کی کوئی ہمدم
ننھی کلیاں بھی تجھے ولولہ آموز نہیں
کیا ترے دل میں کوئی ساز نہیں سوز نہیں

کیا خبر کس نے کیا تجھ پہ یہ جادو اے دوست
اس طرح میں نے کسی کو نہ بدلتے دیکھا
ذہن پر ہے ترے کس چیز کا قابو اے دوست
تجھ میں باقی نہ رہی پہلی سی خوشبو اے دوست

کیا ترے پاس سے مایوس چلا جاؤں میں
مُہرِ لب توڑ دے روداد سنا اپنی مجھے
دلِ بیتاب کو کس طور سے سمجھاؤں میں
گفت گو سے تری تسکین تو کچھ پاؤں میں

لفظ جواب

سن لیا میں نے ترا حرفِ شکایت اے دوست — قابلِ قدر ہے یہ تیری محبت اے دوست
آج نغموں سے تو محروم رہا میرے یہاں — مجھ کو افسوس ہے بے حد و نہایت اے دوست

بات یہ ہے کہ خیالات کی رو گھوم گئی — اور پھر حرف و حکایات کی رو گھوم گئی
دوستی کی جو حقیقت ہے ہوئی جب ظاہر — میری اس پہلی مدارات کی رو گھوم گئی

زندگی کا جو ہے مقصد مجھے معلوم نہ تھا — ظلمتِ جہل میں دن رات بھٹکتا ہی رہا
زندگی اپنی گذرتی رہی اُلٹی سیدھی — جیسے جینا تھا مجھے ایک منٹ بھی نہ جیا

میں نے جذباتِ ہوس نظم میں ڈھالے کیوں تھے — میں نے رُوداد ہوس تجھ کو سنائی کیوں تھی
تجھ کو افسوس کہ وہ محفلیں سونی کیوں ہیں — مجھ کو صدمہ کہ وہ محفل ہی سجائی کیوں تھی

دیکھتا میں بھی ہوں پھُولوں کا تبسم اے دوست — جنتِ گوش ہے بلبل کا ترنم اے دوست
میں جو سنتا ہوں کبھی گُل کا تکلم اے دوست — میرے جذبات میں ہوتا ہے تلاطم اے دوست

ننھی کلیوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے — فصلِ گُل فصلِ بہاراں کی خبر رکھتا ہوں
تُو فقط پھُول کی رنگت پہ مٹا جاتا ہے — اور میں اس کی حقیقت پہ نظر رکھتا ہوں

چٹکیاں لیتی ہے سینے میں مرے صبح و مسا — یہ شفق آتشِ بے دُود جسے تو سمجھا
ذوقِ سر باختگی جوش میں آجاتا ہے — اس کی سُرخی میں شہیدوں کے لہو کا ہے مزا

موجزن رہتا ہے جذبات کا دریا اب بھی — دل میں آباد ہے اِک درد کی دُنیا اب بھی
بات اتنی ہے کہ اب سمت بدل ڈالی ہے — ورنہ بہتا ہے اسی زور سے دھارا اب بھی

مقصدِ زیست کا کیا تجھ کو نہیں کچھ بھی شعور — کیا ترے دل میں حقیقت کا کوئی سوز نہیں
گرم رفتار ہیں ذرّے بھی یہاں غور تو کر — رقصِ ذرہ بھی تجھے حوصلہ آموز نہیں

سہیل احمد زیدی

اعتراف

اب چار قدم بھی ساتھ ترے ہم جا نہیں سکتے اے ساتھی

صدیوں کا سفر طے کر کے بھی ہم وہم و گماں پر چلتے ہیں
دل میں ہے اجالوں کی خواہش آنکھوں میں اندھیرے ڈھلتے ہیں
آخر کب تک گمراہ رہیں، مجبوراً راہ بدلتے ہیں

منزل کے فسانے اب ہم کو بہلا نہیں سکتے اے ساتھی
اب چار قدم بھی ساتھ ترے ہم جا نہیں سکتے اے ساتھی

"اسلام کو خطرہ لاحق ہے ایمان کی دولت جاتی ہے"
"اُٹھو کہ ہماری قوم پہ اب ہر سمت سے آفت آتی ہے"
"دوڑو کہ یہ راہِ قومیت منزل کی طرف ہی جاتی ہے"

یہ کھوکھلے نعرے اب ہم کو بہکا نہیں سکتے اے ساتھی
اب چار قدم بھی ساتھ ترے ہم جا نہیں سکتے اے ساتھی

ہم نے بھی تو ناحق خون کئے ہم نے بھی تو دولت لوٹی ہے
تذلیل کے وحشی ہاتھوں سے انسان کی عزت لوٹی ہے
غیروں کو بھلا کس منہ سے کہیں ہم نے بھی تو عصمت لوٹی ہے

ہم ان خونی افسانوں کو جھٹلا نہیں سکتے اے ساتھی
اب چار قدم بھی ساتھ ترے ہم جا نہیں سکتے اے ساتھی

توحید کے پردوں کے پیچھے انسان ہی پوجے جاتے تھے
تعمیر کے رنگیں ساغر میں تخریب کی مے چھلکاتے تھے
اسلام کی دھن میں بھی اکثر الحاد کے نغمے گاتے تھے

ہر بار فریب تو مت ہم کھا نہیں سکتے اے ساتھی
اب چار قدم بھی ساتھ ترے ہم جا نہیں سکتے اے ساتھی

الحاد کے پردے چاک ہوئے ایمان کی آمد آمد ہے
فرقوں میں بٹے حیوان نہیں انسان کی آمد آمد ہے
خاموش فضائیں کہتی ہیں طوفان کی آمد آمد ہے

چاہیں بھی تو خواب آور نغمے ہم گا نہیں سکتے اے ساتھی
اب چار قدم بھی ساتھ ترے ہم جا نہیں سکتے اے ساتھی

عزیز احمد

سرگذشت

(۱)

کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں
درد سے پُر ہے کہانی میری
میرے ماضی کو نہ پُوچھ
اب مرا حال ہے یہ
یعنی میں کچھ بھی نہیں

(۲)

داستاں عہدِ درخشاں کی سناؤں میں اگر
کس کو آئے گا یقیں
میرے ماضی کی کوئی بات نہیں ہے باقی
کچھ روایات ہی ہیں
کون مانے گا انہیں
ورنہ دراصل کبھی میرا زمانہ بھی تھا
حاکمِ وقت تھا میں
میرا سکہ تھا رواں
میرے ماتھے پہ جو پڑتی تھی شکن
ایک طوفان بپا ہوتا تھا

تم نے تاریخ پڑھی تو ہوگی
ساڑھے تیرہ سو برس گذرے ہیں
جب درندہ تھا بشر
تھی نہ کچھ اس کو خبر
علم و تہذیب کسے کہتے ہیں
آدمیت کے تقاضے کیا ہیں
یہ تو باتیں ہیں بڑی
تھی وہ تاریک فضا
قتل کر دیتا تھا اولاد کو اپنی انساں
حق کا معیار نہ تھا کوئی
نفع اندوزی پہ تھا سارا زمانہ مائل
جیسا اس وقت بھی ہے
اپنے ہی خود کو سمجھتے تھے خدا
دوسرے ان کے اشاروں پہ چلا کرتے تھے
گوشۂ امن نہ ملتا تھا کہیں عصمت کو
جیسا اس وقت بھی ہے
ہائے انساں کی ہوس

(۳)

مجھ سے یہ حال جب انسان کا دیکھا نہ گیا
میں نے انسان کی بھلائی کا اٹھایا بیڑا
حق کا پیغام دیا
عرش اعظم کی بتائیں باتیں
کامیابی کی سجھائیں راہیں
دل میں انسان کے یہ نقش جمایا میں نے
سب کا حاکم ہے خدا
اس کی مرضی پہ چلو
میری پیشانی پہ منقوش ہیں اس کے احکام
میری آواز کو روکا تو گیا تھا تب بھی
سنگ دل ایسے بھی تھے
تھے مگر اہل نظر بھی کچھ لوگ
مجھ کو دی دل میں جگہ
میرے کہنے پہ چلے
مٹ گئے ظلم و ستم
اب کدورت کی جگہ دل میں تھا الفت کا مقام
ذہن ابلیس کی گندی اسکیم
آخر انسان نے دھوکا کھایا
خواہش نفس کی زنجیر پہنکر ظالم
خود کو کہنے لگا حاکم ہوں میں
تاج اور تخت پہ کٹنے لگے سر
اور لٹنے لگے گھر
مجھ سے غفلت کا نتیجہ نکلا
آٹھ نو صدیاں یونہی بیت گئیں
اور چلتا رہا شیطاں کا فسوں
گو سنبھلنے کے مواقع نکلے
کوئی سنبھلا نہ مگر
اور نوبت یہ ہوئی
میرا عاشق جو کبھی تھا مشہور
چند چمکیلے سے سکوں کے عوض
بیچ لیتا ہے مجھے

(۴)

اب بھی آجائے اگر ہوش تو موجود ہوں میں
ہو بہو جیسا کبھی پہلے تھا
اپنی الماری میں محبوس نہ رکھے مجھ کو
اور لے عقل سے کام
سب کو دیدار دکھا دے میرا
میرا دعویٰ ہے کہ وہ عہد درخشاں و حسیں
پھر اسی سطوت و عظمت کو جلو میں لے کر
اپنے انوار دکھا سکتا ہے
کاش انسان کو ہوش آجائے
اب تو سب جان گئے ہوں گے مجھے!!

سعید عقاب

تعمیر پسندوں کے نام

(۱)

یہ کیسا انقلاب ہے یہ کیسا اختیار ہے
نظامِ کائنات میں عجیب انتشار ہے
فلک پہ بزمِ کہکشاں بھی آج سوگوار ہے
کہ ایک بھائی دوسرے کی آستیں کا مار ہے

(۲)

بہیمیت کے راستے پہ رہزنوں کا کارواں
ستم کی ڈولیوں کو دوش پر لئے ہے یوں رواں
لرز رہے ہیں ہر قدم پہ یہ زمین و آسماں
بشر بنا ہے بھیڑیا، درندگی ہے حکمراں
وطن کی وسعتوں پہ خیمہ زن ابھی غبار ہے
خزاں بہار پر ہے اور لٹی ہوئی بہار ہے

(۳)

زمین سرخ ہوگئی لہو بہا عوام کا
انھیں دیا گیا ہے آج مرتبہ غلام کا
سزا، گلا معاوضہ ملا ہے ان کے کام کا
تو کیوں نہ ان کے دل میں جذبہ جاگے انتقام کا
جفا کے دیوتاؤں کے خلاف یہ پکار ہے
جبینِ ارض پر وجود ان کا داغدار ہے

(۴)

چراغِ راہِ زندگی کو آ رہی ہیں ہچکیاں
سوار ہیں گھٹا کے دوش پر سیاہ آندھیاں
نتائج نفاق ہیں یہ خون کی بہتی ندیاں
لہو کا انعکاس ہے جو چھا رہی ہیں سرخیاں
زمینِ خونِ بیکساں سے آج لالہ زار ہے
غرض کہ دہر میں عجیب دورِ انتشار ہے

(۵)

بکھیر دو فضا میں بڑھ کے امن کے لطیف گیت
جو شر پسند ہیں انھیں بتاؤ زندگی کی ریت
گلے لگاؤ غمزدوں کو اصل میں یہی ہے جیت
اٹھو کہ وقتِ خیر ہے کہیں یہ رُت نہ جائے بیت
اِک انقلابِ نو کا پھر جہاں کو انتظار ہے
سکون اور سلامتی کا جس پہ انحصار ہے

احمد حسین انصاری

بجھے دیئے

کردار : ———

خان بہادر نعیم الدین ——— ایک معمر رئیس جو اپنی ریاست گنوا کر مفلس ہو چکا ہے۔

کلیم کی ماں ——— خان بہادر کی ماں

کلیم ——— خان بہادر کا اکلوتا بیٹا جسے خان بہادر نے اپنی ہڈیاں بیچ کر پڑھایا۔

نصرت ——— خان بہادر کی چھوٹی لڑکی جو شبنم کے نام سے فلمی دنیا میں ستارا بن کر چکی۔

خالد ——— ایک تعلیم یافتہ نوجوان جس نے افلاس کی گود میں پرورش پائی اور جسے سرمایہ دارانہ نظام کو بدلنے کی خواہش ہے۔

فیروز ——— ایک رئیس زادی۔ کلیم اور خالد کی کلاس فیلو۔ کسی مضبوط سہارے کی متلاشی

اس کے علاوہ کئی ایک بھکاری، اور دوسرے نوجوان، ڈاکٹر ———

منظر اوّل ——— ایک اوسط درجہ کا کمرہ

(یہ ایک اوسط درجہ کا کمرہ ہے جس کی ساری زیبائشیں مفلسی کی نذر ہو چکی ہیں، سامنے دریچوں میں پردے تک نہیں رہ گئے، دریچہ سے ہٹ کر کونہ کے قریب ایک چار پائی پر ایک بوڑھا بیٹھا کھانس رہا ہے، یہ خان بہادر نعیم الدین ہیں)

خان بہادر ——— کلیم کی ماں ——— دریچوں سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔ ذرا پردے تو سرکا دینا۔

کلیم کی ماں : ——— پردے سرکا دوں۔؟ مگر دریچوں میں پردے ہیں کہاں۔ مال و دولت کے بعد شاید اب عقل بھی کھو بیٹھے ہو؟

خان بہادر : ——— تم ٹھیک کہتی ہو ——— بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب تو ہوش و حواس بھی ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز بے وفائی پر آمادہ ہے ——— تم یہ پھٹے کپڑے کیوں لے بیٹھیں۔

کلیم کی ماں : ——— تمہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے تکلیف ہوتی ہے۔ سوچتی ہوں دریچوں کے لئے پردے ہی سی لوں (اور پھر سینے میں مشغول ہو جاتی ہے)

خان بہادر : ——— زندگی کا صاف و شفاف چشمہ ان جھاڑیوں سے بھی گزرے گا؟ کسے خبر تھی ———

کلیم کی ماں ـــــــ اوف ـــــ آہ ـــــ (سُوئی اُنگلی میں چبھ جاتی ہے)

خان بہادر ـــــــ کیا ہوا بابا۔ ؟ سُوئی چبھ گئی ـــــ کہتا ہوں یہ سب کھڑاگ رہنے دو۔ لیکن تم کب سننے والی ہو۔ رہنے دو پردے وردے۔ مجھے ٹھنڈی ہوائیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ (وقفہ) دریچوں کے شیشے اکم بخت کچھ دن اور نہ ٹوٹتے ـــــ میں نے خادمہ کو جواب دے کر بہت برا کیا۔ اس بڑھاپے میں تمہیں یہ دُکھ اُٹھانا پڑ رہا ہے،

کلیم کی ماں : ـــــ نہیں نہیں۔ وہ تو اچھا ہی ہوا۔ جس طرح اس گھر کے در و دیوار کا کھوکھلا پن چونے کی سفیدی میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ہے تم سمجھتے ہو اسی طرح خادمائیں اور نوکر ہماری مفلسی کے کوڑھ کو چھپائیں گے ـــــ بھوک اور افلاس نے ہمارا سارا کس بل نکال لیا ہے۔ لیکن دُنیا کے سامنے تن کر جانے کی آرزو اب بھی جاگ رہی ہے۔ چراغِ سحری بھڑک رہا ہے ـــــ تیل تو ختم ہو چکا ہے۔ بتی آگ سانے سے کیا ہوگا ـــــ (وقفہ) زندگی کا یہ تلخاب اب حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ موہوم امیدوں پر کوئی کب تک جیئے ـــــ

خان بہادر ـــــ کلیم کی ماں۔ تمہاری باتوں سے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے بعض وقت تم اتنی مایوس کیوں ہو جاتی ہو؟ ہم مر بھی گئے تو کیا ہماری رُوح یہ سُن کر خوش نہ ہوگی کہ ہمارا کلیم بڑا آدمی ہو گیا ہے۔

کلیم کی ماں : ـــــ بڑا آدمی ـــــ ؟ ہی ہی ہی (زہر خند)

خان بہادر : ـــــ تم میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتیں کلیم کی ماں ـــــ جب سوچتا ہوں چھ ماہ بعد میرا کلیم پڑھ کر آ جائے گا اور پھر اُسے ایک اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ اور پھر ـ اور پھر کلیم کی ماں ـــــ (کھانسی کا دورہ پڑ جاتا ہے)

کلیم کی ماں : ـــــ ارے تم خاموش رہو! بولنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ میں نے کہا خدا کھانسی رک جانے دو بابا۔ (بوڑھا کھانستے کھانستے بیدم ہو جاتا ہے) ـــــ (سکوت)

خان بہادر : ـــــ (قدرے سکون کے بعد) کلیم کی ماں ـــــ

کلیم کی ماں : ـــــ پھر کوئی نئی بات سوجھی تمہیں ـــــ

خان بہادر : ـــــ نہیں بابا نہیں۔ تم تو میری زبان بند کرنا چاہتی ہو!

کلیم کی ماں : ـــــ مجھے کیا ہے تم تقریریں کرو ـــــ ابھی کھانستے کھانستے بیدم ہو چکے ہو! ـــــ (وقفہ ـ خاموشی)

خان بہادر : ـــــ کلیم کی ماں۔ تم خفا ہو گئیں ـــــ ارے بابا میری باتوں کا بُرا مت مانا کرو ـــــ (سکوت) ہم نے صوفیہ اور نزہت کی شادی میں کتنا خرچ کیا تھا ـــــ ؟

کلیم کی ماں : ـــــ یہی کوئی بارہ ہزار ـــــ لیکن اب ان باتوں کو یاد کرنے سے حاصل ؟

خان بہادر : ـــــ بارہ ہزار ـــــ (ٹھنڈی سانس) سوچتا ہوں۔ اپنی نصرت کے لئے تو بارہ سو بھی نہیں ـــــ

کلیم کی ماں : ـــــ پہلے یہ تو سوچو ہم غریبوں کی لڑکی کو پُوچھے گا کون ـــــ

خان بہادر : ـــــ (ان سنی کر کے) اچھا ہوا کلیم کی ماں صوفیہ مر گئی ـــــ بڑا دکھ تھا بے چاری کو ـــــ یاد کرتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے ـــــ

کلیم کی ماں : ـــــ اور نزہت ہی کون سے سکھ میں ہے۔ بدنصیب لڑکی ـــــ میں سوچتی ہوں آخر یہ لڑکیاں پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں ؟

(باہر سے نصرت کے گنگنانے کی آواز آتی ہے)

یہ بے کسی کا عالم یہ بے بسی کی دُنیا
دل جل رہا ہے پھر بھی ہم مسکرا رہے ہیں

خان بہادر : ـــــ کلیم کی ماں ـــــ یہ نصرت ہے؟ اِسے کہو ایسے شعر نہ پڑھا کرے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ (نصرت داخل ہوتی ہے) نصرت بیٹا ـــــ یہ شعر کون پڑھ رہا تھا ـــــ اچھے نہیں ہوتے ایسے شعر ـــــ

نصرت : ـــــ بھائی جان کا خط آیا ہے ابّا جان ـــــ

خان بہادر : ـــــ لا بیٹی لا۔ دیکھوں تو سہی کیا لکھا ہے۔ (خط لیکر بیتاب اُنگلیوں سے چاک کرتا ہے) ـــــ (سکوت) سُنا تم نے کلیم کی ماں ـــــ صاحبزادے اور روپیہ مانگتے ہیں۔ لکھتے ہیں میری تعلیم ادھوری رہ گئی تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ (سوچنے لگتا ہے) لیکن اب تو کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ کلیم کی ماں ـــــ

(کلیم کی ماں ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر خاموش رہ جاتی ہے)

خان بہادر : ـــــ (مستقبل کی خوشی کا اندازہ کر کے چہرہ چمک اُٹھتا ہے) میں سوچتا ہوں کلیم کی ماں آج لالہ جی سے گھر کا سودا کر ہی لوں۔ دیکھوں اور کتنا دیتے ہیں۔ وہ پڑھ جائے گا تو بہت سے گھر ہو جائیں گے۔ اس کی تعلیم ادھوری نہ رہ سکے گی۔ میں اپنی بوڑھی ہڈیاں بیچ کر اُسے پڑھاؤں گا۔ تب اُسے روپیہ بھیجوں گا ـــــ

کلیم کی ماں : ـــــ آں ـــــ ؟ (سراپا سوال بنکر رہ جاتی ہے)

دوسرا منظر ——— ایک معمولی سی کوٹھری

(کوٹھری میں بالکل سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے پڑوس کے اونچے مکان سے مسلسل قہقہوں کی آواز آ رہی ہے۔ ایک طرف کلیم کی ماں پڑی دم توڑ رہی ہے۔ اس کے قریب ہی نصرت بیٹھی ہوئی ہے۔)

کلیم کی ماں: ——— نصرت!

نصرت: ——— کیا ہے ماں؟

کلیم کی ماں: ——— کلیم نہیں آیا بیٹی۔؟

نصرت: ——— نہیں ماں۔ وہ تو صبح سے نوکری کی تلاش میں گئے ہیں۔

کلیم کی ماں: ——— نوکری کی تلاش میں گیا ہے۔؟ آہ ——— (ٹھنڈی سانس) نوکری کا خواب دیکھتے دیکھتے بدنصیب باپ مر گیا۔ اور اُسے نوکری نہ ملی۔

نصرت: ——— ماں تم بہت کمزور ہو تمہیں زیادہ نہ بولنا چاہئے۔

کلیم کی ماں: ——— (جیسے سنا ہی نہ ہو) بدنصیب ہماری آتو داؤں پر داؤں لگاتا گیا اور تیری بازی گرتی ہی گئی۔ تیری آرزوؤں کے خوش نما محل مو کی ایک ٹھوکر سے پاش پاش ہو گئے۔ نصرت سانس رُک رہی ہے۔ ذرا پانی تو دے بیٹی ———

نصرت: ——— بہت اچھا ماں ——— (پانی دیتی ہے) نزہت آپا کو تار دلوا دوں ماں؟ تمہاری طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔

کلیم کی ماں: ——— نہیں نہیں بیٹا۔ میں تو اچھی ہوں ——— میں بہت اچھی ہوں بیٹی ——— (وقفہ، خاموشی۔) ارے بابا آج سانس کیوں رُک رُک کر چل رہی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے ہوں جیسے ———

نصرت: ——— کہتی ہوں زیادہ نہ بولو۔ ماں تم بہت کمزور ہو!

کلیم کی ماں: ——— ہاں ہاں اب نہ بولوں گی ——— اب نہ بولوں گی بیٹی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ چراغ گُل ہو گیا کیا؟

نصرت: ——— جل تو رہا ہے ماں ——— ہوا کے تھپیڑوں سے تو تھرتھرا رہی ہے ———

کلیم کی ماں: ——— کھڑکی بند کر دو ——— کون ہنس رہا ہے۔ بڑی بھیانک ہے یہ ہنسی۔ کھڑکی بند کر دو۔ چراغ بجھ رہا ہے۔ (نصرت کھڑکی بند کر دیتی ہے) ادھر آ میری بیٹی۔ کلیم ابھی تک نہیں آیا۔ تو اکیلی ہے۔ میرا دل اس تصور ہی سے کانپ جاتا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے بیٹی میں تیرا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دوں۔ —؟ تم آ گئے ہو سنو! آج تمہارا کلیم نوکر ہو گیا۔ ہنسو! ہنسو! تم خاموش کیوں ہو؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تم تو مرد ہو! میں کمزور عورت! اکیلی اس آندھی کے سامنے کھڑی ہوں میرا ہاتھ پکڑ لو! مجھے سہارا دو! مجھے ڈر لگ رہا ہے!

نصرت: ——— ماں ———

کلیم کی ماں: ——— بیٹی ——— اندھیرا پھر بڑھ رہا ہے۔ (سانس ایک جھٹکے کے ساتھ رُک جاتی ہے)

نصرت: ——— ماں ——— ماں ——— ماں ——— ماں ——— (اور پھر چیخ مار کر رونے لگتی ہے۔ پڑوس کے قہقہے اور تلخ ہو جاتے ہیں)

(کلیم داخل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی)

کلیم: ——— ماں ——— ماں ——— میں تیرے لئے ڈاکٹر لایا ہوں۔ ماں تم بولتی کیوں نہیں۔؟ مجھے نوکری مل گئی ماں۔ (جھنجھوڑتا ہے۔) ماں ———

نصرت: ——— اب آئے ہیں آپ بھائی جان ——— (جیسے طوفان تھم گیا ہو!) ماں تمہارا انتظار کرتے کرتے سو گئی ——— بھیا انہیں نیند آ گئی۔ برسوں کا تھکا ہوا مسافر تھا زندگی بیچ کر سویا ہے)

کلیم: ——— (ڈاکٹر کی طرف مڑ کر) ڈاکٹر ——— آپ جا سکتے ہیں۔ میری ماں کو آپ کی امداد کی ضرورت نہیں ——— شکریہ ———

ڈاکٹر: ——— لیکن میری فیس؟ ———

کلیم: ——— فیس؟ ——— تمہیں فیس چاہئے؟ میری ماں مر گئی ہے۔ اور تمہیں فیس چاہئے۔ یہ رہی تمہاری فیس۔ تم اِسے لیتے جاؤ۔ (ماں کی لاش کی طرف اشارہ کرتا ہے)

ڈاکٹر: ——— لاش ———؟ تمہاری ماں کی لاش۔؟ مگر مجھے روپیہ چاہئے۔ لاش نہیں۔

کلیم: ——— تم نے ٹھیک کہا۔ تمہیں روپیہ چاہئے۔ ہر انسان کو روپیہ چاہئے۔ روپیہ چاہئے۔ یہ لو۔ لے جاؤ۔ لے جاؤ۔ (جیب سے بہت سے روپیہ نکال کر پھینک دیتا ہے) ———

ڈاکٹر: ——— تھینک یو مسٹر کلیم ——— (روپئے اٹھا لیتا ہے) مجھے تم سے ہمدردی ہے۔

کلیم: ——— ہمدردی ہے؟ لٹیرے۔ ٹھہر تو جا! میں تجھ سے ایک سے انتقام

لوں گا ——— ایک ایک (لفظ ایک پر زور) سے انتقام لوں گا
میں بھی تم ہی جیسا ایک لیٹرا ہوں۔ نصرت میں بھی ایک لیٹرا ہوں۔
یہ دنیا لیٹروں سے بھری ہوئی ہے ——— میں ڈاکے ڈالوں گا، قتل
کروں گا۔ مجھے دولت چاہیئے۔ میں بھی دنیا والوں کا اَن داتا
بنوں گا۔ سوسائٹی اور اس کے ایک ایک فرد سے مجھے انتقام لینا
ہے۔ میں اس دنیا کو اُلٹ دوں گا۔ ظالم میرے آنسوؤں سے
کھیلتا ہے ——— نصرت یہ روپئے اُٹھا لے۔ یہ بڑے کام
کی چیز ہیں۔ زندگی۔ اور اس کی ساری لذتیں۔ میٹھے میٹھے سپنوں
کی خوش آیند تعبیریں! ان سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے ———
یہ کاغذ کے ٹکڑے ——— میں نے اپنا ضمیر بیچ کر ان کو خریدا ہے۔ میں
نے اپنے آپ کو کھو کر ان کو پایا ہے۔

نصرت: ——— لیکن بھائی جان نوکری سے پہلے ہی تنخواہ مل گئی۔

کلیم: ——— ہاں ——— نوکری سے پہلے ہی ——— آج میں
نے اس حرامزادے کا پرس اڑایا ہے۔ ہمارے ہی پیسوں سے مہاجن
بنا پھرتا ہے کم بخت۔

نصرت: ——— تم نے جیب کاٹی؟ (تعجب) یہ تم نے بہت برا کیا۔ آدمی کو اتنا
ذلیل نہ ہونا چاہیئے۔

کلیم: ——— قاہ ——— قاہ ——— قاہ ——— (زہر خند) بیوقوف۔ کیسی عزت!
کہاں کی شرافت۔ جیب میں پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب
باتیں پیٹ بھرنے کے بعد کی ہیں ——— ———
نصرت بہن! جو زخم سوسائٹی کے ہاتھوں ہمیں پہونچا ہے وہ کوئی
معمولی زخم نہیں۔ مجھے اس زخم کو بھرنا ہے۔ تم میرا ساتھ دو۔ میں
اُن آنکھوں کو رُلا کر چھوڑوں گا جو ہمیں روتا دیکھ کر نم ناک بھی نہیں
ہوتیں ——— یہ قہقہے ——— ! ——— یہ قہقہے میرا منہ چڑا رہے ہیں۔ میں
اِن قہقہوں کو بند کر کے چھوڑوں گا ——— ماں ———
میری ماں ——— ——— (لاش کے قریب بیٹھ جاتا ہے) مجھے
نوکری مل گئی ہے ——— آہ تیری یہ پھٹی ہوئی آنکھیں ———
اب بھی ان آنکھوں میں دنیا سے جینے کی حسرت جھلک رہی ہے۔
مجھے دعا دے ——— میری ماں ——— اپنا دست دعا اٹھا تو پھیر دے کہ مجھ
میں طاقت آ جائے۔ میرے قدم ڈگمگا نہ سکیں۔
ماں ——— [illegible] انتقام [illegible] قوت [illegible] کی

بھیگ مانگتی ہے ———
نصرت! ——— (کچھ سوچ کر) اس گندی کوٹھری سے مجھے
وحشت ہوتی ہے۔ میں اس متعفن زندگی کو جلد ہی بھول جانا
چاہتا ہوں۔ یہ کوٹھری ہی نہیں۔ میں اس شہر کو بھی چھوڑ دینا
چاہتا ہوں۔ نصرت! چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔

نصرت: ——— اور ماں کی لاش؟ ———

کلیم: ——— اِسے یہیں رہنے دو ——— اب اس میں کیا رکھا ہے۔
اسے یہیں رہنے دو تاکہ اس کی بدبو سے ان بھیانک قہقہوں کا
دماغ بھی تو پراگندہ ہو۔ یہ تحفہ ہے ہم مظلوموں کی طرف سے اس
سوسائٹی کے لئے جس نے ہمارے آنسوؤں پر اپنے قہقہوں کی
بنیاد رکھی (ہاتھ پکڑ کر نصرت کو گھسیٹتا ہے)

نصرت: ——— ماں ——— ماں ——— تم اکیلی کیسے رہ سکوگی۔ ماں ———

خالد: ——— (ایک نوجوان جو باہر سے گفتگو سن رہا تھا)
تمہیں کیا ہو گیا ہے بھائی ——— ماں کی لاش چھوڑ کر کہاں بھاگے
جا رہے ہو؟ اس کا مطلب یہ ہے تم نے ماحول سے اپنی شکست
تسلیم کر لی ——— اور جانتے ہو شکست کا احساس ہی غضب ہے
اب تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں ———

کلیم: ——— مگر تم کون ہو؟ ——— کیوں تم نے میرا راستہ روک
رکھا ہے۔

خالد: ——— میں تو ایک دیوانہ ہوں ——— مگر میرے نزدیک زندگی
کے معنی فرار نہیں ہیں۔ زندگی سے فرار ——— ایک اٹل حقیقت
سے فرار ——— اگر وقت کا دھارا میرے مخالف سمت بہتا ہے تو
میں اس کا رُخ موڑ دوں گا ——— میری نظروں میں تم سے زیادہ
اس بُوڑھی کی عزت ہے جس نے ابھی ابھی دم توڑا ہے ———
اور جو عورت ہو کر بھی آخر دم تک زندگی اور اس کی تلخیوں سے
مردانہ وار لڑتی رہی ——— آؤ میں تمہیں دکھاؤں ———
وہ میری ماں ہے جیسے تمہاری ——— یہ دیکھو (اندر پہونچ کر)
اِس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے نشان ہیں۔ اور تمہاری
آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں۔ مرد ہو کر تم رو رہے ہو [illegible]
آنسو کمزوری کی دلیل ہیں ——— یہ تمہاری ماں ہے ———
اس کی آخری منزل تو بنا دو ——— تم اب تک [illegible]

سکے میں تمہارا کالج کا ساتھی۔ مفلس دوست خالد ہوں ———

کلیم: ——— اوہ ——— خالد بھائی ——— میں پہچان گیا۔ ——— خالد ——— (لپٹ کر رونے لگتا ہے) تم نے میری مصیبتیں نہیں دیکھیں ———

خالد: ——— میں جانتا ہوں بھائی ———

کلیم: ——— اور اسی لئے مجھے اس گندی کوٹھری سے نفرت ہے۔

خالد: ——— اور مجھے اس کوٹھری سے محبت ہے ——— یہ مجھے اس لئے یاد رہے گی کہ اس نے ان مظلوموں کو پناہ دی جو اپنے عالی شان محل زندگی کی بازی پر ہار بیٹھے ——— آؤ ہم عہد کریں کہ ہم اس کوٹھری کو سر بفلک محل میں تبدیل کر کے رہیں گے ———

کلیم: ——— میں سمجھ گیا ——— تم یہ باتیں صرف اس لئے کر رہے ہو کہ تمہاری جیب میں پیسہ ہے۔ تمہارا پیٹ بھرا ہوا ہے ———

خالد: ——— میری جیب میں پیسہ ہے ——— ؟ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ ——— ؟ تم نے اس زخم کو کرید ہی ڈالا ——— بھائی میں تو ایک مفلوک الحال پریشان دیوانہ ہوں۔ تمہیں یقین آئے گا یہ تیسرا وقت فاقہ سے جا رہا ہے۔ مگر یہ فاقے میری ہمت نہیں توڑ سکتے ——— میری آنکھیں خشک ہیں تو تم سمجھتے ہو کہ ان میں آنسو ہی نہیں ——— یہ خوش ہیں۔ ہونہہ خوشی ؟ ——— خوشی تو اس سرمایہ دارانہ نظام میں عنقا ہے میرے بھائی ——— تم میرا منہ تک رہے ہو ؟ ——— میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ تم چاہو تو جا سکتے ہو ! میں اپنی ماں کے کفن دفن کا انتظام کر رہا ہوں ———

کلیم: ——— میں نہ جاؤں گا۔ میں نہ جا سکوں گا ——— ماں میں تجھے اس حالت میں چھوڑ کر نہ جا سکوں گا ——— ماں ——— (رونے لگتا ہے)

خالد: ——— نہیں، رویا نہیں کرتے ——— صبر کرو ——— ہم چاہیں یا نہ چاہیں زندگی کا انجام موت ہی ہے۔ اور یہ موت ——— ؟ سچ پوچھو تو یہ ایک ابدی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ ——— (سکوت) میں ذرا کپڑے وغیرہ کا انتظام کر لوں ——— (چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

(یہ ایک اعلیٰ درجہ کا ہال کمرہ ہے۔ جو تمام تر امیرانہ ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ دروازوں، دریچوں پر ریشمی پردے سرسرا رہے ہیں دیواروں سے ملی ہوئی خوبصورت الماریاں لگی ہوئی ہیں۔ جن میں خوش نما جلدوں کی کتابیں سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ شمالی جانب پیانو رکھا ہوا ہے۔ اور پیانو پر ایک حسین گلدان ہے جس میں نرگس کے پھول لگے ہوئے ہیں۔ آتش دان کے قریب ریڈیو سیٹ رکھا ہوا ہے۔ بیچ میں عین دریچوں کے سامنے حسین صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ باہر سے موٹر رکنے کی آواز آتی ہے ——— اور پھر ایک نوجوان لڑکی اور اس کے ساتھ کلیم داخل ہوتے ہیں۔)

لڑکی: ——— اس غیر متوقع ملاقات سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ——— اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی آپ اتنے دور رہیں گے۔ اس کا مجھے گمان تک نہ تھا ——— اوہ ! آپ کھڑے ہیں تشریف رکھئے ——— دراصل اس وقت مجھے کالج کی رومان پرور فضائیں یاد آ رہی ہیں۔ ان فضاؤں میں زندگی کتنی تیزی سے گذرتی ہے۔ ——— اور آج ——— ! جیسے بند باندھ کر زندگی کی یہ روانی روک دی گئی ہو ! ——— اور اب تو بعض وقت مجھے یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ جیسے وقت کا دھارا بہتے بہتے رک گیا ہے ———

کلیم: ——— مس فیروز ——— یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جوان تھا ——— والد صاحب اور پھر ان کے بعد والدہ کی نامراد موت ——— ان مسلسل کاہشوں نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے آج میرے سامنے زندگی ایک نئے سوانگ میں آئی ہے ——— وہ سنہرے خواب جو میں برسوں جاگنے کی حالت میں دیکھتا رہا ایک ایک کر کے چکنا چور ہو گئے۔ اور ان خوابوں سے چونکتے ہی زندگی اپنی پوری تلخیوں کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے گرد و پیش اِدھر اُدھر نظریں ڈالیں۔ ہر طرف سسکتی ہوئی زندہ لاشیں تھیں۔ لوٹ مار کا ایک بازار تھا جو اپنے پورے شباب پر تھا۔ مظلوم و

مقہور مزدوروں کے زخمی شانوں پر سنہرے تخت تھے جن پر بیٹھ کر
ظالم سرمایہ دار انہیں مظلوموں پر حکومت کر رہے تھے۔ میں یہ نہ
برداشت کر سکا۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ (کسی بھکاری
کے بھیک مانگنے کی آواز آتی ہے "خدا تمہارا بھلا کرے بیٹا بابا
ایک پیسہ دیتے جاؤ") سنا تم نے مس فیروز۔ یہ آوازیں بند
کیوں نہیں ہو جاتیں ——— کم بخت مر کیوں نہیں جاتے سب کے
سب ———
(اٹھ کر دریچے کے قریب آ جاتا ہے اور اس کے پیچھے فیروز بھی)
اے بھک منگے ——— من کے اندھے۔ سنتا ہے ——

بھکاری: ——— کیا ہے بابا ——— رام بھلا کرے۔
ایک پیسہ ———

کلیم: ——— ہزار بار سمجھایا کم بختو! بھیک کیوں مانگتے رہو؟ یہ بڑے بڑے
سیٹھ ساہوکار! یہ سب تمہارا ہی حق مار کر تو بڑے آدمی بنے ہیں
تم اِن سے اپنا حق چھین کیوں نہیں لیتے۔

بھکاری: ——— آں بابو؟ ———

کلیم: ——— گدھا ——— چلے جاؤ یہاں سے ———
وہ دیکھو وہ! موٹر کار ——— وہ جا رہی ہے۔ جاؤ
اُسے لوٹ لو ——— تُڑ دو ——— تمہیں جینے کا بھی
حق نہیں اور وہ لوگ موٹروں پر گھومتے پھرتے ہیں ———

فیروز: ——— تو آج کل یہ ہو رہا ہے ———

کلیم: ——— یہ ——— اور اس جیسے لاکھوں انسان ——— صدیوں سے
روندی ہوئی زندگی گذار رہے ہیں یہ صرف اس لئے جیتے ہیں کہ
انہیں موت نہیں آتی ——— وقت آگیا ہے مس فیروز کہ یہ کچلے
ہوئے لوگ سوسائٹی سے اپنا انتقام لیں ———

فیروز: ——— مگر انہیں تشدد کی تعلیم دینا یہ کہاں کی دانائی ہے ———

کلیم: ——— تشدد ——— فیروز یہ بحث تلخ ہے۔ تم نے ہمیشہ
زندگی کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن اس کا روتا ہوا بھیانک
چہرہ! تم کیا جانو اس چہرہ پر کتنے داغ ہیں۔ تم میری آنکھوں
کو دیکھو۔ یہ اتنا روئی ہیں کہ ان میں اب ایک آنسو بھی نہیں رہ
گیا۔ مگر حوادثات زمانہ نے مجھ میں ایک نئی قوت بھر دی ہے۔ تم
اسے بغاوت کہہ سکتی ہو۔ تمہاری یہ شاندار کوٹھی۔ یہ صوفے۔
یہ پیانو، اور تجوریوں میں بھرا ہوا لاکھوں روپیہ اور صرف تم اکیلی۔
——— اکیلے آدمی کو اتنی بہت سی چیزوں کا کیا حق ہے۔
وہ دیکھو سامنے فٹ پاتھ پر ——— معلوم نہیں کتنے انسان
اِن پر رات گذارتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں ———
تمہارے لئے تو صرف ایک کمرہ کافی ہے۔ مگر آج تک تم اِن غریبوں سے
یہ نہ کہہ سکیں کہ بدنصیبو! اس یخ بستہ سردی میں کوئی رات اس
شاندار کوٹھی میں بھی گذار لو ——— پھر اگر میں اُن سے کہتا ہوں کہ
اِن کوٹھیوں کو لوٹ لو۔ ان موٹروں میں آگ لگا دو۔ تو کیا بُرا کرتا
ہوں۔

فیروز: ——— مسٹر کلیم ——— مجھے آپ سے ہمدردی ہے، مجھے افسوس
ہے آپ نے اپنے مصیبت کے دنوں میں مجھے کیوں نہ یاد کیا ———
میں اتنی غیر تو نہ تھی ——— لیکن بہر حال اب جبکہ میں بالکل
اکیلی ہوں مجھے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ اگر میں آپ سے یہ اُمید
کروں کہ آپ میرا ساتھ دیں گے تو میں سمجھتی ہوں کہ کچھ بے جا نہ ہوگا
نصرت بہن کو بھی یہیں لے آیئے ——— یہ گھر بھی تو آپ ہی
کا ہے ———

کلیم: ——— مگر میں بھیک کے ٹکڑوں پر زندگی نہیں گذارنا چاہتا ———

فیروز: ——— ایک مخلص دوست کی پیشکش کو آپ نے بھیک سمجھا۔
اس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔ آپ چاہتے تو یُوں بھی سمجھ سکتے
تھے کہ مجھے ایک نگراں کار کی خدمات کی ضرورت تھی ———
اور خدمات کا معاوضہ ———

کلیم: ——— مگر میں اتنی سستی قیمت پر نہیں بک سکتا ———

فیروز: ——— آپ سے کون جیت سکتا ہے۔ خیر آپ کی مرضی نہیں تو
میں جبر نہیں کر سکتی ——— لیکن آپ کو کھو کر میں عمر بھر پچھتاؤں گی
——— اوہ میں بھی کتنی خود غرض ہوں آپ کے لئے
چائے کا انتظام بھی نہ کر سکی ——— آپ ذرا تشریف رکھئے
میں خادمہ کو ہدایات دے کر حاضر ہوتی ہوں۔

(فیروز اُٹھ کر چلی جاتی ہے ——— اس کا بیگ صوفہ پر ہی پڑا رہ جاتا
ہے کلیم اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے ——— پھر بیگ کھولتا ہے ———
اس میں نوٹوں کی کئی گڈیاں رکھی نظر آتی ہیں ——— کلیم
الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔)

کلیم: ——— بیس ہزار ——— پورے بیس ہزار ——— اور یہاں بیس کوڑی بھی نہیں ———

(باہر سے کسی بھکاری کی آواز آتی ہے "ایک پیسہ بابو ——— ایک پیسہ بابو")

(کلیم نوٹ نکال کر جیبوں میں ٹھونس لیتا ہے۔ اور بیگ کھلا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے)

(——— سکوت ———)

(اور پھر فیروز اور اس کے پیچھے ایک خادمہ چائے لئے داخل ہوتی ہے)

فیروز: ——— مسٹر کلیم ——— اوہ آپ جا چکے ہیں؟ ——— نرگس !تم جاؤ ——— آخر تم چلے ہی گئے۔ ضدی ——— میرا بیگ ! (استعجاب) یہ تو کھلا پڑا ہے ——— ارے بالکل خالی ——— اور روپئے ——— مسٹر کلیم ——— آپ اتنے گر سکتے ہیں ——— صرف بیس ہزار روپئے ——— (اور وہ صوفے پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے) ——— کروڑوں انسانوں سے بھری ہوئی اس وسیع دنیا میں مجھے صرف ایک دوست کی تلاش ہے ——— ایک اچھے ساتھی کی۔ کسے خبر تھی کہ ہماری تہذیب اتنی بانجھ ہو جائے گی کہ ایک کمزور عورت کو ایک اچھا سہارا بھی نہ دے سکے گی ——— زندگی کو حسین اور پُر مسرت بنانے والی ہر چیز مجھے میسر ہے۔ اور شاید لوگ اسی لئے سمجھتے ہیں کہ میں خوش ہوں ——— لیکن انہیں کون بتائے کہ خوشی تو ان سب چیزوں سے بلند کوئی اور ہی شے ہے۔ اور اگر خوش رہنا اپنے بس میں ہوتا تو دنیا میں آنسو کا لفظ کوئی نہ جانتا ———

(اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے اور پھر دریچے کے پاس کھڑی ہو کر بازار کی چہل پہل میں کھو جاتی ہے)

فیروز: ——— یہ کون ہے۔ ؟ کون ہو سکتا ہے یہ ؟ کیا خالد ———؟ ضرور ——— نرگس ——— نرگس ———

آواز: ——— حاضر ہوئی بی بی ———

فیروز: ——— کہاں ہو تم ؟ جلد ہی آؤ ———

نرگس: ——— خیر تو ہے بی بی ———

فیروز: ——— دیکھو سڑک پر ——— یہ آدمی جو جا رہا ہے۔ نوکر سے کہو اسے بلا لائے۔ جلد جاؤ۔

نرگس: ——— بہت اچھا بی بی ——— (چلی جاتی ہے)

(فیروز بیتابی سے ٹہل رہی ہے لیکن نظریں اسی جانے والے پر لگی ہوئی ہیں۔ قدرے سکوت اور پھر دروازہ کے قریب کھڑی ہو جاتی ہے۔ سامنے خالد آ رہا ہے)

فیروز: ——— آخر پکڑ ہی لیا نا مسٹر خالد ——— چوروں کی طرح یوں چھپے چھپے رہنا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کہئے کہاں رہے اتنے دنوں ———؟

خالد: ——— اوہ مس فیروز ——— ابھی آپ کی مغربیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ——— یوں کھلے بندوں گھومنا پھرنا مجھے اچھا نہیں لگتا ——— پردہ سے باہر ہو کر عورت کی نسوانیت مجروح ہو جاتی ہے)

فیروز: ——— اوہ۔ زندہ باد مولوی ——— میں سمجھی تھی آپ کا جنون اُتر گیا ہوگا۔

خالد: ——— جنون ؟ ——— یہ جنون اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا ———

فیروز: ——— ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ بہت اچھے۔ لیکن آپ دور کیوں کھڑے ہیں۔ اندر تشریف لائیے ——— مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

خالد: ——— میں جانتا ہوں آپ کیا باتیں کریں گی ——— وہی عورت کے حقوق و آزادی کی بات ——— (اندر جا کر بیٹھ جاتا ہے) آپ سوچتی ہوں گی یہ کیسا تاریک خیال مولوی ہے۔ جو اس بیسویں صدی میں بھی عورت کو غلام رکھنا چاہتا ہے۔ مگر سچ فرمائیے گا موجودہ سوسائٹی نے عورت کو جو آزادی دی ہے کیا حقیقتاً وہ آزادی ہے۔ بازاروں اور کلبوں میں دوستوں کے ساتھ بے پردہ گھومنا۔ مردوں کے دوش بدوش کارخانوں دفتروں میں کام کرنا ——— یہ آزادی ہے ؟ ——— یہی مساوات ہے ؟ میں اسے آزادی نہیں سمجھتا ——— کوئی سمجھدار آدمی اسے آزادی نہیں کہہ سکتا ——— مردوں نے گھر، بازار، دفتر، کلب، ہر جگہ اپنے تھکے ہوئے دماغ اور ہاتھ پاؤں کے لئے تفریح کے سامان مہیا کر لئے ہیں۔ اور بس پہلے جو رونق خانہ تھی اب اسے رونق محفل بنا دیا گیا ہے۔ شمع کو بھری بزم میں لا کر اس کے گرد ہزاروں بیتاب پروانے چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ قریب جلتی رہے اور یہ دانوں کے لئے

لذت اندوزی کا سامان مہیا کرتی رہے۔ پھول کو بھونروں کے ہجوم میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ رس کے لوبھی بھونرے اس کا رس چوس چوس کر اُسے پژمردہ کر دیں۔ معاف کیجئے گا۔ مس فیروز میں کچھ آگے بڑھ گیا۔

فیروز: ــــ اوہ کوئی بات نہیں ــــ یہ تو ایک تلخ حقیقت ہے جس کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں۔
نرگس چائے لے آؤ آپ کے لئے ــــ

خالد: ــــ مگر میں اتنا نہ رک سکوں گا۔ مجھے اور بھی کام ہیں ــــ

فیروز: ــــ اتنے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ ابھی بیٹھے بھی نہیں کہ جانے کی بات چھیڑ دی۔ یہ بھی تو گھر ہے۔

خالد: ــــ آپ نے سچ کہا یہ بھی تو گھر ہے ــــ اور میں بھی تو آدمی ہوں۔ (باہر سے کسی بھکاری کی صدا آتی ہے۔ خدا تمہارا بھلا کرے ایک پیسہ دیتے جاؤ بابا) اور یہ بھی آدمی ہے۔ اس غریب کو رہنے کے لئے جھونپڑی بھی میسر نہیں۔ اور مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ محلوں میں آرام کرو۔ آدمی آدمی میں کتنا فرق ہو گیا ہے مس فیروز (یک لخت گفتگو کا رخ موڑ کر) آپ نے کتنے غریبوں کی پرورش اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔

فیروز: ــــ میں سمجھی نہیں ــــ

خالد: ــــ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اس دولت کی مالک ہیں۔؟ یہاں کوئی کسی چیز کا مالک و مختار نہیں۔ وہ تو صرف امین ہے ــــ خدا نے یہ امانت اس کے سپرد اس لئے کی ہے کہ وہ اس کے غریب بندوں کی پرورش اور خبر گیری کرے ــــ

فیروز: ــــ کچھ دیر پہلے مسٹر کلیم یہاں سے گئے ہیں ــــ

خالد: ــــ کلیم ــــ؟

فیروز: ــــ جی ہاں کلیم ــــ مگر وہ ان غریبوں سے کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کی موٹروں میں آگ لگا دو ــــ ان کی کوٹھیوں کو لوٹ لو ــــ

خالد: ــــ یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ــــ یہ تو بالکل ایسا ہی ہوا کہ ایک برائی کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری برائی رکھ دی گئی ــــ مس فیروز ــــ آپ کی دولت میں ان غریبوں کا بھی حصہ ہے ــــ ہم سرمایہ دار کی اخلاقی حس اتنی بیدار کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کسی کو محتاج و پریشان حال نہ دیکھ سکے۔ اور کلیم جس سرخ انقلاب کے خواب دیکھ رہا ہے وہ انسانیت کو کچل کر فرد کو مجبور محض بنا دیتا ہے ــــ ان سرخ کرنوں کے سامنے میں سارے سرمایہ دار مٹ تو جاتے ہیں لیکن انہی کی راکھ سے ایک سب سے بڑا سرمایہ دار پیدا ہوتا ہے اور یہ ہے سرخ اسٹیٹ ــــ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم نے پھانس نکالنے کے بجائے اپنی انگلی کاٹ لی اور پھر اس ناگ کی غذا کے لئے ہمیں خدا، دین، دھرم، اخلاق، اور انسانیت سب سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ میں اتنی بڑی قیمت پر یہ سودا کرنے کیلئے تیار نہیں ــــ

(نرگس چاء لا کر میز پر لگا دیتی ہے)

نرگس: ــــ خالد صاحب۔ چاء پی لیجئے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے ــــ

نرگس: ــــ اے۔ اے۔ کہاں گھسے آتے ہو؟ کون ہو تم ــــ جاؤ یہاں سے ــــ یہاں سے نکل جاؤ ــــ (ایک مفلوک الحال نوجوان اندر آجاتا ہے)

خالد: ــــ نرگس ــــ تم خاموش رہو! ہاں بھئی تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟

نوجوان: ــــ میں ایک بھوکا ہوں ــــ اور روٹی چاہتا ہوں ــــ مگر بھیک نہیں ــــ

خالد: ــــ آؤ بیٹھو ــــ تمہیں روٹی ملے گی مگر یہ تو بتاؤ اس طرح ڈاکے ڈال ڈال کر تم کب تک اپنا پیٹ بھر سکو گے۔

نوجوان: ــــ پھر اور کیا کروں ــــ نوکری تلاش کرتے کرتے تو نوکری کی خواہش ہی کھو بیٹھا ــــ اور پھر یہ ڈاکہ ہی کب ہوا ــــ ہمارا ہی خون چوس چوس کر تو یہ دولت اکٹھا کی گئی ہے۔ پھر اگر ہم اسے لوٹتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں۔ ہم ان تجوریوں پہ بیٹھے ہوئے ایک ایک سانپ کی گردن مروڑ کر ہی دم لیں گے ــــ

خالد: ــــ شاباش ــــ زندہ باد میرے دوست ــــ میں تمہاری قدر کرتا ہوں نرگس آپ کے لئے کھانا لاؤ ــــ دوست آؤ ہم اس ظالم نظام کی جڑیں کھود ڈالیں ــــ مگر تمہاری طرح میں بھی انقلاب کا متمنی ہوں مگر ایسا انقلاب نہیں جس میں انسان مزدور اور کسان کے روپ میں انسان پر حکومت کرے۔

فیروزہ: ـــــ مسٹر خالد ـــــ چارپائی ہوئی جارہی ہے۔ نرگس دوسری پیالی پیش کرو ـــــ

نرگس: ـــــ بہت اچھا بی بی ـــــ (نرگس اجنبی کے سامنے کھانا لگا دیتی ہے)

خالد: ـــــ تم تکلف نہ کرو میرے دوست ـــــ اچھی طرح کھاؤ ـــ مگر میں تم سے کہتا ہوں اگر تم صرف روٹی کے لئے انقلاب کے متمنی ہو تو یہ انقلاب بیکار ہے۔ روٹی سے بالاتر کوئی اور شے ہے جو ہماری زندگی کا نصب العین ہو سکتی ہے۔ اور ہم اسی بلند و برتر نصب العین کے لئے انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

نوجوان: ـــــ میں تو ایک بھٹکا ہوا راہی ہوں ـــــ لیکن آج یہ کیا ہو رہا ہے میرے سامنے سے تاریکیوں کے دبیز پردے کیوں ہٹتے جارہے ہیں آپ نے سچ فرمایا مسٹر خالد۔ اگر ہم صرف روٹی کے لئے لڑے تو ہم میں اور ایک کتے میں فرق ہی کیا رہا ـــــ اللہ میں کس بھیانک غار کے منہ پر کھڑا ہوں ـــ شکریہ میرے دوست۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔ خدا کے لئے مجھے بچالو ـــــ

خالد: ـــــ میرے بھائی ـــــ (اُٹھکر بغل گیر ہو جاتا ہے۔

فیروزہ: ـــــ ایک طرف نعرے ہیں۔ پُرجوش اور شاندار ـــــ اور دوسری طرف عمل ہے خاموش اور نمود و نمائش ـــــ سے خالی۔ انسانیت کی خدمت کا صحیح احساس ـــــ وہ بوجھ جو میں ایک عرصہ سے اپنے دل پر محسوس کر رہی تھی خدا کا شکر ہے آج اس میں کچھ کمی سی معلوم ہو رہی ہے۔

مسٹر خالد ـــــ میری طرف سے سر دست دو ہزار روپئے کی حقیر رقم میرے اجنبی بھائی کو دیدیجئے کہ وہ اس سے کوئی کام شروع کریں ـــ اور آپ میرے حسابات کر دیجئے میرے ذمہ ان غریبوں کا کتنا حق نکلتا ہے۔ یا اللہ مجھے معاف کیجیو۔ میں آج تک تیرے اس حق کو پُورا نہ کر سکی ـــــ

خالد: ـــــ فیروزہ کیا سچ (دفورِ شوق میں)

فیروزہ: ـــــ یقین کیجئے ـــــ

خالد: ـــــ میرے اللہ ـــــ (آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں)

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

فیروزہ: ـــــ نرگس ـــــ یہ چک خالد صاحب کو دو ـــــ وہ اسے اجنبی کو دیدیں ـــــ

اجنبی: ـــــ میں اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکوں گا بہن ـــــ تم نے تو میرا نام بھی نہ پُوچھا۔ کیسے مطمئن ہیں یہ لوگ ـــــ

خالد: ـــــ معاف کرنا بھائی مجھے خیال ہی نہ رہا ـــــ ہاں تو آپ کا اسم ـــــ

اجنبی: ـــــ مجھے احمد کہتے ہیں۔

خالد: ـــــ احمد ـــــ آخر نام اپنی تاثیر دکھلا کر رہا ـــــ اچھا میں چلوں گا مس فیروزہ۔

فیروزہ: ـــــ جی نہیں ـــــ آپ نہیں جا سکتے ـــــ آپ یہیں رہیں گے ـــ یہ گھر بھی تو آپ ہی کا ہے۔

خالد: ـــــ میں آؤں گا ـــــ لیکن ابھی مجھے اور بھی کام ہیں ـــ خدا نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا ـــــ

فیروزہ: ـــــ میں آپ کا انتظار کروں گی۔

خالد: ـــــ خدا حافظ۔

فیروزہ: ـــــ خدا حافظ۔ ـــــ (پردہ)

چوتھا منظر

(یہ ایک شاندار کمرہ ہے۔ جو عیش و نعم کے سامان سے پُوری طرح آراستہ ہے۔ دیواروں پر نیم برہنہ فلمی تصاویر آویزاں ہیں۔ نصرت پیانو پر ایک گیت گا رہی ہے۔)

پچھم کے اندھے کونے میں وہ سورج بیٹھا جاتا ہے
آج کا دن بھی یُوں ہی اے دل خالی بیتا جاتا ہے
ہائے یہ من کی چوٹ
درد کا یہ سنسار
آشا تھی میں چھیڑ سکوں گی من کے ٹوٹے تار
گیت جوان میں تڑپ رہے ہیں کاش میں تم کو سناؤں
لیکن تم اب تک نہیں آئے
من کا طوفان چڑھتا جائے
ٹوٹ گیا دل۔ آس گئی
آس گئی تو جان گئی

لٹ گئی میری ساری پونجی بیٹھی ہوں من مار
ہائے کسی سے آس نہیں کچھ کیسے پہونچوں پار

ایک شخص: ـــــــ (جو عین اسی موقع پر آجاتا ہے) بہت اچھے ـــــ بہت اچھے ـ زندہ باد مس شبنم زندہ باد ـــــ

نصرت: ـــــ اوہ ـ ڈائرکٹر صاحب ـــــ آئیے آئیے تشریف رکھیے ـ کہئے گیت کیسا رہا؟

ڈائرکٹر: ـــــ بہت اچھا ـــــ اس رس بھری مدھر تان کی تو کوئی تعریف ہی نہیں ہوسکتی ـــــ مس شبنم ـــــ آپ کے گیت نے وقت سے اس کی روانی چھین لی تھی ـ مسرت کا یہ لمحہ جو آپ کا گیت سننے میں صرف ہوا مجھے عمر بھر یاد رہے گا ـ آپ کی یہ کوششیں آپ کو فلمی دنیا میں بہت جلد چمکا دیں گی ـ رس ـ روپ ـ اور جوانی ـــــ کسی لڑکی کے اسٹار بننے کی کافی ضمانت ہیں ـ

نصرت: ـــــ آپ تو اچھی خاصی شاعری کر لیتے ہیں ـ

ڈائرکٹر: ـــــ جی شکریہ ـــ ـ ـ ـ ذرہ نوازی ہے ـ ورنہ میں اس قابل کہاں ـ مس شبنم اب اجازت دیجئے ـ ابھی کل کے سفر کی تیاری تو کرنی ہے ـ کل ہمیں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلہ میں آگرہ فتحپور سیکری جانا ہے نا ـــــ

شبنم: ـــــ اوہ ـــــ یہ تو آپ نے خوب یاد دلایا ـــ میں تو بھول ہی گئی تھی ـ

ڈائرکٹر: ـــــ (اُٹھکر جاتے ہوئے) خدا حافظ ـــــ

شبنم: ـــــ ـ ـ بائی ـ بائی ـ (وقفہ ـــ خاموشی) رس ـ روپ اور جوانی کسی لڑکی کے اسٹار بننے کی کافی ضمانت ہیں ـ

(کلیم ـ خالد کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوتا ہے)

کلیم: ـــــ نصرت ـ ان سے ملو ـ یہ میرے کالج کے ساتھی ہیں خالد ـــ اور یہ میری بہن نصرت شاید آپ جانتے ہوں فلمی دنیا کی حسین ساحرہ مس شبنم ـــــ

خالد: ـــــ تمہاری بہن ـــــ ؟

کلیم: ـــــ ہاں میری بہن نصرت ـــــ

نصرت: ـــــ میں آپ کو بھولی نہیں ـــــ ماں کے انتقال کے دن آپ ہی نے تو ہمیں روکا تھا ـــــ ہم آپ کے مشکور ہیں ـ

کلیم: ـــــ خالد ـــــ دیکھ لیا تم نے ـــــ ہم نے سوسائٹی سے کتنا سخت انتقام لیا ہے ـ اس دیش کا بڑے سے بڑا آدمی کون ہے وہ جو شبنم کے قدموں پر نہیں جھکتا ـــــ

خالد: ـــــ مگر سودا بڑا مہنگا رہا میرے دوست ـــــ ذرا اپنے باپ کی قبر میں جھانک کر دیکھو ـ ان کی بے چین رُوح اپنی عزت و شرافت کا ماتم کر رہی ہے ـ خان بہادر نعیم الدین کی بے چین رُوح ـــــ

کلیم: ـــــ ہا ـ ہا ـ ہا ـ (قہقہہ) عزت اور شرافت ـــ ہم تو اُسے اسی روز رو چکے تھے جب دولت نے میرے باپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ـــــ ہم جس معاشرہ کی بنیاد ڈال رہے ہیں اس میں یہی کچھ عزت و شرافت کا معیار ہوگا ـــــ نصرت تم ـ ان سے باتیں کرو ـــ میں ذرا سفر کی تیاری کروں مجھے آج ہی کل میں پارٹی کے ایک بہت ہی ضروری کام کے لئے باہر جانا ہے ـــــ اور کون جانے پھر کب آنا ہو؟ خالد بھائی میں تھوڑی دیر کے لئے معافی چاہوں گا ـ

(چلا جاتا ہے)

خالد: ـــــ شوق سے ـــــ کوئی حرج نہیں ـــــ تو مس شبنم آپ نے فلم لائن اختیار کر ہی لی ـــــ معاف کیجئے گا ـ میں انتظار کا قائل نہیں ـــــ وقت تو طوفانوں کے سر پر سوار ہے وہ کسی کے لئے کب رکتا ہے ـــــ مجھے یہ زندگی کچھ پسند نہیں ـــــ ذرا تلخ ہے یہ حقیقت ـــــ تعجب ہے آپ اس ماحول میں کیسے خوش ہیں ـــ؟

شبنم: ـــــ مجھے یہاں کس چیز کی کمی ہے ـــــ دولت ہے ـ احباب ہیں ـ عیش و عشرت کے سارے سامان ہیں ـ سوسائٹی میں اچھی عزت ہے ـ ہزاروں نوجوان میرے ایک اشارۂ چشم پر جان دینے کے لئے تیار ہیں ـ جوانی حسن اور آرٹ ـ سب میرے ارد گرد لاتعداد مسرتوں کے خزانے بکھیر رکھے ہیں ـــ

خالد: ـــــ لاتعداد مسرتوں کے خزانے ـــــ آپ انہیں حقیقی خوشی تصور کرتی ہیں ـ یہ لاتعداد پروانے جو آپ پر نثار ہونے کے لئے آپ کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں ان سے آپ کے دل کو تسکین ہوتی ہے

بڑی معصوم و سادہ لوح ہیں آپ ۔ شاید آپ نے غور نہیں کیا ——
کیا یہ ۔ پروانے آپ کو شمع کی طرح جلنے پر مجبور نہ کر دیں گے ؟ ——
آپ کا یہ حسین پیانو —— یہ ہمیشہ خوشی کے ترانے ہی گاتا
رہے گا —— ؟ میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں یہ درد انگیز
نغمے بھی گا سکتا ہے —— معاف کیجئے گا مس شبنم ——
میں کچھ آگے بڑھ گیا ——

شبنم: —— نہیں نہیں آپ پریشان نہ ہوں —— وہ خلوص اور
محبت جو آپ کی اس تلخ گفتگو میں ہے ۔ میں کہیں نہیں پا سکی
—— آپ کی گفتگو میں سچائی جھلک رہی ہے ——

خالد: —— نگار خانوں کی متعفن فضائیں —— میں حیران ہوں آپ کو
کیسے راس آگئیں —— خدا کی پناہ —— وہاں دن
دھاڑے انسانیت پر ڈاکہ پڑتا ہے ۔ اور پھر ایک عورت کی عصمت
—— ایک انمول ہیرا ——

شبنم: —— انسانیت ؟ —— عصمت ؟ —— یہ بھی کوئی چیز
ہوتی ہے —— ؟ مگر میں نے تو پڑھا ہے دنیا میں صرف
دو ہی ایک چیز ہے ۔ خدا ۔ مذہب —— اخلاق ——
یہ سب بعد کی چیزیں ہیں ۔ میں صرف انتقام لینا جانتی ہوں
یہی مجھے سکھلایا گیا ہے ——

خالد: —— انتقام —— کتنا معصوم لفظ ہے ——
معصوم اور دل فریب بھی —— مگر شبنم تم نے اس انتقام
کے ہیر پھیر میں کیا کچھ گنوا دیا ؟ کبھی یہ سوچا —— یہ حسین
اور سڈول جسم —— چمکتا ہوا مہتاب جیسا چہرہ ۔ آہ ۔
یہ گوشت اور ہڈیوں کا خوبصورت ڈھانچہ —— مگر اس
کے اندر کی نورانی روح ۔ اس پر گناہ نے اپنی سیاہ چادر ڈال دی
ہے ——

شبنم: —— روح ۔ گناہ —— مگر یہ سب کیا ہیں ——
یہ پہیلیاں میری سمجھ سے باہر ہیں —— اس لشتر کے کچوکے
بڑے زبردست ہیں —— یہ کیسی میٹھی میٹھی خلش بیدار
ہو رہی ہے —— مگر اس دو گھڑی کے اجالے کے بعد
کیا ہوگا —— ؟ سورج غروب ہو رہا ہے کیا یہ اندھیرے
پھر دنیا پر مسلط کر دیئے جائیں گے ؟ —— میں مر جاؤں گی ——

مجھے مر جانے دو —— خالد تم جادوگر ہو !

خالد: —— اندھیرے آتے ہیں تو آنے دو —— ان ہی اندھیروں
سے حقیقت کا نورانی سورج طلوع ہوگا ۔

کلیم: —— (داخل ہوتے ہوئے) او —— بھئی خالد —— تمھارا
یہ وعظ کبھی ختم بھی ہوگا ——

خالد: —— مسٹر کلیم مجھے تم سے شکایت ہے ——
تم نے نصرت کو دلدل میں پھنسا دیا ہے ۔ جہاں بچاؤ کی ہر کوشش تباہی کا پیغام
ہے —— اس روز سے ڈرو جب خدا کے سامنے حاضر ہوکر
ایک معصوم لڑکی کو گناہ کی اس بھٹی میں جھونکنے کا جواب دینا ہوگا ۔
کلیم اس روز سے ڈرو !

کلیم: —— اس گھر میں پھر خدا آگیا ہے ۔ نصرت ہمیں کسی اور تباہی کے لئے
تیار رہنا چاہئے ۔ خدا —— ! بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں پر
رحمتیں برسانے والا خدا —— وہ آج تک ہمیں کیوں بھولا
رہا —— تم آئے ہو ہمیں اس سے ڈرانے ——

خالد: —— کلیم ——

کلیم: —— خاموش —— (انتہائی غصہ میں خالد کے منہ
پر ایک تھپڑ مار دیتا ہے) ہونہہ —— نکل جاؤ یہاں سے ——

خالد: —— شکریہ —— (جانے کے لئے مڑتا ہے)

نصرت: —— آپ جا رہے ہیں —— ؟ بھائی جان محسن کے
ساتھ یہی کچھ کیا جاتا ہے آپ کے نئے معاشرہ میں
یہ بھی عین اخلاق ہوگا —— ؟

کلیم: —— نصرت —— چھوکری ! مجھ سے پوچھتی ہے ——
ہاں ٹھیک ہے تجھے ضرور پوچھنا چاہئے —— میں نے تجھے شبنم
بنایا ہے ۔ فلمی دنیا کی حسین تر شبنم ——

نصرت: —— شبنم —— رات کے اٹھتے ہوئے جنازہ پر
غم نصیب ستاروں کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آخری آنسو ——
شبنم —— حقیقتوں کا سورج طلوع ہوتے ہی فنا ہو جانے
والی شبنم ——

کلیم: —— جاؤ —— سفر کا انتظام کرو —— ہمیں آؤٹ
ڈور شوٹنگ کے لئے باہر جانا ہے ——
(نصرت چلی جاتی ہے) —— بدنصیب لڑکی ——

لیکن اگر یہ جراثیم بڑھ گئے تو شبنم بہک جائے گی ——
(ٹہلنے لگتا ہے اور کسی گہری فکر میں ڈوب جاتا ہے) اور اگر مجھے انڈر
گراؤنڈ ہونا پڑا —— ؟ تو کیا ہوگا —— شبنم کسی
سہارے بغیر رہ سکے گی ؟
(—— سکوت —— خاموشی ——)

پردہ

پانچواں منظر —— ریل کا تھرڈ کلاس ڈبہ

(ڈبہ میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ قریب قریب سارے مسافر نیند میں سرشار ہیں۔ کچھ سو رہے ہیں۔ کچھ اونگھ رہے ہیں۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے چلی جا رہی ہے۔ سردی اپنے پورے شباب پر ہے۔ پورے ڈبہ میں صرف دو شخص جاگ رہے ہیں ایک کلیم ہے جو بظاہر کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہے لیکن اس کا بار بار کروٹیں بدلنا۔ اِدھر اُدھر دیکھنا اس کے ذہنی انتشار کی غمازی کر رہا ہے۔ دوسرا ایک نوجوان ہے جو کونے میں بیٹھا سردی سے سکڑ رہا ہے)

کلیم: —— (کتاب کو بند کر کے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا ——
مگر ہم اس زہر بھرے جام کی تلخی دُور کر کے رہیں گے ——
(کونے میں بیٹھے ہوئے نوجوان پر نظر پڑتی ہے) اوہ تمہیں سردی لگ رہی ہے —— اِدھر آؤ میں تمہیں سردی سے بچاؤں ——
اِس بوڑھے کھوسٹ کو دیکھو گرم کپڑوں کی گٹھڑی ہو رہا ہے۔ قبر اس کا انتظار کر رہی ہے اور یہ اپنی زندگی کی ایسی حفاظت کرتا ہے گویا کوئی بڑی قیمتی چیز ہے۔ دیکھتے کیا ہو چھین لو کمبل۔ اپنی زندگی کو بچاؤ —— دنیا کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے —— ارے تم خاموش بیٹھے ہو! میں تمہیں سے کہہ رہا ہوں —— کیا تم اس بے انصافی کو برداشت کر سکتے ہو؟
جنہیں ضرورت ہے انہیں کچھ نہ ملے —— اور جن کی دنیا کو ضرورت نہیں ان کو سب کچھ ——

نوجوان: —— قسمت بھی تو کوئی چیز ہے —— ؟

کلیم: —— تم بزدل ہو! —— اس زمانہ میں بھی تم قسمت جیسی فضول قوت کے قائل ہو! ٹھیک ہے تمہیں سردی سے ٹھٹھر کر مر جانا ہی چاہئے۔ جب تم میں اتنی بھی قوت نہیں کہ اس بوڑھے سے کمبل چھین سکو تو تم زندگی کی الجھنوں سے کیا لڑ سکو گے۔

نوجوان: —— مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ڈاکے ڈالوں۔ کسی پر ظلم کروں ——

کلیم: —— ڈاکہ —— ظلم؟ ہا ہا ہا۔ (زور سے ہنستا ہے) بے وقوف۔ کون ڈاکو نہیں۔ کون ظلم نہیں کرتا —— یہ سامنے اونگھتی ہوئی موٹی عورت۔ اور یہ کھوسٹ بڈھا —— تم سمجھتے ہو! کیا دولت آسمان پھاڑ کر ان کے گھروں میں کود پڑی ہے —— معلوم نہیں کتنے غریبوں کا خُون چُوسا گیا ہوگا —— کتنے بے گناہوں پر ظلم ڈھائے گئے ہوں گے —— اِدھر آؤ —— میں تمہیں بتاؤں —— صاحبزادے —— اس دُنیا میں جو ڈاکو نہیں —— جو ظلم نہیں کر سکتا۔ اُسے جینے کا کوئی حق نہیں —— اوہ تم نے کانوں میں انگلیاں دے رکھی ہیں —— بیوقوف۔ ظلم صرف اس لئے ظلم ہے کہ ہم نے اُسے ظلم سمجھ رکھا ہے یہ خیر و شر کے سارے فلسفے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں —— کہ یہ بڑے آدمی ان کی آڑ لے کر ہمارا خُون چُوستے رہیں۔ وہ اُدھر برتھ پر کسی بورژوائی لاش پر کتنا حسین اور قیمتی کمبل لپٹا ہوا ہے —— بزدل سردی سے کانپتا کیوں ہے اُٹھ کر چھین لے کمبل ——

نوجوان: —— یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا خدایا مجھے موت دے دے ——

کلیم: —— موت مانگتے ہو! مگر میں تمہیں مرنے نہ دوں گا —— (اُٹھ کر برتھ پر لیٹے ہوئے آدمی کا کمبل کھسوٹ لیتا ہے) یہ لو —— اوڑھ لو —— تمہیں سردی لگ رہی ہے۔

نوجوان: —— نہیں نہیں۔ مجھے کمبل نہیں چاہئے ——
(لیٹا ہوا شخص اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ خالد ہے)

خالد: —— لے لو۔ میرے بھائی —— تمہیں سردی لگ رہی ہے میں نے تمہیں معاف کیا ——

کلیم: —— اوہ خالد! —— خوب ملے بھائی۔ اس وقت مجھے

شدت سے تمہاری کمی محسوس ہو رہی تھی۔

خالد : —— شکریہ میرے دوست ——

کلیم : —— اُس دن کی تلخی کے لئے مجھے معاف کر دو خالد —— تمہیں سردی لگ رہی ہے۔ تم میرا اوورکوٹ پہن لو۔ یہ لو ——

خالد : —— نہیں۔ نہیں۔ تم اپنا کوٹ رہنے دو —— سردی کچھ ایسی زیادہ نہیں ——

کلیم : —— میں نہیں مان سکتا —— تمہیں کوٹ پہننا ہوگا —— ورنہ میں سمجھوں گا۔ تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔

خالد : —— تب تو میں ضرور پہنوں گا —— (اور وہ کوٹ لے کر پہن لیتا ہے)

کلیم : —— دیکھا آپ نے مسٹر خالد —— ہمارے دیش میں کیسے کیسے لوگ مفلسی کا شکار ہیں —— اسی گاڑی میں ہماری سرکار کا خزانہ جا رہا ہے —— اور اسی گاڑی میں کتنے ہی بھوکے بھیک مانگ رہے ہیں۔ بھوکے عوام کی رگوں سے لہو کا آخری قطرہ تک چوس کر یہ خزانہ جمع کیا گیا ہے۔ مُردہ باد سرمایہ داری۔ مزدور! کسانو! کہاں سو رہے ہو؟ —— آؤ میں تمہیں انسانی مساوات کے سنہرے سپنے دکھاؤں۔

خالد : —— انسانی مساوات کے سنہرے سپنے —— ؟ کتنے خوشنما الفاظ ہیں —— مگر مسٹر کلیم۔ سرمایہ دارانہ نظام کا جو ردعمل آپ بیدار کر رہے ہیں وہ انسانیت کو مٹا کر ہی دم لے گا —— اِن روشنیوں کے پسِ پردہ کتنے بھیانک اندھیرے ہیں یہ کوئی مجھ سے پوچھے ——

کلیم : —— (کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھ کر) اوہ ڈیڑھ بج رہا ہے —— وقت آگیا ——

مسٹر خالد —— کتنے بھیانک جنگلوں سے ہم گذر رہے ہیں۔

—— (ٹارچ کی روشنی جنگل کی طرف پھینکتا ہے) دیر ہوئی پیچھے اسٹیشن چھوٹ چکا ہے اور اگلے اسٹیشن کا ابھی کوئی پتہ نہیں ——

وقت گذر جائے گا —— نادان سوچتا کیا ہے ——

خالد تم بہت اچھے ملے۔ بہت اچھے ملے تم خالد ——

(اُٹھ کر فوراً زنجیر کھینچ لیتا ہے۔ گاڑی کھڑی ہو جاتی ہے اور وہ فوراً گاڑی سے نکل جاتا ہے۔

خالد : —— کلیم —— تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے زنجیر کیوں کھینچی؟ —— تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ اس بھیانک جنگل میں کہاں جاؤ گے تم —— ؟ (وہ نیچے اتر کر کلیم کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پائدان میں پھنس کر نیچے گر کر بیہوش ہو جاتا ہے۔)

(یکبارگی گاڑی پر بہت سی ٹارچوں کی روشنی پڑتی ہے —— اور بندوقوں۔ رائفلوں کے چلنے کی آواز کے ساتھ گاڑی لُوٹی جاتی ہے)

چھٹا منظر —— عدالت کا کمرہ ——

(ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ خالد ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا بیان دے رہا ہے۔)

خالد : —— میں جانتا ہوں حادثہ کی رات میں گاڑی پر تھا —— میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس رات گاڑی کی زنجیر کھینچی گئی —— وہ گاڑی سے اُتر کر بھاگا —— میں اُسے پکڑنے کے لئے دوڑا —— لیکن ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اور پھر گاڑی پر گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ کتنے بچے یتیم ہو گئے اور کتنی بہنیں بیوہ ہو گئیں —— یہ اتنا بڑا دکھ ہے کہ میری آنکھیں روتے روتے خشک ہو جائیں تب بھی یہ دکھ کم نہ ہو! —— ضرور میرے دل میں ایک تڑپ ہے۔ اُمنگ ہے۔ حوصلہ ہے۔ میں اس دنیا کو بدلنا چاہتا ہوں۔ میں اُن ہاتھوں کو مروڑ دینا چاہتا ہوں جو برسوں سے انسانیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ مٹھی بھر انسان کروڑوں بے بس و مجبور انسانوں سے اپنی خدائی منوا رہے ہیں —— میں موت سے نہیں ڈرتا —— اور میں خوش ہوں کہ میری موت بھی کسی نہ کسی کی زندگی کا ذریعہ بن رہی ہے میں۔ اگر چاہوں تو اس ظالم کا نام بتا سکتا ہوں۔ یہی نہیں میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن میرے اوورکوٹ کی جیب سے نکلے ہوئے کاغذات۔ اور میرے پاس پڑا ہوا ریوالور ہی میرے خلاف سب سے بڑی شہادت ہیں اسی لئے میں چپ رہنا چاہتا ہوں دنیا کہے گی موت سے ڈر گیا موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔

احمد : —— (فیروز سے) دیکھا آپ نے بھئی فیروز —— کیسی بہکی بہکی باتیں

کرتے ہیں ——— خالد صاحب ———

فیروز: ——— میں جانتی ہوں۔ احمد بھائی ——— وہ مجرم کا نام نہ بتا سکے
اللہ ——— اُن کی یہ ضد انہیں لے ڈوبے گی ——— خدایا
میرا یہ سہارا ٹوٹ نہ جائے ———

خالد: ——— کاش میری آواز اس تک پہنچ جاتی ——— ہم دُنیا سے
نہیں ڈرتے ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم خدا کے سوا کسی سے
نہیں ڈرتے ——— ۔

عدالت: ——— بدنصیب نوجوان! اور کچھ کہنا چاہتے ہو؟

خالد: ——— نہیں

آواز: ——— مگر مجھے بہت کچھ کہنا ہے ——— میں اسے جانتی ہوں ———
میں نصرت ہوں۔ فلمی دُنیا کی بدنصیب ساحرہ شبنم — —
عدالت مجھے پہچان لے۔ دنیا مجھے پہچان لے۔ سارے لوگ
مجھے پہچان لیں۔ میں شبنم ہوں۔ —

عدالت: — — تم کون ہو؟ یہاں کیوں آئی ہو؟ ———

نصرت: — — — میں نصرت ہوں۔ اصل مجرم کی بہن — — وہ میرا
بھائی ہے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں اس کا نام کلیم ہے
میرا بھائی کلیم میں اس کی تصویر لے کر
آئی ہوں وہ دو ... روٹ جس سے گاڑی لوٹنے کی سازش
کے کاغذات برآمد ہوئے وہ میرے بھائی کا ہے ... جانتے ہیں
ابا ... درحقیقت وہ مجھ سے یہ کہہ کر سفر پر گئے کہ وہ پارٹی کے ایک
... کام ... جا رہے ہیں ... ان ... سے
کاغذات جو اس سازش سے متعلق انہیں لکھے گئے وہ آج تک
روپوش ہیں
(اور پھر ایک ... کو پھاڑتا ہوا کلیم داخل ہوتا ہے
اور ... گولی چلا دیتا ہے نصرت گر پڑتی ہے)

نصرت: — آہ ... جان ... آپ ... ؟

کلیم: — — ہاں ... میں ہوں کلیم — اس سازش کا
اصل مجرم ——— (اور پھر وہ اپنے اوپر گولی
چلا لیتا ہے)

خالد: ——— (جو اب تک مجسم حیرت بنا خاموش کھڑا تھا) نصرت ——— نصرت ———
آہ ——— (دوڑ کر نصرت پر جھک جاتا ہے) ظالم تُو نے یہ کیا
کیا ———؟

نصرت: ——— خالد بھائی ——— میں نے آپ کے کہنے سے فلمی دُنیا
چھوڑ دی ——— میں بہت گناہگار ہوں ———
اللہ — — میں کیا کروں —؟ بھیا ——— خالد
بھیا ——— اندھیروں کے پردے تو تم نے چاک کر دیئے
تھے ——— میں آؤٹ ڈور شوٹنگ میں نہیں گئی ———
خدایا — میری توبہ قبول فرمائے ——— خدایا۔

کلیم: ——— اوہ ——— خالد تم فرشتے ہو! فرشتے ——— مجھے
معاف کر دو خالد ——— اب تو میرا آخری وقت ہے ———
خالد بھائی ——— آہ ——— اُوں ———

خالد: ——— میرے بھائی ——— میں نے تمہیں معاف کیا ———

کلیم: ——— میں نے نصرت کو مار ڈالا ——— لیکن وہ زندہ ہے۔
وہ زندہ رہے گی۔ تم نے اُسے بچا لیا ——— خالد
بھائی ——— میں نے اُسے گندگیوں میں آلودہ کر دیا
تھا۔ زندگی روٹی کے لئے نہیں ——— کوئی اور
ہی نصب العین ہے جو اس سفر میں مشعلِ راہ ہو سکتا ہے۔

خالد: — — ہاں کلیم ——— وہ کوئی اور ہی نصب العین
ہے ——— روٹی نہیں ———

کلیم: ——— روٹی نہیں ——— روٹی نہیں ———
روٹی کیوں چھینتے ہو؟ کیوں چھینتے ہو؟ آہ ———
اوہ ہچ ——— (سانس رُک جاتی ہے)

خالد: ——— فیروز ——— مجھے معاف کرنا ——— تمہیں دیر
تک میرا انتظار کرنا پڑا ———

———

ندرت میرٹھی

غزل

غم کا مزا اُٹھا دلِ ناکام کو نہ دیکھ
تجھ کو غرض شراب سے ہے جام کو نہ دیکھ

رنگِ فریب کاریٔ ایّام کو نہ دیکھ
نورِ سحر کو تیرگیٔ شام کو نہ دیکھ

لے کام اپنی فطرتِ مشکل پسند سے
انبوہِ غم کو کثرتِ آلام کو نہ دیکھ

پنہاں ہے اضطراب میں رازِ حیاتِ عشق
تسکین کو قرار کو آرام کو نہ دیکھ

دونوں جہاں کے جلوے ترے دل میں ہیں نہاں
یہ مختصر سا نام ہے اِس نام کو نہ دیکھ

ہے تیرے واسطے نگہِ حسن میں جگہ
تو اہلِ دل ہے جلوہ گہِ عام کو نہ دیکھ

ندرتؔ اقدم بڑھا کہ یہ منزل وفا کی ہے
آغاز کو نہ دیکھ اب انجام کو نہ دیکھ

یٰسین تسکین۔ لکھنؤ

غزل

ملے تو کیسے ملے جلوہ گاہِ قُربِ وحضور
نہ آرزو کا سلیقہ، نہ جستجو کا شعور

ترا خیال بھی ہے، تیرے حُسن سے معمور
تمام حیرت و مستی، تمام نکہت و نور

کمالِ لغزشِ مستانہ ہے کہ اُن کے حضور
قدم قدم پہ گرا ہوں، مگر بڑھا ہوں ضرور

جنوں، کمالِ یقیں۔ اِنتہائے سوز و سرور
جنوں نہ ہو تو محبّت دل و نظر کا فتور

کبھی کبھی تو کوئی نعرۂ جنوں پرور
کہ بدلی ہی نہیں اہلِ عشق کا دستور

حیات، راہِ محبّت میں ساتھ دے نہ سکی
سفر تمام ہوا اور ابھی ہے منزلِ دُور

ہر ایک داغِ جگر، جنّتِ نظارہ سہی
تری نگاہ کی رُسوائیاں نہیں منظور

زمانہ رنگ بدلتا رہا، مگر تسکینؔ
بدل سکا نہ کبھی حُسن و عشق کا دستور

حفیظ میرٹھی

غزل

کسی جبیں پر شکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بغور میرا پیام شاید ابھی جہاں نے سنا نہیں ہے

غلط ہے تیرا خیال اے دل سمجھ نہ اتنا بھی اُس کو غافل
یہ درد میں دلکشی سی کیوں ہے اگر وہ درد آشنا نہیں ہے

سفینۂ عہدِ نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں ہر اِک ناخدا نما ہے مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

خیال کے دیوتا بھی جھوٹے، عمل کے اندھے خدا بھی جھوٹے
خرد بھی فریاد رس نہیں ہے، جُنوں بھی مشکل کُشا نہیں ہے

ہر ایک میکش کے ظرف سے با خبر ہے کتنی نگاہِ ساقی
کسی کو ہے حکمِ جاں نثاری، کسی کو اذنِ وفا نہیں ہے

کہاں کا شاعر خدائے شعر و سخن بھی ہم اس کو مان لیتے
حفیظ میں یہ بڑی کمی ہے کہ بندۂ خود نما نہیں ہے

نسیم مینانگری

غزل

شعور سے کام لے اگر تو، تو لذتِ آگہی ملے گی
عمل کے ہاتھوں تجھے یقیناً مسرتِ دائمی ملے گی

ہوس کے بندوں سے کوئی پوچھے یہ نشۂ خودسری کہاں تک
یہی رہی گر روش تمہاری تو کیا تمہیں پھر خوشی ملے گی

جو پورے اُتریں گے جستجوئے حبیب کے امتحاں میں اے دل
تو ایک دن پھر ضرور ہم کو اجازتِ دید بھی ملے گی

یہاں کا تو رنگ ہی جدا ہے جسے بھی دیکھو خدا بنا ہے
یہی رہا جو نظامِ عالم تو کیا کسی کو خوشی ملے گی

یہ کائنات اور چاند سورج یہ نظم و ضبطِ حیات کیا ہے
انہی میں اہلِ نظر کو پوشیدہ حکمت داوری ملے گی

یہ جہل و عصیاں کا دور دورہ رہے گا جب تک جہاں میں اے دل
تو قہر ٹوٹیں گے ہر طرف سے ہر ایک سُو بیکلی ملے گی

سمجھ لے اب بھی حقیقت اپنی، بچا لے دامن تباہیوں سے
جو ختم یہ زندگی ہوئی تو نہ پھر تجھے زندگی ملے گی

ادارہ

پسند اپنی اپنی

● ——— حسرت موہانی

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے
گدازِ غم اگر چاہے تو مجھ کو با خدا کر دے

اُس جفا کار سے خدا کی پناہ
جو ترا بندۂ وفا نہ ہوا

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیٔ ہمرہاں سے ہم

حسرت پھر اور کس کی کریں جا کے بندگی
اچھا جو سر اُٹھائیں بھی اِس آستاں سے ہم

جنوں نے دل سے وہ حِس بھی مٹا دی
کرے جو امتیازِ رنج و شادی

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اِس میں اِک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

شب وہی شب ہے دن وہی دِن ہیں
جو تری یاد میں گذر جائیں

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

کی بہت کچھ ہرزہ گردی اب یہ حسرت جی میں ہے
چھوڑ دوں سب آسرے اِک اُن کے در کا ہو رہوں

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے

رنج راحت ہے اگر حسبِ تقاضائے مراد
اہلِ تسلیم ترے درد کو درماں کر لیں

زندگی ہے اِسی کا نام تو ہم
ایسی درماندگی سے در گذرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

اب تو راہِ رضائے حق میں قدم
رکھ دیا ہم نے ہرچہ بادا باد

کمالِ شوق کو آتے ہیں ناتمام نظر
تمام شوق تری خواہشِ تمام کے بعد

اس پر آسائشِ بقا ہے حرام
جو تری راہ میں فنا نہ ہوا

ادارہ
(ن - ی)

خیال اپنا اپنا

موجِ نیل

موجِ نیل عربی افسانوں اور افسانوی مضامین کے اُردو تراجم کا مجموعہ ہے۔ افسانے منفلوطی ایک صاحب طرز مصری ادیب کی یادگار ہیں اور اپنے اندر اُردو داں طبقے کے لئے اسلوب کے اعتبار سے بڑا انوکھا پن رکھتے ہیں منفلوطی کے افسانوں کا مجموعہ "العبرات" جس کے اکثر افسانوں کو موجِ نیل میں پیش کیا گیا ہے۔ مصری طرزِ فکر و احساس کا آئینہ دار ہے۔ "العبرات" کے بعد مصری ادب میں جدید رجحانات کا اضافہ ہو چکا ہے۔ تاہم منفلوطی کی حیثیت اپنی جگہ قایم ہے اور ایک مدت تک رہے گی۔

منفلوطی کے افسانوں میں معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا پہلو خاص طور سے نمایاں ہے۔ ہر چند اس کے افسانوی مضامین بڑی حد تک وعظ ہو کر رہ گئے ہیں لیکن وعظ میں بھی اس کے انفرادی رنگ کی جھلک پورے طور سے جلوہ گر ہے۔ اور یہی "العبرات" کی کامیابی کا سبب ہے۔

جہاں تک ترجمہ کی خوبی کا تعلق ہے۔ اس کے لئے مترجم کا نام کافی ضمانت ہے۔ مترجم مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ہیں۔ جو ادبی حلقوں میں ایک عرصے تک مدیر "ادبی دُنیا" کی حیثیت سے متعارف رہے ہیں اور عربی ادب کا نہایت شستہ و شگفتہ مذاق رکھتے ہیں۔ حال ہی میں مولانا کی معرکتہ الآرا اُردو عربی ڈکشنری "بیان اللسان" علمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔

موجِ نیل دوسری مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ اور دو روپیہ میں "**مکتبۂ علمیہ۔ قاضی واڑہ۔ میرٹھ**" سے منگائی جا سکتی ہے۔

کلامِ عربی

کلامِ عربی سجاد صاحب کی ایک اور مقبول تالیف ہے۔ اور چوتھی بار شائع ہوئی ہے۔ یہ تالیف جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے خاص طور سے مفید ہے۔ اس میں قدیم و جدید عربی ادب اور قواعد و ترجمہ و انشا اور عربی اخبارات سے استفادہ کی نہایت سہل طریقہ پر تعلیم دی گئی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ڈیڑھ ہزار کثیر الاستعمال عربی الفاظ کی ایک جامع ڈکشنری بھی شامل ہے۔

مشاہیر اہلِ علم و ادب نے سجاد صاحب کی اس کوشش کو بہت سراہا ہے جن میں سلیمان ندوی۔ ابو الاعلیٰ مودودی۔ مناظر احسن گیلانی۔ نیاز فتحپوری اور سعید احمد اکبر آبادی قابلِ ذکر ہیں۔

کلامِ عربی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ایک روپیہ میں اور دوسرا حصہ ایک روپیہ چار آنہ میں "**مکتبۂ علمیہ، قاضی واڑہ، میرٹھ**" سے مل سکتا ہے۔

ماہنامہ تجلّی

"تجلّی" نو سال سے دیو بند سے جلوہ گر ہو رہا ہے۔ ترتیب دینے والے عامر عثمانی اور زبیر افضل عثمانی فاضلین دیو بند ہیں۔ مقاصد کے اعتبار سے "تجلّی" دینی رنگ لئے ہوئے ہے۔ دینی رنگ کے کتنے ہی رسائل دیو بند، حیدر آباد، لکھنؤ، دہلی اور کراچی سے نکل رہے ہیں لیکن یہ ان سب میں بعض خصوصیات کی بنا پر انفرادیت رکھتا ہے حق گوئی و بے باکی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ تجلّی کی نظموں اور مستقل عنوانات "مسجد سے میخانے تک" میں ترتیب دینے والوں کا ادبی ذوق بھی جھلکتا ہے۔ ایک دوسرے مستقل عنوان "تجلّی کی ڈاک" کے تحت استفسارات کے جوابات قرآن و سنّت کی روشنی میں دلپذیر انداز سے دیئے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ صحیح اسلامی شعور کی بیداری کے لئے بہت کچھ مفید ثابت ہوگا۔ ذہنی رجحان رکھنے والا سنجیدہ اور ذہین طبقہ تجلّی میں اپنی دلچسپی کا کافی سامان پائے گا۔

شائقین "**دفتر تجلّی دیو بند، ضلع سہارنپور**" سے طلب کر سکتے ہیں۔

ماہنامہ کرن

"کرن" کی کرنیں گیا سے پھوٹ رہی ہیں۔ ہنوز ابتدائی منزلوں میں ہے۔ اور کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح جاہلی ادب کے اندھیروں کا دل چیر ڈالے۔ لیکن اس کے لئے اسے اچھے لکھنے والوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ معیارِ مضامین کے لحاظ سے کرن ابھی زیادہ نہیں اُبھر سکا ہے، یہ

خلا اچھے ادیبوں کی توجہ ہی سے پُر ہو سکتا ہے۔ آج جاہلی ادب نے ہر طرف اپنے جال پھیلا رکھے ہیں اور ادب کی منڈیوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ہم ادبی ساتھیوں سے گذارش کرتے ہیں کہ کرن کی ضیا باریوں کو تیز تر کرنے میں غفلت سے کام نہ لیں۔ "کرن" اپنے مقاصد کے اعتبار سے اصلاحی رجحان رکھتا ہے۔

اس ماہنامے کی بنیاد یں ایک مخصوص جماعت "جمعیتہ العراقین" کی قائم کردہ ہیں۔ عموماً اس طرح کے پرچے رُوداووں اور جماعتی تقریروں کا اشتہار بن کر رہ جاتے ہیں لیکن کرن اپنی حد تک وسعت پیدا کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ رجحان اور زیادہ ابھرنا چاہئے۔ مقصد عالمگیر ہو تو جزوی اصلاحیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔

خواہشمند حضرات "دفتر ماہنامہ کرن، پاری روڈ، گیا" سے حاصل کر سکتے ہیں۔

"معیار"

میں نے دیکھا "مجلّۂ معیار"　　شہر میرٹھ کا پرچہ ہے ماہوار

عشق بازی کے سیکڑوں پرچے　　اس میں ہے صرف علم اور وقار

یہ سبب ہے جو اس میں لکھتا ہوں　　شادیاں کر چکا ہوں ورنہ میں چار

اس میں ہوتی ہے نظم بھی علمی　　کیا لکھے اس میں شاعر بازار

اولیائے سیاستِ علیا　　اس میں لکھتے ہیں قیمتی افکار

ہیں رئیسِ مجلّۂ ھذا　　مولوی، اور غضب کے نکتہ نگار

یہ رسالہ ہے جو ہو ہر گھر میں　　جس کے پڑھنے سے عقل ہو بیدار

لیکن اس دورِ آفت افزا میں　　ہیں مسلمان سخت جہل آثار

ان کے ہاں قلم کے رسالے ہیں　　ان کو کہتے ہیں یہ کہ ہیں شہکار

یاد رکھئے کہ علم و فن کے بغیر　　ہر مسلماں رہے گا ہند میں خوار

صنعتوں کے حصول پر دوڑو　　ہو جو چار آنے بھر بھی تم ہشیار

کچھ نہ ہونے پہ بھی کرو دھندے　　مشکلوں کے رہو نہ شکوہ گزار

نکتہ جینے کا صرف ایک ہے اب　　آفتیں آئیں، تم رہو خود دار

سیرتِ مصطفےٰ کرو پیدا　　مسجدی وضع کے نہ ہو دیندار

اس رسالے کو پڑھتے رہئے گا　　آئیں گے میرے چٹپٹے اشعار

دیکھئے ہمتِ رموزی بھی
لیٹ کر لکھ رہا ہے یہ بیمار

(مُلّا رموزی)

ادارہ

مسائلِ زمانہ

کانگریس کا انتشار

بھارت کی اس سب سے بڑی سیاسی جماعت میں کیا کیا انتشار پھیل رہا ہے۔ آزادی کی راہ میں ایک جدوجہد کرنے، شانہ بہ شانہ غیر ملکی طاقت سے لڑنے اور ایک ہی صف میں کام کرنے والے آج بالکل جدا اخلاق کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ وہی دیوار جو پہلے سیسے کی دیوار معلوم ہوتی تھی اب اس کی بنیادیں ریگ پر نظر آ رہی ہیں۔ ایک ایک کر کے پرانے کھلاڑی میدان سے ہٹ رہے ہیں اور ان کی جگہ مخالف رجحان رکھنے والے پُر کر رہے ہیں۔ آزادی کے بعد کانگریس میں بیزاری اور علیحدگی کا جذبہ پہلے پہل یُو۔ پی کانگریس میں نمودار ہوا تھا۔ پھر جب ٹنڈن جی یُو۔ پی کانگریس سے ترقی کر کے صدر آل انڈیا کانگریس ہو گئے۔ تو مخالفتوں کی لہریں وہاں بھی ابھرنے لگیں۔ ادھر انتخابات کا زمانہ آ گیا۔ اور بھارت کی آزادی کے یہ سپاہی اپنے اپنے مستقبل کی فکر میں لگ گئے۔ اچاریہ کرپلانی اور مسٹر قدوائی کا موجودہ کانگریسی کرتا دھرتاؤں سے اختلاف کس سے چھپا ہوا ہے۔ آخر کار بڑی بحث و تمحیص کے بعد بھی جب مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکلی تو کرپلانی جی کسان مزدور پرجا پارٹی بنا بیٹھے۔ اور کانگریس کی دھجیاں بکھرنے لگے۔ ان کے بعد قدوائی اُٹھے اور اٹھ کر کانگریس اور وزارت سے استعفیٰ دے آئے لیکن پنڈت نہرو کے کہنے سے جلد ہی اس کھلے فیصلے میں ترمیم کرنے پر تیار بھی ہو گئے اور کانگریس سے الگ رہ کر وزارت قبول کرنے کا اقرار کر لیا۔ گویا

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

لیکن یہ نہ تو بجھنے والی بات تھی اور نہ بجھ سکی۔ قدوائی کو کانگریس اور وزارت دونوں ہی سے الگ ہونا پڑا۔ کانگریس کا انتشار اسی پر ختم نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے۔ بنائے اختلاف ہنوز اپنی جگہ ہے۔ یہاں تک کہ پنڈت نہرو کو بھی جو کانگریس کے سب سے بڑے سرکردہ رہنما ہیں ورکنگ کمیٹی اور پارلی منٹری بورڈ سے مستعفی ہوئے بغیر چارہ نہ رہا۔ ان کے استعفے کے تعاقب میں مولانا آزاد کا استعفا بھی معرضِ وجود میں آ گیا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی سے پنڈت نہرو کے استعفے نے موجودہ اکابرین کانگریس کے لئے بے چینی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں نہرو اور آزاد کے استعفوں پر غور ہوا ہے۔ اور پنڈت نہرو کی موجودگی کی ضرورت کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اختلافات اس وقت تک کیونکر ختم ہو سکتے ہیں جب تک بنیادی طور پر تبدیلیاں عمل میں نہ لائی جائیں۔ پنڈت نہرو چاہتے ہیں کہ موجودہ ورکنگ کمیٹی کے بجائے دوسری کمیٹی کی تشکیل نئے سرے سے ہونی چاہئے۔ ٹنڈن جی کہتے ہیں "نہرو میرے چھوٹے بھائی کی طرح سہی لیکن میں اپنا یہ حق ختم نہیں کر سکتا کہ صدر کو کمیٹی کی تشکیل کا اختیار رہے۔" گویا ٹنڈن جی کے ہوتے تبدیلی ممکن نہیں۔ ٹنڈن جی اور پنڈت نہرو کا یہ اختلاف بالکل واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسٹر قدوائی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو پنڈت جی کی علاحدگی کا علم تھا۔ تو انہوں نے جواب دیا "علم کیسا! یقین۔ علم ہوتا اور بات ہے اور یقین کامل ہونا اور بات"۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اس استعفے سے قدوائی اور کرپلانی کی پوزیشن مضبوط ہو رہی ہے۔ مسٹر قدوائی کی طرح کرپلانی جی سے بھی اس طرح کا ایک سوال پوچھا گیا تھا کہ پنڈت نہرو کے استعفے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ تو انہوں نے ازراہِ ظرافت جواب دیا۔ "میرا خیال کیا پوچھتے ہو۔ میں تو علاحدگی کا فیصلہ کر چکا۔ اب تم پنڈت جی سے جا کر پوچھو، اور پوچھنا ہی کیا خود دیکھ لو کوئی تو وجہ ہے کہ استعفے دے رہے ہیں۔ اور پھر آج استعفے دے رہے ہیں کل اگر واپس لے لیتے ہیں یا دوبارہ کسی طرح اسی میں شریک رہتے ہیں تو کیا ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

نہیں معلوم علاحدگیوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ٹوٹے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کو کوئی عمل جراحی بھی اب کھوئی ہوئی توانائی واپس نہیں دلا سکتا۔ جب کسی درخت کی جڑوں میں گھن لگ جاتا ہے تو پتوں پر لاکھ پانی چھڑکے جایئے۔ ہریالی باقی رہ ہی نہیں سکتی۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد موجودہ ورکنگ کمیٹی اور خصوصاً ٹنڈن جی

کے نقطۂ نظر کے شاکی ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ فرقہ پرستی تو بری چیز ہے ہی موجودہ قوم پرستانہ نظریات بھی قابلِ تنقید ہیں اور وسعت و ہمہ گیری چاہتے ہیں۔ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کتنے ہی خوشنما الفاظ اور حسین مفہوم کے ساتھ سامنے آئے لیکن اب تک وہ جس طرح کے کردار ادا کرتی رہی ہے ان کی طرف سے عوام کو مایوسی ہے، اور یہی کانگریس کا وقار ختم ہونے کا بڑا سبب ہے۔ دراصل محض سیاسی انقلاب سے آزادی کے پورے پورے فائدے کبھی حاصل نہیں ہو سکتے، آج بھارت کو ایک اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہے جو سیاسی انقلاب کے پیدا کئے ہوئے غیر اخلاقی زخموں کو پُر کر سکے۔ اخلاقی انقلاب کے بغیر سیاسی قوتیں اکثر غلط راہوں میں بھٹک جاتی ہیں۔ اور عوام کی تباہ حالی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

ماسکو میں ہندوستانی وفد

پچھلے دنوں ماسکو میں ایک ہندوستانی وفد گیا تھا۔ وہاں سے واپس آنے پر اس نے اپنے دورے کے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ گویا روس میں کوئی جبر و تشدد یا عوامی بدحالی سرے سے ہے ہی نہیں اور یہ کہ انہیں وہاں کوئی آہنی پردہ نظر نہیں آیا۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ اپنے اس دعوے کی توثیق میں وفد نے بڑے زور دار الفاظ میں بڑے بڑے عجائب خانوں، فلک بوس عمارتوں، شاندار محفلوں اور مشاہیر اشتراکی ادیبوں سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔

چہ خوب! گویا عجائب خانوں میں عوام کی حالت کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اگر روسی عوام کی حالت عجائب خانوں کے قابل بن گئی ہے تو پھر ہم نہیں سمجھتے کہ اس وفد کو آہنی پردہ کیوں نظر نہ آیا۔ ہمیں سرمایہ دارانہ ممالک کی ابتر حالت کا خوب علم ہے۔ لیکن ہم اشتراکیت سے اتنی ذہنی مرعوبیت بھی نہیں رکھتے کہ ہر چمکنے والی چیز کو سونا ہی سمجھ لیں۔ ہندوستانی وفد کا یہ دورہ اسی قسم کا ہے جیسا یورپ سے کوئی شخص آئے اور بمبئی، کلکتہ اور دہلی کی اونچی عمارتوں اور خوشنما مقاموں کی سیر کر کے چلا جائے پھر یورپ جا کر کہے کہ ہندوستانی عوام بڑے خوش قسمت ہیں جو لال قلعہ ایسی عمارتوں میں رہ کر زندگی گذارتے ہیں اور مرنے کے بعد تاج محل جیسے مقبروں میں دفن ہوتے ہیں۔

خلیج فارس اور بحیرۂ روم پر نزول بلا

ایرانی تیل اور ایرانی تیل کی دھار دیکھتے دیکھتے کتنے دن گذر گئے لیکن معاملہ کو ابھی سلجھنا نہیں ہے اس لئے نہیں سلجھ رہا ہے، برطانیہ کے رچرڈ اسٹوکس گفت و شنید کر کے برطانیہ چلے گئے۔ لیکن ارادوں کی ناکامی کا احساس لیکر۔ ایرانی عوام کے جذبات کا دھارا اب بھی اسی زور و تندی سے بہہ رہا ہے جس کا نتیجہ مصدق اور کاشانی پر سخت دباؤ کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ موجودہ حکومت سے اس کی ہرگز امید نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ برطانیہ کا مقابلہ کرے گی لیکن عوامی خواہشات کی بے پناہ قوت دیکھئے کہ آج مصدق پر ذرا سی لچک کا شبہ بھی ہوتا ہے تو قتل کی دھمکی سنا دی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ کاشانی کے لئے بھی حفظِ ما تقدم کے طور پر عوام کے لب و لہجہ میں سختی آجاتی ہے یعنی یہ کہ اگر برطانیہ سے معاہدہ کرنے میں حکومت یا عوامی رہنما دونوں میں سے کسی نے بھی عوامی خواہشات کو نظر انداز کیا تو خیر نہیں، اس صورت میں برطانیہ کی چالیں کیونکر کامیاب ہو سکتی ہیں۔ ایرانی حکومت کو برطانیہ کی تجاویز ٹھکرانے میں آج کوئی امر مانع نہیں اور حالات زمانہ بھی ساتھ ہیں لیکن اس ساری صورت حال میں اگر کہیں خلا ہے تو یہ کہ برطانیہ کے ساتھ اگر امریکہ بھی چاہے تو ایران کی اقتصادی حالت بد سے بدتر کر سکتا ہے، یہ ایران کا خاصا کمزور پہلو ہے لیکن برطانیہ کے اس اقدام میں بھی بظاہر کچھ مجبوریاں ہیں اور وہ یہ کہ اوّل تو روس ایران کو پناہ میں لینے پر تیار ہو سکتا ہے۔ دوسرے امریکہ کا مفاد بھی بہت کچھ ایران سے دوستی میں پوشیدہ ہے۔ خلیج فارس میں برطانیہ کے جنگی جہازوں کی تعداد مسٹر اسٹوکس کے جانے کے بعد سے بڑھنی شروع ہو گئی ہے۔ خلیج فارس کے ساتھ ہی ساتھ مصر پر نہر سوئز کی وجہ سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے مصری حکومت الگ اس پر احتجاج کر رہی ہے لیکن برطانیہ ہے کہ بحیرہ روم پر پاؤں جمائے رکھنا چاہتا ہے۔

معلوم نہیں بحیرہ روم اور خلیج فارس پر گھِر کر آنے والی گھٹائیں جو آج گرج تو بہت رہی ہیں کل کچھ برس بھی سکتی ہیں یا نہیں۔

امن کے ٹھیکہ دار

کوریا کی جنگ برابر جاری ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ صلح کی گفت و شنید بھی پچھلے دنوں اقوام متحدہ کا نمائندہ یکایک کیسانگ سے چلا آیا تھا لیکن گفت و شنید کے امکانات پھر بھی اپنی جگہ پر ہیں۔ اور اس خالی گفت و شنید میں کسی کا کچھ ایسا حرج نہیں۔ سچ ہے تو کوریائی عوام کا۔ مگر ان کی سنتا کون ہے۔ روس اور امریکہ

دونوں امن کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے جنگ آزمائی کر رہے ہیں۔ اِدھر جنگ کی تیاریاں اور بناہ کاریاں ——— اُدھر امن کے زبانی دعوے اور اپنی معصومیت کا پروپیگنڈا —— اس بوالعجبی کو کیا کہیے۔ لوگ بار بار سوچتے ہیں کہ کوریا میں عارضی صلح کب ہوگی اور صلح کی بات چیت کا سلسلہ آخر کہاں تک چلے گا؟ ——— کیا اِس وقت تک کوریا مٹ مٹا کر نابود نہ ہو جائے گا۔؟

جہاں کوئی اخلاقی نظام کارفرما نہیں ہوتا اور کوئی برتر و اعلیٰ اصول اخلاق جاری و ساری نہیں ہوتا وہاں ایسی ہی نیرنگیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ دُنیا کے عوام میں مستقبل پر سوچ بچار کرنے کی اگر کچھ بھی سوجھ بُوجھ ہے تو انھیں روس اور امریکہ دونو بلاکوں سے کسی فلاح، کسی خیر اور کسی طرح کی صلح پسندی کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ یہ خیر بغیر ایک اعلیٰ اخلاقی نظام کے قیام کے بغیر ناممکن ہیں ——— اور ظاہر ہے کہ موجودہ امن کے ٹھیکہ دار اعلیٰ اخلاقی نظام سے کوسوں دور ہیں۔

کرپلانی جی کی پکار

ملک میں کرپلانی جی کی تقریریں زوروں پر ہیں۔ آج یہاں، کل وہاں، پرسوں اور کہیں۔ اترسوں اور کہیں۔ اور بات وہی ایک کہ "موجودہ کانگریسی حکومت (جس کے کچھ دن پہلے وہ اتنے ہی بہی خواہ تھے جتنا آج کا بڑے سے بڑا کوئی اقتدار پسند کانگریسی) آزادی کے مقاصد میں ناکام رہی ہے۔ ملک سے بدحالی۔ غریبی اور پریشانی اب بھی دُور نہیں ہوئی، اور بداخلاقی، رشوت ستانی، اقربا نوازی، بے دردی حکومت کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔"

کرپلانی جی کی بات ٹھیک۔ لیکن اگر انہیں ہٹا کر کرپلانی جی کو حکومت کا انتظام سونپ دیا جائے تو کیا وہ اپنے ساتھی آسمان سے بلائیں گے۔ آخران کے ساتھی بھی تو وہی ہوں گے جو آج کانگریسی حکومت کی مشین کے پرزے ہیں۔ اخلاقی تربیت نا پید ہے اور نہ جب ہوگی۔ تو پھر کہاں سے اخلاقی اوصاف حمیدہ کا مظاہرہ کیا جائیگا۔ کرپلانی جی کو چاہئے کہ اگر انھیں واقعی حکومت اچھے لوگوں کے ہاتھ میں دیئے جانے میں ملک کی بہتری نظر آتی ہے اور موجودہ بداخلاقیوں کو وہ مٹا دیکھنا چاہتے ہیں تو اچھے لوگوں کی فراہمی اور اچھے نظام کی تلاش کی زحمت اٹھائیں۔ اعلیٰ اخلاق اور بہترین سیرت و کردار بغیر اعلیٰ اخلاقی نظام کے ناممکن ہیں، کرپلانی جی کو ایک اعلیٰ اخلاقی نظام کی طرف نشان دہی کرنی چاہئے۔ محض تنقید اور تمنائیں کسی ملک میں اخلاق کی تعمیر نہیں کر سکتیں۔ اس کے لئے بہت کچھ سوچنا سمجھنا اور کرنا ہوتا ہے۔

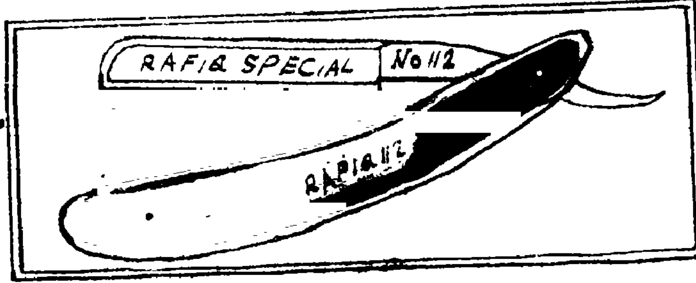
جاپان کا معاہدۂ صلح

جنگ ختم ہوئے کتنے سال گذر چکے ہیں لیکن جاپان کا معاہدہ ۱۹۵۱ء کے آغاز سے گفت و شنید کے مرحلہ میں آیا۔ امریکہ کی یہ ہمدردی کہ وہ جاپان کو اُبھرنے کا موقع معاہدہ صلح کے ذریعہ دینا چاہتا ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے ایشیائی معاملات میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ امریکہ یہ خوب جانتا ہے۔ وہ ایشیا میں روسی طاقت سے مقابلہ کرنے کے لئے نئے نئے دام لا رہا ہے۔ اِدھر معاشی منصوبہ بندی چل رہی ہے اور اُدھر بحرالکاہل کی دفاعی لائن کا استحکام کیا جا رہا ہے۔ اِس منظم منصوبہ بندی کے تحت امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ معاہدہ بحرالکاہل کر چکا ہے اور اب جاپان کو اسی تیاری کے لئے اپنے مفاد کے مطابق صلح نامہ کا مژدۂ جاں فزا سنا رہا ہے۔ ریوکیو جزائر کی جاپان کے ساتھ شمولیت، فارموسا اور جاپان میں امریکہ اڈوں کی موجودگی، یہ ہیں وہ خواہشات جنہیں امریکہ ہزیمت خوردہ قوم کو آزاد قوم کی صف میں لانے کے حسین الفاظ سے چھپانا چاہتا ہے۔

جان فوسٹر ڈلس، جو امریکہ کی طرف سے معاہدہ صلح کی شرائط پر غور کر رہے تھے، سان فرانسسکو کانفرنس میں اپنی کوششیں سامنے لا چکے ہیں۔ اب یہ معاہدہ تکمیل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ جاپانیوں نے اس پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ کرنا چاہئے تھا۔ دیکھنا چاہئے کہ سان فرانسسکو کانفرنس ایشیا کے لئے کیا نئے گُل کھلاتی ہے۔

اِس طرح کی دوڑ دھوپ اور چال بازی میں تجارتی طاقتوں کی رُوح اور اخلاقی فقدان دیکھا جا سکتا ہے کہ کمزور قوموں کی آزادی کے تحفظ کا ڈھونگ رچانے والے کس جذبہ کے تحت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

گارنٹی ہی اطمینان کی کسوٹی ہے



رفیق ریزر فیکٹری ع۱۱۲ کوٹلہ اسٹریٹ میرٹھ

نہایت جاں فشانی اور انتھک کوششوں سے ۱۹۴۲ء سے بہترین ہالوگراؤنڈ استرے کامیابی سے تیار کر کے ملک کی اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے اس کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر مارکیٹ میں سستے اور گھٹیا ولایتی و جرمنی استرے ہندوستانی صنعت کو نقصان پہنچانے کیلئے سپلائی کئے گئے ہیں جو تجربے سے ناپسندیدہ اور نہایت ناکارہ ثابت ہو رہے ہیں، بھولے اور سیدھے بابو محض جرمنی یا ولایتی نام کی وجہ سے خرید کر اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہیں جنہیں ناقص ثابت ہونے یا ایک ہفتہ میں ٹوٹنے پر کوئی دوکاندار بھی واپس نہیں لیتا آپ اپنے پیسے بغیر واپسی کی شرط کے ہرگز ضائع نہ کریں۔ ہوشیار اور آزمودہ بار بر صرف

رفیق ع۱۱۲ ساختہ استرے

خرید کر استعمال کرتے ہیں۔ جن کی ہر طرح قابلِ اطمینان پائیداری و تسلی بخش ہونے کی سو فیصدی گارنٹی دی جاتی ہے! اور کسی قسم کا نقص ہونے پر واپسی کی شرط ہے آپ بھی

رفیق ع۱۱۲ استرے ہی خریدیں

(وہی مال خریدیں جو اس کسوٹی پر پورا اترے)

رفیق ریزر فیکٹری ع۱۱۲، کوٹلہ اسٹریٹ میرٹھ

جدید ڈاکٹری کتابیں

۱۔ شفاء الامراض ڈاکٹری حصہ اوّل دوم۔ سوم

اس کتاب میں انگریزی حرف تہجی کے مطابق امراض کی قرابادینی مفردات ومرکبات اور پیٹنٹ ادویات کا بیان کیا گیا ہے۔ تینوں حصّوں میں حرف ڈی تک کے امراض کی مجرب دوائیں دی گئی ہیں۔ اور آخر میں چند مجربات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

قیمت تینوں حصّے تین روپئے

۲۔ قرطاس مجرّبات۔ طبع دوم

اس کتاب میں اوزان وپیمانے، نسخہ نویسی اور عام امراض کی زود اثر دوائیں اور نسخے بیان کئے گئے ہیں، پاکٹ پری اسکوائیر کے بہت سے نسخے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت فی جلد دو روپئے علاوہ محصولڈاک

۳۔ آزمودہ دوائیں۔ حصّہ اوّل

اِس کتاب میں مکمل اوزان اور پیمانے، برٹش فارما کوپیا کے جدید اور خاص مرکبات درج کئے گئے ہیں۔ انجکشن اور ٹیکوں کا طریقۂ استعمال خاص طور پر بیان کیا گیا ہے، کئی سو انگریزی جدید ترین ادویہ کا مٹیریا میڈیکا اور طریقۂ استعمال درج ہے۔ موجودہ وقت ایک اہم اور خاص الخاص کتاب ہے، بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۲۸،

قیمت فی جلد تین روپئے

۴۔ جلدی امراض کا علاج

اس کتاب میں امراض جلد میں مجرب دواؤں کا مٹیریا میڈیکا اور فارما کوپیا دیا گیا ہے اور چند منتخب مجربات بھی دیئے گئے ہیں۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے

۵۔ خارش

یہ انگریزی کے ایک خاص مقالہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں خارش پر بحث، اسباب، علامات، انداز، اور طریقۂ علاج اور مجرب ادویات کا بیان کیا گیا ہے۔ قیمت فی کاپی آٹھ آنے۔

۶۔ افیون۔ از ــــ ڈاکٹر آر۔ این۔ چوپڑہ۔

یہ ڈاکٹر موصوف کی کتاب "ہندوستان کی دیسی دواؤں" سے ماخوذ ایک مقالہ افیون کا اُردو ترجمہ ہے۔ قیمت فی کاپی آٹھ آنے۔

۷۔ رسالہ مغربی طب ماہوار میرٹھ

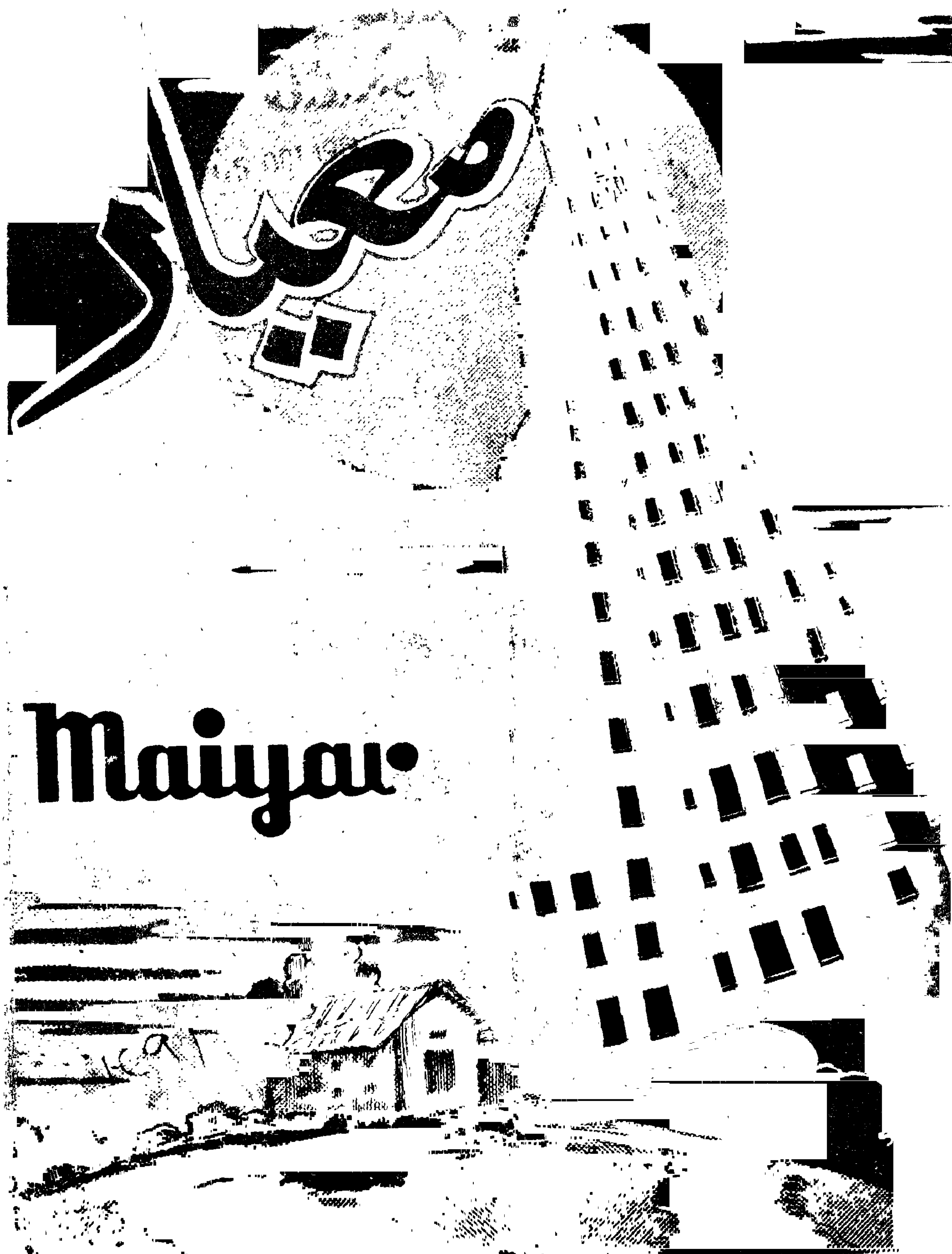
ایڈیٹر:۔ ڈاکٹر بشیر الدین عصری چندہ سالانہ چار روپئے۔ فی کاپی چھ آنے (۶/)

یہ رسالہ ایلوپیتھک ڈاکٹروں کی اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عرصہ چار سال سے جاری ہے۔ ہر ماہ جدید ترین ادویات اور معالجات پر بحث کرتا ہے۔ اور ڈاکٹری کے محیر العقول کارنامے پیش کرتا ہے۔ اور طبیب کے لئے مغربی طب کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔

ملنے کا پتہ

کامیاب انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن میرٹھ شہر

محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ سے شائع کیا


معیار
Maiyar

صحتمند اور تعمیری ادب کا علمبردار

جلد (۱)

شمارہ (۹)

اکتوبر
سنہ ۱۹۵۱ء



ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی

نجم الاسلام

تعاون

سالانہ	پانچ روپیہ
فی پرچہ	آٹھ آنے

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ

سب آفس :- محلّہ کشن گنج دہلی

(مضامین، خط و کتابت، ترسیل زر، اور تبادلۂ جرائد کے لئے ہیڈ آفس)

ترتیب

پاکستان کے خریدار اور ایجنٹ حضرات اپنی رقوم شیخ محمد قمر الدین صاحب پبلشر اندرون موچی گیٹ لاہور کے پتہ پر روانہ کریں۔ اور ہیڈ آفس کو اطلاع دیں۔

ادارہ

نقشِ اوّل

اس پُرآشوب زمانے میں جس ذاتِ بزرگ و برتر کے بھروسے پر مشکلات سے صرفِ نظر کر کے معیار جاری کیا گیا تھا۔ آج اسی کے فضل و کرم سے یہ ماہنامہ
بی دُنیا میں ایک سنجیدہ اور باوقار حیثیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اس پر ہم جتنا بھی امتنان و تشکر کا اظہار کریں کم ہے۔ معیار کی مخصوص سنجیدہ ادبیت تیزی سے
ے کے مشاہیر ادیبوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔ بازاری پرچوں نے اور ان پرچوں نے جنہیں حکومتوں کی سرپرستیاں حاصل ہیں ادبی حلقوں میں
رشات کے مختتانے کی ایسی عادت ڈال دی ہے کہ ایک معیاری اُردو رسالے کے لئے جس کا حلقہ قارئین پہلے ہی سے محدود ہوتا ہے اور وسائل بھی کچھ
ے زیادہ نہیں ہوتے ـــــ کامیابی کی منزلیں طے کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ وہ پہلی سی آسانیاں اور حالات کی سازگاری اب کہاں۔ اس پر بھی ہم چاہتے تو
نانوں اور اُجرتوں کے بل پر معیار کے صفحات معروف و مشہور ناموں کے چلتے ہوئے سکوں سے مزین کر سکتے تھے۔ خواہ واقعتاً وہ سکے کھوٹے ہی کیوں نہ ہوتے۔
نا یہ بات ہمارے مزاج کے خلاف ہے۔ اسی لئے ہم نے کھرے سکوں کا بازار میں چلن نہ ہونے پر بھی کھرے سکے ہی پیش کرنا مناسب سمجھا۔ اور اب اپنے تجربہ
ناپر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زمانہ قریب ہے جب کھوٹے سکے اپنی جھوٹی چمک دمک کھو دیں گے اور دروغ کو فروغ نہ رہے گا ـــــ
کے چوٹی کے ادیبوں میں ایک ایسا صحیح الفکر طبقہ آج بھی موجود ہے جو وقت کے دھارے کے بہاؤ پر کمزور تنکے کی طرح نہیں بہہ رہا ہے۔ بلکہ اس سے
کر بھی کچھ سوچ رہا ہے۔ معیار کی ادبی دعوت نے اس طبقہ کے جذبات کو اُکسانے میں ایک حد تک مدد کی ہے۔ ہمارے لئے کتنی خوشی کی بات ہے کہ
طبقہ نے "بازار میں" اپنے سکوں کا چلن ہوتے ہوئے بھی "معیار" میں دلچسپی محسوس کی ہے اور اس ماہنامے سے تعلقات کو تجارت کا ذریعہ نہیں سمجھا۔ ہمار
ے درمیان جو چیز کام کر رہی ہے وہ خلوص جیسی گرانمایہ شے ہے۔ اور اسی کے بھروسے پر ہم اپنے قارئین سے وعدہ کرتے ہیں کہ گاہ بہ گاہ ان کی نگارشات
ار کے صفحات میں پیش کی جاتی رہیں گی۔

دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر نئی چیز سے طبیعتیں آہستہ آہستہ ہی مانوس ہوا کرتی ہیں۔ پہلے پہل اس پر اوچھے اوچھے واردوں کی وہ بوچھار کی جاتی
لتو بہ ہی بھلی ـــ بعض "تیر انداز" تو یہاں تک بدحواسی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ مشقِ ناز کی دُھن میں تیر کو سیدھا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن جس چیز
ہ ٹھوس فکری بنیادوں پر ہو وہ کب اس طرح کی بے معنیٰ نکتہ چینی سے رُکتی ہے ؎

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر۔ جو بادل گِھر کے آتا ہے وہ آخر چھا ہی جاتا ہے

ایک بڑا پرانا سہ روزہ معاصر ـــــ جو کسی زمانے میں اپنے سنجیدہ صحافتی معیار کے باعث ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے
ـــــ اور جس کے موجودہ
کرام خیر سے ذاتی طور پر ہمارے کرم فرما بھی ہیں ـــــ صالحیت اور تعمیری مقاصد کی جھلک معیار میں پا کر ہم پر خوب خوب برسا ہے "معیار
ندوں کا نہیں بلکہ تعمیر پسندوں کا پرچہ ہے۔ یہ لوگ ترقی پسندی کو ایک تخریبی شے سمجھتے ہیں، کمیونزم اور مغربی جمہوریت کی برائیاں کرتے ہیں اور اس کے
تیسری راہ کی طرف دعوت دیتے ہیں . . . . یہ لوگ جو ادب پیدا کر رہے ہیں اُسے ادب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں پروپگنڈے کا عنصر غالب ہوتا ہے"
قارئین کے لئے یہ امر موجبِ حیرت ہوگا کہ تبصرہ نگار نے ملاقات پر برسبیلِ تذکرہ ستمبر کے شمارے کو خاصے اچھے انداز میں سراہا۔ اُس وقت تک اتفاق

سے تبصرہ ہماری نظر سے نہ گذر سکا تھا کہ اس تضادِ بیان کی توجیہہ دریافت کی جاتی۔ لیکن بعد میں یہ معلوم کرکے ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ تبصرہ کے لئے اپریل کے شمارہ کے بعد زحمتِ مطالعہ ہی گوارا نہ کی گئی تھی۔ محض اندازا اور قیاس سے ہم پر تیر پھینکا گیا تھا۔

تبصرہ کا ایک اور مضحکہ خیز تضاد ملاحظہ ہو۔ الٹی سیدھی تنقید فرمانے کے بعد کا وا زبدل کر ارشاد ہوتا ہے۔ "ترقی پسندوں کو صالح ادب کی تعمیری صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا ترقی پسند اس کے لئے تیار ہیں؟"

اس نادان دشمنی پر ہمیں تبصرہ نگار سے اتنی شکایت نہیں جتنا رونا اس غیر ذمہ دارانہ طریقہ کا ہے جو تبصرہ کے سلسلے میں عام طور سے اداروں میں رواج پا گیا ہے "معیار" تنقید سے بالاتر نہیں۔ نہ ہمیں اس کا دعویٰ ہے اور کون ہے جو اپنی معصومیت کا دعویٰ کرسکے۔ لیکن جہاں تنقید کے پیچھے بے خبری کام کر رہی ہو وہاں بات میں کیا وزن پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ہماری یہ معروضات جو فقط خلوص کے جذبہ کے تحت صاف صاف پیش کر دی گئی ہیں اس غیر ذمہ دارانہ روش کو ختم کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہیں تو ہم سمجھیں گے کہ خدا نے اُردو صحافت کا معیار اونچا کرنے میں ہم سے کچھ کام لیا۔

اس شمارہ میں:

عالم عرفانی کے "اشتراکی نقاد" کی یہ آخری قسط ہے جس میں "ڈاکٹر اختر حسین، عبادت بریلوی اور دوسرے اشتراکی نقادوں کے اُن اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً علامہ اقبال پر کئے جاتے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ قسط خود کوئی مستقل مضمون معلوم نہیں ہوتی مگر اس میں مواد اتنا موجود ہے کہ اس کی مدد سے کئی مستقل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

پریم وار برٹنی اپنی نظم "احتجاج" میں "مشاطۂ اخلاق کے گیسو نوچنے والوں" اور "عقل کے ہاتھ میں نجاست کا ایاغ" دینے والوں پر پوری طاقت سے گرجتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

عام طور سے شہریوں کا ظاہر اچھا خیال کیا جاتا ہے اور دیہات والوں کا باطن مگر ابوالمجاہد زاہد کی نظم "شہر" کا ظاہر اور باطن دونوں اچھے ہیں۔ اس میں زندگی کی دھڑکنیں بھی ہیں اور آرٹ کی رعنائیاں بھی۔

محسن ظفر کی نظم "میں سرگرداں پھیرا" ممکن ہے اوپر سے دیکھنے میں زیادہ قابلِ توجہ نہ معلوم ہو مگر اس کے اندر جو پیاس کی سی ایک کیفیت ہے اسے کچھ اہلِ دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

احسن منظری کی "یہ درس گاہیں" نفسِ تعلیم پر نہیں بلکہ تعلیم کے پست مقصد پر ایک ضرب ہے۔ غالباً تنقید کا یہ نقطۂ نظر "مشرق" اور "مغرب" سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

"امتیاز" میں انور عظمی نے منافقانہ اور بزدلانہ جذب وانجذاب کے اس دور میں "حفظِ خودی" کا پیغام دینے کی جرأت کی ہے۔

نغمائیت، مشاہدہ، تفکر اور نازک نفسیات کا حسین امتزاج "تاباں کی موت" محمود فاروقی کا مثالی افسانہ ہے جو عین مقصدی ہوتے ہوئے بھی تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ اگر ہمارے دوسرے افسانہ نگار بھی اسی رفتار سے ترقی کرنے کی ٹھان لیں تو تعمیری افسانے اُردو میں بہت جلد اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں۔

"جنگ کی بات نہ کرو" ابنِ فرید کا خاکہ ہے جو دل اور دماغ دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ کاش "یہ جنگی تیاریوں کا ڈھول پیٹنے والوں" اور "امن کے نام لیواؤں" کے ضمیر کو بھی متاثر کر سکے!

اور تسکین کی نظم "جنگ" نے جیسے ابنِ فرید کے خاکہ میں رنگ بھر دیا ہو!

ملا رموزی کے تذکرہ دینے والے مزاحیہ مضمون "پانچوں گھی میں" کے اندر اصلاح و تعمیر کے کتنے ہی رموز پنہاں ہیں۔

"انتظار" میں ایم۔ آر۔ ایس ہنستے ہنساتے بڑے دقیق مسائل حل کر گیا ہے۔

خوش کلام اور خوش اخلاق شکیل مراد آبادی کی غزل بتا رہی ہے کہ وہ نئے تقاضوں سے بھی ناآشنا نہیں۔

متانت اور پاکیزگی کے اعتبار سے پنڈت بال مکند عرش ملسیانی کی آواز غزل میں کافی منفرد ہی نہیں اونچی بھی ہے۔ اس کا کچھ ثبوت تو آپ کو اسی شمارہ میں مل جائے گا اور باقی، آئندہ۔

صوفی زمزم چونکہ اہلِ دل ہیں۔ اس لئے سطحی انقلاب کی نظر بندیوں سے مطمئن نظر نہیں آتے مگر ساتھ ہی اُن حقیقی تبدیلیوں کا شعور بھی رکھتے ہیں ج

(ملاحظہ فرمائیے صفحہ [illegible])

نقشِ ثانی

مستقبل میں ملک کی تعمیر

کسی قوم اور ملک کے مستقبل کی تعمیر میں کن کن چیزوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیا کیا عوامل کارفرما ہوتے ہیں کیسی کیسی جاں فشانیوں سے کام انجام پاتا ہے مستقبل پر ماضی کی جھلک کس طرح پرتو فگن اور منعکس ہوتی ہے۔ پچھلی کوتاہیوں، خامیوں اور لغزشوں سے بچنے کی کیا صورت اختیار کی جاتی ہے اور حال کی الجھنوں کو کیونکر سلجھایا جاتا ہے۔ دقتوں اور پریشانیوں کا کیسے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ حالات کس طرح سازگار بنائے جاتے ہیں اور بڑی بات یہ کہ آئندہ کن خطوط پر لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے اور مستقبل سنوارنے کے لئے جدوجہد کا رخ کس سمت کو موڑا جاتا ہے ــــــــ

یہ تمام باتیں کتنی ضروری ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے کسی تعمیری کام کی گوناگوں پیچیدگیوں، مشکلوں اور دشوار و صبر آزما منزلوں کا مطالعہ جدوجہد اور سعی و عمل کے آئینہ میں کیا ہے اور زندگی کی پُرپیچ راہوں سے گذر کر نشیب و فراز کا جائزہ لیا ہے یہ تمام باتیں بنیادی سی باتیں ہیں جنہیں اچھی طرح سوچے سمجھے اور جانے بوجھے بغیر کوئی عملی قدم اکثر تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اس فکری جدوجہد میں جہاں ذرا سی خامی، ذرا سا جھول اور ادنیٰ سی کجی بھی آجاتی ہے عملی دنیا کا وہی گوشہ بے راہ روی، گمراہی اور لغزش کا سبب بن جاتا ہے اور سارے نظام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی گروہ کوئی قوم اور کوئی ملک زیادہ سوچے سمجھے بغیر اور کسی پائیدار اور ٹھوس فکری بنیاد کے نہ ہوتے ہوئے محض جذباتی طور سے کسی کام کا بیڑا اٹھاتا ہے وہ اسی طرح کے نتائج سے دوچار اور اسی طرح کی لغزشوں کا شکار ہوتا ہے۔ آگے چل کر لامحالہ اس کی قوتیں اندھی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونا بنکر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت مستقبل کا کوئی دھیان نہیں رہتا۔ اور انجام کار جدوجہد کا اصل مقصد اور سعی و عمل کا حقیقی منتہا دھندلکوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کوششیں ناتمام رہ جاتی ہیں۔ اس طرح کے انداز فکر و طریق عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تعمیری مقاصد اور وہ اہم ترین ضرورتیں اور نازک ترین مسائل تو پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں جن کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا گیا تھا اور دوسری ضمنی اور فروعی باتیں ابھر آتی ہیں اور اس شدت سے ابھر آتی ہیں کہ فکری خامیاں انہی کو اہمیت کا انتہائی درجہ دے بیٹھتی ہیں۔ ان ضمنی چیزوں کے ابھر آنے میں اگر تھوڑا بہت ہاتھ ہنگامی حالات کا ہوتا ہے تو بڑی حد تک وہ اس ذہنی کج روی کے باعث بھی جنم لیتی ہیں جو عمل سے پہلے پوری طرح سوچ بچار نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں اہم نہ ہوتے ہوئے بھی فروعی اور جزوی باتیں سب سے اہم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یہ صورتِ حال کچھ اتنی غلیظ اور دبیز ہوتی ہے کہ اس کے پردے میں مستقبل بالکل چھپ کر رہ جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو کسی ملک کے مستقبل کی تعمیر کے لئے اس طرح کے حالات انتہائی نازک ہوتے ہیں۔ ایسے مقام پر آجانے کے بعد جہاں سے مستقبل کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا ایک بارِ گراں سوار ہو جاتا ہے۔ نئے نئے حالات، نئے نئے تقاضوں اور نئے نئے مسائل سے دوچار ہونے کے لئے بڑی کوششوں کی اور تدبر و تفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں سے حالات بالکل جدا ہو جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو جذباتی جدوجہد کی برائیاں کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوتیں لیکن جب تعمیرِ مستقبل کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر نزاکتِ حالات تمام چھپی ہوئی کمزوریاں اگل دیتی ہے۔ اور اگر ان کمزوریوں کا تدارک بروقت نہیں کیا جاتا تو پھر اسی تخریب پسندانہ ذہنیت کو ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے جو برسوں کی جدوجہد کے بعد آہستہ آہستہ ختم کی جاتی ہے۔

ملک کی تعمیر کا سوال سامنے آتے ہی اور اس نئے موڑ پر قدم رکھتے ہی جس اہم مسئلہ کی طرف دھیان دیا جانا چاہئے وہ آئندہ کے لئے طریق عمل اور لائحہ عمل کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ اور ان خطوط کے تعین کا معاملہ ہے جن پر تعمیرِ مستقبل کی بنا رکھی جاتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ دراصل ان خطوط اور

اُن راستوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یوں اگر کجی لئے ہوں تو قدم قدم پر لغزشیں ہوتی ہیں اور اگر صحیح راستہ مل جاتا ہے تو پھر منزل تک رسائی ہونے میں عزم و ہمت کے علاوہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں رہتی۔

اہم ترین مسئلہ

آزادی کے حصول کے بعد ہمارے [illegible] سب سے اہم ضرورت اور سب سے ضروری مسئلہ مستقبل میں ملک کی تعمیر کا مسئلہ ہی ہے۔ اس لئے کہ اب تک ہم نے آزادی کے لئے جو جدوجہد [illegible] کی تھی [illegible] تعمیر آزادانہ طور سے کی جا سکے۔ یہ مقصد اگر نا تمام رہ جاتا ہے تو آزادی سے فائدہ ہی کیا۔ اس طرف [illegible] کی ضرورت ہے کہ ہماری پچھلی جدوجہد فقط غیر ملکی [illegible] لڑائی کی تحریک پر چلی تھی اور محدود قوم پرستانہ نظریات کی بنیاد پر جذبات کو اکسا کر سارا کھیل کھیلا گیا تھا۔ کوئی ٹھوس نظامِ فکر اور کوئی منظم تربیت کا پروگرام اس جدوجہد کی پشت میں کارفرما نہ تھا۔ اب جبکہ صورت بدل چکی ہے اور نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں ہمارے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی ہونی چاہئے اور [illegible] کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا کوئی [illegible] ناچاہئے۔ اگر آج بھی پہلے کی طرح بغیر کسی ٹھوس نظامِ فکر و عمل کے مستقبل [illegible] اوپر چھوڑ دیا [illegible] تو ملک کا مستقبل [illegible] پڑ جائے گا۔ اور ان تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا جو کوئی قوم اور کوئی ملک اپنی آزادی سے لگایا کرتا ہے۔ اس مسئلہ کی شدید اہمیت کے پیشِ نظر بجا طور سے توقع کی جا سکتی تھی کہ ارباب قیادت اس طرف توجہ دیں گے لیکن ماضی نے ان کے ذہن ایک خاص سانچے میں ڈھال دیئے ہیں اسی لئے وہ ملک کی تعمیر کے نئے تقاضوں سے بڑی حد تک بے خبر نظر آتے ہیں۔ ان کے رویہ میں کوئی ایسی تبدیلی ابھی تک نہیں آئی جس سے حالات کی تبدیلی [illegible] جدوجہد کے نئے راستے کھل سکے۔ بلکہ غیر جانبدارانہ دیکھا جائے اور آزادی کے بعد کے حالات کا صحیح جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ حقیقت [illegible] ایسی خرابیاں نظر آتی ہیں جو ہمارے پچھلے [illegible] طریق فکر کی پیداوار ہیں۔ تعمیری مقاصد بدقسمتی سے ہمارے پیدا کچھ تو ہنگامی حالات [illegible] پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں اور [illegible] ذہنی غلامی کے اثرات [illegible] آزادی سے پورا فائدہ نہیں اٹھانے دیا اس لئے بھی یہ اہم مقاصد اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ ذہنی غلامی [illegible] رکھنے [illegible] کے اثر سے سوچ بچار کا فقدان یا فکری کج روی نظر آتی ہے۔ [illegible] آزادی [illegible] انقلاب اور محدود نظریات [illegible] ہیں کہ ہم اب ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں [illegible] پاؤں میں سکت ہوتے ہوئے بھی منزلِ حیات کی سمت یقین و عزم کے ساتھ اس لئے گامزن نہیں ہوتے کہ منزل کا واضح تصور اور مقصد کی ایسی روشنی ہمارے پاس نہیں جو دھندلکوں میں رہنمائی کر سکتی ہو۔ یہ سب اسی سوچ بچار کے فقدان کا نتیجہ ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اب آیئے ہم اُن خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا جائزہ لیں جو ملک کی تعمیر میں ہماری رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی ہیں۔

آزادی کا غلط مفہوم

پہلی بنیادی غلطی تو یہی ہے کہ ہمارے ذہن میں آزادی کا جو کچھ تصور بیٹھا ہے یا دانستہ کسی خاص مقصد کے لئے بٹھایا گیا ہے وہی غلط ہے۔ ہم نے آزادی [illegible] کا آغاز کیا تھا کہ کسی [illegible] غیر ملکی طاقت کے استبداد اور ریشہ دوانیوں سے نجات مل جائے اور بس۔ پھر اپنا ملک اپنے ہاتھوں میں آ جائے گا [illegible] اور ایسا ہو گیا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آزادی ملنے کے بعد بھی عوام وہی کڑوے کسیلے پھل چار و ناچار نگل رہے ہیں جو عہدِ غلامی میں کھا رہے تھے۔ ہاتھ بدل جانے کے بعد بھی [illegible] عوام کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں کر سکی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر آزادی صرف چند اوپر کے ہاتھوں [illegible] بدل جانے کا نام نہیں بلکہ پورے فاسد نظام کے بدل جانے کا نام ہے اور مصائب کے خاتمے کی ایک [illegible] ہے تو ہم آزادی کی برکتیں حاصل کرنے میں قطعاً ناکام رہے ہیں۔ [illegible] یہاں کا نظام [illegible] آزادی کے بعد بھی اسی طرح [illegible] کے بل بوتے پر چل رہا ہے جس طرح غلامی کے دور میں اس فاسد طریقہ پر چل رہا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی، کوئی انقلاب اور کوئی تغیر نہیں آیا یہی وجہ ہے کہ نتائج کے اعتبار سے دونوں ادوار کی خرابیوں میں وہی یکسانی ہے۔ حقیقت میں آزادی کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں کہ ہم نے غیر ملکی طاقت کی سیاسی غلامی سے نجات حاصل کر لی بلکہ سچی آزادی اس سے آگے ذہنی غلامی سے بھی چھٹکارا دلاتی ہے اور اس وقت جو غیر اپنوں کی ریشہ دوانیوں، [illegible] پردازیوں اور من مانی کارروائیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ آزادی کا کمال یہ ہے کہ [illegible] انسانوں کی غلامی سے ہی آزاد ہو جائے اور ایک اصولی اور مکمل اخلاقی نظام قائم ہو جائے جس کے تحت سب باعزت اور پرسکون زندگی بسر [illegible] آزادی کا یہ مفہوم نظروں سے اوجھل ہے اور ایک محدود سا تصور پرورش پا گیا ہے جو مصائب میں اضافہ کا موجب بن رہا ہے۔ [illegible] نظریات سے [illegible] زیادہ وسیع جو مقصد سامنے آتا ہے وہ قومی استقلال یا NATIONAL STABILITY ہوتا ہے یعنی نقطۂ اپنے ملک اور اپنی قوم کا استقلال، قطع نظر اس سے کہ باہر کی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اور امن کا کیا حشر ہوتا ہے۔ قوم پرستی کا یہ مفہوم موجودہ دور میں جبکہ دنیا ایک وسیع خاندان کی طرح قریب آتی جا رہی ہے اور عالمی حکومت کا تصور جنم لے رہا ہے بڑا مہلک معلوم ہوتا ہے۔ ایک قوم سے دوسری قوم کے ٹکراؤ میں جو تنگ نظری پائی جاتی ہے وہ اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ دنیا کے سیاسی بحران میں جتنا حصہ اس قومی تفاخر، نسلی امتیاز اور قومی مفاد کا ہے شاید ہی اور کسی چیز کا ہو۔ قوم پرستانہ نظریات کی تنگ دامانی کسی ملک اور قوم کے اخلاق پر بہت برا اثر ڈالتی ہے قوم کی قوم اور ملک کا ملک اپنی سیرت و کردار کو قومی تعصبات کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

اور پھر نظریات محدود ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو آہستہ آہستہ قوم پرستی سے گذر کر یہی رجحان ذات پرستی کی حدود تک پہونچ جاتے ہیں۔ یا پھر فاشزم کی طرف جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ اور قومی استقلال کا مطلب ذاتی استقلال (INDIVIDUAL STABILITY) میں بدل جاتا ہے ہر فرد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی ذات کا استقلال ضروری ہے چاہے جماعت اور قوم پر اس کا اثر کیسا ہی پڑے۔ استقلالِ ذاتی اور استقلالِ قومی کا ٹکراؤ قوم کے مستقبل کو لے بیٹھتا ہے نزاع کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ آج ہمارے یہاں بھی یہی خطرناک صورت پیدا ہو گئی ہے۔ آئے دن قومی خدمتوں کا ڈھول پیٹنے والے استقلالِ ذاتی کی دھن میں قومی استحکام کا نقصان کر رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ قومی استحکام کے آگے ذاتی استقلال اسی طرح اہمیت نہیں رکھتا جس طرح قومی استحکام انسانیت دوستی کے سامنے قابلِ اعتنا نہیں۔ اگر قومی استقلال واستحکام کی دھن میں دوسری قوموں پر ظلم کا کوئی پہلو نکلتا ہو اور پوری انسانیت کا مفاد اس سے مجروح ہوتا ہو تو وہ قومی استقلال ایک فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اسی طرح اگر ذاتی استقلال سے تمدن اور قوم کی سیرت وکردار کا شیرازہ بکھرتا ہو تو اسے ہم ایک لعنت ہونے کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

اجتماعی تربیت کا صحیح تصور

ایک غلط اور ہے جو اجتماعی تربیت کے سلسلے میں کی جا رہی ہے کسی نوخیز ملک کی آزادی اور اس کی بقا کے لئے اجتماعی تربیت جتنی ضروری ہوتی ہے وہ ظاہر ہے لیکن اجتماعی تربیت کا یہ مفہوم صحیح نہیں ہے کہ نازی ازم کی طرح پوری قوم ایک منظم دستہ فوج میں تبدیل کر دی جائے اور پھر اس کے ذریعہ دنیا کو مسخر کر لیا جائے تاریخ نے اس کے بڑے بڑے بھیانک نتائج پیش کئے ہیں اور ان سے سبق نہ لینا کھلی ہوئی نادانی ہوگی۔ یہ مفہوم اگر لیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے خلاف اپنے تحفظ سے زیادہ دوسری قوموں پر ظلم کرنے کی راہ کھل جاتی ہے۔ اجتماعی تربیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ قوم و ملک کی سیرت کی تعمیر ایسے صالح اصولوں اور ایسے اعلیٰ اخلاقی نظام کے مطابق کی جائے جہاں انسانیت دوستی کا جذبہ پنپ سکے، بہتر زندگی گذارنے کی فضا پیدا کی جائے اور ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کر دیا جائے جہاں برائیوں کا سرچشمہ یکسر نابود ہو جائے۔ اجتماعی تربیت نہ ہونے یا غلط خطوط پر ہونے سے قوم کے مستقبل پر بہت برا اثر مرتب ہوتا ہے۔ غلط تربیت سے زیادہ کوئی اور چیز سیاسی بحران میں شاید ہی اضافہ کرتی ہو۔ ہیئتِ اجتماعی (SOCIAL STATUS) میں حقیقی روح کے فقدان سے پورا نظام سیاست ایک بے جان لاشہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور رسمی تربیت و تنظیم اس لاشے کی خوشنمائی میں تو بظاہر معاون ہو سکتی ہے لیکن یہ کہ اس میں حرکت کی صلاحیت پیدا کر سکے اور حیات تازہ بخش سکے ایسا ہرگز ممکن نہیں۔

بے اصولی کے نتائج

تیسری غلطی اور بڑی سخت غلطی ہماری بے اصولی ہے جو اکثر ہمارے فکر وعمل میں مضحکہ خیز تضاد پیدا کر دیتی ہے ہم سوچتے کچھ ہیں اور عمل کرتے وقت راہ کچھ اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنا کوئی واضح مقصد اور وسیع نصب العین نہ ہونے کی وجہ سے یا ہر کی ہر چمکتی ہوئی چیز سونا معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر عالمی سیاست میں ہمارے ملک کی پوزیشن کا جائزہ لیجئے۔ دنیا اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ روسی اشتراکی محاذ اور امریکی سرمایہ دارانہ بلاک یہی دو بلائیں ہیں جو اس وقت اندھیری رات بن کر دنیا پر چھا گئی ہیں۔ اور اپنے مفاد کی رو میں انسانیت کا خون کر رہی ہیں۔ اب اگر کوئی انسانیت پسندی کا ثبوت دینا چاہے تو ظاہر ہے کہ اسے ان دونوں بلاکوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہ دینا چاہئے بلکہ ایک تیسری منصفانہ راہ کی تلاش کرنی ہوگی۔ تیسری راہ کے لئے اور ایک سچے امن پسند گروہ کی تشکیل کے لئے پہلے جو کچھ کرنا ہے وہ فوجی تنظیم نہیں بلکہ ذہنی اور فکری تیاری ہوگی تیسری راہ کے لئے نظریات کی جنگ سب سے اہم ہے۔ ان نظریوں پر ان کی خامیاں واضح کرنے کے لئے ایک تیسری راہ کے حامیوں کو تیسرا بہتر نظام اور تیسرا بہتر نظریہ پیش کرنا ہوگا۔ بھارت ہلکے ہلکے اعتدال پسندانہ رجحانات تو رکھتا ہے جیسا کہ کہیں کہیں اس کے خارجی معاملات سے ظاہر بھی ہوتا ہے لیکن بے اصولی اس رجحان کو دبا دیتی ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا مستقل نظریہ ہی نہیں جو دونوں بلاکوں کے نظریات کی تخریبی روش کے مقابلے میں انسانیت پسندی اور بہتری کا ثبوت دے سکے۔ الٹے سیدھے اور ادھر ادھر کے محدود سے نظریات کا ایک آمیزش (MIXTURS) ہے

جو ہر جگہ اور ہر مسئلے میں واضح رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ چین، کوریا اور یو۔ این۔ او کے معاملوں کو لے لیجئے۔ بے اصولی اور تضاد صاف عیاں ہو جائیگا۔ عالمی سیاست میں یہ رویّہ فقط مثال کے طور پر معرضِ بحث میں آگیا ورنہ بے اصولی ہمارے اکثر ملکی معاملات میں ظہور کیا کرتی ہے۔

اس بے اصولی کے نتائج بھی بڑے مضر ہوتے ہیں۔ پھر کوئی بھرم اور کوئی ساکھ نہیں رہتی۔ پوزیشن مضحکہ خیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تعمیری کام کبھی انجام نہیں پا سکتے۔

ان سب گذارشات کے بعد ہم یہی عرض کریں گے کہ ملک کے مستقبل کی تعمیر کے لئے پہلے اپنے یہاں کے نظامِ فکر میں تبدیلی اور تغیر کی سخت ضرورت ہے۔ وہ مغربی نظامِ فکر جو غلامی کے دور میں ہم نے ورثہ میں پایا تھا ہمارے لئے نہ صرف بیکار ہے بلکہ شدید طور سے مضر پڑ رہا ہے۔ اگر ہماری گاڑی اسی لائن پر دوڑتی چلی جائے گی تو کیا عجب ہے کہ ہم مستقبل میں خوش آیند خواب کی آرزوئیں لئے ہوئے اسی قعرِ مذلت میں گر جائیں جس میں گر کر مغربی نظامِ فکر کی بدولت بہت سے ملک تباہی کا منہ دیکھ چکے ہیں اور بہت سے ہماری طرح اس کی طرف تیزی سے اندھا دھند بڑھے جا رہے ہیں۔ ملک کی ترقی کے لئے ہمیں ایسا نظام درکار ہے جو مادہ پرستانہ بنیادوں سے ہٹ کر خدا پرستانہ بنیادوں پر اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر ایک صالح اجتماعیت وجود میں لا سکے اور اجتماعی و انفرادی آزادی کے تصادم سے پیدا شدہ تمام فتنوں کا مکمل سدِّباب کر سکے۔ صالح اجتماعی زندگی ہی ہماری موجودہ ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت ہے۔

کیا بھارت کے عوام اور اصحابِ فکر اس طرف توجہ دے سکیں گے؟

نقشِ اوّل

طرف سے اردو شاعروں کا ایک طبقہ آنکھیں بند کئے ہوئے بدستور اُونگھ رہا ہے۔

مشکور احمد صدیقی نے جس بے تکلفی سے ادبی مسائل کا تذکرہ چھیڑا ہے اس کے لئے خط کا اندازِ تحریر ہی سب سے زیادہ موزوں تھا۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے بعض "ترقی پسندی" کے مفہوم کے بارے میں مراسلہ نگار سے متفق نہ ہوں۔ لیکن اگر اس کا مطالعہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے رُوحِ رواں ڈاکٹر عبدالعلیم کے بیانات کی روشنی میں کیا جائے تو مشکور کی بات ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔

عالم عرفانی۔ بی۔ اے

اشتراکی نقاد

(۳)

یہ مضمون نامکمل رہے گا۔ اگر خالص نظری مباحث سے ہٹ کر اشتراکی نقادوں کی اُس روش کی نقاب کشائی نہ کی جائے، جو عموماً یہ لوگ غیر اشتراکی ادیبوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے مقصد کے پیشِ نظر صرف اقبال کا تذکرہ کافی ہوگا۔

یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہم کسی فرد کو "عقلِ کل" ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کو اعتراض محض اس طریقے پر ہے کہ علامہ اقبال پر یہ لوگ ایسے اتہامات بلا پس و پیش عائد کرتے چلے جاتے ہیں جن سے ان کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

سرمایہ داروں کی حمایت کا طعنہ

اس سلسلے میں سب سے زیادہ نکتہ چینی مندرجہ ذیل شعر پر کی گئی ہے ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ایک اشتراکی اس شعر سے یہ مطلب اخذ کرتا ہے کہ اقبال عوامی حکومت کا مخالف ہے۔ اور ضمناً اس طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت کا حامی ہے۔ لیکن یہاں کھلی ہوئی دھاندلی سے کام لیا گیا ہے۔ یقیناً اقبال مزدور راج کا قائل نہیں، مگر ساتھ ہی وہ سرمایہ دارانہ طرزِ حکومت کا بھی مخالف ہے۔ وہ سرے سے اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ انسان پر انسانوں کی حکومت ہو۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن　　　　تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

دقیانوسیت کا الزام

دوسرا اعتراض اقبال پر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ جاگیردارانہ ماحول کا پلا ہوا شاعر مشینوں سے خائف اور سائنسی ترقیوں کا مخالف ہے۔ اور ثبوت کے لئے یہ شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت　　　　احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

کیا واقعی اس شعر سے قدرت کے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھانے کی مخالفت کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ کیا ایک ایسے شخص سے جس کا نظریہ یہ ہو :۔

"خدا اور انسان دونوں اپنی تخلیقی صفات کے باعث زندہ ہیں"

یہ بات ممکن بھی ہے؟ اس اعتراض کو مہمل ثابت کرنے کے لئے تو صرف اتنا ہی کافی تھا کہ اقبال یہ الفاظ لینن کی زبان سے ادا کرا رہا ہے۔ جو اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اقبال کا اشارہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی طرف ہے۔ پھر جب ہم سیاق و سباق پر نظر ڈالتے ہیں تو شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اس سے پہلے اسی قسم کے اشعار ہیں ؎

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت　　　　پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس　　　　کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اور آخری شعر یہ ہے ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ　　　　دنیا [illegible] روزِ مکافات

کون نہیں جانتا کہ سرمایہ داری نے مشین کا سہارا لے کر انسانیت کی رگ رگ کو کاٹ دیا ہے۔ اب اگر شاعر کا حساس دل اس پر فریاد کرتا ہے تو یہ اشتراکی نقاد اپنے تیور کیوں بدلنے لگتے ہیں؟

یہ ساری بحث تو اسی وقت تک ہے جب تک کہ ہم "مشین" کو مشین ہی کے معنی میں استعمال کریں لیکن شعر کا انداز یہ بتاتا ہے کہ شاعر نے اس جگہ "رمزیت" سے کام لیا ہے "مشین" سے اس کی مراد سرمایہ دارانہ نظام حیات ہے اور بس۔ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

فاشزم کی تہمت

تیسرا اعتراض اقبال پر یہ کیا جاتا ہے کہ نیٹشے کے فلسفہ سے متاثر ہو کر وہ خونریزی، سفاکی اور بربریت کی تعلیم دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار کو پڑھئے جن میں "شاہین" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سال خورد　　　　اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخ بریں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر　　　　وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اشتراکی نقادوں نے یہاں ایک بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اقبال کو خواہ مخواہ نیٹشے کا پیرو کار فرض کر لیا ہے۔ حالانکہ اقبال قرآنی فلسفۂ حیات کے سوا کسی اور کا تابع نہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال پر ایسے اعتراضات سرمایہ دار طبقہ کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ اور اس کی ایک نفسیاتی توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ خود معترضین کی عملی زندگی فتنہ و فساد کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اس لئے اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کیلئے وہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام اشعار کا مقصد انسان کو سخت کوشی، سعیٔ پیہم اور لامتناہی جدوجہد کی تعلیم دینے کے علاوہ کچھ بھی نہیں، اور اگر آنکھوں پر تعصب اور تنگ نظری کی پٹی نہ بندھی ہو، تو یہ حقیقت، انہیں اشعار سے عیاں ہے۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں　　　　ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

دراصل اقبال کے ہاں ہمیں اس قسم کے جواہر پارے بہت ملتے ہیں جن میں اسلام کے نظریۂ جہاد کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔

عمل پیہم، یقیں محکم، محبت فاتحِ عالم　　　　جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے　　　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

خصوصاً اس قطعہ میں علامہ اقبال نے اپنے خیالات کو بڑی صفائی سے پیش کیا ہے ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے　　　　تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او، دلِ دردآشنائے　　　　چو جوئے در کنارِ کوہسارے

اب بھی اگر کسی کے دل میں اقبال کی طرف سے شبہات موجود ہوں تو وہ اس شعر کو دیکھے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　　　دگر نہ مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

عقل دشمنی کا بہتان

اقبال پر چوتھا اعتراض عقل و عشق کی کش مکش کے بارے میں کیا جاتا ہے، اور یہاں پھر میرے ذہن میں C 7 N / C S کی عجیب الہیئت صورتیں ابھرنے لگتی ہیں۔ اقبال عقل و عشق کی آمیزش چاہتا ہے، آویزش نہیں۔ اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ عقل سماج دشمن عناصر کا بھی اتنا ہی آلہ کار بن سکتی ہے، جتنا کہ ترقی پسندانہ انسانی قوتوں کی۔ . . . . . لیکن دو صورتیں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ عشق عقل کی رہنمائی کرے ورنہ یہ دو پیروں پر چلنے والا حیوان نفسانیت کا شکار ہو کر انسانیت کے لئے خطرۂ عظیم ثابت ہو سکتا ہے۔ بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے جس شخص کو "محبت فاتح عالم" کا سبق یاد نہیں، آخر اس سے انسانی ہمدردی کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

اقبال کا عشق "راہبوں اور سنیاسیوں کا مردہ عشق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک فعال قوت کا نام ہے۔ جو ہمیں ہمیشہ "ظن" سے "یقین" کی طرف، اور حیوانیت سے انسانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ شجاعت، صداقت، عدالت، دراصل اسی عشق کے مظاہر ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ چیزیں زندگی سے گریز کرنے والوں کے لئے نہیں ہیں، بلکہ اُن لوگوں کے لئے ہیں جو طوفانی لہروں سے مقابلہ کرنے کی خواہش رکھتے ہوں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال نے جہاں کہیں "عقل" کی مخالفت کی ہے، وہاں صرف وہ عقل مراد ہے جو بغیر "عشق" کے مسائل زندگی کے حل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جو دنیا میں قطعی ناکام ثابت ہو چکی ہے۔

عورت کی تحقیر کا اتہام

پانچواں اعتراض اقبال پر "مسئلہ زن" کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ اور غالباً موجودہ حالات میں اسے اہم ترین اور مشکل ترین مسئلہ زندگی کہنا مناسب ہے لیکن جن اشتراکی نقادوں نے مندرجہ بالا اصناف اور نسبتاً آسان مسائل میں عمداً یا سہواً اتنی غیر ذمہ دارانہ اور نامنصفانہ روش اختیار کی ہے ان کا اس نازک مسئلہ پر قلم اٹھانا دراصل ادب کی بدقسمتی، معاشرے کی بدقسمتی، بلکہ انسانیت کی بدقسمتی ہے۔ یہاں نظریات میں جو تصادم ہوتا ہے وہ محض اقبال اور غیر اقبال کا تصادم نہیں۔ بلکہ یہ اسلام اور جاہلیت کا ٹکراؤ ہے۔ فطرت اور غیر فطری جذبات کا ٹکراؤ ہے۔ انسانیت اور حیوانیت کا ٹکراؤ ہے۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر کی مختصراً توضیح کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی ایک شخص میں انسانیت کی کوئی رمق باقی رہ سکتی ہے لیکن آزاد جنسی تعلقات کے بعد انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ بات نہ صرف ظاہری حیثیت میں صحیح ہے بلکہ اس کا نفسیاتی "ردِعمل" اس قدر انسانیت سوز ہوتا ہے کہ ایسے ماحول کے افراد سے کسی وقت بھی انتہائی غیر انسانی حرکات صادر ہو سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک دراصل خیر و شر کا کوئی بھی ضابطہ قائم نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں سے کسی انسانی اصول کی وفاداری کی توقع ہی نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ کسی چیز کا اسی وقت تک ساتھ دے سکتے ہیں جب تک کہ ان کی نفس پرستی کو اس سے سہارا ملتا ہے۔ ورنہ فوراً وہ دوسرا راستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ (جس کی طرف اس سے پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے) یہ ہے کہ عورت اپنے فطری فرائض کو تو بہرحال ادا کرے گی۔ اب اگر اس پر معاش کی فکر کرنے اور سامانِ تفریح بننے کی ذمہ داریاں اور ڈال دی جائیں، تو پھر نسلِ انسانی کو آخری تباہی سے بچانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ عورت مجسم سکون ہے۔ رحمت ہے۔ محبت ہے۔ لیکن اسی وقت تک جب تک کہ اسے نیم مرد بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ پرورشِ اولاد نطشے یا مارکس کے نزدیک ذلیل کام ہو سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ ایک نازک فن اور شریف ترین مشغلہ ہے۔ مرد مشین سازی اور عمارت سازی کرتا ہے لیکن عورت، "انسان سازی" کا کام انجام دیتی ہے، اور فطرۃً وہی اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔ ایک بچے کے لئے آغوشِ مادر ہزار نرسنگ ہاؤس سے بہتر ہے۔ کیونکہ بقول کسے انسانی اولاد کی ساخت پرداخت باٹا کے جوتوں کی طرح نہیں کی جا سکتی۔ یہ انسانیت کی توہین ہے اس معاملے میں عورت کی غفلت درندوں کو جنم دے سکتی ہے، انسان نہیں پیدا کر سکتی۔

یوں تو اس دور جاہلیتِ محضہ کی ہر ہر سانس سے فریب و ریاکاری کا ظہور ہوتا ہے لیکن غالباً موجودہ دور کا سب سے بڑا فریب وہ ہے جو عورت کو آزادی کے نام پر دیا گیا۔ کل جو عورت رونقِ کاشانہ تھی، آج ہزاروں مردوں کی خواہشات کی غلام ہے۔ فطری بندشوں کو توڑ کر ایک شخص غیر فطری زنجیروں میں بندھ سکتا ہے۔ آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جو انتہا پسند آج زبردستی عورت کو بازار کی زینت بنا رہے ہیں۔ کل جب اپنی مکمل تباہی کے ہیبت ناک مجسمہ کو دیکھیں گے، تو یہی لوگ سب سے پہلے عورت کو "اژدہا" اور "شیطان کی آلہ کار" کہہ کر اس کا منہ سی دینے، زندہ گاڑ دینے اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دینے کی فکر کریں گے۔ یہ ڈرامے پہلے بھی کئی بار کھیلے جا چکے ہیں۔ اور افسوس کہ حالات کی نزاکت ایک بار پھر وہی کھیل کھیلنے پر مصر ہے۔

یقیناً عورت کے متعلق اقبال کے نظریات ایک خوف پر مبنی تھے۔ لیکن متذکرہ بالا تشریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خوف بے محل تھا۔ اقبال کی حقیقت بیں نظریں دیکھ رہی تھیں کہ عورت کی اخلاقی تباہی دراصل انسانیت کی تباہی کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ دراصل معاشرہ میں عورت کی اہمیت کی دلیل ہے۔ اسی لئے اقبال اسے فرنگی مدنیت کی فتوحات سے بچانا چاہتا ہے ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت ۔۔۔ ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

اشتراکی نقادوں کا یہ کہنا کہ اقبال کی نظر میں عورت کا ایک بہت ادنیٰ تصور ہے، اُن کے عام اندازِ افترا پردازی کا ایک جزو ہے۔ جو مرد ایسا کہتا ہے وہ ذہنی غلامی میں مبتلا ہے۔ اور جو عورت ایسا کہتی ہے وہ احساسِ کمتری کی شکار ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھئے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اُسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اُسی دُرج کا دُرِ مکنوں

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اقبالؔ کے نزدیک عورت پست درجہ رکھتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے ہر بات میں اپنی تذلیل نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب بھی عورت اور مرد کی فطرت میں کسی فرق کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ تو عورت اور خصوصاً اشتراکیت زدہ عورت فوراً اس کو اپنی تضحیک و تحقیر سمجھنے لگتی ہے۔ خواہ اُس میں اس قسم کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ اس سلسلہ میں علیگڈھ کی محترمہ جمیلہ خاتون کا مضمون

"IQBAL'S CONCEPTION OF A PERFECT WOMAN"

انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھئے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن — گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا — ہر قطرہ ہے بحرِ بے کرانہ

وغیرہ وغیرہ

اس قسم کے اشعار کا تجزیہ کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتی ہیں کہ دیکھئے اقبالؔ "مردِ مومن" کے لئے تو ایسی اعلیٰ خصوصیات کی تعیین کرتا ہے، لیکن عورت سے وہ تعلیم اور انسانیت کی تعمیر میں حصہ لینے کا بھی حق چھین لینا چاہتا ہے "بندے" کی خودی کو تو وہ اُس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں تقدیرِ الٰہی بھی اس کی تابع ہو جائے۔ لیکن عورت کی خودی کے لئے اس کے ہاں کوئی مقام نہیں۔ یہاں دراصل ذہنی انتشار اور احساسِ کمتری کی انتہا ہو گئی ہے۔ ایک سرسری نگاہ بھی اس بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ "بندہ" یا "مردِ مومن" عام الفاظ ہیں جن کو اقبالؔ نے "انسانی گروہ" کے لئے استعمال کیا ہے، ان میں مذکر و مؤنث کی ہرگز کوئی تخصیص نہیں۔

اقبالؔ عورت (یا مرد) کی تعلیم کا مخالف نہیں۔ وہ جس قسم کی تعلیم عورت کے لئے مضر سمجھتا ہے، اس ڈھنگ کی تعلیم کو مرد کے لئے بھی خطرناک تصور کرتا ہے اگر وہ عورت کے لئے کہتا ہے :-

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

تو مرد کی تعلیم کے بارے میں بھی اس کی یہی رائے ہے۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے — قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

اگر عورت کی تعلیم پر اس کا طنز ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

تو مرد کی تعلیم پر بھی اقبالؔ کے دکھے ہوئے دل کا زہرخند غور طلب ہے۔

اقبالؔ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

اقبال نے "عورت" کے مسئلہ میں صرف ایک غلطی کی ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اس نے کہا ہے ڈرتے ڈرتے کہا ہے۔ وہ ذات جس کی شاعری نے ع

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

کا ولولہ انگیز پیغام سنایا، عورت کے سلسلے میں یہ کہہ کر گذر جانا چاہتی ہے۔

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

یا

میں بھی مظلومئی نسواں سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

حالانکہ وہ اس مشکل کا حل اچھی طرح سمجھتا ہے۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند

غالباً اس ابہام کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نگاہیں پردہ اٹھنے کی منتظر تھیں۔ ایک جگہ یہ ابہام کسی قدر مغالطہ انگیز ہو کر رہ گیا ہے ؎

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

اگر اس شعر کا وہی مفہوم لے لیا جائے جس کی تشہیر اشتراکی نقاد کرتے رہتے ہیں تو پھر اس کے بعد کے اشعار بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں ؎

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نقطۂ شوق — آتشیں لذّتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات — گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

بات صرف یہ ہے کہ اگر پھول کی خوشبو ہوا کے توسّط سے پھیلتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ پھول یا اس کی خوشبو بجائے خود کوئی ذلیل و حقیر چیز ہے۔ اشتراکی تنقید کا یہ پہلو بہت گھناؤنا، انسانیت سوز اور مغالطہ انگیز ہے کہ یہ لوگ تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتے ہیں۔ اور پھر تنقیص و تنقید کا ایک انبار لگاتے چلے جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر میں اقبال کے نظریہ کو غلط کہا جا سکتا ہے۔ لیکن "حقارت" کا پہلو نہیں نکالا جا سکتا۔

جہاں تک "تعمیر انسانیت" میں عورت کے حصہ لینے کا تعلق ہے۔ اس میں اصل مشکل یہ ہے کہ ہمارا نظریۂ تعمیر اور طریقۂ تعمیر مغربی نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہے۔ اور اس کی تشریح اس بحث کی ابتدا میں کی جا چکی ہے۔ یقیناً عورت کی کسی قسم کی صلاحیت کو دبانا ایک بڑا جرم ہے لیکن مزدوری، کلرکی یا آزاد جنسی اختلاط عورت کے لئے باعثِ فخر نہیں بلکہ باعثِ ننگ ہے۔

آخری اعتراض اقبال پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب کی طرف کیوں مائل ہے؛ اور حق تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام اعتراضات و اختلافات صرف شاخوں سے متعلق ہیں۔ اصل اعتراض یہی ہے۔ جن لوگوں نے اشتراکی ذہنیت کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اقبال نے مذہب کی طرفداری کا "جرم" نہ کیا ہوتا تو شاید وہ تمام باتیں جو آج محلِ اعتراض سمجھی جاتی ہیں۔ اقبال کے محاسن میں شمار ہونے لگتیں۔ مذہب ہی وہ بنیادی چیز ہے جو اقبال کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے بالکل مخالف راستے پر لے گئی ہے۔

اس سلسلے میں اشتراکی نقاد کچھ اس قسم کے جملے استعمال کرتے ہیں:

"اقبال کی نظریں ماضی کی طرف ہیں، وہ رجعت پسند، قدامت پرست اور ایک "REVIVALIST" ہے۔"

"اقبال تاریخ کے مادی تصور اور جدلیاتی تعامل کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکا۔"

"اقبال ابھی تک روحانیت اور اخلاق کے پرانے جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہے۔"

"اقبال نے مذہب کے روایتی بندھنوں کو توڑنے کی جرأت نہیں کی، اسی لئے وہ موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہ کر سکا۔"

"اقبال نے انسانیت اور کائناتی تصورات کو چھوڑ کر اسلام کا تنگ راستہ اختیار کیا" وغیرہ وغیرہ

دراصل اشتراکی نقادوں کا مفہوم یہ ہے کہ اقبال نے بھی انہیں کی طرح عقل و خرد کو جذبات کے ہاتھوں فروخت کر کے خواہشاتِ نفسانی کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا۔ وہ اپنی نظر سے کیوں دیکھتا ہے۔ مارکس کی نظر سے کیوں نہیں دیکھتا؟

میانِ آب و گل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

اِن بیچاروں کو نہیں معلوم کہ جس شخص کی نظر میں قرآن ہو ——— وہ قرآن، جو عین حُسن ہے، عین حکمت ہے، عین حقیقت ہے۔ جو عین فطرت ہے۔ عین زندگی ہے ——— اُس کی نظر میں "مسیلموں" کی "شاعری" کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ یہ علامہ اقبال کی بصیرت کی دلیل ہے انہوں نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کی یکسانیت کا بہت جلد اندازہ لگا لیا تھا۔ دونوں نظامِ حیات خالص مادیت پر مبنی ہیں۔ دونوں عملی اور نظری حیثیت سے اخلاق سے بیگانہ ہیں۔ دونوں ایک ہیمانہ کشمکش پر انسانی ترقی کی ذمہ داری ڈالتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں غیر محدود انفرادی آزادی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت چند عیار عیاشوں کے ہاتھ میں سمٹ آتی ہے۔ اسی طرح مارکسی نظام میں غیر محدود اجتماعیت کی وجہ سے ساری دولت چند اشتراکیوں کے قبضہ میں پہونچ جاتی ہے۔ ظاہری ہیئت کے لحاظ سے تو سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی فرق ہو سکتا ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے دونوں میں کوئی وجہ امتیاز نظر نہیں آتی (یہاں یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہئے کہ اسلام سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک بالکل منفرد نظامِ حیات ہے)

واقعیت کی دنیا بھی اسی بات کا ثبوت بہم پہونچاتی ہے۔ ہم اپنے ارد گرد بے شمار ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ جو لوگ کل تک بہت بڑے جاگیردار تھے، آج بورژوا اور سرمایہ دار طبقے میں انہیں کی اکثریت ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی بورژوا طبقے کے نوجوان ہیں۔ جن کو اشتراکی جماعت میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ——— پھر کہاں ہے طبقات کی وہ "مقدس" تقسیم جس کے لئے اخلاق اور مذہب کو بھی قربان کر دینے کی ضرورت ہوئی؟ ———

دراصل دُنیا میں ہمیشہ صرف دو ہی گروہ رہے ہیں۔ خدا پرست اور نفس پرست، جن کو علامہ اقبال نے نہایت بلیغ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

یہی شرارِ بولہبی ہے، جو کبھی فرعونیت تھا، کبھی یزیدیت، کبھی سرمایہ داری، جاگیرداری اور کبھی اشتراکیت، اسی نفس پرستی کا دوسرا پہلو پاپائیت، ملائیت، پیر پرستی، قبر پرستی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پھر نتائج کے اعتبار سے رہبانیت اور کلیسیت بھی اسی ضمن میں شامل کی جا سکتی ہے۔ انسان کے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں ——— اسلام یا جاہلیت ——— اس کے علاوہ کسی صورت کا کوئی امکان ہی نہیں۔ چند بے بصیرت لوگوں کا اس معاملے میں اقبال پر نکتہ چینی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نابینا کسی آنکھ والے سے کہے کہ تو دیکھتا کیوں ہے؟

اقبال کی نظر میں صرف ماضی کی طرف نہیں بلکہ ماضی، حال، مستقبل سبھی طرف ہیں۔ "طلوعِ اسلام" اور "خضرِ راہ" اس کا ثبوت ہیں۔ زندگی ایک وحدت ہے اُسے آج اور کل میں نہیں بانٹا جا سکتا ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

ہاں یہ ضرور ہے کہ اقبال اُن حضرات کی صف میں نہیں، جو درخت کی جڑیں کاٹ کر پتیوں اور پھولوں کی تازگی کے منتظر رہتے ہیں۔ جس طرح محض ماضی پرستی، فراریت کی دلیل ہے، اسی طرح مستقبل کے ہر دور کو خوش آئند سمجھنا بھی شیخ چلیوں کے خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ مارکسی توہمات کے برخلاف، ایک نئی چیز اسی وقت ترقی پسندانہ ہو سکتی ہے جب کہ اس کی بنیاد خدائی ضوابط و اصول پر قائم ہو۔ ورنہ وہ محض فریب ہے۔ ۔ ۔ ۔ محض سراب ہے۔ اگر مارکسی نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ ہم امام حسینؓ کو "رجعت پسند" کہیں، اور ننگِ انسانیت یزید کو "ترقی پسند" کا لقب عنایت کریں، کیونکہ امام حسینؓ "پرانے" اخلاق، مذہب اور خلافت کے قائل تھے، لیکن یزید نے "بدلتے ہوئے" خارجی حالات کا ساتھ دیا اور کامیابی حاصل کی، لیکن یہ بات اتنی مہمل ہے کہ سوا ایک کامل حیوان کے اور کوئی شخص سننا بھی گوارا نہ کرے گا۔

ایک اشتراکی عموماً جدلیاتی ارتقاء کا تذکرہ کر کے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب اُس سے بڑا فطرتِ انسانی کا راز داں اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا، حالانکہ اقبال اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ تاریخ کے بہاؤ کو چند بندھے ٹکے منطقی مفروضات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر مارکس کے نظریۂ ارتقاء میں کچھ بھی صداقت ہوتی، تو وہ "روس" اور "امریکہ" دونوں کے معاملہ میں غلط نہ ثابت ہوتا۔ روس میں سرمایہ داری کی صرف ابتدا تھی لیکن پھر بھی وہاں اشتراکی انقلاب برپا ہو گیا۔ برخلاف اس

کے امریکہ میں سرمایہ داری اپنے انتہائی عروج پر ہے لیکن اشتراکی انقلاب کے آثار بھی وہاں نہیں پائے جاتے۔ جدلیاتی تعامل کا تصور اپنی جگہ کسی حد تک درست ہو سکتا ہے، لیکن ہیگل اور مارکس نے اُسے جس عمومیت کے ساتھ پیش کیا ہے وہ محض وہم ہے۔ تاریخی تغیرات ہواکی لہروں کے متماثل ہیں۔ جدلیاتی ارتقاء کو مانسونی ہوا فرض کر لیجئے لیکن اِسی ایک اصول کو مغربی ہواؤں "انٹی سائیکلون" "اینٹی سائیکلون" اور دوسرے ہزاروں مقامی اور وقتی حالات پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

بالکل اِسی طرح مادیت بھی ہماری زندگی کا صرف ایک پہلو ہے کُل زندگی نہیں۔ روحانیت کوئی خیالی شے نہیں، بلکہ ایک متحرک حقیقت ہے۔ جس نے سماج کے دھارے کو ہمیشہ حیوانیت سے ہٹا کر انسانیت کے راستے پر لگانے کی کوشش کی ہے۔ اشتراکی نقاد ممتاز حسین کا یہ کہنا کہ "اگر مادی فلسفہ نہ بڑھتا تو یہ مشینی پیکر بھی نہ ڈھلتے" صرف ان کے مظنونات و مفروضات میں سے ہے۔ سائنسی ایجادات مادی فلسفہ کی محتاج نہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں ایجادات و انکشافات کے دریا بہا دیئے تھے۔ آخر وہ کس مادی فلسفہ کے نتائج تھے؟ ذہنی غلامی کی یہ ایک بدترین مثال ہے کہ جو کچھ یورپ میں متعصب اور تنگ نظر پادریوں کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا اُسے زبردستی اسلام اور مسلمانوں پر تھوپ دیا جائے۔ اور وہ بھی محض اس لئے کہ مارکس کے نظریات کی "ابدیت" باقی رہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی بالکل غلط ہے کہ جاگیرداری یا سرمایہ داری اپنے کسی دور میں بھی ترقی پسندانہ قوتیں تھیں۔ یہ نظریہ بالکل "ع" برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مصداق ہے۔ اقبال سرمایہ داری کی مخالفت اِسی شعور کے ساتھ کرتا ہے۔ دراصل یورپ کی تاریخ میں عرصے سے یہ تضاد قائم ہے کہ "مشین" ترقی کر رہی ہے لیکن انسانیت تنزل پذیر ہے۔ جو لوگ صرف خونریزی اور قتل و غارت گری ہی کو انسانی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اُن سے تو خیر کچھ کہنا ہی بیکار ہے، ورنہ جدید یورپ کا ذرہ ذرہ اِسی بات کا شاہد ہے۔

مشکل یہ ہے کہ مادہ پرست انسان، خواہ سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جہاں کہیں مشین کو دیکھتا ہے فوراً یہ فرض کر لیتا ہے کہ انسان ترقی کر رہا ہے، اور اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ انسانی ترقی کو انسان سے علیحدہ کوئی چیز فرض کر لیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقی ترقی پسندی یہی ہے کہ انسان اپنے کردار کو بلند کرنے کی کوشش کرے اور مثالی کردار وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ اپنے کو صبغۃ اللہ میں رنگ لے۔ تسخیرِ نفس اوّلین ضرورتِ زندگی ہے، اور تسخیرِ کائنات، اپنی اہمیت کے باوجود ثانوی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ بغیر ضبطِ نفس کے وسائلِ قدرت کو انسانی مفاد کے لئے استعمال کون کرے گا؟ افراد کی اخلاقی تربیت کے بغیر کسی صالح معاشرت کا وجود پذیر ہونا ناممکن ہے۔ ہم دنیا کے ہر اہم کام کے لئے تربیت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ خالص "مادیت" کا کرشمہ ہے کہ انسانی معاشرے کی تعمیر کے لئے کسی تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ افراد میں خود بخود انسانی ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ ہم دنیا کے تمام علوم میں "دائمی صداقتوں" کی تلاش کرتے ہیں لیکن اخلاق و مذہب کو ایک سطحی نظریۂ تغیر و اضافیت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مادی فلسفہ ہم کو اِسی راہ پر لے جاتا ہے۔ اور یہی گزشتہ اور موجودہ تمام سماجی خرابیوں کی جڑ ہے۔

اقبال اِسی شجرِ خبیث کی جڑوں پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتا ہے۔ وہ اگر احیاءِ دین کا طالب ہے تو محض اس لئے کہ اسلام اور انسانیت کوئی دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں؟ اور اسی لئے اقبال کو " REVIVALISM " کا طعنہ دینا فکری سطحیت کی دلیل ہے۔ وہ تیرہ سو برس پرانا قبائلی نظام واپس نہیں لاتا ہے۔ بلکہ اس مثالی نظامِ حیات کو قائم کرنا ہے۔ جس کی مساوات، حریت، اخوت، صداقت اور عدالت کے عملی نمونے آج بھی ایک حیرت انگیز "IDEAL" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم کو پھر وہی تیر و کمان اور تیغ و سپر واپس نہیں لانے ہیں۔ بلکہ وہ اصول نافذ کرنا ہیں جو دائمی امن کے تحفظ کے ضامن ہیں۔ ہم کو پھر وہی کرتہ و عمامہ رائج نہیں کرنا ہے۔ بلکہ وہ قوانین دوبارہ جاری کرنے ہیں جو بے حیائی و بدکاری و بدطینتی کو ختم کر دیں۔ ایک "انسانیت"[1] ہے جس کے لئے ہماری روح تڑپتی ہے اور ہمارا دل بے چین ہے ۔۔۔ جو عرب کے بدوؤں اور بکریاں چرانے والوں میں ہمیں ملتی ہے۔ اور آج کے "روسیوں" "مارکسیوں" اور ہیگلوں سے ویسی ایک مثال بھی نہیں پیش کی جا سکتی۔ اسلام دینِ فطرت ہے ۔۔۔ وہ انہیں چیزوں کی رغبت دلاتا ہے جو داعیاتِ فطرت ہیں۔ اور اُن چیزوں سے روکتا ہے جو تقاضائے فطرت کے منافی ہیں۔ مسلم یا غیر مسلم، جو شخص اسلام سے جتنا

---

[1] یہ لفظ یہاں عام مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

قریب ہے، اتنا ہی انسانیت سے قریب ہے؟ اور انسانیت سے جتنا دُور ہے اتنا ہی اسلام سے بھی دور ہے۔ کسی شخص کی یہ کوشش کہ وہ اسلام اور انسانیت کو دو قطعاً مختلف چیزیں ثابت کرے، قطعی مہمل ہے ـــــ اتنی ہی مہمل جتنی کہ اشتراکیت اور انسانیت کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہماری انسانیت محض ڈھکوسلوں، بے اصولیوں، آجھوٹے بجوؤں اور خیالی منصوبوں والی انسانیت نہیں ہے۔ ہماری انسانیت متعین اصول، متعین راہ اور متعین مقصد رکھتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب سے ہٹ کر انسانیت کا کوئی راستہ نہیں جاتا۔ جب تک ایک خدا اور ایک خالق کا وجود نہ تسلیم کیا جائے۔ انسانوں کا قوموں، نسلوں، فرقوں اور طبقوں میں بٹ جانا قطعی یقینی ہے۔ اور جب تک ایک حاکم مطلق کی حکومت کو نہ مان لیا جائے۔ تمام انسانوں کا کسی ایک نقطے پر جمع ہو جانا ناممکن ہے۔ اور جب تک خوفِ معاد دل میں نہ جاگزیں ہو تو انسان کا اپنے کو ذمہ دار خیال کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ باتیں دراصل بدیہیات میں داخل ہیں، اور ان سے وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جن کا مذہب، مذہبِ نفسانیت ہے۔

اشتراکی حضرات کو سوچنا چاہیے کہ زمانہ مارکس اور ڈارون سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ وہ کب تک اسی پرانی ڈگر پر چلتے رہیں گے۔ فلسفۂ الحاد کا کھوکھلا پن مادہ پرستوں کی وحشیانہ حرکتوں کی وجہ سے روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا ہے۔ اب مخالفین کو رجعت پسند یا قدامت پرست کہہ کر اپنے خون آلود جبڑوں کو نہیں چھپایا جا سکتا۔ اگر اُن کے دلوں میں انسانیت کے لئے کچھ بھی درد ہے۔ تو وہ ذہنی غلامی سے ہٹ کر غور کریں کہ ترقی کسے کہتے ہیں۔ روحانیت یا اخلاق کا زندگی میں کیا مقام ہے، اور کون سا راستہ انسانی فلاح کا راستہ ہے؟ عاقلانہ تجزیہ و تنقید کے بجائے محض جذبات سے اپیلیں کرنا، چند خود غرضوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے لیکن نوعِ انسانی کے لئے تباہ کن ہے۔ تنقید کا یہ پہلو بھی افسوسناک ہے کہ اشتراکی نقاد ہمیشہ عوام کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اگر اُسے مذہب کی مخالفت کرنا ہے تو وہ نفس موضوع پر کوئی بھی تبصرہ نہ کرے گا۔ بلکہ صرف یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ فلاں ملک اور فلاں دور کے پادریوں نے بادشاہوں اور جاگیرداروں سے مل کر عوام کو اس طرح لوٹا۔ فلاں پیر یا فلاں "ملا" نے اس طرح جعل سازی کی اور عوام کو اس طرح بیوقوف بنایا، یا مثلاً اگر اشتراکی کلیت پسندی (TOTALITARIANISM) پر کسی شخص نے اعتراض کیا تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے گا۔ بلکہ صرف سرمایہ دارانہ جمہوریت میں عوام کی دردناک حالت کا ایک نقشہ پیش کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح صرف دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ مسائلِ زندگی کا کوئی حل نہیں نکالا جا سکتا۔ بلکہ بعض اوقات اشتراکی نقاد کو اتنی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ عیسائیت، یا بودھ مت وغیرہ کے نقائص بیان کرکے نہایت ہوشیاری سے اس کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سرمایہ کاری کی اس روش پر وہ کب تک چلتے رہیں گے؟ وہ کب تک اس بات کو نہ سمجھیں گے کہ انسانی ترقی کا دار و مدار تو افق للبقاء پر ہے، تنازع للبقاء پر نہیں؟ وہ حرکت جو ایک خدا سے بیگانہ ہو کر پیدا ہوتی ہے، صرف سرمایہ دار اور اشتراکی جنگ بازوں کو پیدا کر سکتی ہے۔

یہاں یہ ذہنی مغالطہ نہیں دیا جا سکتا کہ حق و باطل میں مصالحت ناممکن ہے۔ یقیناً حق و باطل میں مصالحت نہیں ہوا کرتی۔ مگر سوال یہ ہے کہ حق و باطل کا معیار کیا ہو؟ ایک خدائی ضابطہ یا ہماری آپ کی نفسانی خواہشات۔ ... ہمارے فلسفہ کا بھی یہ حال ہے کہ ہر نیا دور پرانے ... قیاسات کو توہمات کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اگر ارسطو اور افلاطون کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر سینا و فارابی کے نظریات کو باطل ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اگر کانٹ، ہیگل اور نیٹشے کے مفروضات کی دھجیاں اڑائی جا سکتی ہیں، تو پھر مارکس اور اینجلز ہی کو ... کہ اُن کے نظریات کو وحیِ الٰہی کا مرتبہ دیکر اُن پر اساسِ زندگی کی تعمیر کی جائے؟

پریم وار برٹنی

احتجاج

(۱)

کس ستمگر نے پُر ارمان دلوں کو لوٹا
کس نے گُل کر دیئے معصوم امیدوں کے چراغ
کس نے احساسِ مقدس میں تعفن بھر کر
دے دیا عقل کے ہاتھوں میں نجاست کا ایاغ

(۲)

کس نے مشاطۂ اخلاق کے گیسو نوچے
کس نے انسانی حمیت کا جگر چیر دیا
کس ستم کوش نے شیطان سے سازش کر کے
ابنِ آدم سے شرافت کا چلن چھین لیا

(۳)

کس نے ہنستی ہوئی دُنیا کی مسرت لوٹی
کس نے امید کی کشتی کو بھنور میں چھوڑا
سرنگوں کر کے عَلَم شرم و حیا کا کس نے
عہدِ غمخواری و پیمانِ محبت توڑا

(۴)

کتنے رہرو تھے جو اس منزلِ ہستی میں ندیم
ہو گئے اپنے ہی رہبر کے تغافل سے تباہ
کتنی نوخیز و دل آویز امنگیں تھیں جنہیں
آخرش لینی پڑی موت کے دامن میں پناہ

ابو المجاہد زاہد



شہر

پارکوں میں دھان کے کھیتوں کی ہریالی کہاں — کوٹھیوں میں چھپّروں کی فارغ البالی کہاں

دوست ناحق شہر کی تفریح کو آیا ہے تو
آب و رنگِ شہر پر کیوں اِتنا للچایا ہے تو
خیر چلتا ہوں مگر کیوں اِتنا گھبرایا ہے تو

شہر کی یہ مسجدِ جامع ہے رُوح و دل نواز — ہے یہاں معدوم سی تفریقِ محمود و ایاز

لیکن اس کے جگمگاتے بابِ عالی کا سماں
یہ غریب اندھے اپاہج لولے لنگڑے ناتواں
عارضِ اِسلام پر یہ بھنبھناتی مکھیاں ؟

اور یہ کپڑے کا مل ہے سربلند و سرفراز — جس کے سایہ میں سکوں پاتے ہیں اہلِ حرص و آز

اور یہ مزدور ہیں میلے کچیلے نیم جاں
وقفِ نالہ صرفِ ماتم محوِ فریاد و فغاں
جن کے بل پر اینٹھتا ہے مل کی چمنی کا دھواں

یہ عدالت ہے یہاں انصاف کا ہوتا ہے خوں — رات کو دن کر دکھاتا ہے وکیلوں کا فسوں

چند سکّوں کے عوض ایمان بکتا ہے یہاں

وید بکتا ہے یہاں، قرآن بکتا ہے یہاں

الغرض اللہ اور بھگوان بکتا ہے یہاں

یہ ہے چکلہ، جسم میں تہذیب کے فاسد لہو — اور یہ عصمت فروشانِ حسین و ماہ رُو

اِک "دروغِ مصلحت آمیز" جن کی چال ڈھال

لب پہ دلداری کی باتیں اور دل میں حرصِ مال

جن کی مصنوعی محبت "سوڈا واٹر" کا اُبال

جگمگاتا سا، یہ جیتی جاگتی سڑکوں پہ رُوپ — یہ گھٹا گھنگھور زلفوں کی یہ شلواروں کی دھوپ

شوخ جلوؤں پر یہ آوارہ نگاہوں کا ہجوم

یہ ہوس کے قہقہے فلمی ترانوں کی یہ دھوم

یہ تمدّن کے کرشمے یہ طلسماتِ علوم

اس طرف یہ ہیں دفاتر چند اخبارات کے — کھیل ہیں جھگڑے لڑائی جن کے بائیں ہات کے

فرقہ بندی کے اکھاڑے آدمیت کے مزار

ہندو و مُسلم میں برپا ہے انہیں سے انتشار

چھُو نہ جائے اِن سے تیرے گاؤں کی سادہ بہار!

محسن ظفر

میں سرگرداں پھرا

(۱)

اے حسین کلی!
مجھے تلاشِ حسن ہے ——
میں بارگاہِ حسن میں ہزار مرتبہ گیا
مگر وہاں
سوائے تیرگیٔ شب کے اور کچھ نہ مل سکا
اے حسین کلی!
یہ حسنِ دلفریب ——
تجھے کہاں سے مل گیا؟

(۲)

اے فضائے نغمہ بار!
مجھے بھی اک زمانے سے ہے نغمگی کی جستجو
ہزار بار جا چکا ہوں محفلِ سرود میں
مگر وہاں
سوائے سسکیوں کے اور کچھ مجھے نہ مل سکا
اے فضائے نغمہ بار!
یہ نغمگی ——
کہاں سے تو نے پائی ہے؟

(۳)

اے موجِ رقص آشنا!
مرے بھی دل میں رقص کی اک آرزو ہے موجزن
چنانچہ اس کے واسطے میں رقص گاہ میں گیا
مگر وہاں
سوائے شورِ سیم و زر کے اور کچھ نہ پا سکا
اے موجِ رقص آشنا!
یہ رقص ——
کہاں سے تو نے پا لیا

احسن مظہری

یہ درس گاہیں

چاند تارے یہ حیاتِ قوم کے افلاک پر — ان کی ضو سے دورِ مستقبل کے روشن بام و در
یہ حسیں بچے یہ قوموں کی تمناؤں کے باغ — ان کے رُخ سے ہے نمایاں ایک رخشندہ سحر
ان پہ عورت نے نچھاور کر دیا اپنا شباب — مرد نے ان پر لٹایا اپنی محنت کا ثمر
خاندانی عظمت و عزت کے یہ چشم و چراغ — ماں کی آنکھوں کے یہ تارے باپ کے لختِ جگر

آئے ہیں اسکول میں علم و ہنر کے واسطے — حیف! یہ مقتل ہے مقتل، اِن کو اسکی کیا خبر
آہ یہ اسکول ہے یا مدفنِ علم و عمل — مقتلِ انسانیت تعلیم گہ کے نام پر
دام ہے یہ دام، پھنستی ہے یہاں معصومیت — چُوک جاتی ہے یہاں آکر نگاہِ دیدہ ور
تاجروں کی منڈیاں، یہ درس گاہِ فکر و فن — علم بکتا ہے یہاں، قیمت ہے اس کی سیم و زر

دامِ باطل میں انھیں ڈالا ہے خود ماں باپ نے — حیف! اے ماں کی محبت، حیف اے لطفِ پدر
بُوئے حق تھی اِن حسیں غنچوں کی طینت میں شریک — نذرِ باطل کر دیا تو نے انھیں اے بے بصر
جن کے ہاتھوں قوتِ باطل کی اُڑتیں دھجیاں — ایک دن باطل کے ہاتھوں میں وہ خود ہونگے سپر
مصلحت بینی، زمانہ سازیاں، تن پروری — علم کی ساری تگ و دو کا یہ ہوگا مختصر

ایک دن دولت کی کالی پر چڑھائے جائیں گے
دیوِ حرص و آز کھا ہی جائے گا فکر و نظر

انور اعظمی

امتیاز

(۱)

پھول کی پتّی نے شبنم سے کہا "میری تیری دوستی ہے رات بھر
شام کو آئی سحر کو چل بسی ہے فسانہ تیرا کتنا مختصر
لیکن اِک شکوہ تری حالت سے ہے میں نہ کہتی گر نہ یوں ہوتا جگر

اِتنی دیرینہ ملاقاتوں پہ بھی
جب کرن آئی تو فوراً اڑ گئی

اس چمن میں خار و گل ہیں ہمنشیں ایک لمحے کو جدا ہوتے نہیں
کوئی گل چیں پھول کو توڑے اگر تلملا اٹھتی ہے کانٹے کی جبیں
دہر والوں کی زباں پر عام ہے پھول بے کانٹے کے مل سکتے نہیں

دہر کا دل میکش جام وصال
صبح فرقت سے حسیں شام وصال"

(۲)

سن کے شبنم نے دیا ہنس کر جواب "بے نگاہی کا ہے یہ سارا عتاب
تیری ہی دنیا میں ہیں وہ معتبر پھول ہو کانٹا ہو یا موج و حباب
مجھ کو اپنی بزم کا سمجھا ہی کیوں اتنے دن کی دوستی پر بھی حجاب؟
اپنے مرکز کی طرف کرتا ہے رُخ وہ کوئی ذرّہ ہو یا دودِ سحاب

مجھ میں رم کا ذوق سفاکی نہیں
صاف ہے یہ بات میں خاکی نہیں"

محمود فاروقی

تاباں کی موت

انسنت گیری کے اسٹیشن پر اترنے کے بعد میں نے ایک مرتبہ اور جیب سے تار نکال کر پڑھا۔ دستخط بھائی جان ہی کے تھے۔

"تاباں کی حالت بہت نازک ہے۔" انہوں نے لکھا تھا۔

سینی ٹوریم جانے والی بس میں ابھی دو گھنٹے کی دیر تھی اور میرے لئے یہ دو گھنٹے دو بوجھل سال بنے ہوئے تھے۔ انتظار گاہ کی کھڑکی کے قریب ایک بے ہنگم سی کرسی پر میں اس حالت میں بیٹھ گیا کہ میرا دل آنے والے کسی حادثہ کے خوف سے بری طرح کپکپا رہا تھا...!

اسٹیشن سے گاڑی فارورڈ ہو چکی تھی اور اب وہ کھیتوں کے درمیان ایک بڑے نالے پر سے گذر رہی تھی جاڑے کی اس دھندلی فضا میں گاڑی کا سیاہ دھواں فضا میں عجیب طرح کی اداسی بکھیر رہا تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور مجھے یوں سنائی دیا جیسے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہو۔

"تاباں کی حالت بہت نازک ہے۔"

تاباں کی اور میری کہانی اس گاڑی کی طرح اب تک کتنے ہی موڑ طے کر چکی تھی اور اب یوں معلوم دے رہا تھا جیسے ——— پل ٹوٹ جائے گا اور سنسناتی ہوئی گاڑی ایک قیامت خیز گڑگڑاہٹ کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گہرے دریا میں غرق ہو جائے گی۔

میں نے گھڑی دیکھی ابھی تو صرف پانچ منٹ گذرے تھے۔ اور مجھے تاباں سے جدا ہوئے پورے پانچ سال گذر چکے تھے۔ اس دوران میں تاباں کا صرف ایک ہی خط آیا تھا جس کا جواب میں نے لکھا ضرور تھا لیکن ڈاک میں نہیں ڈالا تھا۔ میرا دل آج مجھ پر بڑی ملامت کرنے لگا۔ قسمتی کا میرے شکستہ دل چاہئے تھا۔ ڈاکٹر رضی کی گمشدگی کے بعد اس کو سہارے کی ضرورت تھی۔

وہ بے سہارا ہو گئی اور آج وہ سینی ٹوریم میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

اگر وہ آہ وہ مر جائے تو کیا اس کی موت کا میں ذمہ دار نہیں ہوں ———؟

لیکن میں کرتا بھی کیا مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میں اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اس اصولی لڑائی کو ہار نہ جاؤں جو تاباں کو ہار کر میں نے ڈاکٹر رضی کے مقابلہ میں جیتی تھی مجھے اپنی اس جیت پر فخر تھا اگر میں واپس جاتا تو شاید میری وہ جیت ہار میں تبدیل ہو جاتی ——— میرے قدم لڑکھڑا جاتے۔

لیکن آہ میری یہ فتح مندی، آج وہ کس قدر گراں بار ہو چکی تھی۔ جنگلے کے اس پار مال کے ایک ڈبہ سے قلی بڑے بڑے تھیلے اتار اتار کر پھینک رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ——— ان تھیلوں کا پورا بوجھ میرے دل پر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

سگریٹ جلا کر میں نے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کا بہانہ سا کیا کھڑکی میں سے بل کھاتا ہوا سگریٹ کا نیلا نیلا دھواں جاڑوں کی اس اداس صبح میں قدرے خوشگوار سا محسوس ہوا اور میرا دل ماضی کے بہت سارے دھندلکوں میں گم ہو گیا۔

دادا ذوقی، کی گرمائی قیام گاہ "الصدف" کے مختلف منظر میری نظروں میں گھوم گئے ——— دادا ذوقی، تاباں، منجو بھابی، بھائی جان اور ڈاکٹر رضی ان سب کی دھندلی دھندلی تصویریں نظروں کے سامنے سے گذرنے لگیں..... کبھی دادا ذوقی اور ڈاکٹر رضی شطرنج کھیلتے ہوئے دکھائی دیتے اور کبھی منجو بھابی اور بھائی جان دنیا بھر کی معاشی الجھنوں پر الجھتے نظر آتے اور پھر ان سب کے درمیان تاباں کی بھولی بھالی شرارتیں بات بات پر اس کا ضد کرنا اور مچل جانا، ڈاکٹر رضی کے موٹر سائیکل کو پنکچر کر دینا منجو بھابی کی محبوب بلی گلنار کو صابن کے بھرے ٹب میں ڈال دینا۔ دادا ذوقی سے

میری جھوٹ موٹ کی شکایتیں کرنا لڑکپن کے وہ دن بھی کتنے ہلکے پھلکے اور حسین تھے ــــ!

میں ان دنوں کی یاد میں کچھ ایسا کھو گیا کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں کن حالات میں اور کہاں بیٹھا ہوں۔ اچانک بیٹھے بیٹھے میں چونک سا گیا!!!

کھڑکی کے پاس کوئی کھڑا ہوا۔ شی، شی، شی کی آواز نکال رہا تھا۔

بلاشبہ وہ تاباں تھی اور جیسے میں اس وقت [illegible] میں نہیں بلکہ دادا ذوقی کی لائبریری میں بیٹھا ہوا تھا۔

"شی، شی، شی [illegible] ــــــــ"

"کون ہے؟" میں نے [illegible] کر کہا۔

"شی، شی، [illegible]!!!" [illegible] پیچھے سے [illegible] آواز آئی۔

میں نے چونک کر دیکھا تاباں [illegible] شی، شی!! کیے جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"شی" ــــ اس نے [illegible] ہونٹوں پر انگلی رکھی یعنی چپ [illegible] بولی "کبھی تم نے آہستہ بات بھی کی [illegible] یاد نہیں [illegible]"

"بڑی سنجیدہ بن رہی ہے۔ [illegible]" میں نے غصہ کی ساتھ [illegible]

لیکن وہ شرارت کی پڑیا [illegible] دیوار کی کنگر پر کھڑے ہو کر [illegible]

"آخر کیا بات ہے تاباں" [illegible] تم بڑی اچھی ہو، میں ایک بڑا شاندار [illegible] میں وہ سب بھول جاؤں گا۔"

"بڑا شاندار پلاٹ کس شان سے [illegible] ہو۔ اچھا میں تو تم کو ایک ایسا پلاٹ [illegible] آج بڑا اچھا موقع ہے۔"

ہا ہا ہا بڑا ہی اچھا ... یہ کہہ کر تاباں [illegible] چاہی تو کنگرے نیچے پھسل پڑی۔

"تمھارا پلاٹ تو بڑا شاندار ہے تاباں" میں نے دریچہ میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ اس نے سینڈل میں [illegible] کی گرہ وار جھاڑی کچھ ایسے الجھ گئی تھی کہ اس کا پیر بری طرح پھنس گیا تھا۔

میں اس کی مدد کے لئے دوڑنے ہی والا تھا کہ مجھے پچھلے بہت سارے قصے یاد آگئے۔ جب کہ اس شریر نے بری طرح ستایا تھا ــــ مجھے اس نے آم [illegible] نے ، قسمت [illegible] اور جب میں نے تنگ آکر آم [illegible] تو دوڑ کر اس نے دادا ذوقی سے شکایت کر دی کہ انجم بھیا نے مجھے [illegible] اور اس طرح اس نے منہ بسور کر شکایت کی کہ دادا ذوقی [illegible] اور مجھے یہ سزا دی کہ میں سارہنی کے تالاب میں مچھلیاں [illegible] کے ساتھ چلا جاؤں۔ مجھے مچھلیاں پکڑنے سے سخت نفرت تھی [illegible] کی وجہ سے لیکن دادا ذوقی کے حکم سے سرتابی کی مجال کسے تھی ــــ جب میں کپڑے بدل کر مچھلیاں پکڑنے کا سامان لئے [illegible] تو اس نے [illegible] کی چھت پر کھڑے ہو کر خوب چڑھایا

[illegible] دن بھر چھپ مارتے رہے۔

[illegible] یاد آگئے اور میں نے انتقاماً چڑھا دیئے

[illegible]

"انجم بھیا [illegible] میرا پیر ٹوٹا جا رہا ہے۔ اُدہ ... اُوہ!!"

"اور تمھاری سینڈل" میں نے لطف لیتے ہوئے پوچھا۔

"[illegible] ستیاناس ہو گیا۔ خدا کے لئے آؤ نا!"

"[illegible]" میں نے بے اعتنائی سے [illegible] اور ہاں میرا [illegible] تو نے کہاں چھپایا ہے [illegible] کھولی نیکر [illegible] اور وہ تاج کمپنی کا عکسی قرآن شریف جو [illegible] دادا [illegible] تو نے خوب لڑ لڑ کر مجھے لینے نہیں دیا تھا نا!"

"لیکن بھیا [illegible] تو مجھے کبھی نہیں ملا" وہ بگڑ کر کہنے لگی۔ "ذوقی دادا نے اس کو [illegible] تو اسے وہاں سے اڑا لیا [illegible] واپس دیئے دیتی [illegible] تیز دوں کے لئے میرا [illegible] دو گے!"

"[illegible]" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا؟" وہ چیں بہ [illegible]

[illegible] سالگرہ پر خیری چاچا نے دیا تھا۔"

"اپنا قلمدان تو توڑ چکے ہو اب میرے قلمدان کے پیچھے پڑے ہو۔ اچھا خیر وہ بھی تمہارا تم میرا پیر تو اس منحوس جھاڑی سے نکالو۔"

اسی طرح تاباں سے بہت سے پکے وعدے کرانے کے بعد جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ کبھی پورے نہ ہوں گے۔ میں نے اس کو اطمینان دلایا کہ میں اس کا پیر جھاڑی سے نکال دوں گا۔

"تو پھر جلدی آؤ نا" وہ اپنے پیر کو کھینچتے ہوئے بولی۔

"آنے کی کیا ضرورت یہ تو بڑی آسان بات ہے" میں نے کھڑکی ہی میں کھڑے کھڑے بڑے اطمینان سے کہا "تم ذرا سا جھک کر سینڈل کا بٹن کھول دو پیر خود بخود نکل آئے گا۔"

"اور سینڈل"

"اری پگلی تجھے اپنے پیر سے مطلب ہے کہ سینڈل سے پیر نکل آئے تو سینڈل کے نکلنے میں کیا مشکل رہ جائے گی۔"

میرے ان دور کے مشوروں پر وہ ناراض سی ہو گئی اور کوئی جواب دیئے بغیر سینڈل کے بٹن کھول دیئے۔

مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ خفا ہو کر چلی جائے گی۔

لیکن . . . . . . !

"اوہ میں تو بھول ہی گئی۔" وہ بڑی جلدی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "شی، شی چپکے سے چلے آؤ۔"

"کہاں؟"

"منجو بھیا بی جمال نیمسلی کے پاس گئی ہوئی ہیں"

"تو پھر"

"اور انہوں نے وہ نمبر والا قفل لگایا ہے جس کے کھولنے کا نمبر تم کو معلوم ہے۔"

"تو پھر"

"پھر یہ کہ منجو بھابی سے بدلہ لیا جائے انہوں نے ہماری شادی کا ڈبہ چرایا تھا نا!"

"اچھا، تو پھر" میں نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ کہ" وہ بولی "صبح گاجر کا حلوہ تقسیم ہوا تھا نا اور دادا ذوقی نے اخروٹ اور بھونے ہوئے چلغوزوں کی تھیلیاں بھی سب کو دی تھیں"

"تو پھر؟"

"تو پھر! تو پھر! تمہارا سر تو نہیں پھر گیا ہے چلو اوپر چل کر تالا کھول دو"

"اچھا تو یہ معاملہ ہے تو تو بڑی آرسین لوپن نکلی مطلب یہ کہ ہم سب کچھ اڑا دیں۔"

اور وہ خوشی سے چہچہا کر بولی "حوض کے کنارے بیٹھ کر چٹ کر جائیں گے ہریانندو۔"

اس کے ہریانندو کہنے پر مجھے قاعدہ سے اس کے ساتھ جھگڑ لینا چاہئے تھا لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں تھا اسی لئے میں نے اس کو کسی مناسب وقت کے لئے ملتوی کر دیا ——— تھوڑی ہی دیر میں ہم نے منجو بھابی کے کمرے پر ڈاکہ ڈالنے کی اسکیم تیار کر لی۔

"لیکن" تاباں نے گھبرا کر کہا۔ "اوپر جائیں کیسے ذوقی دادا اپنے کمرے میں سو رہے ہوں گے اور زینہ کی طرف کا دروازہ کھلا ہو گا۔"

"جوتے اتار کر" اس نے خود ہی سوچ کر بتلایا۔

"اور تو یہ اپنے دست بند بھی نکال دے اگر ذرا سی بھی جھن جھن ہوئی تو خیر نہیں۔"

تاباں نے دست بند اتار کر مجھے دیدیئے تاکہ انہیں میز کی دراز میں رکھ دیا جائے ——— اس کے بعد ہی ہم آہستہ آہستہ زینہ کی طرف چلے ابھی نچلے برآمدہ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ سامنے سے بھائی جان ایک موٹی سی کتاب لئے ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

"تم دونوں یہ ننگے پیر کہاں جا رہے ہو ——— کیا کوئی نئی شرارت سوجھی ہے۔؟"

انہوں نے اس طرح معنی خیز نظروں سے گھور کر دیکھا کہ تاباں سٹ پٹا گئی ——— لیکن میں نے سنبھل کر کہا۔ "تاباں کے پیر میں چوٹ آ گئی ہے میں اسے آئیوڈین لگانے جا رہا ہوں۔"

"ہوں" وہ گھوم کر باغ کی دوسری طرف اتر گئے۔ اور تاباں ان کو دکھانے کے لئے خواہ مخواہ لنگڑا کر چلنے لگی اتنے میں ہم اس ہال تک پہنچ گئے۔ جہاں دادا ذوقی سہ پہر میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ حسب معمول دروازہ کھلا ہوا تھا اور ذوقی دادا اسی جانب کروٹ لئے سو رہے تھے ان کی شکل دیکھتے ہی تاباں ایسی گھبرائی کہ اس نے مجھے آستین پکڑ کر کھینچ لیا۔

"نا بابا۔ نا" وہ اٹھ جائیں گے۔ میں تو باز آئی ایسے حلوے سے۔"

مجھے بڑا غصہ آیا ایک طرف میری ساری کہانی کرکری ہو چکی تھی

اور دوسری طرف تاباں حلوہ چرانے کی اسکیم سے قطعی دستبردار ہوئی جارہی تھی مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور اسے معاملہ کے سارے اُونچ نیچ سمجھائے خاص طور پر ٹافی کے ڈبے کی چوری اور منجو بھابی سے انتقام لینے پر زور دیا اور ہاتھ پکڑ کر کہا "ڈرپوک کہیں کی بڑی بہادر بنتی ہے چل نہیں تو میں زور سے چلاتا ہوں "

تاباں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔ نا۔ نا خدا کے لئے نہیں۔ دادا اٹھ جائیں گے تو آفت ہی آجائے گی۔

میری طبیعت تو جل اٹھی میں نے جھنجھلا کر کہا "پتا! جب اتنا خیال تھا تو پھر اس ساری شرارت کی کیا ضرورت تھی ——— چل نہیں تو میں ابھی منجو بھابی سے جاکر کہے دیتا ہوں کہ تو اس طرح ان کا حلوہ چرانے کے لئے مجھے آمادہ کررہی تھی اور یہ بھی کہدوں گا کہ میری تاباں سے عکسی قرآن شریف والے معاملہ میں دوبارہ لڑائی ہوگئی ہے۔ اسی لئے میں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا ہے "

"انجم بھیا!" تاباں نے ہار مانتے ہوئے کہا "تم ایسا کروگے مجھے تو اس کا یقین نہیں "پھر اس نے مجھے بڑی پُراعتماد نظروں سے کچھ اس طرح دیکھا کہ میں جھینپ سا گیا

اندر سے مسہری کے تختوں کی چڑ چڑاہٹ سُنائی دی۔ میں نے دیکھا تو دادا ذوقی دوسری طرف کروٹ لے چکے تھے۔ بس پھر کیا تھا ہم نے دبے پاؤں اس پل صراط کو طے کرلیا۔ بالا خانہ پر کوئی نہیں تھا۔ منجو بھابی کی کالے دھبوں والی بلی گلنار سائبان کے نیچے دم سکیڑے سورہی تھی۔

"حرام خوری" تاباں بولی "اس کو بھی انجم بھیا ایک دن ٹھکانے لگانا ہے، وہ دیکھو میں نے کہا نہیں تھا نمبر والا قفل لگا ہوا ہے ———"

منجو بھابی کے کمرے پر واقعی نمبر والا سفید قفل لگا ہوا تھا جسے وہ اس ڈر سے نہیں لگایا کرتی تھیں کہ ان کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں اس کے نمبر سے واقف ہوگیا ہوں اب کے وہ شاید بھول گئی تھیں۔ دوسری طرف ہال میں کوئی بھی نہیں تھا تاباں کی دشمن گلنار کے سوا ——— بھائی جان ہمارے سامنے باغ میں جاچکے تھے۔ تاباں کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے منجو بھابی پڑوس میں جمال فیمی کے پاس ٹکڑوں کے تبادلہ کے لئے گئی ہوئی تھیں۔

تاباں زینہ کی طرف مُنہ کئے کھڑی رہی اور میں نے قفل کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا . . . . . . بس معلوم نہیں کیسے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ "یہ تو بری بات ہے"۔ اور میں ٹھٹک سا گیا۔

تاباں نے مجھے رکتے دیکھکر کہا "سوچ کیا رہے ہو! جلدی کرو"

اور میں نے واقعی جلدی کرکے اور غالباً اس چبھتے ہوئے خیال کو دبانے ہی کے لئے قفل کھول دیا ——— تاباں سے طے تھا کہ میں جب تک مال غنیمت لے کر آؤں وہ زینہ کی نگرانی کرتی رہے گی لیکن معلوم نہیں وہ اس بات کو بھول گئی یا یہ کہ اسے اندیشہ ہوا کہ میں کچھ نہ کچھ اندر ہی چٹ کرجاؤں گا وہ بھی اندر گھس آئی ——— جیسا کہ تاباں نے بعد میں مجھے بتایا اسے یہی اندیشہ ہوا تھا کہ میں گاجر کا حلوہ اندر ہی کھا جاؤں گا۔

ہم دونوں نے نیمو باجی کے نعمت خانہ کا خوب ہی جائزہ لیا۔ علاوہ مطلوبہ اشیاء کے اس میں دو موٹی موٹی گل قندیاں بھی رکھی ہوئی تھیں ان کو ہم وہیں چٹ کرگئے۔ اخروٹ اور چلغوزوں کی تھیلی اور حلوے کے ٹین کو اس تھیلی میں ڈال لیا۔ جو تاباں اس غرض کے لئے لیتی آئی تھی۔

جب ہم واپس ہونے لگے تو عجیب ہی واقعہ ہوا۔

"کھٹ" کس نے دروازہ کی چٹخنی باہر سے چڑھادی۔ میں اور تاباں دروازے کی طرف دوڑے وہ بند تھا اور باہر زور زور سے کھی کھی ہورہی تھی۔

"اوہ! منجو بھابی" تاباں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا ——— باہر کی آوازیں تیز ہوگئیں۔

بھائی جان نے کہا "ایک چوہا اور ایک بلی "

منجو بھابی نے طرح دی۔ "دونوں ہوگئے گرفتار"

بھائی جان نے ہم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ——— "تاباں کے پیر میں چوٹ آئی ہے نا انجم تم کیا اندر آئیوڈین لگا رہے ہو۔ لیکن بچو اگر لوگ آئیوڈین کے بجائے گاجر کے حلوے کا لیپ لگانا شروع کردیں تو معاشی نقطۂ نظر سے یہ بات انتہائی خطرناک ہوجائے گی "

منجو بھابی بھلا کہاں چوکنے والی تھیں بولیں ——— "تاباں تم نے میری گلنار کو اس دن اپنے کمرے میں بند کردیا تھا نا اور ذوقی دادا سے جھوٹ موٹ شکایت کی تھی کہ اس نے تمہارا دودھ پی لیا ہے۔ اب اگر گلنار دادا سے شکایت کرے کہ تم اس کے حصہ کا حلوہ کھارہی ہو تو بس مزہ آجائے گا "

کچھ دیر غالباً بھائی جان اور منجو بھابی کانا پھوسی کرتے رہے اس کے بعد بھابی کی آواز آئی ——— "آ میری گلنار چل ذوقی دادا کے پاس" انہوں نے گلنار کو بلایا اور وہ کم بخت میاؤں میاؤں کرتی ہوئی دوڑی۔

ہم دونوں واقعی چوہے دان میں پھنسے تھے

"خوب پھنسی ہو" میں نے تاباں کو چھیڑا۔

"اور تم بھی" وہ بیزاری سے بولی
"اب کیا ہوگا!"

"یہی کہ ذوقی دادا آئیں گے اور پھر وہ سب کچھ ہوگا جو اس سے پہلے ایسے موقعوں پر ہوتا رہا ہے۔"

"نہیں انجم بھیا کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔"

نچلے دالان سے ملی جلی آوازیں آرہی تھیں یقیناً دادا ذوقی جاگ گئے تھے اور ان سے منجو بھابی فریاد کر رہی تھیں۔

میں گھبرا سا گیا دادا ذوقی پچھلی کی وجہ سے پہلے ہی چڑچڑے ہو رہے تھے پھر یہ ساری باتیں ہوں گی اور ہم پکڑے جائیں گے ــــ تب...!

میں نے تاباں کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند کئے دعا کر رہی تھی۔ وہ غالباً اللہ میاں سے وعدہ کر رہی تھی کہ آیندہ سے چوری نہ کرے گی!

اگرچہ مجھے اس کا یقین تھا کہ اب کی بار اللہ میاں ہمیں ایسی آسانی سے نہیں چھوڑ دیں گے خواہ تاباں کتنے ہی وعدے کرے ــــ لیکن جونہی میری نظر اٹھی سامنے بند دریچہ کو دیکھکر فوراً ہی ایک خیال ذہن میں آگیا۔

"تاباں" میں خوشی سے چلّایا لیکن وہ معصوم صورت بنائے اسی طرح دعا مانگنے میں مصروف تھی۔

"اری پگلی! اللہ نے دعا سُن لی۔ دیکھو یہ کھڑکی۔"

"تو پھر" وہ چونک کر بولی۔

"کھڑکی کے ساتھ پیپل کا درخت ہے۔"

"تو پھر"

"پھر یہ کہ چلی چلو تمھارے لئے درختوں پر چڑھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے دن بھر گلہری کی طرح درختوں پر ناچتی ہی رہتی ہو۔"

ابھی وہ کچھ جواب دینے نہ پائی تھی کہ زینہ پر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی ــــ "تو تاباں بھی اندر ہے۔" دادا ذوقی کی آواز آئی اس کے جواب میں پھر کہا گیا اور گلنار نے زور زور سے میاؤں میاؤں کرنا شروع کیا۔ میں نے جلدی سے تھیلی اٹھا کر تاباں کو کھڑکی کی طرف دھکیلا، کھڑکی آسانی سے کھل گئی اب سب سے بڑا مسئلہ تاباں کو پیپل پر چڑھانے کا تھا ادھر ہاتھ میں تھیلی پھنسی ہوئی تھی اور اُدھر بس لوگ دروازہ پر پہنچا ہی چاہتے تھے۔ میں نے تھیلی تاباں کو دی کہ تم اس کو تھام لو اور کنگر پر کھڑی ہو جاؤ۔ میں پیپل کے ڈالے کو جھکاتا ہوں اس پر لٹک کر نچلی شاخ پر پیر ٹیکا لینا

لیکن اس نے تھیلی لینے سے انکار کر دیا ــــ "نہ انجم بھیا میں نے ابھی ابھی اللہ میاں سے وعدہ کیا ہے کہ چوری نہ کروں گی ــــ میں ادھر اصرار کر رہا تھا اور وہ برابر انکار کئے جا رہی تھی۔ اُدھر باہر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

غالباً جاتے وقت بھائی جان بھولے سے یا احتیاطاً تالا لگا گئے تھے اور حسب معمول منجو بھابی اس کا نمبر بھول گئی تھیں۔

"۲۲۲۵" منجو بھابی نے کہا۔

"نہیں جی" بھائی جان جھلا کر بولے "تم ہمیشہ نمبر بھول جایا کرتی ہو، ۳۲۲۵ ہے۔"

"نہیں" وہ چلائیں "مجھے اچھی طرح یاد ہے تم کھول کر دیکھو نا"

"بیچ بیچ" دادا نے غصہ سے کہا بیوقوف کہیں کے جب نمبر بھولنا ہی ہے تو یہ تالا کیوں لگایا جاتا ہے"

ادھر مجھے بڑی زور سے ہنسی آئی نمبر دراصل ۲۲۲۵ تھا اور بھابی ہمیشہ اسے الٹا ۵۲۲۲ کہتی تھیں۔

تم دونوں اپنے اپنے نمبر علیحدہ علیحدہ ملاؤ۔ دادا ذوقی نے حکم دیا۔

ادھر تاباں کا خوف سے بُرا حال ہو رہا تھا وہ کنگر پر کھڑی ہوئی جلدی کر رہی تھی کہ میں پیپل کی شاخ جھکاؤں میں نے تھیلی کو آہستہ سے نیچے باغ میں چھوڑ دیا اور جلدی سے درخت کا ڈالا جھکایا اور اس کو حسب ہدایت تاباں پکڑ کر لٹک گئی۔ دریچہ بند کر کے اس کے پیچھے میں بھی لٹک گیا ایک اور مصیبت پیش آئی۔ میں تو درخت کی نچلی شاخ پر کھڑا ہو گیا لیکن تاباں کے پیر کسی صورت بھی اس شاخ تک نہیں پہنچے اور وہ بری طرح جھولنے لگی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

مجھے بھی بس ایسے ہی وقت شرارت سُوجھا کرتی ہے اور دراصل اس سے اچھا موقع بھی نہیں ملتا جونہی اس نے کہا "مجھے اتارو" میں نے وعدے پختہ کرنے کی تمہید باندھی۔

"ہم تو نہیں اتارتے پہلے وعدہ کرو"

"کا ہے کا وعدہ" وہ تلملا کر بولی "جلدی بولو نا میری ہتھیلیاں چھلی جا رہی ہیں"

"اِس بات کا کہ تم دادا ذوقی سے صاف صاف کہہ دوگی کہ وہ عکسی قرآن شریف مجھے دیدیں۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ تم مجھے اُتارو تو سہی۔"

"اور وہ پیپر ویٹ"

"وہ بھی"

"اور وہ قلمدان جو ——"

"وہ بھی سب کچھ پہلے تم مجھے اتار دو تو سہی"

"۲۲۲۵" کمرے کی طرف سے منجو بھابی کی سیٹی جیسی آواز آئی۔

"اری تاباں اب تو واقعی قفل کھل جائے گا بھابی کو صحیح نمبر یاد آ گیا"

جلدی سے تاباں کو میں نے سہارا دیا اور چند سکنڈ میں ہم مال غنیمت لئے لائبریری میں تھے۔ میں نے ساری چیزیں ایک بڑے فوٹو کے پیچھے چھپا دیا اور میز پہ کتابیں کھول کر ہم اس طرح بیٹھ گئے جیسے ہم کو کسی بات کی خبر ہی نہیں ہے

"دیکھو میرے ہاتھ" تاباں نے کچھ دیر بعد اپنی ہتھیلیوں کو میز پر پھیلا دیا اس کی ہتھیلیوں پر خون کی سرخ سرخ چکتیاں ابھر آئی تھیں۔ مجھے بڑا دکھ معلوم ہوا اور میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

"تم مجھے بے سہارا کیوں کر دیتے ہو؟" وہ روہنسا رہجے میں بولی۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ برآمدہ سے دادا ذوق کی آواز آئی۔

"کون بے سہارا کر دیتا ہے تاباں!"

"کچھ نہیں دادا!" تاباں گھبرا کر [illegible]

"کچھ کیوں نہیں" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے تجھے آخر کس نے اس قدر پریشان کیا اور تم کہتی ہو کچھ نہیں۔

آخر کمرہ سے کوئی تو نکلتا کوئی بھی تو نہیں ایک تو ہے کا بچہ بھی نہیں ان کے پیچھے ہی بھائی جان اور منجو بھابی حیران و شرمندہ سے داخل ہوئے۔

"تم دونوں تو یہاں پڑھنے میں مصروف ہو اور یہ دونوں آخر ان کو سوجھا کیا تھا؟"

"کیا ہوا دادا؟" تاباں نے بھولے پن سے پوچھا

"ہوتا کیا یہی کہ انہوں نے مجھے دق کیا سنا تم دونوں نے خواہ مخواہ دق کیا" —— اس کے بعد انہوں نے مجھے مخاطب کر کے سارا قصہ بیان کیا۔ اس دوران میں بھائی جان اپنے چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کو رومال سے صاف کرتے رہے اور منجو بھابی ہم کو اس طرح دیکھتی رہیں جیسے کچا ہی چبا جائیں گی۔ سب کچھ بیان کرنے کے بعد دادا ذوق بگڑتے ہوئے اور خاص طور سے بھائی جان کی بے وقوفی پر ناراض ہوتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تاباں گہری سوچ میں لانبے میز کی دوسری جانب چپ چاپ

کھڑی ہوئی تھی —— آخرت کی پیلی پیلی دھوپ کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی وہ اس وقت ایسے دلکش پوز میں کھڑی ہوئی تھی کہ میں سب کچھ بھول کر اسے دیکھنے لگا۔

جب دادا ذوق کمرے سے باہر نکلنے لگے تو وہ کھڑے کھڑے چونک سی گئی اور بڑے گہرے لہجہ میں اس نے انہیں پکارا۔

"دادا"

کیا ہے؟ وہ پلٹے۔

"میں نے چوری کی ہے دادا" اس نے نیچی نظریں کئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چوری" یہ لفظ پورے کمرہ میں تیر کی طرح سنسناتا ہوا گذر گیا۔

"میں نے منجو بھابی کا حلوہ اور دوسری چیزیں چرائی ہیں"

"تم دونوں نے" دادا ذوق نے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تاباں کوئی جواب دیئے بغیر دبے قدموں سے بڑے فوٹو کے پاس گئی اور اس کے پیچھے سے چرائی ہوئی چیزیں نکال کر لے آئی اور میز پر رکھ دیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر سچائی کا وقار کچھ اس طرح جھلک رہا تھا کہ میری پلکیں جھپک گئیں —— عمر میں شاید سب سے پہلے میں نے نیکی کے نکھرتے ہوئے رنگ کو تاباں کے چہرہ پر دیکھا تھا۔ وہ مقدس لمحہ میری زندگی کا ایک قیمتی اور یادگار لمحہ تھا جسے میں شاید ہی بھلا سکوں۔

لیکن آہ لڑکپن کے یہ دلکش لمحے گذر گئے —— اور نیکی کا یہ رنگ تاباں کے چہرہ پر پوری طرح قائم نہیں رہ سکا —— "الصدف" کا مدقوق سا ماحول جہاں زندگی جھوٹ سچ اور حق و ناحق کا ایک عجیب سا مرکب بن گئی تھی اس نیکی کو جلا نہیں دے سکا۔ اس میں قصور کس کا تھا؟

بلاشبہ دادا ذوق کا لیکن ان سے کہیں زیادہ ہمارے اس بیداد سماج کا جو ایک طرف تو اپنے آہنی پنجہ سے ہماری گردن کو خدا بیزار حکمرانوں کے سامنے جھکا دیتا ہے اور دوسری طرف وہ دادا ذوق جیسے خدا پرستوں کے بے جان تقدس کے سامنے بھی رکوع و سجود کے لئے مجبور کر دیتا ہے

"آہ یہ کتنا بڑا تضاد ہے جسے ہمارا سماج ہمارے شعور پر لاد دیتا ہے۔"

ہم اس تضاد سے اکتا گئے اور "الصدف" کی فضا سے دونوں نے بغاوت کی لیکن بالکل ہی مختلف انداز میں ہماری کشتیاں دادا ذوق کے دنبالہ سے چھوٹ کر دو مخالف دھاروں پر بہہ گئیں۔ تاباں بالکل

تھا اس سیخ پر چلی گئی جس پر ڈاکٹر رضی جیسا آزاد منش شخص پہلے ہی سے اسے لے جانے کے لئے پریشان تھا اور میں نے وہ راہ اختیار کی جس کے متعلق مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہی راہ زندگی کے وقار کو بلند کرنے والی اور حقیقی منزلوں کی طرف لے جانے والی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ان دنوں داد اندتی کی ٹھنڈی اور خاموش فضاؤں والا "الصدف" حق اور باطل کی ذہنی کشمکش کی آماجگاہ بن گیا تھا ہماری ذہنی لڑائی بھی آنچ کی طرح سلگتی رہی ایک دوسرے کے ساتھ شدید قسم کی والہانہ محبت کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے کو جیت لینے کی کوشش کی لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں ناکام رہے۔ اس کے بعد میرا "الصدف" میں ٹھہرنا بے معنیٰ سا تھا میں وہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔

اور آج میں پورے پانچ سال بعد تاباں سے ملنے جا رہا تھا.....

اور آہ کن حالات میں۔!

انتظار گاہ کی کھڑکی کے تصوری پردہ پر سے پچھلی یادداشتوں کے یہ سارے عکس، طلوع ہوتے ہوئے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی میں تحلیل ہوگئے۔

بس کا ہارن سنائی دیا اور میں بیتابی سے دوڑا ——— جس وقت میں سینی ٹوریم پہونچا تو منجو بھابی اور بھائی جان برآمدے میں کھڑے نرس سے باتیں کر رہے تھے وہ دونوں انتہائی بدحواس اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

"انجم..... " منجو بھابی چیخ کر مجھ سے لپٹ گئیں "تاباں کیسی ہے؟ اس کو کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟"

میں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔

"اندر چلے جاؤ" بھائی جان نے قدرے برہمی کے ساتھ ایک وارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

اندر تاباں آنکھیں بند کئے سفید پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی ایک عجیب طرح کا سکون اس کے بے داغ چہرہ پر چھایا ہوا تھا۔ میں سمجھا شاید وہ سو رہی ہے لیکن قدموں کی چاپ پر اس نے دھیرے سے اپنی آنکھیں کھولیں اور بغیر کسی حیرت کا اظہار کئے ہلکے ہلکے اس نے کہا ———

——— تم آ گئے ———

"تم آ گئے انجم ——— تم آؤ گے! مجھے اس بات پر بڑا یقین تھا بالکل اس طرح جیسے کوئی تمہارے آنے کی مجھے اطلاع دے گیا ہو!"

میں نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا "مجھے معاف کرو۔ تاباں میں بہت شرمندہ ہوں۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ تاباں"..... میرا گلا شدت تاثر سے بھر آیا۔

"میں اچھی ہوں انجم بھیا جو ہونا تھا ہو چکا" وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجہ میں بولی "اب تو کوئی بات باقی نہیں رہی ہے صرف ایک آرزو تھی سو وہ بھی پوری ہو گئی"

"دیکھو انجم بھیا" اس نے چونک کر اس طرح کہا جیسے کوئی بات اسے دفعتاً یاد آ گئی ———

میں نے محض ضد میں تم کو چھوڑ کر ڈاکٹر رضی کے گلگشت کو ترجیح دی تھی۔ شاید میرے متعلق تمہارا یہ خیال رہا ہو کہ یہ سب کچھ میں سچے دل کے ساتھ کر رہی ہوں...... آہ ایسا نہیں ہے بالکل نہیں۔ اگر تم ایک مرنے والی کا یقین کر سکتے ہو تو میرے گواہ رہو میں نے کبھی اندھیرے کے مقابلہ میں اجالے کو اپنے جی سے نہیں ٹھکرایا لیکن یہ سب کچھ محض اس لئے ہوا کہ تم اس اجالے کو مجھے کچھ اس طرح دینا چاہتے تھے جیسے تم بھیک دے کر احسان کر رہے ہو میری خودی تمہارے اس منت کے بوجھ کو اٹھا نہ سکی۔ میں نے ضد کی لیکن انجم بھیا یقین مانو میں نے یہ ضد خدا کے اتارے ہوئے حق کے مقابلہ میں نہیں کی بلکہ صرف تمہارے پندار کے مقابلہ میں۔ اگر تم ایک عورت کے دل کو سمجھتے نرمی اور انکساری سے کام لیتے تو شاید..... کاش تم اس بات کو سمجھ سکتے۔ انجم بھیا..... کاش تم سمجھ سکتے۔

تاباں اس قدر کہہ کر اس طرح نڈھال ہو گئی، جیسے اس نے مدتوں سے اٹھایا ہوا کوئی بوجھ سر سے اتار دیا ہو ——— اس نے سختی سے میرا ہاتھ اس طرح تھام لیا جیسے کوئی ڈوبنے والا کسی سہارے کو پکڑ لے اگرچہ اس کا ہاتھ بری طرح کپکپا رہا تھا ——— تھوڑی دیر بعد ہی اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی میں ندامت سے سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے ہی اس کا ہاتھ میری کلائی پر سے کھسک گیا میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا میرا دل بری طرح اچھل پڑا ——— ایک قیامت خیز گڑگڑاہٹ سی سنائی دی اور جیسے کوئی پل ٹوٹ سا گیا اور رینگتی ہوئی گاڑی گہرے دریا میں گر پڑی۔ پھر ایک سناٹا سا چھا گیا..... کائنات جیسے چند لمحوں کے لئے خاموش سی ہو گئی۔

تاباں سو چکی تھی ——— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ابنِ فرید

جنگ کی بات نہ کرو

(جنگ خواہوں سے امن کی رُوح کی التجا ——— اگر امن کی روح کو فرض کر لینا تعمیری ادب میں معیوب نہیں)

اُف یہ میرا دم کیوں گھٹا جا رہا ہے؟ ——— اِس دریچہ کو بند کر دیکھو اس سے کتنی مسموم لپٹیں اندر گھستی چلی آ رہی ہیں ——— تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو ———؟ میں تم سے کہہ رہی ہوں اس دریچہ کو بند کر دو۔ اس سے جلی جلی سی ایسی ہوائیں آ رہی ہیں جیسے فضاؤں میں ہزاروں گولے، توپیں اور بندوقیں چھوڑ دی گئی ہوں۔ اور ——— ؟! اور اُف ان سے تو خون کی چراند بھی آ رہی ہے ——— بند کر دو، بند کر دو اس دریچہ کو بند کر دو ورنہ میں مر جاؤں گی ——— میں مر جاؤں گی ——— اُف میں مرنا نہیں چاہتی ——— ان ہواؤں کو دریچہ سے داخل کر کے میرا گلا نہ گھونٹو ——— میں مرنا نہیں چاہتی ——— میں تم سے التجا کرتی ہوں مجھے ابھی مرنے نہ دو ——— مگر؟! ——— توبہ ——— اُف یہ تمھاری آنکھوں میں خون کے ڈورے کیوں اُبھرے ہوئے ہیں۔ اور یہ تم نے اپنی پیشانی پر شکنیں کیوں پیدا کر لی ہیں ——— میرے خدا! ——— تم نے تو اپنی مٹھیاں بھی کس لی ہیں ———!

کیا تم کو اس کا بھی احساس نہیں کہ تم ایک جاں بہ لب مریضہ کے سرہانے کھڑے ہو، جس کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں، اور جس کے سینے میں ابھی تک وہ خنجر پیوست ہے جس کا دستہ مرصع اور طلائی ہے اور جس کو تم نے ہی اپنے ہاتھوں میرے خون کی تہوں میں اتار دیا تھا۔ اور اب تم ہی میرے سرہانے کھڑے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ تم مجھے زندہ رکھنے کی امکانی کوشش کر رہے ہو ——— مگر حیف ———! تم کو تو وہ کراہیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں جو ان دم گھٹا دینے والے جھونکوں کے ساتھ یہاں داخل ہو رہی ہیں ——— اور تم ان کراہوں اور ان چیخوں کو آخر سننے کیوں لگے۔ تم نے تو ایسی بہت سی آوازیں سنی ہیں۔ تم تو ان کے عادی ہو گئے ہو۔ یہ تو تمہاری طرب گاہوں کے ترنم زا نغموں سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں ———

مگر میں تو ایسا نہیں سُن سکتی۔ میں تو ایسا تصور نہیں کر سکتی۔ میری آنکھوں میں ابھی تک وہ ہولناک بہیمانہ مناظر ناچ رہے ہیں جن کو کل تک تم نے برپا کر رکھا تھا ——— اُف وہ سب مناظر میرے ذہن میں اس طرح زندہ ہیں جیسے وہ ابھی تک ہو رہے ہوں، مجھے ابھی تک تمھارے انسانیت سوز قہقہے اپنے کانوں سے ٹکراتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں ——— اور ابھی تک مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے ہیں اور میرے دماغ میں ہزاروں زلزلے پیدا ہو گئے ہیں ——— اُف میں پاگل ہو جاؤں گی۔ آخر یہ وحشی ناچ کب ختم ہوگا ———

مگر نہیں یہ دم گھٹا دینے والے جھونکے تو مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ جیسے وہ آگ اور خون کا کھیل پھر کھیلا جانے والا ہے جس سے بچنے کے لئے میں ایک گھر سے دوسرے گھر، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک بستی سے دوسری بستی، اور ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگتی رہی۔ میں برابر تمھاری بہیمانہ حرکات سے بھاگتی رہی ——— لیکن وہ سب تو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ان قافلوں میں بھی جو میلوں لمبے ہوتے چلے جا رہے تھے اور برابر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جن پر موت کی تھکن اور ہراس چھایا ہوا تھا۔ مگر وہ چلتے چلے جا رہے تھے۔ شاید میری تلاش میں ——— جہاں وہ خدا کی زمین پر میری آغوش میں اپنے بھوکے پیاسے دن گزار سکیں۔ لیکن ——— ان کو کیا خبر تھی کہ میں خود بھاگی بھاگی پھر رہی تھی پناہ کی تلاش میں۔ مگر مجھے پناہ نہ ملی۔ میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ میری پیشانی پر ٹھوکریں کھا کھا کر زخم پیدا ہو گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں انتہائی تکلیف سے چیخ چیخ اٹھی۔ مگر وہ میری چیخ کی آواز کو یُوں سمجھتے رہے کہ جیسے میں ان کو آواز دے رہی ہوں۔ اپنی طرف بلا رہی

سا۔ اور وہ اسی امید پر میری طرف بڑھتے رہے۔ بغیر اس کی پرواہ کئے کہ وہ تھک چکے ہیں اور تم موت کے کارندے بن کر ان کے چاروں طرف منڈلا رہے ہو۔ وہ مجھے تلاش کرتے رہے اور میں خود منہ چھپاتی رہی۔ وہ میری طرف بڑھتے رہے اور میں بھاگتی رہی۔ پھر تم موقع پاکر ان خاک سے اٹے ہوئے انسانی کیڑوں پر ٹوٹ پڑے۔ تم نے ان کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ ان کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دیئے۔

مگر آج تم ایسا مظاہرہ کر رہے ہو جیسے تم میرے بہت بڑے محافظ ہو۔ حالانکہ یہ خنجر جس کا مرصع دستہ طلائی ہے اور جو میرے سینہ میں پیوست ہے۔ یہ تمہارا ہی ہے۔ اور جن چوٹوں سے میری پیشانی سے خون کی دھارا چلنے لگی ہے وہ بھی تمہاری پہونچائی ہوئی ہیں۔ مگر مجھے تم نے یہاں لاکر اس شفا خانہ میں ڈال دیا ہے جس میں موت کے فرشتے چاروں طرف پر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ اور بارود کی پیدا شدہ فضا دریچے سے آ آکر فضا کو مسموم کر رہی ہے دم گھٹائے دے رہی ہے۔ پھر بھی تم نے مجھے سینے تک سفید چادر اڑھا دی ہے۔ اور اپنی ناک اور منہ پر سفید کپڑے کے ٹکڑے باندھ لئے ہیں۔ تمہاری آستینیں کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہیں۔ جیسے تم میرے زخموں کو پُر کرنے کے لئے تیار کھڑے ہو——مگر افسوس تم میں اتنی تحریک بھی تو نہیں کہ تم میرے سینے کے خنجر کو باہر نکال لو تاکہ اس کی چبھن سے بے کل ہو کر میں دم نہ توڑ دوں۔ اور پیشانی سے بہتے ہوئے خون کے فوارے کو بھی روکنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو جس کی وجہ سے میری نقاہت ناقابل برداشت ہوتی چلی جا رہی ہے——

بس اگر تم کچھ کر رہے ہو تو وہ یہ کہ تمہاری مٹھیاں بندھی ہوئی ہیں اور تمہاری آنکھوں میں سرخ ڈورے پیدا ہو گئے ہیں۔ شاید تم کو باہر جنگ کے دہماکے اپنی طرف بلا رہے ہیں جو اس دریچے سے باہر چاروں طرف پھیلتے جا رہے ہیں اور سہمی ہوئی انسانیت چیخ رہی ہے کراہ رہی ہے۔ تمہارے طاغوتی ارادوں سے تھرا رہی ہے——

مگر میں تم کو بتلائے دیتی ہوں——خواہ تم میرے ان بہتے ہوئے آنسوؤں پر پیچ و خم ہی کیوں نہ کھا رہے ہو جو میرے انتہائی کرب کی نشانی ہیں——کہ یہ سب تم اپنی ہوس کے لئے کر رہے ہو حالانکہ ظاہر یہی کرتے ہو کہ تم خدا کی اس مخلوق کو میرے پردوں کے سائے میں جمع کرنے کیلئے کر رہے ہو جو بھیڑوں کے گلوں کی طرح تمہاری آواز پر بڑھتی چلی آئی ہے۔ حالانکہ میں نے خود ان پناہ گاہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جہاں تمہارے الفاظ میں ان کو امان ملی ہے۔ تم نے وہاں ان کو بھوکا رکھا ہے جنہوں نے

تمہارے اشاروں پر اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔ تم نے وہاں ان کو غلاظت اور بیماری کے شکنجوں میں دم توڑتے چھوڑا ہے جنہوں نے تمہارے ایما پر اپنی جانوں کو ارزاں کر دیا۔ یہاں وہ میں وہ عصمتیں تمہارے ہی ہاتھوں کوڑیوں کے مول بکی ہیں جن کے محافظ بن کر تم نے ان کا اعتماد حاصل کیا تھا۔

اف! وہاں کتنی ویرانی اور وحشت برس رہی تھی کہ میں وہاں سے بھی تھکن میں چور، چور، لڑکھڑاتی ڈگمگاتی بھاگ کھڑی ہوئی——

اور میں نے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا کہ تمہارے ایوان بقعۂ نور ہو رہے تھے۔ ساز اور شراب کی تیز کھنکتی ہوئی آوازیں تیرگی کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھیں اور ہزاروں آبرو باختہ مترنم آوازیں تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں اور تم ان سب میں اس طرح غرق تھے گویا تمہارے گرد و پیش سب کچھ پُرسکون حالت میں ہے—— ایسا کیوں نہ کرتے——؟

تم نے جو کچھ چاہا تھا وہ سب ہو رہا تھا۔ ہزاروں حسینائیں ہر شب تمہاری آغوش ہوس کو پُر کر رہی تھیں۔ کروڑوں طلائی اور نقرئی سکے سیل بے پناہ بن کر تمہاری تجوریوں میں سماتے چلے جا رہے تھے اور تمہارے ایوان تعداد جانوں کی قربانی لے کر مستحکم کھڑے ہوئے ان پر قہقہے لگا رہے تھے جنہوں نے ان کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

ایک طرف تم عیش و طرب کے گہوارہ میں تھے اور دوسری طرف انسانیت، بربریت اور تباہی کے غار کے منہ پر—— آخر کیوں؟——

صرف اس لئے تاکہ تم ہزاروں سروں کو اپنے غرور اور خود پسندی کے معبد میں سرنگوں کرنا چاہتے ہو۔ اور وہاں ان اختیارات کی نمائش کرنا چاہتے ہو جو دراصل تمہارے نہیں ہیں۔ تم اپنے اس خواب کو سچا کر دکھانے کی کوشش کرنا چاہتے ہو جس کی تمہارے ہی آباؤ اجداد نے اسی طرح آگ اور خون کی ہولی کھیل کر متعدد بار کوشش کی مگر تم جانتے ہو کہ وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ آخر میں انہیں خود ہی اجل کا نوالہ بننا پڑا اور ان کی یادگاروں میں سے صرف ان کی درندگی ہی باقی بچ گئی——

پھر اب تم کس امید پر اس قصۂ پارینہ کو زندہ کرنا چاہتے ہو۔ کیا صرف اس لئے کہ تمہاری بے راہ رویوں سے ہمیشہ انسانیت سسکتی رہے، دم توڑتی رہے اور تم بھیڑیوں کی طرح جبڑے چیرے زبان نکالے ہنستے رہو۔ تمسخر اڑاتے رہو۔

ہاں البتہ اگر بہیمیت کا یہ خنجر جس کا دستہ مرصع اور طلائی ہے تم نے میرے سینہ میں پیوست کرنے کے بجائے خود انسانیت کی حفاظت کے لئے استعمال کیا ہوتا اور ان ماؤں کو تہ تیغ نہ کیا ہوتا جن کے چہروں پر جھریاں

پڑ چکی تھیں، اور جن کی آنکھوں پر دھندلاہٹ چھا چکی تھی ۔ اور آنے والی انسانیت کو پروان چڑھانے والے سینے قلع نہ کئے ہوتے ۔ اور ان قافلوں بستیوں اور ریل گاڑیوں میں قتل عام نہ شروع کر دیا ہوتا جو تمہاری بہیمیت کے سامنے بے بس تھے تو میری پیشانی سے خون کے فوارے نہ چھوٹتے، میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں نہ جھڑنے لگتیں اور خنجر کی چبھن مجھے اس طرح نیم جاں نہ کر دیتی ——

مگر تم اس حالت میں اپنی ہوس رانیوں کو کیونکر روا رکھ سکتے ہے میں سمجھ گئی ہوں کہ تمہارے اندر انسانیت کی ذرا بھی رمق نہیں ہے تمہارے سینے پاکیزہ روحوں سے یکسر خالی ہیں —— پھر شاید تمہارے اندر کسی گوشہ میں انسانیت چھپی بیٹھی ہو —— معاً اس ناامیدی میں مجھے خیال آجاتا ہے —— اور اسی لئے میں مجبور ہو گئی ہوں کہ تم سے ایک بار پھر التجا کر دوں کہ جنگ کی بات نہ کرو ۔ ورنہ ہزاروں بے گناہ موت کی گھاٹیوں میں دھکیل دیئے جائیں گے ہزاروں بستیاں ویران ہو جائیں گی ۔ ہزاروں سرسبز و شاداب کھیت خاک سیاہ ہو جائیں گے —— اور یہ سب کچھ میری برداشت کے باہر ہو جائے گا ۔ میں دم توڑ دوں گی ۔ پھر ابھی تو میرے کل ہی کے زخم ہرے ہیں ۔ ابھی وہ بھی تو اچھے نہیں ہوئے ہیں —— اور —— اُف ؟! —— یہ طلائی خنجر میرے سینے سے نکال لو اس کی چبھن سخت ہوتی چلی جا رہی ہے ۔ اور دیکھو یہ خون بھی ابھی بالکل تازہ ہے اس کو بند کرنے کی کوشش تو کرو ۔ —— اور ؟ —— اور یہ دریچہ ؟ —— آخر تم اس دریچہ کو کیوں بند نہیں کرتے ہو ۔ ؟ —— بارود کی یہ دم گھٹا دینے والی بدبو مجھے مار ڈالیگی —— مگر تم —— ! تم جو میرے معالج بنکر کھڑے ہوئے ہو تمہیں تو یہ جھونکے عطر بیز معلوم ہوتے ہونگے کیونکہ تمہارے دونیں ابھی کچھ ایسے ارادے ہیں اور تم ان کراہوں اور چیخوں کو نہیں سن سکتے جو اس گھمی گھٹی ہوئی بھی نکلتی ہیں ۔

جنگ

اقوام میں کبھی نہ ہوئی صلح و آشتی ۔۔۔ انسان کی سرشت میں داخل ہے قتل و جنگ

تہذیب نو بھی کر نہ سکی اس کا سدِ باب ۔۔۔ فطرت کے آگے چل نہ سکی حکمتِ فرنگ

سائنس کی یہ تازہ بہ تازہ ترقیاں ۔۔۔ انسانیت کے خون کی تفسیر رنگ رنگ

یا جبرِ مجرمانہ ہے یا حیلہ و فریب ۔۔۔ مغرب کا سامراج زمانہ ہے جس سے تنگ

عہد قدیم پھر بھی تھا انسانیت شناس

اس دور نے تو اور ڈبویا ہے نام و ننگ

(تسکین)

ملا رموزی

پانچوں گھی میں

شیخ عیدو محمد کی عرفیت یا تخلص ہی میرے ایسے لطیف الخیال انسان کے لئے کیا کم تکلیف دہ تھا یعنی "عیدو" اس پر عیدو بھٹیاروں سے بدتر گندہ میلے اور چیتھڑے کی قسم کا لباس پہنے بغیر جوتے اور ٹوپی کے اپنی دکان کا کام کرتا تھا، مجھے اس کی دکان سے سودا لینا اتنا ضروری تھا کہ اگر نہ لیتا تو گویا میں پشتو زبان ہی نہیں جانتا تھا یعنی افغانی نہیں تھا۔

میں جب جاتا عیدو خود سلام کرتا اور دوسرے تیسرے دن یہ فقرہ ضرور کہتا کہ حضور آپ تو نواب صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں لیکن پاک پروردگار نے چاہا تو پلاؤ تو میں کھلاؤں گا حضور کو۔

۱۰ اگست ۱۹۵۱ء کو عیدو گلابی عمامہ اس طرح باندھے میرے گھر آیا گویا شرنارتھیوں نے اپنے صدقہ کے دو تھان اس کے سر پہ باندھ دیئے ہیں۔ آج یہ سفید کرتا پاجامہ بھی پہنے تھا جیسے ہی میں اس کے سامنے آیا دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضور آپ کے غلام بیٹا کی بارات . . . . . . گانوں میں جائے گی اور بغیر حضور کے میں بارات ہی نہیں چڑھاؤں گا، عمر بھر سے آپ میاں حضوروں ہی کا نمک کھایا۔

میری بھی شامت آچکی تھی کو میں نے اپنی علالت کا عذر کیا اور کہا کہ اس گانوں تک نہ موٹر جا سکتا نہ لاری، مگر وہ تو قسم کھا کر نکلا تھا کہ اتنے ہی میں ابو دادا لاٹھی کے سہارے آ ہی تو گئے یہ عیدو ہی کے چچا نہیں تھے بلکہ میں بھی ان کو اس لئے چچا کہتا تھا کہ یہ میرے والد صاحب مغفور کو سودا دیتا تھا اور دوست سا بن گیا تھا مرحوم اس کے لڑائی جھگڑے کے معاملے سلجھایا کرتے تھے۔ اب یہ میرے سودے سلف کے بازار کا گویا خواجہ خضر ہے اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے دودھ ملائی سے زیادہ سفید عمامہ کی طرف ہاتھ بڑھائے تاکہ عمامہ کو میرے قدموں پر ڈال کر کہے کہ بارات میں چلو۔

میں نے جھپٹ کر روکا تو ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اچھا پٹھان ہو تو اپنے باوا کی طرح میرے بچے کی شادی میں میرا ساتھ دو۔ میں نے کہا چچا میاں بیمار ہوں عیدو بغل سے بولا کہ میاں گھر کے بیل گاڑی ہیں ایسے آرام سے لے چلوں گا کہ قرآن پاک کی قسم حضور کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ گاڑی میں بیٹھے ہیں کہ موٹر میں۔

معاملہ تھا کھانے کا اور وہ بھی پلاؤ وغیرہ میں نے وعدہ کر لیا گویا موت سے ملاقات طے کر لی۔ دوسرے ہی دن سویرے ہی سے عیدو گاڑی لئے حاضر تھا۔ میں باہر آیا اور میرے شکاری کپڑے لئے کہیں میرا ولی عہد نمبر ایک مصطفٰے شوکت کیا آگیا کہ عذاب آگیا۔ عیدو نے میرے کپڑے لیکر مصطفٰے شوکت سے کہا کہ میاں حضور آپ سب بھائیوں کے بغیر میں گاڑی نہ چلاؤں گا۔ میں نے بہت بہت منع کیا کہ جنگل خطرناک ہیں اور اوپر سے بارشی راستے مگر جس شخص کا نام عیدو ہو اس کو احتیاط اور مآل اندیشی سے کیا تعلق ادھر بچے بہرحال بچے اور ادھر میں ان کا باپ بہرحال باپ، اس لئے گاڑی رک گئی اور مصطفٰے شوکت، مصطفٰے ثروت اور مصطفٰے رفعت اپنے اپنے جنگلی لباس میں تیار ہو کر آئے۔ بیوی نمبر ۲ چونکہ میرے بچوں کی کنٹرول آفیسر ہیں، انھوں نے دیہاتی سفر کا سنتے ہی حکم دیا کہ اپنی اپنی رائفلیں بھی لے جاؤ۔

عیدو کا رائفلیں دیکھنا تھا کہ پھر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ "بڑے بھیا" حضور کی بندوقیں بھی لے آؤ تو قسم کلام اللہ شریف کی وہ شکار کھلاؤں کہ مزا آجائے شوکت کو کون روکتا وہ گئے اور میری بندوقیں بھی لے آئے۔

اب گویا شکار اور پلاؤ یہ دو چیزیں ایسی جمع ہو گئیں کہ میں راستہ اور علالت کی تمام آفتوں کو بھول گیا، گاڑی روانہ ہوئی کوئی دس فرلانگ پر دیکھا کہ عیدو کے لڑکے کی بارات کی کوئی تیس بیل گاڑیاں مع زنانہ ڈبیوں کے

میری گاڑی کے انتظار میں کھڑی ہیں ابھی میری گاڑی کو یہ اعزاز بخشا ہی گیا تھا کہ حضور کی گاڑی سب گاڑیوں سے آگے چلے گی کہ میرے بھانجے صولت سلطان سائیکل پر ہوائی جہاز کی رفتار سے آئے اور بیوی نمبر ۳ کی بھیجی ہوئی بعض لباسی چیزیں مثلاً میرے یا خود نمبر ۳ کے لڑکوں کے گرم کوٹ، برساتیاں، اور ایک جرمن سفوف ہاضم اور اس کے بعد بیوی صاحبہ کی اپنے بچوں کے لئے مجھے کچھ اس طرح کی ہدایانہ ہدایا" کہ

دیکھئے مصطفٰے اور رفعت کو شکار میں ہرگز ہرگز نہ لے جائیے گا۔

اور بہ شروت کو زیادہ گوشت نہ کھانے دیجئے۔

شوکت کو جنگل میں تنہا نہ جانے دیجئے۔

اور سنئے سنئے یہ سفوف سب کو ضرور کھلا دیجئے گا۔

اور آخر میں یہ کہ جلد آئیے گا بچوں کا ساتھ رہے۔

اب میں قبلہ سر آغا خاں سے مفتئ اعظم فلسطین تک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مذکورہ ہدایات میری افغان تربیت اور شکاری عادت کے یکسر خلاف تھیں اس لئے میں جانتا ہوں کہ ہندوستان کے اچھے خاصے اولو العزم، حوصلہ مند، بہادر، شجاع، اور جنگ جو فرقوں کو مدبر و مفکر انگریز نے بی۔ اے، اور سوٹ بوٹ کی نفاست، تانگے، موٹر، رکشا، وغیرہ کی تہذیب میں پھانس کر اس طرح کا واللہ چنانچہ اور لکھنؤ ا بنا دیا کہ وہ اب میدان جنگ، توپ تلوار، چھری چھرے، شکار، گھوڑے کی سواری، دیسی ورزش، غرض ہر مشکل ہمت طلب اور جفاکشی کی زندگی اور خطرہ میں پڑنے اور غنڈوں کا کام سمجھنے لگا اور بقلم خود خاتون مغرب بن کر نفاست و نزاکت کو معیار تہذیب و شرافت سمجھنے لگا مگر مجھے اول تو کو میں بولنے کے لئے محترمہ والدہ صاحبہ نے پتھر اور پہاڑ کی طرح کی [illegible] زبان پشتو عنایت فرمائی اس کے بعد والد صاحب قبلہ کو نواب مفتاح الملک سلطان دولہ منفور کی اتالیقی اور منشی کی ملازمت جو ملی تو موصوف نے شب و روز شیر کے شکار ہی میں گذرتے دیکھے اور سخت فولادی و طاقت والی غذائیں حرف شکار، یہ اپنی افغان والدین کی تربیت کا اثر ہے کہ آج [illegible] ماہ سے زیر علاج ہوں مگر نہ غسل صبح کا ہی کا ناغہ نہ شکار اور نہ پرہیز [illegible] سے توبہ۔

ادہر میں نے ان چاروں مہذب بیویوں کی آٹھ آنکھیں بچا کر ان لڑکوں میں سے دو کو جنگل سے اتنا نڈر بے خوف اور باہمت کر دیا ہے کہ یہ آج تک پاکستان نہ ہی گئے۔

اس لئے میں نے بھانجے کو یقین دلایا کہ تمام ہدایات کی پابندی ہوگی، اور دل میں کہا کہ افغان ہوں تو بیوی کا غلام بن کر نہ رہوں گا۔ کیونکہ بیوی سے دب کر رہنے سے اور تو سب جانے دیجے سینما کے ٹکٹ کا خرچ بڑھ جاتا ہے گاڑیاں روانہ ہوئیں۔ سب سے آگے میری گاڑی تھی اور عبید دکا بھائی شیر فواس کا ڈرائیور تھا۔ کوئی دس گاڑیاں پردہ کی تھیں اور کوئی بائیس گاڑیاں عجیب و غریب قسم کے باراتیوں کو لادے ہوئے تھیں، ہندوستان کی پیدائشی بے ترتیبی، غیر قومی اور کہیں قومی وضع و قطع کے بیچ میں ۳۰۸ قبل مسیح کے کچھ آثار قسم کے رنگا رنگ پوسے اور سادہ ہورے لباس کے باراتی عورتوں کی گاڑیوں سے گانے کی آواز کا وہ تسلسل کہ راستہ کے نشیب و فراز میں رکتا نہ گھنی جھاڑیوں کے رگڑوں سے کم ہوتا، پھر غزلیں وہ گائی جا رہی تھیں کہ نہ دیوان غالب میں نہ حسرت موہانی کے کلام میں، کوئی مصرع گراموفون کے کسی بازاری ریکارڈ کا تو کچھ مصرعے دیوان داغ کے، کچھ سینما کے اشعار اور ان بازاری شعرا کے جن کے کلام کو غنڈے گلیوں میں الاپتے پھرتے ہیں۔

ایک گاڑی میں بینڈ باجے کے آلات اس طرح بندھے ہوئے جیسے بے ہنر مسلمان کسٹوڈین کی ضبطی سے ڈر کر پاکستان لے کر بھاگ رہے ہوں، ان کے پیچھے کاغذی باغ بہاری کے نیلام کے قابل گلدستے اور آتش بازی جو میں نے اپنے دادا مرحوم کے زمانے میں دیکھی تھی وہ۔

اس قحط و بلا اور باراتیوں کی مفلس تر حالت پر بھی دماغی بے حسی کا یہ حال کہ تن پر صرف ایک ریشمی اور سخت شوخ رنگ کا کرتا، پاجامہ اور کسی کے زنٹیل سی ٹوپی اور اس پر سکون قلب اور مستی کا یہ حال کہ میری گاڑی دائیے پانچویں سے اور گیارہویں والے بندرہویں سے اور پاس والے پاس والوں سے اونچے ہو ہو کر سخت بازاری مذاق اور قہقہوں سے کام لے رہے تھے، کسی کسی جگہ مستی اتنی بڑھ جاتی تھی کہ چند لونڈے ایک دوسرے کو پکڑ کر مارنے کے لئے گاڑی پر آتے تو اس گاڑی کے لونڈے کسی بلند درخت پر چڑھ جاتے اور یہی وہ ایک خاص بات تھی جس سے باراتیوں کی حیثیت، کا آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان بے چارے کے لٹھ لونڈوں کے ہر فقرے اور ہر بیہودہ حرکت پر ان کے بزرگ تک کافی قہقہہ لگاتے تھے اب اندازہ فرمائیے کہ اس طرح کے ہمراہیوں میں حضرۃ ادیب الممالک، ملک الشعرا ملا رموزی اتالیق شاہزادگان وبیگمات بھوپال بھی بیل گاڑی میں آ گئے تھے مگر نہ موت تھی نہ رزق، کہ اچانک میرے چھوٹے لڑکے مصطفٰے رفعت نے مجھ سے کہا کہ "میاں ابا وہ ہرن" میں نے

ہرن دیکھتے ہی گاڑی وان سے کہا کہ آپ میری جگہ آ بیٹھئے اور گاڑی مجھے چلانے دیجئے تھوڑی دُور پہنچکر میں نے اپنے بڑے اور منجھلے لڑکوں سے کہا کہ گاڑی سے نیچے کود کر بندوق چلاؤ ان دونوں نے ہرن کی دو مساتوں کو گرایا کہ دو کانے نکل کر تیز بھاگے میں نے ان کو گرایا۔ لڑکوں نے بجلی کی طرح دوڑ کر چاروں کو ذبح کیا نہ ذیل کے بادل گرجنے لگے۔

ابے اوسدوا دوڑ، اسے قرآن کی قسم ایسا نشانہ تو اپنے ہوش میں نہیں دیکھا۔ کہ اتنے ہی میں تین چار گاڑیوں کے سوار پیدل اور ہرن لادنے کے لئے گاڑیاں لے آئے اب آنے دیجئے عورتوں پہ مصیبت اب یہ دہ دردہ کیا جس کو دیکھو ہرن کو اس طرح دیکھ رہی ہے جس طرح ایم، اے، ایل، ایل، بی، ہندوستانی تک آج بھی امریکہ اور برطانیہ کی نئی ایجادوں اور مشینوں کو دیکھکر اپنی بے ہنر اور غیر موجد دماغی بے بسی سے حیران رہ جاتے ہیں۔ ایک خواجہ حسن نظامی قبلہ سے ملتے جلتے ضعیف بزرگ آئے اور میرے لڑکوں کے بندوقی کمال پر کچھ دعائیں کچھ وحشیانہ جملے اور آخر میں یہ کہ میاں حضور یہ اتنی دور کس طرح ان کو مارا۔ میں نے کہا کہ قبلہ بندوق (۳۰۳) ہے، اچھا کہہ کر پھر قوالی کے حال کی طرح کچھ جھومنے سے لگے، میں مارے وحشت کے اپنی گاڑی میں آ گیا۔ مگر وہ (۳۰۳) کی شرح نہ کرا سکے۔

اب جو گاڑی چلی تو خدا یاد آیا یعنی بیل گاڑی ایک سخت ناہموار پہاڑی علاقے سے کیا گذری کہ میری اور بچوں کی کمر نے کمر ہونے سے انکار کر دیا۔ مگر بارات کی ایک گاڑی کے سواروں میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کی گئی بلکہ اب تو چار ہرنوں کے پلاؤ اور خود سے فراہم کئے ہوئے گوشت کو ٹھکانے لگانے کی تجاویز و تدابیر میں انہماک تھا اور مجھے اور میرے بچوں کو انتہائی وحشت و حیرت سے دیکھا جا رہا تھا کہ اچانک دیگ کی قسم کی بارش شروع ہوئی اور میاں نے بیوی نمبر ۳ کی بھیجی ہوئی برساتیوں کو بقلم خود اور بچوں کو اٹھا کر دل میں کہا کہ ہر حال میں چار بیویاں ہی مفید ہیں اس لئے کہ اگر ایک بھولے تو دوسری کو یاد ہے، اگلی بارش سے بچنے کے لئے ان قریب سو مرد و عورت کے درمیان پانچ چھ تریاں تھیں اور باقی خیریت کہ الحمد للہ شادی والے گاؤں کا استقبالی پنڈال اس طرح نظر آیا کہ ایک درخت کے نیچے کچھ چارپائیاں کچھ گندہ میلے حقے اور کچھ لال پیلے اور ہورے اور پورے لباس کے مرد اور لونڈے گاڑیوں کے پہنچتے ہی تمام بارات والوں نے ایک دوسرے سے معانقے شروع کئے اور خدا جانے کس کس طرح کے سلام کہ ناگاہ ہمارے ساتھ کے بینڈ نے شادی کا وہ ترانہ بجایا کہ میرا دل اس کے بے تال سُر ہونے پہ خود کشی کو تیار تھا۔ کسی بگل سے صور کی آواز نکل رہی تھی کسی سے ٹھمری اور غزل کے ماتم کی۔

اس کے بعد استقبالیہ کمیٹی کے ایک قحط زدہ بزرگ مع چند اصحاب کہتے کہ مجھے خوش آمدید کہتے میری گاڑی پر تشریف لائے میں نے بھی معانقہ کے لئے خود کو ان کے بس میں دیدیا کہ بیجے چاہے یو، پی کا معانقہ فرمائیے چاہے سی، پی کا،

صحیح ہے کہ یہ تمام برادری ایک بے حد مختصر سی آمدنی والے کاروبار کے لوگ تھے مگر ان میں جو خلوص جو سخاوت، جو مروت، جو تواضع، جو سچی محبت تھی وہ نہ کانگریس کے دستوں میں ملے گی نہ گاندھی جی کی جمعیت رعیت میں

اب ہم سب پیدل اس خدائی قہر کے قسم کے بینڈ باجے کے ساتھ روانہ ہوئے۔

گاؤں کے دروازہ پر پہنچکر کافی جاہلانہ اور اپنے فرقہ کی روایات تاریک کی رسمیں پوری کی گئیں۔ میرے لئے ایک دالان نہایت صاف خاص کیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دلہن والوں کی طرف سے قبلہ سر آغا خاں کی عمر کے کچھ بزرگ آئے اور فرمایا کہ حضور دال دلیہ حاضر ہے یعنی لنچ۔

ایک بڑے دالان میں زمین دوز قسم کا فرش اور ہاتھ دھلاتے ہی آنے دیجئے بمبئی اور کلکتہ کے برابر قورمہ کے طباق اور مانڈے، قورمہ کی صورت حال یہ تھی کہ شوربہ آئینہ کا کام دے رہا تھا یعنی اتنا پتلا کہ ہماری صورت اور اوپر کی چھت کی تمام تفصیل صاف نظر آتی تھی، میری فرعونیت نے محسوس کیا کہ یہ سالن بدمزگی کی وجہ سے نہ کھایا جائے گا مگر خدا کو منہ دکھانا ہے جیسے ہی پہلا دوسرا لقمہ کھایا اس قورمہ کے چٹخارے اور مانڈے نے مجھے پھر سو ہضم کی حد پہ پہنچا دیا۔ اور حیران تھا کہ جنکو ہم غریب اور لٹھ سمجھتے ہیں وہ بھی اس لذت اور چٹخارے کے کھانے پکاتے ہیں

واضح ہو کہ یہ کھانا بحیثیت مہمانوں کے کھلایا گیا تھا اس کے ۲ گھنٹہ بعد بینڈ باجہ شروع ہوا جس نے وہ واہی تباہ گیتیں غزلیں وغیرہ بجائیں کہ میں جانتا ہوں مگر گاؤں کی ہندو مسلمان آبادی میں سے ایک نہ تھا جو ان باجے والوں کو حیرت سے نہ دیکھ رہا ہو، اور اسی سے ہر باجہ والا فخر و غرور کے حساب سے وائسرائے بہادر بنا ہوا تھا کہ عصر و مغرب کے درمیان نکاح کی مجلس منعقد ہوئی ایک دیہاتی وضع کے قاضی صاحب پیدا ہوئے سب تعظیم بجا لائے، نکاح کے بعد تبرک کے طور پر خرمے اور بڑے بڑے بتاشے تقسیم ہوئے۔ ہر بچہ شیخ کو پھر مہمانوں کو نذر دیا گیا اس میں حلال جانوروں کے سر پائیوں اس چٹخارے کے

پکائے گئے کر میں تو امیروں کے مشک و عنبر اور زعفران والے کھانوں کو بھول گیا۔

اب گیارہ بجے شب کو بارات ہے۔ میں جلد سونے اور جلد اٹھنے کا عادی ہوں کہ عید و شرفو اور ان کے چچا وغیرہ ایک وفد کی صورت میں تشریف لائے اور انتہائی دینی جذبے کے ساتھ فرمایا کہ حضور ہم لوگوں کی برادری نے قسم کھائی ہے کہ کسی تقریب میں بھی رنڈی اور گانا دانا نہ ہوگا البتہ میلاد شریف ہوگی۔ میں نے کہا آپ لوگ اس زمانے کے لاکھوں ان مسلمانوں سے بہتر و برتر ہیں جو تعلیمات اسلامی کی پرشاکتے بغیر غیر اسلامی آداب زندگی اختیار کر چکے ہیں۔ اسی لئے دیکھ لو سب سے زیادہ یہی باغی اسلام لوگ پاکستان بھاگ رہے ہیں اور آج ان کو وہاں بھی سکون و راحت نصیب نہیں، مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے بعد مجھے بھی پھانسی پر لٹکایا جائے گا قسم ہے بیمبر کے شریعت سے اس بیت المقدس تک کی جس کے سر پرستوں کی نااتفاقی اور غیر قومی زندگی اور امریکہ و برطانیہ کی امداد سے حکومت یہود مسلط ہے۔۔۔ جو میں نے عمر میں کبھی میلاد شریف کا کام کیا ہو لیکن ان تینوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا کہ میلاد شریف آپ کو پڑھنا ہوگا۔ میں نے ایک منٹ میں اقرار اس لئے کر لیا کہ جانتا تھا کہ میری میلاد کی کمزوریوں کو کون سمجھے گا۔ ایک کھلے میدان میں ایک وسیع بساط پر پوری بارات نہایت ادب سے بیٹھ گئی اور میں نے ان کی جہالت کو تاک کر حضرات کھانا لیڈیز اینڈ جنٹلمین، اور بیان شروع کر دیا جو سمجھ میں آیا کہا۔ کچھ عربی اشعار پڑھ دیئے اور کچھ آیات قرآن اور میلاد شریف ختم ہوئی مگر ہر شخص کا یہ حال تھا کہ جیسے اصلی مولانا ابو الکلام آزاد کو سن رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح سویا اور صبح سویرے اپنے بچوں کو لیکر جنگل کی طرف نکل گیا حسب وعدہ عید خود گاڑی چلا رہا تھا اس نے تین گھوڑے کے برابر جانور گاڑی سے بہت دور دیکھے مجھے بتائے میں نے گاڑی پر کھڑے ہو کر تینوں کو گرا دیا۔

اب کھایئے ولیمہ، اب گاؤں بھر میں میں ہی تھا بندار تھا اور میں ہی کھیلدار۔

ایک وسیع میدان میں کھانے کا اہتمام تھا مگر میں اور میرے بچے اس سے پہلے ان تینوں جانوروں کی روح کھا چکے تھے کہ کوئی ایک بجے پھر بینڈ بجا اور اب سامنے دیکھیے کھانے والوں کو اب اگر غرباء اور مزدور کہ ان کی مقدار غذا کو میں بیان کروں تو بے خبر لوگوں پر حیرت طاری ہوگی مگر طبی نکتہ صرف اتنا ہے کہ جو مرد یا جو عورت جتنی زیادہ بیوقوف اور کندہ ناتراش ہوگی اس کا ہاضمہ نہایت قوی ہوگا اور جو جتنا ذہین و حساس ہوگا اتنا ہی اس کا ہاضمہ کمزور رہے گا کیونکہ معدہ کی حرکا تعلق براہ راست دماغ کی حس سے ہے اس لئے اب جس طرف دیکھیے پلاؤ ہی پلاؤ اور اوپر سے غریب ہونے پر بھی درجہ اوّل کے شیرمال اور قورمہ پر قورمہ، میں اور میرے بچے جلد فارغ ہو کر اپنے دالان میں چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ اور اب کھانے دیجیے ان کو طباق پر طباق، حال یہ تھا کہ اس مجلس کے شور سے نہ میں قیلولہ کر سکتا تھا نہ ان کھانے والوں کی مقدار غذا سے نظر ہٹا سکتا تھا۔ اور اس طرف یہ حال کہ ایک ایک کے ساتھ چھوٹے بدصورت نیم عریاں بچوں کی ایک فوج مگر مقدار غذا میں ہر معصوم بچہ اپنے باپ کے برابر "ارے چنو ادھر لا پلاؤ"

"بس ہٹ یہاں سے جب تجھ سے نہیں بنتا تو کاہے کو کھڑا ہو گیا"

"نورا، ابے تیری... . . . او نورا۔ وہ غفورا سے تو جا کے کہہ کہ کیا دیگ کے پاس ہی بیٹھا رہے گا تو؟"

پانی دے پانی ابے اندھے کے بچے حاجی صاحب کو،

کیوں حاجی صاحب بس! اسے قرآن کی قسم آپ نے کھایا ہی کیا ہے تو بس یہ گرما گرم طباق اور ختم کرو مگر میں نے دیکھا کہ بوڑھے حاجی صاحب سیر ہونے پر بھی اس طباق کو چٹ کر گئے۔ ایک خاص چیز یہ دیکھی کہ پلاؤ کو زیادہ سے زیادہ پیٹ میں جمع کر لینے کے لئے ۷۵ فیصدی لوگ مختلف قسم کی چٹنیاں بھی ساتھ لائے تھے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک لقمہ دو دو چھٹانک کے برابر منہ میں اس طرح جاتا کہ معاً ہی گلے سے ایک گولے کی طرح اندر جاتا نظر آتا کہ پھر دوسرا لقمہ، کھلانے والوں کا یہ حال کہ جس کے سامنے جتنا چاہا پلاؤ اتار دیا حیرت اور عقل و نفاست کی تباہی تو یہ تھی کہ چار چار پانچ پانچ پلاؤ کے طباق بغیر بریک کے کھا کر پھر شیرمال اور قورمہ بھی ان کے پاس ڈھونڈے نہیں ملتا تھا۔ دیگوں سے مجلس تک گھوڑوں کی رفتار سے کھانے لائے جا رہے تھے اور کوتوالی کے انداز جبر سے کھلائے جا رہے تھے۔ میں نے کافی انتظار کیا کہ کھانے سے کوئی کب اٹھتا ہے آخر میں ہی تھک گیا لیکن ان میں سے ایک نہ اٹھا۔

میرے بچے جو جرمنی کا پیٹینٹ مفقود ہاضم کھائے ہوئے تھے ان لوگوں کی مقدار غذا پر ہکا بکا تھے۔

ایم۔آر۔ایس

انتظار

ٹرین تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ سامنے کی سیٹ پر ایک کمیونسٹ نوجوان اپنے برابر والے مسافر سے سرمایہ داری و اشتراکیت پر گفتگو کر رہے تھے۔ تقریر کی روانی میں نوجوان نے مسافر سے سوال کیا۔ "ایک سرمایہ دار کسی بڑھئی سے فرض کیجئے دو روپیہ مزدوری پر کوئی چیز بنواتا ہے اور اسے دس روپیہ نفع پر فروخت کرتا ہے ذرا بتائیے تو وہ آٹھ روپیہ کہاں جائیں؟"

ہمارا اس گفتگو میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ نہ تھا مسافر بے چارہ ابھی اس انوکھے سوال پر سر کی کھجلی سے کچھ مشورہ سا کر ہی رہا تھا کہ بیساختہ ہماری زبان سے نکل گیا

"سرمایہ دار کی جیب میں"

اس جواب میں نہ معلوم کیا زہر بھرا تھا کہ نوجوان کے چہرہ کا تو ایکدم جغرافیہ ہی بدل گیا۔ کئی بار سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا۔ اور کچھ سکوت کے بعد زوردار لہجہ میں فرمایا۔ "کیوں صاحب! سرمایہ دار کی جیب میں کیوں؟"

"یہ اس لئے کہ آئندہ وہ اپنے سرمایہ اور اس نفع سے ایک کے بجائے دو چیزیں بنوائے تاکہ ایک مزدور کو دو دن کی یا دو کو ایک دن کی روزی میسر آجائے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے تا آنکہ ہزاروں مزدوروں کی مستقل روزی کا ذریعہ پیدا ہو جائے۔"

"ایک نہ شد دو شد۔ بھئی آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ سرمایہ دار معلوم ہوتے ہیں آپ بھی۔ ٹھہر جائیے ذرا۔ اب آپ کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔" انہوں نے مہر نیمروز بنکر کہا۔ "مزدوروں سے ہمدردی بھی اگر سرمایہ داری ہے تو پھر

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

پھر تو آپ اور ہم دونوں ایک ہی جرم کے مجرم ہوئے۔ آئیے دونوں مل کر گانا شروع کر دیں۔" "مگر مزدور کو اتنی مزدوری تو ضرور ملنی چاہئے کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔" ہمدردی کا کارٹون بنتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ضرورت کی بھی ایک ہی کہی آپ نے۔ کوئی مزدور بعلم خود ہے تو کوئی متعلقین کسی کے بوڑھے ماں باپ بھی ساتھ ہیں تو کیا ان سب کی ضروریات برابر ہوں گی۔ فرداً فرداً بھی کوئی کم کھاتا ہے کوئی زیادہ کوئی طویل و عریض ہے تو کوئی نحیف و پستہ۔ کیا ان کی ضروریات میں فرق نہ ہوگا۔ تو پھر ان کی ضروریات کو آپ کس گز سے ناپیں گے؟"

"لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس میں سے مزدور کو صرف دو ملیں اور سرمایہ دار کو آٹھ۔"

"اگر انصاف یہ ہے کہ دس کے دس چھین لئے جائیں، سرمایہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ سرمایہ دار کو معہ خاندان تہ تیغ کر دیا جائے، اور اس کے مکان و سامان کو آگ لگا دی جائے۔ تو پھر وہ انصاف کیوں نہیں ہے؟ دوسرے یہ کہ سرمایہ دار مزدور کو مجبور تو نہیں کرتا کہ وہ اتنی کم مزدوری پر کام کرے ہی کرے۔ وہ زیادہ سے کیوں نہیں کرتا۔ طے شدہ سے کم دینا یا زیادہ طلب کرنا ناانصافی ہے۔ علاوہ ازیں مزدور تو اپنی مزدوری لے کر چلتا بنا۔ اب چاہے سرمایہ دار کو نفع ہو یا نقصان۔ جتنا نفع کا امکان ہے اس سے زیادہ نقصان کا بھی تو ہے اور اس کا بھی کہ مال سرے سے فروخت ہی نہ ہو اور نفع تو رہا درکنار، سرمایہ بھی ٹھپ ہوا پڑا رہے، جب مزدور نقصان میں شریک نہیں تو نفع میں کیوں ہو یا پھر ہو تو دونوں میں کیوں نہ ہو؟"

"لیکن اگر مزدور کم اجرت پر کام نہ کرے تو بھوکوں مر جائے اس لئے وہ بہرحال کام کرنے پر مجبور ہے تو کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا کہاں کا انصاف ہے؟"

"لیکن اگر مزدور کو پوری اجرت ملنے لگے اور اس کی ضروریات پوری ہونے لگیں تو آپ کے پیغمبر مارکس کا فلسفۂ اضداد ("DIALECTICAL PROCESS") جو فیل ہو جائے گا۔ کہئے آپ کو دونوں میں سے کونسی بات منظور ہے۔ مزدور کو پوری اجرت

دلوانا یا قانونِ فطرت کو غلط ثابت کرانا ؟"

خاموشی ——————

"اور ظلم و انصاف کا تو نام بھی آپ زبان پر نہ لایئے ورنہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا "دھرم بھرشٹ" ہو جائے گا"

"وہ کیسے ؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا

"پہلے آپ یہ بتایئے کہ انصاف ہے کیا ؟"

"انصاف تو کھلی ہوئی بات ہے وہ ہے جس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو"

"اور حق کسے کہیں گے آپ ؟"

"ایمانداری سے جو جس کا حصہ ہے وہ حق ہے"

"ایمانداری سے ؟ یہ ایمان کیا بلا ہے جناب ؟"

سکوت ——————

"جب آپ خدا کے وجود کے قائل ہی نہیں تو پھر ایمان چہ معنی دارد۔ خدا کو مانے بغیر تو ایمان کا تصور بھی محال ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے ضرور ہیں اور اسی لئے ان میں ایمان۔ حق۔ انصاف وغیرہ کا تصور کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔ حق وہ ہے جو خدا کا قائم کردہ ہو اور انصاف اس کے مطابق عمل کا نام ہے، اب آپ جو نہ خدا کو مانیں نہ مذہب کی ضرورت سمجھیں ان الفاظ کو کس طرح زبان پر لا سکتے ہیں۔ اپنے "مذہب" کی کوئی چیز پیش کیجئے۔ ڈھونڈنے بیٹھیں گے تو پتہ چلے گا کہ خدا کو مانے بغیر چارہ کار ہی نہیں ہے"

"اچھا تو یوں سمجھ لیجئے کہ حق وہ ہے جو ضمیر کے مطابق ہو"

"کس کے ضمیر کے مطابق ؟ سرمایہ دار کے یا مزدور کے ؟ سرمایہ دار کے ضمیر کا تو یہ حال ہے کہ وہ دس میں سے صرف دو مزدور کو دینا چاہتا ہے اور مزدور کے ضمیر کی کیفیت یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار کے تمام سرمایہ پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے اور غالباً لیڈر صاحب لوگوں کی تخشش سے سرمایہ دار کو معہ خاندان تلوار کے گھاٹ اتار کر۔ اس کے مکان و سامان کو نذرِ آتش کر کے مطمئن ہوتا ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی دو طبقے ہیں۔ تو پھر کس کے ضمیر کے مطابق ؟"

"ارے بھئی آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ اچھا اب یوں سہی کہ حق وہ ہے جو عقل کے مطابق ہو"

"یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کی عقل کے مطابق ؟ عقل تو اپنے نفع اور آرام کی طرف لپکتی ہے اور نقصان و تکلیف سے بچنا چاہتی ہے۔ جب بات یہ ہے تو پھر سرمایہ دار اپنے نفع و عیش کو قرینِ عقل سمجھے گا اور مزدور اپنے کو۔ اور دنیا میں ٹھہرے یہی دو طبقے تو پھر کس کی عقل کو آپ کرسئی عدالت پر بٹھائیں گے۔ پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ کیا عقل تمام چیزوں کے مکمل علم پر حاوی ہے اور جب تک یہ نہ ہو فیصلہ کی صحت و درستی معلوم۔ کیا آپ کسی عقلِ کل کا نام بتا سکتے ہیں ؟ عقل کی نادانی کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے نزدیک دنیا بغیر کسی بنانے والے کے خود بخود پیدا ہو گئی اور بغیر کسی منتظم کے اس کا نظام چل رہا ہے۔ عقل تو دیکھ سکتی ہے کہ زمین ایک طرف کو ½ ۲۳ درجہ جھکی ہوئی ہے جو موسموں کی تبدیلی اور رنگا رنگئ عالم کا باعث ہے مگر ہو گیا یہ سب کچھ خود بخود، عقل کی عینک نے یہ تو دکھا دیا کہ اونٹ کی گردن جو کانٹے دار جھاڑیوں کو بڑے شوق سے کھاتا ہے جھکنے کے بجائے اوپر کو اتنی لمبی درختوں کے پتوں تک پہنچنے کی کوشش میں ہوئی مگر یہ نہ سجھایا کہ کیا پتے زیادہ سے زیادہ اتنے ہی اونچے ہوتے ہیں جتنی آں جناب کی گردن۔ عقل کے پاس ایک ایسی "MASTER KEY" ہے جو تاریخ عالم کے ہر قفل کو کھول سکتی ہے۔ مثلاً ہندو چوٹی کیوں رکھتا ہے۔ مسلمان ختنہ کیوں کرتا ہے۔ انگریز کھڑے ہو کر شاشیدن کیوں کرتا ہے وغیرہ اسی اور کسی قسم کے ہر سوال کا جواب عقل کے نزدیک صرف ایک ہے۔ سنئے مگر شرط یہ ہے کہ ہنسئے گا نہیں ——————

"معاشی وجوہات سے" ——————

اگر عقل یہی ہے تو پھر نہ جانے حماقت کسے کہتے ہیں۔ کیا اسی عقل سے آپ فیصلہ کرانے چلے ہیں ؟"

"تو پھر فیصلہ کون کرے" انہوں نے پوچھا

"فیصلہ وہی کرے جسے آپ مانتے نہیں۔ جو نہ سرمایہ دار کا طرف دار ہے نہ مزدور کا دشمن"

"یعنی ؟"

"یعنی خدا"

"مگر خدا ہے کہاں ؟"

"مگر خدا ہے کہاں نہیں ؟"

"اگر ہوتا تو دکھائی دیتا"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں میری جیب میں کیا ہے ؟"

"جی نہیں"

"کیا میری جیب میں کچھ ہے ؟"

"کہہ نہیں سکتا"

"اچھا یہ تو بتا ہی دیجئے کہ کیا میری جیب میں کچھ نہیں ہے ؟"

"کیسے کہہ سکتا ہوں۔ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی"

"یہ کیسا بے تکا جواب ؟"

"بے تکا کیوں! بھئی جب نظر نہیں آتا تو کیسے کہہ دوں کہ ہے ہی یا نہیں ہے۔"

"مگر خدا کے متعلق تو آپ بڑے زنّاٹے سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ چونکہ نظر نہیں آتا اس لئے ہے ہی نہیں۔ عقل و انصاف سے آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اب اگر وہ نہیں ہے اور میں اسے مانتا ہوں تو میرا کچھ بگڑتا نہیں اور اگر وہ ہے اور آپ اسے مانتے نہیں تو ذرا فکر پکی کر لیجئے گا۔ رہا یہ امر کہ وہ واقعی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اِن آنکھوں سے نہیں تفکر کی آنکھوں سے کرائیے۔ کارخانۂ عالم کے نظم و ضبط پر غور کیجئے۔ مظاہر قدرت پر گہری نظر ڈالئے اور سوچئے کہ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ امیبا "AMEBA" کو تو آپ کی عقل مان لے اور خدا کو نہ مانے"

"اچھا اگر خدا ہے تو وہ سرمایہ داروں کا انتظام کیوں نہیں کرتا؟"

"انتظام تو اس نے کر رکھا ہے مگر زبردستی منوانا اس کے اصول کے خلاف بھی ہے اور عملاً بیکار بھی۔ اس کے بتائے ہوئے نظام میں تو یہ مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے"

"اچھا یہ تو بتائیے پہلے انڈا پیدا ہوا یا مرغی؟"

"یا اللہ، ما دن گھسا پھوٹے آنکھ۔ اس سوال کا اس گفتگو سے کیا تعلق؟"

"تعلق یہ ہے کہ اگر آپ نے ثابت کر دیا کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی تو میں خدا کو مان لوں گا ورنہ مادہ کا قائل رہوں گا۔"

"اچھا صاحب یہ بھی سہی۔ ذرا یہ تو بتائیے آپ نے کبھی مرغیاں پالی اور بچے نکلوائے ہیں؟"

"جی ہاں"

"بچے کس طرح نکلوائے؟"

"سب جانتے ہیں۔ مرغی کو انڈوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ وہ انھیں سیتی رہتی ہے۔ مقررہ مدت میں بچے نکل آتے ہیں"

"کیا کبھی بغیر سئے بھی بچے نکلے؟"

"یہ تو نہ کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ سینے پر بھی کچھ انڈے گندے ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بچے نہیں نکلتے۔"

"اب آپ یہ فرمائیے کہ اگر پہلے پہل صرف انڈا ہی پیدا ہوا تو اس کو سیا کس نے؟"

بہت دیر سوچ کر "انڈے سینے کی ایک مشین بھی تو ہوتی ہے اس میں سے کیا ہوگا۔"

"ہوگا کی بھی ایک ہی رہی۔ اور مشین تو گویا پہلے سے آپ نے تیار کر رکھی ہوگی!" ——— مسکراہٹ اور خاموشی ———

"کہئے اب ہو گئی نہ مرغی پہلے پیدا۔ نہ صرف مرغی بلکہ اس کا "سرتاج" بھی ورنہ انڈا۔ . . ؟ تو اب خدا کو ماننے میں کیا تامل ہے؟"

"آپ مجھے اپنا پتہ لکھا دیجئے۔ بھوپال اسٹیشن آگیا ہے، مجھے یہاں اترنا ہے میں آپ سے ضرور ملوں گا۔" "اس وقت دیکھا جائیگا۔" "مگر آپ تو کہتے تھے میں بمبئی جا رہا ہوں" اس مسافر نے کہا۔ "جی ہاں۔ مگر مجھے بھوپال کا ایک کام یاد آگیا ہے۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی ضرور"

عرصہ ہو گیا مگر وہ در آمد نہیں ہوئے۔ روز انتظار رہتا ہے! اور اسلئے۔

"افسانہ لکھ رہا ہوں ترے انتظار کا"

جگر مراد آبادی

غزل

محبت میں جگر گذرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر
کہ خود لینا پڑا ہے اپنے دل سے انتقام اکثر

کہاں حسنِ تمامِ یار و تکلیف کرم اے دل
بدل دیتی ہے دُنیا، اِک نگاہِ ناتمام اکثر

مری رندی بھی کیا رندی، مری مستی بھی کیا مستی
مری توبہ بھی بن جاتی ہے میخانہ بجام اکثر

محبت نے اُسے آغوش میں بھی پالیا آخر
تصوّر ہی میں آتا تھا جو اِک محشر خرام اکثر

جگر ایسا بھی دیکھا ہے کہ ہنگام سیہ مستی
نظر سے چھپ گئے ہیں ساقی و مینا و جام اکثر

عرشؔ ملسیانی

غزل

جو درِ حُسن کے فقیر ہوئے
دولتِ عشق سے امیر ہوئے

سارے عالم میں ہو گئے مشہور
جو محبّت کے گوشہ گیر ہوئے

آہ اُن طائروں کی خوش فہمی
ہو کے آزاد جو اسیر ہوئے

ایسے ملنے جو دل پذیر نہ تھے
عشق میں وہ بھی دل پذیر ہوئے

ترکِ اُلفت کے بھی سہے الزام
دل میں پیوست ہو کے تیر ہوئے

عرشؔ پیری میں بھی رہے وہ جواں
جن کے ارماں کبھی نہ پورے ہوئے

حفیظ میرٹھی

غزل

حُسنِ جنوں نواز کا دیکھا جو التفات
مستی میں آکے موت سے ٹکرا گئی حیات

اب وہ ترا خیال، نہ بیزارئ حیات
نفرت بھی بے ثبات، محبت بھی بے ثبات

اے محوِ انتظار ستارے نہیں ہیں یہ
ہنستی ہے تیری سادہ دلی پر اندھیری رات

بے مہریاں بڑھی ہیں زمانہ کی جس قدر
اتنی ہی یاد آئی ہیں اُن کی نوازشات

جس سمت دیکھئے وہیں رِستے ہوئے سے زخم
ویسے بڑا حسین ہے دورِ ترقیات

اعلان ہائے حق و صداقت کے باوجود
چھائے ہوئے ہیں فکر و عمل پر تعصبات

طے کیجئے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظ
اک بزدلی کی بات ہے، اِک مردمی کی بات

زمزم بجنوری

غزل

زندگی کا نظام بدلا ہے
عالم صبح و شام بدلا ہے

امتیازِ نیاز و ناز کہاں
شیوۂ خاص و عام بدلا ہے

مے وہی ہے وہی سبو وہی جام
ایک ساقی کا نام بدلا ہے

فرق آیا نہ کچھ مشاغل میں
وقت بدلا ہے کام بدلا ہے

وہی صیّاد ہے وہی گل چیں
کچھ جو بدلا ہے دام بدلا ہے

ہوشیار اے نگاہِ شوق کہ آج
ان کا طرزِ خرام بدلا ہے

گم ہوئی منزلِ یقیں زمزم
پھر نظر نے مقام بدلا ہے

ع۔ا۔خ

پسند اپنی اپنی

جوشؔ ــــــ ملیح آبادی

معاذ اللہ! اب یہ رنگ ہے دُنیا کی محفل کا — خدا کا نام لینا اور ذلیل و خوار ہو جانا

دل دھڑکتا ہے، اشک بہتے ہیں — ہائے! ہم کس بلا میں رہتے ہیں

بڑی نمود سے دُنیا میں وہ اُبھرتا ہے — جو کارخانۂ قدرت میں فکر کرتا ہے

وجد کے قابل تھا راہِ سعی میں میرا ثبات — دل نہ دھڑکا، گو قدم کانپا کیا تدبیر کا

جھلملاتے ہوئے تاروں میں یہ سنتا ہوں صدا — رونیوالے میں ترے پاس ہوں کچھ دُور نہیں

عقل مدہوش ہے اور رُوح دکھاتی ہے چراغ — بے خطر راہِ طلب میں ترا دیوانہ ہے

موت کو اہلِ دل سمجھتے ہیں — زندگانیٔ عشق کا آغاز

تحیّر خیز یہ دُنیا کی رُت ہے — لبوں پر ہے 'خدا' سینے میں 'بت' ہے

عشق ہنگامہ اس کی محفل کا — حُسن اک گھاؤ ہے مرے دل کا

خوشی بڑھ رہی ہے تو دل مر رہا ہے — مسرّت کی تکمیل سے ڈر رہا ہوں

جو حق پرست ہیں مٹ کر تباہ ہو جائیں — اگر یہ ہو تو ستارے سیاہ ہو جائیں

بڑھ کے سامان عیش و عشرت کا — خون کرتا ہے 'آدمیّت' کا

سمجھے گا اس کا درد کون شورشِ کائنات میں — تم نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بنکر — مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

نظمِ عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے — ہنس کے رباب اُٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

اِتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی — میں نے جھک کر یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا؟

خیال اپنا اپنا

قوموں کا عروج وزوال

از سید حامد علی - صفحات ۶۴، قیمت ۸/

شائع کردہ :- مکتبہ جماعت اسلامی ہند - رامپور

آج کل قوموں کے عروج وزوال کو ناپنے کے لئے عام طور سے مادی پیمانے استعمال ہو رہے ہیں جو قوم جتنے زیادہ وسائل وذرائع پر قابض ہے وہ اتنی ہی ترقی یافتہ اور برسر عروج شمار کی جاتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر جتنا جتنا عام ہوتا جا رہا ہے اسی قدر بین الاقوامی تعلقات پیچیدگی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں اور قوموں کی باہمی آویزشوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

زیرنظر کتابچہ میں چند ایک ایسے ہی معتقدات کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ قوموں کا عروج وزوال محض بخت واتفاق پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے بہت سے اسباب وعلل کارفرما ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ اصل فیصلہ کن چیز مادی وسائل وذرائع نہیں بلکہ اخلاقی طاقت ہے اس کے بعد ان اخلاقی اوصاف کی نشاندہی کی گئی ہے جو آگے بڑھنے والی تحریکوں کے لئے ضروری ہیں۔

نوع انسانی کو راہِ ترقی پر ہمیشہ گامزن رہنے اور قوموں کی بڑھتی ہوئی کشمکش کو دور کرنے کے لئے یہ تدبیر بتائی گئی ہے کہ قومیں صرف مادی مفاد کو اپنی جدوجہد کا محور بنانے کے بجائے رضائے الٰہی کے حصول کو اپنی حرکت اور عمل کی منزل قرار دیں۔

"یہ پوری کائنات ایک وحدت ہے اور خدا اس کائنات کی طرح انسان کا بھی خالق، مالک، رب اور آقا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہی بات درست ہے کہ انسان کائنات کی طرح اللہ کے بھیجے ہوئے ضابطہ پر چلے! اسی میں اس کی واقعی فلاح وبہبود اور حقیقی ارتقاء مضمر ہے کہ وہ اور کائنات ایک ہی منزل کے لئے سرگرم سفر ہوں ورنہ انسانی زندگی کا کائنات کے قوانین سے ٹکراؤ ہوگا جس میں کائنات کا نظام تو اپنی جگہ پر رہے گا البتہ انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔"

جن حقایق کو اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ درحقیقت اس قابل ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے توجہ کی جائے مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ ان اہم حقایق کو جس طرح پیش کیا جانا چاہئے تھے وہ اس کتاب میں اس طرح پیش نہیں کئے جاسکے۔ اس کے علاوہ اگر کسی ایک طبقہ کو مخاطب قرار دیکر اس کی مخصوص نفسیات، معلومات، صلاحیتوں اور سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ کو ملحوظ رکھکر یہ کتاب لکھی جاتی تو اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب رہتی اور بہت سے پڑھنے والوں کو اکتا دینے والا اعادہ اور غیر مطمئن چھوڑ دینے والا اختصار محسوس نہ ہوتا۔

مکتبہ مذکور کی طرف سے شائع ہونے والا لٹریچر علمی ذوق رکھنے والے سنجیدہ اور ذہین طبقہ میں تیزی سے مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے اس کی کتابوں کی نمایاں خصوصیت اُن کا TO THE POINT ہونا ہے۔ مضامین میں سائنٹیفک طرز استدلال جذباتیت سے مبرا اگر دلنشین انداز بیان اور انتہائی خشک موضوعات کو پانی کر دینے والے اسالیب کا پایا جانا اس ادارہ کے روشن مستقبل کی واضح علامات ہیں۔ مکتبہ کے قایم کردہ اس معیار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے "قوموں کا عروج وزوال" پر یہ اظہار خیال کیا ہے ورنہ اپنی جگہ یہ کتاب کچھ کم موثر نہیں۔ (ح-م)

تدوینِ قرآن

ناشر مکتبہ برہان - اُردو بازار جامع مسجد دہلی -

صفحات ۱۰۲ - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنہ - مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

"تدوین قرآن" کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں کیا کچھ ہوگا غلام ربانی ایم۔ اے۔ (عثمانیہ) نے اس کی ترتیب تالیف کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اور

اپنے استاذ مولانا مناظر احسن گیلانی کی اسی موضوع پر لکھی ہوئی ایک مستقل کتاب سے استفادہ کیا ہے جو ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی ہے۔ بقول مولف "یہ مقالہ اسی مبسوط و ضخیم کتاب کا جوہری خلاصہ ہے" اصل میں یہ مضمون ایم، اے تفسیر کے لئے تیار کئے گئے ایک امتحانی مقالے سے ماخوذ ہے اور یہی تدوین قرآن کا مقصد اشاعت ہوسکتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مؤلف کی جاں فشانی کاوشِ علمی، اور عرق ریزی کا پتہ چلتا ہے۔ علوم قرآنی کے قدر شناس اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے انداز تحریر سے بخوبی آشنا ہوں۔ مولانا کے مخصوص انداز کی جھلک بڑی حد تک ان کے رفیقِ کار غلام ربانی ایم۔ اے کی اس تالیف میں بھی نمایاں ہے۔

بدقسمتی سے آج غیر مسلم تو کیا خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوچکا ہے جو قرآن کریم ایسے جامع ترین دستور الٰہی کے بارے میں خاصی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ ضرورت تھی کہ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی سعی کی جاتی۔ مقام شکر ہے کہ "تدوین قرآن" اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کررہی ہے اگر موجودہ اسالیبِ تحریر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اندازِ بیان میں (SIMPLICITY) پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تو کتاب مزید فائدہ مند اور موثر ثابت ہوسکتی تھی۔ (ن-ا)

سہ روزہ مستقبل

خاص مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ سالانہ تین روپیہ آٹھ آنہ
مقام اشاعت:۔ دفتر مستقبل کچہری روڈ ملتان شہر

تبصرے کے لئے ہمیں جو شمارہ ارسال کیا گیا ہے وہ اس کی بہت سی اشاعتوں کا مجموعہ ہے اور رسالے کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ادارت سید ابوذر بخاری کررہے ہیں۔ اندرونی صفحات میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے اسم گرامی کے ساتھ القاب و آداب کا بے حد فیاضانہ استعمال غمازی کررہا ہے کہ ابوذر بخاری مولانا بخاری کے فرزند ارجمند ہیں۔

"مستقبل" مولانا عطاء اللہ شاہ کے "احراری رنگ" میں ڈوبا ہوا ہے اس انقلاب آفریں دور میں بھی پچھلی (OUT OF DATE) روش پر جمارہنا باعث حیرت ہے۔ اس مجموعہ کا بیشتر حصہ اکابر احرار کے پندرہ پندرہ سالہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ پرانے خطبوں پر مشتمل ہے جن کے مقالات اور شذرات میں ہیں۔ تمیز دشوار ہے کہ یہ ۴۷ء کے انقلاب سے پہلے لکھے گئے تھے یا بعد میں تحریر کئے گئے ہیں "مستقبل" کے خوش کن نام سے یکایک ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ ضرور یہ معاصر تعمیری مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہوگا اور مستقبل سنوارنے کا کوئی ٹھوس پروگرام پیش کررہا ہوگا لیکن مطالعہ کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں وہاں مستقبل تو کیا حال کی الجھنوں اور موجودہ مسائل کا ادنی سا خاکہ بھی نہیں ملتا بلکہ برعکس ہندنام "زندگی کا مور" فقط ماضی کی بے نتیجہ داستانیں ہیں جنہیں ایک طبقہ سن سن کر اور یاد کرکر کے جیسے تیسے جی رہا ہے۔ پاکستان ہی میں نہیں بلکہ یہ تکلیف دہ صورتِ حال ہندوستان میں بھی اسی طرح موجود ہے۔

یہ تاثر "مستقبل" کے بارے میں ہمارا پہلا تاثر (FIRST IMPRSSION) ہے۔ عام شمارے نظر سے نہیں گذرے اس لئے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بہرحال اتنا مشورہ ہم ضرور دیں گے کہ "مستقبل" کو صحیح معنوں میں مستقبل کا آئینہ اور حال کا عکاس بنکر سامنے آنا چاہئے جس طرح ماضی سے گریز کرنا ٹھیک نہیں اسی طرح ماضی کی خواب آور داستانوں میں گم ہوجانا اور حال و مستقبل کے تقاضوں سے بے خبری بھی قطعاً مناسب نہیں۔ ادارہ "مستقبل" چاہے تو تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مستقبل کی تعمیر کے لئے بہت کچھ کرسکتا ہے۔ خامیاں ہوتے ہوئے بھی اس کے صفحات میں جذبہ دینی کی حرارت اور فرض کا گرانمایہ احساس ملتا ہے اور یہی مستقبل کی آئندہ کامیابی کی اساس بن سکتا ہے۔ (ن-ا)

قلمی معاونین اور قارئین حضرات

خط و کتابت کرتے وقت جوابی پوسٹ کارڈ یا ٹکٹ ضرور ارسال فرمائیں۔ ورنہ جوابی امور کی تعمیل سے معذوری ہوگی۔

(منیجر)

مشکور احمد بی۔اے

غبارِ خاطر

(ذیل کا مکتوب ہمارے ایک دُور اُفتادہ مگر دل سے قریب ادبی ساتھی کے دل کی بھڑاس ہے جو ادارہ معیار کے رفیقِ کار حفیظ میرٹھی سے مخاطب ہوکر نکالی گئی ہے۔مطالعہ کے بعد قارئین محسوس کریں گے کہ مشکور نے صرف اپنے دوست کی باتیں ہی نہیں سنائی ہیں بلکہ ان کے بھی ایسے کتنے ہی ساتھیوں کی تصویر کشی کی ہے جو ترقی پسندی اور تعمیر پسندی کے درمیان جھولا جھول رہے ہیں)

حفیظ بھائی! سلام ونیاز

کل دوپہر . . . ٹہلتے ہوئے میرے دفتر کی طرف آنکلے۔انہیں آتا دیکھکر میں نے بھی کام چھوڑ دیا اور اُٹھکر باہر چلا آیا۔سلام اور مزاج پرسی کے بعد باتیں چھڑ گئیں میرٹھ کا ادبی حلقہ اور "معیار" موضوع بحث بن گئے۔کافی دیر تک گفتگو میرٹھ کی گلیوں ہی میں گھومتی رہی۔اس کے بعد وہ کہنے لگے کہ کہو آج کل کیا کر رہے ہو؟ کوئی شعر وِیر کہا یا نہیں۔اس پر میں مسکرایا۔صبح کو دفتر شام کو کالج رات کو گھر اور پھر درسی کتابیں اور وہ بھی معاشیات کی جن میں ادب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ایسی حالت میں بھلا کوئی شریف آدمی شعر کہے تو کیونکر؟ دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھنے تک کی تو فرصت ہوتی نہیں پھر شعر کہنے کا وقت کہاں سے لائیں۔ زندگی کی مصروفیات اور دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم دونوں کافی دیر تک ہنستے رہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہنسنے کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے۔

گفتگو یونہی برساتی نالے کے پانی کی طرح آوارگی سے بل کھاتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور تھوڑی دیر میں . . . نے اپنا ایک شعر سنایا ؎

ہم پر ہی مگر خاص عنایت رہی ان کی
کہنے کو تو تھی اور بھی لوگوں کی زباں بند

یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ . . . اور میں کافی بے تکلف ہیں بلکہ اس معاملہ میں تو کافی سے بھی کچھ زیادہ چنانچہ میں نے انہیں بالکل داد نہیں دی اور اس وجہ سے نہیں دی کہ اس وقت میری سمجھ میں یہ شعر بالکل نہ آیا۔میں نے دوبارہ پڑھنے کو کہا مگر مطلب سے اس مرتبہ بھی بالکل بے بہرہ رہنا پڑا۔اس کی مختلف

(بختم)

وجوہات ہو سکتی ہیں۔مثال کے طور پر یہ کہ میں دفتر سے اٹھکر آیا تھا اور میرے خیال میں دفتر اور شعر دو مختلف چیزیں ہیں۔شاعر کبھی کلرک نہیں بن سکتا اور دفتر میں کبھی شعریت نہیں پیدا ہو سکتی اور خصوصیت سے اس دفتر میں جس کا تعلق حساب (ACCOUNT) سے ہو۔چنانچہ چند منٹ قبل میں کرسی پر بیٹھا ہوا نو اور دو گیارہ اور تین چودہ، چودہ اور پانچ اُنیس کر رہا تھا اور فوراً ہی مجھے شعر سننا پڑ گیا اور اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ حساب میری زندگی کی وہ کمزوری ہے جس پر میں کبھی غالب نہ آسکا۔یہ دوسری بات ہے کہ اب پہلی تاریخ کا انتظار خشک اعداد کی دیوار چننے پر مجبور کر دیتا ہو۔

بہرحال جب کسی صورت سے بھی . . . کے دو مصرعوں کا حاصل جمع نہ نکال سکا تو انہیں بھی تشویش ہوئی کیونکہ ایسا موقع بہت ہی کم آتا ہے جب میں ان کے شعر کا مطلب نہ سمجھ جاتا ہوں۔میں نے بلا تکلف ان سے مطلب دریافت کیا وہ ہنسے اور پھر اشاریت کی مدد سے مجھے مطلب سمجھانے لگے۔"ہم پر ہی مگر خاص عنایت رہی ان کی" بھئی میں نے یہاں "ہم" ترقی پسند شاعر کے لئے استعمال کیا ہے اور "ان کی" سے مراد حکومت کی" ہے اب کیا بات باقی رہ گئی؟ اس پر میں نے ان سے وہی سوال کیا جو میں اور آپ ان سے پہلے بھی بارہا کر چکے ہیں۔کراچی آنے کے بعد اتفاق سے میں نے یہ سوال اس روز پہلی مرتبہ کیا "کیا آپ ترقی پسند ہیں؟ ممکن ہے آپ نے اس سلسلے میں کوئی دو ٹوک فیصلہ کر لیا ہو؟" اس پر انہوں نے وہی جواب دیا جسے اکثر منٹو بھی دیا کرتا ہے یاد یا کرتا تھا یعنی یہ کہ ہر شخص

وتا ہے اور ہر شخص کو ترقی پسند ہونا چاہئے کیونکہ ہر شخص ترقی چاہتا ہے۔ لیکن
مائی حقیقتاً! آپ خود سوچئے کہ کیا آج کی دنیا میں ایک ادیب یا شاعر کا یہ
ذاب کسی بھی ادیب کو مطمئن کرسکتا ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ممکن ہو جائے اور
الگ صرف اس مختصر سے جواب سے مطمئن ہو جایا کریں۔ میرا خیال ہے کہ جس روز
۔ اس جواب سے مطمئن ہو جائیں گے اس روز دنیا میں اختلاف کا نام و نشان
ش کرنے کے باوجود بھی نہیں مل سکے گا کیونکہ ترقی پسندی کا مفہوم سب کے
ہنوں میں یکساں ہوگا پھر ترقی پسندی کے وہ تمام مفہوم جو آج لئے جاتے ہیں بے
معنی ہوں گے۔ ویسے آج ہر شخص اپنے آپ کو ترقی پسند کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ
ی چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر کپڑے کا تاجر ترقی چاہتا ہے اور اس کے یہاں ترقی
مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی چھوٹی سی دوکان سے اتنا پیسہ پیدا کرے کہ بڑے پیمانے
تجارت کرسکے۔ دوسرے ممالک سے براہِ راست کپڑا درآمد کرے اور دوسرے
الک کو براہِ راست دوسری روئی جیسی چیزیں برآمد کرے یہ اس کی ترقی ہے
ر وہ خود ترقی پسند۔ طالب علم بھی ترقی پسند ہوتا ہے کیونکہ ہر سال اس کی یہ
ی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اگلے درجہ میں چلا جائے۔ کلرک بھی ترقی پسند ہوتا ہے
رسب سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ اپنی تنخواہ میں چند سکوں کے اضافہ کا
اب دیکھتا رہتا ہے اور جب اس کی تنخواہ میں پانچ روپیہ کا اضافہ ہو جاتا ہے
وہ اپنی ترقی کے فسانے کئی ہفتوں تک سنایا کرتا ہے چنانچہ اسے بھی پورا
راحق پہونچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ترقی پسند کہے۔ اس کے علاوہ نسلوں میں
قی ہوا کرتی ہے یعنی یہ کہ میرے دادے ابا کے مقابلہ میں والد صاحب قبلہ نے
ی ترقی کی اور ہر اعتبار سے کی اور اب ابا جان کے مقابلہ میں میں اپنے آپ کو
یادہ ترقی پسند سمجھتا ہوں اور مجھے سمجھنا بھی چاہئے کیونکہ ان کے دور سے اب
، جو بھی ترقی دنیا نے کی ہے میں اس سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اٹھاتا رہونگا

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت سے جبکہ ساری دنیا ترقی پسند
، تو پھر یہ حماقت بھرا سوال ہی کیوں پیدا ہوتا ہے یا پیدا کیا جاتا ہے کہ آپ
ی پسند ہیں یا نہیں؟ یا آپ تعمیر پسند ہیں یا ترقی پسند؟ کیا عجیب اور دلچسپ
ت ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا سر پھرا بھی ہو سکتا ہے جو تعمیر اور ترقی کا
ر ہو۔ اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے تو یقیناً پھر
ہے لوگ بھی ہوں گے جو ترقی اور تعمیر کے منکر ہوں۔ مثال کے طور پر ان سر پھرے
ں میں اپنا نام پیش کردوں گا کہ میں وہ انسان ہوں جو ترقی پسند نہیں ہے۔
مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ میرا کوئی دوست تعمیر پسند ہے یا نہیں۔ میں تو
متعلق جانتا ہوں کہ میں ترقی پسند نہیں ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ

امتحان میں کامیاب ہوکر اگلے درجہ میں جانے کی مجھے بے انتہا خوشی ہوتی ہے
اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنے باپ کے مقابلہ میں میں زیادہ ترقی پسند ہوں
اور میرا یہ بھی ایمان ہے کہ جس روز میری تنخواہ بڑھ جائے گی مجھے غم نہیں ہوگا۔
حالانکہ میں ترقی پسند نہیں ہوں آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ میں نے اس جملے پر
زور دیتے ہوئے ۔۔۔ ۔ کو جھنجوڑا وہ برابر مسکراتے رہے اور میں بکتا رہا۔

میں نے کہا ۔۔۔ ۔ بھیا! اس بات کو کہہ کر تم فلسفہ کے کسی طالب علم
کو مطمئن کرسکتے ہو۔ ادبی دنیا میں ایسی باتوں سے اطمینان نہیں ہوتا۔ آج جبکہ ترقی
پسندی ایک اصطلاح بن چکی ہے اور اس کے خدوخال اس قدر نمایاں ہو چکے ہیں
کہ کسی قسم کے شکوک باقی نہیں رہے تو کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ اس کے معنیٰ اپنے
دل اور لغت کی امداد سے پیدا کرے۔ آج وہی ادیب ترقی پسند ہے جو انجمن ترقی پسند
مصنفین کے اغراض و مقاصد سے متفق ہو اور اس نظام حیات کو جسے انجمن
اپنا چکی ہے ہر ممکن طریقہ سے اپنے اوپر اور پوری دنیا کے اوپر مسلط کرنے کی
پوری پوری کوشش کرتا ہو۔ یہ ہے ترقی پسندی کی تعریف اور اسی تعریف کی بنا
پر لوگ ترقی پسند ہونے کے باوجود ترقی پسند نہیں ہیں۔ میں چونکہ انجمن کے اغراض و
مقاصد سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس نظام حیات پر ایمان نہیں رکھتا جسے انجمن
دنیا میں قائم کرنا چاہتی ہے اس لئے میں ترقی پسند نہیں ہوں۔ اور یہی حال
تعمیر پسندی کا ہے۔ ہر انسان تعمیری جذبہ رکھنے کے باوجود تعمیر پسند نہیں ہوتا اگر
تعمیر پسندی اور ترقی پسندی کا یہی معیار ہوتا تو ہر فیشن ایبل آدمی ترقی پسند اور
ہر صناع تعمیر پسند ہوتا۔

اتنا کچھ سننے کے بعد ۔۔۔ ۔ بولے کہ بات دراصل یہ ہے کہ نہ تو میں
اس فلسفہ پر یقین رکھتا ہوں کہ زندگی کا پورا نظام صرف معاشیات پر مبنی ہو اور
نہ اسی کو مانتا ہوں کہ پورا نظام حیات روحانیات پر قایم ہو اور یہی وجہ ہے کہ
میں کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کرسکا۔ میں نے کہا کہ آج کی دنیا میں ایک ایسا نظام
حیات تو ہے جس کا پورا نظام معاشیات پر مبنی ہے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ
آیا یہ غلط ہے یا صحیح البتہ میرے خیال کے مطابق اس وقت ایسا کوئی نظام
نہیں ہے جو خالص روحانیات پر مبنی ہو۔ ہو سکتا ہے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے
کسی انسان کے دل و دماغ میں زندگی کے لئے روحانی تصور نظام حیات کی
شکل میں پل رہا ہو لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں منظر عام پر تو اس روحانی
نظام حیات کے علمبردار نظر نہیں آتے۔ میرا خیال ہے کہ روحانی نظام سے
تمہارا اشارہ اسلام کی طرف ہے لیکن تعجب ہے کہ تم نے اسلام کے متعلق یہ تصور کہاں
سے قایم کیا۔ میں نے تو جتنا بھی پڑھا اور دیکھا اس سے یہی اندازہ ہوا کہ اسلام

بیشک یہ انتہا پسندی سرے سے ہے ہی نہیں۔ معاشیات، اخلاقیات، سیاسیات اور دوسرے شعبوں کے مل جانے سے زندگی کا تصور سامنے آتا ہے نہ صرف اخلاقیات کے بل پر کوئی نظام حیات چل سکتا ہے اور نہ صرف معاشیات پر کیونکہ زندگی جزو نہیں ہے بلکہ کُل ہے اور یہ تمام شعبے اجزا ہیں جن کے مل جانے سے کُل بنتا ہے۔ لیکن تنہا ایک شعبہ کو کُل نہیں کہا جا سکتا۔ وہ جزو ہی رہے گا۔ اس لئے اس سے یہ توقع کرنا تو قطعی بیکار ہے کہ وہ پوری زندگی کے مسائل کو حل کرسکے گا۔

اس کے بعد ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ہم کلرک بھی ہیں اور اس وقت ڈیوٹی پر اس لئے "یہ استادہ نشست" برخواست کردی گئی۔ بھائی حفیظ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس خط سے الجھن ہوئی ہو۔ بہر حال مجھے چونکہ آپ سے گفتگو کرنی تھی اور گفتگو بالکل اسی طرح جس طرح کبھی ہوا کرتی تھی اس لئے اس خط کے ذریعہ تحریری ملاقات ہوگئی۔ آپ تو آج کل خط لکھنا مناسب نہیں سمجھتے اور میرے ساتھ کچھ اس قسم کی مجبوریاں ہیں کہ کم از کم طویل خط لکھنا تو بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ کافی عرصہ سے نہ کچھ لکھا ہے اور نہ کہا ہے۔ دعا کیجئے کہ ذہنی سکون نصیب ہو۔

ادارہ

یہ مسائل زمانہ

کانگریس لیگ کے قدم بقدم

ایسی سیاسی جماعتوں میں جو کسی ٹھوس نظام فکر کی حامل نہیں ہوتیں بلکہ ان کی بنیاد قومی یا وطنی جذبات کے اُبال پر ہوتی ہے ——— ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ ان کے افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر کا کام جذباتی نعروں اور سطحی ہنگامہ آرائیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جماعت کے آغاز کار میں یہ خامی اتنی نقصان دہ معلوم نہیں ہوتی جتنا آگے چل کر اس کی وجہ سے رخنوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں یہ خامی بڑا انتشار پیدا کر چکی ہے تقسیم ملک سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ دو بڑی سیاسی جماعتیں تھیں۔ کانگریس قوم پرست جماعت تھی اور مسلم لیگ مسلم قوم پرست دونوں کے مزاج میں مغربی سیاست کے وہ تمام اثرات شامل تھے جو اب تک انتشار کی جڑ ہی ثابت ہوئی ہیں۔ کوئی ٹھوس نظام سامنے نہ تھا۔ سامنے جو کچھ تھا وہ اپنی قوم اور غیر ملکی طاقت تھی۔ اس ہنگامے میں قوم کی سیرت کی تعمیر سے آنکھیں بند کر لی گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اقتدار اپنے ہاتھوں میں منتقل ہو جانے کے بعد کانگریس اور لیگ قدم قدم پر لغزشیں کرنے لگیں۔ ان کے کارکن خود قومی مفاد کے حق میں ڈاکو بن کر رہ گئے۔ اور کھلے بندوں بدعنوانیاں پرورش پانے لگیں۔ پاکستان میں مسلم لیگ کے کارکن رشوت ستانیوں، ناجائز الاٹمنٹوں اور طرح طرح کی حرکتوں میں پھنس چکے تھے حکومت کی پالیسی تک متاثر ہونے لگی تھی۔ اور ادھر بھارت میں کانگریس کے نیتاؤں کے ’’ن مانے کرتوتوں‘‘ کی بدولت نظام بگڑ رہا تھا۔

اس انتشار پر پاکستان کی مسلم لیگ کی درستی کے لئے جو قدم اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ لیگ کے چودھری، خلیق الزماں سے کرسی صدارت چھین کر لیاقت علی خاں اپنے اختیار خصوصی سے اس پر قابض ہو گئے۔ یہ قدم غیر جمہوری تھا کہ سیاسی جماعتیں حکومت کے سب سے بڑے عہدہ دار وزیراعظم کے ہاتھوں میں بے بس ہو کر اور کھلونا بن کر رہ جائیں۔ آئندہ انتخابات میں اس اقدام کا اثر عوام کے حق میں بڑا نکلتا۔ لیکن حالات اتنے خراب تھے کہ اس عمل جراحی کے بغیر چارہ ہی نظر نہ آیا اور غیر جمہوری اقدام کا داغ گوارا کر لیا گیا۔ لیکن اس کے بعد لیگ کے مزاج میں کیا تبدیلی آئی۔ یہ غور طلب بات ہے۔ کیا اس اقدام سے لیاقت علی خاں اور ان کی حکومت نے عوام کے اطمینان کی کوئی صورت پیدا کی؟ اور لیگ کے بگڑے ہوئے مزاج میں کوئی تبدیلی آئی۔ انصاف کی نظر سے باطن کی طرف دیکھا جائے تو ہم اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ایسا نہیں ہوا۔ لیگ آج بھی اقتدار کی جُو کی لیگ ہے۔ اس میں وہی عنصر ہے اور جوں کا توں حالت میں ہے جو خرابی کی بنیاد بن رہا تھا صرف سطح کی ہلچل میں ایک گمراہ کن سکون نظر آ رہا ہے۔ تہ میں آج بھی وہی خرابیاں چھپی ہوئی ہیں جو پہلے تھیں۔ اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ لیاقت علی خاں کے صدر بن جانے کے بعد بھی لیگ کے مزاج میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ لیاقت علی خاں بھی ذہنی طور سے اسی طبقہ کی طرح ہیں جس کی وجہ سے خرابیاں پھیلی ہیں۔

لیگ کے اس اقدام کے بعد بھارت کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس میں بھی ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے۔ اس لئے کہ ہر چند دونوں میں ہندو قومیت اور مسلم قومیت کا فرق تھا لیکن مغربی افکار کی بدروح دونوں جگہ کام کر رہی تھی اور رنگ لے آئی جیسا کہ مادی اور غیر اخلاقی فلسفے کا خاصا ہے۔ اقتدار کانگریس کے ہاتھ میں آتے ہی سوائے چند اوپر کے لوگوں کے سب بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگے۔ مفاد پرستی نے فساد پھیلانا شروع کر دیا اور کانگریس کا شیرازہ خود کانگریس کے پرانے بہی خواہوں کے ہاتھوں بکھرنے لگا۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے قضیوں کے بعد نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ یو، پی اسمبلی میں دو ٹکڑے ہو گئے اور جن کانگریس وجود میں آ گئی۔ پھر مرکزی کانگریس میں بھی ٹنڈن جی کے مخصوص نقطۂ نظر سے تنگ آ کر کرپلانی،

قدوائی اور ان کے کتنے ہی ساتھی علاحدگی اختیار کر بیٹھے۔ اور انتہا یہ کہ نہرو اور مولانا آزاد نے بھی ورکنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اس مرحلے پر کانگریس کی اندرونی کش مکش انتہا کو پہونچ گئی تھی کہ مسلم لیگ کی طرح یہاں بھی وہی چال چلی گئی جو پاکستان میں چلی گئی تھی۔ یعنی کسی طرح ٹنڈن جی سے استعفا دلوایا گیا اور کانگریس کی صدارت بھارت کے وزیر اعظم کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ کانگریس کے حمایتی کہہ رہے ہیں کہ پنڈت جی کا یہ اقدام بالکل ٹھیک ہے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔ اور ان کے مخالفین اس طریقے کی مذمت کر رہے ہیں کہ آنے والے انتخابات میں اس کا اثر غلط پڑے گا۔

جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ ٹنڈن جی کانگریس کی صدارت سے ہٹ گئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا پنڈت نہرو کی صدارت کانگریس کی خرابیاں دور کر سکے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلے میں لیگ کے انجام پر نظر رکھنا غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ پنڈت نہرو نے اس نیک نیتی کی بناء پر پچھلے دنوں کانگریس کے امیدواروں میں بہت سی اخلاقی خوبیوں کی فہرست گنوائی ہے جو ان میں ہونی چاہئیں۔ لیکن عملاً کیا ایسا ہوگا؟ ہمیں امید نہیں۔ کانگریس کے مزاج میں جب تک بنیادی تبدیلی واقع نہ ہو اس کے کارکنوں میں کیونکہ وہ خصوصیات پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے جو کسی اعلیٰ اخلاقی اور صالح نظام فکر ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اگر پنڈت نہرو کانگریس کے کارکنوں کا سدھار کرنا چاہتے ہیں تو وہ کانگریس کے نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی فکر کریں کسی خراب چیز کی سطح پر اوپر سے پالش کر دینے سے ظاہر بین نگاہیں تو دھوکا کھا سکتی ہیں لیکن تجربہ آیندہ بتا دے گا کہ یہ نمائش ایک فریب خیال کے سوا کچھ نہ تھی۔

یوپی میں اُردو کا حشر

یوپی اسمبلی کا تازہ کارنامہ یہ ہے کہ ہندی کو یوپی کی سرکاری زبان بنا دیا گیا ہے اور اردو کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت بھی نہیں دی گئی حالانکہ دستور میں الفاظ کی حد تک اُردو کا نام علاقائی زبانوں میں شامل فہرست تھا۔ دستور میں اُردو کو جہاں علاقائی زبان کہا گیا ہے وہیں سنسکرت کا نام بھی ہے۔ حامیانِ اُردو سیکولر اسٹیٹ سے خدا جانے کیا کیا امیدیں باندھکر اسی پر مطمئن ہو گئے تھے کہ چلو اردو کو علاقائی زبان کی حد تک تسلیم کر لیا گیا لیکن یوپی اسمبلی وزیر تعلیم اور وزیر اعظم نے اپنی تقریروں میں نصیحت و تنبیہ اور نرمی و گرمی کے ساتھ جس صفائی سے علاقائی زبان کی تشریح کی ہے اور دستور کی دھجیاں بکھیری ہیں وہ بہتوں کے لئے انتہائی حیرت کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ہمیں تو خیر کوئی حیرت نہیں بھارت کا نظام جن بنیادوں پر چل رہا ہے وہ سب مغربی ڈھنگ سے مستعار لی گئی ہیں اور ان بنیادوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے نظام میں وہ تمام خرابیاں بھی سرایت کر گئی ہیں جن کا باعث اخلاقی اصولوں کا فقدان اور الحادی نظام کا اثر ہوا کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ کوئی غیر جمہوری طرز عمل ہو تو مغربی طرز سیاست اسے حسین الفاظ کے پردوں میں اِس طرح چھپا دیگی کہ اگر دنیا مطمئن نہ ہو تو گناہ کرنے والوں کے اپنے ضمیر ہی کم سے کم مطمئن ہو جائیں۔ سیکولر اسٹیٹ کے حامیوں میں سے اُردو پسند طبقہ اس پر گویا چراغ پا ہو گیا ہے اور ہونے کی بات بھی ہے لیکن شاید اب بھی اسے سیکولر اسٹیٹ کا تجربہ ہو جائے۔ تو یہ سودا گراں نہیں۔ زندگی میں زبان سے بھی زیادہ کتنی اہم چیزیں ہیں۔ خود زندگی اور خود داری کی زندگی کی بقا کتنی اہم ہے۔ اگر نظام خراب ہے تو ہر چھوٹے بڑے جزو میں خرابی پھیل سکتی ہے۔ اس لئے ایک ایک زخم پر مرہم لگانے کے بجائے پورے نظام جسمانی کی دیکھ بھال کرنی ہی زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ یہ گذارشات تو ہم نے حامیان اُردو کی خدمت میں پیش کی ہیں اب ہم کچھ اپنے حکمرانوں کو بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کوئی جمہوری حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ گروہی اور لسانی عصبیتوں کی آماجگاہ بنی رہے گی۔ حکمراں ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ اُردو پر کسی قوم کا ٹھپہ زبردستی لگانا ٹھیک نہیں۔ کتنے ہی غیر مسلم حضرات ایسے ہیں جو آج مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر اُردو داں طبقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اگر یوپی میں اُردو کو علاقائی زبان بھی تسلیم نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کے بدخواہ اس روش کو لے اُڑیں گے اور بھارت کی مخالفت میں دلیل کے طور پر استعمال کریں گے۔ ایسا موقع پھر آخر کیوں آنے دیا جائے۔ ہم کسی خاص گروہی مفاد کے پیشِ نظر یہ گذارشات سامنے نہیں لا رہے ہیں بلکہ آیندہ چل کر معلوم ہو جائے گا کہ ملک کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ ہر زبان کو اس کی صحیح حیثیت دی جاتی ہم متحیر ہیں کہ اگر یوپی بھی اُردو کا وطن نہیں تو کیا ہمارا شہر بنگال۔ ہمارا یا مدراس اس کا وطن ہے؟

چمن میں اور نہ بیاباں ہر چمن سے وائے نصیب ٭ میں یوں مٹا کہ میری داستاں کہیں بھی نہیں

اور یہاں یہ مٹ گئی یا مٹا دی گئی اور دانستہ اس کے وجود سے ہی صرف نظر کیا گیا تو اُردو آخر بھارت کے کس حصے کی علاقائی زبان تسلیم کی جائے گی۔ جبکہ کسی نہ کسی علاقے کی زبان تو یہ ہے ضرور۔ تب ہی تو دستور میں اسے علاقائی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اُردو کی علاقائی حیثیت اس کمزور دلیل سے نہیں مٹ سکتی کہ "سنسکرت بھی ایک علاقائی زبان ہے لیکن کیا کہیں وہ بولی جاتی ہے"؟ اس کی تردید آج یوپی کیا بھارت ہی کے کروڑوں عوام کی زبانیں کررہی ہیں۔ یوپی میں اُردو کا حشر سیکولرسٹیٹ کی قصیدہ خوانی کرنے والے حامیانِ اُردو کے لئے ایک تازیانہ ہے۔

● ———— گاندھی جینتی

گاندھی جی ایسی شخصیت کا نام آج کل جس طرح استعمال کیا جارہا ہے اسے دیکھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ شخصیت پرستی کے تحت سب کچھ نہیں ہورہا ہے بلکہ اغراض کے تحت کیا جارہا ہے ہر رہنما اور ہر سیاسی کارکن اپنی خواہشات کی سندِ جواز گاندھی جی کا نام لے کر پیش کررہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس نام کی اصلی اہمیت اور قدر وقیمت کم ہوتی جارہی ہے حکومت ہند بھی اس بات کو محسوس کرنے لگی ہے چنانچہ اس نے گاندھی جی کا نام کاروباری ذہنیت کے ساتھ استعمال کرنے پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اظہار ناراضگی کیا کبھی کھوئی ہوئی عظمت واپس لاسکتا ہے؟

پچھلے دنوں گاندھی جینتی کے موقع پر تقریباً ہر جگہ خود حکومت کے ملازمین نے جس بیدلی سے رسوم ادا کی ہیں وہ افسوس ناک ہیں۔ سرکاری دفتروں کے ملازمین گاندھی جینتی کے اجتماعات کی حاضری تو اس بیدلی سے پورا کرتے ہیں گویا کوئی بے سود سی بات ہے۔ اور اس بھارت کے عظیم انسان کی یاد میں جو جو پروگرام سرکاری اجتماعات میں رکھے جاتے ہیں وہ اس کی تعلیمات کے مقابلہ میں کتنے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ گویا گاندھی جی کی تعلیم اتنی بھی قابلِ توجہ نہیں سرکاری اجتماعات میں گاندھی جینتی کے موقع پر گانوں، قوالیوں، کیرتنوں اور اسپورٹس کا اہتمام کیا جاتا ہے —— اگر یہی شخصیت پرستی ہے تو ہمارا خیال ہے کہ گاندھی جی جیسی ہستی اس شخصیت پرستی سے الگ ہی بھلی۔

شخصیت چاہے غلط ہو یا صحیح لیکن شخصیت پرستوں میں اگر اس کی عظمت کا شعور ہوتا ہے تو اس کی یاد حوصلہ، امنگ اور جوش وخروش سے منائی جاتی ہے۔ بھارت کے عوام اور حکومت دونوں کی بیدلی دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے ان میں اور گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کے فلسفے میں بڑا فاصلہ ہے۔ وہ زبان سے گاندھی جی کو مانتے تو ہیں چونکہ بڑے بڑے رہنما بھی گاندھی جی کا نام لیتے ہیں لیکن دل سے ان کی تعلیمات پر یقین نہیں گاندھی جی کی موت کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے اس پر بھی بیدلی کا اتنا زور ہے۔ معلوم نہیں کچھ عرصہ گذرنے کے بعد بھارت کے عوام گاندھی جی کو کس حیثیت سے دیکھیں گے۔

● ———— ہندو کوڈ بل

سال رواں کے آغاز میں ہندو کوڈ بل کا مسئلہ بڑی شدت سے پارلیمنٹ میں اُبھرا تھا ہندو حلقوں میں اس پر بڑی لے دے ہوئی لیکن نہرو مشرب حلقے بھی اپنا سا زور لگا رہے تھے بلکہ پنڈت نہرو نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ اس کی خاطر موقع پڑا تو میں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ اس وقت اسمبلی کے ملتوی ہو جانے کی وجہ سے ہندو کوڈ بل کا مسئلہ کچھ دنوں کے لئے ٹل گیا تھا —— اب اسمبلی کے موجودہ اجلاس میں پھر اس پر کافی بحثیں ہوئی ہیں۔ اگرچہ نتیجہ التواہی پر جاکر ختم ہوا لیکن اس دوران میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ کافی دلچسپ ہیں۔ ہندو حلقے اس کوڈ بل سے اس لئے گھبرا رہے ہیں کہ اس کے نفاذ سے ان کا پرانا سماجی نظام ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور پنڈت نہرو اور ان کے حامی مصر ہیں کہ زمانے کے حالات کے مطابق تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔

دیکھنا چاہئے کہ اب یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

جدید — ڈاکٹری — کتابیں

۱۔ شفاء الامراض ڈاکٹری۔ حصہ اوّل و دوم، سوم

اس کتاب میں انگریزی حرف تہجی کے مطابق امراض کی قرابادینی مفردات مرکبات اور پیٹنٹ ادویات کا بیان کیا گیا ہے۔ تینوں حصوں میں حرف ڈی تک کے امراض کی مجرب دوائیں دی گئی ہیں۔ اور آخر میں چند مجربات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت تینوں حصے تین روپے

۲ — قرطاس مجربات — طبع دوم

اس کتاب میں اوزان و پیمانے نسخہ نویسی اور عام امراض کی زود اثر دوائیں اور نسخے بیان کئے گئے ہیں۔ پاکٹ بری اسکوائیر کے بہت سے نسخے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت فی جلد دو روپے علاوہ محصول ڈاک

۳ — آزمودہ دوائیں — حصہ اوّل

اس کتاب میں مکمل اوزان اور پیمانے، برٹش فارماکوپیا کے چیدہ اور خاص مرکبات درج کئے گئے ہیں۔ انجکشن اور ٹکیوں کا طریقۂ استعمال خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کئی سو انگریزی جدید ترین ادویہ کا مٹیریا میڈیکا اور طریقۂ استعمال درج ہے۔ موجودہ وقت کی ایک اہم اور خاص الخاص کتاب ہے، بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۸، قیمت فی جلد تین روپے

۴ — جلدی امراض کا علاج

اس کتاب میں امراض جلد میں مجرب دواؤں کا مٹیریا میڈیکا اور فارماکوپیا دیا گیا ہے اور چند منتخب مجربات بھی دیئے گئے ہیں۔
قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے

۵ — خارش

یہ انگریزی کے ایک خاص مقالہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں خارش پر بحث، اسباب، علامات، انداز اور طریقہ علاج اور مجرب ادویات کا بیان کیا گیا ہے۔
قیمت فی کاپی آٹھ آنے

۶ — افیون — از — ڈاکٹر آر۔ این۔ چوپڑہ

یہ ڈاکٹر موصوف کی کتاب "ہندوستان کی دیسی دواؤں" سے ماخوذ ایک مقالہ "افیون" کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت فی کاپی آٹھ آنے

۷ — رسالہ مغربی طب ماہوار میرٹھ

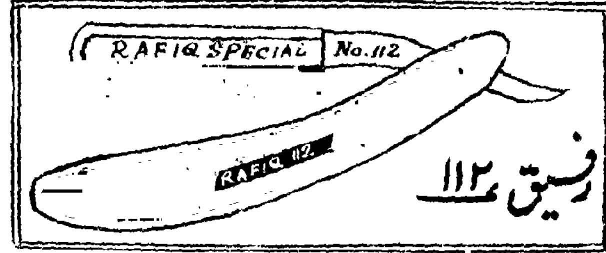
ایڈیٹر ڈاکٹر بشیرالدین عصری۔ چندہ سالانہ چار روپیہ۔ فی کاپی چھ آنے (۶)
یہ رسالہ ایلوپیتھک ڈاکٹروں کی اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے عرصہ چار سال سے جاری ہے۔ ہر ماہ جدید ترین ادویات اور معالجات پر بحث کرتا ہے۔ اور ڈاکٹری کے محیر العقول کارنامے پیش کرتا ہے۔ اور طبیب کیلئے مغربی طب کا خلاصہ پیش کرتا ہے

ملنے کا پتہ

کامیاب انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن میرٹھ شہر

محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ سے شائع کیا

ایشیا بھر میں جدھر دیکھئے



اُسترے چل رہے ہیں

رفیق ریزر فیکٹری نہایت جاں فشانی اور انتھک کوششوں سے سن ۱۹۴۰ء سے بہترین ہالو گراؤنڈ استرے کامیابی سے تیار کر کے ملک کی اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے اس کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھکر مارکیٹ میں سستے اور گھٹیا ولائتی و جرمنی استرے ہندوستانی صنعت کو نقصان پہنچانے کیلئے سپلائی کئے گئے ہیں جو تجربہ سے ناپسندیدہ اور نہایت ناکارہ ثابت ہو رہے ہیں۔ بھولے اور سیدھے باربر محض جرمنی یا ولائتی نام کی وجہ سے خرید کر اپنا پیسہ ضائع کر رہے ہیں، جنہیں ناقص ثابت ہونے یا ایک ہفتہ میں ٹوٹنے پر کوئی دوکاندار بھی واپس نہیں لیتا۔ آپ اپنے پیسے بغیر واپسی کی شرط کے ہرگز ضائع نہ کریں۔ ہوشیار اور آزمودہ باربر صرف

رفیق ۱۱۲ ساختہ اُسترے

خرید کر استعمال کرتے ہیں۔ جن کی ہر طرح قابلِ اطمینان پائداری و تسلی بخش ہونے کی سو فیصدی گارنٹی دی جاتی ہے اور کسی قسم کا نقص ہونے پر واپسی کی شرط ہے آپ بھی

رفیق ۱۱۲ اُسترے ہی خریدیں

(وہی مال خریدیں جو اس کسوٹی پر پورا اُترے)

رفیق ریزر فیکٹری ۱۱۲ کوٹلہ اسٹریٹ میرٹھ


جگر


معیار
Maiyar
Monthly

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ معیار میرٹھ

دسمبر ۱۹۵۱ء

جلد (۱)
شمارہ (۱۱)

ترتیب دینے والے

اصغر علی عابدی ـ نجم الاسلام



تعاون

سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ۸؍ آٹھ آنے

ہیڈ آفس :- خندق اسٹریٹ میرٹھ سب آفس :- محلہ کشن گنج دہلی
(مضامین۔ خط وکتابت۔ ترسیل زر۔ اور تبادلۂ جرائد کیلئے ہیڈ آفس)

ترتیب

مقالات

رنگ نور

افسانے اور خاکے

ایک ناولٹ

جام و سنداں

خیال اپنا اپنا

یہ مسائل زمانہ

ادارہ

نقشِ اوّل

ادارہ کو وقتاً فوقتاً اشتراکیت کی مذمت میں افسانے، نظمیں، اور قطعات وغیرہ موصول ہوتے رہتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج صحبت میں ان نگارشات کے متعلق کچھ اظہارِ خیال کیا جائے تاکہ منتظرین کی اُلجھن ختم ہو۔ اور آئندہ اس موضوع پر 'معیار' کے لئے قلم اُٹھانے والوں کا وقت اور محنت بیکار نہ جائے۔

غالباً ہم سب اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمارے ہر قسم کے "خیر خواہوں" کا ایک ہی کارگر ہتھیار ہے اور وہ ہے غلط فہمیاں ا[illegible] کا کام۔ چنانچہ جب سے 'معیار' کا اجراء عمل میں آیا ہے بہت سے 'دوست' اس فکر میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ اس رسالہ کو ادب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا مقصد تو لوگوں کو اشتراکیت سے بدظن کرکے سرمایہ داری کی گرتی ہوئی دیوار کو روکے [illegible] ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اشخاص جن سے اس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں وہ ہم سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوتے اور نہ ہی اُن کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ یہ الزام سن کر اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کریں وہ تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ایسے مندرجات پر نظر ڈالنے تک اپنی رائے محفوظ رکھیں۔ اب فرض کیجئے کہ کسی شمارہ میں ایک آدھ مقالہ، دو ایک افسانے، چند نظمیں اور قطعات وغیرہ اشتراکیت کی تردید میں انہیں مل جاتے ہیں تو وہ کیا رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں گے خصوصاً اس صورت میں جبکہ بدقسمتی سے آج اشتراکیت کی مخالفت کو آنکھ بند کرکے سرمایہ داری کی موافقت کے ہم معنی قرار دیا [illegible]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اشتراکیت سے کچھ مرعوب ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اشتراکیت سے ہمیں بنیادی اختلافات ہیں۔ اشتراکیوں کے اور ہمارے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم نے تحقیق کے ذریعہ اُن کے جن نظریات کو باطل پایا انہیں باطل کہنے میں ہم کسی وقت بھی پس و پیش نہیں کریں گے۔ تردید بھی ہوگی، تنقید بھی ہوگی، تجزیہ بھی ہوگا، اور وہ سب کچھ ہوگا جو ہونا چاہئے۔ مگر متانت کے ساتھ ہوگا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا جائے وہ انتہائی معیاری ہو۔ سنجیدہ رہے اور سستی جذباتیت سے بالکل پاک ہو۔

اشتراکیت کی مخالفت میں ہماری طرف سے اگر گھٹیا اور سطحی قسم کی نگارشات منظرِ عام پر آنے لگیں تو ہمارے ادب کو 'اینٹی کمیونسٹ پروپیگنڈا' کے نام سے بدنام کرنے کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔ فقروں اور پھبتیوں کا اسلوب ہمیں نہیں پھبتا۔ باوقار لہجہ ہی ہمارے شایانِ شان ہے۔

افسانوں، نظموں اور قطعات وغیرہ کے بجائے اشتراکیت پر تنقید کا کام اگر ٹھوس علمی مقالوں کے ذریعہ اگرچہ اس کے لئے بہت کچھ ریاضت کرنا ہوگا۔

اس شمارہ میں

اب کی مرتبہ ابنِ فرید نے افسانہ کے بجائے "شعور و لاشعور" کے عنوان سے ایک نفسیاتی مضمون پیش کیا ہے۔ جس میں فرائڈ اور دوسرے علمائے نفسیات کے نظریات کا تعارف اور ان کے قابلِ اعتراض حصوں پر تنقید ملتی ہے۔ امید ہے کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے قلمکار بھی اب زیادہ دیر تک خاموش نہ بیٹھیں گے۔

"اقبال کیا تھے" میں انعام الرحمٰن نے اقبال کی صحیح حیثیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقالہ مختصر ہے مگر ایک نیا نقطۂ نظر لئے ہوئے یعنی بقامت کہتر بقیمت بہتر۔

تاج العرفان عثمانی کی نظم "دیباچۂ سحر" سے عرفان و آگہی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں جن کی گرمی سے "بندگیٔ ما سوا کا طوق" رفتہ رفتہ گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

محمود عالم پہلی مرتبہ محفلِ معیار میں ایک حسین اور معیاری نظم کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں۔ "دریچوں کے باہر" مقدس بزرگوں کی خدمت میں ایک مودبانہ طنزیہ نہیں خلوصانہ دعوتِ عمل بھی ہے۔

ابو الحسنات مظاہری "پہچان" میں جوان ہوتے ہوئے شعور کی دو مختلف کیفیات کے دوراہے پر کھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف پارکوں، سینماؤں اور کلبوں کی رومان پرور فضا دنیا کی دلفریبی ہے اور دوسری طرف دکھی انسانیت کی پکار۔ اس کشمکش کے عالم میں وہ زندگی سے اپنا فرض دریافت کر رہا ہے۔

سہیل زبیری کی "ضمیر" مادہ پرستانہ فلسفہ اخلاق پر ایک کاری ضرب ہے۔

شارق میرٹھی چوکھی لڑائی لڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی رباعیات میں قنوطیت، رجائیت، عدم تشدد اور فلسفہ سب ہی رنگ کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ مگر حسنِ ادا کی ملاحت ہر جگہ چھائی ہوئی ہے۔

مزاحیہ خاکہ "بیسویں صدی کا بجٹ" میں متین طارق نے اس دور کی معاشرت، معاشیات، اور سیاسیات وغیرہ کا حساب پھیلایا ہے۔

افسانہ "اقتدار" نفسیاتی تجزیہ اور جزئیات نگاری کی اچھی مثال ہے۔ انور اعظمی کا فن تیزی سے پختگی کی منزل کو پہونچ رہا ہے۔

اقبال نسیم "لنڈن بھیا" کے عنوان سے ایک اچھوتا کردار پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے عہد کی تاریخ نے شہریوں کی یہ ایک نئی قسم پیدا کی ہے جو ظالم اور مظلوم کے درمیان ایک زبردستی کا واسطہ بن کر خود اپنی قوم کے احساسِ کمتری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔

شمسی رحمانی کے ناولٹ "دلدل سے باہر" کی دوسری قسط بھی امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

حقی حریری کی غزل اپنے اندر رنگ میں ... کرتی ہے۔ یہ آپ کو بتایا ہی جا چکا ہے۔ وہ کم غزل کہتے ہیں۔

ظہیر غازی پوری کی غزل، حقی حریری کی غزل کا ردِ عمل ہے۔

ابو المجاہد زاہد کی غزل ان دونوں کی درمیانی کڑی ہے۔

رمزی عظیم آبادی کے ... غزل میں ایک کیفیت اور رشتہ ضرور ہے۔ ذرا طبیعات دیکھئے یہ حرام نہیں بلکہ متبرک ہے۔

نقشِ ثانی

بھارت کا موجودہ نظامِ حکومت — اصول کی کسوٹی

کیا ہمارے ملک میں موجودہ حالات میں معیاری قومی جمہوری سیکولر اسٹیٹ کا قیام ممکن ہے

بھارت کا نظامِ جمہوریت جن بنیادوں پر چل رہا ہے اُن میں دو بڑے اور اہم عناصر قومی حکومت کی تعمیر اور سیکولر اسٹیٹ کی تاسیس سمجھے جاتے ہیں۔ موجودہ عالم میں اتحاد کی [illegible] عوام کے ایک خاصے بڑے طبقے کی خواہشات کے خلاف نئی بنیادوں پر قومیت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے لیکن ایک طبقہ اپنے اسی پرانے نظام پر چلنا چاہتا ہے جو صدیوں سے مختلف صورتوں کے بڑے طبقے میں رائج رہا ہے۔ یہ لوگ جن کے ذہن مغربیت سے زیادہ مرعوب ہیں آج غیر ملکی نسلوں کے مزاج قومیت اور سیکولرازم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ [illegible] قومیت کا اسلوب اور یہ ڈھنگ اور یہ طریقے اسی مغربی تہذیب سے اپنایا گیا ہے جو پچھلی کئی ایک صدیوں سے ہمارے اوپر مسلط تھی اور آج بھی سیاسی غلامی ختم ہونے کے بعد بھی ذہنی غلامی کی [illegible] ہے۔ مغربی ممالک میں اس نظام کے جو نتائج ظاہر ہو چکے وہ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے رازِ درونِ پردہ نہیں۔ اور پھر قومیت کی تعمیر کے سلسلے میں یہاں سیکولرازم کو [illegible] میں جو کچھ بیان سمجھا گیا ہے اور جو کچھ مختلف رائیں اور متضاد نقطہ ہائے نظر پیش کئے گئے ہیں وہ بھی سامنے ہیں اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے مخصوص حالات نے جو کچھ اپنے [illegible] ہیں وہ بھی ظاہر ہیں۔ پھر قومی سیکولر اسٹیٹ کے نظریات کا تماشہ عمل کے پردے پر جس طرح ہم دیکھ رہے ہیں وہ بھی قابلِ غور ہے۔ یہ نظریات کہاں تک موجودہ حالات میں [illegible] ہو سکتے ہیں اس پر بھی غور کر لیجئے۔ اسی سے ان نظریات کی کامیابی اور ناکامی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بھارت کی مختلف جماعتوں، گروہوں اور فرقوں کی لیڈرشپ [illegible] ہے ان میں آپس میں بے حد تضاد اور خیال و فکر کا ایک بھیانک تصادم پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد ان کی پچھلی تہذیب کے [illegible] اور نئی تہذیب کے [illegible] کا پیدا کردہ [illegible] اور تغیر کی دبی ابھرتی لہروں کا تصادم ہے ماضی اور حال کے تصورات کا ٹکراؤ ہے۔ قدیم و جدید کی جنگ ہے جس نے [illegible] کے لاشعور میں [illegible] بھارت کی فضا پیدا کر دی [illegible] میں اٹھی ہوئی لڑائی کا احساس بھر دیا ہے۔ قدیم ترین روایات اور سماج کی پرانی دیرینہ دور کی قدریں نئے نئے تصورات سے الجھتی نظر آ رہی ہیں۔ یہ کشمکش دیر سے اندر ہی اندر [illegible] ہے دیکھنے والے اب اسے باہر پھوٹتا ہوا بھی دیکھنے لگے ہیں۔ اگر ہمارا اندازہ کسی حد تک بھی درست ہے تو وہ وقت قریب ہے جب یہ دبی ہوئی کشمکش کی آگ آتش فشاں [illegible] بنے گی۔ آزادی کے بعد ان چار سالوں میں ملک کے حالات بڑی تیزی سے بدلے ہیں۔ اس طوفانی دور میں جہاں انقلاب نے ابھرتی ہوئی لہروں نے [illegible] کے خس و [illegible] ساحل پر لا پھینکا ہے وہیں تھپیڑوں کی بدولت تہ میں چھپی ہوئی کچھ غلاظتیں بھی ابھر کر سطح پر آ گئی ہیں۔ یہ خس و خاشاک غلامی کے [illegible] بندھن [illegible] جنھیں ہم نے [illegible] لیکن ابھی ہمارا ملک [illegible] سے پاک نہیں۔ آج فرقہ پرستی کی غلاظتیں اوپر اٹھ آئی ہیں۔ یہ ملک کیلئے اسی طرح مضر ہیں جس طرح غلامی کے بندھن آزادی سے پہلے تھے بلکہ [illegible] جائے تو اب معاملہ اور بھی نازک ہے۔ پہلے ہم غلامی کے خس و خاشاک سے بیزار تھے اور اسی بیزاری نے غلامی کا بندھن توڑنے کیلئے ہمیں بے چین کیا تھا لیکن فرقہ پرستی خود ہمارے [illegible] فرقہ پرستی اور سیکولرازم کی مختلف صورتوں میں اٹھ رہی ہے ہو سکتا ہے کہ ہم ناموں سے دھوکا کھا جائیں یا الفاظ کے پردوں تک ہی ہماری نگاہیں جا کر رہ جائیں اور حقائق کا احاطہ نہ کر سکیں۔ [illegible] آج کے اٹھتے ہوئے فتنے کل کے گذرے ہوئے فتنوں سے کسی طرح کم بھیانک نہیں۔ اور پھر نہ صرف فرقہ پرستی ہی ایسا فتنہ ہے جو اٹھ رہی ہے بلکہ دوسری [illegible] تہذیب کے پیدا کردہ کچھ فتنہ ہائے نو بہ نو بھی ہیں یہ اپنے اثرات کے اعتبار سے فرقہ پرستی کی طرح ہی مہلک ثابت ہو سکتے ہیں اگر ہمارے شعور ناپختہ کار ہوں [illegible] تو ان فتنہ سامانیوں کا آسانی سے نشانہ بن جائیں گے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ [illegible] اگر کچھ ابھر کر کسی قابل ہو جائیں گی تو ان کا مزاج آپس میں ٹکرانے کا رہے گا۔ [illegible] اور کون جانتا ہے کہ اس تصادم میں انسانیت کے نرم و نازک جسم پر کتنی خراشیں آئیں۔

قطع نظر اس سے کہ قومی حکومت اس معیاری شکل میں قایم ہو بھی جائے جس کا تذکرہ نظریات کی حد تک عام ہے تو وہ کہاں تک دوسری قوموں کیلئے ایک مصیبت ثابت ہوتی ہے ـــــ مگر اس نقطہ سے ہی بھارت کی قومی جمہوری سیکولر حکومت کا جائزہ لیا جائے کہ وہ اپنے مخصوص حالات میں نظریاتی حیثیت سے [illegible] پوری اترتی ہے کہ نہیں یا [illegible] کیا کچھ کھو کر اسے قوم [illegible] معیار پر لایا جا سکتا ہے تو بھارت کے مستقبل پر [illegible] بڑا پردہ اٹھ جائے گا۔

قومی جمہوری حکومت کے لئے جو ضروری شرائط پوری کی جاتی ہوتی ہیں وہ جن کے بغیر قومی حکومت نتائج کے اعتبار سے تباہ کن ہوتی ہے وہ مختصر طور پر یہ ہو سکتی ہیں کہ ایک مدت تک قوم کے افراد کچھ [illegible] شعور رکھتے ہوں [illegible] اجتماعی تربیت ہو چکی ہو دوسرے قومی یگانگت افراد میں بدرجہ اتم موجود ہو۔ سیاسی شعور سے مراد افراد میں تعلیم و تربیت کے بعد [illegible] پیدا کرنا ہوتا ہے [illegible] کی [illegible] کا کس [illegible] جائزہ لینے اور [illegible] کے حسن و قبح کا اندازہ کرنے کی صلاحیت [illegible] یہ شعور اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کے نتیجہ میں پیدا ہونا ضروری نہیں بلکہ قومی بیداری کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔ دراصل کسی جمہوری حکومت کے لئے یہ شعور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں [illegible] ہمیشہ [illegible] کا موقع ملا رہے گا۔ دوسروں کی جہالت اور سیاسی فراست [illegible] حکومت پر [illegible] اور قومی یگانگت سے [illegible] افراد کی [illegible] نظام اور [illegible] ہوتی ہے جو شدید سے شدید [illegible] یہی انتہائی ضروری ہے۔ قومی [illegible] اس کے بغیر تو قریب جمہوریت کا قیام بھی مشکل ہوتا ہے۔ [illegible] ایک ایسی ابتر حالت پیدا ہو جاتی ہے جو جمہوریت کیلئے مہلک ترین ہے۔ قومی حکومتیں یورپ میں کسی حد تک اگر کامیاب ہوئی بھی ہیں تو ان کی وجہ یہی ہے وہاں قومی یگانگت کے سبب بڑی حد تک ایک قومی مذہبی عصبیت کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے پرورش پا گیا۔ یہ قومی عصبیت چھوٹے چھوٹے اختلافات پر پردہ ڈال کر بڑے بڑے اختلافات کی [illegible] میں ایک [illegible] ظاہر ہونے لگتا ہے۔

قومی جمہوری حکومت کے اس اصولی جائزہ کے بعد آیئے اس [illegible] بھارت کی موجودہ حکومت کا جائزہ لیجئے۔

بھارت کی عام تعلیمی حالت [illegible] ایسی حالت میں سیاسی شعور [illegible] سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سیاسی فراست کے فقدان کی کھلی کھلی مثالیں ہمارے [illegible] [illegible] بھارت کے عوام میں سے ایک طبقہ آج بھی آزادی ملنے کے بعد انگریزی عہد غلامی کو یاد کر رہا ہے۔ یہ سیاسی شعور کے [illegible] عوام [illegible] فکر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔

ایسا [illegible] اقتدار [illegible] کا پیدا ہو رہے۔ دو شخص [illegible] کے لئے ایک طبقہ ان پڑھ اور غریب مسلم عوام میں یہ [illegible] [illegible] پاکستان بھیجدیا جائے گا۔ اور یہ کانگریس کو [illegible] کانگریس کی [illegible] فرقہ پرست [illegible] کانگریس کی مخالفت [illegible] [illegible] کی [illegible] سیاسی فراست اور [illegible] جو حکومت [illegible] جمہوری حکومت کا دعویٰ [illegible] بھارت کی قومی حکومت [illegible] جمہوری نظام کی افادیتوں سے [illegible] [illegible] بھارت [illegible] جمہوری حکومت [illegible] صحیح معنوں میں جمہوری حکومت بن سکتی ہے۔ [illegible] کہ بھارتی عوام کو اپنی [illegible] [illegible] ورنہ ان خوبیاں [illegible] جائیں گی۔ دوسرے [illegible] جب کسی [illegible] بدل جاتی ہے کہ ایک دوسری [illegible] کا موقع مل جاتا ہے۔ یہی جمہوریت [illegible] جیسا کہ برطانیہ [illegible] انتخابات میں ہوا لیکن بھارت میں یہ بات نہیں۔ یہاں حکومت پر اعتماد نہ ہوتے ہوئے بھی عوام [illegible] حکومت بدل دینے کی سکت نہیں۔ عوام [illegible] کا اندازہ ہی نہیں۔ یہ سب کچھ جمہوریت کے فقدان [illegible] سیاسی شعور کی بیداری [illegible] [illegible] نظام کی شرط [illegible] اور وہی ہمارے یہاں [illegible] نظام [illegible] معلوم ہوتی ہے۔

ان گذارشات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا موجودہ نظام حکومت صحیح جمہوریت کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اب قومی نقطہ نظر سے بھی بھارت کے موجودہ نظام کا جائزہ لے لیجئے کہ کیا ہمارے ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر معیاری قومی حکومت کا قیام ممکن بھی ہے؟ ہم کہہ چکے ہیں کہ قومی حکومت کی بنا قومی یگانگت پر ہوتی ہے اور یہ یگانگت کسی قوم کے افراد میں ایک ایسا قومی جذبہ پیدا کر دیتی ہے جو حکومت کے لئے فولادی دیوار کے مانند ثابت ہوتا ہے لیکن بھارت کے حالات ایسے ہیں وہاں قومی یگانگت کے درمیان میں بھی اختلافات کی وسیع خلیجیں حائل ہیں۔ اور عوام کے جذبات میں حقیقی ہم آہنگی ناپید سی ہے۔ قومیت کے جس قدر بھی مادی اور غیر مادی عناصر کہے جاتے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی ایسی پھوٹ ضرور ہے جس سے قومی جذبہ دوسری خواہشوں کے مقابلے میں دب کر رہ جاتا ہے تفصیلی جائزہ لیا جائے تو قومیت کی پیدائش تعمیر اور استقلال کے لئے مادی عناصر نسل۔ وطن۔ سلطنت۔ اور اقتصادی حالات کہے جا سکتے ہیں۔ اور غیر مادی عناصر کے ضمن میں زبان۔ مذہب۔ قومی ادب۔ روایات۔ تعلیم۔ تمدن۔ اور تہذیب۔ قانون۔ ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم۔ اور قوم بننے کی خواہش کا نام لیا جا سکتا ہے۔

قومیت کی تعمیر کے لئے مادی عناصر اگرچہ ضروری عناصر ہیں لیکن وہ ایسے ضروری نہیں ہوتے کہ صرف اُن ہی کے بل پر کسی قوم کی تعمیر ممکن ہو۔ ہندوستان میں اتفاق سے ایسے حالات کہ نسلیں بھی جدا ہیں۔ اور تقسیم کے بعد ملک کی وہ پہلی سی جغرافیائی حدود بھی نہیں رہی ہیں جس سے ہر طرح ایک قطعہ زمین نظروں میں متعین ہو جائے۔ پنجاب سندھ اور سرحد سے آئے ہوئے شرنارتھی آج بھی اپنے پرانے وطن کو نئے مستقر پر ترجیح دیتے ہیں کہ ہمارا وطن ایسا تھا اور ویسا تھا۔ رہے اقتصادی حالات تو بھارت میں وہ بھی ایسی اتحاد کی فضا لئے ہوئے ہیں جو قومی مفاد پر شخصی مفاد قربان کرنے کے لئے قوم کے اکثر افراد کو اکسا سکیں اس کے برخلاف معاشی لوٹ کھسوٹ اور اپنی ذات کیلئے منافع خوری کی ذہنیت میں قومی استقلال کو نقصان پہونچانا بُری طرح وبا بنکر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر طبقہ کا، ہر گروہ کا، ہر فرقہ کا مطمح نظر یہ ہے کہ صرف اسی کے افراد کا بھلا ہو جائے چاہے اس کے حصول کا طریقہ جائز ہو یا ناجائز۔ دوسروں کو اس سے فائدہ پہونچتا ہو یا نقصان۔ بھارت میں یہ مرض ہندو مسلم کشمکش کی صورت میں نہیں بلکہ دوسرے بے شمار چھوٹے چھوٹے ہندو فرقوں خاندانوں اور طبقوں کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ زندگی کی ایک معمولی ضرورت سے لیکر انتخابات اور پارلیمنٹ تک اسی کا دور دورہ ہے۔ خویش پروری اس مرض کی ہی پیدا کردہ ہے جس نے خود ہندو قوم کو بے شمار چھوٹے چھوٹے خانوں میں محبوس کر دیا ہے۔ قومیت کی تعمیر میں اقتصادی حالات کا یہ حصہ ہوتا ہے کہ مادی ضروریات کا اشتراک ان میں اتحاد پیدا کر دیتا ہے۔ یا کسی دوسری قوم کا اقتصادی ظلم افراد میں یک جہتی پیدا کرتا ہے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے اور عوامل اتحاد کے بجائے وہ عوامل موجود ہیں جن میں پھوٹ ہی پھوٹ بھری ہوئی ہے۔ یہ صورت قومیت کی تعمیر کے لئے کتنی مایوس کن ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

اب قومیت کے غیر مادی عناصر کا بھی ایک جائزہ لے لیجئے کہ موجودہ حالات کہاں تک ان کے لئے سازگار ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھارت کے سب سے اُلجھے ہوئے مسئلوں میں سے ہے کون نہیں سمجھتا ہے کہ اُردو کی یہاں کیا اہمیت رہ گئی ہے اور اب اس پر ادبار کی کیسی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ اور کیونکر بھارت کی ایک اکثریت کی خواہش کے مطابق ہندی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ٹھیک ہے ہندی آئے گی اور اُردو کا زور بھی نہ رہے گا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کے بعد بھی وہ سب لسانی اختلافات دب جائیں گے جن کی جڑیں مختلف زبانوں والے خطوں کے افراد کے سینوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ غور تو کیجئے کہ اُردو بنگالی تلگو بہاری مرہٹی تامل پنجابی راجستھانی کناری اڑیا گجراتی ملیالم ہندا مشرقی ہندی بہاری سندھی پہاڑی بھیلی آسامی گونڈی اور کشمیری وغیرہ بولنے والے لاکھوں کروڑوں آدمی جب اپنی اپنی بولیاں بولنے لگیں گے تو کیا بھارت کا یہ چمن یونہی منتشر سا نہ رہے گا جس میں قسم قسم کے خود رو پودے ہوں گے۔ اور پھر بنگالی راجستھانی بنگالی مرہٹی گجراتی اور تلگو کنڑی کے تو اپنے اپنے رسم الخط بھی ہیں۔ تو یہ اُردو کے بعد ختم نہ ہوگا بلکہ آگے بھی چلے گا۔ اور فرض کیجئے کہ اگر کشمکش کسی طرح دب بھی گئی تو لسانی تعصب کی اتنی دبی ہوئی چنگاریاں قومیت کی صحیح تعمیر کب کرنے دیں گی۔

اس ملک میں مذاہب بھی بے شمار ہیں جن میں اختلافات کا ایک طومار حائل ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی جین بدھ یہود قبائل وغیرہ تو الگ رہے۔ ان کے علاوہ ہندو قوم میں بے شمار مذہبی فرقے ہیں جیسے شیو۔ وشنو۔ کبیر پنتھی ست نامی۔ پجاری۔ برہمو سماجی۔ آریہ سماجی۔ رادھا سوامی۔ اور ان کے بعد ذاتیں اور گوتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کے یہاں ایسی رسومات اور روایات ہیں کہ نہ تو ایک دوسرے کے یہاں شادی ہوتی ہے نہ ہاتھ کا چھوا کھانا کھایا جاتا ہے اور نہ دوسری ذاتوں یا گوتوں کے لئے کوئی ہمدردانہ جذبات ہوتے ہیں۔ یہ بات اگرچہ پہلے کے مقابلہ میں اب کم ہوتی معلوم ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ایک ایسا طبقہ بھی اُٹھ رہا ہے جو روحانیت کا قائل تو پہلے بھی کچھ ایسا نہیں تھا اور اب وہ مزید برآں سیاسی اور سماجی بندھنوں کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتا ہے۔ اسی طبقہ کی بدولت سطحی طور سے ذاتیں اور گوتیں قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ دھوکا ہی

ہوچکی ہے ابھی تک بنیادی طور پر وہ سب خرابیاں موجود ہیں جو کچھ تبدیلی معلوم ہوتی ہے وہ صرف ایک نہایت محدود طبقہ میں اور نہایت محدود دائرہ زندگی میں ہے۔ اس پر مستقبل کی امید والا محل نہیں تعمیر کیا جا سکتا۔

جہاں تک ادب کا اور ثقافت کے تناسب سے یہ تبدیلی ناقابل التفات ہے۔ ہر فرقہ اور ہر طبقہ اپنی کچھ مخصوص روایات رکھتا ہے اور اسی
اس کے ادب اور تعلیم کا مسئلہ آتا ہے۔ تفریق یہاں بھی پورے طور سے جلوہ گر ہے۔
ادب کی بنیادیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب روایات ہی کوئی واضح اساس نہیں رکھتیں اور ان ہی میں آسمان زمین کا فرق ہے تو ادب میں کیسے ہم آہنگی اور یکسانی
پیدا ہو سکتی ہے۔ اور پھر جب توافق اور یکسانی کا امکان ہی نہیں تو ہمارا ادب کیونکر قومیت کی تعمیر میں صحیح طور سے معاون بن سکتا ہے۔ ماضی کا روایتی ادب
تو اس طرح ناکارہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد موجودہ انقلابی ادب کا جائزہ لیجئے تو یہاں بھی پہلی نظر میں یہ بات کھل جائے گی کہ اس کے بنیادی تصورات
ہی قومیت کی تعمیر سے میل نہیں کھاتے بلکہ ایک اور خلفشار یعنی طبقاتی جنگ کی بنا ڈالتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ طبقاتی جنگ کے کیا کیا
نقصانات ہیں اور کیا فائدے ہیں بلکہ اشارہ اس طرف کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بہرصورت قومیت کی تعمیر کے حق میں نہیں۔ اسی طرح تعلیمی اداروں کا
جائزہ اگر اس نظر سے لیا جائے کہ آیا وہ قومیت کی تعمیر میں معاون ہیں اور موجودہ نظام تعلیم کہاں تک تعصبات کی پردہ دری کرتا ہے تو ہم جس نتیجے پر پہنچیں گے
وہ ہم میں سے بہتوں کی توقعات کے خلاف اور خواہشات کے برعکس مایوس کن ہی ہوگا۔ اس لئے کہ یکسانی اور برابری کا وہ جذبہ ہمارے یہاں مفقود ہے جس
کی موجودگی افراد میں یگانگت پیدا کرتی ہے۔ یہاں زندگی کے ہر شعبہ پر ایک طرح کی برتری اور کمتری کی لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ جسے محسوس تو سب کرتے ہیں لیکن
ڈاکٹر امبیدکر کی طرح جیسا کہ انہوں نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں کہہ ڈالا تھا ——— کہتے کم ہی لوگ ہیں۔

اسی طرح تفصیل سے اگر دوسرے غیر مادی عناصر کا تجزیہ کیا جائے اور بھارت کے حالات کی روشنی میں قومیت کی تعمیر کے امکانات پر اصولی حیثیت سے
سوچا جائے تو یہ بات صاف طور سے سامنے آجائے گی یہاں ایسے حالات نہیں ہیں کہ معیاری قومی جمہوری نظام حکومت برپا ہو سکے۔ اور زیادہ تفصیل میں
جائیں اور بھارت کے عوام کے مزاج کا اندازہ کریں تو ہم اس نتیجے پر بھی پہنچ جائیں گے کہ سیکولر اسٹیٹ بھی بعض وجوہات سے قائم ہونی مشکل ہے۔

بھارت کے عوام کے لئے موجودہ صورت حال بہت مایوس کن ہے۔ قومی حکومت کے معیار پر جب ہماری حکومت صحیح معنوں میں مستقبل میں بھی نہیں پہنچ
سکتی تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ اور کون سی راہ کھلی ہوئی ہے۔ ہمارے خیال میں اس پر بہت کچھ سوچا جانا چاہئے۔ بھارتی عوام کی یہ ذہنی پراگندگی اگر کسی بہتر صورت سے
ختم ہو سکتی ہے تو وہ ایک اعلیٰ اخلاقی اور سماجی انقلاب سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ صحیح بنیادوں پر بھارتی عوام میں ایک ذہنی انقلاب لایا جائے تاکہ
صدیوں کے تعصبات کے بندھن ٹوٹ سکیں اور رسومات و روایات کی جگہ حقائق کو دی جا سکے ورنہ کمیونزم کا سیلاب ان بندھنوں کو توڑ کر ایک نئی جنگ
زندگی بپا کر دے گا۔ جس کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوگا سوائے اس کے کہ بھارت کے عوام ایک دام سے نکل کر دوسرے دام میں پھنس جائیں گے۔

آج انتخابی جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ زور شور سے کوششیں جاری ہیں۔ لیکن انتخابی ہنگامہ باز تنہائی کی گھڑیوں میں کبھی یہ سوچیں کہ کیا صرف
انتخابات کی ہار جیت سے جمہوری نظام قائم ہو جائے گا۔ جب کہ عوام میں سیاسی شعور ہی کا فقدان ہے۔ اس ہنگامے سے بہتوں کا اپنا بھلا تو ہو سکتا ہے
لیکن اس اجتماعی فائدے کی توقع بے سود ہے جو جمہوریت سے عوام کو حاصل ہونا چاہئے۔ کرنے کا اصل کام انتخابات کی دوڑ دھوپ نہیں۔ وہ اس سے کہیں
زیادہ اہم ہے۔

ابنِ فرید۔ بی۔ اے

شعور و لاشعور

ہمارے اعصاب مسلسل اپنے مخصوص افعال کرتے رہتے ہیں ہمارے اعضا اپنی مخصوص حرکت کرتے رہتے ہیں لیکن بجز کسی خاص اعصابی بے ربطی کے یا توجہ کے ہم ان کے افعال سے اور ان کی حرکت سے بے خبر رہتے ہیں۔ مثلاً دل کی حرکت، عمومی تنفّس، پلکوں کے جھپکنے کی طرف ہم ہر وقت رجوع ہوتے نہیں رہتے۔ وہ ہماری کسی خاص توجہ کے بغیر ایک حد تک ہماری لاعلمی میں اپنے مخصوص افعال کرتے رہتے ہیں۔ اور کچھ افعال ہماری خاص توجہ اور ہمارے اعلیٰ دماغی رجحان کے مرہون ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی امر کے بارے میں سوچنا، کوئی ایسا کام کرنا جو پیچیدہ ہو۔ اس طرح ماہرینِ طبعی نفسیات (PHYSIOLOGICAL-PSYCOLOGY) نے دماغی افعال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اوّلاً خود اختیاری اعصابی افعال (AUTONOMOUS NERVOUS ACTIVITIES) جو زیادہ توجہ کے محتاج نہیں اور جو فطری ہیں۔ ثانیاً مرکزی اعصابی افعال (CENTRAL NERVOUS ACTIVITIES) جن میں اعلیٰ دماغی (CEREBERAL CORTEX) مشغول ہوتا ہے۔ مرکزی اعصابی نظام کے افعال سے زیادہ تر ہم آگاہ رہتے ہیں لیکن خود اختیاری اعصابی افعال کے لئے یہ ضروری نہیں۔ پھر بھی بعض حالات میں یوں بھی ہو جاتا ہے کہ بعض پیچیدہ قسم کے افعال بھی خود اختیاری اعصابی نظام کے عمل دخل میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً سائیکل چلانا ہے۔ شروع میں سائیکل سیکھنے والا اپنی ہر حرکت سے باخبر رہتا ہے لیکن جب یہی افعال عادت بن جاتے ہیں تو خود اختیاری اعصابی افعال ہو جاتے ہیں۔

افعال کی اس تقسیم سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ ہمارے دماغ کا کچھ حصہ شعوری ہے اور کچھ لاشعوری۔ فرائڈ کی تحقیقات کے مطابق دماغ کا لاشعوری حصہ نوگنا ہے اور شعوری صرف ایک ۔ا۔ بالکل برف کے تودہ کی طرح جس کا پانی میں صرف ایک حصہ سطح سے اوپر رہتا ہے اور نو حصہ پانی کے اندر۔ شعور و لاشعور کے تناسب کے لئے ICEBERG کا لفظ استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اس سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ فرائڈ انسانی افعال کے کتنے بڑے حصہ کو لاشعور کی چارہ گری کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان وہ نہیں ہے جو اس کا شعور ظاہر کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو اس کا لاشعور چھپائے رکھتا ہے۔ اس لئے اگر کسی فرد کی صحیح نفسیاتی کیفیات کی تحلیل کرنی ہو تو اس کے لاشعور کا مطالعہ کیا جائے۔

لاشعور اپنا اظہار نہیں کر سکتا کیونکہ فرائڈ کے نظریہ کے مطابق وہ انسان کی حیوانی خواہشات کا مسکن ہوتا ہے، یہ خواہشات اتنی ناکتخدا ہوتی ہیں کہ جب بھی ان کو ظہور کا موقع ملتا ہے تو ایک ابتری سی پیدا کر دیتی ہیں۔ اس لئے قدرت نے ان پر قابو رکھنے کے لئے محتسب قائم کر دیا ہے جو ان کو اس وقت تک شعور کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیتا جب تک کہ اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ اب وہ خارجی ماحول سے تطابق کے لئے موزوں ہو گئی ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو وہ محتسب انہیں لاشعور میں واپس کر دیتا ہے۔ اس طرح ہمارے شعور سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ لاشعور کا برآمد کردہ اور "محتسب" کا ہم آہنگ کیا ہوا ہوتا ہے۔

مگر لاشعور کے پروردہ اتنے پست ہمت نہیں ہوتے کہ وہ شعور کے ذریعہ اپنے اظہار کا موقع نہ پا کر فنا ہو جائیں، بلکہ وہ لاشعور میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں جب ان کو اپنے اظہار کا کوئی ذریعہ فراہم ہو جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ محتسب غافل ہو جائے۔ فرائڈ کا یقین ہے کہ خواب کے وقت یا ذہنی توازن کے فقدان کے وقت (ہسٹریا، ٹشنس، سرسام وغیرہ امراض میں) یا تو محتسب بالکل غافل ہو جاتا ہے یا کسی حد تک کمزور پڑ جاتا ہے اور اس لمحے لاشعور اپنے اظہار کا بہترین موقع پا جاتا ہے۔ خواب میں جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایسی خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے جو شعور میں گذر نہ کر سکیں۔ مثلاً ایک بچی کسی دوکان میں چند خوبصورت کھلونے دیکھتی ہے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان کو حاصل کرے لیکن نہیں کر سکتی۔ اب وہ جب محوِ خواب ہوتی ہے تو دیکھتی ہے اس کے چاروں طرف خوبصورت کھلونوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے اور وہ ان سب سے کھیل رہی ہے۔ اس طرح وہ خواہش جو شعوری طور پر ناکام رہی اس کو لاشعور نے آسودہ کر دیا۔

فرائڈ لاشعور کی تکمیلِ خواہشات کی ایک دلچسپ مثال اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کے ہم پیشہ ڈاکٹر اکثر خبط الحواس سے گھر کی کنجیوں سے مطب یا دفتر کھولنے لگتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ اس کے برخلاف کبھی نہیں ہوتا، یہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ اس وقت کام کرنے کے بجائے گھر میں آرام کرنا پسند کرتے تھے اور ان کے لاشعور نے

ایک ذراسی غفلت کی بنا پر اس کا اظہار کر دیا۔

فرائڈ کی اس مثال پر غور کرنے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ لاشعور کا یہ اظہار کتنا مثالی اور کنایاتی ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ جب محتسب اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ لاشعور اپنا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتا تو وہ اپنی شکل یا نوعیت بدلتے بدلتے اصل سے اس قدر مختلف ہو جاتا ہے کہ اکثر اُسے ایک نظر میں پہچانا نہیں جا سکتا۔ اس کی مثالیں زیادہ تر وہ خوابوں سے دیتا ہے جن کو وہ لاشعور کا خاص ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ مثلاً ایک نوجوان ایک جگہ مہمان جاتا ہے اور وہاں کے ماحول سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ رات کو خواب دیکھتا ہے کہ BULBS جو ابھی کاشت کئے گئے ہیں اُگ آئے ہیں اور ان میں پھول بھی لگ گئے ہیں۔ فرائڈ اس کی تعبیر یوں بیان کرتا ہے کہ اُس نوجوان کے دل میں لاشعوری خواہش تھی کہ وہ وہاں اتنے عرصہ تک قیام کرے جتنا عرصہ کہ BULBS کو اُگنے اور پھولنے میں لگتا ہے۔ اور BULBS کے لئے یہ ایک طول عمل ہے۔

شعور سے لاشعور جس قدر زیادہ قوی ہے اس کا اندازہ اُوپر کی معروضات سے ایک حد ہو جاتا ہے لیکن فرائڈ لاشعور کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے اُسے تین حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے ——— اِیڈ (ID) ایگو (EGO) اور سُپر ایگو (SUPER-EGO)۔

جس وقت بچہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے اُس میں لاتعداد فطری طاقتیں ہوتی ہیں جو ماحول سے یکسر بے بہرہ ہوتی ہیں۔ یہ طاقتیں مختلف خواہشات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ یہ لامحدود قوت اور توانائی لاشعور کی مذکورہ تقسیم کے مطابق اِیڈ (اسے نفس امارہ بھی کہہ سکتے ہیں) ہے۔ جو سراسر لاشعور ہے۔ اس کی خواہشات کی تکمیل میں تلذذ[1] ہوتا ہے۔ زمانۂ بلوغت میں یہی تلذذ جنسی تعلقات کے استوار کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ بچہ اس تلذذ کے لئے ہر وقت جدوجہد کرتا ہے اور ہر اُس عمل کو چھوڑتا چلا جاتا ہے جو اس تلذذ کی راہ میں مزاحم ہو۔ یہی تنازع بچہ کی ذہنی پرورش کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اِیڈ یا نفس امارہ کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے فرائڈ کی نگاہ میں بچے خارجی ماحول سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اِیڈ ابھی تک طبعی تحقیقات کی دسترس سے باہر ہے۔ محض ظن وتخمین کے سہارے اس مفروضہ کو وجود میں لایا گیا ہے۔ اس لئے اس کی وضاحت میں حتمی امور کا کافی فقدان ہے۔

ایگو یا خودی، اِیڈ کا وہ حصہ ہے جو خارجی ماحول سے رفتہ رفتہ نزدیک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور حواس اپنا عمل ادراک کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ ان تعلقات کی بنا پر یہ حصہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ترقی کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بچے میں "میں" "از خود" کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا وجود کائنات میں کسی سیال قطرے کی طرح محلول نہیں ہے بلکہ ٹھوس چیزوں کی طرح منفرد ہے۔ اب احساس سُود وزیاں کا درجہ پیدا ہونے لگتا ہے لیکن اس درجہ تک پہنچنے کے لئے بچے کو کافی دشوار گزار تجرباتی وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ وہ اب لذت کے اظہار کے بجائے احساس برتری کی آسُودگی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے ——— اور تلذذ اپنی لاشعوری تکمیل خواہش کرتا رہتا ہے ——— اس طرح بچہ اپنی اہمیت واضح کرنے کے لئے اکثر تنہائی میں رونے لگتا ہے۔ ممکن ہے دوسرے تلازمۂ خیالات کی وجہ سے خود [illegible] بھی پیدا ہو جا[illegible] وہ [illegible] کہ وجود سے آگاہ ہوتا ہے اور گھر کے دوسرے افراد بھی اس کے لئے مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس آگاہی کے بعد وہ دوسری چیزوں کی شعوری [illegible] آگاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ایگو یا خودی [illegible] رہتے اور [illegible] وہ اِیڈ سے ممیز ہو جاتی ہے۔ ایگو، اِیڈ کی خواہشات کی تکمیل کے لئے ماحول کی سازگاری کو بھی پیش نظر رکھنے لگتی ہے۔ [illegible] اور ناگواری کا احتمال ہوتا ہے اس سے فرار اختیار کرتی ہے۔ خارجی ماحول سے تعلقات قائم کرنے کے لئے اِیڈ اور ماحول کے درمیان ایگو کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔

فرائڈ ایگو کی بنا بھی لاشعور میں [illegible] کرتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ اس کی تحقیق کے مطابق شعور میں اور زائد حصہ لاشعور میں ہوتا ہے۔ ایگو کی اہمیت محض تحلیل نفسی کے اوقات [illegible] ہوتی ہے ورنہ وہ بھی حد سے زیادہ مابعد الطبیعاتی ہے۔

اور اسی طرح سُپر ایگو یا ضمیر بھی ہے۔ یہ ایگو کا ایک ترقی یافتہ حصہ ہوتا ہے جو ماحول سے انتہائی مطابقت اختیار کرنے کی بنا پر اخلاقی اور معاشری بلکہ لاشعور کے روشن ترین حصہ بن جاتا ہے۔ اس تکوین میں فرائڈ کے مطابق والدین اور ماحول کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ والدین جب معاشری اور اخلاقی بندشوں پر سختی سے قائم رہیں تو بچہ میں سُپر ایگو، ضمیر یا فوق الانا پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب اس طرف سے کوتاہی ہوتی ہے تو یہ معیار پست ہو جاتا ہے۔ فرائڈ کے مطابق ہٹو اب اور نا ہٹو اب کچھ بھی نہیں ہے

---

[1] یہ تلذذ بھی وہ [illegible] (LIBIDO) [illegible] لاشعور کو [illegible] کے تحت کے گرد گھما دیتا ہے۔ جنس کے معنی فرائڈ [illegible] ہے جو مسرت بخش ہے۔ مثلاً بچے کا انگوٹھا چوسنا، ماں کا دودھ پینا اور ہاتھ پیر پھینکنا بھی جنسی تسکین کا حصول ہے۔

بلکہ تجھ خود اپنے ماحول سے رسوم و رواج کے مطابق معیوب اور احسن کا معیار قایم کرلیتا ہے اور اس کے قایم کرنے میں سراسر سُپر ایگو کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اس کا بھی معتد بہ حصّہ لاشعوری ہوتا ہے۔ اور بغیر کسی اعلیٰ خارجی ماحول کے یہ نشوونما نہیں پا سکتا۔ یہاں تلذذ اور تکمیل خواہش پر ماحول کو ترجیح دی جاتی ہے اس لئے ایڈ اور لاشعور کے محرکات (IMPULSES) ذہنی الجھنوں اور محتسب کی غفلت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایڈ، ایگو، اور سُپر ایگو کے نصب العین کے جدا ہونے کی وجہ سے اور نوعیت افعال کے بھی مختلف ہونے کی وجہ سے ان تینوں طاقتوں کے درمیان نزاع کا ہونا لازمی امر ہے۔ اسی نزاع سے بے شمار اعصابی اور ذہنی نقائص (NERVOUS AND MENTAL ABNORMALITIES) پیدا ہوتے ہیں۔ اور چونکہ لبیڈو[1] (LIBIDO) ان سب میں کارفرما رہتا ہے اس لئے جنسی بیماری کا ہونا بھی لازمی امر ہو جاتا ہے۔

جہاں تک شعور و لاشعور کی تمیز کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی دماغ فطری طور پر ان دو کا حامل ہے۔ ہمارے کچھ کردار یا افعال خود اختیاری ہوتے ہیں اور کچھ شعوری لیکن لاشعور کی تقسیم کرتے ہوئے فرائڈ نے قیاسات کا بہت زیادہ سہارا لیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک طبیب تھا اور تحلیل نفسی کی ابتدا اس نے ہسٹریا کے مریضوں کی تشخیص سے کی۔ اور اسی کی امداد سے اس نے نظریۂ خواب و جنس کی تعمیر کر ڈالی۔ ہسٹریا ایسے امراض خالص جنسی ہوتے ہیں اور نفس پر جنس کے غلبہ کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ وہاں جنس کی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں تفریط سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کو عمومی زندگی میں بھی تلاش کرنا زیادتی ہے۔

اِسی تسلسل میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنے کے قابل ہے کہ مغرب اپنا ایک خاص اندازِ فکر اور ایک خاص اندازِ معاشرت رکھتا ہے جو جنس اور مادہ پرستی کی انتہائی سرحدوں تک پہونچ گیا ہے۔ اس لئے وہاں کے تجربات کو آفاقی حقیقت کا حامل تصور کر لینا ہی سب سے بڑا سہو ہے۔ فرائڈ نے بھی سہو کیا۔ اس نے اپنے موضوع کو تجربات کی جولانگاہ میں کافی محدود رکھا، اس کی تحقیقات مغرب ہی سے شروع ہوئیں اور مغرب ہی میں ختم ہو گئیں۔ اس تنگ دامانی کی وجہ سے سب سے پہلے مغرب ہی میں اور اس کی زندگی ہی میں اس کے مقتدیوں نے اختلاف کیا۔ یونگ (JUNG) نے "تحلیلی نفسیات" کی بنا رکھی، ایڈلر (ADLER) نے "انفرادی نفسیات" کی طرح ڈالی اور نو نژاد فرائڈیوں (NEO-FREUDIANS) نے خود اس کی بہت سی حقیقتوں کو جھٹلا دیا۔

یونگ اور ایڈلر نے چند ضمنی امور میں ہی اس سے اختلاف کیا تھا جن کا اس موضوع سے بیّن تعلق نہیں یہ اختلافات خود بھی اُسی طرح مابعد النفسیاتی ہیں جس طرح فرائڈ کے نظریئے (علاوہ دو ایک تحقیقات کے) لیکن نو نژاد فرائڈیوں نے اُس کے نظریۂ جنس پر کاری حملہ کیا۔ ریورز (RIVERS) نے تحلیل نفسی کو طبعی نفسیات کے قریب لانے کی کوشش کی لیکن لبیڈو اور لاشعور کے مابعد النفسیاتی وجود نے سخت مزاحمت کی۔ لبیڈو میں جنسیاتی عنصر کی جس قدر بھرمار کر دی گئی ہے اس سے جدید اہل نفسیات میں سے کسی نے بھی اتفاق نہیں کیا ہے۔ جوزف جاسٹرو نے اِسے تحلیل نفسی کی بدقسمتی گردانا ہے۔ یوں صاف واضح ہوتا ہے کہ فرائڈ نے جنس کی جو بنیاد رکھی تھی وہی متزلزل ہو گئی ہے۔ جوزف جاسٹرو جنس کے وجود کا جنسی بیماریوں میں اقبال کرتا ہے لیکن اس کے بعید وہ کچھ زیادہ قائل نہیں۔

لاشعور کے ساتھ بھی جدید اہلِ نفسیات نے یہی چیرہ دستیاں کی ہیں۔ دماغ (جس کے لئے نفس کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب ہے) نے طبعی جائزہ کے بعد وہ لاشعور کا مادّی وجود کہیں بھی نہ پا سکے۔ اس لئے وہ اِسے مابعد النفسیاتی معروضہ کہنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اور اسی وجہ سے وہ ایڈ، ایگو، اور سُپر ایگو، کی تقسیم کو بھی چنداں اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ اِسے صرف فرائڈ کی تصوراتی حدبندی کہتے ہیں۔

ہڈسن نے دماغ کی بالکل مختلف تقسیم کی ہے وہ فعالی (OBJTECTIVE) اور مفعولی (SUBJECTIVE) طبقات کا قائل ہے۔ فعالی

---

[1] لبیڈو (LIBIDO) کے لئے LUST توضیحی لفظ تصور کیا گیا ہے۔ اور یہ جنس کے ہم معنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ زمانۂ طفولیت میں فرائڈ کی نگاہ میں یہ اظہار کے بے پناہ مواقع پاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ مرتفع (SUBLIMATE) ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ یہ جمود اختیار کر لیتا ہے اور زمانہ طفولیت کے بعد لڑکپن اور شباب میں بھی اپنا اظہار کرتا رہتا ہے جس میں مختلف جنسی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً (NARCISSISM) اور (OEDIPUS COMPLEX) وغیرہ۔

شعوری افعال کا ذمہ دار ہے اور مفعولی غیر شعوری اور مافوق العادت افعال کا لیکن اس نے اس عروضہ کو تناسل رُوحانی کا ترجمان بنادیا اس لئے وہ بھی حقیقت سے دُور ہوگیا اگر وہ یہ ملث راہ میں نہ لاتا تو اس کے معروضہ میں کچھ ایسی زیادہ کمزوری نہ تھی لیکن اس تصوّر نے اس کی ساری کاوش کو ایک لغزش محض بنا کر رکھ دیا۔

ریورز شاید پہلا ماہر نفسیات تھا جس نے قبل از شعور (SUB CONCIOUS) کی طبعی تحقیق شروع کی۔ اگر در حقیقت دنیائے نفس، شعوری اور قبل از شعوری افعال میں منقسم ہے تو یہ ناگزیر ہے کہ وہ علم عضویات (PHYSIOLOGY) سے ماوراء ہو۔ اس لئے ہیڈ اور ریورز نے اس کے لئے ایک حل تلاش کیا انھوں نے حیوانی (PROTOPATHIC یا PREMITIVE) اور میزاتی (DISCRIMINATING یا EPICRITIC) افعال میں تمیز کرنے کے لئے ایک تجربہ کیا۔ اور یہ تجربہ انہوں نے خود اپنے آپ پر کیا۔ اپنے ہاتھ کی ایک رگ کو منقطع کرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ جس کے دوبارہ نظم میں آنے کا ایک خاص طریقۂ عمل ہے۔ کچھ غیر متعین، کچھ بے ترتیب۔ کبھی تیز رفتاری سے اور کسی لمحہ ایک تکلیف کے ساتھ تحریک ہوتی ہے اس سے قبل کہ وہ متعین، مرتب اور مخصوص حس پیدا ہو۔ اس عمل کو عمومیت دیتے ہوئے انہوں نے تشریح کی کہ ہماری حیاتی زندگی کا ایک حصہ حیوانی ہے جس کے عمل ابتائی سادہ قسم کے ہیں اور دوسرا حصہ میزاتی ہے جس کے عمل اعلیٰ اور پیچیدہ قسم کے ہیں، مثلاً تمیز، احساس، طاقت و محنت، مقصد اور ارتباط وغیرہ۔ اس تشریح کو حسی حرکی میکانیت (SENSORY MOTOR MECHANISM) کے نیوراتی نظام (NEURAL ORGANISM) سے کافی سہارا ملا۔[1]

جوزف جاسٹرو اس معروضہ سے اتفاق کرتا ہے اور فرائڈ کی تقسیم لاشعور کو اس کے سامنے زیادہ وقیع نہیں سمجھتا۔ وہ حیوانی اور تمیزاتی حصوں کے لئے ابتدائی (PRIMARY) اور ثانوی (SECONDARY) کی اصطلاحیں بہتر سمجھتا ہے اور لاشعوری اور خود اختیاری اعصابی افعال کو ابتدائی تصور کرتا ہے، مرکزی اعصابی افعال اور شعوری واعلیٰ افعال کو ثانوی افعال تصور کرتا ہے۔ اس طرح ہڈسن، ریورز اور ہیڈ سے لیکر جوزف جاسٹرو بلکہ مَن (MUNN) اور گارڈنر مرفی تک نے جنس کی مرکزیت کا سدّباب کر دیا ہے۔

پھر بھی لاشعور کی تومندی کے یہ سب قائل ہیں اور دماغ کے تنقیدی یا میزاتی حصہ کو ابتدائی اور حیوانی حصہ بلکہ فرائڈ کے الفاظ میں "لاشعور" کا ترقی یافتہ درجہ مانتے ہیں۔ مگر اب ہم اسے بھی نظرِ قبولیت سے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اس کے معنی صاف الفاظ میں یہ ہوئے کہ نفس انسانی مُسرّت پرست ہے۔

اس لئے ہم ریورز اور جاسٹرو کی تقسیم سے اتفاق تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی تشریح سے نہیں۔ دماغ کا یقیناً ایک اعلیٰ ترین حصہ ہے جو اعلیٰ ترین افعال و شعور کا مسکن ہے۔ مثلاً فکر، استدلال، گفتگو وغیرہ اور دوسرا خود اختیاری اعصابی و لاشعوری افعال کا مثلاً اعضاء و اعصاب کی حرکت اور ان کا فعل وغیرہ۔ اسے حیوانی جُز کہنا برا نہ ہوگا کیونکہ حیوانی سے ہماری مراد ذی حیات (LIVING ORGANISM) ہے۔ قدرت نے ہمیں ان دونوں سے آراستہ کیا ہے۔ ابتدائی اور حیوانی جُز میں نفس امّارہ بھی شامل ہے لیکن اعلیٰ دماغ میں اس کا گذر نہیں۔ اعلیٰ دماغ سرتاپا تعمیری ہے۔ وہ انسان کے ہر فعل میں احسن پہلو تلاش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اگر ان قبائل پر بھی تجربات کئے جائیں جو صحراؤں میں تاریک زندگی گذار رہے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ اُن کا ہر فعل نادانستہ (اور ان کے نفس کے لحاظ سے دانستہ) تعمیر اور ترقی و تحفظ کے لئے ہوتا ہے یوں ہم آسانی سے اخذ کر سکتے ہیں کہ اعلیٰ دماغ حیوانی و ابتدائی دماغ کا کوئی جُز اور اس کا پروردہ نہیں ہے۔ اگر ہمارے تجربات اس روشنی میں ہوں تو یقیناً حوصلہ افزا نتائج مہیا ہو سکتے ہیں۔ حیوانی و ابتدائی دماغ خود اپنا وجود رکھتا ہے جو ادنیٰ اعصابی افعال کے ساتھ نفس امّارہ کو بھی ابھارتا رہتا ہے ہمارے خیال میں اسے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ ارتفاع (SUBLIMATE) کیا جا سکتا ہے۔ اس کا امتناع (REPESSION) تجربات کے لحاظ سے پسندیدہ نہیں، کیونکہ مختلف ذہنی بیماریاں پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے، اسی وجہ سے جب بھی زندگی میں یہ موقع پاتا ہے عود کر آتا ہے۔

فرائڈ کے تخمینہ کے برخلاف حیوانی و ابتدائی دماغ نہ اعلیٰ دماغ سے قوی ہے اور نہ تناسب میں اس سے فروتر ہے بلکہ یہ فرد کے مخصوص نشو و نما پر منحصر ہے۔ اگر وہ ایسے ماحول[2] اور والدین میں پرورش پاتا ہے جو حیوانی دماغ کی چارہ گری کے بھی نشانہ ہو جاتے ہیں تو اعلیٰ دماغ درحقیقت اپنی پوری پرورش نہ پا سکے گا۔ اور اسی طرح حیوانی دماغ کے ساتھ اس کے برخلاف ماحول میں ہوگا۔

---

[1] ریورز اور ہیڈ کا مذکورہ تجربہ نیوراتی نظام ہی پر کیا گیا تھا۔ اس طرح حسی حرکی میکانیت اس معروضہ کی کافی حد تک معاون ہے۔ [2] جس طرح ماحول نشو و نما اور تربیت میں ایک ناگزیر چیز ہے، اُسی طرح یہ ناقابل تسخیر بھی نہیں ہے جیسا کہ موجودہ نفسیات میں تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تسخیر کے بغیر کوئی عظیم ہستی وجود میں نہیں آسکتی۔

یہ تجربات ایسے افراد پر کئے جا سکتے ہیں جو بالکل ناکتخدا ہیں۔ اُن میں ہم اعلیٰ دماغ کی کارفرمائیوں کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ آخر کیوں؟ ---- اور یہ بھی کہ وہاں حیوانی دماغ ہی کیوں حاوی رہتا ہے ----؟ ہمارے خیال میں حیوانی دماغ کسی ماحول اور تربیت کا محتاج نہیں کیونکہ اس کے معتدبہ افعال خود اختیاری ہوتے ہیں۔ ادراک کی ترقی یافتہ شکلیں (HIT AND MISS) کے انداز کی ہوتی ہیں۔ مگر اعلیٰ دماغ فطری ہونے کے باوجود بھی تربیت کا محتاج ہے کیونکہ اس کے افعال پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے زیادہ تر بغیر کسی تربیت کے وجود میں نہیں آ سکتے۔ مثلاً زبان و گفتگو، فکر، احساس اور صواب و ناصواب وغیرہ۔ اعلیٰ دماغ کے افعال کی پیچیدگی ہی نے مغرب کے اہلِ نفسیات کو کچھ بے راہ روانہ اندازے لگانے پر مجبور کر دیا۔

اعلیٰ دماغ کے افعال اور حیوانی دماغ کے افعال میں فصل کے لئے فطرت نے انسان کو قوتِ تمیز بھی دی ہے جسے فرائڈ نے محتسب تصور کیا ہے۔ یہی قوتِ تمیز ہر جگہ انسان کی رہنمائی کرتی ہے نہ کہ اس کے لاشعوری افعال کو فراری انداز میں ممتنع (REPRESS) کرتی ہے۔ یہ لاشعور کی معیوب خواہشات کو لاشعور میں واپس نہیں بھیجتی بلکہ اُسے بے آسرا چھوڑ کر اعلیٰ دماغی افعال کی طرف راجع کر کے اعلیٰ دماغ کو تنومند کرتی ہے۔

حیوانی دماغ اور اعلیٰ دماغ، اور قوتِ تمیز کے بارے میں ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ہمیں اس کا احساس ہے کہ ابھی یہ مفروضہ اپنے ابتدائی مراحل میں ہے شاید تجرباتی پیش قدمی کے بعد ضروری تحریف و ترمیم اسے روشن ترین نظریہ بنا دے۔ اس کے باوجود بھی فرائڈ کے نظریۂ شعور و لاشعور کا سحر خود مغربی ماہرین نفسیات ہی نے توڑ دیا ہے اور اس میں جنس ایک بے وجہ حاشیہ آرائی ثابت ہو چکی ہے کیونکہ دماغ کی موجودہ تشریح کے مطابق جنس کا صرف اُسی وقت اظہار ہوتا ہے جب حیوانی دماغ اس کو مستقلاً پرورش دیتا رہا ہو۔ یا وہ اس حد تک پہونچ گئی ہو کہ دماغی ابتری پیدا ہو جائے اور اعلیٰ دماغ اور قوتِ تمیز اس کے سیلِ بے پناہ کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے۔

انعام الرحمٰن خاں

اقبال کیا تھا؟

ڈاکٹر اقبال پر جب گفتگو کی جائے تو ان کے متعلق دو سوالات پہلے سامنے آتے ہیں ایک تو یہ کہ مختلف بلکہ متضاد طرز نظر کے حاملین ان کو اپنا ہم خیال بتلاتے ہیں اور اپنے نظریہ کی تائید میں ان کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ حقیقتاً اُن کا نظریہ کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ جو قبول عام اور عظمت ان کو حاصل ہوئی کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ حتیٰ کہ ان کے نام سے ادب و فلسفہ کی ایک مستقل صنف منسوب ہوگئی۔ فردوسیات وسعدیات یا غالبیات و داغیات کے نام سے ادب کی کوئی صنف نہیں ہے لیکن اقبالیات کے نام سے ایک صنف موجود ہے آخر ان کی اس عظمت کا راز کس چیز میں پوشیدہ ہے؟ . . . . ان ہی دو چیزوں کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

بعض لوگ ان کو وطن کے پجاری کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں بعض ان کو مسلم قوم پرستی کا نمائندہ جانتے ہیں۔ بعض اشتراکیت کے حق میں ان کے کلام سے استدلال کرتے ہیں کسی کو ان کے کلام میں محض فلسفہ ملتا ہے اور کسی کو محض تصوف کوئی ان کو جمہوریت کا حامی بتلاتا ہے اور کوئی مخالف۔ بعض کی نظر میں وہ انسانیت و آفاقیت کے علمبردار ہیں اور کچھ لوگ ان کو اسلام کا ترجمان سمجھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں ان سب لوگوں کی تائید میں مواد ملتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لئے اقبال کو اپنا ہم خیال سمجھنے کی ایک حد تک گنجائش موجود ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض لوگ اقبال کی مقبولیت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں لیکن اکثر لوگ دیانتداری سے اقبال کو اپنے ہی خیالات کا ترجمان سمجھتے ہیں میرے خیال میں اقبال کچھ نہیں تھا صرف شاعر اسلام ـــــــ شاعر مسلمان نہیں شاعر اسلام ـــــــ تھا۔ لیکن اس کو سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ اسلام کو نہ سمجھ لیا جائے۔ یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ اس زمانہ میں مختلف اسباب کی وجہ سے اسلام کو اس کے پورے جمال و کمال کے ساتھ دیکھنے اور سمجھنے والے غیر مسلموں میں تو کیا خود مسلمانوں میں مفقود ہیں۔

ایک ہی شخص کے کلام میں جب لوگوں کو وطنیت اور آفاقیت قوم پرستی اور اصول پسندی کہیں ایک چیز کی حمایت اور کہیں اس کی مخالفت ساتھ ساتھ نظر آتی ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان متضاد چیزوں میں باہم کس طرح تطبیق دیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسلام کو ایک قوم کا مذہب اور وہ بھی پرائیویٹ زندگی تک محدود مذہب . . . . سمجھا جاتا ہے۔ اگر اسلام کا صحیح اور ہمہ گیر تصور ان کے سامنے ہوتا تو یہ سیدھی سی بات سمجھ لینے میں ان کو قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ اقبال کے کلام میں جو وسعت و ہمہ گیری پائی جاتی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی شاعر تھا۔ یہ بات کس طرح ان کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتی کہ اسلام کا تعلق بھی انسانیت اور آفاقیت سے ہوسکتا ہے۔ اور واقعی اسلام اگر محض ایک قوم کا مذہب اور تمام مفہوم میں ایک محدود مذہب ہے تو ساری دنیا کی فلاح و نجات سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے لیکن اگر اس کو پوری انسانیت کے لئے ایک پیغام حیات کی حیثیت سے جیسا کہ واقعتہً وہ ہے دیکھئے تو یہ مشکل سرے سے پیش ہی نہیں آئے گی۔

دراصل اقبال کے کلام میں مندرجۂ بالا خصوصیات ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مسلمان تو یقیناً تھے اور ان کی شاعری ان سے زیادہ مسلمان تھی۔ لیکن انہوں نے اسلام کو اپنے آباؤ اجداد کی میراث سمجھکر نہیں رکھ چھوڑا تھا بلکہ ایک خداترس فطرت کے ساتھ اس کی صداقت و حقانیت کو جانچا اور پرکھا تھا۔ اس کی صحت پر ان کی عقل گواہ تھی اور اس کے فطری اور خدائی ہونے پر ان کے دل کا ریشہ ریشہ شاہد تھا یہ ایک مزید فضل تھا کہ وہی مذہب ان کے آباؤ اجداد کا بھی تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس لئے نہیں لگ گئے تھے کہ باپ دادا کی عصبیت میں گرفتار تھے ـــــ یہی وجہ ہے ان کے خیالات میں تدریجی ارتقاء ہونے کی۔ وہ وطنیت، قومیت اور ایشیائیت غرض ہر منزل پر تھوڑی دیر کے لئے رُکے اور ان میں سے ہر ایک کی چمک دیکھکر ان کے دل نے ہٰذا ربّی پکارا لیکن چونکہ ذہن و نظر کی صفائی ان کو حاصل تھی اس لئے ان میں سے ہر ایک پر سے لا احب الآفلین کہتے ہوئے گذر گئے۔ اسی لئے ایک وقت تو ان کو خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آتا ہے لیکن آخر میں ماننا پڑتا ہے کہ ع ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں ان کا یہ ذہنی ارتقا مسلّم ہے میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ان کے ذہن میں دوسرے ذہنوں کی طرح ارتقا نہیں ہوا ہے کہ ایک ہی رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے بلکہ یہ وہ مراحل تھے جو ہر جویائے حق کو تلاشِ حق کے سفر میں پیش آتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی اسلام کے علمبردار نہیں تھے۔ نہ اس اسلام کے علمبردار تھے جس میں ملا کو اگر سجدہ کی اجازت ہو تو وہ نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد۔ بلکہ اس اسلام کے علمبردار تھے جو کسی زمانے، کسی قوم، اور کسی ملک کی حدود میں مقید ہونے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ ہر زمانے کے لئے ہے۔ پوری انسانیت کے لئے ہے۔ اور انسانیت کے تمام مسائل کو حل کرتا ہے۔ وہ قومیت کو تسلیم کرتا ہے۔ قومی محبت خود سکھاتا ہے لیکن اس کو بت بنا کر قوم پرستی کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ وہ وطنیت کا بھی دشمن نہیں ہے بلکہ حبُّ الوطنی کو پسند کرتا ہے لیکن وطن کو خدا کا مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ ملوکیت کا دشمن اور جمہوریت کا حامی ہے لیکن ایسی بے قید جمہوریت کو فتنہ سمجھتا ہے جس میں جمہور ہی اندھا بن جائیں۔ وہ تمدنی، معاشرتی، معاشی ہر قسم کی مساوات چاہتا ہے بلکہ دنیا کو سب سے پہلے اس نے مساوات کا سبق دیا لیکن وہ فطری و حقیقی مساوات چاہتا ہے جس میں ہر شخص کو ترقی کے مواقع یکساں حاصل ہوں مصنوعی مساوات کو وہ فطرت انسانی کے خلاف جنگ سمجھتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلام کے اندر وہ تمام چیزیں ایک متوازن شکل میں موجود ہیں جو ایک انسان کے لئے انفرادی طور پر اور ہر قوم اور پوری انسانیت کے لئے مجموعی طور پر مفید و ضروری ہیں۔

اقبال چونکہ اسلام کا علمبردار ہے اس لئے اس کے یہاں یہ تمام چیزیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر وہ زور دیتا ہے لیکن اتنا ہی جتنا زور دینے کی اسلام اس کو اجازت دیتا ہے ان میں سے کسی ایک کو مرکز نہیں بناتا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ وطنیت کا بھی حامی ہے لیکن وطن پرستی کا نہیں بلکہ حبُّ الوطنی کا۔ وہ قومیت کا بھی دلدادہ ہے لیکن قوم پرستی کا نہیں جو دوسری قوموں کے لئے عذاب بن جاتی ہے بلکہ قومی محبت کا دلدادہ ہے جو دوسری قوموں سے بھی نفرت نہیں سکھاتی۔ وہ جمہوریت کو بھی پسند کرتا ہے لیکن اس جمہوریت کو جو اسلام نے سکھائی ہے۔ بے شک وہ آفاقیت کا علمبردار ہے۔ قومیت، وطنیت اور رنگ و نسل کے بندھنوں کو توڑ کر پوری دنیا کو چشم جہاں بیں سے دیکھتا ہے۔ پوری انسانیت کی خودی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ تمام انسانی برادری کو شاہین بننے کی دعوت دیتا ہے لیکن اسی چیز کا نام تو اسلام ہے۔ . . . . لفظ اسلام سے لوگوں کو اگر کد ہے تو خیر۔ دوسرا نام اس دین کا ہے فقر غیور۔ یقیناً وہ مساوات چاہتا ہے لیکن خدا [illegible] مساوات نہیں بندگی میں مساوات یعنی وہ چاہتا ہے کہ تمام انسان یکساں خدا کے بندے بن کر رہیں۔ یہ نہیں چاہتا کہ سب یکساں شتر بے مہار بن جائیں۔

زمانے کی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ اسلام جو مساوات کا تنہا داعی ہے اس کا ترجمان جب مساوات کا ذکر کرتا ہے تو لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ اسلام کا نہیں اشتراکیت کا حامی ہے۔ گویا یہ چیز طے شدہ ہے کہ اسلام تو اگلے زمانے کی ایک مقدس یادگار ہے۔ مساوات جیسی اعلیٰ چیزوں سے اس کا کیا تعلق۔ یہ شخص جو اس قسم کی باتیں کر رہا ہے ہو نہ ہو اس نے یہ سبق اس مہذب اور ترقی یافتہ زمانے کی اشتراکیت ہی سے سیکھا ہے۔

یہ ہے اقبال کے نظریہ اور اس کے کلام کا پس منظر۔ اقبال کے پیغام پر غور کرتے [illegible] جائے تو طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوں گی کوئی تو اس کے کلام میں تضاد پا کر اس پر اعتراض کرنے لگے گا اور کسی کو اس کی طرف سے معذرت کرنا پڑے گی۔

یہ مشکل اسی وجہ سے پیش آئی ہے کہ اسلام بے شمار غلط فہمیوں کے پردوں میں چھپ گیا ہے۔ اسلام کا نام آتے ہی ملائی تنگ نظری مسلمان بادشاہوں کی ملک گیری، اور مسلمان امراء کی ہوسناکی کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ روادار اور کام کوئی قدر کی نگاہ سے دیکھتا بھی ہے تو اس کو ایک قوم کا مذہب سمجھ لیتا ہے۔ اس صورت میں جب آدمی غور کرے گا تو اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہے کہ اسلام ممکن ہے ایک اچھا مذہب ہو لیکن اس کو عالمی مسائل سے کیا تعلق۔ اس تصور کے ساتھ جب وہ ایک شخص کے کلام میں اسلام اور مرد مومن وغیرہ الفاظ دیکھے گا تو اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہے کہ یہ بھی بس مسلمان کی لن ترانی ہے۔

جب قرآن مجید کی تلاوت قرأت کے ساتھ طلب ہدایت کے لئے نہیں محض ثواب کی خاطر کی جاتی ہو تو یہ راز کس طرح لوگوں کو معلوم ہو سکتا ہے کہ مومن۔ قاری نظر آتا ہے۔ حقیقت میں ہے قرآن۔

جب خود حاملین قرآن نے اس جہان بے ثبات کو اوروں کی خاطر چھوڑ کر غلامی پر قناعت کر لی ہو۔ قرآن کو غلامی کا کامیاب نسخہ جانتے ہوں۔ اس سے غلامی میں ترقی کے لئے تعویذ حاصل کرتے ہوں ایسی حالت میں جب ان کو قرآن کا اصل انقلابی پیغام سنایا جائے گا تو ان کو شرکیہ ہوتا ہی چاہے کہ یہ کتاب سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق۔

اسلام کی اس حقیقت کو سامنے [illegible] اپنے اپنے مقام پر نصب [illegible] بھی آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہ کچھ نہیں [illegible]

اتنا ہی نہیں بلکہ اس سوال کا جواب بھی اس میں مل جائے گا کہ اقبال کو کیوں یہ قبول عام حاصل ہوا اور کیوں اس کی عظمت دلوں پر اس قدر چھا گئی کہ اکثر لوگ اس سے اپنے خیالات کا سلسلۂ نسب جوڑتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کے سایہ میں بیٹھکر اپنے خیالات اس کے نام سے پیش کرتے ہیں اور یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے کہ اقبال خواہ کچھ بھی کہتا ہو اور کچھ بھی نظریہ رکھتا ہو ہم یہ کہتے ہیں اور ہمارا نظریہ یہ ہے جس کو ہم حق جانتے ہیں۔

اسلام جو تحفہ انسانیت کو دیتا ہے اس کے نتیجہ میں انسان کے اندر ساری کائنات پر چھا جانے والی نگاہ اور پوری دنیا سے محبت کرنے والا دل حاصل ہوتا ہے۔ حوصلہ میں فراخی اور ہمت میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ نظر کی پاکی اور روح کی صفائی میسر آتی ہے۔ ذہن و نفس میں انضباط اور فکر میں آزادی نصیب ہوتی ہے۔ سوئی ہوئی خودی بیدار ہوتی ہے اور اُبھری ہوئی خود پسندی دب جاتی ہے۔ یقین محکم کی دولت عمل پیہم کی طاقت کا وہ مالک بن جاتا ہے، محبت کی وہ شمشیر اس کے قبضہ میں آجاتی ہے جو فاتح عالم ہے۔ وہ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان بن جاتا ہے۔ اس کے ارادے قدرت کے مقاصد کا معیار بن جاتے ہیں اور وہ خود افکار و مقاصد کی میزان بن جاتا ہے۔

اگرچہ اقبال کے کلام میں اس آفتاب ہدایت کا پورا عکس نہیں آیا ہے۔ پھر بھی اس کی چمک کا یہ عالم ہے کہ آنکھیں خیرہ ہوتی جاتی ہیں اور اس بات کی تحقیق جاری ہے کہ یہ چمک کس چیز کی ہے۔

یہ ہے اقبال کی عظمت و مقبولیت کا راز، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ایک شخص کے اندر نور اسلام کے صرف ایک پرتو سے ایسی عظمت پیدا ہو سکتی ہے تو اس سوسائٹی کی طاقت و جبروت اور مقبولیت، و محبوبیت کا کیا عالم ہوگا جو اس روشنی سے پورے طور پر منور ہو جائے۔ کیا اس کی موجودگی میں دنیا کی امامت کا حق کسی اور کو ہو سکتا ہے۔ وایسی ایک جماعت کو جسے یہ دولت میسر آجاتے چاہیے امامت و قیادت کی ضرورت نہ ہو لیکن امامت و قیادت کو خود اس کی ضرورت ہوگی ——— لیکن افسوس۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اقبال کی اور اقبال سے زیادہ اس کے مخاطبین کی بدقسمتی کہ اس کے پیغام کے وہ صرف دو جواب دے سکے، یا تو ایک طرف شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے گھکو۔ کی آواز سن کر اس کی شکایت کرنے لگے اور اس کو بے دین سمجھ لیا۔ یا دوسری طرف اپنے قومی فخر و غرور کے بت خانے میں اقبال نام کا ایک اور بت بٹھا لیا گیا تاکہ دوسرے اس کے اس عام پیغام کو بھی اپنا حریف سمجھ لیں۔ خدا اسلام کو اس کے ان طرفداروں سے اور اقبال کو اس کے ان حامیوں سے بچائے۔ وہ خود اپنے ان قدر دانوں سے شکایت کرتا ہے ؎

بے خبر بیتابی جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید۔

تاج الفرقان عثمانی

دیباچۂ سحر

(۱)

نمودِ شب بھی تو دیباچۂ سحر ہے جناب ۔۔۔ یہ ہولناک سیاہی سے خوف بے جا ہے
طلوعِ مہر سے کافور ہو گی جب ظلمت ۔۔۔ پتہ چلے گا کہ ہم میں سے کون کیسا ہے

(۲)

ابھی تو تیرگیٔ شب کے سب ہی شاکی ہیں ۔۔۔ بجا ہے گلشنِ ہستی میں چل رہی ہے سموم
مگر ہمارا زمانہ بھی آنے دے ساقی ۔۔۔ مہک اٹھے گا چمن مسکرا اٹھیں گے نجوم

(۳)

فریب خوردہ رہے آج تک عوام غریب ۔۔۔ خودی کا اُن کے خیالوں میں بھی گذر نہ ہوا
خیالِ عزّت و جاہ و حشم تو کیا آتا ۔۔۔ سکوں سے ایک بھی لمحہ کبھی بسر نہ ہوا

(۴)

نوائے وقت سے جاگے ہوئے غریب عوام ۔۔۔ مزید اپنی تباہی پہ ہنس نہیں سکتے
نکل کے اِن زر و جاگیر کے شکنجوں سے ۔۔۔ وہ اب نئے کسی پھندے میں پھنس نہیں سکتے

(۵)

خیال و ذہن میں لرزاں ہیں آتشیں نغمے ۔۔۔ رباب و چنگ سے ایسے میں کون کھیلے گا
زمانہ تنگ ہے انسان کی خدائی سے ۔۔۔ بس اور رنج و الم اب کوئی نہ جھیلے گا

(۶)

کبھی وہ وقت بھی آئے گا ایک دن جب ہم ۔۔۔ رخِ حیات کی رنگت نکھار ڈالیں گے
گلے سے بندگیٔ ما سوا کا طوق اے دوست ۔۔۔ خدا نے چاہا تو اک دن اُتار ڈالیں گے

محمود عالم

دریچوں کے باہر

مرے پیشواؤ مقدس بزرگو
گنہگار دھرتی کے روشن منارو
حریم تقدّس کے خلوت گزینو
ذرا جھانک کر ان دریچوں سے دیکھو

یہ جلتے ہوئے باغ و گلزار دیکھو
یہ اُجڑے نشیمن کے انبار دیکھو
یہ جُھلسے ہوئے پُھول افسردہ غنچے
یہ منظر ہے کتنا دل آزار دیکھو

مقدس بزرگو مرے پیشواؤ ——
دریچوں سے باہر بھی اِکبار دیکھو

یہ جیون کے ماتھے پہ افشاں لہو کی
خیالوں پہ چھائی ہوئی مُردنی سی
اُمیدوں کے لاشے اُمنگوں کے مدفن
دلوں پر مسلّط جہانِ خموشی

مرے پیشواؤ مقدّس بزرگو ——
حریم تقدس کی رخشندہ رُو ہو

ذرا جھانک کر ان دریچوں سے دیکھو
ذرا زندگی سے بھی آنکھیں ملاؤ
سسکتی لرزتی ہوئی زندگی سے
اندھیروں میں ڈوبی ہوئی زندگی سے
لہو میں نہائی ہوئی زندگی سے
مرے پیشواؤ مقدس بزرگو
ادھر بھی کبھی اک ذرا مڑ کے دیکھو
ذرا کچھ بتاؤ ـــــ

بتاؤ کہ یہ زندگی یونہی مجروح و مقہور و مغموم کب تک رہے گی
اندھیروں میں کب تک بھٹکتی رہے گی اسی طرح مظلوم کب تک رہے گی
فضا یونہی مسموم کب تک رہے گی
امید سحر یوں دلوں میں مثال تمنائے موہوم کب تک رہے گی
مرے پیشواؤ یہ اولادِ آدم اجالوں سے محروم کب تک رہے گی
بتاؤ بتاؤ خدا را بتاؤ
مرے پیشواؤ مقدس بزرگو
حدیثِ غمِ زیست کے رازدارو....

ابوالعرفان مظاہری

بے آگہی

(۱)

ہوا مجھ سے رخصت وہ معصوم بچپن وہ خوابوں کی محفل خیالوں کا گلشن
یہ نظریں ہیں کیوں آج طوفاں بداماں یہ کیوں تیز تر ہے مرے دل کی دھڑکن
یہ ہیجان کیسا بپا ہو رہا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے؟

ہوا ہوں نئی ایک محفل میں داخل بنایا گیا ہوں نئی شے کا حامل
تلاطم پسند اک طبیعت پہ مائل بغاوت مزاج اک ارادہ کا قائل
شعور آج شاید جواں ہو رہا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے؟

یہ رونق ہے کیسی بتا پارکوں میں سیناؤں، کلبوں میں اور کالجوں میں
دھمک کیوں ہے پازیب میں پائلوں میں چمک ہے یہ کیسی نئی ساڑھیوں میں
یہ نشہ سا کیوں مجھ پہ چھانے لگا ہے؟
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے؟

یہ ہموار بازو، یہ بیتاب سینے یہ دبتے ابھرتے چھلکتے سفینے
یہ زلفِ سیہ، یہ نظر کے قرینے یہ رنگیں تبسم، درخشاں نگینے
جدھر دیکھئے اِک قیامت بپا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے

(۲)

اُدھر کائناتی حوادث کا منظر   اِدھر اپنے ہاتھوں بپا ایک محشر
کشاکش، تصادم، تعصب سراسر   یہ پھوڑے، یہ ٹیسیں، یہ بیرحم نشتر

مصیبت میں انسانیت مبتلا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے

یہ تقسیم آدم یہ قومی اکھاڑے   یہ طبقوں کی ٹکر یہ خونی تماشے
یہ تہذیب و عمراں کے بے رُوح ڈھانچے   یہ تقدیس آدم کے ننگے جنازے

یہ کیوں ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے

یہ فرقے، یہ طبقے یہ دولت یہ غربت   یہ خواہش یہ روٹی یہ اُجرت یہ محنت
یہ مفلوج ایماں یہ پژمُردہ غیرت   یہ مجبور عزت یہ پامال عصمت

یہ کیوں ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے

عدالت ہے لیکن دیانت نہیں ہے   سیاست ہے برپا، امانت نہیں ہے
کرامت کے چرچے، ہدایت نہیں ہے   رفاقت کے دعوے، صداقت نہیں ہے

غرض ہر طرف جُھوٹ پھیلا ہوا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے

نظر مطمئن ہے نہ دل شادماں ہے   خودی اور خود اعتمادی کہاں ہے
رواں اِک مسافر جو بے کارواں ہے   بلاسمت و منزل ہر اِک سو دواں ہے

یہ "بے آگہی" ہے کوئی کہہ رہا ہے
بتا زندگی اب مرا فرض کیا ہے

سہیل زیدی

ضمیر

یوں بھی ہو جاتا ہے اکثر، یہ کوئی بات نہیں
خود کو سمجھاتا ہوں ایسے ہی حوالے دے کر
یہ جوانی کا تقاضہ تھا یہ تھی وقت کی بات
دل کو بہلاتا ہوں، معصوم دلاسے دے کر

یہ کتابیں، یہ ترقی زدہ افکارِ حیات
تجربوں کی طرف انمول اشارے ہی تو ہیں
سرِ بازار حسینوں کے یہ بے باک ہجوم
ایک رنگین سی خلوت کے بلاوے ہی تو ہیں

اک مزے دار سی لغزش کی تمنا کے سوا
اِن حسیں مرمریں باہوں کا سہارا کیا ہے
کھینچتی ہیں جو ہر اِک گام پہ ہر راہی کو
آخر ان شوخ نگاہوں کا تقاضا کیا ہے

وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے دُنیا کا نظام
پھر یہ بندش یہ قوانین ہی دائم کیوں ہیں
پاکی و عصمت و عفت کی پُرانی قدریں
اس نئے دور نئے عہد میں قائم کیوں ہیں

میں خطاکار گنہگار نہیں ہوں لیکن
میرے احساس پہ لعنت سی برستی کیوں ہے
یہ جوانی کا تقاضہ تھا یہ تھی وقت کی بات
بات ناگن کی طرح پھر مجھے ڈستی کیوں ہے

فلسفہ کی نئی تعبیر گنہ کے با وصف
عین فطرت ہو ندامت کہیں ایسا تو نہیں
یہی قدریں جنہیں میں وہم سمجھ بیٹھا ہوں
اصل میں ہوں یہ حقیقت کہیں ایسا تو نہیں

شارق میرٹھی، ایم۔ اے

رباعیات

ہم لوگ

افسردہ حیات کی ادا ہیں ہم لوگ ٹوٹے ہوئے دل کا مدعا ہیں ہم لوگ
یہ خون، یہ آگ، یہ ہلاکت خیزی آندھی کے حضور اک دیا ہیں ہم لوگ

شعلہ و شبنم

شعلوں کا نمی سے کام لینا ہو گا کانٹوں کا کلی سے کام لینا ہو گا
ہشیار کہ رزم گاہِ ہستی میں تجھے! غنچہ کا ہنسی سے کام لینا ہو گا

سہارا

دیتے ہوں پناہ گر کنارے تو نہ لے دیتے ہوں ضیا اگر ستارے تو نہ لے
ٹوٹے ہوئے دل کے اِک سہارے کے حضور ملتے ہوں اگر لاکھ سہارے تو نہ لے

صبحِ نو

تاریک حیاتِ مختصر ہے تو کیا بے نورِ تبسمِ شرر ہے تو کیا
چمکے گا فلک پہ دورِ حق کا خورشید محرومِ ضیا ابھی سحر ہے تو کیا

متین طارق باغپتی

بیسویں صدی کا بجٹ

یہ بیسویں صدی ہے بہت لمبی، بہت چوڑی شاید جب یہ شروع ہوئی تھی تو لوگوں کو گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ ربڑ کی طرح بڑھتی چلی جائے گی اور اس پر نظر ڈالنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ آبادی اتنی کثیر ہو جائے گی کہ غلے کی کمی کو مونگ پھلی کے آٹے اور جنگلی بیروں سے پورا کرنا پڑے گا نیز کثرت کو نقطۂ اعتدال پر لانے کیلئے برتھ کنٹرول کی نوبت آجائے گی جگہ جگہ ایٹم بم گرانے کی ضرورت ہوگی اور عورتوں کو مرد بنانا ضروری سمجھا جانے لگے گا۔

یوں تو یہ باتیں آپ کو کچھ الٹی الٹی سی معلوم ہو رہی ہوں گی مگر حقیقت میں سیدھی ہیں اگر سیدھی سیدھی طرح سمجھ لیا جائے۔ بات یہ ہے کہ کل کے نظریے آج بدل گئے ہیں جو چیزیں پہلے اچھی سمجھی جاتی تھیں آج متروک ہیں جو متروک تھیں وہ سوسائٹی کا جزو ہیں جیسے پہلے چراغ تلے اندھیرا رہتا تھا اب اس کے خلاف اوپر ہوتا ہے یا پہلے گھی سے سبزی بنتی تھی اب سبزی سے گھی بنتا ہے یعنی اب ہرن کے اوپر گھاس لادی جا سکتی ہے کوتے ہنس کے پر لگا کر اونچے اڑ سکتے ہیں۔ الٹی ندی پہاڑ کو بہا سکتی ہے نیز عورتیں مرد بن سکتی ہیں اور مرد عورت۔

یا مثلاً ہمیشہ سے یہ اصول چلا آرہا تھا کہ جیسا راجہ ویسی پرجا مگر اب یہ بالکل الٹ گیا ہے یعنی اب جیسی پرجا ویسا راجہ ہوتا ہے گویا پرجا ہی دوسرے معنی میں راجہ ہے وہ جو چاہے سو کرے سفید یا سیاہ یہی وجہ ہے کہ پہلے چونکہ راجہ ایک سر کا ہوتا تھا اس کی داد عیش کے ذرائع اور اثرات مختصر و محدود ہوتے تھے لیکن اب راجہ سینکڑوں سر کا ہے اس لئے قدم بہ قدم، کوبکو، خانہ بخانہ، قحبہ خانے اور شراب خانے قائم ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اس صدی نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ یہ اتنا ہی ٹھیک ہے، جیسے چرچل کا رجعت پسند ہونا یعنی اگر سب سے پہلا انسان ننگا رہتا تھا تو آج بھی ترقی یافتہ ممالک میں ننگے کلب قائم کئے جا رہے ہیں شروع زمانے میں عورت مرد کے ساتھ مل جل کر کام کرتی تھی یوں ہی اب وہ گھروں سے نکل کر بازاروں، دفتروں اور بھٹیوں کی آگ کے سامنے ننگی کا ناچ ناچ رہی ہے کہ مرد سے پھسڈی نہ رہ جائے رہا بچوں کا سوال تو اول تو اب اس کی ضرورت ہی نہیں کہ بچے پیدا ہوں اور اگر اتفاقی حادثات پیش بھی آجائیں تو اُس کے لئے نرسری ہاؤس کافی ہیں جہاں بچہ رہے گا، پلے گا، بڑھے گا ماں کو نہ دودھ پلانے کی زحمت نہ پاس سونے کی نہ ہی ٹھیک زندگی کیلئے کیک، مصنوعی دائی اور کپڑوں کی ضرورت ہے نہ کہ ممتا کی اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہر بچے کو نرسری کے لاتعداد بچوں کے استعمال شدہ کپڑے ملیں گے، کریم نکلا دودھ بھی مل جائے گا رہنے کے لئے لمبا چوڑا باڑہ بھی ہوگا مگر ماں کی چھاتیوں کا دودھ نہیں مل سکے گا اُس کی گود میں گرمائی نہیں مل سکتی بس بھیڑ بکریوں کی طرح باڑے کی چہار دیواری کے اندر پلو بڑھو اور جوان ہو کر غول انسانی میں مل جاؤ۔

مخلوط تعلیم کا رواج بڑھتا جاتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک جگہ پڑھتے اور مل جل کر پروان چڑھتے اور کھلی چھپی صحبتوں میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ جس سے عورت مرد کے بیچ کی خلیج ختم ہوتی جا رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اب عام طور سے لوگ شادی کرنے کے خلاف ہیں کہ یہ عورت کے لئے پابجولانی اور مرد کی حکمرانی ہے پھر جس چیز کو آزادی کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے اُس کے لئے اہتمام کی ضرورت بھی کیا، چنانچہ اب گانا بجانا نہیں ہوتا، لال خط نہیں لکھے جاتے، مجلسیں نہیں جمتیں، پکوان نہیں چلتے بلکہ راہ چلتے چلتے شادیاں ہو جاتی ہیں اور گھر پہنچتے پہنچتے لوٹ پھیر بھی ہو جاتی ہے۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ اب مجنوں کم بنتے ہیں، فرہاد کم سر پھوڑتے ہیں آئے دن کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غم جاناں غم روزگار سے بدل گیا ہے یعنی اب آدمی کھوتا کم اور کماتا زیادہ ہے کام ہے تو پیام ہے نہیں تو دور ہی سے سلام ہے غضب خدا کا ہمسایہ ہمسائے کو نہیں پہچانتا پہچانیں بھی کہاں سے آبادی اچھی خاصی کھچڑی ہے بالکل بھان متی کا سا کنبہ بھانت بھانت کی بولیاں الگ الگ وضع قطع معاش کے تقاضوں نے ایک جگہ سے اکھاڑا

دوسری جگہ لا بسایا وہاں جی گھبرایا تو پارک اور قدم قدم پر ہوٹل موجود۔ بیمار پڑیے تو نرسیں تیمارداری کے لئے کھٹ پٹ کرتی حاضر اور اگر مر جائیے تو ماہران کفن دفن اینڈ سنز ٹیلی فون نمبر فلاں کی خدمات چند روپیہ میں حاصل نہ رونے والوں کی ضرورت نہ مرثیہ خوانوں کی۔ بس وصیت ہو اور چیک بک تمام کام اس خوبی سے ہو جائے گا جیسے آپ کی زندگی میں ہوتا۔

اسی لئے اب کسی کے مرنے پر کفِ افسوس نہیں ملے جاتے کیونکہ دنیا کے جو مزے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آتا، کوئی کام بند نہیں ہوتا اور اگر خدانخواستہ ساری دنیا کے آدمی بھی خودکشی کرلیں تو یہاں کے چرچے جوں کے توں رہینگے۔ کیونکہ اس کی جگہ کام کرنے کے لئے مشینیں موجود ہیں کارخانے جاری ہیں۔ گو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات، نیز نئے نئے ہیروشیما بنتے چلے جا رہے ہیں . . . . .

پھر بھی مشینوں کی سُودمندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کون نہیں جانتا آج ہر طرف نقلی گھی، مصنوعی ریشم، رولڈ گولڈ سونا اور مسخ سفید چھاپے کے کپڑوں کی بہتات ہے جن کے پیچھے اشتہارات کی بھرمار ہے، دیواروں پر اشتہار کھمبوں پر اشتہار حتیٰ کہ خود آدمیوں کے اوپر بھی اشتہار گویا زندگی اندر سے آدمی ہے اور باہر سے اشتہار ہے چنانچہ اگر اشتہاری زندگی سے الگ کرکے آدمیوں کو دیکھا جائے تو آدمی ہونے میں بھی شک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لئے چیزوں سے پہلے اشتہارات اور اُن کے پیچھے چیزیں دوکانوں میں آتی ہیں۔

اِدھر دوکانیں اپنی جگہ منہ بولتا عجائب خانہ ہیں جہاں خرید و فروخت کے لئے آواز کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ چیزیں اپنے آپ دعوت نظارہ دیتی ہیں کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید چنانچہ اسی خرید و فروخت میں بھری جیبیں پل میں خالی ہو جاتی ہیں اور خالی جیبوں کو دور ہی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ منہ اور مسور کی دال بے دال کے بودم خفت مٹانے کے لئے سودا بازی سے ہٹ کر چوری کرتے اور جیبیں کاٹتے ہیں تاکہ کاروان حیات آگے بڑھے ..

. . . . . ویسے کاروانِ حیات کو آگے بڑھانے کے لئے موٹر، ریل، ٹرام اور جہاز بھی استعمال کئے جاتے ہیں جن کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ الامان والحفیظ ہر راستے ہر منزل ہر موڑ پر سواریوں سے زیادہ گاڑیاں اور گاڑیوں سے زیادہ مسافروں کی بھیڑ جن کو بیٹھنے تک کی جگہ نہیں آگے پیچھے دائیں بائیں بس چلنے سے کام ہے بقول شخصے کہ زندگی ایک سفر ہے جو رکا وہ مرا اسی لئے عام طور سے گھر کے بجائے گاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں کہ زندگی کا مفہوم اور سیاحت کا لطف دونوں حاصل ہو جاتے ہیں مکان اگر بنتے بھی ہیں تو بہت تنگ و

تاریک جیسے کارخانوں کی چمنیاں جن کی اونچائی بہت مگر چوڑائی کم پہلے آدمی مکانوں کے لئے جگہ زیادہ گھیرتے تھے کہ ع

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

مگر اب جگہ کی کمی، میونسپلٹی کے ٹیکس کے باعث صحن کی جگہ صرف دیواریں ہوتی ہیں۔ دیواریں جتنی اونچی ہوں گی اُتنا ہی مکان شاندار اور مکیں محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ نیز مکانوں میں مکان دار کم اور کرایہ دار زیادہ رہتے ہیں بندر کی بلا طویلے کے سر جو رہے وہ مرے کرایہ البتہ پیشگی آنا لازمی ہے چنانچہ کرایہ کے تقاضوں اور روز روز کی کھینچا تانی کی علت سے بجائے اب بہت سے لوگ پٹریوں پر سوتے ہیں کہ جینے میں آزادی اور مرنے میں آسانی ہے گو مردہ پھر بھی زندوں کے ہاتھوں میں ہی رہتا ہے کہتے ہیں ڈالو یا کھائی میں البتہ سڑکوں کی صفائی ضروری ہے اسی لئے اب مر مر کر جیتے ہیں۔ اور گر گر کر اُٹھ بھاگتے ہیں کہ کہیں دن بھر کی حشر خیزی میں کچل نہ جائیں۔

خیر یہ تو رہیں بیرون خانہ کی باتیں جو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ ہیں آپ ذرا اندرون خانہ دیکھئے زندگی کتنی اپٹوڈیٹ ہوگئی ہے۔ بیوی ڈارلنگ بن گئی ہے روٹی کے بجائے ڈبل روٹی پانی کی جگہ سوڈا استعمال کیا جاتا ہے کہ دیواروں پر تصاویر اور وہ بھی ننگی ملبوس نیم عریاں شیروانی کبوتر کی طرح پر پھیلائے۔ ہاتھ میں اخبار منہ میں سگار اور بغل میں کتا زندگی کے لوازمات میں سے گنا جاتا ہے۔

شاید آپ سُنتے ہی ناک بھوں چڑھائیں لیکن گھبرائیے نہیں ہماری بیسویں صدی میں مغربی ممالک بھی شامل ہیں جہاں کتا کچھ اس طرح ضروری ہے جیسے صابن دانی کے لئے صابن، اچکن کے لئے بٹن اور اخبار کے لئے کاغذ کہ ان میں سے اگر ایک بھی چیز کم ہوئی تو ؎

نہ زندگی زندگی رہے گی نہ آدمی آدمی رہے گا

چلتے چلتے یہ بات بھی سن لیجئے کہ پرانی لکیر کے پیٹنے والے اب رخصت ہو چکے ہیں اور دنیا اوروں کے ہاتھ میں آگئی ہے اب نہ عاقبت ہے نہ ہاتھ میں تسبیح کوئی اپنی ڈھٹائی سے خدا کا نام لے تو لے ورنہ

رقیبوں نے رپٹ جا جا کے لکھوائی ہے تھانے میں

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یہی نہیں عقائد و اعمال میں آج ایک زبردست کشمکش ہے یک گونہ بیخودی میں مست الست وظیفہ بازی بھی کرتے ہیں اور ریس بازی بھی جامہ زیبی کے بھی قائل ہیں اور جامہ دری کے بھی دل تنگ بھی ہیں اور دل پھینک بھی فرق ہے تو اتنا کہ اپنا مطلب ہو تو آنکھیں فرش راہ اور اگر دوسرے کا معاملہ ہو تو تو کون میں کون غیروں کے غیر بیگانوں کے بیگانے۔

مختصر یہ ہے کہ
اپنے لئے سب کچھ حلال دوسرے کے لئے حرام جس کے ذرائع اچھے
وہ عشوہ بازی سے لیکر مقدمہ بازی. تیتر بازی اور سیاست بازی سب کا خوگر
لیکن جس کی رسائی محدود اُس کے لئے لطیفہ بازی۔ شعر بازی . . . . .
حتیٰ کہ راست بازی تک گناہ ہے اسی لئے عام طور سے جھوٹ بولا جاتا ہے کوئی
صرف جھوٹ بولتا ہے کوئی سفید جھوٹ بولتا ہے، کوئی کالا۔ نتیجہ سب کا ایک
ہے کہ ایک دوسرے کو چوروں کی نظروں سے دیکھتے، جانتے اور استعمال
کرتے ہیں خواہ ایک آدمی کا ایک آدمی سے واسطہ پڑے یا قوم کا قوم سے سب
اس حمام کے اندر ننگے ہی ہیں۔ جس کے اندر کی کیفیت کے لئے یہی کہا جا سکتا
ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آپ معیار کہاں سے حاصل کریں

بعض شہروں کے قارئین کی طلب پر نیچے کچھ مقامات کی ایجنسیوں کے پتے دیئے جا رہے ہیں۔ خواہشمند حضرات وہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہیں۔
(مینیجر)

دہلی :۔ شرفیہ کتب خانہ اُردو بازار دہلی۔
کلکتہ :۔ عثمانیہ بک ڈپو لوور چت پور روڈ کلکتہ۔
کانپور :۔ منظور نیوز ایجنسی محمد علی پارک چمن گنج کانپور۔
بنارس :۔ محمد ضمیر عالم صاحب نیوز پیپر ایجنٹ۔ گولا دینا ناتھ کبیر روڈ بنارس۔
علیگڈھ :۔ دارالمطالعہ اسلامی، شمشاد بلڈنگ علی گڈھ
پٹنہ :۔ اسرائیل نیوز ایجنسی۔ باقر گنج بزازہ پٹنہ۔
بھوپال :۔ مشتاق احمد صاحب۔ احاطہ مسجد نور محل بھوپال
آگرہ :۔ محمد سلیم صاحب محلہ خالی پورہ کلاں آگرہ
فیروز آباد :۔ اے جمیل صاحب۔ نیوز پیپر ایجنٹ۔ آگرہ گیٹ۔ فیروز آباد
بھاگلپور :۔ عبدالقدوس نیوز اسٹورس تاتار پور۔ بھاگلپور۔
حیدر آباد :۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد
آسنسول :۔ عابد حسین صاحب۔ نیوز پیپر ایجنٹ۔ آسنسول
بدایوں :۔ راشد علی صاحب۔ شہباز پور کوٹھی۔ بدایوں
بھاولپور اسٹیٹ :۔ فاروق القریشی صاحب نیوز ایجنٹ، رحیم یار خاں۔ بھاولپور۔
کراچی :۔ مکتبہ اسلامی آرٹ رام روڈ کراچی
لاہور :۔ شیخ محمد قمر الدین صاحب پبلشر اندرون موچی گیٹ لاہور
راولپنڈی :۔ محمد سعید صاحب بٹ۔ گوبند پورہ لیسین روڈ۔ راولپنڈی
پیشاور :۔ نیا مکتبہ۔ قصہ خوانی بازار۔ پیشاور۔

انوار عظمی

اقتدار

رامو چارپائی پر بیٹھا ہوا کھانس ہی رہا تھا کہ خبر ملی رادھا کا کشٹ کٹ گیا۔ اس کو اپنی قسمت کی طرف سے اتنی سخت بدگمانی تھی کہ جب بھی اس پر کوئی افتاد آتی وہ ہمیشہ اس کے بھیانک پہلو کو سامنے رکھ کر کانپ جاتا، جب اس نے سنا کہ رادھا درد میں بری طرح مبتلا ہے اور بچہ کی پیدائش میں اس کی جان جانے کا خطرہ ہے تو وہ اپنے کو سنبھال نہیں سکا۔ کچھ دیر بدن میں سنسناہٹ رہی اس کے بعد پھیپھڑے اور حلق نے پورے بدن کے غم کو اپنی طرف منتقل کر لیا۔

ستائیس اٹھائیس سال کوئی پہاڑ نہیں ہیں مگر رامو اس عمر میں معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی سو بہاریں دیکھ چکا ہے، اور دمہ کے حملے نے تو اس کی شکل کو حد درجہ مسخ کر دیا تھا۔ مگر اس کو اتنا معلوم تھا کہ ابھی زندگی کے کچھ دن اور باقی ہیں اس لئے وہ ہل اسی طرح چلاتا، کھیت کی نگہداشت اسی طرح کرتا جس طرح کہ اس وقت کیا کرتا تھا، جب نہ تو دمہ نے حملہ کیا تھا اور نہ قسمت سے بدگمانی تھی۔

دمہ تو معلوم نہیں کیوں اس کا ساتھ پکڑنے پر آمادہ ہوا تھا۔ البتہ قسمت سے بدگمانی کی چند وجہیں تھیں۔ اس کو اپنے باپ سے ورثہ میں چند بسوے زمین ملی تھی۔ دو ڈھانچ قسم کے بیل اور ایک پھوس کا جھونپڑا، مگر نہ جانے کیا بات تھی جب تک اس کا باپ زندہ رہا وہ جھونپڑے کو لالہ کشوری مل کے سفید محل سے کم سمجھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوا۔ جب اس کا باپ مرا تب اس کو احساس ہوا کہ یہ پھوس کا چھپر ہے۔ وہ چند بسوے کھیت اور وہ بیل نما ڈھانچے، پہلی بدگمانی جو اس کو اپنی قسمت سے ہوئی وہ یہی تھی، چند مہینے پیشتر وہ لالہ کشوری مل سے اپنے کو کسی حیثیت سے کم سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ لالہ جی کے لڑکے سیوا نند جی کی اور اس کی جگہ مقابلہ کی جوڑی تھی۔ لی میں دونوں نے برابر کی حیثیت کا ثبوت دیا تھا، اکھاڑے میں دونوں یکساں زور کی مقدار لے کر اترتے تھے، کوئی بھی بازی ہو دونوں میں سے کوئی بھی دب کر کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لیکن باپ کے مرتے ہی سب سے تلخ حقیقت جو اس پر ظاہر ہوئی وہ یہی تھی کہ رامو رامو ہے اور سیوا نند، سیوا نند جی ہے۔

اس کا ردعمل کتنا خوفناک ہوا اس کے بارے میں رامو نے اب تک غور نہیں کیا۔ البتہ یہ اسی دن سے اس کا قائل ہو گیا کہ یہ محض قسمت کا پھیر ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ باپ کے مرتے ہی صبح کی روٹی سوکھے کنکر کی طرح سخت ہو جاتی اور پانی پیتے وقت جب میٹھا کھانے کو جی چاہتا تو گھر سے گڑ غائب ہو جاتا، اس کا پختہ یقین تھا کہ یہ محض بدقسمتی کی وجہ سے ہے۔

رامو کا یہ احساس شدید تر ہوتا چلا گیا، پہلے ایک وسیلہ کے ساتھ وہ دنیا سے تعلق قائم رکھتا تھا۔ جتنے معاملات چلتے وہ اس وسیلہ کی آڑ میں چھپ کر اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا۔ وہ اب خود معاملہ کرتا۔ لین دین کا تعلق براہ راست رکھتا، دوستی، دشمنی کے مسئلے واضح تھے دنیا کے جس عضو پر اس کا ہاتھ پڑتا وہ اپنی دونوں آنکھوں سے صاف دیکھ لیتا کہ اس عضو میں کتنی رگیں ہیں۔ اور ان رگوں میں سفید خون ہے یا سرخ، اس نے بلدیو کی دوستی کو پرکھا، جہاں اسے خود غرضی کے غلیظ کیڑے ملے، اونکار پنڈت کے منتر سنے، جس کے پیچھے نفسانیت کی سڑی ہوئی لاش ملی۔ ملا جی کا وعظ سنا، جہاں شیطنت کی تیز بساند تھی، چند بسوے کھیت کے لئے ٹھاکر دت سنگھ سے تعلق قائم کیا۔ جہاں ظلم کا بے رحم طمانچہ ملا۔ اور اس کا احساس اتنا شدید ہوا کہ نہ صرف سیوا نند کے مقابل میں بلکہ پوری سوسائٹی میں اپنے کو بدقسمتی کا نمائندہ سمجھنے لگا۔

بیس سال کی عمر، جب بچپن، جوانی سے گلے مل کر رخصت ہوتا ہے۔ اس عمر میں رامو کا کھوسٹ بیل ایک طویل غنودگی کے بعد ختم ہو گیا۔ بیل ابھی چارے بھی نہیں گئے تھے کہ ہردیو نے اسے بتایا کہ کاتک قریب ہے، بیلوں کی قیمت چڑھ جائے گی اور اس کے دماغ میں یہ خیال پہنچا دیا کہ اسے جلد سے جلد بیل خرید لینا چاہئے، بیل جب مرا تھا تو اس نے اپنے پڑوسی کے بارے میں خیال کیا تھا کہ کاتک میں اس کے بیل سے کام چل جائے گا، اس کا یہ خیال کچھ بے جا بھی نہیں تھا۔ بلدیو گھنٹوں بیٹھ کر اس کے ساتھ گپ ہانکتا اور تمباکو پیتا تھا۔ بلدیو کی باتیں کتنے پریم کی ہوتی تھیں۔ باپ کے مرنے پر اس نے رامو سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور اسی وقت سے رامو کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ بلدیو کا بیل قریب قریب اسی کا ہے۔ مگر جس دن بیل مرا اس دن کی شام کو جب بلدیو اس کے یہاں آیا۔ اور رامو نے اس پر اپنا خیال باتوں باتوں میں ظاہر کیا تو اس نے کچھ عجیب پھیکے پن کا

اظہار کیا۔ رامو بلدیو کے اس رویہ کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکا۔ آج سے پہلے بھی کاتک آتا تھا۔ اور بلدیو بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے بیلوں کو اسے دے دیا کرتا تھا۔ آج یہ رُوکھا پن کیوں تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اور اس نے اپنے پہلے سے اعتماد کے بل پر بلدیو سے دوبارہ کہا۔

بھیا! اس سال کا کاتک پار ہو جائے تو فصل کٹنے پر دیکھکر کوئی بیل لے دینا۔

بلدیو نے صاف جواب تو نہیں دیا۔ البتہ بڑی دُور سے گھوم کر اس سے پیچھا چھڑانا چاہا۔

"لینا تو ہے ہی جیسا آج ویسا کل، بیل دوارے کی سوبھا ہے۔ جب سے مرا ہے، دوار کتنا سُونا لگتا ہے۔ میں آس پاس میں کوئی بیل دیکھوں تو بتاؤں"

رامو کا دل بالکل نادان تھا، اس نے بڑی صفائی سے کہا۔

"مگر بھیا۔ ہاتھ میں کوئی رقم بھی تو نہیں"

یہ کون بڑی بات ہے" بلدیو نے تیزی سے کہا "بدری ساؤ سے تو ادھار جتنا چاہو لے لو"

رامو نے بلدیو کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بھیا! تم نے بڑی دیا کی، مجھے تو روپیہ کی بڑی چنتا تھی"۔ بلدیو تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گپ لگاتا رہا اور اس کے بعد اٹھکر چلا گیا

رات میں رامو نے رادھا سے بلدیو کی تمام بات کہہ ڈالی۔ اس کو رادھا پر بڑا اعتماد تھا۔ اور اگرچہ اس پر وہ اکثر بڑی خفگیاں بھی کرتا تھا لیکن اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ رادھا اس کے علاوہ اور کسی کے بارے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ جب رادھا سے اس کا بیاہ ہوا تھا۔ اس وقت کی بات تو اسے یاد نہیں آتی تھی لیکن جب سے اس کے دل میں رادھا کی طرف کھنچاؤ بڑھتا جا رہا تھا، اسے برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ وہ ہر جگہ اس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھتی تھی۔ اس نے دو ایک بار سنا تھا کہ اور عورتوں کے درمیان جب بھی کسی عورت نے رامو پر سیوا انند کو فوقیت دی تو رادھا نے بڑی دلیری کے ساتھ رامو کا پلڑا جھکنے سے روک دیا۔ ایسے موقعوں پر اس نے عورتوں کو بتایا تھا کہ رامو کا دل صاف ہے۔ اس کا سینہ چوڑا ہے، اس کے بازو میں طاقت ہے۔ دھوتی اچھی باندھتا ہے۔ گلا خوب چلتا ہے اور رامو کے ساتھی سیوا انند کے ساتھیوں سے زیادہ ہیں۔ رامو نے کئی بار ان باتوں کو سُنا اور جب بھی سنا رادھا اسے ایک ایسی چٹان کی طرح نظر آئی جو کنول کے تال کی شوریدہ لہروں سے بچانے کے لئے اپنا سینہ وقف کئے رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی وجہ ہو کہ برسات کے موسم میں رامو کا معمول تھا کہ رادھا کے کنول کے لئے ڈھنگے ہار ضرور پہناتا۔ اگرچہ پاس پڑوس کی بھاوجوں نے رادھا کا نام کنول پتی رکھکر رامو کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔

آج بلدیو کی بات اس نے رادھا کو اسی لئے بتلائی کہ وہ کوئی معقول تجویز ضرور بتائے گی۔ اور اس کوشش کے سے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ڈھونڈھ نکالے گی۔ رادھا پوری بات سُن کر چُپ تھی رامو اس کی خاموشی سے اکتا گیا اور بڑے اضطراب سے بولا۔

"بلدیو بھائی کی بات ٹھیک ہے کیا؟"

رادھا نے گردن اٹھائی اور ایک لمبا سانس لیکر چپ ہو گئی۔ رامو نے پھر دُہرایا

"آخر کیا رائے ہے؟"

"تم کتنے مُورکھ ہو" رادھا نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سایہ پھیل گیا۔

"کیا بدری ساؤ روپیہ نہ دیں گے؟"

رامو کے سوال پر رادھا کھلکھلانے لگی اور عجیب بے بسی کے انداز میں کہا۔

"روپیہ دینا تو ان کا کام ہی ہے۔ مگر اتنا تو سوچو اگر بھیا مانگے سے بیل نہیں دیتے تو ساؤ مفت میں روپیہ کیوں دیں گے۔

رامو کو پہلی بار بلدیو کی دوستی پر شبہ ہوا لیکن اس نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی اور بالکل معصومانہ انداز میں پوچھا۔

"تب کیا ہوگا؟" "رادھا! تب کیا ہوگا؟"

پہلی بار اس نے رادھا کا نام لیا اور رادھا کو احساس ہوا کہ رامو اس سے کتنا قریب ہے۔ اس نے اب رامو کی بے چینی کو دونوں آنکھوں سے دیکھا جو اس کے دل و دماغ میں چنچل چوہے کی طرح دوڑ رہی تھی، اور اپنے پر قابو رکھتے ہوئے بولی۔

"تم چنتا مت کرو، بھگوان کی دیا رہی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

جیٹھ کی دھوپ میں ٹھنڈے میٹھے رس کا ایک کٹورا جیسے کسی نے رامو کے منہ سے لگا دیا ہو۔ اور وہ چپ ہو گیا۔ لیکن رادھا اس کی نگاہ میں بلدیو سے بہت اونچی نظر آئی۔

رامو نے قریب کے گاؤں میں ۳۵ روپے کا ایک بیل ٹھیک کیا، اور روپیہ رادھا نے دیا، بیل دروازے پر آکر بندھ گیا۔ گاؤں والے دروازے پر آکر بندھ گیا۔ گاؤں والے دوارے کی شوبھا کو دیکھنے آئے، اور مختلف قسم کی تنقیدیں اور تعریفیں کر کے اپنے اپنے کاموں پر واپس چلے گئے، جاتے وقت بدری ساؤ نے بڑے دلسوزانہ لہجہ میں رامو کو الگ لے جا کر کہا۔

"ادھار لائے ہو؟"

"نہیں مہاراج" رامو نے گردن جھکا کر جواب دیا "نقد روپیہ نقد کا ہے۔"

بدری ساؤ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس کے دماغ میں یہی بات گردش کر رہی تھی کہ اگر رامو نے اس کے یہاں سے نہیں تو کسی دوسرے مہاجن کا دروازہ دیکھا ہوگا۔ اس لئے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"کتنے بیاج پر لیا ہے؟ آج کل کی سمے میں آگے پیچھے دیکھ کر چلو رامو۔"

رامو کو اس اضطراب کا صحیح اندازہ نہیں ہوا جو بدری ساؤ کے دل میں برپا تھا۔ اس نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"مہاراج بیاج تو کچھ نہیں دینا ہے۔"

بدری ساؤ نے سر کھجلا کر منہ پھیلایا۔ اور ناصحانہ انداز میں بولے۔

"ہائیں! رامو تو نپٹ مورکھ بچہ ہے۔ کھیت رہن رکھ کر بیل کیوں مول لیا۔ میں کوئی تمہارا بیری تھا۔ تمہارا باپ کا کتنا وشواس مجھ پر تھا تم کو معلوم نہیں۔"

رامو نے ساؤ کی ہمدردی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اور کھل کر کہنے لگا۔

مہاراج مجھے تو بیل کی بڑی چنتا تھی پر گرہستن نے، روپیہ کا بندوبست کر لیا۔ رام جانے بڑی سیوک ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے جھینپ کر گردن جھکا لی۔

بدری ساؤ اس کے بعد کچھ نہیں بولے، کچھ دلاسا دیکر فوراً روانہ ہوگئے۔ مگر یہ بات ان کے دل میں برابر کھٹکتی رہی کہ آخر ۳۵ روپئے رادھا کو ملے کہاں سے؟

بات گذر گئی، گاؤں حسب معمول اپنے کاموں میں منہمک تھا۔ رامو کی دوڑ دھوپ ہل بیل، کھیت تک محدود تھی۔ وہ تھکا ہارا گھر پہونچتا، مگر رادھا کو گھر کے انتظام میں مصروف دیکھکر اسے بڑی فرحت نصیب ہوتی، اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ قسمت سے بدگمانی کوئی اچھی بات نہیں۔ خاص کر جیت کی فصل کاٹتے وقت اس کا یہ احساس بہت تیز ہو گیا۔ اور اس نے ہنستے ہوئے رادھا سے کہا۔

"بھگوان کتنے دیالو ہیں۔ کشٹ کٹتے دیر نہیں لگتی۔"

رادھا اس سے پہلے ایسی باتیں کئی بار سن چکی تھی اور دیکھ گئی تھی کہ رامو کبھی کچھ ہے، اور کبھی کچھ، اس نے مسکرا کر اس احساس سے سرسری گذر جانا چاہا۔ مگر رامو کے دل میں تو خوشی کی لمبی بالوں کو دیکھ کر کلبلاہٹ پیدا ہو رہی تھی، اس لئے خاموش رہنا نامناسب ہی نہیں بلکہ اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس نے رادھا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میری تو آنکھ پھوٹی تھی۔ ابھی تک لیکھے کا رونا روتا تھا پر دیکھ بھگوان کی کتنی دیا ہے کہ جَو اتنا اچھا ہوا، اور اتنی سُندر گرہستن دی۔"

رادھا نے جھینپتے ہوئے کہا "آج کہیں سنک تو نہیں ہو؟"

چھیڑ بہت دیر تک جاری رہی اور جب دوپہر کو دونوں کام کر کے لوٹے تو ہر قدم کے ساتھ دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے سائے تو دو ہیں لیکن جسم اور روح ایک ہی ہے۔

رامو کو دن بدن قسمت کی طرف سے خوش گمانی ہوتی جا رہی تھی۔ زندگی کے پیالے کا صرف کنارا ہی تلخ تھا پینے کے بعد معلوم ہوا کہ پیالہ کے اندر اتنی تلخی نہیں جتنی کہ اس کے کناروں میں تھی۔ بات صرف ہمت کر کے منہ لگانے کی تھی، اور جب اس نے دو چار گھونٹ پی بھی لئے تو اس کی آنکھ کھل گئی کہ زندگی کتنی خوشگوار ہے۔

رامو کی یہ خوش گمانی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی کی تعمیر میں قسمت سے بدگمانی کا اچھا خاصہ حصہ صرف کیا گیا ہو۔ ابھی وہ چند دن بھی اپنی قسمت پر ناز نہ کرنے پایا تھا کہ ایک کہر یلی شام کو جب جانور چر کر اپنے تھانوں پر واپس آ رہے تھے اور ان کے اڑائے ہوئے غبار کی طاوت سے کہرے میں گہرا پن پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ایک کرب انگیز اطلاع ملی، بات کسی دوسرے کے متعلق ہوتی تو وہ اسے زیادہ اہمیت نہ دیتا لیکن رادھا کے اوپر وہ کسی شک کی پرچھائیں کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

۳۵ روپئے اس کی زندگی کے معاملات میں دخیل ہو کر اب اس سے اتنے قریب ہو گئے تھے کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا تھا۔ جب اسے یہ روپئے ملے تھے تو اس نے چند دنوں تک رادھا سے ضرور پوچھا کہ یہ روپئے اسے کہاں سے ملے لیکن رادھا نے ہر بار ایک ہی بات کہہ کر اس معاملہ کو ٹال دیا کہ تمہیں کام چلانے سے کام کہ دنیا بھر کی ٹوہ لینے سے؟ اور اسے رادھا پر اتنا اعتماد تھا کہ اس بات کو سُن کر اس نے زیادہ کرید نہیں کی اور معاملہ ہر بار بڑی خوش اسلوبی سے طے ہوتا رہا۔

مگر آج گاؤں کی ایک جہاں دیدہ عورت نے جس کے بال یقیناً دھوپ میں سفید نہیں ہوئے تھے یہ کہہ کر اسے محوِ حیرت کر دیا۔

"رامو! اتنی نادانی ٹھیک نہیں۔ رادھا تیری ہے تو تک اس پر بھی نگاہ رکھا کر۔"

رامو کھوسٹ کی طویل گفتگو کے اس معنی خیز نتیجہ کو مطلق نہیں سمجھا اور سادگی سے بولا۔

"چاچی! میں تو اسے بڑے آرام سے رکھتا ہوں۔"

بڑھیا کچھ آگے کھسک آئی اور کھانستے ہوئے بولی۔

"ہا! رامو! تو نپٹ مورکھ ہے۔ تنک چال چلن بھی دیکھا کر۔"

پینتیس روپئے پہلی بار جھنن جھنن اس کے ذہن میں کھنکھنائے اور جیسے صدائے بازگشت پیدا ہوئی "کہاں سے؟ کہاں سے؟"

رات گئے تک رامو خاموش رہا۔ رادھا دل ہی دل میں جھنجھلا رہی تھی۔ رامو نے اسے کئی بار پیٹا بھی تھا جھڑکا بھی تھا اور تُو تُو میں میں بھی کی تھی مگر یہ صورت حال کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ بغیر جرم بتائے ہوئے اتنے گہرے طور پر خاموش

ہوگیا تھا۔ اس نے بار بار چاہا کہ اس خاموشی کے بارے میں پوچھے لیکن ہر بار بہت کہنے کے بعد بھی ہانپنے لگی۔ وہ سخت الجھن میں تھی اور جلد سے جلد اس دکھ کو معلوم کرنا چاہتی تھی جس نے رامو کے دل ہی کو نہیں بلکہ اس کی زبان کو بھی جلا کر خاکستر بنا دیا تھا۔

رامو خاموش آتا جاتا رہا۔ اس نے بیلوں سے آج بڑی دلچسپی لی۔ شام ہی کو ہل کو کھنگشایا۔ اس کے پھل کو خواہ مخواہ کے طور پر نکال کر پھر درست کیا، گائے کی گردن بڑی دیر تک سہلایا کیا۔ بلدیو سے بڑی دیر تک لایعنی گفتگو کی۔ چارپائی کے بان توڑ توڑ کر کسے۔ بیکاری کے شغل کے طور پر گھڑوں کے ٹھنڈے پانی کو گرا کر تازہ پانی لایا۔ عجیب و غریب حرکتیں کیں اور جب تقریباً تھک گیا تو ایک چارپائی پر بغیر کسی بستر کے سو گیا۔

رادھا ابھی تک حیرت اور دلچسپی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور گھٹتی رہی۔ مگر جب رامو دور چارپائی پر لیٹا تو اس سے رہا نہ گیا اور کمبل سنبھالتے ہوئے ہولے ہولے آئی اور چہرے پر زندگی بھر کی مسکراہٹوں کو سمیٹ کر بولی۔

"کچھ بھوجن کرو۔ طبیعت ٹھیک نہیں کیا؟"

رامو نے جواب دیا "ہوں" اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

رادھا آہستگی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھوں کو تھام کر اس پر اپنی آنکھوں کو رکھ دیا۔ گرم گرم آنسوؤں نے رامو کو بتلایا کہ رادھا پر قیامت گذر رہی ہے، مگر اس نے درشت لہجہ میں کہا۔

"جاتی ہو یا بے عزت ہونا چاہتی ہو"

رادھا اٹھ کر پیروں پر سر رگڑنے لگی۔ اور گھگھیاتے ہوئے بولی۔

"تم تو اتنے کٹھور نہیں تھے۔ آج کیا ہو گیا ہے؟"

رامو مناسب لفظ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اسے ملے نہیں ہانپ کر خاموش ہو گیا۔ البتہ پیر کھسیٹ لئے۔

رادھا کھل کر رو دی۔

"آخر کچھ منھ سے بھی [illegible]"

"۳۵ روپئے" رامو نے کہا۔ اور جیسے اس کی زبان پر موٹا سا قفل لٹکنے لگا۔ رادھا ٹھٹھکی اور فوراً ہی [illegible] کے کان میں سنساتے ہوئے الفاظ ڈالے کہ کہاں سے؟"

حیرت کے چھٹتے ہی رادھا [illegible]۔ رامو کو محسوس ہوا جیسے اس نے زبردست بیوقوفی کی ہے لیکن رادھا نے اسے سنبھالا۔

"بدری ساؤ ہی کے یہاں سے تو نہیں لائے۔ [illegible] کا جھومر [illegible] اچھا تھا؟"

رامو بہت پچھتایا۔ آج اس کے اعتماد کی بنیاد کتنے ہلکے سے جھونکے سے متزلزل ہو گئی تھی۔ اس کا اسے افسوس تھا۔ پھر بھی اطمینان کے لئے پوچھا۔

"پہلے تو نہیں بتایا"

رادھا اس کے قریب ہو گئی اور جھجک سے کہنے لگی۔ "پہلے بتاتی تو بھنگ رگڑ کر اڑا نہ دیتے۔"

رامو چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے رادھا کو ڈائن سمجھ رہا تھا۔ جس نے بلدیو کی دوستی کو نگل لیا تھا۔ اس کے باپ کو دور کر دیا تھا۔ بدری ساؤ کی ہمدردی سے محروم کر دیا تھا اور ایک طرح گاؤں میں نکو بنا دیا تھا۔ مگر بغیر کسی ثبوت کے، کسی واضح دلیل کے اب وہ یوں مطمئن تھا جیسے رادھا پہلی بار اس سے ملی ہے۔ محبت بہت جلد بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہے لیکن اس بدگمانی کے غبار کو جب خلوص کے آنسو دھو دیتے ہیں اور اس پر معصوم مسکراہٹوں کی بجلی چمکتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ محبت کا چہرہ داغ اور گرد و غبار سے بالکل صاف ہے، دل کو دبنگ دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رامو نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"بات یہ ہے رادھا! جب تم کسی کو دیکھتی ہو تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

رادھا شرما گئی، رامو نے کہا

"دل نہیں کہتا کہ میرے سوا اور کوئی تیرا مالک ہو۔"

رادھا نے کہا۔ "بس کرو! تنک سی بات پر من اتنا میلا کر لیا۔ ہے رام! اگر کچھ ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا"

رامو نے جوش میں آکر کہا۔ "ارے میں اس کی آنکھ نکال لوں جو تجھے گھورے تو خالی میری ہے رادھا۔"

دونوں چپ ہو گئے۔ اور اس وقت سے رامو بڑھیا سے سخت نفرت کرنے لگا۔ رادھا کے لئے گاؤں میں اس کا ایک اور دشمن پیدا ہو گیا لیکن قسمت سے بدگمان ہونے کی طرف مائل ہوتے ہوتے اس کی زندگی کو خوش فہمیوں کی گود میں ہمکنے کا موقع ہاتھ آگیا۔

بات جس طرح ابھری تھی اسی طرح دب گئی لیکن جیسے رامو کو ایک زبردست حقیقت کا عرفان نصیب ہو گیا تھا۔ پہلے وہ رادھا کو ڈانٹتا تھا مارتا پیٹتا تھا۔ لیکن اس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تھی۔ مگر اس رات کی بھولی بھالی گفتگو کے بعد اس کے دل میں یہ بات جم گئی کہ رادھا اس کی ہے اور اسے اس پر ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ یہ احساس روز بروز تیز ہوتا چلا گیا اور آج کئی دنوں سے وہ بستر پہ لیٹے لیٹے بے شمار خیالات کی تہ میں جھانکنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اسے خبر ملی کہ رادھا کا کشت کٹ گیا"

" رادھا کا کشٹ کٹ گیا" لیکن اس کی ذہنی الجھن میں کوئی کمی نہیں واقع ہو گئی۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ آج کتنے دن سے وہ بیمار ہے لیکن رادھا نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہ عورتیں بڑی مطلبی ہوتی ہیں۔ ابھی تک کوئی آسرا نہیں تھا تو میرے پیر دھو کر پینے کو تیار تھی۔ کتنے سویرے کھانا تیار کرتی۔ دوار کا کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ بیلوں کو کھلاتی پلاتی۔ مگر جب سے بیر بھاری ہوا تب سے وہ کتنا کترا کر رہتی ہے۔ دن بھر بچوں ہی ہوں اس کو کیا پڑی ہے کہ منت کرے۔ اب تو بھی ہے کہ اگر رامو کچھ نہ کرے گا تو کیا ہوا۔ بھگوان نے تو ایک سہارا لگا دیا ہے۔"

رامو کا یہ خیال کچھ غلط نہیں تھا۔ اگرچہ وہ اپنے لڑکے کو کھلاتے وقت بڑے جوش و خروش کا اظہار کرتا لیکن جب یکایک اسے رادھا کا بدلا ہوا رویہ یاد آتا تو بچہ کو سانپ سمجھنے لگتا جس نے رادھا کے دل کی محبت کو ڈس لیا تھا اور اس میں زندگی کی ذرہ برابر بھی حرارت نہیں چھوڑی تھی۔ رادھا بھی اپنا زیادہ وقت بچہ ہی کو سینہ سے لگائے ہوئے گزار دیتی۔ رامو ہنسی میں کہتا۔

" رادھا تو تو جیسے ہمیں بھول ہی گئی"

" رادھا ناک سکیڑ کر بولتی "

" تم تو جوان مسٹنڈے ہو۔ بے منہ کا بالک تمہارے پیچھے چھوڑ دوں؟"

رامو جل کر کباب ہو جاتا لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتا۔ دن بدن اس کے دل کا طوفان ابلتا ہی گیا۔ اور احساس کی شدت نے بہت جلد اس کو ایک دوراہے لا کر کھڑا کر دیا۔ اب اس کو فیصلہ اور آخری فیصلہ کر لینا تھا کہ رادھا صرف اسی کی رہے گی یا اس پر دوسرے کا بھی حق تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

معاملے نے بڑی سنگینی اختیار کر لی تھی، ننھا بالک کوئی بلبلہ نہیں تھا جس کی فاقت کو رادھا کے لئے قربان کر دینے میں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوتی۔ بیمار باپ بن تھا جس کی تیمارداری اور خدمت کے بجائے رادھا کی ساری لگن بالک کے لئے رنگ نب کرنے میں کسی خاص اذیت کا شکار نہ ہونا پڑا۔ گاؤں کے جوان نہیں تھے جن رادھا کی خاطر ہزاروں بار جھگڑے کی نوبت آ گئی تھی بلکہ وہ بالک تھا۔ اس کے دل کے خون سے کھینچا ہوا نقش۔ خون، مان کرتا ہوا اس کا اپنا دل، مجسم شکل اس کی روح، دوسری طرف ایک زبردست خواہش اقتدار تھی جو یہ برداشت پر تیار نہیں تھی کہ رادھا اس کے علاوہ اور کسی کی ملکیت ہو۔ امید کی اس کشمکش۔ اس اندرونی الجھن کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ اور کیوں کر ہوگا۔ یہ دوسرے ساتے خود نہیں معلوم تھا۔

خیالات ٹکراتے رہے، جذبات الجھتے رہے۔ احساسات کی رو میں گتھم گتھا میں۔ مایوسی اور امید پر تو ڈالتے رہے۔ اور یہ الجھن اتنی شدید ہو گئی کہ رامو بہت جلد ایک فیصلہ پر پہونچ جانا چاہتا تھا۔

ایک طوفانی رات میں جب گاؤں کے قریب کا نالہ بڑی بیدردی کے ساتھ ساحل کا سر پھوڑ رہا تھا اور دریائی عفریت غصہ میں جھاگ اچھال رہا تھا۔ رامو آہستگی سے اٹھا، ذہن چیخ رہا تھا۔ "رادھا تیری ہے" جذبات پکار رہے تھے "رادھا تیری ملکیت ہے" خواہش چلا رہی تھی "بالک نے رادھا کو چھین لیا ہے۔ اسے نیست نابود کر دو۔ فنا کر دو۔ اس سانپ کے بچہ کا سر کچل دو" باہر سخت بارش ہو رہی تھی۔ بادل آسمان پر جیسے جنگلی قصائی لڑ رہے ہوں، بجلی کی مداخلت کسی فریق کو گوارا نہیں تھی۔ ایک لمحہ کو ندتی مگر دونوں طرف کے گروہ اس کا گلا دبوچ لیتے۔ نہ جانے کتنے بادلوں کی گردن کا خون موسلا دھار بارش کی شکل میں زمین پر تیر رہا تھا۔ رامو کمبل اوڑھے ہوئے نکلا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔

" گھرڑ گھرڑ،" نالہ کی موجوں نے رامو کو خوش آمدید کہا اور چھپاکے کی آواز آئی۔

صبح کو سیلاب کے خوف سے پورا گاؤں سہما ہوا تھا۔ بیلوں کو کھول دیا تھا تاکہ وہ تیر کر بعد صرف پناہ کی جگہ پا لیں چلے جائیں۔ بچوں کو قریب بٹھا لیا گیا تھا آنے والے خطرے کی بو فضا میں چھپ رہی تھی ایک سکوت پیہم رقص کر رہا تھا مگر رامو کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ رادھا مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور رامو اپنے مسلسل سوچ رہا تھا کہ وہ بالک کے لئے کیوں رو رہی ہے؟

دوپہر کو بارش تھی۔ بچے گلیوں میں پانی روک روک کر کھیلنے لگے۔ بوڑھی عورتوں نے ناک چڑھاتے ہوئے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا۔ بہتوں نے ہولی کی کسر آج نکالی۔ رادھا صبح سے کراہ رہی تھی۔ اس کا ذہن کام کرنے سے انکار کر چکا تھا۔ یکایک اس نے ایک آہ بھر کر اٹھائی اور جیسے کوئی خفیف سی بو کو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایک لمحہ۔ دو لمحہ۔ منٹ۔ دو منٹ۔ پانچ منٹ۔ یک بیک اٹھ کر نالہ کی طرف دوڑی اور بے تکان چھلانگ لگا دی۔ موجوں نے ایک اور قہقہہ بلند کیا۔ سطح پہلے جیسی ہو گئی۔

رامو چارپائی پر پڑا ہوا تھا لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ ایک عورت نے آکر اس کا کندھا جھنجھوڑا اور وحشیوں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ عورت نے زور زور سے چیختے ہوئے کہا "رادھا ڈوب گئی۔ ارے رادھا ڈوب گئی!!"

رامو نے ہمارا سنا۔ "کیا کہا ہوں"۔ اور یکایک کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر نظر ڈالی اور ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور عورت کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

" رادھا میری ہے۔ رادھا میری ہے "

اور تیز تیز قدم سے گاؤں سے باہر چلا۔ لوگوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن نہ جانے اس کے پیر میں کہاں کی سرعت آ گئی اور وہ چیختے ہوئے بھاگا۔ "رادھا میری ہے۔"

اقبال نسیم عثمانی

لڈّن بھیّا

آپ سے ملئے۔ آپ ہیں ہمارے لڈّن بھیّا یقین جانیئے بڑے خوبیوں کے آدمی ہیں آپ بھی۔ کچھئے ہر ہنر کے ماہر۔ ہر کسب میں کامل اور ہر فن میں مولا۔ زندگی کے کسی مورچہ پر جا دیکھئے۔ مجال ہے جو ذرا جھجک جائیں۔ عمر کی بینتیس بہاروں میں کم ازکم ذہنی انقلابات کے پندرہ موڑ ایسے آچکے ہیں جہاں بھیّا نے کامیاب زقند کے سہاروں پر اپنے سفر کی کتنی ہی سمتیں بدل ڈالیں۔ چنانچہ اب سے دس سال پہلے آپ ایک مذہبی جماعت کے سرگرم کارکن تھے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو اچانک ادیب بنے اور صرف ایک سال کی ادبی خدمات کے بعد ۱۹۴۲ء میں یکایک اس طرح غائب ہوئے کہ پھر ہماری مشتاق نگاہوں نے پورے پانچ سال بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو منور شام میں آپ کو سیاسی اسٹیج پر کھڑا ہوا پایا۔ جہاں سے آپ نے دونوں ہاتھ بڑھا کر پبلک کو نمسکار کیا اور فضا ایک دم "بھیّا زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ خلافِ معمول سر پر ٹرکش کیپ کے بجائے تھری ناٹ تھری کی سفید بگلا ٹوپی۔ فورٹونٹی چپل اور جسم پر کھدّر کا قمیص پاجامہ اور اس پر مشکی ڈاڑھی گویا نورٌ علیٰ نور۔ بھیّا کی اس غیر متوقع جدید کج کلاہی کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے بوتل سے ماء اللحم کا پرانا لیبل کھرچ کر "اسپرٹ ماس حلّ" کی نئی پرچی چپکا دی ہو ——— شاید بھیّا نے بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا کیونکہ وہ "وقت" کی ایک اہم تخلیق تھے۔ اور یہ تبدیلی "اسی وقت" کی پکار ———

جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لینا اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا عقل کی دنیا میں دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر ہمارے بھیّا کوئی دیوانہ بھی نہیں۔۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اُن کو نیم دیوانہ ہی فرض کر لیا جائے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ "بکار خویش ہشیار" کی پہلی ہی منزل سے ایسی دیوانگی بھی فرزانگی بن جایا کرتی ہے ———

اب آپ اسے محض ستم ظریفی سمجھئے یا کچھ اور۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مستقبل قریب میں تاریخ کے ہلکے پھلکے اوراق ہمارے بھیّا کے کارناموں سے بوجھل نظر آئیں گے۔ ذرا اس دور کے بارے میں سوچئے جب گھر گھر لڈن بھیّا کی سوانحِ حیات رٹی جائے گی۔ ہر محفل میں اُن کے تذکرے ہوں گے۔ ہر مجلس میں اُن پر تبصرے ہوں گے۔ اور اساتذہ کرام تاریخ کے اس بھاری بھرکم عنوان پر سُرخ روشنائی سے نشان دہی کریں گے۔ "بچّو! یہ سبق امتحان میں آنے والا ہے" اور معصوم بچّے خطرہ کے اس سرخ نشان سے سہم کر اکبر اعظم کے پُرانے سبق کو چھوڑتے ہوئے اُونگھتے اونگھتے بھی رٹتے رہیں گے۔

"لڈّن بھیّا۔ لڈّن بھیـــا"

ممکن ہے کہ ہمارے اِس تاریخی ہیرو کی تاریخی حیثیت کچھ اس سے بھی زیادہ ہو کیونکہ آپ جانئے کہ تاریخ میں کسی کا صحیح مقام متعین کرنا ایک مورخ ہی کا کام ہے اور یہ بندۂ ہیچمداں، خاکسار، ناپائیدار، یعنی لڈّن کا غمگسار، صرف ایک عدد افسانہ نگار ہے اور وہ بھی کچھ یوں ہی سا۔ اِس پر بھی اگر آپ کو بھیّا کی افسانوی پوزیشن ہی مرتب کرانی ہے تو آئیے! بسم اللہ۔ آپ کی دعا سے افسانوی زبان میں اُن پر اتنا کچھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بھی گھبرا کر چلّا اٹھیں۔

"آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی"

اچھا تو سنئے! کہنے کا مطلب یہ تھا کہ لڈّن بھیّا کی تھوڑی بہت تاریخی پوزیشن سمجھنے کے بحساب اگر آپ کو اُن کا حدود اربعہ یعنی مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ڈیل ڈول۔ لمبائی۔ چوڑائی اور موٹائی کے ساتھ بتا دیا جائے تو یقین ہے کہ آپ اُن کی جغرافیائی کنڈیشن خود مرتب کر لیں گے۔

اور صاحب! معاف کیجئے! ۔ آپ تو آپ ہی ہیں اگر ہمارے شہر کے گھسیٹے اور نتھو سے بھی پوچھا جائے کہ اِس اِس قد و قامت کا اِس بستی میں کون بستا ہے تو یقین جانیئے بلا جھجک فی البدیہہ یہی جواب ملیگا۔ "لڈّن بھیّا"

کچھ سُنا آپ نے ——— کتنی قابلِ قدر شہرت کے مالک ہیں ہمارے بھیّا بھی ——— مگر خدا کے لئے اِس بتائے ہوئے پتہ پر شرفِ نیاز کے شوق میں کہیں آپ اُن کے دولت کدہ پر ہی نہ پہونچ جائیے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو اس میں شک نہیں کہ آپ کی بے انتہا آؤ بھگت ہو گی۔ خاطر مدارات ہو گی۔ کیونکہ ہر دلعزیزی اور مہمان نوازی میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ویسے بھی مہمان نوازی ایک اسلامی شعار ہے اور آپ دیکھیں گے کہ بھیّا اس کے سختی سے پابند ہیں۔

اب یہ اور بات ہے کہ آپ کی اس مہمان نوازی کا بار ہم جیسے غریب ہمسایوں کی قلیل تنخواہ پر پڑکر رہ جائے۔ آپ کی اس غیر متوقع آمد پر بھیا اپنی روایات کو قائم رکھنے کے لئے ہم سے کچھ نہ کچھ اُدھار لیں گے۔ اور اس شان کے ساتھ کہ پھر کبھی نہ دیں گے۔

چنانچہ اُس روز بھی کوئی ایسا ہی حادثہ رونما ہونے والا تھا کہ بھیا نے ہم سے پوچھا تھا۔ اور ہم نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے نہایت شرمسارانہ انداز میں جواب دیا۔ "بھیا! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج مہینہ ختم ہے۔ اور ہماری قلم بند آمدنی کے بچے ہوئے چند پیسے پھٹی ہوئی جیب میں صرف آخری ہچکی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔"

اور وہ قطع کلام کرتے ہوئے مسکرائے۔ "خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ عید میلاد النبی کے سلسلہ میں آج ہی بیس روپئے فلاں صاحب کو دیئے ہیں۔ سوچا آپ سے بھی دو چار روپئے دلا دوں۔ ثواب کا کام ہے۔ اگر اس وقت آپ کے پاس نہیں ہیں تو بھی پھر دیدیجئے۔" اب میلاد پر فلاں صاحب کو روپیہ دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ مگر ہم بھیا کے مقروض ہو چکے اور کسی ایسے ہی موقع پر احساس فرض کا کچوکہ دیکر یہ قرض وصول کر لیا جائے گا۔ لیکن مہمانوں کی قسمت سے اگر یہ دوسرا موقع بھی مہینہ کی آخری تاریخوں ہی میں آپڑا۔ تو بھیا اپنی خضاب آلود چندیا کو سہلاتے ہوئے کچھ رنجیدہ سی صورت بنائے ہوئے پاس آنے کے بجائے سامنے والی سڑک کے چوراہے پر اس شان سے ایستادہ ہوں گے کہ گویا آپ بھی انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ سے متعلق کوئی فرد ہیں اور آج دفاعِ عام کی خاطر سڑک کی پیمائش کے لئے آن ڈیوٹی کھڑے ہیں۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی مائی کا لعل اپنی شامت اعمال سے ان کی متلاشی نگاہوں کے ہتھے چڑھ ہی جاتا ہے۔ اُس روز بھی ایسا ہی تازہ شکار پھنسا تھا۔ چنانچہ لڈن بھیا۔ نہایت غمگسارانہ انداز میں سر کھجاتے ہوئے بولے۔

"ارے بھئی چھٹن! ۔۔ کہاں ہو یار ۔۔ دکھائی ہی نہیں دیتے۔" بھیا کا ترکش ایک تیر سے خالی ہوا۔ اور غریب چھٹن ٹھیک اُس کی زد پر آکر پھڑپھڑاتے ہوئے بولا ۔۔۔

"کیا عرض کروں بھیا۔ آج کل سخت پریشان ہوں۔"

"کیوں خیریت تو ہے" بھیا کے خشک لبوں سے ہمدردی کا چشمہ پھوٹا۔

"جی ہاں! صرف کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ ویسے سب خیریت ہے۔"

چھٹن نے رونی صورت بناتے ہوئے جواب دیا۔

"اُف! تم نے تو کبھی مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔" بھیا بولے۔ "بھئی! ایسی بھی کیا غیریت۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ وہ زبیری کو تو تم جانتے ہی ہو گے۔ بیچارہ عرصہ سے بیکار تھا۔ چنانچہ کل ہی پانڈے جی سے مل کر سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں ایک جگہ پر تعینات کرا دیا۔ بنارس کے لڑکے رسولا کو ایک ایجنسی دلائی۔ اور وہ نجّو بیچارا۔ نجّو۔ ارے بھئی وہی چھریرے سے بدن کا گورا چٹّا لونڈا ۔۔ جو نہور شاہ کے اکھاڑے میں زور کرنے آیا کرتا ہے۔ عرصہ سے جان کھا رہا تھا۔ "بھیا ایک ٹھیک بنائی ہے کنٹرول ریٹ پر سمنٹ دلا دو۔" آخر تنگ آکر اُسے پانچ سو کٹے سمنٹ کا پرمٹ دلا ہی دیا۔ تو پھر کیا تمہارے لئے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ خدا کا احسان ہے کہ اب بھی ان کمزور ہاتھوں میں اتنی جان باقی ہے کہ جس سے چاہوں ہاتھ پکڑ کر جو چاہے لکھا لوں ۔۔۔۔

"کیوں نہیں بھیا! یہ سب کچھ آپ کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔"

چھٹن نے اعتراف کے موڈ میں اُن کی سیاسی سرگرمیوں کو سراہا۔

"اجی قربانی۔ وُربانی کیا۔ یہ تو اُس مالک کا انعام ہے کہ وہ ہم جیسے ناکاروں سے بھی ملک اور قوم کی خدمت لے رہا ہے ورنہ آپ جانیئے کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔"

بھیا عجز و انکسار کی آخری حدود پھلانگتے ہوئے بولے "خیر چھوڑو۔ وہ ان تذکروں کو۔ اور اب خدا کا نام لیکر تم ایک درخواست لکھ لاؤ۔ خدا نے چاہا سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

کچھ دیر بعد حسب ہدایت چھٹن ایک درخواست لکھ لایا۔ اور بھیا منہ بسورتے ہوئے بولے۔ "بھئی تمہاری قسمت۔ سوچا تھا پانڈے جی سے مل کر آج ہی تمہیں کہیں نوکری دلا دوں گا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہیڈکوارٹر لکھنؤ جا رہے ہیں۔ خیر تم درخواست دیدو۔ میں اپنی سفارش لکھ کر اُن کے ڈرائیور کے ذریعہ لکھنؤ پہونچا دوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لکھے کو کسی طرح نہیں ٹال سکتے۔ تمہارے لئے تو میں خود ہی لکھنؤ چلا جاتا مگر مشکل یہ ہے کہ گاندھی جینتی کے سلسلہ میں مرکز سے کچھ ضروری ہدایات آئی ہیں جنہیں صوبہ کی تمام امن کمیٹیوں کے نام جاری کرنا ہے۔ پھر بھی تم بے فکر رہو۔ انشاء اللہ تمہارا کام ہو جائے گا۔ نجّو کی درخواست بھی اسی ڈرائیور کے ذریعہ بھجوائی تھی۔ اور میاں! یہ نجّو ویسے تو بیوقوف سا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہے بڑا تیز کہنے لگا۔ "بھیا! نقل مشہور ہے جس کا کھائیے۔ اس کا گائیے۔ اگر مناسب ہو تو ڈرائیور کو دو چار روپئے دیدیئے جائیں۔"

میں نے کہا بھئی! جیسا مناسب سمجھو کرو۔ مجھے خواہ مخواہ اس گناہ میں کیوں کھینچتے ہو۔ وہ اس پر بھی نہ مانا۔ اور میری لاعلمی میں ڈرائیور کو دس روپیے دے ہی ڈالے۔ ایمان کی بات ہے کہ ڈرائیور نے بھی دوڑ [illegible] کوشش کی کہ چار روز میں ہی گھر بیٹھے پرمٹ بھجوا دیا۔

چھٹن یہ تمام کہانی غور سے سُن رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی درخواست کے ساتھ آفس کے پڑے ہوئے دس روپئے بھیج سکے۔ اور بھیا نے اپنے مخصوص انداز میں منہ ہاں سے انکار اور ہاتھوں سے اقرار کرتے ہوئے ڈرائیور کے نام کا یہ محنتانہ خود اپنی ہی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ دوسرے ہی لمحہ نہ جانے کیوں مجھے [illegible] یہ محسوس ہوا

جیسے جوہر تجربہ کا موٹا تازہ محافظ ہے کہ بجائے آنہ آن کی جیب میں ہی پھڑ پھڑا رہا ہو۔

ادھر مہینوں کوئی جواب نہ پاکر چھیٹن نے بار بار بھیا کو یاد دہانی کرائی۔ آخر ایک روز وہ ہمدردی کے لہجہ میں گویا ہوئے

"بھئی! چھیٹن! تمہارے لئے اب لکھنؤ خود ہی جانا پڑے گا" چھیٹن مسکرایا۔ اور بھیا کے حکم کے مطابق بیوی کا زیور رہن رکھکر صرف دو سو روپیہ اس وادی میں لگنے فرسٹ کلاس میں سفر ہوا۔ اور ہمارے بھیا اپنے بھولے شکار کے ساتھ لکھنؤ کے ایک شاندار ہوٹل میں قیام پذیر ہو گئے۔ کیک۔ پیسٹری۔ انڈا۔ توس مکھن۔ شامی کباب۔ نرگسی کوفتے۔ بریانی۔ قورمہ۔ اور متنجن اڑتا رہا۔ ادھر روزانہ ناشتہ کے بعد ہمارے بھیا پچاس ٹکڑے دیسی پان فلاں تنبولی سے منوا کر چھیٹن کی کوشش کے لئے نکل جاتے ۔۔ امین آباد پارک۔ حضرت گنج۔ اور مختلف دیگر تفریحی مقامات کی سیر سپاٹے کے بعد شام کو واپسی ہوتی۔ چھیٹن مسکراتے ہوئے خیر مقدم کے لئے بڑھتا۔ اور ہمارے بھیا۔ "اُف! بہت تھک گیا ہوں"۔ کے دل دوز نعرے لگاتے ہوئے مسہری پر دراز ہو جاتے۔ اور پھر ایک من گھڑت کہانی شروع ہوتی۔ "چھیٹن! آج میں تمہارے لئے مشرا جی سے ملا تھا۔ یہ پانڈے جی کے گہرے دوست اور میرے پرانے کرم فرما ہیں۔ دیکھتے ہی ایک پاؤں سے کھڑے ہو گئے اور آ۔ بے۔ لونڈے۔ جا۔ بے۔ لونڈے کی تحکمانہ آوازوں کے ساتھ۔ لیمن۔ جنجر۔ برف۔ پان۔ سگریٹ۔ اور نہ جانے کیا کیا الا بلا چیزوں کے لانے کا حکم دیا گیا۔ میں نے لاکھ معذرت کی "مشرا جی! آخر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے"۔ مگر صاحب! ہماری ایک نہ سنی گئی۔ کہنے لگے۔ "بھیا میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب کچھ آپ کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے"۔ غرض کھانے پینے کے بعد جب حرف مطلب زبان پر لایا۔ تو گویا ہوئے "سب کچھ ہو جائے گا۔ ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔ ذرا دم لو۔ غریب خانہ پر قیام کیجئے۔ ہم آپ کے حکم سے کبھی باہر نہ ہو سکیں گے۔ پچھلے دنوں آپ نے ضلع مجسٹریٹ کے تبادلہ کے لئے لکھا تھا۔ سو اسے ایسی جگہ بھجوا دیا ہے کہ تمام عمر یاد کرے گا بچہ! ۔ پرسوں خود روتا ہوا آیا تھا "بھگوان کے لئے میرا تبادلہ نہ کیجئے"۔ میں بھیا سے معافی مانگ لوں گا۔ مگر میں نے جھڑک کر بھگا دیا۔ سوچئے! ۔ یہ چار ٹکے کے آدمی اگر اسی طرح ہمارے ورکروں کی توہین کرتے رہے تو بس اس ساری جماعت کا اللہ ہی بیلی ہے۔ غرض بھیا اسی طرح تمام دن کی سرگذشت سناتے رہے اور چھیٹن غریب سنتا رہا۔ اور پھر دوسرے دن بھی حسب معمول لڈن بھیا پچاس ٹکڑے پان اور دس روپیہ بطور الاؤنس لیکر کسی نئے شاستری جی سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ تمام دن کچہری کی خاک چھانی۔ محکموں کا چکر کاٹا۔ دفتروں کی جھڑکیں اٹھائیں اور شام کو وہی ڈھاک کے تین پات والی کہاوت کے مصداق بے نیل و مرام واپس لوٹے۔ اور آنے والی کل پر آئندہ پروگرام کے سبز باغ دکھانے شروع کئے۔ دو ایک طرح تین چار روز تک مختلف محکموں کی جھڑکیں اٹھانے اور گڑگڑانے کے بعد جب بھیا کو یہ یقین ہو گیا کہ اب غریب چھیٹن کے پاس واپسی کا صرف کرایہ ہی باقی رہا ہے تو اس کو اطمینان دلا دیا گیا کہ پانڈے جی نے وعدہ کر لیا ہے جگہ خالی ہونے پر ضرور ضرور خیال رکھا جائے گا ۔۔۔۔۔۔ اب اگر کوئی جگہ ہی خالی نہ ہو تو غریب چھیٹن کی قسمت۔ بھیا کا اس میں کیا قصور ۔۔۔۔۔ اس پر بھی کوئی ان سے بدگمان ہی ہونا چاہے تو ہوا کرے لیکن یہ دنیا جانتی ہے کہ آج حکام رسی میں بھیا اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ اس روز کی بات ہے کہ ہمارے شہر میں کوئی منسٹر تشریف لا رہے تھے۔ ضلع کی کانگرس کمیٹی اور حکام کی طرف سے خیر مقدم کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور بھیا خواہ مخواہ اپنے آپ کو کچھ مصروف سا محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ بنگالی کٹ قمیص کی آستین چڑھائے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح اڑے اڑے پھر رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ وہ صرف بھیا ہی ہوتے تو یقین جانئے کہ غنڈہ ایکٹ کے تحت دھر لئے جاتے۔ مگر شکر ہے کہ بھیا ہونے کے علاوہ وہ کچھ اور بھی تھے۔ اور یہ کچھ اور ہونا ہی گویا ان کے لئے پروانۂ راہ داری تھا جس کو لئے وہ جہاں چاہے جائیں۔ جو چاہے کریں۔ خود مختار ہیں۔ آزاد ہیں۔ اور بزعم خود سیاسی ورکر۔ پھر کسی کی کیا مجال جو ان سے آنکھ بھی ملا سکے۔ چنانچہ وہ بالکل آزاد تھے اور اس روز کچھ مصروف نہ ہونے پر بھی بے حد مصروف۔ منسٹر کی آمد پر جب ان کا ایک شاندار سواگت کیا گیا تو ہمارے یہ عظیم المرتبت بھیا نہ جانے کس تکڑم سے منسٹر کے قریب ہی فٹن میں براجمان ہو گئے۔ دنیا نے دیکھا۔ شہر والوں نے دیکھا۔ بھیا کے عزیز و اقربا اور محلہ والوں نے دیکھا۔ اور حد ہے کہ خود چھیٹن بھی اس بصیرت افروز منظر کی تاب نہ لاکر زیر لب بڑبڑا اٹھا۔ ع

"بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترا تا"

چھیٹن اس طرح اپنے جلے پھپولے پھوڑتا رہا۔ مگر فضا پہلے ہی بے کاروں سے گونج رہی تھی۔ اس لئے نقار خانہ میں طوطی کی صدا سننے والا ہی کون تھا۔ "اُف چھیٹن بے چارہ" ۔۔۔۔۔۔ انڈوں کی حرارت سے کبھی کبھی بھیا میں پرانے ادبی جراثیم بھی عود کر آتے ہیں۔ چنانچہ اردو تحفظ اور الیکشن کے سلسلہ میں اکثر آل انڈیا قسم کے مشاعرے کرانا بھیا اپنا ایک ادبی کارنامہ اور قومی خدمت سمجھے ہوئے ہیں۔ اور عجیب اتفاقات ہیں کہ اس قسم کے ہر مشاعرے کے بعد بھیا کے نئے مکان میں کچھ نہ کچھ تعمیر شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ مقصد تو تعمیر سے ہے ۔۔۔ ادب کی نہیں تو مکان ہی کی سہی۔ چنانچہ اردو کی بقا اور ترقی کے لئے نئی انجمن کی تشکیل بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔

یاد ش بخیر! پچھلے سال بھی ایک ایسی ہی ادبی انجمن بنائی گئی تھی اور ہر شخص جانتا ہے کہ ممبر سازی کے لئے بھیا کے طوفانی دوروں نے محلات اور قصبات کہاں دیہات تک میں ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔ آج کی یہ انجمن بھی اسی سابقہ انجمن کا جدید ایڈیشن سمجھئے۔ جس کی ممبری کے لئے بھی "تعاون" وہی آٹھ آنہ ماہانہ مقرر کیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ بھیا کی کوششوں سے ماشاءاللہ دو سو ممبر داخل رجسٹر ہو چکے ہیں اور بالحمد اللہ کہ اس وقت انجمن کی ماہانہ آمدنی مبلغ سو روپیہ ہے۔ چنانچہ ماہ گذشتہ بھیا نے سو روپئے کی پہلی قسط کہ جس کے نصف مبلغ پچاس روپیہ سکہ رائج الوقت ہیں، مملکت ہندوستان بھیجتے ہیں۔ وصول کر کے رسیدات کاٹ دیں تاکہ سند ہوں اور وقت ضرورت کام آویں۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انجمن کے اغراض و مقاصد میں تعلیم بالغان کے آئیٹم کا بھی اضافہ کیا گیا ہے اور یہ ہمارے بھیا کے اختیارات خصوصی کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے چنانچہ پچھلے جمعہ کی بات ہے کہ بھیا کی زبانی محلہ میں ایک اسکول جاری کرنے کا اعلان کیا گیا۔ دوسرے دن ان کا دس نمبری بھتیجا جو مشکل سے بچپن میں "عم" کا پارہ پڑھ پایا تھا ساٹھ روپئے مشاہرہ پر ملازم رکھ لیا گیا۔ اب آپ چلاتے رہئے

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

لیکن یہ نہ سمجھ لیجئے کہ بھیا کا بھتیجا ملازم رکھا گیا ہے۔ وہ اس پر بھی ملازم رہے گا۔ لیجئے بسم اللہ کر کے اب آپ بھی نعرہ لگائیے۔

"بھیا زندہ باد۔ تعلیم بالغان پائندہ باد۔ اقربا نوازی تابندہ باد"

بھیا کے ان تاریخی کارناموں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ وہ مرثیئے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر پھیپھڑوں کی آخری قوتوں سے چلاؤں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ قوم کے پھوٹے پھلے چمن کا یہ دیدہ ور اگر کہیں چل بسا تو اس چمن کا کیا ہوگا۔ زبیری۔ رسولا۔ اور مجھ پر کیا گذرے گی۔ ہمارا کیا بنے گا۔ اردو کیسے باقی رہے گی۔ اُف خدایا۔ رحم کر۔

شمسی رحمانی اعظمی

دَلدَل سے باہر (۲) — ایک ناولٹ

(۵)

باہر پہنچنے پر میں نے یکّہ سے تین شوٹ بُوٹ میں ملبوس نوجوانوں، ایک برقعہ پوش عورت، اور ایک بے پردہ لڑکی کو، جس کی عمر بیس سال کی ہوگی۔ اُترتے دیکھا — خالو جان نے تینوں نوجوانوں سے میرا تعارف کرایا۔

"یہ ہیں جمال۔ یہ ہیں مسعود، اور یہ ہیں اختر — یہ تینوں فیض آباد میں رہتے ہیں اور میرے بھتیجے ہیں — اور جمال، یہ میرا لڑکا ہے۔" وہ میری طرف اشارہ کرکے بولے۔ "اس سال الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان دے کر آیا ہے۔ اور یونیورسٹی کے سب سے اچھے لڑکوں میں گنا جاتا ہے۔"

ہم تینوں نے ذرا سرد مہری سے ہاتھ ملایا۔ اور جمال صاحب انگریزی میں بولے۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

میرے جی میں آیا۔ کہہ دوں۔ مجھے تو آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ مگر ہماری سوسائٹی کے نام نہاد اخلاق کو توڑنے کی ہمت ابھی مجھ میں پیدا نہیں ہوئی تھی . . . . اور میں نے جواب دیا۔

"مجھ کو بھی آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی ہے۔"

مسعود صاحب نے پھر انگریزی میں سوال کیا۔

"آپ نے بی۔ اے میں کون سے مضمون لئے تھے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ادب انگریزی، اقتصادیات، اور فلسفہ۔" اس کے بعد اسی قسم کی رسمی بات چیت ہوتی رہی۔ اور تھوڑی دیر میں میں اُوپر چلا گیا۔

آپا جان نے جاتے ہی سوال کیا۔ "کہو کیسے آدمی ہیں؟"

"ان کی دنیا دکھاوے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔" میں نے جواب دیا۔

"عشرت کو دیکھ کر تم غالباً اس سے بھی خراب رائے قایم کروگے۔" وہ پُر خیال انداز میں بولیں۔

"عشرت کون ہیں؟" میں نے بے پروائی سے سوال کیا۔

"وہی لڑکی، جس کو تم نے دیکھا تھا۔" وہ بولیں۔

"اچھا —" میں نے جواب دیا، اور اپنی کتاب کھول کر اسی میں محو ہوگیا۔ بمشکل آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ایک چھوٹا سا بچہ آکر مجھ سے کہنے لگا!

"چلیئے آپ کو جمال بھائی بلاتے ہیں۔"

"کیوں —؟" میں نے بغیر نظر اٹھائے سوال کیا۔

"ہمیں نہیں معلوم۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا — بچہ میرے آگے آگے چلا۔ جمال کے مکان اور ہمارے مکان کے بیچ میں صرف ایک پتلی سی گلی واقع تھی اور دونوں کے دروازے بالکل سامنے تھے۔

باہر کے کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور تینوں بھائی بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ بیچ میں تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے اور ایک طرف وہی لڑکی بیٹھی ہوئی ایک پائپ کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ اس کے بال اگرچہ کٹے ہوئے نہ تھے اور عجیب سے انداز میں سنورے ہوئے تھے کینتھرڈین کی تیز خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی جس میں "ایوننگ اِن پیرس" کی خوشبو ملی جُلی تھی۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی جو اس کے چہرے کو ایک سے زیادہ بار دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ بحیثیت مجموعی وہ جمیل تھی مگر اس کے چہرے سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی دنیا محض تزئینِ جمال تک محدود ہے۔

"آیئے جناب آپ ہی کا انتظار تھا۔" مسعود نے کہا۔

"اس انتظار کا شکریہ۔" میں نے طنز اور سنجیدگی کے ملے جُلے انداز میں کہا۔

"ان سے ملئے۔" جمال نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہ ہماری بہن ہیں عشرت۔ اس سال ہائی اسکول کا امتحان دیا ہے۔"

میں نے ہاتھ ملانے کی ضرورت نہ سمجھی اور خشکی سے کہا — "بہت خوب۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُوپر اٹھائیں۔ ان کی چمک اور بڑھ گئی تھی۔ اور وہ مسکرا کر اس طرح بولی جیسے مجھ سے اس سے برسوں کی ملاقات ہو۔

" اور مجھے تو آپ سے مل کر بہت بڑی خوشی ہوئی "

مجھے یہ بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی مجھ جیسا خشک انسان کیا پسند کرتا جس کے دوستوں کا حلقہ شاہد منصور اور وحید آگے کبھی نہ بڑھا تھا میں نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا اس سے الگ رہنے کی کوشش کروں گا ۔

" یہ ایک عجیب بات ہے کہ اگرچہ ہم سے اور آپ سے جان پہچان ہو چکی ہے مگر ہم میں سے کسی کو آپ کا نام نہیں معلوم ہے " اختر نے مجھ سے کہا ۔

" میرا نام انور ہے " میں نے کہا ۔

مسعود نے مجھ سے پوچھا ۔

" آپ کونسا کھیل پسند کرتے ہیں "

" میں تقریباً ہر کھیل جانتا ہوں " میں نے کہا " جو آپ پسند کریں گے وہی میں بھی کھیلوں گا "

" برج کے علاوہ اور کوئی کھیل تو شریفوں کے قابل ہے نہیں " جمال صاحب نے اس انداز میں کہا جیسے برج کھیلنا انہوں نے ورثہ میں پایا ہو ۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ۔ اختر میرے ساتھی بنے اور کھیل شروع ہو گیا ۔

مسعود نے شروع کیا " ون کلب "

" ون ڈائمنڈ " ۔۔۔ اختر بولے ۔

" ون اسپیڈ " جمال نے کہا ۔

" ون نو ٹرمپ " میں نے کہا ۔

مسعود نے کہا " نو بڈ "

اختر نے بھی کہا " نو بڈ "

جمال بولے " ٹو اسپیڈس "

میں نے کہا " تھری کلبس "

تیسری بار کسی نے کچھ نہ کہا ۔ سب نو بڈ کہتے گئے ۔ صرف میں نے کہا ۔ فور کلبس " اور کھیل شروع ہو گیا ۔ اختر نے اپنے پتے سامنے پھیلا دیئے ۔

کچھ دیر تک کھیل ہوتا رہا ۔ اتنے میں یکایک عشرت بول اٹھی ۔

" جمال بھائی آپ " لٹل سلام " بنائیے "

" لٹل سلام " نہیں " گرینڈ سلام " بناؤں گا " جمال نے ذرا تیز لہجہ میں کہا " پاگل ہو گئی ہو کیا ۔۔۔ ؟ انور صاحب کی " کال " Call ہے اور میں بناؤں گا لٹل سلام " ۔۔۔

" انور بھائی ۔۔۔ ؟ " اس نے طنزیہ انداز میں کہا ۔ " ان کو تو کھیلنا ہی نہیں آتا "

" چپ رہو عشرت " مسعود نے تنبیہ کے انداز میں کہا ۔

عشرت کچھ دیر خاموش رہی ۔ پھر کہنے لگی ۔

" انور بھائی خدا کرے آپ ہمیشہ ہارتے جائیں "

میں خاموش رہا مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس نے پھر کہا ۔

" اونہہ آپ کو تو کھیلنا ہی نہیں آتا "

اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ سے وہ کچھ اس قسم کے موتی بکھیرتی رہی :۔

" خدا کرے آپ ہمیشہ ہارتے جائیں "

" نہیں ، یہ نہیں ، یہ کارڈ پھینکئے "

" آپ نے غلط " بڈ " (Bid) کی ہے ۔

" آپ کو تو کھیلنا آتا ہی نہیں "

" معلوم ہوتا ہے آپ کی یونیورسٹی میں برج کے کھلاڑی ہی نہیں ہیں "

وغیرہ ۔

اس کے بھائیوں نے اس کو خاموش کرنے کی لاحاصل سعی کی ۔ مگر میں اس طرح خاموش رہا جیسے وہ یہ سب کسی اور سے کہہ رہی ہو ۔

ہم لوگ کافی دیر تک کھیلتے رہے اس کے بعد میں آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا ۔ آپا جان سے معلوم ہوا کہ عشرت صاحبہ پچھلے سال ہائی اسکول میں فیل ہو گئی تھیں اس لئے کہ کتابوں سے زیادہ چہرے دیکھنے کا شوق تھا ۔

" لیکن آپ کے خاندان میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جو عشرت کی اتنی آزادی کو جائز سمجھتا ۔ یہ اتنی آزاد کیسے ہو گئیں ۔۔۔ ؟ " میں نے سوال کیا ۔

" ہمارے مرحوم چچا جان پرانے زمانے کے بی ۔ اے تھے ۔ اس لئے بہت زیادہ آزاد خیال تھے ۔ انہوں نے شروع سے عشرت کو بے پردہ رکھا ۔۔۔ اور جب باپ ہی یہ سب کچھ کر رہا تھا تو بولنے کا اختیار کسے تھا " انہوں نے جواب دیا ۔

عشرت سے میری کشیدگی خاطر بڑھتی گئی ۔۔۔ مگر وہ ہمیشہ ہم لوگوں کے ساتھ رہتی اور اس کے موقع بے موقع تیروں کا ہدف میں ہی ہوتا ۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے لیکن اس کا مداوا میرے بس کا نہ تھا ۔

میں چونکہ کتابیں سب پڑھ چکا تھا اس لئے میرا زیادہ وقت تاش میں صرف ہوتا ہم لوگ زیادہ تر برج کھیلتے یا اگر عشرت شامل ہو جاتی تو بلیک کوین Black Queen کھیلتے ۔ مسعود ۔ جمال اور اختر کی تعلیم صرف ہائی اسکول تک محدود تھی اس لئے ان سے ستھرے ادبی ذوق کی توقع کرنی بیکار تھی ۔ اور وہ

لوگ اپنی اعلیٰ ذہانت کا اظہار صرف برج اور بلیک کوین کے محدود دائرے کے اندر کر سکتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔

عشرت کا بڑھتا ہوا "التفات" میرے لئے تکلیف دہ تھا۔ میں اسے گرد و راہ سمجھتا تھا جو ہر راہی کے دامن سے لگ کر کچھ دور چلتی ہے اور پھر ادھر ادھر آوارہ ہو جاتی ہے ——— لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی کرم فرمائیاں بڑا گہرا رنگ لائیں گی۔ اسی درمیان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے دماغ کے اندر بنے ہوئے سکون کے محل کو متزلزل کر دیا۔

ایک بار ہم لوگوں نے گاؤں سے چار میل دور ایک پُرفضا مقام کی سیر کا ارادہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ عشرت ساتھ نہ ہو مگر جونہی ہم گھر سے باہر نکلے عشرت سامنے سے آتی ہوئی مل گئی۔

"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے میری طرف رخ کر کے ایک وسیع مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو دعوت مجسم تھی۔

"ٹہلنے" اختر نے کہا۔

"میں بھی چلوں گی" اس نے بچوں کی طرح کہا۔

"بہت دور جانا ہے۔ آپ نہیں چل سکتیں" میں نے کہا۔

"نہیں ——— میں چلوں گی" اس نے مچل کر کہا۔

مجبوراً اسے بھی ساتھ لینا پڑا۔ راستے بھر عشرت بے محابا اور بے محل قہقہے لگاتی رہی۔ ایک جگہ بکری کے چند بچے اچھل کود رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر اس نے بچوں کی طرح قہقہہ لگایا اور کہنے لگی۔

"اہا انور بھائی۔ ذرا ان سب کو دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشاق کھلاڑی نے چار پانچ فٹ بال کی گیندوں کو ایک ساتھ رکھ کر (Kick) کِک لگا دی ہو"

"واہ تشبیہ کتنی جاندار ہے" اختر شاعرانہ انداز میں بول اٹھا۔

تشبیہ جاندار تھی یا بے جان، مگر اس بے موقع قہقہے نے میری طبیعت قریب قریب مکدر کر دی۔

اس وقت غالباً شام کے چار بجے تھے۔ سورج دن بھر اپنی شعلہ باریوں کا مظاہرہ کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ دور شاید کوئی ٹرین ایک خاموش سا شور کرتی ہوئی گذر رہی تھی۔ فضا پر کچھ خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کوئی کوا کائیں کائیں کرتا ہوا ہمارے سروں پر سے گذر جاتا ——— حدِ نگاہ تک بھوری زمین پھیلی ہوئی تھی۔

چاروں بھائی بہن باتیں کر رہے تھے مگر میں ان کی باتوں میں بہت کم حصہ لے رہا تھا۔ وہ شاید کسی فلم کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ میں صرف خاموشی سے سنتا رہا۔ میرے ذہن کا بوجھ اس وقت کچھ زیادہ معلوم ہو رہا تھا ——— چار میل خلافِ امید جلد ہی گذر گئے اور ہم اس باغ تک پہنچ گئے جہاں کے لئے چلے تھے۔

باغ کے پھاٹک پر عشق پیچاں کی گھنی بیل بہت اونچائی تک چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے قریب قریب سارے پھاٹک کو ڈھک لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے عشق پیچاں کی بیل پھاٹک پر ہی اُگی ہو۔ اندر شمشاد کے پیڑوں کے بیچ میں ایک حسین سنگ مرمر کا فوارہ ابل رہا تھا۔ رنگین سنگ مرمر کا یہ قدیم طرز کا فوارہ ہرے ہرے پیڑوں کے بیچ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شمشاد کے پھول سے ہی پانی ابل رہا ہو ——— شفاف پانی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے فوارہ بجائے پانی کے چاندی اگل رہا ہو۔ بلند آسمانوں سے باتیں کرتے سرو ایک شاہانہ خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کا بے آوازہ نطق پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس جنت کے حکمراں وہی ہیں . . . . . گلاب کے بڑے بڑے پھول اور ادھ کھلی کلیاں عجیب سے شرمائے ہوئے انداز میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ پتیوں کے بیچ میں گلاب کے پھول ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے بہت سی رنگین تتلیاں ایک ساتھ بیٹھی ہوں۔ انار کے گنجان درختوں میں غیر معمولی طور پر بڑے بڑے انار جھول رہے تھے ——— ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تاروں پر پرندے جھول رہے ہوں۔ ملی کے سفید سفید پھولوں پر ایک حسین، معصوم کنوارپن سا برس رہا تھا۔ جیسے انہیں فرشتوں یا چاند سورج کی پاک کرنوں، اور ہوا کے لطیف جھونکوں کے سوا کسی نے چھوا نہ ہو۔ میرے جی میں آئی کہ میں بڑھ کر انہیں چوم لوں اور وہ شرماتی لجاتی ہوئی لڑکیاں بن جائیں . . . . .

میں اپنے اس خیال پر خود ہی مسکرا پڑا۔

مجھے یہ احساس نہیں کہ میرے ساتھیوں کے احساسات کیا تھے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ اس باغ کا حسن دیکھ کر مبہوت ہو گئے تھے۔ عشرت کی شوخ روح بھی فطرت کے معصوم حسن سے متاثر ہو گئی تھی۔

یہ باغ اب خانوادے کی ملکیت تھا اور انہوں نے اس کی نگہداشت کے لئے کئی مالی مقرر کر دیئے تھے۔

جب ہم اچھی طرح سیر کر چکے تو میں نے واپس چلنے کی رائے دی۔ مگر عشرت بول اٹھی۔

"واہ انور بھائی۔ ابھی تو ہم لوگ آئے ہیں ابھی جانے سے کیا فائدہ۔ آیئے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر بلیک کوین (Black Queen)

کھیلی جاتے ہیں"

"مگر تاش کہاں ہے — ؟" میں نے کہا۔

"میں لیتا آیا ہوں" مسعود بولا۔

مجھے ماننا پڑا اور ہم سب ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

کھیل شروع ہو گیا — چند منٹ تک تو عشرت خاموش رہی پھر دفعتہً بول اٹھی۔

"انور بھائی - میں آپ کو دل کی ملکہ دوں گی"

سب اس پر ہنس پڑے - اس لئے کہ انگریزی میں پان کو Hearts (دل) کہتے ہیں۔ اور اس کی شکل بھی دل ہی کی سی ہوتی ہے۔ اور اس وقت عشرت نے پان کی ملکہ والا کارڈ پھینکا بھی تھا — کہنے کو تو یہ ایک مذاق تھا مگر میں اس کا مفہوم سمجھ گیا اور خاموش رہا لیکن وہ سب ختم ہونے کے بعد میں دردِ سر کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔ اور چاروں بھائی بہن برج کھیلنے لگے۔

جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ہم سب واپس ہوئے۔ مگر عشرت کی بات میرے دل کو لگ گئی تھی اور میں اسے بھول نہ سکا۔

اس کے بعد میں عشرت سے دور دور رہنے لگا۔ تاش کھیلنا بھی قریب قریب بند کر دیا اور تین ہی چار دن بعد واپس الہ آباد چلا گیا۔

(۶)

جب میں چلنے لگا تو عشرت میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

"انور بھائی"

"کیا ہے ؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"آپ مجھے اپنی کوئی یادگار دیتے جائیں . . . ." اس نے جواب دیا۔

"یعنی — ؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"یعنی کچھ نہیں" وہ شرما سی گئی "ہم آپ اتنے دن ساتھ رہے ہیں، اپنی کوئی چیز مجھے دیتے جائیں جو آپ کی یاد ہمیشہ قائم رکھے"

"میری یاد ہی میری یادگار رہے" - میں نے کہا "میں اس سے قیمتی چیز آپ کو دے سکتا ہوں" وہ خاموش ہو کر چلی گئی۔

یکہ تیار تھا سب لوگوں سے رخصت ہو کر میں اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

چچا جان کے یہاں آ کر میں نے ایک اور نیا چہرہ دیکھا - میں نے محسوس کیا کی فطرت میں ذہانت اور خود پسندی کے عناصر ملے ہوئے تھے حقیقت میں وہ مجھے اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بہت الگ نظر آئی اس کے چہرے پر وہ عجیب و غریب ماورائی کیفیت تھی جو جمال و جلال کے نادر امتزاج سے بنتی ہے۔ چچی سے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ان کی بہن کی لڑکی ہے اور یہیں کچھ دن رہنے آئی ہے۔

اب روز بروز میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہوتا جا رہا تھا — اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ بلکہ میں نے اس کے چہرے پر ایک ماورائی بلکہ مافوق العادت سی کیفیت دیکھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیدھی آسمانوں سے چلی آ رہی ہے۔

ادھر عشرت اپنے عجیب ماحول کے ساتھ کبھی کبھی میرے خیالوں پر مسلّط ہو جاتی — عشرت کا عجیب و غریب طرزِ عمل اور رحیلہ — اس کے چہرے کا وہ جلال و جمال کا نادر امتزاج۔ یہ دونوں چیزیں مجھے ہر وقت گھیرے رہتیں اگرچہ میں عشرت کے طرزِ عمل کا مطلب سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ عشرت مجھ کو کہاں لے جانا چاہتی تھی مگر پھر بھی اس کا خیال مجھے پریشان کیا کرتا غرض ذہن میں عجیب سی پراگندگی تھی۔

ایک شام کو میں کہیں سے لوٹ کر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا رحیلہ کتابوں کی میز کے پاس کھڑی کچھ کتابیں اُلٹ پلٹ کر رہی تھی . . . . . .

اس نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو گیا۔

میں نے پوچھا "آپ کر کیا رہی ہیں"

پھر وہ اپنے کو سنبھال کر بولی۔

"کتابیں تلاش کر رہی تھی"

"کیسی کتابیں آپ پڑھتی ہیں —؟" میں نے سوال کیا۔

اس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں الماری سے ایک کتاب نکال کر اُسے دی۔ اور کہا۔

"یہ کتاب آپ کو پسند آئے تو لے لیجئے"

اس نے ہاتھ بڑھا کر کتاب لے لی۔ وہ قیسی رامپوری کی "خیانت" تھی میں نے دیکھا کہ وہ بُری طرح شرما رہی تھی — شاید میں نے کمرے میں آ کر کوئی غلطی کی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔

"اگر آپ کو میرا آنا ناگوار ہوا ہو تو میں باہر چلا جاؤں — ؟"

لیکن قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ سے آگے بڑھ سکوں وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں کھڑا رہ گیا اور دیر تک مجھے ایک ایک کر کے تمام باتیں یاد آتی رہیں

---

(۷)

میرے الہ آباد آنے کے چار دن بعد اخباروں میں نتیجہ کا اعلان ہوا۔ شاہد یونیورسٹی میں فرسٹ آیا تھا اور میں سکنڈ۔ وحید اور منصور سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے [illegible] ایک ایک تار دیا اور خود میرے پاس دو دن کے اندر نہ جانے کتنے تار اور خطوط آئے۔ شاہد نے تار دیا۔

"مبارک باد۔ تمھاری کامیابی پر تمھیں۔ اور اپنی کامیابی پر خود کو"

سب سے پیارا تار آپا جان کا تھا۔

"خوشیوں کی وادی کا سب سے خوشبودار پھول تمھاری نذر کرتی ہوں"

ابھی یونیورسٹی کھلنے میں پندرہ دن باقی تھے اس لئے میں باندہ چلا گیا۔

جب یونیورسٹی کھلی تو باندہ سے میں واپس آیا۔ یونیورسٹی کی چہل پہل میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ جو ایک عام بات ہے۔ نئے نئے پروفیسر۔ نئی نئی صورتیں، اور نئی نئی دلچسپیاں، بہت سی نئی چیزیں ایک ساتھ ہو جاتی ہیں ——— منصور، وحید، اور شاہد سے ملاقات ہوئی۔ منصور اور وحید میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ مگر شاہد بہت بدل گیا تھا۔

اس کے چہرے کی سنجیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اب بے ضرورت باتیں نہ کرتا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خلوص، صداقت اور نرم دلی بہت واضح نظر آتی تھی ——— اور آہستہ آہستہ مجھے اس کے اندر اور بھی تغیرات کا علم ہوا۔ وہ سینما اب کبھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کی زندہ دلی اب صرف مخصوص مواقع تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور ایک دن تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اسے ایک مسجد میں جاتے دیکھا!

میں نے اس سے کئی بار اس تغیر کا راز معلوم کرنا چاہا۔ میں کیا یونیورسٹی کے ہر فرد کو اس کی اس تبدیلی پر حیرت تھی۔ مگر یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ ایک اور بات جو مجھے بہت عجیب لگی وہ یہ تھی کہ اگرچہ اس نے مجھ سے بارہا ایم۔اے انگریزی ادب میں کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اس نے اقتصادیات لینا پسند کیا۔

وہ اقتصادیات کا طالب علم تھا اور میں انگریزی کا اس لئے مجھ سے اور اس سے یونیورسٹی میں بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن جب میں اس سے ملا تو قدرتاً میں نے پہلا سوال اس سے یہی کیا۔ اس نے خاموشی سے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لائبریری میں لے گیا۔ ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے اور اس نے کہنا شروع کیا۔

"انور۔ تم ایک سمجھدار انسان ہو۔ میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا تم نے کبھی اپنے دماغ کا جائزہ (Introspection) لیا ہے؟"

"ہاں ———" میرے منہ سے نکل گیا۔

"تو تم نے کیا محسوس کیا ———؟" اس نے سوال کیا۔

"یہی ——— کہ میرے ذہن میں عجیب سی ناقابل تشریح بے چینی رہتی ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیوں ———؟" اس نے ایک کامیاب وکیل کی طرح جرح کرتے ہوئے کہا "کیا تم کسی سے محبت کرتے ہو؟ کیا تمھاری زندگی تکلیف سے گذرتی ہے، کیا تمھارے اوپر کوئی بوجھ ہے ———؟"

"نہیں ———" مجھے اعتراف کرنا پڑا۔

"پھر کیا وجہ ہے کہ باوجود تفریح، ادب، اور فلسفہ میں ڈوبے رہنے کے تم بے چین رہتے ہو؟"

"میں نہیں کہہ سکتا ———" میں نے جواب دیا "مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اسی بے چینی سے فرار ہو کر میں نے ان چیزوں میں پناہ لی ہے"

"بالکل ٹھیک" شاہد نے کہا "یہی حال میرا بھی تھا۔ میں نے اپنی ذہنی کشمکش کا تذکرہ تم سے بھی نہیں کیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے بچنے کے لئے میں اکثر تمام رات طوائفوں کے یہاں گذار دیا کرتا تھا۔ میرا سینما دیکھنے کا جنون انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔ یہ تم جانتے ہی ہو ——— لیکن سکون مجھے کہیں نہ ملا۔ ۔ ۔ ۔"

وہ سگریٹ جلانے کے لئے رکا۔ اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں نے بہت سوچا۔ بہت مطالعہ کیا۔ اور تب میری سمجھ میں آیا کہ سکون کہاں مل سکتا ہے۔ مجھے سکون ملا خدا کے سائے میں اور ایمان کی روشنی میں اور خلوص و صداقت میں ۔ ۔ ۔ ۔ تم شاید اس پر کچھ اعتراض کرو مگر حقیقت ہے۔ میں نے بہت سے کمیونسٹ لڑکوں کی نفسیات کا غائر مطالعہ کیا۔ مگر میں نے سب کے عیش و مسرت کی تہہ میں خلش اور کسک، درد، اور بے چینی پائی۔ ۔ ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا کو مانے بغیر ہم زندگی کے بہت سے مسائل حل ہی نہیں کر سکتے۔ مثلاً اس کائنات کی اصلیت کیا ہے۔ اس کا خالق کون ہے۔ اس دنیا کے بعد اور کوئی دنیا ہے یا نہیں، اس دنیا کی نوعیت کیا ہو گی ——— وغیرہ جب تک میں نے خدا کو نہیں سمجھا تھا میرے ذہن میں بہت سی الجھنیں تھیں مگر اب میں روشنی میں ہوں ——— اب میں سکون کی تلاش میں تاریک تاریک

سینما ہالوں اور بالاخانوں کی سیر نہیں کرتا۔ میں نے سکون اس سے پایا ہے۔ جو سکون اور اطمینان کا خالق ہے . . . . اب میرے ذہن کے تاریک گوشے منور ہو گئے ہیں "

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

مجھے آپا جان یاد آگئیں۔ مگر دوسرے لمحہ میری فلسفیت پھر ابھر آئی۔ میں نے کہا۔

" لیکن یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے جو چیز ہمیں اپیل کرتی ہے وہ دوسروں کو بھی متاثر کرے۔ میرا اور تمھارا معاملہ تو بہت غیر معمولی ہے۔ عام انسان کے لئے اسلام کیا کرتا ہے؟ اگر اسلام صرف ایک وجدانی چیز ہے اور موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کرتا تو میں یقیناً اشتراکیت کو ترجیح دوں گا "

" نہیں " شاہد نے کہا "میں نے اسلام کو صرف اس لئے نہیں مانا کہ مسلمان ہو کر میرے ذہن کو سکون مل جائے گا۔ یہ چیز تو اسلام لانے کا ایک نتیجہ ہے۔ میں نے اسلام اس لئے اختیار کیا کہ اس کا اقتصادی، سیاسی، اور معاشرتی نظام سب سے اچھا اور تمام برائیوں سے پاک ہے۔

" اسلام کا اقتصادی نظام ـــــ؟ " میں نے متعجب ہو کر کہا۔ " اسلام تو صرف ایک مذہب ہے میرے دوست "

" معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسلام کو دور سے بھی نہیں دیکھا۔ کچھ دن قبل میری بھی یہی حالت تھی۔ مغربی فلسفہ نے ہم لوگوں کی توجہ اپنی طرف اتنی مبذول کر لی تھی کہ ہم اپنے گھر کے زر و جواہر کو بھول گئے۔ تم کو چاہئے کہ تم اسلام اور اشتراکیت کا کافی مطالعہ کر لو۔ میں کل تمہیں کتابیں لا دوں گا " اس نے جواب دیا۔

فراق صاحب کے کلاس کا وقت ہو گیا تھا۔ اور میں شاہد سے رخصت ہو کر کلاس میں چلا گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کیا پڑھایا تھا۔ مگر اتنا یاد ہے کہ میں سب سے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا مسلسل سوچتا رہا۔ جب کلاس ختم ہوا تو میں گھر واپس چلا آیا رستے میں میں کئی بار گرتے گرتے بچا اور گھر پہنچتے ہی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا

میرے ذہن طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ رحیلہ، عشرت، آپا جان، شاہد۔ فراق صاحب کی شیروانی کا دامن جو سگریٹ سے جل گیا تھا۔ سٹوڈنٹ، جو میرے پاس بیٹھی تھی اس کی پینٹوں کی دھاریاں، جمال کی ریشمی ٹائی، اور خدا جانے کیا کیا ـــ میں بے سرو پا باتیں سوچتا رہا۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ آپا جان اتنی خوش کیوں رہتی ہیں ـــ؟ اس لئے کہ انہوں نے سکون کی تلاش اس کے وہاں کی تھی جو سکون و اطمینان کا خالق ہے ـــ یعنی خدا؟ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ آپا جان نے شوپن ہار کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتیں ـــ اور ہیوم تو خدا کو مانتا ہی نہیں ـــ مگر لاک تو خدا کو بہت نیک اور محبت کرنے والا بتاتا ہے۔ ـــ خدا ـــ؟ کیا خدا سکون دے سکتا ہے؟ خدا کی ہستی کیا ہے ـــ؟ آپا جان لڑکی جو ٹھہریں ان کا دماغ اس سے آگے نہ جا سکا۔ مگر شاہد ـــ؟ شاہد تو بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ بھی تو یہی کہتا ہے ـــ اور اب اس کو سکون مل گیا ہے۔ اس نے شوپن ہار، کانٹ۔ اور نطشے سب کا مطالعہ کیا ہے، وہ کم بخت کیوں ایسی بات کہتا ہے ـــ؟ مگر شاہد کے پاس بھی سکون ہے۔ اور آپا جان کے پاس بھی ـــ یہ کیوں؟ میرے پاس سکون کیوں نہیں؟ برنارڈ شا کہتا ہے خدا نامکمل ہے ـــ کیا واقعی؟ ـــ نامکمل نہ ہوتا تو دنیا میں اتنا فتنہ و فساد کیوں ہوتا ـــ؟

" مگر میرے پاس سکون کیوں نہیں؟ شاہد اور آپا جان کے پاس سکون ہے ـــ اس لئے کہ وہ خدا کو مانتے ہیں ـــ مگر عشرت بھی تو بہت خوش رہتی ہے؟ ـــ اس کو تو خدا سے دور کا واسطہ بھی نہیں . . . . مگر [illegible] ہو ـــ ہاں ـــ یہی بات ہے عشرت کا دل مردہ ہو گیا ہے۔ جمال [illegible] اور اختر کی حسّیں بیکار ہو گئی ہیں ـــ مگر خدا ـــ؟ خدا بھلا سکون دے سکتا ہے؟

" سکون کون دے سکتا ہے ـــ؟ کمیونزم؟ کمیونزم کو روح سے کیا تعلق؟ وہ تو مادیت کا فلسفہ ہے۔ اس دن کامریڈ رضا ہی مجھ سے کہہ رہا تھا " انور ـــ میرے دل میں بے چینی سی رہتی ہے۔ میں مارکسزم کو مانتا ہوں۔ مگر مجھے سکون نہیں ملتا ـــ نہ جانے کیوں " اور میں نے اسے اسپینوزا اور کانٹ پڑھنے کی صلاح دی تھی ـــ مجھے اسپینوزا اور کانٹ پڑھ کر سکون نہیں ملا تو اسے کیا ملے گا ـــ؟ مگر فراق بھی تو خدا سے دور ہیں؟ ان کے پاس سکون کہاں سے آیا ـــ؟ ـــ مگر خدا ہی جانے کہ ان کے پاس سکون ہے کہ نہیں۔ اگر وہ ابدی سکون کے مالک ہوتے تو ان کی حسن پرستی آج مٹ گئی ہوتی۔

" شاہد یہ بھی تو کہہ رہا تھا کہ اسلام کا ایک اپنا اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام ہے ـــ یہ تو سچی بات ہے کہ بغیر اخلاق کے انسان سدھر نہیں سکتا۔ اخلاق کے بندھن جسم کو تو قید کرتے ہیں مگر روحانی طور پر آزاد کر دیتے ہیں۔ مگر روح ـــ؟ روح ہے بھی کوئی چیز ـــ؟ روح کی حقیقت ضرور کچھ نہ کچھ ہو گی ـــ میں بے چین کیوں رہتا ہوں؟ یہ میری روح کی بے چینی ہے ـــ فراق کی روح تو مر گئی ہے ـــ جمال، اختر اور مسعود کتنے [illegible] ہیں ـــ عشرت کی روح بھی مر گئی ہے ـــ ورنہ اس کے دماغ میں بھی بے اطمینانی رہتی ـــ

" شاہد اور آپا جان کے پاس سکون ہے [illegible] لئے کہ وہ مادہ کے بجائے روح کو پاک کرتے ہیں ـــ وہ خدا کو مانتے ہیں ـــ [illegible] اقتصادی نظام رکھتے ہیں۔

مگر خدا؟ خدا ہے بھی کوئی چیز ــــــ ؟ شاہد یہ بھی کہہ رہا تھا کہ خدا کو مان کر ذہن کی بہت سی گتھیاں کھل جاتی ہیں ــــــ خدا نہ ہوتا تو یہ کائنات آئی کہاں سے؟ ہیوم تو کہتا ہے کہ کائنات خود بخود پیدا ہو گئی ہے ــــــ شوپن ہار کہتا ہے کہ خدا ہے تو مگر اپنی مشیت کا غلام ہے ــــــ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں اتنی مصیبتیں اور تکلیفیں نہ ہوتیں۔ وہ تو صرف پیدا کرنا جانتا ہے ــــــ مگر یہ تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ کائنات کا نظام یقیناً کسی کے ہاتھ میں ہے۔ شاید شوپن ہار حیثیت نہیں جانتا تھا۔ اگر خدا اپنی مشیت کا غلام ہوتا اور زمین کو اور زمین والوں کو آزاد چھوڑ دیتا تو کائنات میں اتنا نظم نہ ہوتا۔ زمین گھومتے گھومتے مریخ یا زحل سے ٹکرا جاتی ــــــ سورج کبھی کبھی بجائے مشرق کے مغرب سے نکلتا اور رات کے بجائے دن ہی رہتا ــــــ مگر یہ سب کبھی نہیں ہوتا ــــــ کیا بغیر کسی خدا کے یہ سب ہو سکتا ہے؟ ــــــ خود دنیا میں تہذیب نے اتنے قدم آگے بڑھائے۔ اتنی ترقیاں ہوئیں مگر انسان کی چوری کی عادت پر کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ کوئی سائنس داں مرغی کے پیٹ سے چوہا پیدا نہ کر سکا ــــــ ؟ کیا بغیر کسی شعور لامحدود کی کے یہ سب ہو سکتا ہے۔؟

"نہیں ــــــ خدا ہے ــــــ اور ضرور ہے ــــــ اور مجھے سکون بھی وہی دے سکتا ہے ــــــ وہی اطمینان کا خالق ہے اور خوشیوں کا مالک . . . . "

سوچتا سوچتا میں سو گیا۔ اور جب میری آنکھ کھلی تو نیلے آسمان کے سمندر میں تیرنے والے جہاز اپنا آدھا راستہ طے کر چکے تھے

(۸)

دوسری صبح کو جب میں اٹھا تو ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

بے اطمینانی کے بادل چھٹ چکے تھے اور میں اپنے دماغ کو مسرتوں کا گہوارہ پاتا تھا۔ میں اپنی منزل پہچان چکا تھا مگر ابھی راہ سے ناواقف تھا۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے پھولوں کی سڑک کی بجائے سخت، نامانوس، اور بے مروت کانٹوں کی سیج پر چلنا ہوگا۔ میں سمجھتا تھا کسی اصول کو لے کر اس پر اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کرنا مذاق یا بچوں کا کھیل نہیں۔ میں جانتا تھا کہ مجھے ریت کا قلعہ یا تاش کے پتوں کا مکان نہیں بلکہ زندگی کا عالی شان اور مضبوط محل بنانا ہے جو ہر بادِ مخالف، ہر حزن اور ہر طوفان کا مقابلہ بآسانی کر سکے۔ جو ناموافق حالت میں گر کر منہدم نہ ہو جائے بلکہ ایک روشنی کے مینار کی طرح دوسروں کے لئے بھی مشعل راہ کا کام دے ــــــ مجھے معلوم تھا کہ کبھی کبھی مجھے "ہر قدم آگے بڑھانے کے لئے خون کی بھینٹ" بھی دینی ہوگی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوگا کہ ؎

تشنگی پینے پر مجبور کرے یا نہ کرے
زہر آلود ابھی سیکڑوں جام آئیں گے

لیکن میں مطمئن تھا ــــــ اس لئے کہ میں نے زندگی کی تعمیر کے لئے ایک سخت چٹان کو بنیاد بنایا تھا۔ بالو اور ہوا کو نہیں۔ میری زندگی قرطاس فضا پر ایک نقش؟ نہ تھی بلکہ ابدی چٹانوں کے سینے پر کندہ کی ہوئی ایک جاوداں تصویر تھی ــــــ اور اب مجھے اس سادہ نقش کو اپنے خونِ دل سے رنگین کرنا تھا ــــــ میں یہ کر سکتا تھا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب وقت کے سینے میں محفوظ تھا۔ مگر میں کرنے کو تیار رہتا۔ میرا ذوقِ تجسس خام ضرور تھا۔ مگر اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ تھی۔ وہ کچا سونا تھا۔ جسے خالص بنایا جا سکتا تھا . . . .

یونیورسٹی جاتے ہی میں شاہد سے ملا۔ وہ میرے لئے مارکسزم اور اسلام پر بہت سی کتابیں لے آیا تھا۔ سب کتابیں مستند مصنّفین کی لکھی ہوئی تھیں اور بہت مفصل تھیں ــــــ اس دن میں بجائے کلاس میں جانے کے لائبریری ہی میں بیٹھا شاہد کی دی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب پڑھتا رہا۔

کئی دن تک میں نے یونیورسٹی کا منہ نہیں دیکھا اور ہر کتاب کو بہ نظر غائر پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد میں نے ان کتابوں کو ایک بار پھر پڑھا ــــــ اور تب میں نے محسوس کیا کہ مجھے تلاطم میں کتنا ڈال گیا ہے . . . . .

ان کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ جو زندگی میں گزار رہا تھا وہ کتنی تاریک تھی۔ میرا مقصدِ زندگی کیا تھا، مجھے کیا کرنا چاہئے تھا اور میں کیا کر رہا تھا ــــــ یہ سوچ کر میں کانپ گیا کہ میں کتنی غلط راہ پر جا رہا تھا اور میرا حشر کیا ہوتا۔

اخلاقی موت! یہی تو ہوتا تھا۔ اور اخلاق کی موت کے بعد انسان جرائم کی ایک زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ دماغ اور دل اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوتے ہیں ــــــ اور وہ موت کا گھروندا بن جاتا ہے ــــــ میرے فرائض کیا تھے، مجھے کیا کرنا تھا۔ اگر زندگی کا مقصد سرد رہی ہے تو زندہ رہنے سے کیا فائدہ . . . . ؟

میرا دماغ چکرانے لگا ــــــ میری حالت اس انسان کی تھی جو ایک تاریک کوٹھری میں بند ہو اور دفعتًہ اس کے تمام گوشے منوّر ہو جائیں ــــــ وہ بالکل گھبرا جاتا ہے۔ اور ایک ثانیہ کے لئے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

میں نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔

(۹)

اب میں جلد جلد اپنی عادات تبدیل کر رہا تھا۔ میں نے اپنی تمام کمزوریاں چُن چُن کر چھوڑنی شروع کیں اور کوشش کرنے لگا کہ جلد از جلد اس مسموم فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں جس میں اب تک قہقہے لگا رہا تھا۔

میری تبدیلیوں کو دیکھ کر سب متعجب تھے مگر کسی نے مجھ سے پوچھا نہیں۔ اور

کوئی پوچھتا بھی تو میرے پاس ان تبدیلیوں کی وجہ کیا ہوتی ۔؟

ہم چاروں طرف سے غیر متوقع چیزوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کب کیا ہونے والا ہے۔ کچھ لوگ اسے تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ اتفاقات کا نام دیتے ہیں۔ اور کچھ اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں ـــــ ایک عجیب بات یہ ہے کہ میری زندگی میں غیر متوقع چیزیں بہت کم آئیں۔ مگر جب آئیں۔ میرے صحیفۂ حیات کا ایک ورق الٹ گیا اور کوئی نئی چیز سامنے آگئی۔

ایسی ہی ایک غیر متوقع چیز سے میرا سابقہ اس وقت پڑا جب رحیلہ مجھے کتابیں واپس کرنے آئی ـــــ میری نئی زندگی کا تیسرا مہینہ ختم ہونے والا تھا شاید دسمبر کی ۲۳ تاریخ تھی۔ شام ہو چکی تھی اور کہرے کی وجہ سے گھر میں کافی اندھیرا تھا

وہ آکر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ . . . ان تین مہینوں میں میں اس سے صرف دو بار ملا تھا۔ . . . .

اگرچہ چچی جان اس حد تک آزاد خیال تھیں کہ ان کی نظروں میں رحیلہ کا مجھ سے ملنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ مگر میں ہمیشہ اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دل کا سیلاب پھوٹ بہے۔

وہ آکر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ مگر میں خاموشی سے سر جھکائے نئی کتاب پڑھتا رہا ـــ جب میں نے اس سے اندر آنے کی کچھ نہ کہا تو وہ خود اندر آگئی اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

بڑا عجیب لمحہ تھا۔ ایک طرف میرے جی میں آتا تھا کہ اس کے قدموں پر سر رکھ دوں اور اسے آنسوؤں سے تر کر دوں۔ اور دوسری طرف ضمیر کی وقیع اور سنجیدہ آواز آتی تھی۔

" پاگل نہ بن . . . . اور ٹھوکر نہ کھا۔ اگر تو گر جائے گا تو تجھے کون اٹھائیگا . . . ؟ " میں نے سر اٹھایا اور سرد لہجے میں کہا۔

" فرمائیے۔ کیا حکم ہے ۔ ؟ "

وہ کچھ گھبرا سی گئی ـــ اس کی جبیں پر سرخ لکیریں نمودار ہو گئیں ـــ اس نے رک رک کر کہا۔

" یہ کتابیں ہیں ۔ آپ کی کتابیں " اس کی زبان میں لکنت تھی۔

" میز پر رکھ دیجئے " میں نے کہا۔ اور ایک سگریٹ جلانے کی کوشش کی ـ ماچس بجھ گئی۔ میں نے دوسری جلائی۔ وہ بھی بجھ گئی۔ اور تیسری بھی۔ اور چوتھی ـــ پانچویں بار میں سگریٹ جلانے میں کامیاب ہوا ـــ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔

" مگر ـــ اگر آپ ـــ اگر آپ برا نہ مانیں تو ـــ میں ایک بات " وہ بھی میری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ مگر ہمت سے کام لے رہی تھی۔

میں نے سگریٹ ہونٹوں سے لگائی۔ مگر کش نہ لے سکا۔ میں نے اسے ایش ٹرے میں پھینک دیا اور کہا۔

" کہئے۔ کیا بات ہے "

اور غیر متوقع طور پر اس نے پوچھا۔

" آپ کیوں اتنے بدل گئے ہیں ـــ ؟ "

میری نگاہ اپنے سامنے لگے ہوئے بڑے آئینے پر جا پڑی ـــ اور میں نے دیکھا کہ میرے چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔

میں کچھ دیر تک خاموش رہا ـــ اس کے بعد میں نے الٹے سیدھے الفاظ میں رک رک کر جس طرح بھی ہو سکا۔ اسے تمام باتیں بتا دیں۔

وہ غور سے سنتی رہی۔ اور جب میں ختم کر چکا تو سنجیدگی سے بولی۔

" آپ کی باتوں میں سچائی ضرور ہے ـــ مگر ـــ مگر آپ مجھے پڑھنے کے لئے کچھ کتابیں دے سکتے ہیں ـــ ؟ "

" ضرور " میں نے کہا۔ اور کچھ کتابیں منتخب کر کے اسے دیں۔ اور اس کے بعد وہ چلی گئی۔

میں بت بنا کھڑا رہا ـــ اور میرے دل میں ایک پھر یہ آواز بلند ہوئی۔

" میں اس سے محبت کرتا ہوں ـــ "

میں کافی دیر تک ایسا ہی کھڑا رہا ـــ اور جب ہوش میں آیا تو پہلا سوال جو دماغ نے پیش کیا وہ یہ تھا کہ میری محبت خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہے یا نہیں ـــ ؟

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموش سوچنے لگا۔

سب سے پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ " تیری محبت جنسی ہے۔ خدا کبھی اسے قبول نہ کرے گا ـــ " دماغ کے اس فیصلے نے میرے احساسات فنا کر دیئے اور میں بالکل خاموش بستر پر لیٹا رہا۔ اور غیر ارادی طور پر میری آنکھوں سے آنسو بہہ گئے۔

جب کچھ دیر بعد ذہن اپنی اصلی حالت پر آیا تو ایک نیا خیال دماغ میں آیا۔

" میری محبت جنسی نہیں ہے۔ میں رحیلہ سے اس کا جسم نہیں چاہتا ـــ مجھے اس کے حسن کی تمنا نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری محبت کا جواب محبت ہو۔ وہ صرف میرے لئے ہو۔ اور ـــ اور ـــ "

میں آگے نہ سوچ نہ سکا۔

فوراً ہی ادراک کی پُر مغز آواز آئی۔

" کیا یہ بے معنی استدلال خدا کے نزدیک کوئی حقیقت رکھتا ہے ؟ "

میرا عقل زمین پر پڑا رہا۔ اور دل کی کمزور آواز آئی۔

" خدا جانے "

میں کسی حل پر نہ پہنچ سکا ـــــ اور چونکہ نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ اس لئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

نماز پڑھ کر آیا تو پھر وہی خیالات دماغ میں آ گئے ـــــ اور میں اسی ادھیڑ بن میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔

نفسیاتی بنیاد پر میں "خالص" اور "سچی محبت" کا قائل نہیں تھا۔ جو محبت صرف خواہشات نفسانی کو فوری اور عارضی طور پر پوری کرنے کے لئے کی جائے وہ میرے نزدیک محبت نہیں تھی۔ لیکن میں ہر محبت کا بنیادی جذبہ اور محرک جنسی خواہش کو سمجھتا تھا۔ اس لئے میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا تھا کہ میں جو محبت کرتا ہوں اس کی بنیاد "غیر جنسی" ہے لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ میں مروجہ محبت نہیں کر رہا تھا جو صرف جنسی خواہشات کو تھوڑے عرصے کے لئے پوری کرنے کے لئے کی جاتی ہے ـــــ یہ خیال آتے ہی مجھے خیال آیا کہ محبت کرنا کوئی گناہ یا جرم تو ہے نہیں۔ اس کو غلط راستہ پر استعمال کرنا البتہ جرم یا گناہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ سوچ کر مجھے ایک گونہ طمانیت ہوئی لیکن پھر بھی میں نے یہ طے کر لیا کہ میں رحیلہ سے کبھی نہ ملوں گا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں "شاہراہ محبت" پر ایک قدم اور بڑھا دوں۔

"عورت" ہر انسان کی دکھتی رگ ہوتی ہے اور میں اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اگرچہ فطرتاً میں عورت کی طرف زیادہ ملتفت نہیں ہوتا لیکن رحیلہ کے بارے میں میں جس بری طرح پھسلا تھا وہ آیندہ کے لئے بڑی اچھی تنبیہ ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے یہ طے کر لیا کہ میں کسی بھی لڑکی سے بلا ضرورت نہ ملوں گا اور نہ ہی اس سے بے تکلف ہوں گا ـــــ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ ارادہ کچھ لوگوں کو احمقانہ معلوم ہو۔ مگر باوجود اس مصمم ارادے کے میں نے جس طرح ٹھوکر کھائی وہ قابل عبرت ہے۔

(باقی آیندہ)

حقی حزیں۔ ایم۔ اے

غزل

کبھی جو صورتِ حالِ دل و جگر کہئے
زباں سے کام نہ لیجے بہ چشمِ تر کہئے

نہیں جو شکوۂ بے مہریٔ جہاں لب پر
کسی کی اِک نگہِ لطف کا اثر کہئے

اِدھر یہ شوق بہ تفصیل عرضِ حال کریں
اُدھر یہ حکم بالفاظِ مختصر کہئے

جو پردہ اُٹھنے پہ بھی تابِ دید لا نہ سکے
اُسے نظر نہ سمجھئے حجابِ در کہئے

خبر ہے سارے زمانے کی جب اسے اے دل
پھر اپنے حال سے کیوں اس کو بے خبر کہئے

یہ زندگی پہ ہے موقوف ساتھ دے کہ نہ دے
کسی کے غم کو بہر حال معتبر کہئے

نہ پوچھئے مرے دل کی کہ میرے دل میں حزیں
وہ بات ہے جسے فرمودۂ نظر کہئے

ابوالمجاہد زاہد

غزل

دل نگہ میں کھنچا سا آتا ہے
کون رُخ سے نقاب اُٹھاتا ہے

لالہ و گُل ہوں یا مہ و انجم
تیرے انداز کون پاتا ہے

کس کے ہونٹوں پہ ہے پیامِ وفا
یہ مرا گیت کون گاتا ہے

زندگی کو بھی جو سمجھ نہ سکا
وہ ہمیں موت سے ڈراتا ہے

نُور بھی تیز رَو ہے ظلمت بھی
دیکھئے کون مات کھاتا ہے

قحطِ اِنسانیت معاذ اللہ
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

اِس نئے دَور کو بھی دیکھ لیا
راہزن راستہ دکھاتا ہے

نامِ دُنیا اِسی کا ہے زاہد
کوئی روتا ہے کوئی گاتا ہے

ظہیر بگھروی

غزل

ہر شوق کو قرباں کرنا ہے، سر عشق کا میداں کرنا ہے
دشوار تو ہے یہ راہ مگر دشوار کو آساں کرنا ہے

جینے کی طلب فطری ہے اگر تو جینے کا ساماں کرنا ہے
تاریکی میں آنکھیں کھولی ہیں ناچار چراغاں کرنا ہے

طے یہ بھی میداں کرنا ہے طے وہ بھی میداں کرنا ہے
جینے کا بھی ساماں کرنا ہے مرنے کا بھی ساماں کرنا ہے

جو کہتے ہیں وہ دَور گیا جب عشق کا سکّہ چلتا تھا
اے آتشِ دل کچھ اور بھڑک ان سب کو پشیماں کرنا ہے

نغموں کے عوض مرغانِ چمن مصروف ہیں آہ و شیون میں
اُمید کے نغمے گاتے ہیں روتوں کو غزل خواں کرنا ہے

اِتنا تو نکھر اِتنا تو اُبھر مطلوب ہے جو معیار انھیں
اے ذوقِ طلب کچھ تجھ کو بھی شائستۂ ارماں کرنا ہے

محرومِ سماعت ہے اب تک آوازِ شکستِ دل یعنی
آوازِ شکستِ دل کو ابھی کچھ اور نمایاں کرنا ہے

کیا کنجِ قفس کیا صحنِ چمن اس دور میں دونوں ایک سے ہیں
اِس دَور میں کچھ دیوانوں کو سامانِ گلستاں کرنا ہے

زمزم بجنوری

غزل

تو محیطِ بود و ہستی مری زندگی بہانہ
تو تمام تر حقیقت میں تمام تر فسانہ

تری بندہ پروری ہے مری زندگی کا مقصد
تری شانِ بے نیازی مرا ذوقِ والہانہ

مجھے کیا خبر کہ کیا ہے یہ مرا وجودِ خاکی
مری زندگی ہے سازِ غمِ ہجر کا ترانہ

میں حریمِ قدس میں تھا بحضورِ ذاتِ مطلق
نہ غیاب کا خزینہ نہ شہود کا خزانہ

کسی چشمِ حق نگر کا یہ تصرفِ مسلسل
نہ جچی مری نظر میں کبھی شانِ خسروانہ

یہ جہانِ رنگ و بُو ہے کہ طلسمِ بے حقیقت
یہ مری نظر کا دھوکہ کہ ترا نگارخانہ

ترا منتظر ہے اب تک تری بیخودی کا عالم
ترے ذوقِ میکشی میں ہے سرورِ جاودانہ

ادارہ

خیال اپنا اپنا

جارج برنارڈ شا ایک نظر میں

مصنفہ۔ ظ۔ انصاری
قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے۔ ضخامت ۲۷۸ صفحات
ناشر:۔ مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی

شا کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ عمر کی طوالت کے لحاظ سے اگرچہ شا نے جتنا کچھ لکھا وہ تھوڑا ہے لیکن جو کچھ لکھا وہ اپنی جگہ پائیداری لئے ہوئے ہے۔ اس انگریز مصنف سے اُردو داں حلقے نام کی حد تک تو متعارف ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے ہیں جو اس کے ذہنی ارتقاء فکری اتار چڑھاؤ اور ادبی نقطۂ نظر سے اچھی طرح واقف ہوں۔ شا کی حیثیت موجودہ دور کے ادب میں ایسی نہیں جسے کسی طرح نظر انداز کیا جا سکے۔ اس کے بغیر ایک بڑا خلاء رہ جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے جس سے اُردو داں حلقے کافی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

شا پر انگریزی میں بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں اور کتنے ہی مختلف زاویوں سے اس کی تخلیقات پر تنقیدیں کی گئی ہیں۔ جن کا ایک جگہ سمیٹنا بڑا مشکل تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ضروری بھی تھا۔ مصنف نے اس کتاب میں بہت سے انگریز مصنفین کی تنقیدات کا نچوڑ "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول پر پیش کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے سوائے چند ایک مقامات کے تنقیدی رویے کو بہت کم دخل دیا ہے اور ذاتی افکار کی رنگ آمیزی سے اجتناب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے شا کی اصل حیثیت بہت کچھ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ہماری دانست میں مصنف کی اس احتیاط کی وجہ سے کتاب کی اہمیت خاصی بڑھ گئی ہے۔

"جارج برنارڈ شا ایک نظر میں" تین خاص موضوعات پر مشتمل ہے۔

(۱) سوانح عمری۔ جس میں شا کی زندگی کے وہ اہم حالات آ گئے ہیں جن سے اس کی ذہنی تعمیر متاثر ہوئی۔

(۲) فن اور ادب جس کے ضمن میں اس کی تنقید نگاری۔ ظرافت نگاری۔ مفکرانہ رجحانات اور سیاسی خیالات کا خاکہ اس کی تحریروں سے اخذ کر کے پیش کیا گیا ہے

(۳) شا کے چار ڈراموں کے چیدہ چیدہ حصے۔ جن میں اصل ڈراموں کا صرف ڈھانچہ اور اہم مکالمے دیئے گئے ہیں تاکہ اس کی ڈرامہ نگاری کو سمجھا سکے۔ اس کتر بیونت سے اگرچہ فنی حُسن مجروح ہوا ہے لیکن مصنف جو کچھ چاہتا ہے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہے ان خلاصوں سے شا کے ڈراموں میں چیخوف کی سی ڈرامہ کی بدلی ہوئی شکل اور ابسن کی سی ڈرامہ کی رُوح دونوں کے امتزاج کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ڈراموں پر جو کچھ مصنف نے لکھا ہے اس میں کافی مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اور شا کے عمرانی فلسفہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈراموں کی جو تقسیم کی گئی ہے اس سے اور بھی شا کی ادبی حیثیت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے یعنی

(۱) وہ ڈرامے جن میں شا نے سماج کے بنیادی مسائل کو کھرچا ہے۔
(۲) وہ ڈرامے جنہیں شا نے اپنے فلسفیانہ نظریات پیش کرنے کا بہانہ بنایا۔
(۳) وہ ڈرامے جو محض فرمائش پوری کرنے کے لئے یا تفریحِ طبع کیلئے لکھے۔
(۴) وہ ڈرامے جو تاریخی کرداروں سے افسانوی جامے پہنانے کے لئے لکھے۔

اسی تقسیم کے تحت بشر اور فوق البشر (Man & Superman) ڈاکٹر کی مصیبت (Doctors Delimma) "سیب گاڑی" "چٹانوں پر"۔ "ہتھیار اور انسان۔ بیک ٹو میتھوسلاہ" "تم کبھی نہیں کہہ سکتے" (Constancy Unrewarded) "شادی کی گئی" "سیزر اور قلوپطرہ"۔ "سینٹ جون اور قسمت کا دھنی وغیرہ وغیرہ ڈراموں کی مقصدیت کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے یہ بات صاف طور سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ شا کی تخلیقات کے پیچھے کوئی نہ کوئی سوچا سمجھا مقصد اور کوئی فلسفہ ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو اس نے مقصد کے پیچھے فنی حسن، ہیئت اور ڈرامائی کشش کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کی اور چھوڑ دی تھی۔ شا نے اپنے کو پمفلٹ باز جرنلسٹ اور اشتہار باز کہلوانے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ غالباً یہ سب سے پہلا اور سب سے بیباک ادیب تھا جس نے اپنے ادب کو خود پروپیگنڈے کی تحریر کہہ کر پیش کیا اور اس پر بھی اس کی پختہ فن کاری نے اپنی بلند حیثیت سب سے منوا لی۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شا محض مسخرہ تھا جس نے کبھی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں سوچا

اور جو صرف اپنی مخصوص ظرافت اور تیز طرار دلچسپ فقروں سے مخاطب کا دل بہلانا جانتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی ہے جو شا کا براہ راست مطالعہ نہ کرنے اور اس کے رجحانات و میلانات سے بے خبری کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ اگر شا کا براہ راست مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ وہ ظریف تو تھا لیکن ایسا ظریف نہیں تھا جس کی ظرافت کا کوئی مقصد نہ ہو۔ بلکہ وہ اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ خیالات کے اعتبار سے وہ نیم سوشلسٹ تھا اور انقلاب کے لئے تشدد کو ناپسند کرتا تھا۔ ایک زمانہ میں ان خیالات کا فےبین (Fabian Socialism) تحریک کے نام سے کافی چرچا رہا۔ شا کا نام اس تحریک کی داغ بیل ڈالنے والوں میں سے تھا! اس کے نزدیک انقلاب ایک تاریخی جبر تھا جس کے لئے جد و جہد کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد اس کا ذہن ادلتا بدلتا رہا۔ اور متضاد خیالات ابھرتے رہے جن کے بیچ و خم میں الجھ کر کبھی اس نے سوویٹ روس اور سُرخ فوج کو تہذیب و تمدن کا حیرت ناک مرکز کہہ کر پکارا تو کبھی ہٹلر اور مسولینی کے فاشزم کو تہذیب کے ارتقاء کا سامان سمجھا۔ ان تمام الجھنوں کے باوجود شا کی تحریروں میں سوشلزم کا فےبین تصور (Fabian Conception) نمایاں حیثیت سے ہر دور میں جھلکتا رہا۔ کو نبات اور تخلیقی ارتقا کے بارے میں بھی شا کے خیالات اس کے دوسرے ادبی اور سیاسی خیالات کی طرح قابل تنقید تو ضرور ہیں۔ لیکن بہر حال ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں شا کی ظرافت سے زیادہ اس کی سنجیدگی کو اہمیت دی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے مصنف نے شا کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مصنف نے شا کے قہقہوں میں فریاد و فغاں کی ایک مخصوص چھپی ہوئی سنجیدگی کا کھوج لگا لیا ہے اور یہ اس کی بڑی کامیابی ہے۔

اب یہ قارئین میں سے اہل قلم حضرات کا کام ہے کہ وہ آگے بڑھ کر تعمیری نقطۂ نظر سے شا کا جائزہ لیں تنقیدیں لکھیں اور مستقبل کے ادب کی تعمیر میں اس کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ (ن۔ ا)

مسئلۂ انتخابات اور مسلمانانِ ہند (حصہ اوّل)

از۔ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی

ضخامت ۱۱۱ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ قیمت۔ چودہ آنے

ملنے کا پتہ ـــــ مکتبہ جماعت اسلامی رامپور

یہ بروقت پیشکش اُن مقالات کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ "زندگی" رامپور میں "اشارات" کے مستقل عنوان سے مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔

ہندوستان کی عام آبادی کسی نہ کسی پارٹی سے ایک بہتر مستقبل کی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے اور اس لئے انتخابات میں خاصی دلچسپی لے رہی ہے مگر مسلمانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے حالات اور واقعات اُن کے نفسیات پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئے ہیں کہ وہ الیکشن کے ہنگاموں کا استقبال کرنے کے لئے اپنے اندر کوئی اُمنگ اور جوش نہیں پاتے۔ اُن کے بعض ممتاز اہل الرائے افراد نے کچھ عرصہ پہلے اُن کی صحیح حالت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے اُن الجھنوں کا تذکرہ کیا تھا جو الیکشن کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے میں اُن کے سامنے تھیں۔

اس تجزیہ اور منطقی اندازِ گفتگو نے مسلمانوں کو کچھ وقفہ کے لئے اپنے مشفق خیرخواہوں کی بات سننے کے لئے آمادہ کر دیا تھا مگر یہ شمشیرانِ باتدبیر اپنی گنوائی ہوئی سب الجھنوں کو بغیر سلجھائے ہوئے ملک کی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کو اپنی انتخابی خدمات کہیں لطیف اور کہیں بھونڈے انداز میں پیش کر چکے ہیں اور جلد ہی اپنے اپنے طور پر "ماس کنٹیکٹ" کی سعی مشکور شروع کرنے والے ہیں۔ الیکشنی پروپگینڈہ کی اس فضا میں مسلمانوں کو جو مشورے دیئے جا رہے ہیں وہ کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں چونکہ ان میں سے اکثر کسی با قاعدہ سوچ بچار کا نتیجہ ہونے کے بجائے شکست فکری کی پیداوار ہیں اور اُن میں بھی کنویسنگ کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ "مسئلۂ انتخابات" کا مصنف اپنے فکر و احساس کے دامن کو ان آلودگیوں سے بچانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ اُس نے مسئلہ کے ہر پہلو پر گہری نگاہ ڈالی ہے اور نتائج کو دیانت داری کے ساتھ سامنے رکھ دیا ہے۔ الیکشن سے احتجاجاً بے تعلقی اختیار کرنے کے مشورہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "بچے اگر ضد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کے لئے معذور سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور شاید اُن کا یہ ضد کا، تو یہ بھی اس اعتماد پر مبنی ہوتا ہے کہ ان کے والدین اور رشتہ دار اُن کو زمین سے اُٹھا کر سینے سے لگا لیں گے لیکن مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ اُن کو منانے والا کوئی نہیں ہے اُن کو بیٹھا چھوڑ کر آگے بڑھنے والے آگے بڑھ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ چلتے چلتے دو چار ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔ یہ دنیا بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔"

اس طرح الیکشن میں حصہ لینے کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں اُن پر الگ الگ سُلجھی ہوئی اور مدلل گفتگو کرنے کے بعد مصنف اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ "الیکشن کا زمانہ کیسے ہی جنون کا زمانہ کیوں نہ ہو کوئی پارٹی الیکشن جیتنے کے شوق میں اتنی دیوانی نہیں ہو سکتی کہ وہ مسلمانوں کے تھوڑے سے ووٹوں کے لئے یہاں کی اکثریت کو اپنا مخالف اور دشمن بنا لے لیکن اگر کوئی ایسی پارٹی نکل بھی آئے تو اس سے بھی بڑی دیوانگی کی بات یہ ہوگی کہ آپ کسی ایسی دیوانہ پارٹی کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کے

بارے میں کوئی سمجھوتہ کریں۔"

اور اس کے بعد سوال کرتا ہے "۔ اس وقت مسلمانوں کے سوچنے اور کام کرنے کے یہی دو نقشے ہیں مگر کیا واقعی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہی دو راہیں کھلی ہوئی ہیں یا ان کے علاوہ اُن کے لئے کوئی اور راستہ بھی ہوسکتا ہے جس کو اختیار کرکے وہ دین و دنیا دونوں کے نقصانات سے بچ سکیں اور ساتھ ہی اس ملک کی خدمت کرسکیں جس میں وہ رہتے ہیں اور جس میں رہنے کی وجہ سے اُن پر اس کی خدمت کی بھی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"

اس تیسرے راستہ کا پہلا قدم اس اقدام کو قرار دیا گیا ہے کہ مسلمان آیندہ انتخابات سے کلیتہً الگ رہیں۔ ایسی علیحدگی مصنف کے نزدیک ایک مستقل فکر ہے جس کو غفلت اور جمود و خمود سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے بعد اس نقطۂ نظر پر کئے جانے والے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں ان میں سے چند ایک کے عنوانات یہ ہیں۔ انفرادی نقصان۔ نمایندگی کا عذر۔ کسی زیادہ خطرناک پارٹی کے برسرِ اقتدار آجانے کا خوف۔ مسلمانوں کی حلیف پارٹیوں کی ناخوشی کا اندیشہ۔

مصنف کے ذہن کی صفائی کا اعتراف کرنے کے باوجود ہمیں اس میں شک ہے کہ مسلمان اس مشورہ پر عمل کرسکیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس الیکشن کو وہ اس نظر سے نہیں دیکھتے کہ ان کی واقعی حیثیت پر اس کا کیا اثر پڑے گا وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی روزمرّہ کی انفرادی مشکلات کو دُور کرنے کے لئے انھیں کچھ حکام رس وسیلے میسّر آجائیں۔ لوٹ کھسوٹ کی جیسی آزادی غیر مسلموں کو حاصل ہے ایسی ہی انہیں بھی حاصل ہوجائے وہ بھی دھڑلّے سے رشوتیں لیں۔ بلیک مارکیٹ کریں اور جب پکڑے جائیں تو وزنی سفارشوں کے مہیّا ہونے میں دیر نہ ہو وہ یہ منظر دیکھنے پر مجبور رہنا نہیں چاہتے کہ نیچ قوموں سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں کی زبانیں انہیں "میاں سلام" اور "سرکار سلام" کہتے کہتے خشک ہوجاتی تھیں اُن کی اولاد سینہ تانے ہوئے بے نیازانہ اُن کے برابر سے گذر جائے، اُن کی خواہش ہے کہ جو سنجیدہ تقریبات اور رسم و رواج وہ منا تے چلے آر ہے ہیں وہ ساتھ خیریت کے منتے رہیں اگر انھیں کبھی نماز پڑھنے کا موڈ آجائے تو اس پر کوئی معترض نہ ہو۔ مسجدیں سب کھلی رہیں چاہے رفتہ رفتہ پوری قوم بے نمازی بن جائے۔ اردو میں لکھی ہوئی عرضیاں قبول کرلی جایا کریں اور شیروانی نہ سہی تو کم از کم پاجامہ کے استعمال کی آزادی برقرار رہے۔ یہ اور اسی قسم کے چند غلط اور صحیح مطالبے ہیں جن کی منظوری ان کے نزدیک ان کے مذہب، زبان اور کلچر کے تحفظ کی سب سے پہلی ضمانت ہے اور ان کے مل جانے پر وادی بھی ان کو چین ہی چین لکھتا ہے۔

اصل میں بنیادی غلطی (جس کو "مسئلۂ انتخابات" میں بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے) یہ ہو رہی ہے کہ عرصہ سے مسلمان اپنی اصل حیثیت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ ان کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات اور تحریک سمجھنے کے بجائے اُسے عملی زندگی سے تعلق نہ رکھنے والے چند عقائد کا مجموعہ اور محض ایک جامد مذہب تصوّر کئے ہوئے ہیں وہ یہ بھول چکے ہیں کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح وہ ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک اصولی جماعت ہیں ایک ایسی جماعت جس کا کام اصولوں کو بھینٹ چڑھا کر گوشت پوست کے لوتھڑوں کو بچانا نہیں مگر اپنے اصولوں کو پھیلانا ہے جب تک یہ حقیقت اُن کے ذہن نشین نہیں ہوگی کسی صحیح مشورہ پر عمل کرنا تو درکنار وہ اس کو پوری طرح سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے۔ ایک اعلیٰ مقصودِ حیات سے محروم ہوجانے کی وجہ سے وہ بد حواسی میں بہت سے چھوٹے چھوٹے اور گھٹیا درجہ کے مقاصد کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں اور ان کے حصول میں بھی انہیں باعزّت کامرانی نصیب نہیں ہوتی۔ ؎

ہزاروں ٹھوکروں میں جستجوئے مرگ کرتے ہیں
وہ جن کو زندگی ملتی تھی تیرے آستانہ پر

الیکشن میں حصّہ لینے کو غیر مفید جانتے ہوئے بھی مسلمان اس سے کلیتہً اس لئے بھی علیحدہ نہیں رہ سکیں گے کہ اُن کے سامنے ابھی تک کوئی لائحہ عمل موجود نہیں ہے۔ "مسئلۂ انتخابات" کے مصنف نے اپنی تصنیف کے دوسرے حصّہ میں اس انتہائی اہم ضرورت کو پُورا کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر ہمارے خیال میں الیکشن پر گفتگو کرنے سے پہلے نہیں تو اس کے ساتھ ہی اُسے بھی پیش کردینا ضروری تھا۔ ایک مثبت پروگرام نہ ہونے کی صورت میں کوئی منفی مشورہ بڑے پیمانے پر قابلِ عمل نہ ہوگا خواہ وہ اپنی جگہ کیسا ہی معقول اور بیش قیمت کیوں نہ ہو۔

(ح-م)

ہندوستانی سوشلزم

از- سیّد اصغر علی عابدی
ناشر- مکتبۂ "فکرِ نو" ۱۳۵، شاہ گنج الٰہ آباد

ہمارے ملک کے باشندوں میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اٹھنے والی تحریکوں کے بنیادی فلسفوں اور اُن کے اجزائے ترکیبی سے واقفیت حاصل کئے بغیر اپنے مخصوص مقاصد کو ذہنوں میں لئے ہوئے اُن میں شامل ہوجاتے ہیں اور جب یہ تحریکیں کامیابی کی منزل کو پہنچ کر اُن کی توقعات پوری نہیں کرتیں تو حیرت اور جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ عملی اقدام کرنے سے پہلے اگر ان تحریکوں کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بہت سے وہ نتائج جو بعد میں رُونما ہوکر پریشانی اور پشیمانی کا سبب بنتے ہیں اُن کا بہت پیشتر معلوم ہوجانا ممکن ہے۔ عوام اور خواص کی طبیعتیں سنجیدہ تحقیق و تجسّس کی عادی نہیں ہیں اور گہرے غور و فکر سے گھبراتی ہیں۔ یہ بڑی خامی ہے جس کا احساس اب رفتہ رفتہ کچھ ذہنوں کو ہوتا جاتا ہے اور اسی احساس کا نتیجہ یہ تازہ ترین تصنیف "ہندوستانی سوشلزم" ہے۔

کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے اپنے موضوع پر کافی سوچا ہے اور اس تحریک پر بالکل نئے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ ہندوستانی سوشلزم وہ تحریک نہیں ہے جو مارکس اور اینجلز نے شروع کی تھی بلکہ یہ گاندھی ازم، جہا بھائیت اور ایک خاص قسم کی محدود سوشلزم کا مجموعہ ہے۔ اس تحریک کے ان تینوں اجزائے ترکیبی پر مصنف نے علیحدہ علیحدہ مدلل اور دلنشین گفتگو کی ہے اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے۔

"ہندوستانی سوشلزم کی تحریک ایک منفی تحریک ہے۔ اس کے راستہ میں کوئی روڑا آجائے تو وہ اس روڑے کو ٹھوکر مار کر راہ سے ہٹانے کے بجائے الٹا اپنے اندر اس کے لئے خلا پیدا کرے گی۔ اس طریق کار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سوشلسٹ تحریک اور تو سب کچھ بن جائے گی مگر خود کچھ نہ رہے گی۔"

اُمید ہے کہ سیاسی ذہن رکھنے والے اس بے لاگ اور دلچسپ تبصرہ کو پسند کریں گے مخلص اور معقول سوشلسٹوں کو اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر اس لئے کرنا ضروری ہے کہ اُن کی تحریک پر یہ تنقید کسی ایسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے آدمی کی طرف سے نہیں کی گئی ہے جو انتخابات کے میدان میں اُن سے برسر پیکار رہی ہو۔ بلکہ یہ ایک غیر جانبدارانہ مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کو اگر خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے چونکہ یہ واقعہ ہے کہ کسی بھی تحریک کے پیشِ علمبردار اپنی تحریک میں اصولی تضاد کو محسوس کرکے چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی سوشلزم میں اسی تضاد کو واضح کرنے کی سب سے زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ کتاب جامع اور سستی ہے۔

اب ایک بات ہم اندازِ بیان کے سلسلہ میں کہنا چاہتے ہیں بحیثیت مجموعی اگرچہ یہ سنبھلا ہوا ہے البتہ سوشلسٹوں کی جہا بھائیت پر جہاں نکتہ چینی کی گئی ہے وہاں تھوڑی سی غیر ضروری جذباتیت شامل ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سوشلزم کے مستقبل کے متعلق کتاب کے پہلے ہی پیراگراف میں فیصلہ دیدینا بھی ایک قسم کی کوتاہی ہے۔ ایسا کرنے سے ایک مصنف کی حیثیت اکثر و بیشتر محقق کے بجائے منجم یا مفتی کی بن جایا کرتی ہے۔ جس کا نفسیاتی تاثر پڑھنے والوں پر اچھا نہیں ہوتا۔

(ح - م)

ادارہ

یہ مسائل زمانہ

انتخابات سے پہلے

بھارت کے عام انتخابات قریب آگئے ہیں۔ حصّہ لینے والی پارٹیوں میں ہل چل مچی ہوئی ہے۔ جوڑ توڑ اور چھینا جھپٹ سے کرسیاں حاصل کرکے قومی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا
جارہا ہے۔ جن کو کانگریس کا ٹکٹ مل چکا ہے ان کا تو کہنا ہی کیا۔ جن کو نہیں ملا وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے میدان میں اتر آئے ہیں۔ بعض منچلے ایسے بھی ہیں جنہوں نے ٹکٹ مل
جانے پر بھی کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور اب وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے اپنے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ سوشلسٹ پارٹی،
کے۔ ایم۔ پی پارٹی، کمیونسٹ پارٹی۔ جن سنگھ اور مہا سبھا وغیرہ وغیرہ بھی اپنے امیدوار کھڑے کرچکی ہیں۔ خیر یہاں تک تو معاملہ توقع کے خلاف نہیں تھا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے
کہ مسلم لیگ نے بھی جنوبی ہند کے کچھ حلقوں سے امیدواروں کو میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس سے بھی آگے حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے امیدوار کچھ ہندو صاحبان بھی ہیں اور
مزید تعجب کا مقام یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست جماعتوں کی طرف سے کچھ مسلمان امیدواری کے لئے آگے بڑھائے گئے ہیں جو بقول معاصر ہماری آواز" کانپور خدا جانے کس
کارخانے کے بنے ہوئے مسلمان ہیں۔"

اس وقت انتخابی جدوجہد اس مرحلہ میں ہے کہ کاغذات نامزدگی داخل کئے جاچکے ہیں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک ایک سیٹ کے لئے آٹھ آٹھ دس دس امیدوار ہونا ایسی عام
بات ہے کہ ادھر سے ادھر تک بھارت کے کسی حلقہ کا جائزہ لے لیجئے یہی ہر جگہ نظر آئے گی۔ بلکہ بعض بعض حلقوں میں تو متحیر کن حد تک امیدواروں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ کانگریس نے
تمام نشستوں کے لئے امیدوار کھڑے کئے ہیں بلکہ ذیلی امیدواروں کی نامزدگیاں بھی کرائی ہیں کانگریس کے بعد مجموعی حیثیت سے آزاد امیدواروں کی تعداد سب سے زیادہ
ہے۔ اسکے لگ بھگ سوشلسٹ پارٹی کے امیدواروں کی تعداد ہے۔ سوشلسٹ پارٹی سے کم کسان مزدور پرجا پارٹی کے امیدوار ہیں۔ فرقہ پرست جماعتوں میں جن سنگھ
سب سے زیادہ حصّہ لے رہی ہے۔ اس کے بعد مہا سبھا کا نمبر ہے اور مہا سبھا کے بعد رام راجیہ پریشد کا۔ ترقی پسند گروپ کی طرف سے بھی مختلف الخیال امیدوار بڑھے ہیں۔
کوئی انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا امیدوار ہے تو کوئی فارورڈ بلاک کا۔ پھر فارورڈ بلاک میں بھی ایک روئیکار گروپ ہے دوسرا مارکسی۔ بولشویک پارٹی اور انقلابی کمیونسٹ
پارٹیاں الگ رہیں ان کے علاوہ ری پبلکن پارٹی بھی ہے۔ کرشکر لوک پارٹی بھی ہے۔ اور خدا جانے کتنی ایسی پارٹیاں ہیں جن کے نشانات مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سب پارٹیوں
کو کانگریس سے مقابلہ کرنا ہے اور کانگریس سے خود نکلے ہوئے آزاد امیدواروں سے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ایسی بنیاد نہیں جس پر اتحاد ہوسکے۔ نظریات کی حد تک ان پارٹیوں
میں بعد المشرقین ہے اور اصولی اتحاد ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس تو خیر اپنا بھرم کھو چکی ہے ان جماعتوں کا بھی کوئی اصول کوئی متعین راہ
اور کوئی مقصد نہیں۔ بس ایک خواہش اقتدار ہے جو تنگ و دو کرا رہی ہے۔ اس خواہش اقتدار کے پیچھے بعض بعض پارٹیوں نے نام نہاد اصول و نظریات کو پس پشت ڈال کر جماعتی
مفادین کا مظاہرہ کر بھی ڈالا ہے۔ موقع پرستی اور ابن الوقتی کی ایسی کتنی ہی مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ سوشلسٹ پارٹی اور امبیدکر کی پارٹی کے اتحاد کو دیکھ لیجئے۔
پالیسیوں میں کھلا ہوا فرق ہوتے ہوئے بھی متحد ہو کر انتخابات لڑنے کا فیصلہ کرچکی ہیں۔ پنڈت نہرو اس اتحاد پر ایک سخت تنقید کر بھی چکے ہیں اور اس کا جواب ڈاکٹر امبیدکر
انتخابی زبان میں دے چکے ہیں لیکن غیر تشفی بخش۔

ایک اور مثال ہے جو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے اور وہ ہندو اور مسلم فرقہ پرست جماعتوں کا انتخابی گٹھ جوڑ ہے بالکل بے معنی سی بات، لیکن کانگریس کی دشمنی کے
لئے اور دشمنی سے زیادہ کانگریسی لیڈروں ہی کی طرح اپنے مفاد کے لئے یہ اقدام بھی کر ڈالا گیا ہے۔ مسلم لیگ کے بچے کھچے اثرات مدراس کی طرف کچھ موجود ہیں۔ چنانچہ
اس نے امیدواروں کو کھڑا بھی کیا ہے۔ پچھلے دنوں مدراس کی ری پبلکن پارٹی۔ ہندو مہا سبھا۔ مسلم لیگ، پرجا پارٹی اور شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کے پاس مدراس

سے کھڑے ہونے والے امیدواروں نے ایک مشترکہ میٹنگ کی تاکہ کانگریس کے خلاف ایک متحدہ محاذ بن سکے۔ ادھر کانگریس خود کتنے ہی ذیلی گروپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کہنے کو ایک ہی جماعت ہے لیکن ہر بڑی شخصیت اپنی ذات سے ایک انجمن بنی بیٹھی ہے۔ اور اندرونی اختلافات کا ایک آتش فشاں اندر ہی اندر پھوٹ پڑنے کیلئے بیتاب ہے۔ آزاد امیدواروں کا اثر بھی کچھ کم نہ سمجھئے۔ ان میں اکثر وہ ہستیاں شامل ہیں جو ماضی میں کانگریس ہی کے پلیٹ فارم سے عوام پر کافی اثر انداز رہ چکی ہیں۔ انھیں مقامی طور پر بھی کافی عوام کی ہمدردیاں حاصل ہیں اور حلقہ سے باہر بھی ان کا اثر ہے ... سیاسی زندگی بھی ان کے حریف کانگریسیوں سے زیادہ بہتر ہے۔

کل بھارت میں، ۱ پارٹیوں کے نشانات مقرر کئے گئے ہیں۔ بعض بعض تو بالکل ہی غیر معروف ہیں۔ انتخابات قریب تو آ گئے مگر ان کا ڈھنگ سے تعارف بھی نہیں۔ اندازہ ہے کہ کاغذات نامزدگی واپس لینے کی آخری تاریخ تک بہت سے بھلے اور سمجھدار آدمی بیٹھ جانے کا فیصلہ کرلیں گے۔ اور اس طرح تھوڑی بہت حد تک بھیڑ میں کمی ہو جائے گی۔ اس سب صورتِ حال کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آیندہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں کیسے مختلف الخیال اور متضاد الرائے ارکان کا انبوہ ایک جگہ جمع ہو جائے گا۔ کانگریس ہی اس چار سال کے عرصہ میں کچھ نہ کرسکی جب تک اس کی کوئی ذمہ دار اپوزیشن پارٹی بھی نہیں تھی اور ارادوں میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ ہی بعض داخلی کمزوریوں اور بنیادی خرابیوں کے باعث ناکارہ ثابت ہوئی تو پھر آنے والی حکومت جو بھانت بھانت کی آوازوں سے مل کر بنے گی اور جس کی تجاویز پر ہر لمحہ ذمہ دار مخالفتیں ہوا کریں گی کیا کر ڈالے گی۔ ان حالات میں ناممکن نظر آتا ہے کہ وہ یک جہتی پیدا ہو سکے جو ملکی استقلال کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ عوام خود بھی اس پر بڑی حد تک متحیر ہیں کہ اس ہنگامہ میں کس کو پہچانیں اور کیا کریں۔ ہوٹلوں، بازاروں، پارکوں، شہروں اور قصبوں میں سیاسی جماعتوں کے شور و غوغا سے گھر کی رونق "ضرور بڑھ گئی ہے لیکن نغمۂ شادی اور نوحۂ غم کے امتیاز کا فقدان ہے۔ ایک معاصر کے بقول "مسلمان تو اور بھی تذبذب و تحیر کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ اس کے سامنے سے کانگریس، کسان مزدور پرجا پارٹی، سوشلسٹ پارٹی، ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ وغیرہ کے ماضی اور حال کی متحرک تصاویر گذر رہی ہیں۔ وہ کانگریس سے بدظن ہے لیکن کچھ مذہبی رہنماؤں کے کردار سے اور کچھ ہندو فرقہ پرست جماعتوں سے گھبرا کر سوچتا ہے کہ ناچار کانگریسی ہی سہی لیکن اتنا سوچتے ہی اس کی نگاہوں کے آگے کانگریسی نیتاؤں کی چار سالہ سیاہ تاریخ آجاتی ہے۔ فرقہ پرستوں کی حمایت، مسلمان فریادیوں کی بے سود فریاد و فغاں۔ کانگریسی نیتاؤں کی بے بنیاد زبان، مسلم ملازموں کی برخاستگیاں۔ ذبیحہ گاؤ پر پابندی۔ اردو کشی۔ اور پھر ٹنڈن ازم کا دور دورہ۔"

اس سوچ بچار سے انتخابات کے ہنگاموں سے وہ فطری طور پر اکتا جاتا ہے۔ اگر ہم غور سے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ یہ اکتاہٹ انکی روزمرہ کی زندگی سے لیکر بڑے سے بڑے کاموں اور غور و فکر کے ہر مرحلے پر چھائی ہوئی ہے۔ یہ اکتاہٹ ان کے لئے بعض حیثیتوں سے نقصان دہ بھی ہے اور بعض حیثیتوں سے بہت زیادہ فائدہ مند بھی۔ نقصان دہ تو اس لئے کہ کہیں زیادہ اکتاہٹ سے ان کے خیالوں پر مُردنی اور فکر و عمل پر آداسی اپنا بھیانک سایہ اور زیادہ گہرا نہ کر دے۔ اور فائدہ مند اس لئے کہ جس ہنگامہ آرائی کے وہ حد سے زیادہ خوگر ہو چکے تھے اب خود ایسے مواقع پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ ہنگامہ آرائی کے بجائے کسی ٹھوس اور خاموش تعمیری کام کی طرف متوجہ ہوں۔ اور یہ بات ہے بھی ٹھیک، جب مسلمانوں کے پارلیمنٹ میں جانے نہ جانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں بلکہ الٹا نقصان یہ ہے کہ فرقہ پرست جماعتوں سے اور لڑائی ٹھن جاتی ہے جس کو ووٹ نہ دیا جائے وہی بگھرنے پر تیار ہے تو آخر مسلمانوں کے لئے کون سا فائدہ باقی رہ جاتا ہے جس کے لئے وہ انتخابات لڑیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ انتخابات میں حصّہ ہی نہ لیں۔ اور ہنگامہ آرائی کے بجائے اس اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہوں جو بہ حیثیت انسان اور بہ حیثیت مسلمان ان پر عائد ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو استعمال کرنے اور ان کے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش تو بہت کریں گی۔ کیونکہ اکثریت کے ووٹ بے شمار جماعتوں میں بٹ جانے کے بعد فیصلہ مسلمانوں کی ووٹوں پر ہی منحصر ہوگا۔ اکثر پارٹیاں وعدوں سے پرچائیں گی۔ کچھ تشدد اور دہشت پسندی کا حربہ بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ آپس میں بھی ان میں پھوٹ کا اندیشہ ہے جس کی کہیں کہیں ابھی سے ابتدا بھی شروع ہو گئی ہے۔ پارٹیوں میں سنگ باری کی نوبت آچکی ہے۔ جمہوریت" کا نادر نمونہ ملاحظہ ہو کہ شیواجی پارک بمبئی میں سوشلسٹ پارٹی اور شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن نے مشترکہ طور پر جو ایک انتخابی جلسہ کیا تھا اور اس میں شرکت کے لئے جلوس نکالا گیا تھا اسکے سلسلہ میں سنگ باری تک کی نوبت آ گئی اور بالآخر ایسا ہنگامہ ہوا کہ بمبئی پولیس کو ۱۹ راؤنڈ گولیاں چلانا پڑیں۔ کلکتہ میں کانگریس کے ایک جلسہ میں ایسا انتشار پیدا کر دیا گیا کہ مقرر کو تقریر کرنا مشکل ہو گیا اور جلسہ منتشر کرتے ہی —— ضلع ہگلی میں کسان مزدور پرجا پارٹی کے ایک جلسہ کو ناکام کرنے کی مکروہ کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے یہ کہا ہے کہ ریاست بمبئی اور ریاست آسام میں دو سوشلسٹ کارکنوں کو قتل کرا ...

گیا ہے۔ یہ سب انتخابات سے پہلے کا حال ہے۔ انتخابات کے دوران میں کیا کچھ گل کھلیں گے وہ خدا بہتر جانتا ہے۔

ہر پارٹی کی جانب سے انتخابی تقریروں کا آغاز ہو چکا ہے۔ غرضکہ ایک ہنگامہ برپا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اتنے امیدواروں میں اصول و نظریہ کا امتیاز سوائے ایک آدھ پارٹی کے کہیں نہیں۔ امتیازی چیز جو کچھ ہے وہ شخصیتوں کا اپنا اپنا اثر ہے۔ بھارت کے عوام کے ذہنوں کا جائزہ لیکر دیکھا جائے تو وہ ان میں تفریق کرنے سے قاصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب عوام کو ووٹ دینے کی ساری آوازوں کا مسلہ وران کی لے ایک ہی خواہش اقتدار کی پابند معلوم ہوگی تو اصول کی کیا وقعت رہ جائیگی۔

اس وقت ہر پارٹی کے مفاد کی کل اقلیت کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ پرست عناصر بھی اس پر طرح طرح سے اپنا جال پھینکنے کی فکر میں ہیں لیکن بات کہ وہ جمہوری طریقہ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں محال معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ غیر جمہوری طریقوں کی تیاری میں لگے ہوں جیسا کہ پنڈت نہرو کی حالیہ انتخابی تقریروں سے ظاہر بھی ہوتا ہے۔ کانگریس اپنے ماضی کے بھروسہ پر اقلیت کے تعاون کی امیدیں لگائے بیٹھی ہے اور بظاہر اس کے امکانات زیادہ نظر بھی آرہے ہیں۔ کیونکہ اقلیتی فرقہ کا ایک طبقہ جو حکام رسی کی بدولت اپنی تھوڑی بہت ساکھ جمائے ہوئے ہے کانگریس کی جا و بیجا ہر طرح سے حمایت کر رہا ہے۔

سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف اقلیتی فرقہ کا جھکنا ناممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہے۔ اس لئے کہ اول تو بھارت کے دوسرے فرقوں میں ہی ان کی کوئی طاقتور پوزیشن نہیں پھر اقلیت ہی کیا متاثر ہو، دوسرے اقلیتی فرقہ کا مزاج بھی اس راہ سے کچھ جدا ہی ہے۔ رہے وہ آزاد امیدوار جو کانگریس میں پہلے رہ چکے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں ان کا اثر بھی بہت ہے تو ان کی کامیابی اسی طرح ممکن ہے جس طرح کانگریس کے امیدواروں کی۔ کیونکہ عوام ووٹ ڈالتے وقت اصول کی تفریق نہیں کر سکیں گے بلکہ ذاتی اثر کے تحت اپنی اپنی رائے دیں گے۔ یہی بات ہے جس کا خیال کرتے ہوئے کچھ ایسے کانگریس کے امیدواروں نے جنہیں ٹکٹ مل چکے تھے کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کا ارادہ وقت کے وقت بدل دیا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب کے میدان میں اتر آئے۔

انتخابات کی اس گھماگھمی سے ہندو مسلم کشمکش پر پردہ سا پڑ گیا ہے۔ جیسا کہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ ہر پارٹی اور ہر گروہ ایسے موقعوں پر کام نکالنے کے لئے مخالفوں کے بھی قریب آنے کی کوشش کیا کرتا ہے اور وعدوں کے بلند سے بلند تر بلند سے باندھ دیتا ہے۔ گو وقت آنے پر ان کی کوئی پرسش نہیں ہوتی۔ انتخابات سے نتیجہ خیز بات جو حاصل ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اصولی جماعتوں کو اپنی پوزیشن کسی نہ کسی حیثیت سے واضح طور پر پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ جماعتیں جو انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں اور ان کا کوئی مخصوص نقطۂ نظر کوئی متعین راہ عمل کوئی جانا پہچانا مقصد ہے وہ چاہے موجودہ انتخابات میں کانگریس کے مقابلہ میں ناکام ہی ہوجائیں لیکن عوام میں صاف طور سے متعارف ہوجائیں گی اور ان کا مقصد کھل کر سامنے آجائے گا۔ اور اقلیتی فرقہ میں سے وہ جماعتیں یا وہ بااصول اور سوچنے سمجھنے والا طبقہ جو انتخابات میں حصہ لینے سے گریز کر رہا ہے۔ اس کو بھی اپنی پوزیشن اور اپنا سب سے جدا زاویہ فکر دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا ایک موقع مل جائے گا۔ کیونکہ لوگ بہر حال یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ انتخابات میں حصہ نہ لینے کی وجہ کیا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے انتخابات کی اہمیت کئی حیثیتوں سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ طبقہ بھی جو انتخابات میں خیر کا کوئی پہلو نہیں دیکھ رہا ہے وہ بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے، اگرچہ یہ آواز مشکل ہی سے عوام کے دلوں میں اتر سکے گی چاہے اس میں کتنا ہی فائدہ ہو۔ کیونکہ انتخابات کی ہاؤ ہو سے لذت لینے والے افراد خاموش تعمیری کاموں کی طرف جلدی سے راغب نہیں ہوا کرتے۔ دیکھنا چاہئے کہ یہ آواز کہاں تک لوگوں کو اپیل کرتی ہے۔

پندرہ روزہ الحسنات رام پور۔ یو۔ پی

کا چوتھا خاص نمبر

حضرت محمد مصطفیٰ صلعم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک

مصلح اعظم

رہبر کامل

ہادی عالم

ایک نہایت سبق آموز مجموعہ ہے

ضخامت سوا سو صفحات سے زاید۔ قیمت عمر سالانہ خریداران کو سالانہ چندہ میں ہی دیا جائیگا۔ چندہ ساڑھے پانچ روپیہ سالانہ

آج ہی خریدار بنکر سیرت نمبر طلب فرمائیں۔ اس سے پہلے توحید و آخرت نمبر عہ رسالت نمبر عہ شائع ہو چکے ہیں۔

پاکستان میں رقوم بھیجنے کا پتہ "دفتر اخبار کوثر" گوال منڈی، لاہور۔ وی۔ پی ہم سے براہ راست طلب فرمائیں۔

منیجر الحسنات رام پور۔ یو۔ پی

(محمد احمد ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے کمال پرنٹنگ [illegible] میں چھپوا کر دفتر [illegible] سے شائع کیا)